THE ADEEB DELHI

نومبر ۱۹۳۵ء

فلم ''مورتی'' مس خورشید

دس روپے علاوہ محصولڈاک

قیمت فی کاپی ۔ ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک

ادیب

سید محمد ارتضیٰ واحدی —— فصیح الدین احمد ایم۔ اے

جلد ۱۰ | نومبر ۱۹۴۵ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

برق پارس

مصنفہ خاں محبوب نوری۔ شائع کردہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ قیمت دو روپے۔

لکھائی چھپائی کاغذ معمولی

محبوب نوری کچھ عرصہ پہلے رسالہ "ساقی" دہلی میں افسانے لکھتے رہے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی محبوب نوری ہیں کیونکہ وہی طرز تحریر ہے۔ کہانی میں وہی تحیر کے وقفے ہیں اور وہی "اسرار پناہی" ہے۔ ان کے افسانے شروع ہی سے اس طرح چلتے ہیں کہ انسان کا ذہن آہستہ آہستہ ان کا تعاقب کرسکتا ہے۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آتے۔ وہی حیرت پھیلا کر ایک وقفہ پیدا کرتے ہیں۔ پھر واقعات پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد خلا پیدا ہوجاتا ہے۔

زیر نظر کتاب بھی ایک تحیر انگیز قسم کا ناول ہے جو پہلے سائنٹفک معلوم ہوتا ہے۔ آگے جاکر جاسوسی، اس سے ذرا بڑھکر Adu اور کہیں کہیں رومانی۔ مگر کردار زیادہ پیدا ہوجانے کی وجہ سے کہانی میں کسی قدر گنجلک سی پیدا ہوگئی ہے۔

محبوب نوری کے اس قسم کے ناول اب تقریباً پندرہ سال پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس لئے اب وہ دوسری زیادہ شگفتہ باتیں لکھیں تو اچھا ہے۔ کتاب کافی دلچسپ ہے۔ اور دعوت مطالعہ دیتی ہے۔

ایک حمام میں

از خواجہ محمد شفیع صاحب سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۰۴۔ مجلد گرد پوش۔ قیمت دو روپے۔ شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دہلی۔

کتاب کا نام ناول کے پلاٹ کے لحاظ سے نہایت موزوں رکھا گیا ہے۔ ناول کے دراصل تین باب ہیں۔ اول ایک شریف اور متمول خاندان کا چشم و چراغ مرزا احمد بیگ۔ دوم مشتری طوائف۔ تیسرے چنّا اور مُنّی۔ ان چاروں کیرکٹروں پر اس ناول کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ درمیان میں بیسوں اور غیر اہم کیرکٹر بھی پلاٹ کو پُر کرنے کے لئے ملتے ہیں۔ مگر ہم آہنگی برابر جاری رہتی ہے۔ ناول کے پلاٹ کے ساتھ ساتھ ایک سب پلاٹ بھی ہے۔ اگر یہ سب پلاٹ اصل کہانی سے وابستہ ہوتا تو ناول کی دلچسپی زیادہ ہو جاتی۔ موجودہ حالت میں اس سب پلاٹ کے ذریعہ ایک ڈرامہ نویس کو مشتری اور احمد بیگ سے متعارف کرایا گیا ہے۔ جس کے بعد ایک تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

ناول کا موضوع شفیع صاحب کا پسندیدہ اور منتخبہ موضوع ہے۔ اس ناول کا ہیرو احمد بیگ ایک شریف متمول۔ خوبرو مگر بد اطوار نوجوان ہے جو تفریح طبع کے لئے خاندانی روایات کو تازہ رکھتا ہے اور بیوی بچوں کی محبت سے بیگانہ ہوکر اختری طوائف سے محبت کے پینگ بڑھاتا ہے اور بیدریغ روپیہ خرچ کرتا ہے۔ مگر اس کی بیوفائی سے دل کھٹا ہو جاتا ہے اور پھر وہ مشتری کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جہاں اس کی ایک ڈرامہ نویس سے ملاقات ہوتی ہے اور ایک فلم کمپنی کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ تھیٹر کو کامیاب بنانے میں مالی اور دیگر دشواریاں پیش آتی ہیں اس لئے ایک رئیس کی امداد حاصل کی جاتی ہے۔ رئیس کا دل مُنّی پر آجاتا ہے۔ مُنّی ایک لاوارث لڑکی تھی جسے چنّا نے ترس کھاکر اپنے ہمراہ لے لیا تھا اور بہن کی طرح اسکی نگہداشت کرتا تھا۔ اور جو بالآخر کمپنی کی مقبول ہیروئن بن جاتی ہے۔ مرزا اس لاوارث لڑکی کی لاج کی خاطر کافی نقصان کے باوجود مع کمپنی ریاست سے فرار ہوجاتا ہے۔ اس اثناء میں دو اور حادثے پیش آتے ہیں۔ رئیس مرزا کی کمپنی میں آگ لگوادیتا ہے اور مرزا چنّا کے ذریعہ ریاست کا ایک راز دریافت کرتا ہے جس کی وجہ سے راجہ گدی سے اتار دیا جاتا ہے اور اس کا جانشین مرزا کو ایک لاکھ روپیہ انعام دیتا ہے۔ ادھر مُنّی پر ایک نوجوان متموّل منیر نامی فریفتہ ہوجاتا ہے۔ مرزا شاہ صاحب کا بھیس بدل کر اس کے باپ کو مُنّی اور منیر کی شادی پر آمادہ کرتا ہے اور اس کی شادی ہو جاتی ہے مگر شاہ صاحب بنکر مرزا کو ایسا مزا آتا ہے کہ یہ واقعی تسبیح اور مصلّے ہمیشہ کیلئے سنبھال لیتا ہے۔

ناول کی زبان اس قدر چٹخارے دار ہے کہ دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔ پھر طوائف کے ناز و انداز، مکر و فریب، دانہ و دام، بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں، اختری بیوفائی کرتی ہے تو مشتری وفا کی پتلی بنکر سامنے آتی ہے۔

چنّا کا کیریکٹر کسی اکھاڑے کے پہلوان سے ملتا جلتا ہے مُنّی فلاکت سے نکل کر پہلے سٹیج پر آتی ہے اور پھر ایک شریف کے گھر میں جا بیٹھتی ہے۔ ناول میں کہیں کہیں ذاتی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً فیروز بخت کی بیماری اور اس قسم کی بعض دیگر باتیں جو ناول کو کہیں کہیں حقیقت میں بدل دیتی ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی حاضر جوابیاں

(از واحدی)

دلی سے سلطان جی کی درگاہ کو جو سیدھی سڑک جاتی ہے اُس پر دلی دروازہ سے نکلتے ہی جیل خانہ ہے۔ جیل خانے کے سامنے نیا قبرستان ہے اور جیل خانے کے پیچھے ایک پُرانا قبرستان ہے۔ اِس پُرانے قبرستان کی مسجد میں کٹہرے کے اندر شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان دفن ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے بیٹے شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب اور دوسرے بہت سے عزیز قریب یہیں آرام کر رہے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کی آٹھ سو سالہ تاریخ میں جو غیر معمولی عالم اور مقدس ہستیاں گزری ہیں یہ حضرات اُن میں سے تھے۔ اور ان کی یہ خصوصیت اور قابلِ خیال ہے کہ شاہ عبدالرحیم صاحب سے علم اور تقدس کا جو سلسلہ چلا وہ کئی نسلوں تک چلے گیا۔ مسلسل کئی نسلوں تک جس نے اس خاندان میں جنم لیا وہ علم اور تقدس سے بہرہ ور رہا۔ تین پشتوں میں عموماً دولت اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہے۔ کجا علم اور تقدس۔ علم اور تقدس موروثی چیزیں نہیں ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحب وہ بزرگ ہیں جنہیں امام غزالی اور امام رازی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان کی تصنیفات ساری دنیا پڑھتی ہے۔ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ بھی ان کا بہت مقبول ہے اور ان کے ایک بیٹے شاہ رفیع الدین صاحب نے قرآن مجید کا اُردو میں لفظی ترجمہ کیا۔ اور دوسرے بیٹے شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن کریم کا اُردو میں بامحاورہ ترجمہ کیا۔ تیسرے اور بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز صاحب علم و فضل اور تقدس میں باپ کے ہم مرتبہ تھے۔ اور ذہانت اور طباعی میں جواب نہ رکھتے تھے۔ ہندستان کا کوئی ایک عالم اس خاندان کے کسی ایک فرد کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ پھر عالم کا بیٹا عالم نہ باپ عالم ملیگا نہ بیٹا عالم ہوگا۔ برخلاف اس کے این خانہ تمام آفتاب است[1]"

شاہ عبدالعزیز صاحب ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے تھے یعنی آج سے دو سو پانچ یا دو سو چار برس پہلے۔ آج کل ۱۳۶۴ھ ہے۔ اُن جیسا ذہین اور طباع ہندستان کے عالموں (مولویوں) میں نہ اُن سے پہلے کوئی ہوا تھا اور نہ اُن کے بعد کوئی ہوا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کی حاضر جوابیاں ابھی تک دلی میں نقل ہوتی چلی آتی ہیں۔ میں اُن میں سے چند آپ کو سناتا ہوں۔ یہ محض حاضر جوابیاں ہی نہیں ہیں اُنہیں علمی اور دینی لطیفے بھی کہا جاسکتا ہے۔

(۱)

مسٹر چکنگ یا مسٹر چکنات نامی کوئی انگریز حضرت شاہ صاحب کے زمانہ میں دلی کے کسی بڑے عہدے پر متعین تھا۔ اُس کے ہاں ایک پادری صاحب آکر ٹھیرے۔ مسٹر چکنگ نے پادری صاحب سے کہا "شاہ صاحب کو ہراؤ تو جانیں اگر ہرا دو تو تمہیں دو ہزار روپے دونگا ورنہ تم دو ہزار روپے مجھے دینا۔" پادری صاحب راضی ہوگئے اور پہنچے مسٹر چکنات کے ساتھ شاہ صاحب سے مناظرہ کرنے۔ شاہ صاحب نے فرمایا "کہئے جو کہنا ہے۔" پادری صاحب نے کہا "میں اپنی بات کا جواب معقول چاہتا ہوں۔ منقول اور کتابی نہیں چاہتا۔" شاہ صاحب نے ارشاد کیا "منظور ہے۔ کسی کتاب کا نام نہیں لوں گا۔" پادری صاحب نے پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے، آپ کے پیغمبر اللہ کے محبوب ہیں۔ اور امام حسین ان کے نواسے تھے جنہیں وہ بیحد چاہتے تھے۔ پھر اللہ نے یہ کیسے گوارا کرلیا کہ محبوب کا محبوب شہید کر دیا گیا۔ نہ اللہ ہی نے خود پرواہ کی اور نہ اللہ کے محبوب نے اُسے توجہ دلائی؟" شاہ صاحب نے فرمایا "ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ دلائی تھی۔ لیکن اللہ نے جواب دیا۔ میاں تمہیں اپنے نواسے کی پڑی ہے یہاں کم بختوں نے میرے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کو سُولی چڑھا دیا۔ مجھے ذرا اس کی فکر سے تو فارغ ہو لینے دو۔"

---

[1] شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے تھے۔ مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحب شہید بھتیجے تھے۔ شاہ غلام علی شاہ (ترکمان دروازہ کے پاس جن کی مشہور خانقاہ ہے) اور مفتی صدرالدین خاں صاحب (مرزا غالب کے مربی) اور مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی جیسے لوگ شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے دیوبندی علماء اپنے آپ کو اُن ہی کے شاگردوں کا شاگرد کہتے ہیں اور ان ہی School of Thought کا متبع بتاتے ہیں۔ جمعیۃ العلما کا رجحان سیاسی بھی شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا رہینِ منت ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب پہلے عالم اور درویش تھے جنہیں ملت کے گراؤ کا احساس ہوا۔ شاہ ولی اللہ صاحب اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں نوجوان تھے اور اورنگ زیب کے بعد کا زوال مدت ہائے دراز تک اُن کی نظر سے گزرتا رہا۔ اور اسی وقت اُنہوں نے ملت کو سنبھالنے کی کوشش شروع کردی تھی۔

(۲)

ایک شخص نے مسئلہ دریافت کیا "حضور! یہ بدکار پیشہ ور طوائفیں مریں تو ان کی نمازِ جنازہ پڑھنی چاہیئے یا نہیں؟" شاہ صاحب نے فرمایا "اُن کے ہاں جانے والے اور اُن سے ناجائز تعلق رکھنے والے مردوں کی نمازِ جنازہ پڑھتے ہو؟" سائل نے کہا "ہاں اُن کی تو پڑھتے ہیں۔" شاہ صاحب نے فرمایا "تو طوائفوں نے اُن سے بڑھکر کون سا قصور کیا ہے کہ انہیں نمازِ جنازہ سے محروم رکھا جائے۔"

(۳)

دہلی کا رزیڈنٹ شاہ صاحب سے ملنے آیا۔ اور باتوں باتوں میں کہنے لگا "جناب میں نے ایک سوال کئی عالموں سے کیا۔ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا آپ بھی غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مسافر راستہ بھول گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص سامنے پڑا سو رہا ہے اور ایک شخص اُس کے برابر بیٹھا ہے۔ اب مسافر جاگتے سے راستہ معلوم کرے یا سوتے سے؟" شاہ صاحب سوال کی تہ کو پہنچ گئے سوتے سے مراد رزیڈنٹ کی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور جاگتے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ شاہ صاحب نے فوراً جواب دیا "راستہ سوتے سے پوچھنا ہوگا۔ وہ جاگنے والا خود اس انتظار میں بیٹھا ہے کہ سونے والا اُٹھے تو اُس سے راستہ پوچھے۔ مسافر کو چاہیئے کہ وہ بھی سونے والے کے اُٹھنے کا انتظار کرے۔

(۴)

شاہ عبدالعزیز صاحب کی عمر صرف بارہ سال تھی جب شاہ ولی اللہ صاحب اُن کے والد کا انتقال ہوا ہے۔ لیکن آپ اس وقت تعلیمی کورس پورا کر چکے تھے۔ چند مولوی صاحبان شاہ ولی اللہ صاحب کے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کے شاگرد قصبہ پھلت سے شاہ ولی اللہ صاحب کی تعزیت کرنے بیل گاڑی میں دلی آ رہے تھے۔ راستہ میں ان کی آپس میں گفتگو سُنکر گاڑیبان نے جو ہندو تھا کہا کہ "ایک بات میری بھی بتا دو کہ خدا ہندو ہے یا مسلمان؟" مولوی صاحبان نے جواب دیئے لیکن گاڑی بان کی سمجھ کے موافق نہیں دیئے۔ آخر عاجز ہو کر پھر طے کیا کہ دلی پہنچ کر شاہ صاحب سے جواب دلوائیں گے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے سامنے سوال پیش کیا گیا۔ مولوی صاحب نے گاڑیبان سے فرمایا "خدا ہندو ہوتا تو گئو ہتیا کبھی نہ کرنے دیتا۔" یہ جواب گاڑی بان کے دل کو لگ گیا۔

(۵)

ایک شخص نے عرض کیا کہ "محفلِ رقص و سرود میں انسان رات رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ لیکن اللہ کی عبادت میں نیند آنے لگتی ہے۔ اسکی کیا وجہ ہے۔" شاہ صاحب نے فرمایا "دو پلنگ ہوں، ایک پر کانٹے بچھے ہوں اور ایک پر پھول۔ نیند کس پر آئے گی؟" اس نے عرض کیا "پھول والے پلنگ پر۔" فرمایا "بس رقص و سرود کی محفل کانٹے پلنگ کے مثل ہے اور اللہ کی عبادت پھول والے پلنگ کی مثل۔"

(۶)

ایک سوداگر کو اپنی بیوی سے تو بڑی محبت تھی لیکن بیوی کے باپ سے وہ کچھ ناخوش تھا۔ وہ سوداگری کے لئے سفر پر جانے لگا تو بیوی سے کہہ گیا کہ "اپنے باپ کے گھر گئی تو تجھے طلاق ہے۔" اتفاق کی بات کہ باپ اسی اثنا میں بیمار پڑا اور مر گیا سوداگر کی بیوی اب کیا کرتی۔ اس سے نہ رہا گیا اور وہ باپ کے گھر جا پہنچی۔ غرض سوداگر واپس آیا تو پریشان ہوا کہ بیوی خواہ مخواہ ہاتھ سے چلی گئی جس عالم سے فتویٰ پوچھتا ہے یہی فتویٰ ملتا ہے کہ طلاق ہوگئی۔ شاہ صاحب کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش ہوا۔ آپ نے برجستہ فرمایا "باپ کے مرنے کے بعد گھر باپ کا کہاں رہا۔ وہ گھر تو خود بیٹی کا ہو گیا۔ سوداگر کی بیوی باپ کے گھر نہیں گئی اپنے گھر گئی۔ لہٰذا طلاق کیسی۔"

(۷)

ایک انگریز عربی فارسی جاننے والا جامع مسجد میں آیا۔ شاہ صاحب جامع مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے۔ وہ انگریز وعظ سُننے لگا۔ اور تھوڑی دیر بعد بلند آواز سے اُس نے یہ شعر پڑھا ؎

کسے بگفت کہ عیسیٰ ز مصطفےٰ اعلیٰ است ۔ کہ ایں بزیرِ زمین و فن آں بہ اوجِ سماست

شاہ صاحب نے اُسی وقت یہ شعر پڑھ دیا ؎

بگفتمش کہ نہ ایں حجت قوی باشد ۔ حباب بر سرِ آب و گہر تہِ دریاست

(۸)

شیعوں کے ایک بڑے عالم تشریف لائے اور فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی عائشہؓ کے جنتی ہونے کی بھی آپ کے پاس کوئی دلیل ہے؟" شاہ صاحب نے پوچھا "آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے؟" شیعہ عالم نے جواب دیا "ہاں! کیوں نہیں۔ بڑی مستند کتاب ہے۔" کہا "اُس کتاب میں لکھا ہے کہ عکاشہ رضی اللہ عنہ نے ایک بار کسی حیلہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہرِ نبوت کو چوم لیا تھا۔ اور اس چومنے کی وجہ سے وہ جنتی ہو گیا۔" شیعہ عالم نے کہا "صحیح ہے۔" شاہ صاحب نے فرمایا "عجب یہ بات ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جنتی ہونے میں کیا شبہ ہے اُنھوں نے ایک نہیں ہزار بار مہرِ نبوت کو دیکھا اور چوما ہوگا۔ وہ تو رسول اللہ کی بیوی تھیں۔

(۹)

ایک انگریز نے شاہ صاحب سے سوال کیا کہ ہماری قوم کے سینکڑوں آدمی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ایک رنگ اور ایک روپ کے نظر آئیں گے۔ آپ کی قوم میں کوئی گورا، کوئی کالا، کوئی سانولا اور کوئی کسی طرح کا کیوں ہے؟" فرمایا "گدھے سب یکساں ہوتے ہیں اور گھوڑے مختلف۔ کوئی سبزہ، کوئی کُمیت، کوئی سمند، کوئی لکھو، کوئی سرنگ۔

اسلم میری نظر میں

(از فصیح الدین احمد)

شیخ میاں محمد اسلم صاحب کو فسانہ نگاری اور ناول نویسی کی وجہ سے اُردو داں طبقے میں کافی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے اور جن لوگوں نے ان کی تصانیف پڑھی ہیں اُنہوں نے اکثر کتابوں میں ان کی تصویر بھی دیکھی ہوگی۔ مگر ہندوستانی فوٹو گرافر کو صرف ایک کام آتا ہے یعنی وہ اپنے گاہک کی تصویر نہایت خوبصورت پیش کرنے کا عادی ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح نقش و نگار تصویر سے کہیں ظاہر نہیں ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی بت کی تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔

آج میں اسلم کی ایک قلمی تصویر پیش کرنی چاہتا ہوں۔ وہ اسلم جس نے کم و بیش ساٹھ ہزار صفحات سیاہ کئے ہیں اور جس کی تصانیف کی تعداد تقریباً ایک سو ساٹھ تک پہنچ چکی ہے۔ جن میں سے بعض بعض کتابیں سات سو صفحے پر مشتمل ہیں۔ اسلم نے صرف فسانے اور ناول ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ بعض مضامین کے مجموعے بھی شائع کئے ہیں۔ لیکن دنیا محض ناول نویس کی حیثیت سے اُن سے واقف ہے۔

میں اسلم کے حسب و نسب سے واقف نہیں۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ ان کا خاندان لاہور کے معزز، شریف اور متمول گھرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ جس طرح حیدرآباد دکن میں ہر شخص کو مولوی یا مولانا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اسی طرح لاہور میں ہر شخص کو شیخ صاحب تصور کیا جاتا ہے۔ اسلم شیخ صاحب بھی ہیں اور میاں صاحب بھی۔ یہ شیخ ہیں یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ مگر واقعی یہ "میاں" ضرور نہیں ہیں (دہلی کی زبان میں "میاں" ایک سید ہے اور شریف آدمی کو کہتے ہیں)

لاہور میں جس جگہ ان کی موروثی حویلی ہے اُسے بارود خانہ کہتے ہیں۔ شاید شاہی زمانے میں یہ شاہی میگزین ہوگی۔ بارود خانہ سے ذرا آگے بڑھئے تو ہیرا منڈی آتی ہے۔ ہیرا منڈی میں "الماس"۔ "طمنچہ"۔ "ہیرا" اور "کنار" بستی ہیں۔ گویا یہ دہلی کا چاوڑی بازار ہے۔

"میاں صاحب" کی حویلی بہت قدیم معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ڈیوڑھی ایسی شاندار ہے کہ ہاتھی یا اونٹ سوار بآسانی اُس کے اندر جا سکتا ہے۔ جس محلے میں یہ رہتے ہیں وہاں کی ساری جائداد ان کی ملکیت ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب میں جگہ جگہ ان کے وسیع مربعے موجود ہیں۔

اسلم کی عمر غالباً پچاس برس سے متجاوز ہوگی۔ لمبا چہرا۔ لمبی ناک۔ پچکے ہوئے گال۔ لمبی لمبی مونچھیں۔ گھٹی ہوئی ڈاڑھی۔ چندیا صاف۔ صرف بغلیوں میں کچھ بال نظر آتے ہیں۔ دانت پورے معلوم ہوتے ہیں۔ پان سگرٹ سے نفرت ہے۔ حقہ بھی نہیں پیتے دیکھا۔ ہاتھ پاؤں لمبے مگر گوشت کم۔ گفتگو میں ملائمت اور انکسار۔ سچا اور پکا دیندار آدمی۔ ہیرا منڈی کے قرب میں رہکر بھی کبھی زندگی کو ان جواہر ریزوں سے مالامال نہیں کیا۔ اولاد سے محروم۔ طبیعت میں صفائی اور ستھرائی۔ لمبا کالر دار کوٹ۔ ریشمی قمیص۔ اور شلوار۔ سر پر سرخ ترکی ٹوپی۔ گلے میں نکٹائی۔ دوست کا دوست اور دشمن کا بھی دوست۔ مہمان نوازی سے فرحت بلکہ مہمان کو خدا کی رحمت سمجھنا۔ مہمان کے ساتھ سایہ کی طرح رہنا۔ یہ ان کی خصوصیات ہیں۔

ان کے سگے ماموں بقول اسلم صاحب "جانگلی" ہیں۔ "جانگلی" معلوم ہوا اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو راوی کے اس پار خانہ بدوش قبائل کی طرح رہا کرتے تھے۔ ان کے پاس مویشیوں کے گلے ہوتے تھے۔ جس جگہ ہریاول دیکھی ڈیرے ڈال دیئے۔ پھر آگے چل نکلے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسلم صاحب کو شکار کا بے تحاشہ شوق اسی وجہ سے ہوا۔ ان کے ہر ناول میں اور کم و بیش ہر افسانے میں بندوق اور شکار کا ذکر ضرور آتا ہے۔ خانہ بدوش لوگ ایک قسم کی نظم خوانی بھی کرتے تھے جسکو ان کی زبان میں "ڈھولا" کہتے ہیں۔ ڈھولے عموماً اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھکر یا آبادی سے دور درخت پر بیٹھکر کہے جاتے تھے۔ جہاں سے ڈھولا کہنے والے کی آواز سامعین کو برابر آتی رہتی تھی۔ مگر وہ ان کو دکھائی نہ دیتا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہوگی اسلم کو موسیقی کا بھی کچھ شوق ہے۔ اور ان کے ناولوں میں اشعار اور گیت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ہیرا منڈی کا قرب حاصل ہے اس لئے کبھی کبھی کسی رقاصہ کا بھی ذکر آجاتا ہے۔

کوئی مہینہ جاتا ہوگا کہ اسلم کی کوئی نہ کوئی کتاب ریویو کے لئے نہ ملتی ہو۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اتنے بے شمار افسانے اور ناول لکھنے کے لئے ان کے پاس کہاں سے وقت آتا ہوگا۔ مگر جو زندگی کے حالات اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ فکرِ معاش سے مستغنی۔ اولاد کی فکر سے سبکدوش۔ ایسا شخص جتنا بھی لکھے کم ہے۔

اسلم کے متعلق کوئی بیان اُن کی بیٹھک کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہوگا۔ بیٹھک مکان کے سامنے بالا خانہ پر واقع ہے۔ یہ بھی پرانی وضع کی عمارت ہے۔ دو کمرے اور آگے چھوٹا سا صحن جس میں گملے رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی بیٹھک میں بھی مغرب اور مشرق دونوں ملتی نظر آتی ہیں۔ کرسیوں اور میزوں کے ساتھ قالین اور چاندنی بھی موجود ہے۔ دیواروں پر بے شمار فوٹو اور قطعات آویزاں ہیں۔ جانشین پر اکثر تصاویر ان کی گود لی ہوئی مرحوم بھانجی اصغری کی موجود ہیں۔ اسلم صاحب کے ہاں چونکہ کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اس لئے اُنہوں نے اپنی بہن کی ایک کم سن لڑکی کو متبنٰی کر لیا تھا مگر قدرت کو ان کی گود بھری رکھنی منظور نہ تھی۔ ان کی نشست نیچے چاندنی پر بھی ہوتی ہے۔ اور کرسیوں پر بھی۔ ان کی ساری تصانیف اسی جگہ پروان چڑھیں۔

اسلم صاحب کی تعلیم کے متعلق مزید تفصیلات معلوم نہیں۔ مگر اتنا ضرور سننے میں آتا ہے کہ دسویں پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے۔ سر محمد اقبال مرحوم ان کے شاگردوں میں تھے۔ روزانہ شام کو یہ سیر کر کے جب واپس آتے تو انارکلی میں ڈاکٹر اقبال کے مکان پر پانی پینے کے لئے رُک جاتے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے کسی انگریزی نظم کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ اور کلاس روم میں بورڈ پہ رکھدیا۔ ڈاکٹر اقبال کی جب اُس ترجمہ پر نظر پڑی تو اُنہوں نے نصیحت کی کہ "اسلم تم کو چاہیئے کہ کچھ نثر لکھو۔ اس کے عمل سے تم کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔" وہ دن اور آج کا دن، اسلم نے قلم اُٹھائی اور ایسی اُٹھائی کہ اُردو مصنفین میں ناول نگاری میں اپنے لئے ممتاز جگہ پیدا کرلی۔

ان کے پبلشروں کی تعداد بھی بکثرت موجود ہے۔ جس طرح کثیر الاولاد والدین اپنی اولاد کو بخوشی دوسروں کو متبنٰی بنانے کے لئے دیدیتے ہیں اسی طرح اسلم صاحب نے شاید کسی کتاب کا بھی حق تصنیف اپنے حق میں محفوظ نہیں رکھا۔ بلکہ پبلشروں کے ہاتھ فروخت کردیں۔ ان کے موجودہ پبلشر مکتبہ دار البلاغ میو روڈ محمد نگر لاہور ہیں۔ جو اب تک اسلم کی بیس بائیس کتابوں کا حق اشاعت حاصل کر چکے ہیں۔ انکی خواہش ہے کہ دنیا اسلم کو "گناہ کی راتوں" کے مصنف کے اعتبار سے نہیں بلکہ ان کی باقی تصنیفوں کی وجہ سے یاد رکھے۔

اسلم کی فسانہ نگاری کے متعلق چند فقرے ضروری معلوم ہوتے ہیں اسلم کی فسانہ نگاری کا ماحول آپ کی نظر سے گذر چکا ہے۔ اب صرف یہ بتانا باقی ہے کہ وہ افسانہ کیونکر لکھتے ہیں۔ اس کے متعلق خود ان کا قول ہے کہ افسانہ کا پلاٹ ان کو زندگی کے ہر موڑ پر نظر آتا ہے مثلاً کیلے کے چھلکے پر سے کسی کو رپٹتے ہوئے دیکھ لیا۔ مرغی کا انڈوں پر بیٹھنا۔ گائے کے بچھڑے کا ماں کے تھنوں سے دودھ چوس چوس کر پینا۔ بڑھیا کا راوی کے کنارے کشتی کا انتظار کرنا یا کارعلی کے ٹکڑے کے لالچ میں چوہے دان میں پھنس جانا۔ یہ باتیں ان کیلئے پلاٹ بنانے کیلئے کافی ہیں۔ مگر افسانہ کے پلاٹ کو ذہن میں مکمل تیار کرنے سے پہلے اکو ایک مناسب نام کی ضرورت ہوتی ہے۔ نام رکھے بغیر یہ کبھی افسانہ لکھنا شروع نہیں کرتے اور افسانہ لکھنے کے بعد اس وقت شائع نہیں کرتے جب تک چند معتمد دوستوں کو پہلے سنا نہ لیں۔ چنانچہ ان کے دوستوں کا پہلا فرض ہوتا ہے کہ وہ ہمہ تن گوش ہوکر ان کے افسانے کو سنیں۔ افسانہ سنانے میں ان کو داد لینی منظور نہیں ہوتی بلکہ اُن کی رائے اس لئے طلب کرتے ہیں کہ افسانہ کی خامیوں کو دور کیا جاسکے۔ یہ ہٹ دھرم نہیں ہیں۔ اگر ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوجائے تو اُسے تسلیم کرنے میں دیر نہیں کرتے۔ خود ان کا قول ہے کہ جب افسانہ ان پر طاری ہوتا ہے تو دنیا کی کسی چیز میں انہیں دلچسپی نہیں رہتی۔ یہ کاغذ اور قلم دوات لیکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور جو کچھ دماغ میں ہوا ہے اسے نکال کر کاغذ پر رکھ دیتے ہیں۔ گھر میں بچوں کا شور یا بڑوں کی بات چیت ان کے کام میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر ریڈیو آہستہ آہستہ چلتا ہے یا گراموفون ریکارڈ بجتا رہے تو ان کو اس کام میں اور بھی امداد ملتی ہے۔

ان کے دوستوں کے نام بھی مجھے معلوم نہیں۔ گفتگو میں دو نام اکثر ان کی زبان سے سننے میں آتے ہیں۔ "بخاری اور تاج"۔ یعنی پروفیسر احمد شاہ بخاری اور سید امتیاز علی تاج"۔ ان دونوں کو یہ اپنا سچا رفیق سمجھتے ہیں۔ اسلم کو میلوں، تماشوں، کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ البتہ سنیما ضرور دیکھتے ہیں مگر یہ شرط ہے کہ کوئی افسانہ اس وقت ان پر نازل نہ ہو۔ افسانہ نازل ہوتے وقت ان کو خور و نوش کی بھی خبر نہیں رہتی۔ سنیما میں جس خاص سین کی تعریف سنکر دیکھنے جاتے ہیں اُسے دیکھکر باہر آجاتے ہیں۔ تمام وقت سنیما میں نہیں بیٹھتے۔

یہ خاکہ میں نے میاں محمد اسلم صاحب کا اپنے زاویہ نگاہ سے کھینچا ہے ممکن ہے دوسروں کی نظر ان کو کسی اور طرح دیکھتی ہو۔ مگر مجھے دوسروں سے کیا واسطہ؟ اس مضمون میں اسلم صاحب کی تصانیف پر رائے زنی کرنے کا میرا ارادہ نہیں۔ البتہ اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ ان کے بعض ناول ایسے ہیں کہ ان کو بہت کامیابی کے ساتھ پردۂ فلم پر مستعمل کیا جاسکتا ہے ؛

۴۵ء کا مجاز

(آہنگ" پر ایک نظر)

(از جناب ایم شکیل صاحب)

غالباً گرمیوں کی ایک شام تھی اور رشیدہ[1] آپا کے یہاں چائے پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ خالص قسم کے لیڈر، ترقی پسند افسانہ نگار، زندگی کے ترجمان شاعر، تنقید نگار، ناول نویس، بمبئی کے اداکار، لکھنؤ کے سٹوڈنٹس لیڈر، غرضکہ سب ہی تھے۔ فنکاروں کے اس اجتماع میں میں صرف ایک اداکار کی طرح تھا۔ اس لئے میز کے اس آخری حصہ کو میں نے چائے کے وقت منتخب کیا جو بالکل خالی تھا۔ مجھے خوشی اور حسرت تھی کہ میرے سامنے کوئی نہ تھا۔ خوشی اور اطمینان جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں بہت دیر تک نہیں رہتا۔ شائد فطرت کے اسی اصول کے مطابق جب میں چائے کا دوسرا گھونٹ پینے کے لئے پیالی کو اپنے لبوں سے لگا رہا تھا کہ ایک نیم کالے رنگ کے، تپ دق کے شکار نوجوان کمرے میں داخل ہوئے اور جلدی سے میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ بس ایسا معلوم ہوا کہ یہ حضرت کمرے کے پیچھے اسی انتظار میں کھڑے تھے کہ میں ادھر پیالی کو منہ سے لگاؤں اور اُدھر وہ کمرے میں داخل ہو کر میرے سامنے گنگنانے لگیں۔ دعوت میں جب گرم گرم چائے، شیرے میں ڈوبے سفید رس گلّے اور دال موٹ سامنے رکھی ہو، تب بھی اگر کوئی خوش نصیب گنگنانے کو کھانے سے زیادہ اہمیت دے تو یہ امر یقینی ہے کہ وہ شاعر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ "حضرت" بھی چونکہ گنگنا زیادہ رہے تھے اور ناشتے سے بالکل بے تعلق تھے اس لئے یہ تو میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ حضرت ہوں نہ ہوں شاعر ہیں ——— مگر کون شاعر؟ یہ معمہ حل کرنا کچھ اتنا آسان بھی نہ تھا۔ اُن سے خود پوچھنا تہذیب کے خلاف میری سمجھ کے مطابق تھا۔ اور کسی دوسرے سے اُن کے بارے میں پوچھنا اپنے آپ کو نیم اُلو ثابت کرنے کے برابر تھا۔ اس لئے میں نے صبر سے کام لیا۔ اپنے پیدا کرنے والے معبود حقیقی کی بارگاہ میں اس مشکل کو حل کرنے کی دُعا بھی شروع کر دی کہ شاید اسے میرے اوپر رحم آجائے اور معمہ حل ہو جائے۔

چائے کے دَور کے ختم ہوتے ہی گفتگو کا دور شروع ہو گیا۔ لوگ میز سے اُٹھ کر دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر ادب، سیاست، اقتصادیات، معاشرت، تمدن وغیرہ پر گرم ——— چائے سے زیادہ گرم گرم بحثیں کرنے لگے۔ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا تھا کیونکہ میں نہ ادیب تھا نہ لیڈر۔ نہ اقتصادیات کا ماہر اور نہ تمدن کا علمبردار۔ ایسی حالت میں اپنے لئے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ سب سے الگ ایک کرسی پر اخبار لیکر بہت ضرورت سے زیادہ سنجیدہ قسم کے انسان کی طرح بیٹھ جاؤں۔ حقیقت میں میری نگاہیں تو ضرور اخبار کی سیاہ سطروں پر جمی ہوئی تھیں لیکن کان سب کی گفتگو کی طرف لگے تھے۔ اخبار سے نگاہ اُٹھا کر جب میں نے دیکھا تو وہی شاعر صاحب میری طرف بیٹھے ایک لڑکی سے بہت ہی مزے سے باتیں کر رہے تھے۔ پتہ نہیں سیاست پر تبصرہ ہو رہا تھا یا ادب پر تنقید۔ لیکن میں نے کان کھڑے کئے تو گفتگو ہو رہی تھی:-

"آج بہت موڈ میں ہوں" (شاعر)

"لیکن آپ کس وقت موڈ میں نہیں ہوتے" (لڑکی)

"تم دیکھ لینا اسی موڈ میں ایکدن میری جوانی انقلاب کی نذر ہو جائیگی" (شاعر)

"مجھے ڈر ہے کہ اسی موڈ میں کہیں انقلاب خود آپ کی جوانی کی نذر نہ ہو جائے" (لڑکی)

مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ جتنا اس کمبخت کو روکنے کی کوشش کی اتنی ہی اس نے اور سرکشی شروع کر دی۔ "شاعر" چونک پڑا اس نے میری طرف دیکھا۔ شاعر گناہ سے نہیں بلکہ گناہ کے دیکھنے والوں سے ڈرتا ہے۔ اُسے میرا ہنسنا بہت ناگوار گزرا تھا۔ اور یوں وہ ہنسی تھی بھی اس تہذیب کے خلاف۔ "شاعر" نے میرے اُوپر حملہ کرنے کی ٹھان ہی لی۔ وہ مُڑ کے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"آپ ہنسنا بھی جانتے ہیں؟ معاف فرمائیے گا میں تو سمجھا تھا کہ ———

——— "شاعر" ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ وہ "صاحبزادی" بیچ میں بول اُٹھیں "تو کیا پھیکا منہ بنا کر اخبار پڑھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے۔"

"کل رشیدہ آپا کنن ڈرامہ سٹیج کر رہی ہیں، اور یہی حضرت اس میں ہیرو

---

[1] ڈاکٹر رشید جہاں۔

کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے "شاعر" پہلے "شاعر" سے مخاطب ہو کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"تو پھر ڈرامہ ٹریجڈی ہوگا"! پہلے شاعر نے برجستہ کہا۔ میں تلملا اُٹھا۔ جیسے کسی نے تیر مار دیا ہو —— میں کچھ جواب دینا چاہتا تھا مگر افسوس کہ "شاعر" میری کرسی کے پاس سے جا چکا تھا۔ اب وہ نوجوانوں کے ایک مجمع میں گھرا تھا۔

"بھئی جوز صاحب! کچھ سنایئے" لڑکے فرمائش کر رہے تھے۔

"ہاں ضرور" لڑکیاں تائید کر رہی تھیں۔

وہ شہر جس سے رخصت ہوتے ہوئے اودھ کے آخری تاجدار اختر نے کہا تھا ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

وہ شہر جہاں کی ایک تاریخی طبی کانفرنس میں کھڑے ہو کر حضرت سائل مرحوم (داغ کے داماد) نے کہا تھا ؎

دلّی کے جتنے لوگ ہیں مہمانِ لکھنؤ
ہیں اک سرے سے سارے ثنا خوانِ لکھنؤ
پیرانِ عہد روتے ہیں یہ گریہ ہے بجا
آتا ہے یاد سابقہ دورانِ لکھنؤ
وہ مٹ گئیں سب صورتیں خاک میں ملیں
دو چار باقی ہیں کہنہ وضعانِ لکھنؤ

اس شہر کی یوں تو ہر شام اپنے اندر دلکشی کی ایک خاص طاقت رکھتی تھی۔ لیکن وہ شام سب سے زیادہ دلکش تھی۔ اُس شام کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ جب سارا ہندوستان اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ۳۶ء کی ایک شام تھی۔ انیس، شرر، چکبست، آتش، ناسخ، سرور اور سرشار کو پیدا کرنے والی زمین پہ کچھ لوگ جمع تھے۔ وہ بیج جو ۳۵ء کو لندن کے ایک چھوٹے سے چینی ریسٹوران میں بویا گیا تھا اب وہاں پھوٹ رہا تھا جس کے لئے حضرت حالی نے فرمایا تھا ؎

اُردو کو راج چار سُو تیرا ہے — شہروں میں رُوح گو یہ کُو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی — تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی یہ پہلی کانفرنس تھی جس کی صدارت اُردو ہندی کے مایۂ ناز ادیب پریم چند نے کی۔ یہ وہ راگ تھا جو نہ صرف سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر علیم نے چھیڑا تھا۔ بلکہ جس آواز کی تائید ٹیگور، نہرو اور مولوی عبدالحق نے بھی بڑے پُر جوش طریقے سے کی تھی۔ ہماری اس کانفرنس میں جمع ہونے والے نئے ادیب جنہیں سر سید، شبلی، حالی، آزاد اور غالب کا سرمایہ ورثے میں ملا تھا ادب کو کسی نئی راہ پر لے جانا نہیں بلکہ زمانۂ حال کے مطابق اس میں رنگ بھرنا چاہتے تھے۔ ملک کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنا کر اس پر قلم اُٹھانا چاہتے تھے۔ "زندگی کی ترجمانی" کا نعرہ بلند کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا مقصد تھا کہ ادب کسی خاص طبقے کی ملکیت نہ ہو بلکہ عوام کے لئے ہو۔ اسی لئے اس کانفرنس کے اعلان نامے میں صاف صاف الفاظ میں کہا گیا ہے:

"نیا ادب ہندوستان کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے گا اور یہ ہے غلامی، بھوک، افلاس اور سماجی پستی" اس اعلان، اس تاریخی اجتماع نے ادیبوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کامستقبل کی طرف تھا اور دوسرا "سنہرے ماضی" کی بجائے "سیاہ مستقبل" کو دیکھ رہا تھا۔ ایک زندگی کی کھردری، تلخ، بد مزہ ٹھوس حقیقتوں کو عوام کے سامنے رکھ کر ان کو سمجھانے کی دعوت دینے کا شیدا تھا تو دوسرا انہی حقیقتوں سے فرار کا آرزومند۔ ایک کا نعرہ تھا "ادب برائے زندگی" تو دوسرا صاف کہہ رہا تھا "ادب برائے ادب" غرض دونوں اصول ٹکرائے۔ جنگ ہوئی اور خوب ہوئی۔ مگر یاد رہے کہ یہ جنگ، یہ ٹکر، یہ تصادم نئے اور پرانے ادیبوں کا نہیں بلکہ نئے اور پرانے اصولوں کا تھا۔ اس لئے اس کا نتیجہ بھی وہی نکلا۔ تاریخ ہر میدان میں اپنی ضرورت پوری کر کے رہتی ہے۔ چاہے وہ ادب کا میدان ہو یا اقتصادیات کا۔ سائنس ہو یا تمدن —— اسلئے ادب کے میدان جیسا ہی تاریخ نے اپنی ضرورت پوری کر کے چھوڑی۔ زندگی نے موت پر فتح پائی۔ نئی رُوح کے سامنے پرانی رُوح کو ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ نیا ادب پرانے ادب پر چھا گیا۔ ترقی پسند ادب نے رجعت پسند ادب کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اپنی شکست کو دیکھ کر وہ اور بھی گھبرا کر رونے اور چلانے لگے۔ بقول سجاد ظہیر صاحب کے "پرانے اداروں کے اجارہ دار محسوس کر رہے ہیں کہ ان کی کشتی میں سوراخ ہو گیا ہے اور وہ اب ڈوبنے سے نہیں بچ سکتی۔ اسی لئے وہ اور شور مچا رہے ہیں۔ حیرت تو اس بات پہ ہوتی ہے کہ اس شور، اس مخالفت، اس پروپیگنڈے کے بعد بھی ترقی پسند مصنفین کی یہ بڑھتی ہوئی تحریک "شامِ اودھ" کے لکھنؤ کی رومان پرور فضا سے نکل کر بنگال، بہار

تک ہی نہیں بلکہ پنجاب اور حیدرآباد دکن تک پہنچ گئی۔ بلکہ راس کماری سے لیکر کوہ ہمالیہ تک کی ادبی دنیا میں "ادب برائے زندگی" کا اصول مقبول ہونے لگا۔ ہر طرف سے یہی صدا آنے لگی۔ اُردو، ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تلگو، پنجابی غرض ہر زبان کے ادب میں یہ رجحانات چھا گئے۔

اُردو ادب کا ایک نیا شاندار دور شروع ہوا۔ ہمارے لکھنے والوں نے پُرانی کیچلی اتار پھینکی۔ "گل و بلبل" کے بجائے اب "جھونپڑے" ہماری اُردو شاعری میں آنے لگے۔ اسی دور میں ہندستان بھی سیاسی حیثیت سے بالغ ہو چکا تھا۔ آزادی کا دھندلا تصور گہرا ہو چلا تھا۔ آزادی کے سوال کے ساتھ ساتھ اب یہ بھی سوال ہر طبقہ اور ہر قوم میں اُٹھنے لگا تھا کہ آزاد ہندستان زور پکڑ رہا تھا۔ اگر ایک طرف طبقاتی شعور کی نشو و نما تیزی سے ہو رہی تھی تو دوسری طرف اقلیت کی قومیں بھی بیدار ہو رہی تھیں۔ ایک خاص احساس ان میں پیدا ہو چلا تھا۔ اور یہ سب مستقبل میں اپنے حقوق کی ضمانت چاہتی تھیں ——— سیاست زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اور ادب زندگی کا آئینہ۔ ظاہر ہے کہ جب ہندستان میں یہ انقلاب آیا۔ جب ہندستانی قوموں کی زندگی اور رجحانات میں ایک عظیم الشان تغیر ظہور پذیر ہوا تو ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُردو ادب میں بھی ایک انقلاب آیا۔ اُردو شاعری میں اس نئے دور کے شعرا نے حالی، آزاد، چکبست اور اقبال کے بنائے ہوئے حب الوطنی[1] کے تنگ دائرے کو توڑ دیا اور جوش نے وطنیت[1] کے بجائے بین الاقوامیت[2] کو اپنا مسلک قرار دیا۔ جوش حقیقت میں اس نئے کارواں کے میر ہیں جو اقبال کے بعد شروع ہوتا ہے۔

مجاز کی شاعری کا ستارہ جب ہمارے ادبی آکاش پر چمکا تو اس وقت چاروں طرف بادل ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ ترقی پسند شعرا "بین الاقوامی برادری" میں داخل ہو چکے تھے۔ مگر ساری دنیا کو بغیر ملکی و نسلی و مذہبی اختلاف کے امیر و غریب کے دو حصوں میں بانٹنے کا تصور بہت ہلکا اور دھندلا نظر آتا تھا۔ سرمایہ داری کے پُرانے گھُن لگے نظام سے عام بیزاری کا جذبہ ہر ترقی پسند شاعر کے کلام میں کچھ کم کچھ زیادہ صاف عیاں تھا۔ مگر ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ وہ اندھیری رات کے مسافر کی طرح بھٹک رہے تھے اسی لئے آگ، خون، انقلاب جیسے خوفناک الفاظ ضرور سنائی دیتے تھے۔ مگر ان میں صرف تخریب کے پیغام کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ لیکن مجاز اندھیری رات میں بھی اپنی منزل دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہاں وہ انقلابی شاعر ہے۔ وہ تخریب کا حامی ہے۔ مگر اسکی تخریب تعمیر کے لئے ہے۔ وہ اپنی عقابی نگاہوں سے تخریب کے سینے میں تعمیر کی مدھم سہمی ہوئی روشنی دیکھتا ہے۔ وہ پُرانی بوسیدہ حویلی کو گرا دینا چاہتا ہے۔ مگر اس لئے تا کہ اسکی بنیادوں پر نئی اور مضبوط حویلی تیار ہو ——— جب وہ حویلی گرانے چلتا ہے تو نئی حویلی کا نقشہ اُس کے ذہن میں محفوظ رہتا ہے۔ تخریب میں تعمیر کے حُسن کو دیکھنا اور دکھلانا حقیقت میں مجاز کا ہی حصہ ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

کوہساروں کی طرف سے سُرخ آندھی آئے گی
جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
سُرخ ہونگے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہونگے آتشیں ملبوس میں منظر تمام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونی سبق
آسمان پر خاک ہوگی، فرش پر رنگ شفق
اور اس رنگ شفق میں با ہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حُریّت کا آفتاب

مجاز ایک سرکش نوجوان شاعر ہے۔ وہ پانی کی نیلگوں سطح پر نظر ڈالتے ہی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اسکی تیز نگاہیں دھرتی کی سخت پتھریلی چھاتی کو چیرتی بہت دور تک چلی جاتی ہے۔ وہ کوئی راہ بھولا مسافر نہیں ہے۔ ہر طرف پھیلی اتھاہ تاریکی میں بھی بہت دُور مگر اُس کے سامنے ایک شمع جلتی رہتی ہے۔ وہ اس شمع کے نُور کو اور زیادہ تیز کرنا چاہتا ہے۔ تا کہ ظلمت و اندھیرے کا دور ختم ہو جائے۔ اس اندھیرے میں جہاں ہر طرف جنگ، بھوک، بیماری، فاقہ اور پستی کے علاوہ کچھ نہیں۔ جہاں ادب و فن پر بھی پہرے بیٹھے ہیں۔ جہاں بلند سے بلند فن کار کو چند چمکتے ہوئے سکّوں کے بدلے اپنا فن بیچنا پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک کسبی چند روپوں میں اپنی عصمت بیچتی ہے۔ عصمت بیچنے سے بڑا گناہ فن کا بیچنا ہے۔ شاعر کے پہلو میں اب صبر کرنے والا دل نہیں۔ اُس کے صبر کا پیمانہ اب بھر چکا ہے۔ وہ اس دُنیا سے عاجز آ چکا ہے۔ وہ نئی دُنیا آباد کرنا، ایک نئی بستی بسانا چاہتا ہے۔ وہ "نئی دنیا" آباد کرنے کے لئے انقلاب کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ بوڑھوں

(۱) Nationalism.
(۲) ~~inter~~ Nationalism.

ہے نہیں" نوجوانوں سے" مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

بہت لطیف ہوئے دوست تیغ کا بوسہ — یہی تو جانِ جہاں اس میں آب پیدا کر
شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے — تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر — جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

اردو شاعری میں بہت سی انقلابی نظمیں ملتی ہیں۔ بہت سی نظموں میں ہمارے شعراء نے سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ لیکن ہمارے اس نوجوان شاعر نے جیسے ستاروں پر کمند ڈالنے میں بہت لذت محسوس کی ہے۔ بہتر سرمایہ داری کی تعریف ہمیں اردو کی کسی نظم میں نہیں ملتی۔ بہت خوبصورت الفاظ سلیقے سے شاعر نے سجا کر رکھ دیئے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے مشہور فلسفی کارل مارکس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "سرمایہ"؎ میں جو کچھ لکھا شاعر نے اسے سیدھے سادھے الفاظ میں فن کی بلندی کو قائم رکھتے ہوئے کہہ دیا۔ کوئی بھونڈا لفظ استعمال نہیں کیا۔ لیکن کڑوی دوا شہد میں ملا کر مریض کے حلق سے اتار دی ؎

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمہیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
کہیں یہ ایک کی ہمدم کہیں لاکھوں کی دشمن ہے
کہ اس کے آہنی پنجوں میں مظلوموں کی گردن ہے
یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیت چھین لیتی ہے
یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے
ہمیشہ خون پی کر ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہے
زمانہ چیخ اٹھتا ہے یہ جب پہلو بدلتی ہے

سنا آپ نے؟ شاعر کہہ رہا ہے کہ سرمایہ داری کے پہلو بدلنے سے زمانہ چیخ اٹھتا ہے۔ جنگ کو ختم ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کا راج جسے ہم "فاشزم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سرمایہ داری کا پہلو بدلنا نہیں تو اور کیا تھا؟ منحوس ہٹلر کے جوتوں سے جب یورپ کچلا جا رہا تھا۔ ہاں تب صرف یورپ ہی نہیں دنیا چیخ رہی تھی۔ دنیا کا بچہ بچہ پکار رہا تھا۔ ہر مہذب انسان بلک رہا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ کا سارا نچوڑ، ساری طبقاتی کشمکش کا نقشہ چند اشعار میں کھینچ کر رکھ دینا ایک بڑے سمندر کو کوزے میں قید کرنا، طبقاتی لوٹ کھسوٹ کی تاریخ کو ایک شعر میں کہنا کوئی مذاق نہیں۔ یہ بہت ہمت کا کام ہے اور یہ ہمت مجاز کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اب سنئے "مسافر" اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ نام اس کا "مسافر" ہے مگر حقیقت میں وہ ایک "مجاہد" ہے جو ارتقا کی راہ میں حائل زنجیروں کو کاٹنے بڑھ رہا ہے۔ کام بہت سخت ہے۔ راستہ بھی کچھ سیدھا صاف نہیں۔ کہیں پر گل ہیں تو کہیں خار۔ کہیں آگ تو کہیں پانی۔ شاعر اس لئے اس سے نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

"کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے — قدم اپنے آگے بڑھائے چلا جا
حسیں بھی تجھے راستے میں ملیں گے — نظر مت ملا مسکرائے چلا جا
محبت کے نقشے تمنا کے خاکے — بنائے چلا جا مٹائے چلا جا"

ظاہر ہے کہ محبت کے نقشے اور تمنا کے خاکے کو بنانے اور مٹانے کا مشورہ دینا کسی بہت ہی چوٹ کھائے دل کا کام ہے۔ جو اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ اس راہ پر چلنے والے مسافر اگر ایسے نقشے اور خاکے بناتے اور مٹاتے نہیں تو اپنی منزل سے بہت دور ہو جاتے ہیں اور انقلاب کی منزل پر پہنچنے کی بجائے پریم نگر کی سیر میں پڑ کر اپنا مقصد قربان کر دیتے ہیں۔ اب آگے چلئے اور سنئے کہ شاعر اور کیا کہتا ہے معشوق کے گھر کی چوکھٹ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مرنا بہت زیادہ اچھا ہے ؎

بات تو جب ہے کہ مر جا عرصہ گاہِ رزم میں
اس پہ دم دینے سے کیا اور اس پہ دم دیتے سے کیا

ایک قدم اور آگے ؎

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

ابھی تک شاعر نوجوانوں، سرفروشوں، مجاہدوں سے مخاطب تھا اب وہ خاتون سے کیا کہتا ہے۔ یہ بھی ذرا دل تھام کر سنئے ؎

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے — تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
عیاں ہیں دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبے — انہیں تو رنگِ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا
اثر باقی نہیں مفلوج پیروں کی دعاؤں میں — جوانانِ بلاکش کی دعا لیتی تو اچھا تھا

رومان اور انقلاب ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ رومانی اور انقلابی شاعری

؎ Capital

بہت فرق ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے۔ مگر مجازؔ کی شاعری پر نظر ڈالتے ہی یہ حقیقت بالکل باطل ہو جاتی ہے۔ وہ انقلابی اور رومانی شاعر ایک ساتھ ہے۔ وہ انقلاب اور حسن و محبت میں تضاد کا قائل نہیں۔ انقلاب خود ایک حسن ہے۔ محبت کا نتیجہ انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ آگ لگانے اور بجھانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت کا خود اُسے اعتراف بھی ایک جگہ کرنا پڑا ہے ؎

"آ آ کے ہزاروں بار یہاں ، خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے ، یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے"

نہ صرف علی گڑھ بلکہ پورے ملک میں ہر دل میں وہ اپنی شاعری سے آگ لگانے اور بجھانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ صرف یہ چند شعر پڑھ کر ہی آپ کے دل میں آگ لگ گئی ہوگی۔ اب یہ اور بات ہے کہ آپ اُسے ہم پر ظاہر نہ کریں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آئیے اب اپنی آگ کو ٹھنڈا بھی کر لیجئے ؎

تجھ سے مت پوچھ ترے عشق میں کیا رکھا ہے
سوز کو ساز کے پردے میں چھپا رکھا ہے
جگمگا اٹھتی ہے دنیائے تخیل جس سے
دل میں وہ شعلۂ جاں سوز دبا رکھا ہے

شاعر کے پہلو میں دل ہے اور دل میں محبت بھی۔ اگر آپ اسکی محبوبہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم کرنے کے لئے بہت بے چین ہیں تو بس آپ کے لئے اتنا کافی ہے ؎

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اس کی

ہاں! ایک بات تو بتائیے کہ کیا محبت کرنا جرم ہے؟ نہیں — لیکن پھر بھی محبت تک پر ہماری سماج نے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ محبت کو بھی رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ پہرے، یہ زنجیریں، یہ پابندیاں ہمارے شاعر پر بھی لگی ہیں ؎

نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اُس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اُس کو پوجتا ہوں اور اُس کو پا نہیں سکتا

یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا"

اب ایک بار پھر کلیجہ تھام کر بیٹھئے ؎

رودادِ غمِ اُلفت اُن سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے
اربابِ جنوں پہ فرقت میں اب کیا کہئے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے
یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھکو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

زخمی شاعر اپنے زخم پر مرہم رکھنا چاہتا ہے تاکہ اگر زخم نہ بھرے تب بھی کچھ سکون تو مل جائے۔ [illegible] میں "میخانے" کے علاوہ شاعر کے زخموں کو وقتی سکون اور کہیں حاصل نہیں ہو سکتا۔ شاعر میخانے کی طرف چلتا ہے۔ لیکن "میخانے" "کاشانے" اور پھر "ویرانے" میں چلنے کا مشورہ بھی تاریکی مجاز کو دے رہی ہے۔ میخانے، ویرانے، کاشانے میں کون سب سے اچھا ہے۔ شاعر اس کا فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے اور وہ اپنے شوخ دل سے مشورے کا طالب ہے ؎

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ابھی تک تو شاعر دل سے پوچھ رہا تھا کہ کیا کروں؟ مگر اب اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا ہے کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ سماج میں آج کیا ہو رہا ہے؟ اِدھر اُدھر دیکھئے، سوچئے اور سمجھے بغیر دولت کے آستانوں پر کس بری طرح انسانیت قربان کی جا رہی ہے۔ انسانیت دولت کے بوجھ سے دبی جا رہی ہے۔ ٹیگور، جگدیش چندر بوس، پی سی رائے کا وطن پچھلے سال بری طرح اجڑا۔ کلکتے کی سڑکوں پر لوگوں نے دم توڑا۔ انسانیت کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکالا گیا۔ اور دوسری طرف منافع خور، ذخیرہ باز عوام کو لوٹتے رہے ہیں۔ ایک طرف دولت کے انبار لگتے گئے تو دوسری طرف انسانیت سسکتی رہی ؎

ابھی تہذیب عدل و حق کی کشتی کھے نہیں سکتی
ابھی یہ زندگی دادِ صداقت دے نہیں سکتی
ابھی انسانیت دولت سے ٹکرلے نہیں سکتی

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

اب وہ آخر غمِ دل اور وحشتِ دل سے کیوں پوچھے۔ اب تو وہ اپنا فرض سمجھ چکا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس لئے وہ اپنے "دوست سے" کہہ رہا ہے ؎

"کوئی دم میں حیاتِ نو کا پھر پرچم اٹھاتا ہوں
بہ ایمائے حمیتِ جان کی بازی لگاتا ہوں
میں جاؤنگا میں جاؤنگا، میں جاتا ہوں میں جاتا ہوں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر"

اللہ اللہ وہ عزم رکھیئے۔ "حیاتِ نو" کا پرچم اڑانے کے لئے "جان کی بازی لگانا" ضروری ہے اور جان کی بازی لگانے کے لئے آہنی عزم و استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنی بیباکی، رعنائی اور دلفریبی کے ساتھ الفاظ سے کھیلنا اُسے پشکن سے ملا دیتا ہے۔ پشکن نے ترانۂ آزادی میں جو جوشش، ولولہ، جذبہ ہمیں محسوس ہوتا ہے اس سے کہیں کچھ زیادہ "سرمایہ داری"، "اندھیری رات کا مسافر"۔ "ہمارا جھنڈا"۔ "ایک جلا وطن کی واپسی"۔ "انقلاب" اور "مزدور" کے پڑھنے سے قلب پر طاری ہوتا ہے، گولیوں کی سنسناہٹ تلواروں کی جھنکار، توپوں کی گرج خود بخود ہمیں سنائی دینے لگتی ہے۔ فطرت نے اُسے ایک جینیس، مُردہ ملک میں پیدا کرکے اس پر جو ظلم کیا ہے وہ کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کاش مجاز مشرق کے بجائے مغرب میں پیدا ہوتا۔ کاش وہ اُردو کے بجائے انگریزی کا شاعر ہوتا!

چراغ کے نیچے اندھیرا رہنا بھی قدرت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔ دوسروں کی پیاس بجھانے والے کبھی اپنی پیاس نہیں بجھا سکے۔ جب بھی کسی پر اجتماعی محبت کا سودا سوار ہوا اُسے ہمیشہ اپنی انفرادی محبت اُس پر قربان کردینا پڑی۔ ہمارا شاعر بھی وہ ساقی ہے جس نے پوری محفل کو جام دیئے مگر خود جام لینا بھول گیا۔ شاعر کا کلام پڑھکر سب جھوم اُٹھے۔ کسی نے کہا "بھئی خوب کہا"۔ کسی نے فرمایا "مجاز تم نے کمال کردیا"۔ "کسی نے لکھا "مجاز نے قلم توڑ دیئے"۔ کوئی جھوما، کوئی ناچا، کوئی گنگنایا اور کوئی مُسکرایا۔ مگر حضرت مجاز پر کیا گزرتی ہے، یہ کوئی کیا جانے۔ اب اسے پھر کہنا ہی پڑتا ہے ؎

"سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے"

اس کا اثر یہ ہوتا ہے ؎

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

جب لطفِ بہاراں چھوٹے پھر بھلا دلّی میں رہنا کیا معنی؟ شاعر دلّی سے واپس ہوتا ہے ؎

رخصت اے دلّی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں، نالہ بہ لب جاتا ہوں میں
تیرا دل دھڑکا چکے ہیں میرے احساسات بھی
تیرے ایوانوں میں گونجے ہیں مرے نغمات بھی
دل میں سوزِ غم کی اِک دُنیا لئے جاتا ہوں میں
آہ تیرے میکدے سے بے پئے جاتا ہوں میں

مجاز ایک شاعر ہونے کے علاوہ ایک مجرم بھی ہے۔ ہر بلند پایہ خوددار فن کار مجرم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بھی مجرم ہے اور اُسے اپنے جرم کی سزا وہ مل رہی ہے جو کیٹس کو ملی تھی۔ فن کار کبھی زنجیروں کی گرفت کو برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ آزاد فضا میں ایک طائر کی طرح پرواز کا آرزومند ہوتا ہے کیا نوکری زنجیر نہیں؟ مجاز نے ایک بار پھر زنجیر توڑی۔ مگر دہلی کی لائبریری چھوڑنے کے بعد اب اُسے لکھنؤ کی جگمگاتی، بھاگتی سڑکوں پر آوارہ پھرنا پڑتا ہے۔ ہماری سماج ہمارے شاعر سے انتقام لے رہی ہے۔ اور کچھ ایسا محسوس ہورہا ہے کہ اس شاعر کی موت بھی کیٹس کی طرح ہوگی۔ ہمارا یہ فن کار عوام کی تخیل کی پرواز سے بہت بلند ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو اس کی ذاتی زندگی سے بہت شکایت ہے۔ مگر یہ شاعر کی نہیں، ان لوگوں کی بھول ہے جو شاعر کو اپنے اصول کی ترازو پر تولتے ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ ہمارے دوست مجاز کو غور کر دیکھیں اس کو سمجھنا اتنا آسان نہیں جیسا کہ ہم اکثر سوچتے ہیں۔ اس کی زندگی شاندار ہے اور یقیناً اس کی موت اُس کی زندگی سے بھی شاندار ہوگی۔ آج وہ "رسوا" کی موت مرے گا لیکن کل نہ صرف اُس کا کلام زندہ رہے گا بلکہ اس کی ذاتی زندگی پر بھی آئندہ کی نسلیں تحسین و آفرین کے پھول چڑھائیں گی۔ کیونکہ مجرم وہ نہیں بلکہ سماج ہے۔

حضرت مجاز پر یہ مختصر سا مضمون جسے پڑھکر مجاز کی شاعری کو سمجھنا ناممکن ہے۔ میں سجاد ظہیر صاحب کا یہ قول نقل کرکے ختم کرونگا کہ "مجاز کے کلام پر تبصرہ کرنا ظلم ہے ——— آپ خود مجاز کا کلام پڑھکر اپنی رائے قائم کیجئے۔"

———— ※ ————

کُتب خانہ کا صحیح استعمال

(از فصیح الدین احمد ایم۔ اے)

کتاب کو ہر پڑھے لکھے آدمی کا بہترین مونس، غمخوار، معتبر اور دوست سمجھا جاتا ہے۔ کتاب سے انسان کی خوشی دوبالا ہوتی ہے اور رنج کم ہوتا ہے۔ کتاب کی تاریخ انسانی تہذیب کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ کتاب کو موجودہ شکل میں لانے کے لئے انسان کو کتنی جد و جہد کرنی پڑی اور کن کن مراحل سے گزرنا پڑا، اس کی مختصر کیفیت کتاب کی عظمت و شان اور اس کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتی ہے۔

انسان کو ادراک اس وقت حاصل ہوا جب اس نے عقل حیوانی سے آگے بڑھ کر اپنی ضروریات زندگی کو گرد و پیش کی چیزوں سے حاصل کرنے کے لئے نئے نئے طریقے اختیار کئے۔ مثلاً شیر کو جب بھوک لگتی ہے تو وہ آبادی کی طرف رخ کرتا ہے۔ اور انسان یا جانور جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، کھا کر چلا جاتا ہے۔ اس کے پنجے اور دانت اس کے لئے چھری کانٹے کا کام دیتے ہیں۔ انسان کو بھی جب بھوک لگتی تھی تو وہ پتوں اور جنگلی میووں کو کھا کر گذارہ کرتا تھا۔ انسان نے درندوں سے گوشت خواری سیکھی۔ بھیڑ، بکری، اونٹ جو اس کو مل جاتا اسے نوکدار پتھروں یا لکڑیوں سے مار ڈالتا تھا لیکن گوشت کو پوست سے علیحدہ کرنے کے لئے کسی زیادہ تیز چیز کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے اس نے دھات کی طرف رجوع کیا اور چھری ایجاد ہوئی۔ غرض اس طرح انسان نے تمام خارجی ضرورتوں اور مشکلات کا حل دریافت کیا۔

انسانی تہذیب کی تاریخ پتہ دیتی ہے کہ انسان نے اپنی یادداشت کے لئے شروع میں درختوں، پتھروں اور چٹانوں پر مختلف قسم کے نشانات بنانے شروع کئے۔ یہی تحریر کا آغاز تھا۔ رفتہ رفتہ ان نشانات نے تصویروں کی شکل اختیار کر لی۔ بعد میں مسلسل تصویروں کے ذریعے واقعات کا اظہار ہونے لگا۔ جانوروں، عورتوں، بچوں، میوہ دار درختوں کے شمار کرنے کی وجہ سے گنتی کا آغاز ہوا۔ اب دھات کے ٹکڑے، درختوں کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں پر نشانات لینے شروع ہوئے۔ پھر انسان کو یہ شوق پیدا ہوا کہ جو باتیں اس نے عقل اور تجربہ کی بنا پر دریافت کی ہیں انہیں اپنے اہل و عیال اور قبیلے کے واسطے کسی شکل میں محفوظ کرے۔ چنانچہ کھیتی باڑی کرنے، شکار کھیلنے اور بیماروں کی دیکھ بھال کرنے سے جو وقت باقی بچتا اسے وہ تجربوں پر صرف کرتا تھا۔ جب لوگوں نے مکان بنانے شروع کئے تو مکانوں کے در و دیوار، مندروں کی مورتیوں اور عبادت کی دیواروں پر کسی نوکیلی چیز سے نشانات بنانے لگا جو رفتہ رفتہ اس قدر عام فہم ہو گئے کہ قبیلے کے سب لوگ ان کا مطلب سمجھنے لگے۔ غرض لکھنے پڑھنے کی ضرورتوں کے اضافہ کی وجہ سے کاغذ ظہور میں آیا اور کتابیں لکھی جانے لگیں۔ لیکن چونکہ چھاپہ خانے نہ تھے اس لئے کتابوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اور صرف مالدار آدمی ہی کتابیں لکھوا سکتے یا خرید سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ زمانہ وسطیٰ میں جسے انگریزی میں (Middle Ages) کہتے ہیں تعلیم عام نہ تھی بلکہ مذہبی اور متمول فرقوں تک محدود تھی۔

سترہویں صدی عیسوی میں چھاپے خانے کا ظہور ہوا۔ کہتے ہیں پہلی بار کتاب چین میں شائع ہوئی اور پھر جرمنی، اٹلی اور فرانس میں بھی پریس کا آغاز ہوا۔ اور اس طرح تعلیم مخصوص طبقوں کی میراث سے نکل کر اوسط درجہ کے لوگوں میں پھیلنی شروع ہوئی۔ کتابوں کی طباعت کے ساتھ ساتھ مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی اضافہ ہوا۔ اور تعلیم کو زیادہ مقبول بنانے اور فروغ دینے کے لئے کتب خانوں کا آغاز ہوا۔ درسی کتابیں اکثر طلبا خرید لیتے ہیں۔ مگر کالج اور یونیورسٹی کے طلباء صرف درسی کتابوں پر اکتفا نہیں کر سکتے بلکہ امدادی کتابوں کا مطالعہ بھی اُن کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کتب خانے قائم کئے جاتے ہیں۔ جہاں ہر شعبہ کی تعلیم پر اچھی سے اچھی کتابیں بکثرت مل سکتی ہیں۔ اور ہر طالب علم ان سے مستفید ہو سکتا ہے۔

اسی طرح مختلف لوگوں کی مختلف ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف قسم کے کتب خانے قائم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً وکیلوں کے لئے قانونی کتب خانہ۔ دستکاروں اور صناعوں کے لئے صنعت و حرفت کی کتابوں کا کتب خانہ۔ ماہرین طب اور جراحی کے لئے میڈیکل کتب خانہ وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں ہر گاؤں، قصبہ، شہر یا صوبہ میں پبلک کتب خانے بھی ہوتے ہیں۔ جن کو آبادی کی ضرورت کے لحاظ

سے قائم کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کا معیار مقامی ضرورت پر مبنی ہوتا ہے۔
کتب خانوں میں اخبارات اور رسائل بھی ملتے ہیں مگر یہ ایک
ضمنی شے ہے کیونکہ ریڈنگ روم یا اخباری مطالعہ بھی کتب خانوں کا
ایک جزو بن گیا ہے۔ مختلف زبانوں، صوبوں اور ملکوں کے اخبارات
اور رسالہ جات کو بھی اسی لئے جمع کیا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنی ضرورت
کے مطابق اُن سے فائدہ اُٹھا سکے۔

جس طرح آج ہر مسلح قوم کو Atom Bomb کے نسخہ
کی ضرورت لاحق ہے اس سے کہیں زیادہ ہر لکھے پڑھے آدمی کو ایک
اچھے کتب خانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر پیشے اور حرفے کا آدمی وہاں
جاکر اپنی عملی جستجو کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ مختلف قسم کی ضرورتوں کو پورا
کرنے کے لئے لوگ کتب خانے جانے پر مجبور ہیں۔ علاوہ ازیں جن لوگوں
کو کسی پیشے یا حرفے سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا وہ بھی اپنا خالی وقت نظم
نثر یا افسانوں کو پڑھکر گزار دیتے ہیں۔ پھر ایسے فن بھی ہیں جو شوقیہ
باغبانی۔ فوٹوگرافی۔ زراعت Mechanism کتوں کی
دیکھ بھال۔ موٹروں کی خورد پرداخت۔ مکان کی سجاوٹ۔ بچوں کی تربیت۔
تقریر کا فن۔ ہسٹری وغیرہ کے سیکھنے کے لئے کتب خانے جاتے ہیں۔
غرض موچی اور دھوبی سے لیکر وائسرائے اور شہنشاہ ہند یا بادشاہ تک
ہر شخص کتب خانوں کا محتاج ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہندستان کی
تعلیمی حالت بہت پست ہے اس لئے یہاں اچھے کتب خانے
کافی تعداد میں موجود نہیں۔ لوگ ذاتی عزت اور حشمت کی خاطر لاکھوں
روپے بے دریغ خرچ کر دیتے ہیں لیکن علمی اور ادبی اداروں کی سرپرستی
نہیں کی جاتی۔ اگر کہیں خال خال کچھ لوگ نظر آتے ہیں تو وہ کسی خارجی
وجہ سے متاثر ہوکر ادبی یا علمی اداروں کی امداد کرتے ہیں۔ علمی اداروں
کی امداد صرف علم کے قدردان ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن جب ملک میں
تعلیم یافتہ آدمیوں کی تعداد صرف بارہ فی صدی ہو اور جبکہ یہ بارہ فی
صدی بھی متوسط درجے کے لوگ ہوں تو علمی اداروں کی امداد کس طرح ہو سکتی
ہے؟ لہذا نتیجہ ظاہر ہے۔

تعلیمی کمی کا گلہ اہل ملک حکومت سے اور حکومت اہل ملک سے
کرتے آئے ہیں لیکن جب تک دونوں طرف سے تعاون کی باہم کوشش نہ
کی جائے یہ خامی دور نہیں ہو سکتی۔ ہارڈنگ لائبریری دہلی کا سکریٹری ہونے
کی وجہ سے مجھے اکثر غیر ملکی حضرات کو لائبریری میں خوش آمدید کہنے کا موقع
ملا۔ یہ لوگ امریکہ۔ انگلستان۔ فرانس اور دیگر یورپین ممالک کے
سربرآوردہ حضرات ہیں ہوتے تھے۔ دہلی کو ہندستان کا پایۂ تخت سمجھ کر اور
لال قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار اور نئی دہلی کی سیر کرنے کے بعد ان کا
یہ خیال ہوگا کہ اس تاریخی شہر کا کوئی کتب خانہ بھی ہندستان بھر میں
ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہوگا۔ شاید ان کی حیرت حق بجانب ہوتی مگر
چونکہ وہ ایک سرکاری لائبریری۔ ایک یونیورسٹی لائبریری اور چند دیگر
پبلک کتب خانوں کو دیکھتے ہوئے آئے تھے۔ بظاہر انہوں نے
کسی مزید حیرت کا انکشاف نہیں کیا

جس طرح چند بلدیوں کی گرہیں جمع کرکے جہاز بنایا ہی نہیں بن سکتا
اسی طرح چند ہزار کتابوں سے ایک پبلک لائبریری لائبریری نہیں بن سکتی۔ لائبریری
بنانے کے لئے خاص خاص باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً اس کی وسیع
اور کشادہ عمارت جس میں ہوا اور روشنی کا انتظام ہو۔ جس کا محل وقوع خاموش
مگر ستھری اور صاف جگہ ہو۔ جس میں گرمی اور سردی سے بچنے کے لئے
انتظامات مکمل ہوں اور جس میں مناسب فرنیچر اور کارآمد اور منتخب
کتابوں کا ذخیرہ موجود ہو۔

بہرحال اگر صحیح معنوں میں ایک اچھی لائبریری موجود ہو تو اس کے
استعمال کے لئے بھی چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً کتاب
بلا ضرورت نہ لیا جائے یا کتاب کو ضرورت ختم ہونے کے بعد فوراً واپس
کر دیا جائے۔ کتاب کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ اس میں داغ
دھبے نہ لگیں اور اس کے صفحات کو موڑا نہ جائے۔ نہ اس پر پنسل سے
نشانات لگائے جائیں۔ بعض صورتوں میں لائبریری سے کوئی شخص کتاب
حاصل کر لیتا ہے مگر خود پڑھکر کسی دوست کو دیدیتا ہے، جو کتاب کو احتیاط
احتیاط سے استعمال نہیں کرتا اور کتاب خراب ہو جاتی ہے یا کھو جاتی ہے
مگر بعض اہم کتابیں دوبارہ دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ کتاب کو وقت مقررہ سے
ہرگز نہیں رکھنا چاہیئے کیونکہ عموماً اور پڑھنے والے اس کے انتظار میں رہتے
ہیں۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ دو کتابیں منتخب کرنے
لئے جب تک دو دو کتابیں کھلوا کر نہیں دیکھ لیتے انہیں چین نہیں آتا۔ ایسا
کرنے سے وہ لائبریری کا اور خود اپنا وقت بھی ضائع کرتے ہیں اور
پڑھنے والے اس حرکت کے ختم ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ بعض صورتوں
اگر لائبریری کے قواعد کے مطابق صرف دو کتابیں ایک وقت میں ملتی
ہیں تو لوگ ایک وقت میں چار کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں

بعض صاحبان محض اس لئے لائبریری کے ممبر بنتے ہیں کہ چند اچھی اور قیمتی کتابیں حاصل کرکے گھر میں چپ چاپ بیٹھ جائیں اور تقاضوں کے باوجود کتابوں کو واپس کرنے کا نام نہیں لیتے۔ بعض حضرات لائبریری میں کتابیں لینے جاتے ہیں مگر وہاں جاکر دوسرے ممبروں سے کسی بات پر اُلجھ پڑتے ہیں۔ بعض صاحبان اپنے کتوں اور چھوٹے بچوں کو لیکر لائبریری جاتے ہیں۔ کتے بھونک بھونک کر اور بچے رو رو کر دوسروں کا ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اکثر آدمیوں کا یہ اصرار ہوتا ہے کہ ہر نئی کتاب جو لائبریری میں آتی ہے پہلے اُن کو ملتی رہے۔ مگر یہ تمام باتیں قابلِ اعتراض ہیں اور ایک پڑھے لکھے آدمی کو ان باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

یہ چند باتیں وہ تھیں جو کسی شخص کو لائبریری میں نہیں کرنی چاہئیں، مگر کرتے ہیں۔ اب میں آپ کے سامنے وہ باتیں بیان کرتا ہوں جن کے پورا ہونے کی توقع ہر شخص ایک اچھی لائبریری سے کرسکتا ہے۔

ہر اچھی لائبریری میں مضامین کے اعتبار سے اور نیز مصنفوں کے اعتبار سے card catalogues ہوتی ہیں اور پھر اکثر جگہ مضامین کے اعتبار سے ترتیب دی ہوئی مطبوعہ فہرستیں بھی ہوتی ہیں۔ آپ خود لائبریری جاکر بغیر وقت ضائع کئے کاغذ کے ایک پرچہ پر مطلوبہ کتاب کا نام اور نمبر نوٹ کرکے لائبریرین کو دیکر پانچ منٹ میں کتاب حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی خاص موضوع پر کتاب درکار ہے تو ایسی صورت میں فہرستوں کو الٹ پلٹ کئے بغیر براہ راست لائبریرین سے مشورہ طلب کرنا چاہیئے۔ لائبریرین اپنی لائبریری سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ وہ آپ کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی خاص مضمون پر کوئی نئی کتاب لائبریری میں موجود نہ ہو، ایسی صورت میں وہ کسی دوسری اچھی لائبریری سے کتاب منگا کر آپ کو دے سکتا ہے۔ اگر کتاب جلد درکار نہ ہو اور عام دلچسپی کی اچھی اور مفید کتاب ہوگی تو آرڈر دیکر ایک معینہ عرصہ میں وہ کتب فروشس سے بھی آپ کے لئے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اصل میں ایک اچھی لائبریری کی کتابوں کا انتخاب اس کی انتظامیہ کمیٹی پر نہیں بلکہ خود اس کے پڑھنے والوں پر منحصر ہوتا ہے۔ اور یہ ہر پڑھنے والے کا حق ہے کہ وہ کتابوں کے سلسلے میں اپنی تجویزیں لائبریرین کے پاس بھیجتا رہے۔ اگر آپ کی تجویزیں بلند یا دلچسپ ہیں اور وہ کتابیں حاصل ہوسکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لائبریری میں اُن کو خرید کر نہ رکھا جائے۔

بعض قیمتی یا Reference کی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کا مطالعہ صرف لائبریری میں کیا جاتا ہے۔ اُس کو گھر لے جانے کی کوشش بیکار ہے۔ البتہ اگر آپ چاہیں تو وہ کتابیں آپ کو لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کے لئے مل سکتی ہیں۔ اور آپ اُن میں سے ضرورت کی باتیں نوٹ کرسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتا ہوں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک ممتاز افسر نے اپنے ماتحت کو ایک کتاب لائبریری سے مانگ کر مطالعہ کے لئے دی۔ وہ کتاب ہندستان بھر میں کسی جگہ مطبوعہ شکل میں موجود نہ تھی۔ چند ماہ گذرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان حضرت نے اس کتاب کو مطالعہ کے لئے نہیں بلکہ چھاپنے کی غرض سے حاصل کیا تھا۔ چنانچہ ایک مقامی پریس سے انہوں نے اس کی دو ہزار جلدیں شائع کرا ڈالیں۔ اسے چوری نہیں بلکہ سینہ زوری کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ رد و کد کے بعد دو ہزار مطبوعہ جلدوں کو قانوناً لائبریری کے حق میں ضبط کرلیا گیا۔

ہر لائبریری آپ کی خدمت کے لئے قائم ہے مگر شرط یہ ہے کہ آپ اس سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ اس کی ہر کتاب پبلک کے استعمال کے لئے جمع کی گئی ہے۔ مگر آپ تنہا اس کے وارث بننے کی کوشش نہ کریں۔

(منشور از نشرگاہ دہلی)

جگر کے کلام میں تخئیل کا عنصر

(از جناب افتخار احمد صفدر مخدومی بی اے (آنرز))

حقیقت کائنات کے ادراک کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک عقلی اور ایک وجدانی۔ سائینس داں اور فلسفی جس حقیقت کو سینکڑوں تجربوں اور عقلی موشگافیوں کے ذریعہ سے دریافت کرتا ہے ایک صوفی اور شاعر اپنے روحانی قوی کی بدولت سائینس کے آلات اور کسی قسم کی مادی امداد کے بغیر اسی حقیقت کا ادراک اپنی روح میں کر لیتا ہے۔

حقیقی شاعر ابتدا میں حُسن ظاہر کی پرستش اور تعریف و توصیف میں محو رہتا ہے لیکن بعد میں ضرور وہ ایک ایسے مقام پہ پہنچ جاتا ہے جہاں اسے حُسن کی پس پردہ حقیقت یا جسے حُسن کی اصل ماہیت کہنا چاہیئے محسوس ہونے لگتی ہے جُسن کے مظاہر کو پوجنا پوجتا یہ بت پرست واقعی ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں پر اسکو یہ ظواہر کم اہم نظر آنے لگتے ہیں۔ اور وہ انکی بنیادی حقیقت کی اہمیت کا احساس کر لیتا ہے۔ وہ رنگ و بُو کی بھول بھلیوں ہی میں پھنس کر نہیں رہ جاتا بلکہ ان کے پس پردہ کار فرما حقیقت پر پہنچ جاتا ہے۔ البتہ بہت سے شاعر تمام عمر "رنگ و بُو" کے طلسم ہی میں گرفتار رہتے ہیں اور حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔

تجربہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر شاعر کو ضرور ان دو مختلف دُنیاؤں میں زندگی گزارنا پڑتا ہے اور یہ اس کی رُوحانی ترقی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ انگریزی میں ہم دیکھتے ہیں کہ شیکسپیئر بھی ابتدا میں اسی ظاہر پرستی کا شکار رہا ہے۔ اس کی ابتدائی نظموں میں عریانیت تک نمایاں ہے۔ جیسے (Venus and Adonis) وینس اور ایڈونس سے ظاہر ہے لیکن بعد میں جلد ہی وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں کہ اس نے اپنے آپ کو اس طلسم سے آزاد کر لیا۔ اور فطرت اور اس کے اسرار کے انکشاف میں مصروف ہو گیا۔

جگر بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ابتدا میں اس کی شاعری بھی اس وجود پرستی کی حامل نظر آتی ہے لیکن جوں جوں اسکی شاعری ترقی کرتی جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے لئے ایک فلسفۂ حیات پیدا کر لیتا ہے اور اپنے اشعار میں اپنے اس فلسفہ کا اظہار کرتا ہے۔ ہم اس کی واردانی شاعری سے اس قدر موثر ہو چکے ہیں کہ ہمیں خیال تک بھی نہیں آتا کہ جگر ایک اعلےٰ شاعر ہونے کے علاوہ ایک اعلےٰ مفکر بھی ہے۔

تاہم ہم جگر کو اس وجود پرستی سے اس قدر آلودہ نہیں پاتے جس قدر بعض دوسرے شاعر ہیں۔ ظواہر حسن کے ساتھ اس کی یہ وابستگی بھی اپنے اندر ایک خاص لطافت رکھتی ہے۔ وہ کیٹس (Keats) کی بجائے شیلے (Shelley) سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اُسے ابتدا ہی سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وجود سے یہ وابستگی بذات خود مقصد نہیں بلکہ کسی مقصد کے حصول کا ایک لازمی ذریعہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

جہانِ حسن سے تکمیل تشنگی کر لے
ابھی نظر سے نہ یہ پردۂ سراب اُٹھا

اُسے معلوم ہے کہ یہ محض سراب ہے۔ لیکن وہ اس پردۂ سراب کو دور نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس کی روحانی ترقی کی منزل میں یہ بھی ایک ضروری مرحلہ ہے مندرجہ بالا شعر سے شاید کوئی صاحب یہ سمجھ بیٹھیں کہ جگر تمام سلسلہ کائنات ہی کو سراب قرار دیتا ہے۔ ہرگز نہیں ——— اگر ایسا ہوتا تو میں جگر کو ایک مفکر نہ کہتا بلکہ اُسے نقالوں کے اُس زمرہ میں شمار کرتا جو اہل ہمہ اوست کے چند خیالات مستعار لیکر نظم کر دیتے ہیں اور بزعم خود بڑے صوفی اور فلسفی بن بیٹھتے ہیں۔ جگر ان نیشن ایبل روحانیوں میں نہیں وہ ایک اعلیٰ مفکر (Original thinker) ہے۔ سلسلۂ کائنات کے متعلق وہ کہتا ہے ؎

سمجھ سوچ کر پاؤں آگے بڑھانا — حقیقت ہے دُنیا کہانی نہیں ہے

وہ حُسن اور ظواہر حُسن کو مترادف قرار دینے کو خراب کہتا ہے۔

جگر کا مابعد الطبیعاتی نظریہ اقبال کی طرح بالکل اسلامی ہے۔ دونوں میں میری نظر میں صرف یہ فرق ہے کہ اقبال جس چیز کو علم الاخلاق کے لباس میں ظاہر کرتا ہے اُسی کو جگر آرٹ کا لباس پہناتا ہے۔ ایک کا نقطۂ نظر اخلاقی اور فلسفیانہ ہے تو دوسرے کا محض فنی (Artistic) دونوں کے نزدیک "فلسفہ سنجیٔ علل این ہمہ وحشت و ملل" کے سوا کچھ نہیں۔ حقیقت کائنات کا ادراک روح کائنات کے ساتھ ایک وجدانی تعلق ہی قائم کرنے سے ہو سکتا ہے۔ دونوں کے نزدیک کائنات ایک ٹھوس حقیقت ہے فریب نظر نہیں۔ جہاں اقبال کہتا ہے ؎

طرح انسان جو صحیح معنوں میں بیدار ہے دونوں مصروف ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی ممد و معاون ہیں۔ جو انسانی بدھیں اس بہاؤ کے خلاف کشتیٔ حیات کو چلا رہے ہیں اُن کے سفینے اپنی تباہی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور جو اس بہاؤ کے ساتھ ساتھ ہیں وہ اپنے لئے زندگیٔ دوام کا انتظام کر رہی ہیں۔ ان کے ارتقا کو موت بھی نہیں مٹا سکتی۔

مگر اپنے گرد و پیش کے حالات سے بھی غافل نہیں۔ اس کی رومانی شاعری زندگی سے گریز کا ایک بہانہ نہیں۔ وہ زمانہ حال کے تُرش حالات کو دیکھتا ہے اور اُن سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ قدرتی طور پر رجائی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نوع انسان کے درد کو محسوس ہی نہیں کرتا۔ وہ ابنائے وطن کی مصیبتوں سے بھی غافل نہیں۔ دستِ غیر کے ظلم سے بھی ناواقف نہیں۔ مفسدہ پرداز مصلحین کے فریبوں سے بھی آگاہ ہے۔ دیکھئے اپنے گرد و پیش کے حالات کا نقشہ کتنے خوبصورت، صحیح اور دردناک الفاظ میں کھینچتا ہے ؎

دشمن آدم آدمے ہم سخنے نہ ہمدمے
چشم کشا دیکدمے فتنۂ اہرمن نگر
آں ہمہ لغزش و خطا ایں ہمہ سازش و دغا
خلوتِ اہلِ دل ببیں جلوتِ اہلِ فن نگر
جرم و خطا روا ہمے عذر و دغا شکا ہمے
جور فرنگیاں مپرس دار ببیں رسن نگر
گاہ بیا بشہر و دیہہ شورشِ دار و گیر بیں
گاہ برو بسرحد و اذنِ بزن بزن نگر

ذرا اس مصرعہ کی داد دیجئے "خلوتِ اہلِ دل ببیں، جلوتِ اہلِ فن نگر" ایک مصرعے میں حقائق کی ایک دُنیا بھر دی ہے۔ جاہل پٹھانوں کو متمدن بنانے والی تمام سرکاری سرگرمیوں کو کتنا مجمل اور کتنا موثر طور پر بیان کر دیا ہے۔ ع "گاہ برو بسرحد و اذنِ بزن بزن نگر" شمالی مغربی سرحد کی تمام پولٹیکل حالت کا نقشہ کھینچ کر رکھدیا ہے۔

آخر میں اقبال کے ہمنوا ہو کر کہتا ہے ؎

فلسفۂ مسیحیٔ علل ایں ہمہ وحشت و خلل
زود بکوشش و رعمل باز بخویشتن نگر

جگر کے کلام میں تخئیل کا عنصر

(از جناب افتخار احمد صفدر مخدومی بی۔ اے۔ (آنرز))

حقیقت کائنات کے ادراک کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک عقلی اور ایک وجدانی۔ سائنس دان اور فلسفی جس حقیقت کو سینکڑوں تجربوں اور عقلی موشگافیوں کے ذریعہ سے دریافت کرتا ہے ایک صوفی اور شاعر اپنے روحانی قویٰ کی بدولت سائنس کے آلات اور کسی قسم کی مادی امداد کے بغیر اسی حقیقت کا ادراک اپنی رُوح میں کر لیتا ہے۔

حقیقی شاعر ابتدا میں حُسن ظاہر کی پرستش اور تعریف و توصیف میں محو رہتا ہے لیکن بعد میں ضرور وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے حُسن کی پس پردہ حقیقت یا جسے حُسن کی اصل ماہیت کہنا چاہیئے محسوس ہونے لگتی ہے۔ حُسن کے مظاہر کو پوجتا پوجتا یہ بت پرست واقعی ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں پر اسکو یہ ظواہر کم اہم نظر آنے لگتے ہیں۔ اور وہ انکی بنیادی حقیقت کی اہمیت کا احساس کر لیتا ہے۔ وہ رنگ و بُو کی بھول بھلیوں ہی میں پھنس کر نہیں رہ جاتا بلکہ ان کے پس پردہ کارفرما حقیقت پر پہنچ جاتا ہے۔ البتہ بہت سے شاعر تمام عمر "رنگ و بُو" کے طلسم ہی میں گرفتار رہتے ہیں اور حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔

تجربہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر شاعر کو ضرور ان دو مختلف دُنیاؤں میں زندگی گزارنا پڑتا ہے اور یہ اس کی رُوحانی ترقی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ انگریزی میں ہم دیکھتے ہیں کہ شیکسپیئر بھی ابتدا میں اسی ظاہر پرستی کا شکار رہا ہے۔ اس کی ابتدائی نظموں میں عریانیت تک نمایاں ہے۔ جیسے (Venus and Adonis) وینس اور ایڈونس سے ظاہر ہے لیکن بعد میں جلد ہی وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں کہ اس نے اپنے آپ کو اس طلسم سے آزاد کر لیا۔ اور فطرت اور اس کے اسرار کے انکشافات میں مصروف ہو گیا۔

جگر بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ابتدا میں اس کی شاعری بھی اس وجود پرستی کی حامل نظر آتی ہے لیکن جوں جوں اسکی شاعری ترقی کرتی جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے لئے ایک فلسفۂ حیات پیدا کر لیتا ہے اور جا بجا اپنے اشعار میں اپنے اس فلسفہ کا اظہار کرتا ہے۔ ہم اس کی واردانی شاعری سے اس قدر موثر ہو چکے ہیں کہ ہمیں خیال تک بھی نہیں آتا کہ جگر ایک اعلیٰ شاعر ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ مفکر بھی ہے۔

تاہم ہم جگر کو اس وجود پرستی سے اس قدر آلودہ نہیں پاتے جس قدر بعض دوسرے شاعر ہیں۔ ظواہر حسن کے ساتھ اس کی یہ وابستگی بھی اپنے اندر ایک خاص لطافت رکھتی ہے۔ وہ کیٹس (Keats) کی بجائے شیلے (Shelley) سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ گو ابتدا میں ہی احساس ہوتا ہے کہ وجود سے یہ وابستگی بذات خود مقصد نہیں بلکہ کسی مقصد کے حصول کا ایک لازمی ذریعہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

جہانِ حسن سے تکمیل تشنگی کر لے
ابھی نظر سے نہ یہ پردۂ سراب اٹھا

اسے معلوم ہے کہ یہ محض سراب ہے۔ لیکن وہ اس پردۂ سراب کو دور نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس کی روحانی ترقی کی منزل میں یہ بھی ایک ضروری مرحلہ ہے مندرجہ بالا شعر سے شاید کوئی صاحب یہ سمجھ بیٹھیں کہ جگر تمام سلسلہ کائنات ہی کو سراب قرار دیتا ہے، ہرگز نہیں —— اگر ایسا ہوتا تو میں جگر کو ایک مفکر نہ کہتا بلکہ ایسے نقالوں کے اس زمرہ میں شمار کرتا جو اہل ہمہ اوست کے چند خیالات مستعار لیکر نظم کر دیتے ہیں اور بزعم خود بڑے صوفی اور فلسفی بن بیٹھتے ہیں۔ جگر ان نیشنل ایبل روحانیوں میں نہیں وہ ایک اوریجنل تھنکر (Original thinker) ہے سلسلہ کائنات کے متعلق وہ کہتا ہے ؎

سمجھ سوچ کے پاؤں آگے بڑھانا حقیقت ہے دُنیا کہانی نہیں ہے

وہ حسن اور ظواہر حسن کو مترادف قرار دینے کو حماقت کہتا ہے۔

جگر کا مابعد الطبیعاتی نظریہ اقبال کی طرح بالکل اسلامی ہے۔ دونوں میں میری نظر میں صرف یہ فرق ہے کہ اقبال جس چیز کو علم الاخلاق کے لباس میں ظاہر کرتا ہے اسی کو جگر آرٹ کا لباس پہناتا ہے۔ ایک کا نقطۂ نظر اخلاقی اور فلسفیانہ ہے تو دوسرے کا محض فنی (Artistic) دونوں کے نزدیک "فلسفہ سنجیٔ علل این ہمہ وحشت و خلل" کے سوا کچھ نہیں۔ حقیقت کائنات کا ادراک روح کائنات کے ساتھ ایک وجدانی تعلق ہی قائم کرنے سے ہو سکتا ہے۔ دونوں کے نزدیک کائنات ایک ٹھوس حقیقت ہے فریب نظر نہیں۔ جہاں اقبال کہتا ہے ؎

[illegible] دونوں [illegible] ہیں اور دونوں
ایک دوسرے کی ممد و معاون ہیں۔ جو انسانیت اس بہاؤ کے خلاف کشتیٔ حیات کو چلا رہی ہیں اُن کے سفینے اپنی تباہی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور جو اس بہاؤ کے ساتھ ساتھ ہیں وہ اپنے لئے زندگیٔ دوام کا انتظام کر رہی ہیں۔ ان کے ارتقا کو موت بھی نہیں مٹا سکتی۔

مگر اپنے گرد و پیش کے حالات سے بھی غافل نہیں۔ اس کی روحانی شاعری زندگی سے گریز کا ایک بہانہ نہیں۔ وہ زمانۂ حال کے رُوح کُش حالات کو دیکھتا ہے اور اُن سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ قدرتی طور پر سمجھتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نوعِ انسان کے درد کو محسوس ہی نہیں کرتا۔ وہ ابنائے وطن کی مصیبتوں سے بھی غافل نہیں۔ دستِ غیر کے تظلم سے بھی ناآشنا نہیں۔ مفسدہ پرداز مصلحین کے فریبوں سے بھی آگاہ ہے۔ دیکھئے اپنے گرد و پیش کے حالات کا نقشہ کتنے خوبصورت، صحیح اور دردناک الفاظ میں کھینچتا ہے ؎

دشمنِ آدم آدمے ہم سخنے نہ ہمدمے
چشم کشا و یکدمے فتنۂ اہرمن نگر
آں ہمہ لغزش و خطا ایں ہمہ سازش و دغا
خلوتِ اہلِ دل ببیں جلوتِ اہلِ فن نگر
جرم و خطا روا ستے عذر و دعا حکا ستے
جورِ فرنگیاں مپرس دار ببیں رسن نگر
گاہ بیا بشہر و دیہہ شورشِ دار و گیر بیں
گاہ برو بہ سرحدے داذنِ بزن بزن نگر

ذرا اس مصرعہ کی داد دیجئے "خلوتِ اہلِ دل ببیں، جلوتِ اہلِ فن نگر" ایک مصرعے میں حقائق کی ایک دُنیا بھر دی ہے۔ جاہل پٹھانوں کو متمدن بنانے والی تمام سرکاری سرگرمیوں کو کتنا مجمل اور کتنا موثر طور پر بیان کر دیا ہے۔ "گاہ برو بہ سرحدے داذنِ بزن بزن نگر" شمالی مغربی سرحد کی تمام پولٹیکل حالت کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

آخر میں اقبال کے ہمنوا ہو کر کہتا ہے ؎

فلسفہ سنجیٔ علل ایں ہمہ وحشت و خلل
زود بکوش در عمل باز بخویشتن نگر

گلزار ہست و بُود نہ دیوانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

وہاں جگر اپنے خیال کو یوں ادا کرتا ہے ؎

ہر ذرہ ہے اک پیکرِ صد حُسنِ حقیقت
ہستی کو جگر ہستیٔ باطل نہ سمجھنا

کائنات میں ایک رُوحِ حیات رواں و دواں ہے۔ اب اس رُوحِ حیات کی ماہیت کیا ہے؟ یہ جگر کے الفاظ ہی میں سُنیئے ؎

ہمہ ایں دام قیود و ہمہ ایں نقشِ وجود
حلقۂ ہست ز صد سلسلۂ برہم کیف

جہاں اقبال کے نزدیک وہ حقیقت ایک ہمیشہ متحرک رہنے والی قوت کا نام ہے۔ وہاں جگر اس کو "حُسنِ حقیقی" کی صورت میں دیکھتا ہے۔ وہ حُسنِ حقیقت بھی ہمیشہ متحرک دریائے حُسن بھی رواں دواں اپنی نمود میں مصروف ہے ؎

عالم کا تلوّن کیا، ہستی کی حقیقت کیا
تو خود جو خراماں ہے سایہ بھی خراماں ہے

انسان بھی اپنی مخصوص صلاحیتوں کی بدولت اس حقیقت سے خاص نسبت رکھتا ہے۔ جب اُسکو اپنی اس قربت کا احساس ہو جاتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اسی گہرے تعلق کی وجہ سے وہ اُسی کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے ؎

کس کو دیکھا پردۂ خاکی میں اپنے جلوہ گر
ڈھلتے ہی اک نظر مغرورِ انساں ہو گیا

یا پھر سُنیئے ؎

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیونکر جو ہوں تو کیا ہوں میں
تمام اصل و حقیقت کا آئینہ ہوں میں
خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں

لیکن انسان صرف اسی وقت مظہرِ خدا بن سکتا ہے جب وہ اپنی ان مخصوص صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کے ارتقا کے لئے کوشاں ہے ؎

ورنہ کیا تھا صرف ترتیبِ عناصر کے سوا
خاص کچھ بیتابیوں کا نام انساں ہو گیا

اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے ؎

اپنی ہستی سے جو انوار سے بیگانہ ہے
وہ فقط چند حجابات کا دیوانہ ہے

بہ الفاظ دیگر جب تک انسان اپنی خودی کی تخلیق اور اسکی نشو و نما کی طرف متوجہ نہ ہو وہ اپنے منتہائے مقصود کی تکمیل سے قاصر رہتا ہے اس خودی کی بدولت ہی انسان خدا کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ جگر اس غیر اسلامی نظریہ کا ہرگز قائل نہیں۔ جو یہ کہتا ہے کہ انسان اپنی خودی کو نیست کر کے ہی قربتِ الٰہی ڈھونڈ سکتا ہے۔ وہ اقبال کی طرح تخلیقِ خودی کا قائل ہے۔ اب اس خودی کی تکمیل اگر غلط طریقہ پر کی جائے تو یہی جذبہ خود پسندی اور خود پرستی میں تبدیل ہو کر انسان کے اپنے حق میں اور دیگر بنی نوعِ انسان کے حق میں نہایت ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے۔ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ اس کی تکمیل میں روحِ حیات سے رہبری اور ہدایت حاصل کی جائے۔ اس کے ساتھ گہرا روحانی تعلق قائم رہے۔ تاکہ ہر قدم اور ہر مرحلہ پر اسکی رہنمائی حاصل ہوتی رہے۔ اور اس سے مدد ملتی رہے تبھی جگر کہتا ہے ؎

یہی حُسن و عشق کا راز ہے کوئی راز اس کے سوا نہیں
کہ خدا نہیں تو خودی نہیں جو خودی نہیں تو خدا نہیں

ہمہ اوست کے قائل حضرات اس خودی کے تصور کو روحانی ترقی کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان اس سے خدا پرست بننے کے بجائے خود پرست بن جاتا ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو بھی بعض اوقات بمنزلہ خدا کے سمجھنے لگتا ہے۔ جگر ہمیں اس خطرے سے بھی آگاہ کرتا ہے ؎

رواں اگرچہ ہیں اس میں بھی سب وہی موجیں
مگر ہے قطرے پہ فرضِ احترام دریا کا

اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ انا الحق کے مدعی اس گروہ میں زیادہ ہوئے ہیں جو خودی کو نیست کرنے کے دعاوی کرتے تھے بہ نسبت اس گروہ کے جو خودی کی تخلیق پر زور دیا کرتے ہیں

کائنات کی قوتِ تخلیق ہر لحظہ جہانِ نو کی تخلیق و تدوین میں مصروف ہے۔ سراب زدہ آنکھیں اسی جہان کو اس کائنات کا ہر کارہ سمجھ لیتی ہیں لیکن جگر ہمیں بتاتا ہے کہ ایسا نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ؎

چشمِ نظر پرست میں جس کا جہان نام ہے
حُسنِ تمام یار کا جلوۂ ناتمام ہے

اس جلوۂ ناتمام کی تکمیل میں رُوحِ کائنات اور رُوحِ انسان وہ

حضرت ہجر اور انکی شاعری

سنہ ۱۲۹۸ھ — ۱۳۳۲ھ
۱۹۱۴ء

(از محترمہ وجاہت فاطمہ شاہجہانپوری)

قبلہ نانا میاں، نواب ناظم علی خاں ہجر ۱۲ ارشعبان سنہ ۱۲۹۶ھ کو شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورث اعلیٰ نواب بہادر خاں صاحب چنتہ اور نواب دریا خاں صاحب نے شاہجہاں کے زمانے میں شاہجہاں پور آباد کیا تھا۔ اور ادھر ادھر سے خاندانوں کو لاکر بسایا تھا۔ ابھی اس خاندان کی دس پشتیں بھی نہ گزری تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا وہ قہر و غضب نازل ہوا جسے انگریز مورخ غدر کہتے ہیں۔ اس قہر سے یہ خاندان بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اور ۱۸۵۷ء میں ۲۲ گاؤں بھی حکومت برطانیہ نے ضبط کر لئے۔ صرف تھوڑی سی جائداد عورتوں پر ترس کھاکر چھوڑ دی گئی تھی۔ قندھار، کابل، کانجر، گجرات وغیرہ کے علاقے ۱۸۰۲ء میں نواب وزیر اودھ اور حافظ رحمت خاں صاحب کی باہمی آویزش میں ان کے بزرگوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ بے محل نہ ہوگا اگر حضرت ہجر کا مختصر شجرہ نسب درج کر دوں۔

شجرۂ نسب

نواب کاظم علیخاں صاحب　　نواب ناظم علی خانصاحب

نواب خانم علیخاں صاحب	والدہ نواب کاظم علیخانصاحب و ناظم علیخانصاحب ہجر
نواب اشرف خانصاحب	نواب زین العابدین خانصاحب عرف عبدو خاں
نواب محبت خانصاحب	نواب مہتاب علیخانصاحب
نواب فیض علیخانصاحب	نواب بدرالدین خانصاحب
نواب مرتضیٰ خانصاحب	نواب شہاب الدین خانصاحب
نواب صالح محمد خانصاحب	نواب عبدالغنی خانصاحب
نواب فتح محمد خانصاحب	نواب بختیار خاں صاحب
عمدۃ الملک نواب دلیر خاں صاحب چنتہ	عمدۃ الملک نواب بہادر خانصاحب چنتہ

نواب دریا خانصاحب

حضرت ہجر نے اس زمانے میں شرفا کے رواج کے مطابق گھر پر فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ طبیعت بلا کی ذہین پائی تھی۔ دوسرے تعلیم کا شوق تھا اس لئے قدرتی طور پر تھوڑی ہی مدت میں غیر معمولی استعداد پیدا ہو گئی۔ لٹریچر سے شغف اور دلچسپی کی وجہ سے ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ حضرت ہجر کی شاعری کا آغاز سنہ ۱۳۱۷ھ سے ہوا اس وقت ان کی عمر انیس برس کی تھی۔ سب سے پہلی غزل "ہے مرگ کا حشر کے دن تک مجھے خیال امیر" کی طرح پر کہی تھی۔ یہ طرح حضرت امیر مینائی کی وفات پر گلدستہ پیام یار لکھنؤ کی طرف سے دی گئی تھی۔ اس غزل کے اشعار مجھے نہیں مل سکے۔ پہلی غزل کے بعد کچھ دنوں تک شعر کہے اور پوشیدہ رکھے۔ لیکن ان کی قابلیت کا جوہر ان کی انکساری چھپا نہ سکی۔ اور رفتہ رفتہ ان کے کلام کی شہرت ہو گئی۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ حضرت احسان شاہجہانپوری کو اپنا کلام دکھائیں۔ حضرت احسان اس زمانے کے کہنہ مشق استاد مانے جاتے تھے۔ حضرت ہجر نے انہیں صرف ایک غزل دکھائی لیکن ان کی اصلاح پسند نہ آئی۔ تھوڑے عرصہ بعد فصیح الملک نواب مرزا داغ کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ حضرت داغ نے کچھ اس خیال سے کہ جوہر کامل پایا اور کچھ اس وجہ سے کہ پرنانا میاں نواب خانم علیخانصاحب اور حضرت داغ سے خاص مراسم تھے۔ حضرت ہجر کے کلام پر خاص دلچسپی سے اصلاح دی۔ قبلہ حضرت نوح ناروی فرماتے تھے "میرے زمانۂ قیام حیدرآباد دکن میں اکثر تمہاری (حضرت ہجر) غزلوں کی اصلاح میرے ہاتھوں ہوئی ہے۔ بہت سے اشعار بدستور رہنے دئے گئے۔ اکثر میں کہیں کہیں الفاظ کا تغیر و تبدل ہوا۔ بعض اشعار کی خود استاد نے تعریف کی۔"

حضرت ہجر نے شاہجہان پور سے ایک ماہوار رسالہ زبان اُردو کے نام سے نکالا تھا۔ جو برسوں نہایت کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ لیکن ادب کیلئے وہاں کی آب و ہوا موافق نہ تھی۔ اس لئے یہ گلدستہ بھی دوسرے ادبی گلدستوں کی طرح مرجھا گیا۔

حضرت ہجر کے ہمعصروں اور دوستوں میں حضرت نوح ناروی، حضرت احسن مارہروی، حضرت سائل دہلوی۔ محترمہ حجاب شاہجہاں پوری۔ حضرت تسلیم لکھنوی۔ نواب مرزا سعیدالدین خاں صاحب طالب آف لوہارو۔ اور دوسرے سخن فہم شاعران کے کلام پر بیحد قدر کرتے تھے۔ اور انہیں چوٹی کا شاعر سمجھتے تھے۔ اس زمانے کے سندیلے، مارہرہ اور بدایوں وغیرہ کے مشاعروں میں حضرت ہجر کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے شاعر ان کے کلام پر سر دھنتے تھے۔

خاکِ ہند کا یہ نامور فرزند عزیزوں سے صدہا میل دور دیارِ غیر (بمبئی)

میں ۲۰ جون ۱۹۱۴ء (۲۰ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ) میں عالمِ شباب میں اِس دُنیا سے اُٹھ گیا۔ خاندان کے لئے حضرتِ تجمر کی موت "وَمَا کَانَ قَیسٌ ھُلکُہٗ ھُلکَ وَاحِدٍ وَّلٰکِنَّہٗ بُنیَانُ قَومٍ تَھَدَّمَا" کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اُردو ادب بھی اُن کی موت پر کم سوگوار نہیں تھا۔ حضرتِ تجمر نے موت سے چند منٹ پہلے یہ شعر کہا تھا۔

ائے تجمر وقت ٹل نہیں سکتا ہے موت کا
لیکن یہ دیکھنا ہے کہ مٹی کہاں کی ہے

شاعر کا یہ شعر کتنا یاس انگیز اور ماتم طلب ہے۔

حضرتِ تجمر کی شاعری، زبان کی سادگی، بیان کی شوخی، بندش کی چستی طرزِ ادا کی بے ساختگی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ ان کی شاعری میں بھی حُسن و عشق کی روایات، رقیب و مدعا اور فلکِ پیر کی شکایت پائی جاتی ہے لیکن ان کا اندازِ بیان اچھوتا اور طرزِ ادا انوکھا ہے۔ حضرتِ تجمر کی شاعری میں بھی شورشِ تخیل کا نام حُسن اور اضطرابِ قلب کا نام عشق ہے۔ لیکن انہوں نے اس نادار حُسن اور ناکام عشق کی تعبیر نہایت سادہ، اثر انگیز اور تیکھے پن سے کی ہے۔ حضرتِ تجمر نے بھی رندوں کا سرور، تعیش اور زاہدوں کا ساز تجرد چھیڑا ہے۔ مگر جس ڈھنگ سے کسے الاپا ہے وہ سب سے الگ ہے۔

کلام کا انتخاب

ایک شاعر کی شاعری کی حیثیت کا صحیح ترجمان اسکا کلام ہوتا ہے۔ اس لئے میں حضرتِ تجمر کے کلام کا ذیل میں صرف انتخاب پیش کئے دیتی ہوں۔ اور اس خیال سے کوئی تبصرہ نہیں کرتی کہ اُن کا کلام مجھ سے بہتر اُن کی شاعری کی ترجمانی کریگا۔

ہاجو انکو بام پر غش آگیا مجھے — تازہ کلیم و طور کا افسانہ ہوگیا
اں ہاں تمہارے حُسن کی کوئی خطا نہیں — میں حُسنِ اتفاق سے دیوانہ ہوگیا
بولو سبب یہ پوچھتے ہیں وہ میرے جنوں کا حال — دیوانہ بن گیا ہے کہ دیوانہ ہوگیا
آنسو بہائے فرقتِ ساقی میں اس قدر — لبریز اپنی عمر کا پیمانہ ہوگیا
جو تھے جنوں میں چھوڑ دیئے سب نے اپنے گھر — آباد ان کے عہد میں ویرانہ ہوگیا
انکو تو اپنی جلوہ نمائی سے کام تھا — اس کی خبر نہیں کوئی دیوانہ ہوگیا
اس درجہ تجمر ہوش رُبا ہے کسی کا حُسن — جس کی نگاہ پڑ گئی دیوانہ ہوگیا

بے چین ہو کے بزم سے آخر وہ اٹھ گئے — دیکھا گیا نہ حال ارے اضطراب کا
قاصد کو قتل کرکے وہاں کوئی مطمئن — ہے منتظر یہاں کوئی خط کے جواب کا
بجلی سی اک چمک کے گری کوہِ طور پر — گوشہ اُلٹ گیا جو کسی کے نقاب کا

شرما سے گئے کچھ وہ دمِ تذکرۂ وصل — جیسے ہوئے لہجہ میں کہا ہو نہیں سکتا

کچھ خبر ہے تجھے اے چین سے سونے والے — رات بھر کون تری یاد میں بیدار رہا
اک نظر نزع میں دیکھی تھی کسی کی صورت — مدتوں قبر میں بے چین دلِ زار رہا
عمر ہنس کھیل کے اس طرح گذاری اے تجمر — دوست کا دوست رہا یار کا میں یار رہا

آیا ہے لُطف سوزشِ زخمِ جگر میں کیا — کیا جانے بات تھی تیرے تیرِ نظر میں کیا
تم کو لگاؤ اور مجھے لاگ غیر سے — میری نظر میں کیا ہے تمہاری نظر میں کیا
جبتک وہ میرے گھر میں تھے رونق بھی گھر میں تھی — بس گھر ہی گھر وہ ہے اب میرے گھر میں کیا
شوخی بھی اور جلوہ نمائی کا شوق بھی — یہ حال ہو تو بیٹھ سکے کوئی گھر میں کیا
آنسو تو روکنے سے بھی رُکتے نہیں کبھی — دریا بھرا ہوا ہے میری چشمِ تر میں کیا
اے تجمر چرخ دشمنِ اہلِ ہُنر ہے کیوں — کیا جانے ایسی بات ہے اہلِ ہُنر میں کیا

نہیں کبھی نہ کبھی مرکے بھی دکھا دوں گا — جو زندگی لئے وفا کی جو بر قرار رہا
ادائیں دیکھ چکے آئینہ میں آپ اپنی — بتائیے تو سہی دل پہ اختیار رہا

وہ شوخ بام پر جب بے نقاب آئیگا — تو ماہتابِ فلک کو حجاب آئیگا
خبر نہ تھی کہ مٹیں گے جوان ہوتے ہی — اجل کا بھیس بدل کر شباب آئیگا
پڑیگا عکس جو ساقی کی چشمِ میگوں کا — نظر شراب میں جامِ شراب آئیگا

ہوا اچھا کہ وہ گھر سے نہ نکلے — کسے معلوم کس کے دل میں کیا تھا
اُمیدِ وصل کی حالت نہ پوچھو — فقط اک آسرا ہی آسرا تھا
بہت اچھا ہوا وہ لے گئے دل — بڑا ضدی نہایت بیوفا تھا
نہ پوچھو جلوہ گاہِ ناز کا حال — ہر اک محوِ جمالِ دلربا تھا

میکدے میں شیخ صاحب منہ چھپا کر آئے ہیں — میکشو! لینا ذرا بایاں قدم اُستاد کا

ؔ قیس کی موت سے اکیلا قیس نہیں مرا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو قوم کی بنیادیں ڈھے گئی ہیں ●

رہ گئی کیوں نگہِ چشمِ فسوں گر اُٹھ کر　　ہم تو سمجھے تھے کہ ہم پر کوئی جادو ہوگا
میری تقدیر کا بل ہی کہ نکلتا ہی نہیں　　یہ بھی شاید کوئی ان کا خمِ گیسو ہوگا

آج کل ساقیٔ میخانہ ہے دلبر اپنا　　شیشہ اپنا ہے، سبو اپنا ہے، ساغر اپنا
حشر میں ڈھونڈتے ہیں مرے غمخوار مجھے　　اور میں ڈھونڈ رہا ہوں دلِ مضطر اپنا
دل ہمارا نہ ہوا، آپ ہمارے نہ ہوئے　　لوگ غیروں کو بنا لیتے ہیں کیونکر اپنا
تیرے انداز تو بے چین کئے دیتے ہیں　　کس طرح کوئی سنبھالے دلِ مضطر اپنا
سنتے ہیں حشر میں وہ سب کی سنیں گے اے ہجر　　آزمائیں گے وہاں ہم بھی مقدر اپنا

اس بیوفا سے یارب کیونکر نبھے گی اپنی　　عادت مجھے وفا کی جس کو ہے جفا کا
مایوس ہوگئے آخر اس بزم سے اُٹھے ہم　　پایا نہ کوئی موقع اظہارِ مدعا کا
مرتا ہوں میں طبیبو! مرنے کی آرزو میں　　موقع نہیں دوا کا، یہ وقت ہے دعا کا
ہم خوب جانتے ہیں محشر کی سب حقیقت　　وہ بھی ایک فتنہ اس چشمِ فتنہ زا کا

اس بزم کی جانب ہمیں دل لیکے چلا ہے　　سنتے ہیں جہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا
آئینے میں خود دیکھتے ہیں اپنی ادائیں　　جس وقت کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا
ناکامیٔ قسمت نہیں جاتی، نہیں جاتی　　ایسا نہیں ہوتا، نہیں ہوتا، نہیں ہوتا
حیرت ہے کہ تمکو ہیں گلے میری وفا کے　　مجھ سے تو جفاؤں کا بھی شکوا نہیں ہوتا
دل تو ترے وعدوں کا یقیں ہو، تو یقیں ہو　　ہم کو تو کسی طرح بھروسا نہیں ہوتا
وہ دل نہیں ہوتا، اُسے ہم دل نہیں کہتے　　اے ہجر جو دل محوِ تمنا نہیں ہوتا

کچھ ملی کچھ نہ ملی میری فغاں کی تاثیر　　کچھ سنا کچھ نہ سنا، آپ نے شیون میرا
جو ہیں آزاد وہ خوش اپنے نشیمن میں رہیں　　ہے قفس ہی مرے نزدیک نشیمن میرا

لیجئے وہ غیر پر مرنے لگے　　خاک میں نامِ محبت مل گیا
انتہائے بدگمانی ہو چکی　　پیچھے پیچھے نامہ بر کے دل گیا
کہہ گئی موسیٰ سے وہ برقِ جمال　　دید بازی کا نتیجہ مل گیا
ہوگیا دو ظالموں میں ربط و ضبط　　آسماں جھک کر زمیں سے مل گیا

لب پہ کا سخن وا نہیں ہوتا　　ہم سے اُن کا گلا نہیں ہوتا
جب سے تم میرے دل میں رہتے ہو　　ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

اُن سے جو کچھ بھی ہو وہ تھوڑا ہی　　بیوفاؤں سے کیا نہیں ہوتا
آپ وعدے ہزار کرتے ہیں　　کوئی وعدہ وفا نہیں ہوتا
اُن کے دیدار کو ترستے ہیں　　مدتوں سامنا نہیں ہوتا
دل سے کرتے ہیں گفتگو انکی　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
وہ خفا ہیں مگر یہ کہتے ہیں　　میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

ہر چیز میں پرتو ہے اُنکے رخِ زیبا کا　　کس رنگ میں دنیا ہے، کیا رنگ ہے دنیا کا
اب سوزِ محبت نے کچھ رنگ جمایا ہے　　ہے داغِ تمنا میں عالم یدِ بیضا کا
اس واسطے سینہ میں اس دل کو جگہ دی ہے　　یہ دل ہے جلوہ خانہ اک شاہدِ رعنا کا

رخِ پرنور پہ زلفوں کو پریشاں دیکھا　　صبح پر شام کے عالم کو نمایاں دیکھا
جب کہا میں نے، مرا حال پریشاں دیکھا　　ناز سے پھیر کے منہ کہنے لگے، ہاں دیکھا!

اُدھر نہیں اُٹھ سکتی شرمائی ہوئی چتون　　بسمل کوئی محفل میں اس تیر سے کیا ہوگا

وہ شوخ اپنے ہاتھ سے مجھ کو پلا گیا　　ایمان تو گیا، مگر اک لطف آ گیا
ہم نے کسی حسین کی صورت تو دیکھ لی　　پروا نہیں، اگر دلِ مضطر گیا، گیا
میں باوفا نہیں، نہ سہی، بے وفا سہی　　کچھ تو لقب ملا مجھے، کچھ تو کہا گیا
جو دل کی بات تھی وہ اِدھر سے کہی گئی　　جو منہ میں آگیا، وہ اُدھر سے کہا گیا
توبہ کے بعد بھی مری نیت وہی رہی　　دو گھونٹ پی کسی نے، مزہ مجھ کو آگیا

ہو رہی تھیں ملک سے سرگوشیاں زینت کے وقت
یہ نہیں معلوم پھر کیا فیصلہ اہم ہوا
میرے مرنے کی خبر سن کر کہا اُس شوخ نے
خیر سے اک چاہنے والا ہمارا کم ہوا
وہ عیادت کو مری آئے مگر دشمن کے ساتھ
اک خوشی حاصل ہوئی، اور ایک مجھکو غم ہوا
اس لئے کرتا ہوں میں، غم ماہِ نو کو دیکھ کر
جانتا ہوں اک مہینہ زندگی کا کم ہوا

نہ درد تھا، نہ خلش تھی، نہ تلملانا تھا　　کسی کا عشق نہ تھا وہ بھی کیا زمانا تھا

کوئی کسی کا نہیں اس جگہ یہ محشر ہے — وہ دن گئے کہ ستمگر ترا زمانا تھا
ترے جمال کو تھا کوہ طور سے کیا کام — نگاہ بن کے مری آنکھ میں سمانا تھا
سنا کیا کوئی خلوت میں رات بھر اے ہجر — عجیب طرح کا دلکش مرا فسانا تھا

ترے سوا نظر میں سمایا نہیں کوئی — عالم تمام میری نظر سے نکل گیا
میں زیب کہوں گا کہ سر سے بلا ٹلی — سودائے زلف ہجر جو سر سے نکل گیا

ہے کے قابل کسی کا حال تھا صبح وصال — گفتگو جھینپی ہوئی انداز شرمایا ہوا
نیند آنے کا بہانہ شام ہی سے وصل میں — یہ تو فقرہ ہے کسی سیکھے کا سمجھایا ہوا
شیخ جی ایسے میں بھی وہ چیز ناجائز ہے کیا — فصل گل آئی ہوئی ہے ابر ہے چھایا ہوا
دیکھ کر میرا دل افسردہ وہ کہنے لگے — پھول اچھا تھا اگر ہوتا نہ مرجھایا ہوا
ہائے کیا جانے پڑی ہے کیا مصیبت ہجر پر — پھر رہا ہے ہر طرف بے چارہ گھبرایا ہوا

چاک کر کے مجھکو واپس کر دیا نامہ مرا — واہ کیا عجیب ہے ظالم نے مرے خط کا جواب

وہ صرف عشق سنکے عدو پر فدا ہوا — میں کیا سمجھ رہا تھا مقدر سے کیا ہوا
ممکن نہیں کہ تیرے مٹائے سے مٹ سکوں — اے چرخ میں بھی غیر کا کیا نقش پا ہوا؟
دشمن تمہارے رنج کریں میری موت کا — اس کا ملال کیا ہے تمہیں جو ہوا، ہوا

آئی ہے خوب گھر کے گھٹا آسمان پر — میکش ڈٹے ہیں پیر مغاں کی دوکان پر
ظالم نے کہدیا دم اظہار آرزو — تم اور ایسی بات تمہاری زبان پر
تعریف حور کی تو کہا اس نے طعن سے — بس بس اب آپ جا کے رہیں آسمان پر

دیکھے شب خلوت کوئی دلدار کے انداز — کچھ قہر کی نظریں ہیں تو کچھ پیار کے انداز
میدان قیامت میں ٹہلنا نہیں اچھا — محشر نہ اٹھا لے تری رفتار کے انداز
آئینے میں کیا جانئے کیا دیکھ لیا ہے — گھبرائے ہوئے ہیں نگہ یار کے انداز
ہنس ہنس کے کریں آپ نہ انکار محبت — اقرار کے انداز ہیں انکار کے انداز
کہتے ہیں جسے اہل جہاں فتنۂ محشر — وہ سب ہیں ستمگر تری رفتار کے انداز
جب بہتے آنسو ٹپک پڑتی ہے حسرت — چھپتے ہی نہیں طالب دیدار کے انداز
ہنس ہنس کے مجھے کوستا ہے کوئی اے ہجر — ظالم کی جفاؤں میں بھی ہیں پیار کے انداز

جب مجھ سے پوچھتا ہے کوئی ماجرائے دل — بے اختیار منہ سے نکلتا ہے ہائے دل
قاصد گیا، گیا نہ گیا کس کو اعتبار — میری تو جانئے یہ کہ ہمراہ جائے دل
شکوہ کیا ستم کا تو کہنے لگا وہ شوخ — ہم پوچھتے ہیں ہم سے کوئی کیوں لگائے دل
سنتے ہیں ہجر عشق میں دیوانہ ہو گیا — پوچھو مزاج بھی، تو وہ کہتا ہو ہائے دل

ہجوم آرزو سے وسعت دل گھٹتی جاتی ہے — ہزاروں بس گئے اس گھر میں داخل ہوتے جاتے ہیں

پھر اُن کی جستجو ہے اور میں ہوں — وہی پھر آرزو ہے اور میں ہوں
شب غم تیرا کوئی نہیں ہے — خیال یار تو ہے اور میں ہوں
ہوا پھر مجھ کو سودائے محبت — پھر اس کی آرزو ہے اور میں ہوں

کیا قیامت ہے کہ وہ جلوہ نظر آتا نہیں — دم مرا آنکھوں میں اٹکا ہے نکل جاتا نہیں
روٹھنے کا لطف یہ ہے روٹھ کر من جائیے — روٹھتے ہیں آپ، لیکن روٹھنا آتا نہیں

شب غم غیر کی تصویر کا یہ کہہ کے منہ چوما — اسی کو پیار کر لوں میں جسے وہ پیار کرتے ہیں
عدو کا تذکرہ آتے ہی تم شرما گئے کیسے — ذرا نظریں ملاؤ ہم تمہیں سے بات کرتے ہیں
وہ آئے بھی عیادت کو تو یہ کہتے ہوئے آئے — یہی صورت ہے مرنے کی اسی صورت سے مرتے ہیں

ناز سے پوچھا تھا اک دن اس حسیں نے حال دل
بس جبھی سے ہجر کچھ حالت مری اچھی نہیں

اجل کی آمد آمد ہے کہ اس رشک مسیحا کی — پئے تعظیم کیوں اٹھ اٹھ کے سب بیمار بیٹھے ہیں

وہ اور غیر عشق، سمجھنے کی بات ہے — سچ ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا شباب میں
اے آسمان غیر کے گھر جا رہے ہیں وہ — کمبخت دیر کیا ہے ترے انقلاب میں

اک عالم ہے اِدھر ایک زمانہ ہے اُدھر — بیکسی پوچھتا کوئی اِدھر ہے کہ نہیں
یہ بھی ہے رنج کہ بے موت مرا جاتا ہوں — یہ بھی ہے فکر انہیں اس کی خبر ہے کہ نہیں

وہ جفا کرے تو وفا کروں، وہ ستم کرے تو دعا کروں
کبھی یہ کروں کبھی وہ کروں کبھی کیا کروں کبھی کیا کروں

جب وہ آتے ہیں تو ہوتی ہے مسرت مجھ کو
جب وہ جاتے ہیں تو اک طرح کا غم ہوتا ہے

خدا کرے کہ وہ محشر میں بے نقاب نہ ہوں   رہا، رہا، نہ رہا، دل پہ اختیار مجھے

فرقتِ غیر سے یہ آپ کی حالت کیا ہے   آئینہ میں تو ذرا دیکھئے صورت کیا ہے
کیا کہیں پھر تو گلہ تھا نہ کوئی شکوہ تھا   ہنس کے جب اُس نے کہا تم کو شکایت کیا ہے

اچھا ہوا کہ جان گئی، فیصلہ ہوا   [illegible] کے آزاد ہو گئے
تم کو سنائیں اپنی تباہی کا حال کیا   برباد ہونے والے تھے برباد ہو گئے

نقشِ رہِ پائے غیر نہ داغِ دلِ عدو   پھر کیوں مٹا رہا ہے کوئی فتنہ گر مجھے
اللہ یہ دماغ، یہ ناز اور یہ غرور   آئینہ دیکھتا ہے کوئی دیکھ کر مجھے
تھی نزع میں بھی لب پہ مرے داستانِ عشق   مرنے کا [illegible] یاد رہا، عمر بھر مجھے

سنا ہے آج وہ بہرِ عیادت آنے والے ہیں
ابھی سے کچھ مریضِ غم کے چہرے پر بحالی ہے
شبِ غم پھر تصور یار کی زلفِ پریشاں کا
بتا ہیں کیا تمہیں اے تجرؔ [illegible] حالی ہے

دل میرا اُن کی زلفِ شکن در شکن میں ہے
ہے کس چمن کا پھول مگر کس چمن میں ہے
سوزِ تپِ دروں نے جلایا ہے اس قدر
بس ایک مشتِ خاک مرے پیرہن میں ہے
رہ رہ کے یاد آتے ہیں اے تجرؔ ہم وطن
ہم ہیں سفر میں، دھیان ہمارا وطن میں ہے

نقابِ رُخ سے ہٹائیں ہٹا نہیں سکتے   ہمیں جمال دکھائیں، دکھا نہیں سکتے
وہ ہم کو یاد کریں کیا غرض انہیں ایسی   ہم ان کو دل سے بھلائیں، بھلا نہیں سکتے
تمہارے حسن نے ہم کو بنا لیا اپنا   تمہیں ہم اپنا بنائیں، بنا نہیں سکتے
خدا سے حشر میں پرسش کے وقت کہہ دیں گے   قصور اپنے گنا ہیں، گنا نہیں سکتے

جنابِ تجرؔ محبت چھپے یہ نا ممکن   ہزار آپ چھپائیں، چھپا نہیں سکتے

ظالم نگہِ شوخ تری اشوخ بڑی ہے   اس سے کبھی اُلجھی ہے کبھی اُس سے لڑی ہے
اب اور تری آنکھ کی تعریف کروں کیا   چنچل ہے نکیلی ہے سجیلی ہے بڑی ہے

آنسو کبھی جو فرطِ محبت سے گر پڑے   سب حرف مٹ گئے مری فردِ گناہ سے
میں تو یہی کہوں گا کہ قسمت پلٹ گئی   آ کر وہ پھر گئے شبِ وعدہ جو راہ سے
گستاخ ہو گیا ہے بہت تجرؔ آج کل   سیدھا بنا دیجئے اسے ترچھی نگاہ سے

بدل کے بھیس وفا کا جفا نکلتی ہے   ادا ادا میں تمہاری ادا نکلتی ہے
خیال یہ ہے کہ برباد میری خاک نہ ہو   تمہارے کوچہ سے بچ کر صبا نکلتی ہے

کل اُس نے نقابِ رُخِ زیبا کو اُلٹ کر   میری نگہِ یار سے ارمان نکالے
اے تجرؔ تڑپ کر مرا دل کہتا ہے مجھ سے   میں وہ نہیں جس کو کوئی پہلو میں چھپا لے

خانۂ دل میں خیالِ یار آ سکتا نہیں   عشق نے سونپی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے
اللہ اللہ ان کو اپنے حسن پر اتنا غرور   اس پہ بگڑے ہیں کہا کیوں یوسفِ ثانی مجھے

تم نے دل لے کر نگاہیں پھیر لیں   یہ ادائیں کی [illegible] احسان ہے
تم جنابِ تجرؔ سے ملنا ضرور   ایک اپنی وضع کا انسان ہے

پرائے واسطے اپنوں سے اے دل کون لڑتا ہے
بُرا میں اُن کو کہتا ہوں، بھلا تو کیوں بگڑتا ہے
تماشہ ہے کسی کو بھی پسند آتیں نہیں حوریں
انہیں کے واسطے ہر ایک محشر میں جھگڑتا ہے
ہمارا حال بھی اے تجرؔ گویا ہے مزاج اُن کا
سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں جس دم بگڑتا ہے

آئینے میں عکس اپنا دیکھ کر کہنے لگے   لیجئے یہ بھی ہمارے گھورنے والے ہوئے

اُن کی نگہِ ناز عجب شعبدہ گر ہے   ناوک ہے تو ناوک ہی، نظر ہے تو نظر ہے

دل میں غم ہے، درد پہلو میں ہے، سودا سر میں ہے
اپنے اپنے گھر کا مالک اپنے اپنے گھر میں ہے

وہ رہتا ہے کلیجہ میں کبھی، دل میں کبھی
آج یہ مہمان اس گھر میں ہے کل اس گھر میں ہے

شیخ صاحب تم جہاں دیدہ ہو دیکھو تو ذرا
کیا یہ شیشہ میں ہے، کیا خم میں ہے، کیا ساغر میں ہے

گیسوؤں نے انکے جب دیکھی پریشانی مری　　کچھ پریشاں ہو رہے تھے کچھ پریشاں ہو گئے

دن رات انکے سامنے رہتا ہے آئینہ　　لو اب وہ اپنے آپ نگہبان ہو گئے
وہ پھر رہے تھے عرصۂ محشر میں شاد شاد　　مجھ پر نظر پڑی تو پریشان ہو گئے
وہ دیکھتے تھے پیار کی نظروں سے آئینہ　　میں مسکرا دیا تو پشیمان ہو گئے

وہ مدعی کیلئے، مدعی خوشی کے لئے　　نہ کوئی میرے لئے ہے نہ میں کسی کیلئے
وہ ایک ہم، کہ ہمیں موت کی تمنا ہے　　وہ ایک خضر کہ مرتے ہیں زندگی کیلئے
ہوا یہ حال محبت میں ہجر کا افسوس　　غریب کھیل گیا جان پر کسی کیلئے

یہ سوچتا ہوں کہ اب بے دہن کہوں کہوں　　انہیں رقیب سے دیکھا ہے گفتگو کرتے
مزہ تو جب تھا کہ دونوں کو بیخودی ہوتی　　وہ ہم کو ڈھونڈتے، ہم ان کی جستجو کرتے
فلک نے ہم کو مٹایا تو کیا کمال کیا　　مزہ تو جب تھا کہ یہ ظلم خوب رو کرتے

آتے ہی میکدے پہ یہ کیوں جھومنے لگا　　ابر بہار ہے کہ کوئی بادہ خوار ہے
آرام ہجر میں کسی کروٹ نہیں مجھے　　کیا دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہے
ممکن نہیں ہے رشتۂ الفت کا ٹوٹنا　　یہ یار کی قسم ہے نہ پیمانِ یار ہے

نالۂ دل دوز نکلے کام کے　　رہ گئے وہ بھی کلیجہ تھام کے
اٹھکے جب چلنے لگے وہ صبح وصل　　رو دیئے ہم انکا دامن تھام کے
طور پر جاتے تو ہوتم اے کلیم　　دیکھنا ان کو کلیجہ تھام کے
میں نے جب دل تھام کر فریاد کی　　رہ گئے وہ بھی کلیجہ تھام کے

نام سنکر ہجر کا بولا وہ شوخ
آدمی دیکھے نہیں بس نام کے

یہ حضرت ہجر کی زندگی اور اُن کی شاعری کا ایک اجمالی خاکہ ہے
توفیق ملی تو پھر کبھی ان کی شاعری پر تفصیل سے بحث کروں گی۔

ایک ضروری تصحیح

ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۵ء کے مشترکہ پرچے میں ایک

ایک غزل صفحہ ۶۷ پر حضرت بیخود دہلوی کے نام سے شائع ہوئی ہے جو

اصل میں جناب ملک بشیر احمد صاحب بیخود سے منسوب ہونی چاہئے تھی ہم اس غلطی کا افسوس ہے

ہوشیار! ہوشیار!! ہوشیار!!!

گھریلو راحت اور مسرت کا سامان پہلے سے کرنا ضروری ہے

کتنا خوش نصیب ہے وہ آدمی جسے آسائش کی یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں مہیا ہوسکیں۔ جن کے بغیر گھریلو زندگی محض پھیکی اور بے مزہ ہوتی ہے۔ مثلاً ریڈیو، ٹیلیفون، آرائش کا سامان اور بچوں کے کھلونے۔ خوشحال اور نادار آدمی کا فرق انہیں چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں جنگ کے بعد افراط سے مہیا ہونگی۔ لیکن اس وقت آپ انہیں مہینہ بھر بلکہ تین مہینے کی آمدنی میں سے بھی نہیں خرید سکتے۔ اس لئے بہت سے لوگ جو اس وقت بچت کر سکتے ہیں، ہر مہینے روپیہ بچا رہے ہیں۔ یہ لوگ آئندہ تنگدستی کے سبب قسطوں پر چیزیں خریدنے کی دقتوں میں مبتلا نہیں ہونگے کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اس وقت روپیہ لگانے کی بہترین مد کون سی ہے۔

نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹس

ہر دس روپے بارہ برس میں پندرہ روپے ہو جاتے ہیں۔

۳½ فی صدی منافع اور انکم ٹیکس معاف۔

۲ سال بعد پانچ روپے والے سرٹیفکیٹ بھنا کر پوری رقم مع جمع شدہ منافع حاصل کی جاسکتی ہے۔

جاری کردہ:- فیلڈ پبلسٹی بیورو۔ دہلی

ڈوبے ہوئے نغمے

(از جناب علیم پرویز صاحب بی اے علیگ)

تینو اپنے اُبلتے تبسم کو چھپاتے ہوئے بولی ——— اور پہلے تو یہاں تین سا گر بہتے تھے ——— بارن، ستھیل ——— اور راکھا۔ یہی تینوں سے ہم کھڑے ہیں۔ بارن اور ستھیل تو اب خشک ہو گئے۔ بس یہی ایک باقی ہے۔ گو متی میری۔ اس کی ہجوں تو کہتی تھی کہ جب سے بارن اور ستھیل خشک ہوئے ہیں یہاں کی زمین پر اب وہ رونق نہیں ہے جو کبھی پہلے تھی ———

اور بارن تو دیوتا ہے ——— بہت بڑے دیوتا ——— گاؤں کے بوڑھے کہتے تھے کہ بارن دیوتا اب اجلاگ کی بلند چوٹیوں پہ رہتے ہیں ——— وہ جو سامنے درختوں کا جھنڈ ہے نا ——— اس کے پیچھے اجلاگ کی فلک بوس چوٹیاں ہیں۔ دھرما کی بستی جہاں ہم رہتی ہوں اجلاگ کی گود میں واقع ہے ———

بارن دیوتا کو دھرما سے بہت محبت ہے۔ جب کوئی غیر شخص آ کر بستا ہے تو اسکو اتنا پریشان کرتے ہیں کہ وہ چند روز میں بستی کو چھوڑ دیتا ہے ——— مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی سی تھی تو بارن میں بہت پانی آیا تھا ——— اتنا پانی کہ آس پاس کے بہت سے گاؤں اس میں ڈوب گئے تھے۔ مگر ہماری بستی بالکل محفوظ رہی تھی ———

تمہارے باپ کیا کرتے ہیں؟" ریوا نے اپنے بازو سے چرمی تھیلا اتارتے ہوئے کہا۔

"میرے باپ" تینو نے افسردگی میں کہا۔ "عرصہ ہوا وہ تو مر گئے۔ مگر میری ماں کہتی ہے کہ میرا باپ ایک بڑا زمیندار تھا۔ اس کے بہت سارے کھیت تھے۔ سر پر ایک بڑا سا صافہ باندھتا تھا۔ ہر اتوار کو وہ نوکروں کو گھر پر بلاتا تھا۔ سب کو کام کرنے کی ہدایت دیتا تھا اور پھر سب کو مزدوری بانٹتا تھا۔" یہ کہکر وہ خاموش ہو گئی۔ اور راگا کے اس پار ٹوٹے ہوئے مجسمے کو کچھ اس انداز میں دیکھنے لگی جیسے اس کے شاعرانہ تخیل میں اسکی باپ کی روح وقتی طور سے اس میں پیدا ہو گئی تھی۔ راگا کے وسیع دامن میں شام کی خاموشی سے بوجھل لہریں کروٹیں لے رہی تھیں اور بسا اوقات بیقراری میں بڑھکر مجسمے کے آگے اگی ہوئی گھاس کو ہلا دیتی تھیں۔ گزرے ہوئے ایام کے کسی بت تراش نے راجہ گردھا کا یہ حسین مجسمہ بنایا تھا جس نے ایک عرصہ تک اس علاقے پر حکومت کی تھی ——— ——— اور دیر تک تینو کسی گہری فکر میں ڈوبی رہی۔ آخر اپنی نظریں مجسمے سے ہٹاتے ہوئے بولی ———

"تم کون سے دیس سے آ رہے ہو؟"

"سولن سے۔"

"وہاں تو ابھی میلا لگا تھا ——— کیا کیا لائے ہو تم؟"

——— "اچھے اچھے کپڑے اور زیور" یہ کہکر ریوا نے اس کی پوری تھیلا کھول لیا ——— ماتھے کی بندیا ——— جوشن ——— جڑاؤ چوڑیاں ——— کنگن ——— طلائی آویزے ——— یہ سب دیکھکر اس کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ اور مسکراتے ہوئے بولی "کتنے اچھے ہیں یہ ——— مگر یہ تو تمہارے ہیں۔"

"تمہیں پسند ہیں؟" ریوا نے اس بے تکلفی کو درگزر کرتے ہوئے کہا۔

"بہت"

"لو ——— یہ تم پہن لو ———"

"اور تم گھر جا کر کیا کہو گے؟"

"یہی ——— کہ تمہیں نذر کر دیں۔"

"مگر تم کون ہو ——— ؟ تمہارا کیا نام ہے ——— ؟ کیا کرتے ہو ——— ؟"

ریوا کے ہونٹ مسکراہٹ سے کچھ آپ ہی آپ پھیل گئے۔ کتنی معصوم اور سادہ لوح ہے یہ لڑکی ——— وہ سوچنے لگا۔ پہاڑی ماحول میں رہکر اس کے خدوخال بھی شبنمی بوندوں کی طرح حسین بن گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں تینو کی کشادہ پیشانی پر بکھرے ہوئے بال کچھ اس طرح معلوم ہوتے تھے جیسے افق کی چتون پر گھنگھور گھٹاؤں نے بل ڈال دیئے ہیں۔ اور مستی سے ابلتی ہوئی آنکھیں پیشانی کے نیچے دو چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ جو زیر افق ہلکی ہلکی کالی لکیروں سے گھیرے ہوئے ہوں۔ اس کے تشنگی لئے ہوئے لب ہر دیکھنے والے کو کچھ پیغام دیتے تھے ——— خیال انگیز جس سے سارے جسم میں ایک لغزش سی پیدا ہو جاتی تھی ——— اور یہ خیال ریوا کے دماغ میں کچھ اس پھرتی سے گشت کرنے لگا کہ اسے اپنی زندگی کے مٹے ہوئے نشانات کا خیال آ گیا ——— اس کا ماضی کتنا رنج و الم لئے

...تھا۔ اور اس کے برخلاف نینو کی زندگی رنج و فکر سے آزاد تھی۔ اسکی باتوں
...معصومیت تھی۔ لطافت تھی اور ساتھ کے ساتھ جاذبیت بھی ——— ریوا کی
...اس کے چہرے سے پھر کر اب اسکی آنکھوں پر ٹھیر گئیں جو ایسے دمکتے ہوئے
...کی طرح معصومیت سادگی اور محبت کا لاوا اگل رہی تھیں۔ اسے
...س ہوا جیسے یہ تینوں چیزیں یکجا ہوکر ایک چشمے کی صورت میں بہہ رہی ہیں۔
...تیز دھارا میں ہر کوئی بہہ سکتا ہے۔ اور ان خیالی باتوں پر اسے واقعی
...نوں کے قریب چشمے کا شور سنائی دینے لگا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں
...کو اس چشمے کے رنگ میں ڈبو دینا چاہا۔ مگر نینو کے ہاتھ نے اس کے جسم کو
...یا اور اس کے تمام خیالات درہم برہم ہوگئے۔ گھبرا کر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں
...کے پہلو میں کھڑی ہنس رہی تھی شاید ریوا کی بدحواسی پر ——— اور اپنی
...نٹ وہ دباتے ہوئے بولی ——— "کس سوچ میں پڑ گئے تم؟"

"کچھ نہیں" ریوا نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا "سوچ رہا تھا کہ
...باپو کی طرح میں بھی کبھی بڑا آدمی تھا۔ میرے بھی بہت سے کھیت تھے۔ لیکن
...یہاں کے کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ بڑے سرکار کے ہاں بھی ملازم ہوں۔
...کے لوگ مجھے ریوا کہتے ہیں ——— مگر تم یہاں
ڈوبے کیا کرتی ہو؟"

"بیٹھا" نینو قدرے تامل سے بولی ——— "سموتی کے گھر سے جب
...ہوں تو کچھ دیر یہاں بیٹھ جاتی ہوں ——— اور پھر سورج چھپتے ہی گھر
...پہنچ جاتی ہوں۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" ریوا نے ذرا رک کر پوچھا۔

"میرا نام ——— نینو" اس نے ایک دلکش سادگی میں جواب دیا۔

شام زیادہ ہو چلی تھی۔ اور راگا کی چمکیلی لہریں تاریکی میں غائب ہوچکی
...مگر کبھی کبھی موجوں میں ایک ہلکا سا تموج پیدا ہوکر ساری دنیا کو موسیقی
...روں میں لپیٹ لیتا تھا۔ گردھارا کا مجسمہ بھی بڑھتی ہوئی سیاہی میں دھندلے
...سے خوابوں کی طرح نظر آرہا تھا۔ نینو راگا کے کنارے کبھی اتنی دیر نہیں ٹھیری
...پھیلتے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر وہ بے اختیارانہ بول اٹھی ——— "ماں میرا
...انتظار کر رہی ہوگی ——— اب میں جاتی ہوں۔"

"اور یہ زیور" ریوا نے اسکی آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے پاس رکھو۔"

"نہیں ——— میری طرف سے تم لے لو۔

نینو کا ہاتھ خود بخود ریوا کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے زیورات کو اپنے آنچل میں باندھ لیا اور تیزی سے قدم بڑھا کر وہ شام کی سیاہی میں غائب ہوگئی۔

نینو نے یہ زیورات شاید پہلی بار تاجو کی شادی میں دیکھے تھے۔ تاجو اسکی ساتھ کی کھیلی ہوئی تھی اور اسکی شادی کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا۔ اس روز تاجو کو سر سے پیر تک زیورات میں لدا دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ اس وقت اس کا ہلکا نقرئی رنگ کا گھونگھٹ فلکی ستاروں کی طرح چمک رہا تھا۔ اور وہ آس پاس کی عورتوں میں گھری ہوئی ایک چاند کی طرح نظر آرہی تھی جو تاروں کے جھرمٹ میں آہستہ آہستہ آسمان پر تیر رہا ہو۔ شہنائیاں بج رہی تھیں اور ڈھولک پہ ٹھیٹ دیہاتی گیت گائے جا رہے تھے۔ ڈھولک کی آواز نے نینو کے تمام تصورات کو منتشر کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ متواتر تاجو کے زیورات کے متعلق سوچتی رہی۔ تاجو کے اندر آج وہ غیر معمولی حسن دیکھ رہی تھی۔ زیورات نے شاید اس کے حسن میں اور بھی اضافہ کردیا تھا ——— اس روز سے اب تک تاجو کے جسم کی جگمگاتی ہوئی چیزیں اس کے ماضی کے دلفریب دور کا ایک جز بنی ہوئی تھیں۔ اور آج اس نے ان چیزوں کو پاکر اپنی دیرینہ خواہش کو مکمل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا۔ اس نے ان خیالات کی موجودگی میں اتنا راستہ طے کرلیا تھا کہ دھرما کی بستی کے کانپتے ہوئے چراغ اسے نظر آنے لگے۔ اسکی رفتار پہلے سے کچھ تیز ہوگئی۔ گھر میں اگر کسی نے پوچھا کہ زیورات کس نے دیئے ہیں تو وہ کیا جواب دیگی۔ اس کا دماغ اب اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسکی ماں ہمیشہ دروازے پر اس کا انتظار کرتی تھی۔ اور آج تو خلاف معمول اسکو دیر بھی ہوگئی تھی۔ وہ ضرور دروازے پر کھڑی نینو کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس نے جسم کے ہر اعصاب کو اس فکر کی گہرائی میں ڈال دیا۔ مگر وہ کسی قابل قدر نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ اسی الجھن میں وہ بستی میں داخل ہوگئی۔ اور لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی ٹھیک کچی ٹھیا پہ پہنچ گئی۔ جہاں سے اس کا گھر بالکل سامنے نظر آرہا تھا۔ مکان کے باہر منجو بیٹھا بھینس کا دودھ نکال رہا تھا۔ اور رسوئی سے دھواں نکل رہا تھا۔ نینو نے سوچا کہ آج شاید اسکی ماں کو پکانے میں دیر ہوگئی ہے۔ اور یہ موقع غنیمت سمجھ کر وہ مکان میں تیزی سے قدم اٹھا کر داخل ہوگئی منجو نے پلٹ کر دیکھا بھی اور اسکی عجلت کا جائزہ بھی لینا چاہا مگر نینو ایک لمحہ کے لئے بھی منجو سے بات کرنے کی غرض سے نہیں رکی۔ اور اپنے کمرے میں داخل ہوکر اس نے بکس کھولا اور تمام زیورات کو مقفل کردیا۔

دوسرے روز شام کو جب نینو سموتی کے گھر سے لوٹ رہی تھی تو راگا کے کچے گھاٹ پر اسے دور سے کوئی سایہ متحرک نظر آیا۔ اس کے دل میں ریوا کی موجودگی کا فوراً خیال ہوا۔ اور وہ غیر ارادی طور سے سائے کی طرف بڑھ گئی۔ مگر بستی کے

سے کیسا ہو کار برج نرائن کو آتے دیکھکر بہت کوفت ہوئی ــــــ نہ جانے کیوں ــــــ وہ ریوا کو دیکھنے کے لئے بیقرار تھی۔ اسے اب گنگا کے کنارے تنہا کھڑے رہنے میں کچھ الجھن سی ہو رہی تھی۔ گزشتہ روز کی باتیں اس کے دماغ میں اب بھی گونج رہی تھیں۔ اور ریوا کی قدرے بھرائی ہوئی آواز اس کے کانوں کے پاس بلند ہو رہی تھی۔ شام کے وقت سورج کی زرد زرد کرنوں میں گنگا کی لہریں اسکو ہمیشہ دلکش نظر آتی تھیں۔ مگر آج معلوم کیوں وہ ان لہروں میں بھی کوئی خوبصورتی نہیں دیکھ رہی ہیں۔ اس نے پہلی بار اپنے مستقبل پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اسکی قلب کی دھڑکنیں بتلا رہی تھیں کہ آنے والے دور میں وہ مسرتوں اور خوشیوں سے کوسوں دور نکل جائے گی۔ کوئی آواز بھی اسے گر وہ نہ لوٹنے گی۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے وہ ان واقعات کو نکالیگی۔ جنسے اسکی زندگی بھی جگمگا رہی تھی۔ روشن تھی اور ساتھ کے ساتھ بیدار بھی ــــــ اس بھیانک دور کا خیال اس کے دماغ میں ایک ذہنی ہلچل کی صورت میں نمایاں ہوا اور پھر اسکی تمام توجہ مستقبل کے دلدل میں پھنس گئی ــــــ ریوا کا ابھی تک کچھ پتہ نہ تھا اور شام کی سیاہی ہوا تیز پھیل رہی تھی۔ افق سے ابھرتا سے گہری شفق غائب ہو چکی تھی اور دور آسمان پر کوئی موٹا تارہ مسکرا رہا تھا تینو کی آنکھیں اوپر پر ٹھیر گئیں اور پھر اس موٹے تارے پر جو افق کے نقطے پر ایک بت ہیا کی طرح جھانک رہا تھا۔ تینو دیر تک اس موٹے تارے کو تکتی رہی۔ اسکے تخیل میں بھی ریوا ایک تارے کی طرح جھانک رہا تھا ــــــ کچھ دیر اور بھی گزر گئے ــــــ یکدم اسکی آنکھیں خوف سے پھیل کر پگڈنڈی پر جم گئیں [illegible] کوئی راہ نورد تاریکی کو چیرتا ہوا تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کی امیدیں یکجا ہو کر اس سائے کے گرد ناچنے لگیں ــــــ لیکن پھر ریوا کا سایہ ہونے [illegible] سے باتیں کرنے لگی۔ اس کے پاؤں لاشعوری طور سے آگے پیچھے حرکت کرنے لگے۔ اور اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ جب ہلکی گہری تاریکی میں اسے ریوا کا تھکا ماندہ چہرہ نظر آیا ــــــ کچھ مضمحل اور نڈھال ــــــ وہ عجیب انداز میں چل رہا تھا۔ تینو کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ مگر وہ سایہ اس سے کچھ دور ٹھیر گیا۔ اس بار تینو نے پہلے سے کہیں زیادہ اس سائے کو بغور دیکھا اور ریوا کی موجودگی کا یقین کر کے وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی ــــــ "قریب کیوں نہیں آتے۔"

"ڈر معلوم ہوتا ہے۔" ریوا نے تمسخرانہ لہجہ میں کہا۔

"مجھ سے"

"ہاں تم سے"

"کیسی باتیں کر رہے ہو تم"

"تمہیں بری معلوم ہوتی ہیں۔"

"ہاں ــــ بہت ہی بری۔ تینو نے منہ بنا کر کہا اور ایک ہلکا سا قہقہہ بھی ساتھ لگا دیا۔ ریوا کے کانوں میں اس کا قہقہہ کچھ اس طرح گونجنے لگا جیسے کہیں دور سے چھاگل کی صدا فضا میں سانس لیتی ہوئی آ رہی ہے۔ تینو کی [illegible] نے اسکے دل پر پھر ایک ہلکی سی ٹھیس لگا دی تھی۔ ریوا کو بس دو دو سال پیشتر کی شام یاد آ رہی تھی جب اس نے رنجھا کو اپنے پہلو میں جگہ دی تھی۔ لیکن رنجھا کی موت نے اسکے بنے بنائے گھروندوں کو ڈھا دیا تھا ــــــ اس کی آرزوئیں ــــــ امڈتے ہوئے جذبات ــــــ اور آنے والے دور کی سب رنگینیوں کو بے دردی سے روند دیا تھا۔ اس کا دماغ اب رومانوی باتوں سے خالی تھا۔ رنجھا کا تصور اسکو گزرے ہوئے دنوں کی یاد دلاتا تھا۔ اس نے رنجھا کے ساتھ سورج کو افق کا سہارا لیکر ڈوبتے ہوئے دیکھا ــــــ چاند کو ایک کھلی ہوئی رقاصہ کی طرح آسمان پہ تھرکتے ہوئے ــــــ اور برسات کی نشہ آور گھٹاؤں میں تو رنجھا کا تصور اسکو بہت ستاتا تھا ــــــ رنجھا کے ساتھ لمبی ہوئی شامیں ــــــ کھیتوں کی منڈیروں پر ساتھ بیٹھے ــــــ شام کی سکون انگیز فضا میں پرندوں اور ہواؤں نے ہم آہنگ نغمہ بہت ــــــ اب بھی اس کے [illegible] کر رہے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ گھر لوٹتے وقت وہ بارش میں بھیگ جاتے تھے۔ [illegible] کپڑے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک جاتے تھے اور اسکی چھاتی کے نیم چھپے ہوئے گول دائرے اور جھلکتے ہوئے ساغر معلوم ہوتے تھے ــــــ بجلی چمکتی تھی تو رنجھا ڈر سے ریوا کے اس سے چمٹ جاتی تھی۔ ریوا کو احساس ہوتا تھا جیسے اس سے لپٹ کر اسکے جسم میں ایک نئی زندگی دوڑ رہی ہے ــــــ اور آج پورے دو سال بعد وہ پھر اسی دور کو دیدہ و دانستہ بلا رہا تھا ــــــ اپنی پریشانیوں کی ــــــ تکلیف دہ لمحات کی ــــــ افسردہ گھڑیوں کو جن کو وہ پہلے بھی ایک بار دیکھ چکا تھا ــــــ اس مرتبہ تینو نے ریوا کی خاموشی کو دیکھکر اپنا ہاتھ اسکے شانے پر رکھدیا۔ اور وہ چونک پڑا۔ تینو اس کے اور قریب گئی۔ اسکی گرم گرم سانسیں۔ ریوا کے ہونٹوں پر آ کر ٹھیر رہی تھیں۔ ریوا کو محسوس ہوا کہ تینو کے قریب آتے ہی اس کے نتھنوں میں ہلکی، بھینی اور سوندھی خوشبو داخل ہونے لگی۔ ــــــ اسکی انگلیوں کا لمس اسکو ایسے دنوں کی یاد دلا رہا تھا جو آج تک اس نے رنجھا کے ساتھ بھی بسر نہیں کئے تھے۔ مگر وہ دیر تک اس خوشگوار لمحے میں نہ رہ سکا۔ اور تینو اس کے شانے سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

[illegible] اس کے گرد ـــــ [illegible] یہ الفاظ اس کے کانوں میں مسلسل [illegible] میں چکر کاٹنے لگے۔ اُس نے ایک بار پھر نیتو کی آنکھوں کا جائزہ لیا۔ اُس کے خیال میں نیتو کی آنکھیں نہ تو بالکل سیاہ تھیں اور نہ ہی شربتی [illegible]۔ بلکہ اُسکی آنکھوں میں ان تمام روشنیوں کا باہم امتزاج موجود تھا جو ایک چھپتے ہوئے سورج اور اُبھرتے ہوئے چاند سے پھوٹتی ہیں۔ اور یہ سوچ کر اسکے دماغ پر ایک عجیب وجد سا طاری ہونے لگا۔ نیتو اسکی خاموشی پر پھر یکایک بول اُٹھی ـــــ "کب تک خاموش رہوگے؟" اور رتوا آخر اپنے خیالات کو دباتے ہوئے بولا ـــــ "تم ہر روز یہاں آتی ہو؟"

"ہاں ـــــ اور تم؟" نیتو اپنی گردن کو ہلاتی ہوئی بولی۔

"بنگلے سے لوٹتے ہوئے میں ہر روز یہاں سے گزرتا ہوں۔"

"پسند آیا یہ پہاڑی مقام؟"

"بعض اوقات تو ان اونچے پہاڑوں کو دیکھکر طبیعت گھبرا جاتی ہے۔"

"طبیعت گھبرا جاتی ہے؟" نیتو نے زور سے ہنستے ہوئے کہا ـــــ یہاں تو کچھ بھی پہاڑ نہیں ہے۔ یہ جگہ تو پھر بھی میدانی ہے۔ اعلکہ کے پرے جاکر دیکھو تو سب طرف پہاڑ ہی پہاڑ نظر آئیں گے ـــــ چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں ان پہاڑوں میں ـــــ اور "رسین" نامی بستی تو ـــــ تمہیں کیا بتاؤں کتنی خوبصورت ہے۔ وہاں خوبصورت قسم کے ہوٹل ہیں ـــــ بڑے بڑے افسر اس میں جاکر ٹھہرتے ہیں۔ یہ جگہ تو صرف کھانے پینے کے لحاظ سے اچھی ہے۔ یہاں سے پہاڑی ہر روز دودھ، گھی، چاول، ترکاری اور دیگر چیزیں لے جاتے ہیں۔ ساوتری میری پڑوسن کی ایک لڑکی "رسین" میں بیاہی ہے۔ وہ تو کہتی ہے کہ جب وہاں کوئی طوفان آتا ہے اور بارش خوب زور کی ہوتی ہے تو بڑے بڑے پتھر پہاڑوں سے گر کر بستی کی جھونپڑیوں اور مکانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں ـــــ" ساوتری کا خیال آتے ہی وہ رُک گئی۔ اُسے اپنی ماں کا خیال آگیا۔ اور پھر وہ رتوا کو مخاطب کرتے ہوئے بولی ـــــ "اب میں گھر جاتی ہوں ـــــ ماں میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔" رتوا بھی دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ اسکے جسم کا ہر اعضا تھکن سے چور تھا۔ اور وہ دونوں کچھ دور ساتھ چل کر الگ الگ پگڈنڈیوں پر مڑ گئے۔ رتوا نے کئی بار اُسکو مڑ کر دیکھا اور اُسکی سادگی اور خوبصورتی اسکے دل کی گہرائیوں میں ہر بار اُترتی گئی۔

رتوا اس راہ پر پہلے ہی چل چکا تھا۔ رمبھا اسکی زندگی میں حسین قہقہوں کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ اور اشک بن کر نکل گئی تھی۔ رمبھا کی محبت یہ اُسے کچھ شک نہ تھا۔ اور یہ شک شاید اُسے رمبھا کے مرنے کے بعد پیدا ہوا۔ نہ معلوم کیوں اُس خیال میں [illegible] رمبھا کو مرے ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اور اُس وقت اسکی محبت کا خیال کر کے یا حاصل کیا تھا۔ رمبھا کی زندگی میں اُس نے شاید کبھی اسکی محبت کے متعلق نہیں سوچا ـــــ وہ ہمیشہ اُسکی آنکھوں کے طلسم جادو میں بہتا رہا۔ رمبھا نے اُسکو خوش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر پھر بھی وہ اُسکو اپنے سے بہت دور [illegible] تھا۔ رمبھا نے اپنی محبت جتانے کے لئے بہت کچھ کیا اور رتوا کو بھی اس چیز کا اعتراف تھا۔ اسکی چند قربانیوں نے رتوا کو بہت متاثر کیا تھا۔ لیکن رتوا کی طبیعت میں یہ چیز عام تھی کہ وہ بہت جلد کسی چیز کا اثر قبول کر لیتا تھا، اس میں چاہے رمبھا ہو یا کوئی دوسرا۔ اُسکی فطرت کی یہی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ جب کبھی رمبھا کا ہمدردانہ سلوک وہ یاد کرتا تھا تو جاڑے کی ایک طویل رات اُسکے سامنے تصویر کی طرح تھرکتی تھی۔ رمبھا نے اُس پر کتنی مہربانی کی تھی ـــــ اگر وہ نہ آتی تو شاید وہ درد کی شدت سے کراہ کراہ کر جان دیدیتا ـــــ اور پھر اُسکی آنکھوں میں اُس رات کا ایک واقعہ گھومنے لگا ـــــ

جاڑے کی طویل رات ـــــ اندھیری اور سنسان ـــــ وہ صاحب کے بنگلے سے لوٹ رہا تھا۔ اس کا دماغ خیالات کے ہجوم سے بھاری تھا۔ اُس کا دل کسی خاص نظریہ کے ماتحت دھڑک رہا تھا۔ اُسکے اعضا بھی تو بعض اوقات شدت احساس سے کانپ اُٹھتے تھے۔ شاید وہ صاحب کی ناراضگی اور اپنی حرکت پہ ملامت کر رہا تھا۔ وہ تمام راستے ڈر و خوف میں مبتلا رہا تھا۔ جنگلی درختوں میں سے کچھ عجیب قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور وہ ایک بے حسی کے عالم میں لڑکھڑاتا شرابی کی طرح چل رہا تھا کہ یکایک اُس کا پاؤں کسی پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں جا گرا اور جب اُس نے گڑھے سے اپنا پاؤں نکالا تو وہ مٹی سے لت پت تھا۔ ہلکی ہلکی ٹیس اُسکی پنڈلی میں اُٹھنے لگیں۔ چوٹ تازہ دگرم تھی۔ اُس نے پرواہ نہیں کی۔ اور وہ برابر چلتا رہا۔ مگر گھر پہنچنے سے کچھ دیر قبل اس کی پنڈلی میں شدت کا درد ہونے لگا۔ جسکی وجہ سے ایک، ایک قدم بھاری معلوم ہونے لگا۔ اسی تکلیف دہ عالم میں آخر وہ گھر پہنچ گیا۔ اُسکی ماں نے پاؤں اور پنڈلی کو صاف کیا اور "کوڑی" [illegible] کر ان خراشوں پر لگا دی جو پتھروں سے کچھ جانے سے ہوگئی تھیں۔ مگر رتوا کا درد بڑھتا گیا۔ اور آخر وہ درد سے کراہنے لگا۔ رمبھا کا مکان اُس کے گھر سے کچھ دور نہ تھا۔ بیچ میں صرف دو مکان چھوڑ کر اس کا گھر تھا۔ رمبھا کا یہ دستور تھا کہ جب رتوا شام کو گھر لوٹتا تھا تو رات کو مکان کے پچھلے حصے سے وہ اُسے دیکھکر چلی جاتی تھی۔ حسب معمول جب اس روز وہ مکان کے پچھواڑے پہنچی تو اسکے کانوں میں رتوا کے چیخنے کی آواز آئی۔ اسکی آواز سنکر

[illegible] نینو بغیر کچھ کہے سنے رَیوا کو چھوڑ کر اپنے گھر چل دی۔

اگلے روز شام کو جب سورج اُفق کی گود میں چھپ رہا تھا۔ نینو راگنا کے کنارے رَیوا کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس روز نینو نے گھر کا ذرا سا بھی کام نہیں کیا تھا۔ اسکی تمام حسرتیں چہرے سے کچھ اس طرح غائب ہو چکی تھیں جیسے سحر کے وقت اُفق کے ماتھے سے مسکراتے ہوئے تارے۔ رَیوا کا تصور اسکے تمام خیالات پر حاوی تھا۔ اسکی آنکھیں چاروں طرف اپنے کھوئے ہوئے سائے کی تلاش کر رہی تھیں۔

اور آخر اسکی نظریں اپنے محور کے اردگرد گھومنے لگی۔ رَیوا اپنا چمڑی تھیلا کاندھے پر رکھے آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سایہ نینو کے سامنے ٹھیر گیا۔ نینو بڑھکر اس کے پاس آگئی اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتی ہوئی بولی:۔

"جا رہے ہو ؟"

"ہاں ــــــ مگر میں آؤں گا ایک بار اپنی نینو کو دیکھنے۔"

رَیوا اپنا تھیلا سنبھالتا ہوا بولا۔

"کاش ــــ تم اِن الفاظ کو نہ بھولو !"

"تم بھروسہ کرو !!"

"پردیس میں جاکر سب بھول جاتے ہیں۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

اور رَیوا یہ کہکر آگے بڑھ گیا۔ نینو کا چہرہ ایک دم افسردگی میں گھر گیا۔ اس کو اب ہر طرف رَیوا کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ہر چیز اسکی عکاسی کر رہی تھی۔ راگنا کی لہروں پر رَیوا کا چہرہ تیرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں سے آپس میں ٹکرا کر رَیوا ــــ رَیوا پکار رہی تھیں۔ اس کے جسم کے ہر اعضا پر رَیوا ناچ رہا تھا۔ دل میں ــــ دماغ میں ــــ ہر رگ میں رَیوا سمایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پگڈنڈی پر سائے کے ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ رَیوا کا شکستہ سایہ برابر تھرکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا ــــ اور کچھ لمحے بعد وہ سایہ اُسکی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس کی نظریں پگڈنڈی سے لوٹ کر اب ماحول کا جائزہ لینے لگیں۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے اُس کے بالوں کو پریشان کر رہے تھے۔ [illegible] کے پتّے زمین پر گر کر ایک دلکش آواز پیدا کر رہے تھے۔ نینو نے اپنے جسم کو حرکت دیکر آگے بڑھایا۔ اس کے کانوں میں پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ گونج رہی تھی۔ اس کا دل رَیوا کے ساتھ بسرے ہوئے اوقات

[illegible] ایک چھوٹا سا [illegible] ہے ــــــ

ہوا کے جھونکے اس کے جسم کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے لیکن [illegible] کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی ــــــــ اور [illegible] کے سبز [illegible] نہ جانے کب تک ہوا کے تیز جھونکوں سے بھنور کی صورت میں زمین سے بلند ہوتے رہے۔

دلِ بیتاب

(از جناب امین الدین احمد صاحب عارف صدیقی)

سلیم کا شمار درجہ کے ذہین ترین لڑکوں میں سے تھا۔ وہ ہر درجہ میں فرسٹ پاس ہوتا آیا تھا۔ چنانچہ ایف اے کا امتحان بھی اُس نے فرسٹ ڈویژن میں بڑے اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد سلیم اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ یونیورسٹی کی فضا کالج کی فضا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں کی فضا نے سلیم جیسے خوش طبع انسان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہاں قدم رکھتے ہی اس میں ایک زبردست تبدیلی پیدا ہونے لگی۔

ویسے تو ذہین واقع ہوا تھا اور ساتھ ہی ساتھ محنتی بھی۔ جب ہی تو اب تک تمام امتحانات میں ممتاز ہوتا آیا تھا۔ یونیورسٹی کا طالب علم بننے سے پہلے اُسکی تمام تر توجہ اپنی پڑھائی کی طرف مبذول رہتی تھی۔ مگر اب اس کی توجہ منتشر ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو ایک یونیورسٹی سٹوڈنٹ (جس کی شان میں محنت سے پڑھنا ایک گستاخی ہے) سمجھنے لگا تھا۔ اسے اپنی اس گمراہی کا مطلق خیال نہ تھا۔ وہ اسے اپنی بھلائی اور ترقی کا ذریعہ قرار دے رہا تھا۔ وہ اپنے فرض کو غلط سمجھ رہا تھا۔ دراصل یونیورسٹی کی فضا نے سلیم کو وہاں کی سوسائٹی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

نصیر بھی سلیم ہی کا کلاس فیلو تھا اور دونوں کی طبیعت میں کافی یکسانیت بھی پائی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے یہ دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ سلیم اور نصیر کو خداوند تعالیٰ نے مذاقِ سلیم عطا فرمایا تھا۔ اسی لئے وہ کالج کی پُر فضا زندگی میں (جو لڑکیوں کی وجہ سے اور بھی زیادہ لطیف اور بہترین گئی تھی) کبھی بھی کسی حسین موقع سے فائدہ اُٹھانے اور اپنے مذاقِ سلیم کو کام میں لانے سے نہیں چوکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی طبیعتیں بہت ہی زیادہ قابلِ اعتبار تھیں۔ تمام یونیورسٹی کی لڑکیاں اُن کے مذاق اور شرارتوں کا نشانہ بنی تھیں۔ انہیں اس قدر پریشان کیا جاتا تھا کہ بعض اوقات وہ عاجز آکر پروفیسروں سے شکایت بھی کر دیتی تھیں۔ مگر کہاں تک۔ پروفیسر خود دونوں کی شکایتوں کو ناپسند کرتے تھے اور تنگ آکر ٹال جاتے تھے۔ اس طرح یہ بچاری بے گناہوں پر لڑکے روز بروز حاوی ہوتے جا رہے تھے اور لڑکیاں مجبوراً بھیگی بلی بنتی جاتی تھیں۔ نصیر اور سلیم کا اس میں سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ پروفیسروں کی لاپرواہی اُنہیں اور بھی آزادی دے رہی تھی۔ جسے دل چاہتا ستاتے اور بناتے۔ غرض یہ کہ سب ان سے عاجز تھیں۔

نصیر اور سلیم کا یہ رویہ ان کی ذاتی زندگی پر کسی قسم کا اثر نہیں ڈالتا تھا۔ بلکہ یہ تو اُن کے نزدیک ایک وقتی چیز تھی، جسے وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ تمام تفریحات یونیورسٹی کی حدود ہی تک محدود تھیں۔ یہاں سے جانے کے بعد وہ کبھی خیال بھی نہیں کرتے تھے کہ آج کیا ہوا۔ اس کا مقصد اُن کے نزدیک صرف تفریح تھا نہ کہ اِس سے اثر لیا جانا۔

نہ جانے کتنی لڑکیاں آئیں اور کتنی اُن کی شرارتوں سے عاجز ہو کر چلی گئیں لیکن ستانے کا عمل برابر جاری رہا۔ روزانہ نئی نئی ترکیبیں سوچی جاتیں اور ہر ایک کو نئے نئے طریقوں سے بنایا اور پریشان کیا جاتا تھا۔ سب کو ایک سے ایک بڑھ کر خطابات دیئے گئے تھے۔ جو ہمیشہ ان کی چڑ کا باعث ہوتے تھے۔ کسی کو "برق" کہکر پکارا جاتا۔ کسی کا نام "تسکین" رکھا گیا تھا۔ اور کسی کو "ماہ" وغیرہ القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ جب کبھی "تسکین" نامی لڑکی اُن کے سامنے سے گزرتی تو کہتے "تسکین آگئی"۔ ظاہر ہے کہ اس ایہام کا استعمال کتنا حسین اور مذاقِ سلیم سے پُر تھا۔

سلیم اور نصیر بی، اے فائنل میں آگئے تھے۔ رابعہ بھی ان کی کلاس فیلو تھی۔ ان کی شرارتیں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ لوگ اپنی پڑھائی کی طرف سے لاپرواہ ہوتے جاتے تھے کیونکہ فائنل میں انہیں اس قدر تفریحیں نہیں کرنی چاہیئے تھیں۔ یہی ان کا ایک ایسا مقابلہ تھا جس پر اُن کی آئندہ زندگی کے بن جانے کا دارومدار تھا۔ سلیم جو پہلے ہمیشہ اپنے آپ کو ممتاز کرتا آیا تھا ابھی اپنی پڑھائی کی طرف اتنا متوجہ نہ تھا جتنا پہلے۔ اس کے اندر ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔

اُنہوں نے رابعہ کو بھی اپنے دائرۂ مذاق سے بچکر نہ نکلنے دیا۔ حالانکہ وہ اُن سے بہت کٹتی تھی، تاہم یہ لوگ کسی موقعہ کی تلاش میں لگے رہتے۔ رابعہ کلاس میں محض اس ڈر کی وجہ سے کہ بنائی نہ جاسکے سب سے بعد میں پروفیسر کے آجانے کے بعد داخل ہوتی۔ لیکن کب تک وہ بنائے جانے سے نہ بچ سکی۔ اور سلیم وغیرہ نے نہایت حسین طریقے سے اُسے اپنے مذاقِ سلیم کا نشانہ بنا کر اپنی شرارتوں کا ثبوت دیا۔

درجہ میں تمام لڑکے آکر بیٹھ چکے تھے [illegible] کے مطابق پروفیسر صاحب
آگئے تھے ان کے بعد راآبو بھی داخل ہوئی۔ تمام کلاس میں صرف سلیم
کے برابر والی (جو اسی مقصد کے لئے کہ راآبو آکر بیٹھے خالی چھوڑ رکھی تھی) سیٹ خالی
تھی۔ مجبوراً راآبو کو وہاں بیٹھنا پڑا۔ تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر جیسے ہی پروفیسر
صاحب حاضری لے چکے تو راآبو انہیں اپنی کاپی دکھانے کی غرض سے گئی۔ سلیم
نے موقع کو غنیمت جانا اور جھٹ کاپی اٹھا کر ایک سادہ صفحہ پر جلی حروف میں
یہ مصرعہ لکھدیا۔ ؎

دل بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی

اور پھر کاپی واپس رکھدی جہاں سے اٹھائی تھی۔ نصیر سلیم کی یہ سب حرکتیں
دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ کلاس ختم
ہونے پر جب اُسے معلوم ہوا تو اُس نے سلیم کے اس کارنامے پر اظہار خوشی کیا۔
راآبو کلاس ختم ہونے پر دوسری طرف چلی گئی۔ کیونکہ اس کے مضامین اُن سے
مختلف تھے۔

اس واقعہ کو کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ راآبو نے کاپی پر لکھے ہوئے مصرعہ
کو دیکھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ کافی غور کے بعد بھی یہ معلوم نہ کرسکی کہ اس
کا لکھنے والا کون ہوسکتا ہے۔ راآبو کو لٹریچر سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ لہٰذا اُسے
دوسرا مصرعہ معلوم کرنے کا اشتیاق ضرور پیدا ہوا۔ مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آنے
کی وجہ سے اُسے بغیر کسی اہمیت کے چھوڑنا ہی مناسب سمجھا۔

کئی دن بعد سلیم اور نصیر کا گھنٹہ خالی تھا۔ وہ اپنے خالی گھنٹے اکثر لائبریری
میں گزارتے تھے۔ معمول کے مطابق وہ لوگ لائبریری میں پہنچے تو دیکھا کہ راآبو ایک
بنچ پر بیٹھی ہوئی ایک رسالہ بہت غور کے ساتھ پڑھ رہی ہے۔ انہوں نے اس موقع
کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور قریب جاکر ایسے بیٹھے کہ راآبو کو بیچ میں لے لیا۔
تھوڑی دیر تک تو بغیر کچھ بولے ہوئے یہ لوگ بھی رسالہ دیکھتے رہے مگر پھر آہستہ
آہستہ قریب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ راآبو سے شانہ مل گیا۔ وہ عجب پریشانی
کے عالم میں تھی۔ اسکی پیشانی پسینہ سے شرابور ہوگئی تھی۔ رخساروں پر شرم سے
سرخی دوڑ گئی تھی۔ باوجودیکہ وہ ایک اسکول لڑکی تھی، اس کے اندر دوسری
لڑکیوں کی طرح بے شرمی موجود نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُن سے ہٹ جانے کو
کہدے اور اُنہیں ہٹا کر نکل جائے۔ مگر اس کی زبان الفاظ پاتے ہوئے بھی ادا
کرنے سے قاصر تھی۔ الفاظ آآکر رک جاتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو یک بیک اس
حالت میں پاکر جس کا اُسے گمان بھی نہیں تھا، بوکھلاسی گئی۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں
پڑگئی کہ صفحہ اُلٹنا بھی بھول گئی۔ سلیم نے اپنی شرارتوں سے باز نہ آتے ہوئے کہا

اُس پر تو کوئی [illegible] (...) [illegible]
خواب سے چونکی اور سوچنے لگی [illegible] کہ سلیم نے بھی اپنا اخبار اٹھایا
دیکھ کر اسے اندر رکھ لیا تھا اور [illegible] پڑھنے لگا تھا۔ وہ [illegible]
بے تکلفی سے پڑھنے لگے جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ گھنٹہ ختم ہوا اور [illegible]
ہوا مگر یہ لوگ نہ اُٹھے۔ راآبو کی پریشانی اب اور بڑھتی جارہی تھی۔ کیونکہ تمام
لڑکے اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ اپنے دل میں کیا
کہتے ہوں گے۔ ان ہی خیالات میں وہ دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔ سلیم نے پنسل لے کر
اخبار پر موٹے حروف میں لکھدیا ؎

دل بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی

سلیم اور نصیر چلے آئے۔ راآبو کو کچھ تسلی ہوئی اور وہ خدا کا شکر
ادا کرنے لگی۔ اسکی نظر جب اخبار پر پڑی تو وہی مصرعہ جو کاپی پر لکھ دیا گیا
تھا پایا۔ اب اسکی سمجھ میں سب کچھ آگیا کہ یہ سلیم کی حرکت ہے۔ اُسے غصہ آرہا
تھا کہ یہ لوگ مجھے کیوں ستاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے دوسرا مصرعہ معلوم
ہوسکنے کی اُمید بندھ گئی تھی۔ اس لئے اُسے غصہ کو ضبط کرنا پڑا۔ اُس نے تہیہ
کرلیا کہ وہ دوسرے مصرعہ کی بابت ضرور پوچھے گی۔

آج پھر سلیم اور راآبو ایک دوسرے کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے تھے
راآبو نے سلیم سے کاپی دیکھنے کی غرض سے مانگی۔ اسپر جانے کیا لکھنے لگی سلیم
سمجھا کہ وہ بدلہ لُٹا رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کاپی سلیم کو واپس مل گئی۔ اس پر
لکھا ہوا تھا۔

"سلیم صاحب! مجھے اس شعر کا دوسرا مصرعہ معلوم کرنے کا بہت اشتیاق
ہے۔ اگر بتائیں تو مہربانی ہوگی۔ فقط راآبو"

سلیم خط پڑھکر سوائے مسکرانے کے اور کچھ نہ کرسکا۔ راآبو اُس کا یہ لوک
دیکھ دیکھکر بہت چڑ رہی تھیں۔ وہ تمام گھنٹہ منتظر رہی مگر سلیم نے دوسرا مصرعہ
نہ بتانا تھا نہ بتایا۔ جب گھنٹہ ختم ہوا تو اُس نے پھر وہی مصرعہ دہرایا ؎

دل بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی

گھنٹہ ختم ہونے پر نصیر نے سلیم سے پوچھا کہ اُس نے تمہاری کاپی پر
کیا لکھا تھا؟ تو سلیم نے مذاق کے طور پر کہدیا "کچھ بھی نہیں"۔ اس سے
نصیر کا اصرار اور بھی بڑھ گیا اور وہ قسمیں دینے لگا۔ آخر سلیم نے اُسے بتادیا۔
اس پر نصیر نے سوال کیا "تم نے اُسے مصرعہ بتا کیوں نہیں دیا"۔ سلیم نے کہا
"بس تم خاموشی سے دیکھتے رہو میں کیا کرتا ہوں۔"
راآبو سلیم کے اس برتاؤ کو بہت برا سمجھ رہی تھی کہ وہ ایک شخص کی

برداشت بھی منظور نہیں کر سکتا۔ آخر اس نے کیوں مصرعہ بتانے میں پس و پیش کی۔ اس کا مطلب کیا تھا۔ یہ سوالات تھے جو اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ اُسے غصہ آ رہا تھا۔ وہ اُسے انسانیت کے درجہ سے گرا ہوا خیال کر رہی تھی۔ سلیم کے برتاؤ کو وہ ننگِ انسانیت قرار دے چکی تھی۔

اگلے دن سلیم اپنی سیٹ پر آ کر پہلے ہی بیٹھ چکا تھا اور بھی بہت سے لڑکے آ چکے تھے۔ رابعہ آ کر سلیم والی سیٹ پر بیٹھنے لگی تو سلیم نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ؎

آپ پہلو میں جو بیٹھیں تو سنبھل کر بیٹھیں

رابعہ ویسے ہی جلی ہوئی تھی، گرج کر بولی "اس سے آپ کا مطلب؟"

"دلِ بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی" سلیم نے نہایت لاپروائی سے جواب دیا۔

اس وقت رابعہ کی حالت دیدنی تھی۔ ایک طرف تو اسے سلیم کی اس حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ دوسری طرف اس کے مذاقِ سلیم کی قائل ہو رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اُسے مصرعہ معلوم ہو جانے کی بھی خوشی تھی۔ وہ اسی حالت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اسی دوران میں ایک صاحب جو بہ گفتگو سن رہے تھے بولے "بہت اچھے سلیم ۔ ایک اور دل جلے بول اٹھے" نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی ——" غرض اس طرح رابعہ بہت ہی بنائی گئی۔ اور اب بنائے جانے کا مستقل ذریعہ پیدا ہو گیا۔

رابعہ کی خوش قسمتی تھی کہ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد امتحانات شروع ہو گئے۔ اب انہیں اتنا زیادہ موقع نہ ملتا تھا کہ وہ اس قسم کی تفریحات جاری رکھیں۔ لیکن پھر بھی دو ایک مرتبہ رابعہ سے جب بھی سامنا ہو جاتا تو وہ بغیر یہ مصرعہ دہرائے ہوئے نہیں رہتے تھے۔ بے اختیار زبان سے نکل ہی جاتا تھا ؎

دلِ بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی

سلیم بی اے پاس کر چکا تھا۔ نصیر اور رابعہ بھی پاس ہو گئے تھے۔ سب لڑکے تو چھٹیاں منانے میں لگے ہوئے تھے مگر سلیم اس انتظار میں تھا کہ کب یونیورسٹی کھلے اور کب وہ اپنی تفریحات کو جاری کرے۔ اور رابعہ کو دیکھ سکے۔ نہ جانے کیوں زندگی میں پہلی بار اپنے دل میں وہ ایک لڑکی کے لئے جگہ پا رہا تھا۔ اس نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو اسی طرح بنایا تھا مگر کبھی بھی کسی سے اتنی محبت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ درد اُس کے لئے نیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو رابعہ کی طرف کھنچتا ہوا پا رہا تھا۔ اُسے تنہائی میں اکثر دو مہینوں کے طویل عرصہ کا خیال پریشان ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔

جوں توں کر کے چھٹیاں ختم ہوئیں۔ سلیم اپنا ارمانوں بھرا دل لئے ہوئے یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوا۔ اُس کے خرمنِ دل پر جیسے بجلی گر گئی ہو۔ اُس کے ارمانوں کا خون کر دیا گیا تھا۔ اُسے روحانی صدمہ پہنچا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے رابعہ اُس سے چھین لی گئی ہو۔ رابعہ کی غیر حاضری اُسے بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کے بغیر کمی محسوس کر رہا تھا۔ اُس سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ وہ گھر چلا آیا۔ وہ روزانہ جاتا۔ اس لئے نہیں کہ تعلیم حاصل کرے بلکہ محض رابعہ کے انتظار میں۔ لیکن روزانہ اُسے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ کئی دن کے بعد معلوم ہوا کہ رابعہ کے والد کا کسی دوسرے شہر میں تبادلہ ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں جب اُسے شہر کا نام تک معلوم نہیں تھا، وہ رابعہ سے کبھی نہ مل سکنے کے بھیانک خواب سے چونک پڑتا اور آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکتا۔

خدا خدا کر کے ایم اے پاس کیا۔ اُسے بالکل بھی تو خوشی نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں اب بھی رابعہ کی معصوم صورت کے تصور میں نم پائی جاتی تھیں۔ وہ اب بھی ایک موہوم سا خیال لئے ہوئے بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ وہم ہو کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ بظاہر کوئی تدبیر نہیں تھی جس سے رابعہ کو پا سکتا۔ مگر پھر بھی ایک آس تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور رابعہ سے ملے گا۔

ایک اور تازہ غم اُس کے سینہ پر لگایا جا رہا تھا۔ جان بوجھ کر اُس کے دُکھے ہوئے دل کو ایک مستقل نشتر مل رہا تھا۔ پھر اس کے احساس کا دامن تار تار نظر آ رہا تھا۔ آج پھر اُسے رونے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ سلیم کے والدین اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی رچا رہے تھے۔ اس کی شادی اس کے والد کے کسی دوست کی لڑکی سے ہو رہی تھی، جو میرٹھ میں کسی اعلےٰ عہدے پر مامور تھے۔ سلیم نے کبھی اس سے پہلے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ وہ اس خبر سے سہم گیا۔ وہ شادی کی غرض سے لے جایا جا رہا تھا۔ مگر اس کا دل مردہ تھا۔ وہ ہزار کوشش کرتا تھا کہ صاف انکار کرے مگر نہ جانے کیوں اسکی زبان کسی نے سی دی تھی۔ اُس سے دل کی بات زبان پر اور پھر وہ بھی والدین کے سامنے نہیں لائی جاتی تھی۔ وہ مجسم ایک مورت بنا ہوا تھا۔

برات میرٹھ گئی اور وہاں سے تیسرے دن واپس آ گئی۔ جوں جوں دن گذرتا جا رہا تھا سلیم کے دل پر ایک بار سا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس شادی کو رسمی سمجھ رہا تھا۔ اور اُسے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تم نے اپنی آرزوؤں کا خون ہوتے ہوئے دیکھا اور خاموش

[illegible]

کا پتہ کیا بتائے گا۔ اس خیال سے اُسے تمام الزام اپنی قسمت پر لگانا پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسکی زندگی ایک مستقل اندوہ ہو جائے گی۔ کیونکہ رابو کے بغیر وہ کبھی خوش نہ رہ سکے گا۔

آخر شام آئی۔ اور اُس کے لئے اور بھی زیادہ وحشت کا سامان لائی۔ رات گئے اُسے زبردستی کمرۂ عروسی میں دھکیل دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے مجروح دل کو زندہ کرنے کی سعی کی جا رہی ہو۔ سکیم آگے بڑھا۔ اس کے قدم کانپ رہے تھے۔ وہ محبت کے خلاف قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجبور تھا۔ کشمکش میں مبتلا تھا کہ اس نے دیکھا سامنے دلہن سفید ریشمی چادر میں لپٹی بیٹھی تھی۔ رسمی طور پر اُس نے بہت ہی زیادہ پس و پیش کے بعد اُوپری دل سے نقاب اُٹھایا۔ اُسی لمحہ کمرے کی فضا میں گھگی کی سُریلی آواز گونج اُٹھی ؎

دلِ بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی

رُباعیات

(از جناب افسر آفندی)

دُعا

دریائے تخیل کا کنارا ہوجا
مایوس نگاہوں کا سہارا ہوجا
پھر مطلعِ اُمید درخشاں کردے
آ! اور مری قسمت کا ستارا ہوجا

مستی

آج شوخ نگاہوں میں مچلتی مستی
اٹھلائی ہوئی، گرتی سنبھلتی مستی
اور کیف میں ڈوبی ہوئی ہر ایک نظر
سو رنگ قیامت کے بدلتی مستی

حالات

الفاظ سے تحریر بدل جاتی ہے
مضمون کی تفسیر بدل جاتی ہے
کوشش تک ہے واقعات پر دار و مدار
حالات سے تدبیر بدل جاتی ہے

قربانی

(از مسٹر مسعود نسیم بی اے)

عابد اپنے کمرے میں بیٹھا گھڑی کی آواز سن رہا تھا۔ جو کہ اس کی زندگی کی ختم ہونے والی گھڑی کو قریب لا رہی تھی۔ یہ کوئی آج نئی بات نہ تھی۔ ہزاروں بے گناہ اور بیکس انسان اس کمرے میں بیٹھے اپنی اپنی زندگی کی گھڑیاں گن گئے تھے۔ اُنہیں بے گناہ انسانوں میں سے عابد بھی ایک تھا۔ دنیا کے ظلم و ستم کا اور زمانے کی گردشوں کا پِسا ہوا۔ وہ اپنے پچھلے واقعات یاد کر رہا تھا کہ اچانک اُسے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی جو کہ رات کی خاموشی کو توڑتی ہوئی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی، حتّٰی کہ عابد کے کمرے کے پاس آ کر قدم رُک گئے۔ کچھ دیر بعد تالے میں چابی لگی اور آہستہ سے دروازہ کھلا۔ عابد گردن جھکائے بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"سرکار یہی ہے وہ قیدی جس کو آج پانچ بجے صبح ——"

"اچھا تم باہر ٹھیرو!" ایک باریک آواز آئی۔

پھر سپاہی کی آواز آئی۔ جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"اپنی حرکتوں سے خبردار"

یہ دوشیزہ جو کہ حُسن کا مجسّمہ تھی جیل وارڈن کی سولہ سالہ لڑکی تھی۔ جس نے اندر آ کر تھوڑی دیر بعد کہا۔

"معاف فرمائیے گا۔ میں نے اتنی گستاخی کی کہ جان نہ پہچان آپ کے پاس چلی آئی۔ ابّا جان سے آپ کی تعریف سُنی تھی اور اسی وجہ سے آئی ہوں"

"عابد نے پہلی مرتبہ سر اٹھایا اور دوشیزہ کی طرف دیکھکر بولا۔

"آپ نے خاکسار کی کیا تعریف سُنی تھی جو اتنی اچھی لگی؟"

"یہی کہ آپ دوسرے قیدیوں کی مانند نہیں ہیں۔ عموماً جو قیدی یہاں آتے ہیں بہت گرے ہوئے اخلاق رکھتے ہیں۔ آپ کی خوش اخلاقی کی وجہ سے ابّا جان آپ کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ آپ ایک خاندانی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اوصاف عموماً شریف آدمیوں میں ہی پائے جاتے ہیں۔" وارڈن صاحب کی لڑکی نے کہا۔

"خیر یہ تو آپ کے والد صاحب کی مہربانی ہے جو مجھ جیسے انسان کی ایسی تعریف کرتے ہیں۔ ورنہ ناچیز اس کے قابل کہاں۔" عابد نے کہا۔

"مگر آپ نے ایسا کام کیوں کیا جس سے آپ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ممکن ہے کہ آپ بُرا مانیں کہ میں کیوں آپ کی پرائیویٹ زندگی میں دخل انداز ہو رہی ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہو گئی ہے۔ اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کو بھائی جان کہہ کر پکاروں۔" لڑکی نے یہ جملہ اس انداز سے کہا کہ جیسے ایک حقیقی بہن اپنے بھائی سے متکلم ہوتی ہے۔

عابد کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں کیونکہ وہ بہن کی محبت کا بھوکا تھا۔ آج ایک لڑکی سے بھائی کا لفظ سُنکر اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور وہ کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے آپ کا کوئی بھائی نہیں ہے، اسی لئے یہ برادرانہ محبت آپ کے دل سے پھوٹ رہی ہے۔ میری بھی کوئی بہن نہیں ہے آپ کی محبت بھری باتیں سُنکر خواہ مخواہ میرا بھی بہن کہنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تو آپ مجھے ضرور بہن کہہ سکتے ہیں۔"

"اچھا میری پیاری بہن تمہارا نام کیا ہے؟"

"مجھے زیب یا زیب النسا کہتے ہیں۔"

حامد :- اچھا۔ آج سے تم میری بہن ہو۔ گو چند گھنٹوں کیلئے۔ مگر پھر بھی میں بہت خوش ہوں کہ مجھے ان آخری گھڑیوں میں خدا نے تم جیسی رفیق بہن عطا فرمائی۔

زیب النسا :- اچھا تو بھائی جان! کیا آپ مجھے اپنے غم میں شریک کرینگے کیونکہ میں چاہتی ہوں مجھے اپنے بھائی کی زندگی کا پورا علم ہو جائے۔ آپ کا خواہ کیسا بھی راز ہو مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کیجے۔

عابد :- "اچھا بہن! اگر سننا چاہتی ہو تو پہلے قسم کھائیے کہ کسی کو نہیں بتائیں گی۔"

زیب النساء :- میں کسی اور کی قسم نہیں کھاتی۔ صرف اس مالک دو جہان کی قسم کھاتی ہوں کہ تمہارا راز میرے سینہ میں ہمیشہ پوشیدہ رہے گا۔

عابد :- اچھا سنو۔ یہ ہے میری داستان۔

پہلے میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ڈاکٹر ہاشمی نہیں ہوں۔ میرا

عابد۔ میں لاہور کے ایک بہت بڑے خاندان کا لڑکا ہوں۔ میری
زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ بی، اے کا امتحان
دے کر میں ریاست "کنیا" میں جہاں میرا ایک عزیز دوست "عباس" رہتا
تھا چلا گیا۔ ڈاکٹر ہاشمی، عباس اور میں کالج میں سیاسی کاروائیوں میں
بہت نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ہم گورنمنٹ کے خلاف تقریریں کرتے تھے۔
عباس کے ساتھ والے بنگلے میں ایک خورشید نامی دوشیزہ رہتی تھی۔ جس نے
بی، اے کا امتحان دیا تھا۔ اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اور پھر ہم اکثر
ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملاقاتوں نے محبت کا جامہ پہن لیا
خورشید کا نتیجہ نکلا۔ اور وہ ایف اے میں فرسٹ آئی۔ تھوڑے دنوں بعد
میرا نتیجہ بھی آیا اور خوش قسمتی سے میں بھی بی اے میں فرسٹ آیا۔ اب مجھے
لاہور واپس آنا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا پروگرام خورشید کو بتایا کہ دس تاریخ
کو مجھے قانونی کالج میں داخل ہونا ہے۔ خورشید بھی میرے ساتھ ساتھ تاریخ
کو جانے پر راضی ہوگئی۔ چنانچہ آٹھ تاریخ کو ہم روانہ ہوئے اور لاہور آکر اپنے
کالج میں داخل ہوگئے۔ ہماری محبت اور طول پکڑتی گئی اور دو سال کے بعد میں
وکیل بن گیا اور خورشید بی، اے پاس کرکے "کنیا" واپس چلی گئی۔ میں نے
لاہور میں وکالت شروع کر دی۔ خورشید کے ساتھ میری خط و کتابت جاری
رہی۔ پھر خورشید کے خط ایک دم آنے بند ہوگئے۔ جس کی وجہ سے میں
بہت پریشان ہوا۔ پھر ایک دن خط آیا:۔

پیارے عابد! سلامت رہو۔

آداب۔ جو خواب ہم دونوں دیکھ رہے تھے اُن کی تعبیر اُلٹی نکلی۔ اب وہ کبھی
پورے نہیں ہونگے۔ وہ دُنیا جو ہم بسائے بیٹھے تھے آہستہ آہستہ مٹتی نظر آرہی
ہے۔ آج پانچ تاریخ ہے۔ دس کو میری شادی ڈاکٹر ہاشمی سے ہو رہی ہے
میں نے بہت کوشش کی اور والدہ سے کہا کہ میں اور پڑھوں گی ابھی شادی نہیں
کرنی چاہیئے۔ وہ کسی طرح نہیں مانتیں۔ لاچار دل تھام کر بیٹھ گئی۔ ممکن ہے کہ
تم کو ہماری شادی منظور نہ ہو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا، پیارے عابد! خورشید
ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تمہاری ہوچکی ہے اور کوئی دُنیا کی طاقت اُسے دوسرے
سانچے میں نہیں ڈھال سکتی۔ اگرچہ ہاشمی میرے جسم کا مالک ہوسکتا ہے مگر میرے
دل پر قابو نہیں پاسکتا۔ دل میں تمہارا ورد ہے اور وہ ہمیشہ کیلئے اپنے عابد
کا غلام رہے گا۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل پر جو کچھ گزریگی وہ اگر کسی اور پہ
گزرتی تو اس کی تاب نہیں لاسکتا۔ مگر تم اپنی خورشید کے واسطے سب
کچھ برداشت کرلوگے اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ بات اگر ظاہر ہوگئی تو اس
میں میری بدنامی ہوگی۔ اور تم یہ [illegible] کبھی نہیں
دیکھ سکتا۔ میری یہ دُعا ہے کہ تم اس دُنیا میں خوب پھولو اور پھلو اور میں
دیکھکر خوش ہونگی۔ اور اسی سہارے جیتی رہونگی کہ میرا عابد دُنیا میں
ایک کامیاب ہستی کی طرح زندگی بسر کررہا ہے۔ میرے لئے تمہارا دیا
ہوا غم ہی زندگی کا سہارا ہوگا۔ کہ

تم نے دیا ہے غم مجھے اس لئے غم سے پیار ہے

اب رخصت ہوتی ہوں۔ خدا حافظ   تمہاری بدنصیب
خورشید

اِتنا سُنا کر عابد خاموش ہوگیا۔

زیب النساء۔ پھر کیا کیا آپ نے؟

عابد:۔ اس خط کو پاتے ہی میں نے خورشید کے والد کو خط لکھا اور رشتہ
مانگا۔ مگر میری التجا ٹھکرا دی گئی۔ چھ مہینے بعد خورشید کی شادی ہوگئی۔
اُدھر میں نے وکالت چھوڑ دی اور در در کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ میں لاہور چھوڑ
چکا تھا۔ اور اب پونہ میں رہتا تھا۔ عباس کے ساتھ میری خط و کتابت تھی۔
اس سے معلوم ہوا کہ اب ایک سال کے بعد خبر آئی کہ خورشید کی گود ننھے سے
بچے نے پُر کر دی تھی۔ کچھ عرصہ تک بخار آتا رہا مگر پھر وہ اچھی ہوگئی۔ ایک دو
ہفتے کے بعد میں میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ پاس ہی اخبار پر میری نظر پڑی
اور اسٹاپ پریس کے نیچے جو نظر پڑی معلوم ہوا کہ وزیرستان کے پٹھانوں
نے گورنمنٹ کی حدود میں آکر لوٹ مار مچائی اور تمام گورنمنٹ افیسرز اور
ہسپتال کے ڈاکٹروں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اور اپنے علاقہ میں جاکر وہ
ایک ایک کو موت کے گھاٹ اُتار رہے ہیں۔ میں ایک دم چونکا کیونکہ خورشید
کا خاوند وہیں ہسپتال میں سول سرجن تھا۔ اس کے دو روز بعد عباس کا خط آیا
لکھا تھا کہ:۔

پیارے عابد!

تم نے شاید اخبار میں پڑھا ہوگا کہ وزیرستان کے پٹھان لوٹ
مار کرکے سرکاری آفیسرز کو بھی لے گئے ہیں۔ مگر تمہیں یہ خبر نہ ہوگی کہ ان کے
ساتھ کیا سلوک ہونیوالا ہے۔ ان آفیسرز میں ڈاکٹر ہاشمی بھی ہے اور اسکو انہوں نے
موت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اب وہ جیل میں بند ہے۔ خورشید خوش قسمتی سے
اُن کے ہاتھوں سے بچ گئی تھی مگر وہ گھر واپس نہیں آئی۔ اگر ہوسکے تو تم فوراً
وہاں پہنچو اور اسکی بروقت امداد کرو۔ فقط   تمہارا عباس

یہ کہتے ہی میں رات کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ یہ [illegible] افغان [illegible] کا دوست تھا جو وزیرستان کے سردار کا بیٹا تھا۔ میں سیدھا اُس کے پاس گیا۔ اور سب واقعات اُسے بتائے۔ مگر وہ بیچارا مجبور تھا۔ آخر جب میں نے اُسے ایک اور تدبیر بتائی تو وہ راضی ہو گیا۔ مگر پھر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ نہیں میں ایسا نہیں ہونے دونگا۔ تم میرے دوست ہو۔ میں تمہیں موت کے مُنہ میں نہ بھیجونگا۔ مگر میرے سب حالات بتانے کے بعد بڑی مشکل سے وہ راضی ہو گیا۔ اس کے ذریعہ سے میں یہاں پہنچا اور میں نے ڈاکٹر ہاشمی کی جگہ لے لی۔ یہ لوگ مجھے ہی ڈاکٹر ہاشمی سمجھتے ہیں۔

زیب النساء:۔ مگر ڈاکٹر کو شرم نہ آئی کہ تمہیں مصیبت میں ڈالنے پر وہ راضی ہو گیا۔

عابد:۔ وہ راضی نہ ہوتا تھا۔ یہ تو زبردستی کیا گیا۔

زیب النساء:۔ مگر خورشید کو خبر نہیں ہوئی کہ تم اسکی جگہ سزایاب ہونے والے ہو۔

عابد:۔ زیب بہن! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو احسان جتایا کرتے ہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ایک بیکار ہستی اگر کسی کے کام آسکے تو اُسے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ اور پھر ایسے موقع پر جب کہ ایک خاندان اُجڑ رہا ہو اور خاندان بھی وہ جسکے ایک فرد کی خوشی خود میری اپنی زندگی سے بالاتر ہو۔

زیب النساء:۔ بھائی جان! میں یہ داستان سُنکر بہت خوش ہوئی اور مجھے ناز ہے کہ آپ جیسا بھائی مجھے ملا میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے ——— اچھا بھائی جان! پیشتر اس کے کہ میں جاؤں کیا آپ یہ چاندی کا چھلا جو آپ کے ہاتھ میں ہے مجھے دے سکتے ہیں؟ میں نشانی کے طور پر اسے رکھنا چاہتی ہوں۔ جس نے اپنی محبوبہ کے گھر کو بے خانماں ہوتے دیکھکر خود اپنی جان کی بازی لگا دی۔

عابد:۔ اگر آپ کو نشانی چاہیئے تو یہ چھلا ایک بدنصیب بھائی کی یادگار رہیگا۔ اور اگر آپ کو کبھی موقعہ ملے اور خورشید سے ملنے کا اتفاق ہو تو اُسے یہ دکھانا اور کہنا کہ فلاں جگہ عابد قبر میں سو رہا ہے۔

زیب النساء کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور وہ جلدی سے اتنا کہکر باہر چلی گئی۔ "اچھا بھائی جان! فی امان اللہ۔"

"خدا حافظ بہن! اللہ تمہارا نگہبان رہے۔" عابد نے کہا۔

جیل کے گھنٹے نے ساڑھے چار بجائے اور سپاہی نے عابد کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"چلنے کو تیار ہو؟"

"ہاں بھائی تیار ہوں!" عابد نے جواب دیا۔

اور آہستہ سے اس کے ساتھ باہر چلا آیا۔ باہر لٹیروں اور باغیوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ جب عابد آیا تو کسی نے گالی دی۔ کسی نے پتھر مارا اور کسی نے دھکا دیا۔ یہ سب کچھ عابد نیچی نظر کئے سہتا رہا آخر میں ایک شخص نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ عابد سر نیچا کئے چل رہا تھا۔ مگر اس حرکت نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اس کی طرف مڑ کر دیکھے۔ سامنے عباس کھڑا تھا ——— "عباس تم ——— !!" اتنا ہی عابد کے مُنہ سے نکلا اور اسکی نظریں جُھک گئیں۔ اُدھر عباس کا مُنہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ اُسے چکر آیا اور وہ گر پڑا۔ عابد آگے جا چکا تھا۔ اُسے ایک اکیلی جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ دس قدم کے فاصلہ پر کچھ سپاہی بندوقیں لئے کھڑے تھے۔ اور حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ دو منٹ کے سکون کے بعد آواز آئی۔

"کوئی آخری التجا ہے؟"

اِدھر عابد دل میں کہہ رہا تھا "پیاری خورشید! کاش تم اِس وقت میرے پاس ہوتیں اور دیکھتیں کہ تمہارا عابد آج اپنا قرضہ ادا کر رہا ہے۔ اور تمہارا دل تمہیں واپس دے رہا ہے۔ کاش مرنے سے پہلے اگر ایک بار تمہیں دیکھ لیتا تو چین سے مر سکتا۔" عابد اسی اُلجھن میں تھا کہ اسے آواز نے چونکا دیا۔

"ہاں ایک چھوٹی سی التجا ہے۔" عابد نے کہا۔

"بیان کرو۔"

عابد نے اپنی قمیص کو سینے پر سے پھاڑ ڈالا اور بندوق کے سامنے سینہ تان کر سپاہیوں سے کہنے لگا

"بھائیو! سب کے سب ایک دم اور اس کے پار" اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دو منٹ کی خاموشی کے بعد سپاہیوں کے افسر نے انکو حکم دیا "تیار!" اور پھر "فائر" کی آواز آئی۔ بندوقیں چلیں اور خاموش ہو گئیں۔ اور اُدھر عابد بھی ساری عمر کیلئے خاموش ہو گیا۔ جب عباس کو ہوش آیا تو عابد کی لاش کچھ گز کے فاصلہ پر پڑی ہوئی تھی۔ اور ایک عورت پاس کھڑی ہوئی حسرت بھری نگاہوں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ اور آنکھیں اپنی بہن کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ گویا کہہ رہی ہوں کہ پیاری بہن غم نہ کر۔ یہی میری زندگی کا مقصد تھا۔

عباس لڑکھڑاتا ہوا عابد کی لاش کے پاس پہنچا اور اس لڑکی سے اُسے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ جب عباس کو واقعات کا علم ہوا تو وہ عابد کی لاش سے لپٹ گیا۔ "عابد! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں ہاشمی سمجھا تھا اور اس لئے تھوکا تھا کہ اسنے تمہاری خورشید تم سے چھین لی تھی۔ اور اب وہ بیوہ ہو رہی تھی۔ مجھے کیا پتہ کہ تم اس پر نثار ہونے کیلئے یہاں آگئے ہو۔ میں نے تمہارے دل پر چوٹ لگائی ہے۔ عابد! مجھے معاف کر دو۔" اور وہ روتا روتا بیہوش ہو گیا۔

یہ تحصیل ہے!

(از جناب صلاح الدین قریشی صاحب)

قبرستان کی طرح بھیانک ——— لیکن جیتے جاگتے
انسانوں سے آباد ——— یہ تحصیل ہے!
بارِ غم سے کانپتے ہوئے دل اور خوفِ انجام سے لرزتی ہوئی ٹانگیں یہاں قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی قسمت کے فیصلے اس عرصۂ محشر میں صادر ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنی پریشانی میں مبتلا اور کسی گہری فکر میں لگا ہوا ہے۔ سب منتظر ہیں کہ کب صورِ اسرافیل پھونکا جائے اور حاکمِ قسمت بارگاہِ عدالت میں رونق افروز ہو۔ وہ دیکھئے کچھ بیچارے دیہاتی فتنۂ قیامت کا انتظار کرتے کرتے موت کی سی نیند سو گئے ہیں۔ ہر شخص لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ یہی سوچتا ہوا احاطہ میں داخل ہوتا ہے کہ کہیں آواز نہ پڑ گئی ہو اور سب سے پہلے تحصیلدار صاحب نے میرا ہی مقدمہ نہ لے لیا ہو ——— اور پھر یہ بدنصیب انسان کھلا یا ہوا کمرۂ عدالت میں جھانکتا ہے اور ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ کرسی خالی ہے، وہ ٹھنڈا سانس لیتا ہے اور پھر خیالات کی دنیا میں ڈوب کر انتظار کی گھڑیاں گننے لگتا ہے۔

سب لوگ بے چین ہیں اور تحصیلدار صاحب کی آمد کے منتظر ہیں۔ اب تو لنچ کا ٹائم قریب آرہا ہے، شاید وہ لنچ ٹائم پر آجائیں۔ دو دو چار چار آدمی ادھر اُدھر جمع ہو گئے ہیں۔ اور کسی طرح وقت گذارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بعض لوگ اپنی جگہ بالکل مطمئن نظر آرہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا گھر ہے اور وہ یہاں کی ہر چیز سے بے تکلف ہیں

آج تحصیلدار صاحب کو آنے میں واقعی بہت زیادہ دیر ہو گئی ہے، اس سلسلے میں ہر طرف خیال آرائی ہو رہی ہے ——— "تحصیلدار صاحب دورے پر چلے گئے ہیں۔" ایک صاحب نے باوثوق ذرائع سے اطلاع دی۔ "بھئی واہ! دورے پر کیسے چلے گئے۔ اور آج ہماری تاریخ جو ہے۔" کسی نے پنچھی نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بھئی آپ کیا جانیں۔ یہ نئے تحصیلدار صاحب تو ہر وقت دورے پر ہی رہتے ہیں۔ کام بھی بہت ہے ان کے پاس۔ آخر کیا کریں بیچارے؟" کوئی ذمہ دار سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے پکارے۔ "آج تو سنا ہے وہ کمشنر صاحب سے ملنے گئے ہیں۔ کاشتکاروں کو روپیہ وغیرہ تقسیم کرنا ہے نا؟" انہوں نے بڑی بے تکلفی سے ہوئے کہا ——— ایک بیچارے پرانی وضع کے بزرگ جو شاید آدابِ عدالت سے بے بہرہ تھے اور اس کوچہ میں نو وارد معلوم ہوتے تھے پان کی آخری گلوری منہ میں رکھتے ہوئے بولے: "جی ہاں! ایسے ہی تو ہمدرد ہیں وہ کاشتکاروں کے بھئی تم یہ بھی نہیں جانتے، ان کا کام تو لوگوں سے روپیہ لینا ہے۔ روپیہ لینا۔ کیا سمجھے آپ؟ یہ کیا کہدیا آپ نے؟ میاں! گھر پہ سے دورے کی تھکن اتار رہے ہونگے۔ آجائیں گے ذرا کھانا وانا کھاکر، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ بھئی عبداللہ تم جاؤ پان وان اور بنوا لاؤ۔ کھانے سے تو گئے تھے، یہاں تو پانوں کے بھی لالے پڑ گئے۔ نہ جانے کب تک آئیں گے وہ ابھی۔"

تحصیل کیا ہے معلوم ہوتا ہے آثارِ قدیمہ میں سے کوئی عمارت ہے جسے زبردستی تحصیل بنا لیا گیا ہے۔ اصلی عمارت میں جگہ جگہ کتر بیونت کر دی گئی ہے۔ اس لئے عجیب صورت اختیار کر لی ہے۔ سامنے کئی کمروں کی قطار ہے۔ بیچ کے کمرے میں تحصیلدار صاحب کی عدالت اور ادھر اُدھر متعلقہ دفاتر ہیں۔ دائیں جانب کے بڑے کمرے میں سب سے زیادہ رونق ہے۔ اور کیوں نہ ہو، یہاں قرق امین حضرات جمع ہیں۔ ہر شخص اپنی بولی بول رہا ہے۔ تحصیلدار صاحب چونکہ ابھی نہیں آئے ہیں۔ اس لئے یہ شترِ بے مہار کی طرح گھوم رہے ہیں۔ ابھی گھر سے آئے ہیں دو تین بجے تک بیٹھیں گے، ذرا گپیں لڑائیں گے، معاملے کی باتیں ہونگی۔ پھر فوراً کسی شکار کی تلاش میں نکلیں گے۔ ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ ہوشیار ہے اور ایک دوسرے کی بیڑیاں اور سگریٹ پینے کی کوشش کر رہا ہے۔ غریب غربا بے بس اور مجبور شرفا جو اس وقت ان کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں ان کو ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں سے گھور گھور کر اور تحصیلدار صاحب کی درشت مزاجی اور ناظر کی سختی سے ڈرا دھمکا کر ان بیچاروں کا خون خشک کیا جارہا ہے۔ تاکہ "دستِ غیب" کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ یہ عجیب عجیب طرح کا انسان نظر آرہا ہے۔ ایک صاحب بالکل بوڑھے ہیں۔ آنکھوں پہ موٹے موٹے تالوں کی عینک لٹک رہی ہے۔ ہاتھ پاؤں میں جان نہیں ہے اور آج نصیر و پہلوان کے مکان پہ قرقی لیکر جائیں گے۔ ایک دوسرے صاحب نے

[illegible] شاید [illegible] ہی نکل رہی ہیں۔ [illegible] جیسے معلوم ہوتے ہیں
بات کرتے ہیں جیسے کسی نے لقمہ اٹھا دیا۔ ان کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے
کہ پولیس میں ہوتے تو کافی ترقی کرتے ورنہ یہاں خواہ مخواہ لمبے جو ہر برباد کر رہے
ہیں۔ ابھی ہیں ایک صاحب ہیں مرزا جی۔ نہ جانے بیچارے یہاں کس طرح آ پھنسے
ہیں۔ چند دن سے دو قرقیاں سر پر پھر رہے ہیں اور ایک پر بھی عملدرآمد نہیں
کر سکے۔ روز ان پر پھٹکار پڑتی ہے لیکن یہ بیچارے وضعداری پر مرے جاتے ہیں۔
ان کے تجربہ کار ساتھیوں نے کئی دفعہ کہا "مرزا جی! ان لوگوں کا کیا ہے، بڑے
نادہند ہوتے ہیں۔ شریف ہو یا نیک، آپ کو اس سے کیا واسطہ؟ بھرے مجمع
میں ان لوگوں کی عزت اتار لیجئے۔ اسی میں آپ کی خیریت ہے۔ لحاظ کا کیا کام
ہے۔ بھئی ہمارا کام تو بھگتنے کا ہے۔ باقی آپ کو اختیار ہے۔" یہ سن کر
انہیں تحصیلدار صاحب کا خیال آ جاتا ہے اور لرز کر رہ جاتے ہیں۔

یہ کمرہ جہاں یہ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، تحصیل بھر میں ایک خاص حیثیت
رکھتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ روشنی اور ہوا حتی الامکان
اندر نہیں آ سکتی۔ یہاں کے بیٹھنے والوں کو شاید ان چیزوں کی ضرورت ہی نہیں۔
چونکہ ان کے دل پہلے ہی سے روشن ہیں اور دماغوں میں ہوا بھری ہوئی ہے۔
ویسے بھی اندھیرے میں بہت کچھ گنجائش ہے۔ جہاں کوئی شکار پھنسا اور خاموشی
سے اسے کسی تاریک سے گوشے میں لے گئے۔ معاملہ طے ہو گیا۔ لوگ ان
دونوں کو اور صاحب معاملہ خود ان حضرات کو اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔

کمرے کی عام صفائی کی طرف شاید عرصہ سے توجہ نہیں دی گئی ہے
ہر طرف کاغذ کے ٹکڑے اور بیڑی کے ٹونٹے منتشر ہیں۔ شاید کام بہت زیادہ
اور ردی کی ٹوکریاں بہت کم ہیں۔ کمرے کا سارا رکھ رکھاؤ پرانی طرز کا ہے
ایک بڑا سا ٹاٹ بچھا ہوا ہے ——— بچھا ہوا کیا ہے۔ شاید ابتدا میں
ہی بچھا دیا گیا تھا۔ چنانچہ اب تک بچھا ہوا ہے۔ بار بار روشنائی گرنے کی وجہ
سے کچھ خوشنمائی سی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اور دور سے یہ رلا جوٹ ہلمز کا
منقش قالین معلوم ہوتا ہے۔ ہر شخص کے سامنے ڈیسک رکھے ہوئے ہیں۔ شروع
میں نہ معلوم ان کا کیا رنگ تھا۔ لیکن اس وقت نیلا سیاہی مائل نظر آ رہا ہے
بعض حضرات بہت کفایت شعار اور اپنے محکمے کے پورے خیر خواہ معلوم ہوتے ہیں کہ
اب تک کسی نہ کسی طرح ان ڈیسکوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ ایک صاحب نے
اپنے ڈیسک کے پایوں کا کوئی سوال ہی نہیں رکھا۔ گزشتہ کئی سال سے ان کی
جگہ چند گز اینٹیں مستقل طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب
کے ڈیسک کا اگلا پایہ ٹوٹ گیا ہے انہوں نے کوئی اینٹ رکھنے کی زحمت

بھی گوارا نہیں کی بلکہ لکھنے کے وقت ایک ہاتھ سے سہارا دیے لیتے ہیں اور [illegible]
اس کے پورے طور پر عادی ہو چکے ہیں۔ ایک صاحب کے ڈیسک کے گرد
مکڑیوں نے کئی جگہ سفید سفید موٹی جھلیاں منڈھ رکھی ہیں اور ان کے اندر برابر
ان کے انڈے بچے نہایت اطمینان سے پرورش پا رہے ہیں۔ ان ڈیسکوں کی
چار دیواری میں جو طلسمی دنیا آباد ہے اس کا حال تو بس خدا ہی جانتا ہے۔ بعض
ڈیسکوں پر بیک وقت کئی کئی ہولڈر اور بعض پر کئی کئی دواتیں نظر آ رہی ہیں
اور اس کے باوجود دفتر کا کام برابر چل رہا ہے۔ دواتیں عجیب عجیب نمونوں کی اور
ہولڈر نئے نئے ڈیزائن کے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ بعض ہولڈر ضرورت
سے زیادہ لمبے اور بعض برداشت سے زیادہ چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں
نبیں بھی عجیب شان کی ہیں۔ لکھنے والوں نے جس رخ چلا دیا ہے چل نکلی ہیں۔
ہر نب سے ہر شخص نہیں لکھ سکتا۔ کوئی نرمی سے لکھتی ہے اور کوئی سختی سے
کوئی الٹا لکھتی ہے اور کوئی ترچھا۔ دواتوں میں سے بعض کے کنارے جھڑ گئے
ہیں۔ اکثر کے ڈھکنے غائب اور کئی کے ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ گئے ہیں۔
بلوٹنگ جیسی کارآمد چیز بھی یہاں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ یہاں والے اس کے
صحیح اور بر وقت استعمال سے واقف نہیں ہیں۔ بعض ڈیسکوں پر پھیلے ہوئے
بلوٹنگ پیڈ جہاں اپنی کہن سالی کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں وہاں دفتر اور دفتر والوں
کی قدیم تاریخ کے آئینہ دار بھی ہیں۔ بعض لوگوں نے ان پر فرصت کے اوقات میں
مصوری، نقاشی اور بعض نے شاعری بھی فرمائی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں
کوئی دلچسپ کارٹونسٹ بھی مقیم تھے جن کی چابکدستیوں کے نمونے ابھی تک موجود
ہیں۔ ایک ڈیسک پر کسی تاریخی مخبلکڑ صاحب کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ عجیب
عجیب باتیں انہوں نے بطور یادداشت کے لکھ چھوڑی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے
"آج حجامت بنوانی ہے۔" دوسری جگہ تحریر ہے "بھولو سے گھی بدلوانا ہے۔"
وغیرہ وغیرہ۔

تحصیلدار صاحب کا کمرۂ عدالت سارے دفتر کی جان ہے۔ یہاں
دیواروں پر سفیدی کے علاوہ کواڑوں پر رنگ روغن بھی ہے۔ دروازے میں
گھستے ہی سامنے کرسیٔ عدالت ہے۔ تحصیلدار صاحب کی کرسی بید سے بنی
ہوئی ہے۔ اوپر سے ایک حد تک صاف ستھری ہے۔ لیکن نیچے مکڑی کے
جالوں سے سیاہ ہو رہی ہے۔ میز سب سے بڑی ہے اور سیاہ آئل کلاتھ کا
ایک ٹکڑا بچھا ہوا ہے۔ ضرورت کے وقت کبھی کبھی ناظر صاحب اس ٹکڑے کو
گھر بھی لے جاتے ہیں۔ یہاں قلم دوات کا انتظام ہمیشہ باقاعدہ رہتا ہے۔
لیکن تحصیلدار صاحب ہمیشہ اپنا فاؤنٹین پین ہی استعمال کرتے ہیں۔ اکثر نئے

...اسی میز سے زندگی شروع کرتے ہیں اور مختلف منزلوں سے گزرتے ...ے اندر ڈیسک کے تختوں پر جان دیدیتے ہیں۔ یہاں اکثر چیزوں کی زندگی ...عدالت سے ہی شروع ہوتی ہے اور دفتر کی تاریکیوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ ...ب کئی درازیں ہیں۔ اُن میں سے بعض بالکل خالی اور بعض خوب بھری ہوئی ...

اس کمرے میں فی الحال ناظر صاحب کا سکہ رواں ہے۔ وہ اس وقت ...سی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن دماغ آسمان پر ہے۔ سمجھ لیجئے۔ لمبا قد، ...جسم، سیاہ رنگت، سر چھوٹا، منہ پہاڑ۔ شیو بڑھا ہوا۔ دانتوں پر ...کثرت سے سرخ سیاہی اُن میں کی موٹی تہہ جمی ہوئی۔ کپڑے خاصے میلے۔ ...انی کے کالر پر دو دو انگل چیکٹ۔ انگلی میں چاندی کی موٹی سی انگوٹھی ...فیروزہ جگہ جگہ پر چیختا ہوا۔ دونوں ہاتھ دستانی میں لت پت ہیں اور ...اہ اپنی بے ہنگم میز پر آڑے ترچھے ہاتھ چلا رہے ہیں۔ میز پر مختلف ...اور کاغذات بے ترتیبی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ جن پر بیڑی ...نے جگہ جگہ چیر کے ڈال دیئے ہیں۔

ایک ——— دو ——— تحصیلدار صاحب کی میز کے سامنے ...دیوار پر لگے ہوئے سیکو شا کے جاپانی کلاک نے دو بجائے۔ سررشتہ دار ...ب نے بیڑی کا بنڈل ختم کرتے ہوئے آخری بیڑی سلگائی اور ذرا سنبھل کر ...لئے۔ اچانک ایک تانگہ صدر دروازے پر سسکتا نظر آیا۔ "تحصیلدار صاحب ...یف لا رہے ہیں" بے اختیار کسی کی زبان سے نکلا۔ ایک پرانا سا زنگ ...انگ آہستہ آہستہ تحصیل کے احاطہ میں داخل ہوا۔ دفعتہً یہ خبر بجلی کی طرح ...اور آگ کی طرح پھیل گئی۔ سررشتہ دار صاحب نے پڑھتے پڑھتے "بہرام کا قلعہ" ...ٹے مارا۔ ناظر نے جلدی میں لالہ جی سے معاملہ طے کرتے ہوئے دو ہی روپیہ ...کر لیا۔ اور جھٹ ان کے ہاتھ سے دو روپے لیکر جیب میں ڈال لئے ...سے ایک بالکل کھوٹا تھا۔ چپڑاسی نے اپنی بیڑی بجھا کر کان میں ...اور اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے گنواروں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی مستعدی ...ت دینے لگا۔

عدالت کے قریب پہنچ کر تانگہ رُکا اور تحصیلدار صاحب نے اپنے ...و ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ مجمع کی کثرت کو دیکھکر ناک بھوں چڑھائی اور ...سے اُتر پڑے۔ اُترتے ہی توند پہ سے کھسکی ہوئی پتلون پُر تمکنت انداز ...پر چڑھاتے ہوئے اور چہرے کو زیادہ سے زیادہ ہیبت ناک بناتے

ہوئے آگے بڑھے ——— سرخ سفید رنگ، اوپر ابھرے ہوئے ...ڈاڑھی۔ بڑی بڑی وحشت آلود آنکھیں جن میں سے شیطانی ذہنیت جھانک رہی تھیں۔ اگرچہ سردی شروع ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک ایک ٹھنڈا نیم جان سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ کوٹ کے پیچھے کا بخیہ جگہ جگہ سے اُدھڑا ہوا تھا اور پتلون کی کریز ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی تھی۔ پاؤں میں ایک ...سا پمپ تھا جس کی صورت مسلسل استعمال کی وجہ سے بالکل بگڑ چکی تھی۔

قدرتی طور پر سب کی ڈھارس بندھی۔ اب عدالت شروع ہوگی۔

لیکن نہیں ——— زمانے کو ابھی بہت سی کروٹیں بدلنی تھیں۔ راستے ہی میں نہ جانے کدھر سے دو فرشتے آدھمکے۔ ایک سیٹھ جی، سر سے پاؤں تک نمونۂ امارت۔ دوسرے ایک بابو صاحب نہایت شاندار سوٹ زیب تن کئے ہوئے بظاہر سیٹھ صاحب کے مشیر قانونی معلوم ہوتے تھے۔ بہت تپاک سے ملاقات ہوئی۔ اور کچھ دیر تک بڑی رازداری کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔

تحصیلدار صاحب نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اپنے معزز مہمانوں سے رخصت ہوتے ہوئے عدالت کی طرف چلے۔ ان کی محشر خرامی سے اِدھر اُدھر سوتے ہوئے دیہاتی سرو قد کھڑے ہوتے گئے۔ چھ چھ فٹ کے قوی ہیکل نوجوانوں کے فولادی سینے میں دل کر دھک دھک کرنے لگے۔ اور آہستہ آہستہ ایک سیلاب کی صورت میں عدالت کی طرف بہہ نکلے۔ تحصیلدار صاحب دروازے میں داخل ہوئے اور ہر چیز کو گھورتے ہوئے اپنی میز کی طرف بڑھے۔ پُر تمکنت انداز میں کرسی گھسیٹی اور ہاتھ کا ڈنڈا جسے اب تک پھراتے آ رہے تھے زور سے میز پہ دے مارا۔ اچانک ایک کرخت آواز بلند ہوئی اور سارے کمرے میں کلاس روم کی طرح خاموشی چھا گئی۔ سررشتہ صاحب دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھے اور مقدموں کی فہرست میز پر پھیلا دی۔ ایک ایک کر کے آوازیں پڑنے لگیں۔ اور مقدمے پیش ہونے شروع ہو گئے۔

(ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوحؔ ناروی)

فصلِ گل میں یہ ہوا سر پھوڑ کر
رکھ دیا ہم نے قفس کو توڑ کر

پھر نہ دیکھی قبر بھی منہ موڑ کر
چل دیئے سب مجھ کو تنہا چھوڑ کر

آج تک میں نے وفائیں کتنی کیں
تم حساب اِن کا بتا دو جوڑ کر

زاہد ہم سے اور نبھ جاتا چہ خوش
مل گئے رندوں میں توبہ توڑ کر

وہ مری مشکل نہ آساں کر سکی
رہ گئی تلوار بھی منہ موڑ کر

مجھ کو جینا مجھ کو مرنا بھی یہیں
میں کہاں جاؤں ترا در چھوڑ کر

جوشِ وحشت میں سلامت رہ چکے
کیا کروں دامن کے ٹکڑے جوڑ کر

سامنے سنگِ درِ محبوب کے
کیوں نہ دیدیں جان ہم سر پھوڑ کر

عشق اگر چاہے تو ناممکن نہیں
آسماں سے لائے تارے توڑ کر

دیکھتا ہوں میں مآلِ مرگ و زیست
اُس سرے سے اِس سرے کو جوڑ کر

کیا ستم ہے جن میں ہو شرحِ ستم
وہ پڑھیں خط اتنی سطریں چھوڑ کر

آئینہ گروہ ہے میری رائے میں
جو دکھا دے دِل کے ٹکڑے جوڑ کر

کوہکن لائے گا جوئے شیر کیا
جوئے خوں لائیں گے ہم سر پھوڑ کر

جن میں تھے کھلنے کو گل ہائے نشاط
پھینک دیں غم نے وہ شاخیں توڑ کر

دل میں آنے کو ہے وہ تیرِ نگاہ
رنج و غم ہٹ جائیں رستہ چھوڑ کر

دستِ وحشت میں گریباں آگیا
دِل ہے خوش دونوں کا رشتہ جوڑ کر

لکھنے والے نے لکھا قسمت میں کیا
دیکھنا تھا یہ [?] مجھے سر پھوڑ کر

ہو گئے فضلِ خدا پر مطمئن
نوحؔ بھی کشتی کا لنگر توڑ کر

رُباعیات

(جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحر۔ پی، سی، ایس)

(۱)

دل خوگرِ تسلیم و رضا کرتا جا
اُلفت کو شناسائے جفا کرتا جا
مانا کہ حسینوں کا تو ایماں ہے جفا
تیرا تو وفا ہے تو وفا کرتا جا

(۲)

دل بغض و حسد سے کبھی رنجور نہ کر
یہ نورِ خدا ہے اسے بے نُور نہ کر
نااہل و کمینہ کی خوشامد سے اگر
جنّت بھی ملے تجھکو تو منظور نہ کر

(۳)

تُم بحرِ حوادث میں اُبھرنا سیکھو
ہر حدِّ یقیں سے گذرنا سیکھو
ایثار طلب ہوتا ہے ہر نقشِ دوام
جینے کی تمنّا ہے تو مرنا سیکھو

"مشعلِ راہ"

(از حضرت نخشب جارچوی)

ہوں خجل غم نہ چھپانے کا قرینہ آیا
اشک روکے تھے کہ ماتھے پہ پسینہ آیا

ہم بھلا کر اُنہیں مغرور بھی تھے شاد بھی تھے
بوندیں پڑنے لگیں ساون کا مہینہ آیا

واقعہ یوں ہے تری نیم نگاہی کی قسم
مرنا آیا مجھے اُلفت میں نہ جینا آیا

غم کے عالم میں بھی جب تک وہ نظر یاد رہی
بھول کر بھی نہ خیالِ مئے و مینا آیا

آہ! وہ غم جو امانت ہے نظر والوں کی
ہائے وہ راز کہ جو سینہ بہ سینہ آیا

رُوح بے چین، نفس تیز، نگاہیں بیتاب
تم پہ دل آیا کہ طوفاں میں سفینہ آیا

تیری روداد مؤثر تھی مگر اے نخشب
بات کا ڈھنگ نہ کہنے کا قرینہ آیا

دعوتِ ماہتابی

(از جناب سروش عسکری طباطبائی)

کہاں ہو آؤ باشبِ مہ کو شرمسار کریں
اِس آئینے میں ہم اک دوسرے کو پیار کریں

یہ طنزِ ماہ، یہ چشمک زنیِ ستاروں کی
یہ زہر تلخیِ بادہ سے خوشگوار کریں

وفورِ کیف سے آنکھوں میں میکدے کھولیں
فروغِ بادہ سے چہروں کو لالہ زار کریں

نسیمِ لطف سے نظروں کو گل فروش بنائیں
شمیمِ قرب سے سانسوں کو مشکبار کریں

چڑھائیں جام، اڑائیں گلال، اچھالیں مے
بہار کو طرب آسودۂ بہار کریں

ہر ایک خار میں بھر دیں گلوں کی رعنائی
ہر ایک ذرہ کو غیرت دہِ نگار کریں

سرورِ طرح کو تولیں نظر کے کانٹے پر
شکستِ رنگ سے اندازۂ خمار کریں

صلاحِ گوشہ گزینی اگر مناسب ہے
چمن میں کنج نشینی ہی اختیار کریں

اگر یہ سچ ہے کہ ہے بیخودی ذریعۂ قرب
تو آج آپ کو بدمست و بادہ خوار کریں

جو رہنمائے حقیقت ہے مستیِ عرفاں
تو عشقِ دوست کو مستی سے ہمکنار کریں

اگر یہ سچ ہے کہ انساں ہے بیکس و مجبور
تو جبرِ عشق و محبت ہی اختیار کریں

بنالیں غازۂ رخسار صبح و شام اے دوست
گلوں کو رنگ کریں، رنگ کو غبار کریں

رہا کریں غرض اس جشنِ ماہتابی کی
کہ فرطِ رشک سے قلبِ فلک فگار کریں

غزل

آدمی مجموعۂ اوہام ہے — نام کو ورنہ خدا کا نام ہے

وقت کے ہاتھ پہ کس نے لکھ دیا — ابنِ آدم خوگرِ آلام ہے

پاک ہے سجدوں سے فطرت کی جبیں — بندگی کا زیست پہ الزام ہے

چند سانسیں اور اک خوابِ طویل — نظمِ ہستی کسقدر ناکام ہے

پرسشِ غم اور بہ اندازِ ستم — شاید پہلے تو کچھ آرام ہے

کتنے رنگیں دام ہیں ہر گام پر — گیسوؤں کا دام کیوں بدنام ہے

زندگی الطاف کیا ہے کچھ نہ پوچھ
ایک رودادِ الم انجام ہے

جناب الطاف مشہدی

غزل

ایسا نہ ہو وہ اور نئی آگ لگا دے — اے سوزِ نہاں شمعِ تمنا کو بجھا دے

میں مجرمِ الفت ہوں سزا دے کہ جزا دے — اب تیری یہ مرضی ہے مٹا دے کہ بنا دے

وہ پوچھنے آئے ہیں دلِ زار کی حالت — کیا ہو جو دلِ زار ابھی شور مچا دے

اس واسطے قیمت ہے گراں ساغرِ دل کی — گر ٹوٹ بھی جائے تو نہ زنہار صدا دے

اک روز مرا عشق ترا حسن نہ ہو جائے — جلوہ کی تمنا مجھے جلوہ نہ بنا دے

ملتا نہیں مانگے سے کبھی دردِ محبت — یہ دین اُسی کی ہے جسے چاہے خدا دے

انجام رہے گا یونہی ناکامِ محبت
یہ شعلۂ رنگیں اُسے جب تک نہ جلا دے

جناب انجام کاشمیری

غزل

خوشی جاوداں ہے نہ غم دائمی ہے — ابھی نامکمل مری زندگی ہے
تری جستجو میں مری عمر گذرے — یہی آرزو ہے تمنا یہی ہے
یہ نیرنگیِ صبح و شامِ محبت — ابھی روشنی تھی ابھی تیرگی ہے
یہ کیا انقلابِ چمن ہے الٰہی — کہ گل رو رہے ہیں کلی ہنس رہی ہے
ابھی غم نہ دل پر نگاہیں جماؤ — ابھی تو تمنا جواں ہو رہی ہے
ستاروں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں — مری داستاں کس قدر غم بھری ہے
کروں کیا حیاتِ دو روزہ کا شکوہ — کسی حال میں ہو بسر ہو رہی ہے
یہ ناکامیاں اور یہ حسرت کا عالم — کہ اب موت کی منتظر زندگی ہے

ہو تاثیر اشعار میں کیوں نہ میرے
محبت میں ڈوبی ہوئی شاعری ہے

جناب نعمان تاثیر

غزل

نظر آیا یہی، سوچا جہاں تک — نہ چھوٹے گا ترا غم دو جہاں تک
ہوا نالوں سے شق جب آسماں تک — ہمیں ہم تھے مکاں سے لامکاں تک
حدِ سوزِ دروں پہنچی یہاں تک — کہ دل تو دل، جلایا آشیاں تک
خدایا! خیر ہو اہلِ قفس کی — نظر آتی ہیں چپ چپ تیلیاں تک
ترے ہی حسن کا پرتو ہے دنیا — تو ہی تو ہے زمیں سے آسماں تک
کہوں کس سے قفس میں وقتِ آخر — مجھے پہنچا دے کوئی آشیاں تک
زمانہ بڑھ گیا منزل بہ منزل — نہ پہنچے ہم تو گردِ کارواں تک
بھلا اس چار دن کی زندگی میں — دعائیں وصل کی مانگوں کہاں تک

نویدِ آمدِ گل ہے یہ راغب
کہ داماں میں نہیں ہیں دھجیاں تک

جناب راغب لکھنوی

ہنگامِ رخصت

(از جناب فاروق محشر بدایونی)

جدائی نئے گل کھلاتی رہے گی رگِ جاں پہ نشتر لگاتی رہے گی

کبھی آہ بن کر کبھی نغمہ بن کر مئے تلخ و شیریں پلاتی رہے گی

بلا سے ترا غم ستاتا رہے گا مسلسل تری یاد آتی رہے گی

تبسم حشرِ غم کی کہ ہر تازہ غم میں خوشی کی کرن جھلملاتی رہے گی

تغافل شکایت تبسم تکلم جدائی یہی بات جاتی رہے گی

نظر پھر بھی نقش و نگارِ تصور بناتی رہے گی مٹاتی رہے گی

دلِ غمزدہ اندر سے روئے گا لیکن لبوں پہ ہنسی آتی جاتی رہے گی

طبیعت کو بللہ قابو میں رکھنا یہ رنگِ رخ اکثر اڑاتی رہے گی

محبت کی آگ آنسوؤں کی روانی مرا دل جلاتی بجھاتی رہے گی

کوئی ذکر جب چھیڑ دے گا وفا کا وہیں طاقتِ صبر جاتی رہے گی

خلاصہ یہ ہوگا کہ اے جانِ محشر ہر اک لذتِ زیست جاتی رہے گی

فراموش ہو جائے گی ساری دنیا
مگر تیری آواز آتی رہے گی

مانگ کی افشاں

(جناب اشعر ملیح آبادی)

اے جلوۂ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

آکاش پہ بکھرے ہوئے ہوں جیسے ستارے
یا سینۂ گیتی سے ابلتے ہوں شرارے
دریائے شبِ تار میں یا نور کے دھارے

اے جلوۂ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

جیسے رخِ سنبل کو گہر چوم رہے ہوں
یا سبزہ و گلہائے سمن جھوم رہے ہوں
یا کرمکِ شب تاب کہیں گھوم رہے ہوں

اے جلوۂ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

جس طرح گھٹاؤں میں ہو بجلی سی چمکتی
یا جیسے کہ پگھلی ہوئی بہتی ہوئی چاندی
تابندہ سرِ عرش ہو یا کاہکشاں سی

اے جلوۂ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

تھم تھم کے بہے جیسے کہ پگھلا ہوا پارا
یا کفر کے بادل میں ہو ایماں کا نظارا
یا پردۂ ظلمات میں بہتا ہوا دھارا

اے جلوۂ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

بکھری ہوئی ہوں جیسے کہ سورج کی شعاعیں[1]
سورج کی شعاعوں سے دمکتی ہوں فضائیں
اور مست فضاؤں میں جوانی کی ادائیں

اے جلوۂ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

[1] میں "شعاعوں" اور "فضاؤں" کے قافیہ کو جائز سمجھتا ہوں ۔ اشعر

جامِ نو

جناب نیساں اکبرآبادی

...ں محفل کی ساقی عشرتیں تجھ کو مبارک ہوں
...لت طِ زندگی کی راحتیں تجھ کو مبارک ہوں
...ے کیوں مجھے اب تلخ سی لگتی ہے مَے ساقی
مرے کانوں پہ اب نغمہ کی لے بھی بار ہے ساقی
...نے جی میں کیا آئی کہ میں گھبرا گیا ساقی
تری محفل سے کیا معلوم کیوں اُکتا گیا ساقی
...علوم دل لیجائیگا مجھ کو کہاں ساقی
مجھے یاد آئیں گے تیرے زمین و آسماں ساقی
...یں بزم گہ سے، اور سوئے رزم گہ آیا
یہاں پہ زندگی کا اک انوکھے روپ میں پایا
...ں پہ زندگی خنداں، یہاں پہ زندگی حیراں
وہاں کی زندگی ساحل، یہاں کی زندگی طوفاں
...ں پہ اک سکوں طاری، یہاں بے چینیاں ساری
وہاں پہ رنگ کی ہولی، یہاں پہ خون کی ہولی
...ں انساں کے نغمے، یہاں انساں کے نالے
وہاں جینے میں اک لذت، یہاں جینے کے ہیں لالے
...ں پہ قلقل و مینا، یہاں توپوں کی آوازیں
وہاں پر قہقہے رقصاں، یہاں انساں کی چیخیں
...ں پہ لغزشِ صہبائے ساقی کے اشارے ہیں
یہاں پر عزم و ہمت زندگانی کے سہارے ہیں
...ں پر عیش کے ساماں، یہاں پر آگ کے طوفاں
یہاں انبار لاشوں کے ہیں خاک و خون میں غلطاں
...ر جائے تشکر ہے کہ وہ دور اب نہیں باقی
وہ دورِ جنگ تھا ساقی، یہ دورِ امن ہے ساقی
...راب کہنہ پھر شیشہ سے ساغر میں ڈھلے ساقی
چلو آؤ کہ دورِ جامِ نو اب پھر چلے ساقی

غزل

جناب اقبال خلیل صفی پوری

منزلیں عشق کی الاماں الاماں
ہر نفس کشمکش، ہر قدم امتحاں

یہ ادا، یہ تبسم، یہ انگڑائیاں
جیسے بدمست ساون کی رت کا سماں

میری جرأت کہاں، اُن کا دامن کہاں
دیر تک تھرتھراتی رہیں اُنگلیاں

کوئی اُن سے الگ ہو کے جائے کہاں
زندگی بھی خفا، موت بھی بدگماں

اور اس چشمِ مخمور کو جنبشیں
اور دو چار ہنستی ہوئی بجلیاں

گود میں عشق کی سو گئی زندگی
دیں کچھ اس طرح امید نے تھپکیاں

میکشو! یہ فضا مرحبا مرحبا
کھول دو میکدہ چھا گئیں بدلیاں

اُس تجلی کی تابانیاں کیا کہوں
جیسے چھٹکی ہوئی چاندنی کا سماں

یاد کچھ آ گیا اشکِ غم تھم گئے
دل نے آواز دی رک گیا کارواں

اتصالِ محبت بھی کیا چیز ہے
مجھ پہ ہونے لگا ہے تمہارا گماں

شب بھی کیف آفریں، وہ بھی پہلو نشیں
ہر ارادہ حسیں، ہر تمنا جواں

رنگ نکھرا ہوا، زلف بکھری ہوئی
شام بھی صبح بھی کچھ عیاں کچھ نہاں

میری نظروں میں اقبال ہیں آج تک
وہ حنا کی سنواری ہوئی انگلیاں

نقوشِ مانی

(از جناب سید کلب احمد مانی ۔ جائسی)

ہر قدم پر شوقِ منزل کی فراوانی تو ہے
راہِ دشوارِ محبت میں یہ آسانی تو ہے

بے شک اس جینے سے مرجانے میں آسانی تو ہے
لیکن اے دل مرضیِ قاتل کی قربانی تو ہے

کامیابی ہو نہ ہو، بیٹھا نہ رہ، تدبیر کر
مدعا بس میں نہیں ہے، سعیِ امکانی تو ہے

آج یہ تسکین کافی ہے کہ کل روزِ جزا
روئدادِ زیست کہہ کر دادِ غم پانی تو ہے

ہے مرا انجام، آغازِ حیاتِ مستقل
میری ہستی بھی اہم کتنی ہے گو فانی تو ہے

ہاں یہاں یہ ہے کہ مقصود و تمنا ساتھ ہیں
ورنہ جنت پہلے ہی سے جانی پہچانی تو ہے

اور نکلے گی کوئی تدبیر پیراہن دری
ہوں جو شل ہیں ہاتھ، شوقِ چاک دامانی تو ہے

ہاں بُرے کو بھی نہ ایذا دے کہ اس کی ذات میں
خوئے انسانی نہیں ہے روحِ حیوانی تو ہے

آئینے میں اقتدارِ حسن کی صورت کہاں
آئینہ رکھ دے، ادھر آ، میری حیرانی تو ہے

ایک نالہ اور اے مانی کہ روزِ بازپرس
لب تک آخر داستانِ دردِ دل آنی تو ہے

سچ ہے شیون سے مرے اُن کو پریشانی تو ہے
لیکن آخر درد، عذرِ نالہ سامانی تو ہے

ایک ظرفِ دل ہے، اس میں دو کی گنجائش کہاں
دُور اے جمعیتِ خاطر، پریشانی تو ہے

رہنمائی عقل سے چاہی شروعِ عشق میں
عفو کر اے بےخودی، یہ میری نادانی تو ہے

دیکھئے بازارِ محشر میں یہ کن داموں بکے
جنسِ غم کی خیر سے دُنیا میں ارزانی تو ہے

ان کو کیا، ٹوٹے کسی کا دل کہ رُسوا ہو کوئی
خوش رہیں یوسف کہ ثابت پاک دامانی تو ہے

کس غرض سے پھر گوارا کیجئے تکلیفِ ضبط
راز رکھ کر بھی محبت کی سزا پانی تو ہے

اہلِ دل سے یہ جہاں خالی بھی رہتا ہے کہیں
عرفی و غالب نہیں، فانی نہیں، مانی تو ہے

...اے محبوب!!

اب کوئی وعدۂ فردا تو نہ کر اے محبوب!

زندگی کیا انہیں وعدوں پہ گذر جائے گی؟
یونہی ہر رات، یونہی شام و سحر جائے گی؟
یونہی ہر آرزو سینے ہی میں مر جائے گی؟
میری دنیا تو نہ کر درد و الم سے مغلوب!
اب کوئی وعدۂ فردا تو نہ کر اے محبوب!

آزما کر مری اُلفت کی صداقت دیکھی!
میری خاموشی بھی، ضبط کی طاقت دیکھی!
اپنے ہر ظلم کے بدلے میں محبت دیکھی!
اب تو اس زیست کو میری نہ بنا دے معتوب!
اب کوئی وعدۂ فردا تو نہ کر اے محبوب!

مجھ میں اب ظُلم کے سہنے کی وہ طاقت نہ رہی!
جھوٹے وعدوں پہ جیے جانے کی فرصت نہ رہی!
آزمائش کی بھی اب تجھ کو ضرورت نہ رہی!
آج جذبات کے طوفاں نے کیا ہے مغلوب!
اب کوئی وعدۂ فردا تو نہ کر اے محبوب!

پھر وہی تیری جفاکیش ادائیں اے دوست!
پھر وہی مجھ سے الگ ہونے کی راہیں اے دوست!
پھر وہی میرے لئے غم کی گھٹائیں اے دوست!
کون کہتا ہے کہ الفت میں نہیں یہ معیوب؟
اب کوئی وعدۂ فردا تو نہ کر اے محبوب!

کیا کہا ہے تجھکو جفاؤں پہ پشیمانی ہے!
پھر یہ کیوں وعدۂ فردا؟ — مجھے حیرانی ہے!
اور فردا کا بھروسہ — یہ جہاں فانی ہے!!
تو نہ ہو اپنی جفاؤں پہ اب اتنا محجوب!
اب کوئی وعدۂ فردا تو نہ کر اے محبوب!

بھول کر بھی نہیں اوروں کو کبھی یاد کیا!
تیری تصویر سے اس قلب کو آباد کیا!
تیرا انجم ہے وہی، جس نے نہ فریاد کیا!
بیوفائی تو نہ کر ذات سے اسکی منسوب!
اب کوئی وعدۂ فردا تو نہ کر اے محبوب!

...ناب انجم بنارسی بی۔ اے (علیگ)

غزل

(جناب پنڈت پرمیشری نند صاحب ایم اے جالندھری)

عتاب و لطف اُلفت میں بہم یوں بھی ہے اور یوں بھی
کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی، ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

غم و آزار میں سو لطف میرا دل اُٹھاتا ہے
نشاط و عیش کا ساماں بہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

بہر صورت تری ممنون لطفِ عام ہے دُنیا
مرے ساقی زمانے پر کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تری رحمت کا احساں ہو کہ تیرے جَور کا شکوہ
دلِ بیتاب پر بارِ ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ اسکے آگے راحت ہے نہ بے اسکے مسرت ہے
خدایا کیوں یہ دل کا زیر و بم یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ فکرِ بیش و کم ہم کو نہ ذکرِ رنج و غم ہم کو
ہماری زندگی لطف و ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

بنائیں یا بگاڑیں کچھ توجہ ہی نہیں اس پر
مجھے تو اہلِ دُنیا پر بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

اسرار

(از جناب شرقی خالدی)

ذرہ ذرہ کو جو محبوبِ نظر رکھتا ہوں میں
آرزو میری بہ اندازِ دگر رکھتا ہوں میں

رہنما و جادۂ و منزل سے مستغنی ہے شوق
سینکڑوں دل اپنے غریب رہ گذر رکھتا ہوں میں

تازیانہ ہے سمندِ ناز پر جبرِ مقام
قید میں رہتے ہوئے شوقِ سفر رکھتا ہوں میں

اس پذیرائیٔ اُلفت پر تصدق جان و دل
کیا یہ کم ہے فرصتِ برق و شرر رکھتا ہوں میں

سرزمینِ عاشقی ہے بے نیازِ ہجر و وصل
تنگ ظرفی ہے جو یہ شام و سحر رکھتا ہوں میں

مہر و مہ کیا تو بھی جس کی تاب لا سکتا نہیں
وہ فروزاں دل وہ تابندہ جگر رکھتا ہوں میں

اب کہاں جائینگے مجھ سے چھپ کے جلوے حُسن کے
ذرہ ذرہ پر بڑی گہری نظر رکھتا ہوں میں

اعتبارِ دل کا ماتم اور غضب ہائے دراز
محشرِ خاموش ہنگامِ سحر رکھتا ہوں میں

مدتوں اپنی نگاہوں کا لیا ہے امتحاں
جلوہ گر ہو جا کہ یارائے نظر رکھتا ہوں میں

میری راتیں تیری آمد کی نہیں ہیں منتظر
رازدانِ شوق وردِ معتبر رکھتا ہوں میں

اُن کو اک لمحہ میں کر سکتا ہوں شرقی اشکبار
اتنی ہمت اتنا دل اتنا اثر رکھتا ہوں میں

...ناعِ حیات

...ب جگدیش بھٹناگر حیاتؔ

رہرو کامیاب ہو جاؤ
جستجو میں خراب ہو جاؤ

میرے اشکوں کے پُر اثر قطرو!
رحمتوں کے سحاب ہو جاؤ

جب نہ باقی رہے حجاب کوئی
آپ اپنا حجاب ہو جاؤ

جان لو رازِ ارتقا یعنی
محرمِ انقلاب ہو جاؤ

جادۂ عشق میں فنا ہو کر
منزلِ کامیاب ہو جاؤ

یہی اک شکلِ شادمانی ہے
ہمہ تن اضطراب ہو جاؤ

امتحاں جذبِ دل کا ہو جائے
کاش تم بے حجاب ہو جاؤ

شانِ ساقی کی دیکھنا ہے اگر
بن کے میکش خراب ہو جاؤ

قائلِ کفرِ عشق ہو کے حیاتؔ
مستحقِ عذاب ہو جاؤ

غزل

جناب دردؔ سعیدی ٹونکی

نگہ میں انجام جستجو ہے، قدم بھی آگے بڑھا رہا ہوں
نظر مقدر ہی پر نہیں ہے، خدا کو بھی آزما رہا ہوں

یہی نظامِ چمن رہا ہے، یہی نظامِ چمن رہے گا
وہیں قفس بھی بنے گا اک دن جہاں نشیمن بنا رہا ہوں

یہ کیوں فضا پر ہے یاس طاری؟ یہ ہر طرف کیوں اداسیاں ہیں
ابھی تو اپنی تباہیوں پر میں آپ بھی مسکرا رہا ہوں

میں دوسروں کے بھی رنج و غم پر ہوں دردؔ مجبورِ آہ و زاری
جو میری تقدیر میں نہیں ہے، وہ بارِ غم بھی اٹھا رہا ہوں

غزل

(جناب شاہد نصیر صاحب)

وہ ہم سے بے رُخی اُنکی، اور اُس پر سادگی اپنی
ہم انکو آج تک سمجھے ہوئے ہیں زندگی اپنی

وہی آنسو، وہی آہیں، وہی تاریکیٔ شب ہے
لُٹا دی ہے کہاں اے چاند تو نے چاندنی اپنی

ستارے گنتے گنتے کٹ گئی جو رات کیا غم ہے
شرارے مل گئے مجھ کو گئی [illegible] تشنگی اپنی

بس اک تیرے سہارے اے سحر کاٹیں گے شامِ غم
دگرنہ موت سے کچھ کم نہیں ہے زندگی اپنی

میرا رہے یونہی گاہے بگاہے اک تقاضہ ہے
نہ اُن سے دوستی اپنی نہ اُن سے دشمنی اپنی

نہیں ناداں پرکھتا ہوں میں اکثر فریب اُن کا
محبت کو سمجھتا ہوں اور اُس پر بے بسی اپنی

بتا شاہد ہوا کیا ہے، بتا کیا ہو گیا شاہد
تمہیں تو اس محبت میں رہی نہ ہوش بھی اپنی

غزل

(جناب قدیر لکھنوی)

حجابِ حسن سراپا بنا کے دیکھ لیا
اُنہیں حریمِ تصور میں لا کے دیکھ لیا

حریمِ ناز کا پردہ اُٹھا کے دیکھ لیا
کسی کے حُسن کو مرکز پہ جا کے دیکھ لیا

بھری بہار میں سو تیلیوں سے ٹکرا کر
قفس کو ہم نے گلستاں بنا کے دیکھ لیا

تڑپ کے ساتھ چمک بھی ہو بجلیوں کی سی
یہ کس نے جانبِ دل مُسکرا کے دیکھ لیا

وہی چمن، وہی بجلی، وہی قفس، وہی قید
ہزار بار نشیمن بنا کے دیکھ لیا

نفس نفس کلمہ ہے قدم قدم سجدہ
نیاز مندِ محبت بنا کے دیکھ لیا

قدیر کر نہ سکے جب وہ چارہ سازیٔ دل
تو ہم نے درد کو درماں بنا کے دیکھ لیا

اہم اطلاعات

صنعتی تحفظ و ترقی کیلئے ٹیرف بورڈ

حکومت ہند عرصہ سے صنعتوں کی حفاظت اور امداد کے متعلق غور کر [رہی] تھی۔ اب اس سلسلہ میں اس نے ایک ٹیرف بورڈ کے قیام کا اعلان کیا ہے [بو]رڈ اُن صنعتوں کی طرف سے حفاظت یا امداد کی درخواستوں پر غور کریگا جن [کی] ابتدا یا نشو و نما زمانہ جنگ میں ہوئی ہو اور جن کی کاروباری حالت مستحکم [ہو]۔ لیکن دوسری مستحق صنعتوں کو بھی امداد مل سکتی ہے۔ صنعتوں کی حفاظت اور [امد]اد کا سلسلہ عبوری دور کے بعد بھی جاری رہے گا۔ حکومت کی ٹیرف پالیسی یہ ہے [کہ ص]نعتوں کی اس طرح حفاظت کی جائے کہ اس سے ملک کے مفاد کی بہترین [حف]اظت ہو سکے۔

[ریلو]ں، سڑکوں اور بندرگاہوں کی ترقی

ٹرانسپورٹ کی مشاورتی کونسل اور پالیسی کمیٹی کے مشترکہ اجلاس میں [ری]لوے لائنوں۔ بڑی بڑی بندرگاہوں اور سڑکوں کی ترقی و توسیع پر غور [کیا] گیا۔ نیز ریلوں، سڑکوں اور دریائی نقل و حمل کے باہمی تعاون پر زور دیا گیا۔ [تجوی]ز یہ ہے کہ ۵ ہزار میل لمبی نئی ریلیں بنائی جائیں۔ اس میں سے ۲۸۰۰ میل لمبی [لائ]ن حکومت ہند اپنے خرچ سے تعمیر کرے گی۔ اس سکیم پر ۲۰۰ کروڑ روپیہ صرف [ہوگ]ا۔ اور وہ سات سال میں مکمل ہوگی۔ ۸۰ ہزار میل لمبی سڑکیں تعمیر کی جائیں گی [ان] میں سے ۱۵ ہزار میل لمبی سڑکیں برطانوی علاقہ سے تین ہزار میل لمبی سڑکیں [ری]استوں میں سے گزریں گی۔ اس کے علاوہ بس سروسوں میں توسیع کی جائیگی۔

موجودہ بندرگاہوں کو گہرا کرنے کی تجویز بھی ہے تاکہ ان میں بڑے [بڑ]ے جہاز ٹھیر سکیں۔ اس کے علاوہ ہندستان کے مشرقی ساحل پر ایک نئی عظیم الشان [بند]رگاہ بنائی جائے گی۔

[ب]یرونی ملکوں کے ساتھ تجارت

حکومت ہند کے ٹریڈ کمشنر مقیم آسٹریلیا نے جو آج کل ہندستان

[illegible]

آسٹریلیا کی صنعت نے زبردست ترقی کی ہے۔ اور وہ ہندستان کو کافی سامان مہیا کر سکتا ہے۔ دونوں ملکوں میں جنگ کی وجہ سے برآمد پر پابندیاں تھیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی برآمدی تجارت میں کافی اضافہ ہوا۔ آپ نے جنگ کے موافق اور ناموافق اثرات کا تجزیہ کیا جن کی وجہ سے ہندستان اور آسٹریلیا کی تجارتی تعلقات میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن آپ نے کہا کہ اگر ہوشیاری اور احتیاط سے کام لیا جائے تو نہ صرف آسٹریلیا کی منڈی میں ہندستان کی موجودہ حیثیت برقرار رہ سکتی ہے بلکہ اس میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں ملکوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ آپس میں اشیاء کا تبادلہ کریں۔

معلوم ہوا ہے کہ حکومت آسٹریلیا نے باہر سے مال منگوانے کے لئے لائسنس لینے کے بارے میں جو پابندیاں عائد کی تھیں وہ بہت سی اشیاء پر سے اٹھا دی ہیں یا کم کر دی ہیں۔

---

۵ دسمبر ۱۹۴۵ء سے لندن میں انڈیا سپلائی کمیشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ ہندستان کو رسدیں مہیا کرنے کے متعلق ایجنسی کا جو کام اب تک انڈیا آفس کے "اقتصادی اور سمندری شعبہ" میں کیا جاتا تھا وہ تقریباً سارا کا سارا یہی ادارہ کریگا۔

۱۹۴۵ء کے موسم بہار میں حیدری مشن نے حکومت برطانیہ سے اس بارے میں کامیابی کے ساتھ گفت و شنید کی کہ ہندستان کو ۱۹۴۶ء میں شہری استعمال کے لئے تین لاکھ ٹن فولاد مزید، [illegible] لاکھ ٹن سیمنٹ اور ۵ لاکھ ٹن لکڑی دی جائے تاکہ ہندستان کی اقتصادیات کو جو نقصان پہنچا ہے اسکا ازالہ ہو سکے۔

حکومت ہند اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ ہندستان سے جو ابرک برآمد کیا جاتا ہے اس کی قیمتوں اور معیار [illegible] کے لئے قانون بنایا جائے اور حکومت کی تجویزوں کے متعلق تاجروں سے مشورہ کیا جا رہا ہے۔

چونکہ زمانہ جنگ میں برازیل، کناڈا، اور مشرقی افریقہ میں ابرق کے نئے وسیلوں کو ترقی حاصل ہوئی ہے اور کئی چیزیں ابرق کے بدل کے طور پر استعمال ہونے لگی ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہندستان سے [illegible] قسم کا

ابرق برآمد کیا جائے۔ ابرق کی برآمد پر ایک محصول وصول کرنے کی تجویز ہے جس کا روپیہ ابرق کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے گا۔

ہندوستان کے قومی اور تجارتی فرموں کو فرانس اور بلجیم کے آدمیوں اور تجارتی فرموں کے ساتھ تجارتی و مالی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ امید ہے کہ اٹلی کے ساتھ بھی تجارت کی جلد اجازت دیدی جائے گی۔

تجارت اور قیمتوں کا کنٹرول

دفاعی ضرورتوں کے لئے سیمنٹ کی مانگ کم ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے حکومت ہند نے بھی مرمت اور نئی عمارتیں بنانے کے لئے پبلک کو سیمنٹ کی زیادہ مقدار مہیا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یکم نومبر سے پورٹ لینڈ سیمنٹ کی قیمت گھٹا کر ۶۳ روپے ۱۲ آنے کر دی گئی ہے۔

حکومت نے "فیکٹری سیکنڈس" کے موٹر اور موٹر سائیکل کے اور بہت بڑے بڑے ٹائروں کی انتہائی قیمتیں مقرر کر دی ہیں۔ ٹائروں پر دوبارہ ربڑ چڑھانے کی انتہائی اُجرتیں بھی مقرر کر دی گئی ہیں۔

بغیر لائسنس کے کروم کے مرکبات —— مثلاً پوٹیشیم یا سوڈیم کرومیٹس۔ بائی کرومیٹس اور کروم ایلم —— فروخت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

شہری رسدوں کے کنٹرولر جنرل نے منظوری دیدی ہے کہ اگر ہندوستانی اسٹیشنری کی چیزوں کا کوئی تاجر کسی دوسرے تاجر کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرے تو وہ بنانے والے کی قیمت فروخت پر ۳۵ فی صدی کا اضافہ کر کے اس چیز کو فروخت کر سکتا ہے۔ اور غیر تاجر سے بنانے والے کی قیمت کا ۵۰ فی صدی حصہ زیادہ وصول کیا جا سکتا ہے۔

---

۲۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ختم ہونے والے ہفتہ میں صنعتی خام اشیاء کی تھوک قیمتوں کا اشاریہ ۲۳۸۰۰ رہا۔ اس سے پچھلے ہفتہ میں یہ اشاریہ ۸٫۲۳۷ تھا۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ختم ہونے والے ہفتہ میں اشیائے خوراک کی تھوک قیمتوں کا اشاریہ ۸٫۲۳۵ رہا۔ اس کے مقابلہ میں پچھلے ہفتہ کا اشاریہ ۷٫۲۴۴ تھا۔

صنعت اور مزدور

ہندوستان نے زمانہ جنگ میں طبی سامان اور جراحی کے آلات وغیرہ بنانے میں ترقی کی۔ اور ۸۵ فی صدی سامان مہیا کیا۔

ہندوستان کی کوئلہ کی کانوں میں آتشزدگی کے امکانات کے روکنے کے لئے عرصے سے کوشش جاری ہے۔ کول مائنز اسٹوئنگ بورڈ (کوئلہ کی کانوں میں خلا کو بھرنے والے بورڈ) نے ۴۴-۱۹۴۳ء میں جو رپورٹ پیش کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے کانوں میں سائنس کے اصولوں کے مطابق موثر تدابیر اختیار کی گئیں۔ اور بہت سی کانوں کو مالی امداد دی گئی۔

حکومت ہند نے یکم فروری ۱۹۴۶ء سے زمین دوز کانوں میں مزدور عورتوں کو کام پر لگانے کی ممانعت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کی اجازت جنگی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے عارضی طور پر دی گئی تھی۔

یکم سے ۱۵ اردسمبر ۱۹۴۵ء تک ہندوستان کی مرکزی فیکٹریوں نے ۱۱۶۵۳ من شکر تیار کی۔

سائنسی تحقیق

برسیم ایک پودا ہے جو مصر میں بہترین چارے اور کھاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کی کاشت ہندوستان میں ۱۹۰۴ء سے شروع ہوئی ہے۔ یہ پودا قیمتی سبز کھاد کا بھی کام دیتا ہے۔ اس کی کاشت کو ترقی دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

بیرونی ملکوں سے جو کیڑے مار دوائیں آتی ہیں وہ مہنگی پڑتی ہیں

...س نے زرعی تحقیقات کا شاہی ادارہ دیسی اشیاء سے کیڑے
دوائیں تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ افیون اور تمباکو کے متعلق تجربے
ئے گئے اور معلوم ہوا کہ افیون کے پھوک کا ہلکا عرق کیڑوں کو موثر طریقہ سے
ک کر سکتا ہے۔

...لی سروس

فروری میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے تحت شاہی ہندستانی
ے کے مستقل کمیشن کے لئے ایک مقابلہ کا امتحان ہوگا جس میں ۱۸ سے
سال تک کے نوجوان شریک ہونگے۔ ۸ خالی جگہوں کے لئے امیدوار
ے جائیں گے۔

انڈین سول سروس - انڈین پولیٹیکل سروس - انڈین پولیس اور
ی صوبجاتی حکومتوں جو آسامیاں جنگی خدمات انجام دینے والوں کے
مخصوص ہیں، انہیں پر کرنے کے لئے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ بہت
اسیران جنگ قید کے زمانہ میں زخمی ہونے کی وجہ سے جسم کا کوئی نہ کوئی عضو
بیٹھے ہیں۔ اب ان لوگوں کو مصنوعی اعضاء مفت مہیا کئے جائیں گے۔

...ک و تار

زمانی ۱۹۴۵ء میں لندن میں کامن ویلتھ ٹیلی کمیونیکیشن کانفرنس
ہ ہوئی تھی جس میں دولت مشترکہ برطانیہ کے ملکوں کی ٹیلی کمیونیکیشن
روں کے مستقبل پر غور کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے فیصلوں کے مطابق
، نیا بورڈ قائم کیا جائیگا۔ جس میں ان ملکوں کے نمائندے شامل ہونگے
ں بورڈ کے اختیارات اور فرائض بہت وسیع ہونگے۔ امید ہے کہ ان
روائیوں سے مواصلات کا نظام بہتر اور وسیع ہو جائے گا۔ اور اس
ہندستان کی پبلک کو عام طور پر فائدہ پہنچے گا۔

اب ملایا اسٹریٹس سیٹلمینٹ اور ہانگ کانگ کو بھی ہندستان
بری ڈاک بھیجی جا سکتی ہے۔ ملایا کے بعض حصوں کو تار بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔
س۔ سنگاپور اور ہینگ کو جانے والے نجی تاروں میں تاخیر ہو سکتی
ہے

...جاپان کو مقررہ ... بھیجے جا ... ان
میں غیر معین تاخیر ہو سکتی ہے۔
ڈائرنگ کو بھی تار بھیجے جا سکتے ہیں۔
۴۶-۱۹۴۵ء کے آنے والے بڑے دن اور نوروز کے موقعہ پر پہلے کی طرح
کے ہندستان آنے جانے والے تار قبول نہیں کئے جائیں گے۔ لیکن "امپائر
سوشل ٹیلیگرام" بدستور قبول کئے جائیں گے۔

ہندستان کی بھیڑیں اور بکریاں

دنیا بھر میں سب سے زیادہ بکریاں ہندستان میں پائی جاتی ہیں
اور بھیڑوں کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا میں اس کا چوتھا نمبر ہے۔ مرکزی
زراعتی فروخت محکمہ نے اپنی رپورٹ میں اس امر پر زور دیا ہے کہ ہندستان
میں آسٹریلیا اور ارجنٹائن کی طرح بکریوں اور بھیڑوں کی نسلوں کو بہتر بنایا
جائے۔ بعض حصوں میں عمدہ نسل کی بکریاں اور بھیڑیں پائی جاتی ہیں۔
مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ عام طور پر عمدہ نسل کی بھیڑیں اور بکریاں پیدا
ہونے لگیں۔ اس کے متعلق رپورٹ میں ضروری تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔

ٹڈی دل سے فصلوں کا بچاؤ

اس سال بڑے پیمانے پر ٹڈیوں کی نشوونما ہوئی اور ان کی نقل و حرکت
بھی زیادہ رہی۔ مگر ہندستان کی فصلیں انکی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں۔ یکم سے
۱۵ اکتوبر کے عرصہ میں ہندستان کے کسی حصہ میں انکا زور نہیں ہونے پایا۔

عزیز پریمی

کشمیری گیٹ سے اردو پارک تک

رٹز سینما

یونائیٹڈ فلمز کا لاجواب مسلم سوشل شاہکار بھائی جان ان دنوں دکھایا جا رہا ہے۔ "بھائی جان" سچی اور پاکیزہ محبت کی دلچسپ اور نصیحت آموز تصویر ہے۔ نورجہاں نے لاجواب اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ کیریکٹر ایکٹر شاہ نواز بلندیوں پر ہے۔ کرن دیوان اور مینا کی اداکاری بھی خاصی ہے۔ "بھائی جان" بے شک ایسی تصویر ہے جسے بلا شبہ آپ بیوی بال بچوں کے دیکھ سکتے ہیں۔ رقص، موسیقی اور مزاح کو کچھ اس طرح دلچسپ انداز میں یکجا کیا ہے کہ خواہ مخواہ منہ سے واہ نکلتی ہے۔ نورجہاں کی گائی ہوئی غزلیں بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ میسرز ایرا انڈیا پکچرز نے تصویر کی نشر و اشاعت کافی وسیع پیمانے پر کی ہے۔ جسے تصویر کی کامیابی میں کافی دخل ہے۔

منروا ٹاکیز

فیمس فلمز کی بہترین مسلم سوشل تصویر پھول گذشتہ بارہ ہفتوں سے عوام کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ "پھول" کے متعلق گذشتہ کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور بلاشبہ "پھول" کو ایک کامیاب تصویر کہا جا سکتا ہے۔ اس میں وینا۔ پرتھوی راج۔ مظہر خاں۔ واسطی۔ یعقوب وغیرہ نے کام کیا ہے۔

جمعہ ۷ ارنومبر سے دوصاحبہ بہترین مزاحیہ اور اصلاحی تصویر بیسویں صدی کی نمائش شروع ہو جائے گی۔ "بیسویں صدی" میں چنچل ترس مقبول لال۔ مظہر خاں۔ آشا لتا۔ گوپ۔ نگیندر۔ نورین اور بدھو اڈوانی نے کام کیا ہے۔

ناولٹی سینما

جمنا پروڈکشنز کی موسیقی نواز تصویر "رتن" گذشتہ ۲۹ ہفتوں سے دکھائی جا رہی ہے۔ "رتن" کے سلور جوبلی ہفتے کے موقع پر سیٹھ جگت نراین۔ جیمنی دیوان اور مسٹر مدھوک کی طرف سے پارٹی دی گئی۔ کرن دیوان بھی پارٹی میں شریک تھا۔ مسٹر مدھوک کسی خاص وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ "رتن" باوجود [illegible] ہے۔ موجودہ حالات نے گمان پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے "رتن"، "بسنت" اور "قسمت" کا ریکارڈ توڑ دے۔ گذشتہ ہفتہ کی آمدنی کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۰۵۵۵ روپے ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصویر ابھی اور کافی دنوں چلے گی۔ دہلی کے علاوہ لاہور میں سلور جوبلی منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ دیگر مقامات کی اطلاعات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر جگہ خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ تصویر کی کامیابی پر ہم مالکان، پروڈیوسر جیمنی دیوان سیٹھ جگت نراین اور مسٹر مدھوک کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اداکار جنہوں نے اس میں کام کیا ہے خوش نصیب ہیں۔ جن کی تصویر کو اس قدر کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

جوبلی ٹاکیز

ایشیاٹک پکچرز کا مزاحیہ شاہکار "چاند تارا" دکھایا جا رہا ہے۔ چارلی "چاند تارا" میں اچھوتے انداز سے پیش ہوا ہے۔ چارلی کی مزاحیہ اداکاری پر دلی والے جان دیتے ہیں۔ چارلی کے ہمراہ سورن لتا نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ جگدیش سیٹھ اور ببی اندرا نے بھی خوب کام کیا ہے۔

جمعہ ۹ نومبر سے منروا موی ٹون کا تاریخی شاہکار "ایک دن کا سلطان" نمائش کیلئے پیش کر دیا جائے گا۔ "ایک دن کا سلطان" ایک سقہ کی داستان حیات ہے۔ ایک سقہ ایک ملکہ حسن کے حصول کے لئے مالک تخت بنا۔ یہ تاریخ ہند کی آب زر سے لکھی ہوئی ایک تاریخی داستان ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کہانی آغا جانی کاشمیری جو فلمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے، کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ گانے ولی صاحب اور موسیقی شانتی کمار اور رفیق غزنوی کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ہدایات ہدایت کار اعظم سہراب مودی کی ہے۔ اداکاران میں حسین ساحرہ ملکہ حسن مہتاب۔ واسطی غلام محمد۔ نثار۔ زین۔ صادق علی۔ اور اے۔ شاہ کا نام خصوصاً قابل ذکر ہے۔ "ایک دن کا سلطان" کا دہلی میں نہایت بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ دہلی کی پبلک اسے کافی پسند کریگی۔ یہ تصویر میسرز انڈیا فلم بیورو کے

شمالی ہندوستان میں نمائش کیلئے پیش کی جا رہی ہے۔

...ڈم سینما | محبوب پروڈکشنز کا لاجواب لافانی اور تاریخی شاہکار **ہمایوں** دسویں ہفتہ میں
...ت کامیابی کے ساتھ دکھایا جا رہا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کی علمبردار تصویر
...ں اس قدر مقبول ہو چکی ہے کہ ٹکٹ گھر کی کھڑکیاں کھلتے ہی تھوڑے
...ے بعد مالکان کو ٹکٹ بند کا بورڈ لگانا پڑ جاتا ہے۔ "ہمایوں" نہایت
...ے سلور جوبلی منائیگا۔ ہمایوں کی کامیابی محبوب پروڈکشنز کے مخالفوں کے
...پتر ہے۔ اب بھی ایسے لوگوں کو شرم محسوس ہونی چاہیئے جو اشتہارات
...ی وجہ سے [illegible] تصویر کی مخالفت کر رہے ہیں سا انہیں یہ بھی احساس
...ہیئے کہ ان کی مخالفت سے تصویر کی کامیابی میں فرق نہیں آئے گا۔ بلکہ
...خالفت کی وجہ سے لوگوں کا خواہ مخواہ تصویر کے دیکھنے کو دل چاہے گا۔
...لینے کے بعد ان کا خیال ان لوگوں کی طرف سے بدظن ہو جائیگا۔ یہ لوگ
...ی مخالفت نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنی تجارت کو ٹھیس لگا رہے ہیں۔ خیر
...ت بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ مخالفت کرتے رہیں گے۔ اور "ہمایوں"
...کے جھنڈے گاڑتا ہوا چلتا رہے گا۔ "ہمایوں" واقعی ایسی تصویر ہے جسے
...ماں کی بہترین تاریخی تصویر کہا جا سکتا ہے۔ "ہمایوں" میں وینا۔
...از۔ اشوک کمار۔ نرگس۔ چندر موہن۔ کے این سنگھ نے کام کیا
...سوز منور کجن پکچرز تصویر کی خاطر خواہ نشر و اشاعت کر رہے ہیں۔

...ار ٹاکیز | ڈی آر ڈی پروڈکشنز کا سوشل فلم **آئینہ** کافی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اس میں حسن بانو
...یشودھرا کاٹجو اور سلوچنا چیٹرجی نے کام کیا ہے۔

...ٹاکیز | جینت دیسائی جو اس سے پیشتر کئی کامیاب سوشل اور تاریخی تصویریں پیش کر چکے ہیں۔ اب اپنی
...ر **تدبیر** پیش کرتے ہیں۔ "تدبیر" میں تقدیر اور تدبیر کی زبردست
...دکھائی گئی ہے۔ آخر میں تدبیر کو کامیابی ہوتی ہے۔ تدبیر کی کہانی
...لہانی نیس مسٹر ایم۔ جی۔ بھٹے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں ہندوستان
...ت گویا سہگل اور پہلی مرتبہ ثریا یکجا پیش ہوتے ہیں۔ ان کے ہمراہ
...۔ سالوی۔ جلو۔ ریوا شنکر اور نیا چہرہ نیلوفر نے اپنی اپنی اداکاری
دکھلائے ہیں۔ موتی ٹاکیز کے علاوہ ریجنٹ لاہور میں بھی نمائش
...ہے۔

...ت سینما | ہند پکچرز کا تیار کردہ دنیا کا مشہور ترین رومان

[illegible] پیٹے جنگل [illegible]
تیار کر چکی ہیں۔ مگر نذیر نے اسی پرانی شراب کو نئی بوتل میں کچھ اس
انداز سے پیش کیا ہے کہ تعریف کرنے کو دل چاہتا ہے۔ مجنوں کا پارٹ
نذیر نے اور لیلیٰ کا پارٹ سورن لتا نے ادا کیا ہے۔ یہ فلم کے علاوہ بھی
حقیقت میں ایک دوسرے کیلئے لیلیٰ مجنوں ہیں۔ لیلیٰ مجنوں کے گانے تنویر
نقوی نے لکھے ہیں۔ کہانی و مکالمے منشی دل لکھنوی کے ہیں۔ موسیقی ماسٹر
گوبند رام کی ہے۔ ہدایات تیر اور نذیر کی ہیں۔ تصویر کو کافی مقبولیت
حاصل ہو رہی ہے۔ بمبئی میں "لیلیٰ مجنوں" کی سلور جوبلی ہو چکی ہے۔ امید
ہے کہ یہ تصویر دلی میں کافی دنوں چلے گی۔ سورن لتا اور نذیر کے علاوہ
ایم اسماعیل۔ کے این سنگھ اور گوپ نے بھی کام کیا ہے۔

بمبئی ٹاکیز شیراز علی حلیم کے پاس

دیویکا رانی نے ایک روسی اداکار سے شادی کرلی۔ اور بمبئی ٹاکیز
سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ اب بمبئی ٹاکیز کو سیٹھ شیراز علی حکیم نے
خرید لیا ہے۔ افواہ ہے کہ نواب صاحب بھوپال اور مہاراجہ بہادر پٹیالہ
نے سیٹھ شیراز علی کی مالی امداد کی ہے۔ مگر بعض کا خیال ہے کہ کسی جند
نے مدد کی ہے۔ خیر بہر حال کسی نے مدد کی ہو۔ اب بمبئی ٹاکیز کی باگ ڈور
سیٹھ شیراز کے ہاتھ میں ہے۔ بمبئی ٹاکیز ہندوستان کا مشہور فلمی ادارہ
ہے۔ اور ہمیشہ اس ادارہ سے بہترین تصویریں آئی ہیں۔
ہمیں امید ہے کہ اب بھی بمبئی ٹاکیز سے ایسی ہی تصویریں
آئیں گی۔

کانن بالا، لیلا دیسائی اور آزاد ہند فوج

مشہور فلم سٹار کانن بالا نے ... [illegible] روپے آزاد ہند
فوج ریلیف کمیٹی میں چندہ دیا ہے۔ اور لیلا ڈیسائی نے مسٹر [illegible]
بوس کو ایک چیک اسی سلسلہ میں بھیجا ہے۔

Not too Fast
قوت اور طاقت ایک دولت کا سرمایہ ہے۔ اگر تیزی کے ساتھ اُسے صرف کردیا تو وہ اس آدمی کی طرح تھک کر بیٹھ جائے گا جو لمبی دوڑ میں شروع ہی سے تیز دوڑتا ہے لیکن آج اکثر آدمی تھک کر بیٹھ چکے ہیں۔ اُن کی قوت کمزور پڑ گئی ہے۔ اُن کا دماغ اور اعصاب کمزور ہو چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے صرف
معجون شباب آور
ہی ایک چیز ہے جو اُن کے اندر ایک نئی زندگی کا جوش اور نئی جوانی کا ولولہ پیدا کر دیگی اور چند ہی روز میں کایا پلٹ جائے گی۔
"معجون شباب آور" اعصاب کو قوت دیتی ہے، حافظہ کو بڑھاتی ہے اور جسم کو چست و چالاک اور خوبصورت بناتی ہے۔ خون خوب پیدا کرتی ہے۔
آج ہی منگوا لیجئے۔ قیمت فی شیشی (۲۰ دن کے لیے) پانچ روپے (عہ)
ہمدرد دواخانہ، دہلی
HAMDARD DAWAKANA, DELHI

ہندو مسلمان سب بھائی بھائی ہیں!!

آپس کے جھگڑے ختم کردو!

ایک ہو جاؤ۔ اسی میں تمہاری فلاح اور بہبودی ہے

بھونانی پروڈکشنز کا لاجواب ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار شاہکار

[illegible]

موتی لال کی جذباتی اداکاری۔ نرگس کی شوخ اور چنچل ایکٹنگ

[illegible]پ کے مزاحیہ جملے اور مظہر خاں کے پرزور مکالمے آپ کو مسحور کردیں گے

اداکاران:۔ موتی لال۔ نرگس۔ مظہر خاں۔ گوپ۔ آشالتا
نوین یگنیک وغیرہ

[illegible] جمعہ [illegible] نومبر سے [illegible] میں شروع

جاری کردہ [illegible]

شالیمار پکچرز کی پیش کش

غلامی

اداکاران خصوصی :-

رونیکا دیوی
مسعود پرویز
بھارت ویاس
تواڑی
راج کماری شکلا
انور وغیرہ

...ے :-
...ق بھارت ویاس
...تر الایمان اور مجاز
...یقی :-
...یس کے پال
...یش کردہ :-
...بلیو۔ زیڈ احمد
...ایت کار :-
...موہن وہدوانی

تین اور لاجواب فلم بہت جلد تیار ہو کر آ رہے ہیں!

میرا بائی

...زندہ جاوید مجاہد اور ولی صفت میواڑ
...ایک شہزادی کی روح کو ہلا دینے والی کہانی ہے
...اداکار :- لاثانی نینا۔ پرویز۔ بھارت بھوشن
ممتاز۔ تواری۔ بینا شرما اور راما اوتار
ہدایت کار :- ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد

پرتھوی راج سنجوگتا

راجستان کا ایک زبردست تاریخی رومان جو بغیر جنگ کے شادی نہیں ہو سکتی جس میں نا قابل فراموش فلم کے اداکار نینا اور پرتھوی راج کا پھر سنگم ہے۔
دوسرے اداکار :- تواری۔ بھارت ویاس۔ بی بی بائی۔ رام اوتار اور محمد حسین۔ ایس کے پریم اور کاکو۔
ہدایت کار :- [illegible]

سری کرشن بھگوان

ہزاروں کی ایک اور عظیم الشان تصویر
ایک حقیقت افروز زبردست ڈراما
نینا اور بھارت بھوشن
دوسرے اداکار :-
بینا۔ شیاما۔ شانتا، پریم لتا۔ پرویز۔ تواری۔ بھارت ویاس۔ ایس کے پریم، دار کشمیری۔ رام اوتار اور دس ہزار اور
ہدایت کار :- ڈبلیو زیڈ احمد

اسٹوڈیو شنکر سیٹھ روڈ۔ پونہ

تاجدار رقاصہ

(از فصیح الدین احمد ایم۔ اے)

یہ ایک فرانسیسی ناول کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس ناول کے واقعات کچھ سال قبل مسیح سے شروع ہوتے ہیں جبکہ تخت سلطنت روما کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک حکومت کا دار السلطنت روم تھا اور دوسری کا قسطنطنیہ تھا۔ یہ دوسری حکومت بزنطینی کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ بزنطین کی دولت اور عیش و عشرت اس زمانے میں ضرب المثل تھے۔ یہ ناول اس زمانے کے روشن حالات کا مرقع ہے جبکہ شرم و حیا کے نام سے لوگوں کو شرم آتی تھی اور سوسائٹی کی زینت اور ترقی کا معیار صرف نسوانی حسن کی پرستش رہ گیا تھا۔ لباس سے نفرت کی انتہا نے عریانی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ حکومت کے وزرا اور عمال بڑے بڑے عہدوں کو زر کثیر خرچ کر کے حاصل کیا کرتے تھے اور پھر دونوں دونوں ہاتھوں سے پبلک کو مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ لوٹ کر اپنا گھر بھر لیا کرتے تھے۔ نفس پرستی کے انسداد کی ناکام کوشش نے سارے ملک کو بد اخلاق بنا رکھا تھا۔ جب زنان بازاری کو پکڑ کر زبردستی ایک خانقاہ میں رکھا گیا تو انہوں نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں اونچی اونچی دیواروں سے کود کر جان دیدی۔ مگر پارسائی کی زندگی پسند نہ کی۔ سوسائٹی میں ان بد خصال عورتوں کی جگہ شریف عورتوں نے لے لی۔ اور جو عیب اب تک پس پردہ ہوتا تھا اب کھلم کھلا ہونے لگا۔ اب تک مرد آزاد تھے مگر بدکاری کے انسداد کے بعد عورتوں نے بھی جنسی آزادی اختیار کر لی۔ شاہی دربار کی حالت امیروں اور وزیروں کی سازشیں، اجتماعی قتل اور غارتگری۔ قحط سالی۔ وبا اور سیلاب اور طوفان کس طرح ملک اور سوسائٹی کے نظام کو درہم برہم کرتے ہیں۔ اور جہاں بادشاہ ملک پر قابو رکھنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک عورت نے جس نے اپنی زندگی بازاری رقاصہ کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ مگر بادشاہ سے شادی کر کے ملکہ بن گئی تھی حکومت کے ادارے پر قابض ہو جاتی ہے اور تمام سازشوں کو بے نقاب کر کے مفسدوں کو عبرتناک سزائیں دیتی ہے۔

غرضیکہ یہ ناول ایک رقاصہ کی داستان حیات سے وابستہ ہے جس کے مطالعہ کے ساتھ زمانہ کے حالات اور واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

قیمت دو روپے (عہ) علاوہ محصول ڈاک

ثروت آرا

محترمہ حمیدہ سلطانہ کا شاہکار

حمیدہ سلطانہ صاحبہ نے جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں احباب کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر "ثروت آرا بیگم" شائع کر دی ہے۔ ناول موصوفہ نے اب سے دس سال قبل لکھا تھا۔ اس لئے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے اخلاقی و ادبی لحاظ سے یہ ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے۔ جس میں زندگی اور سماج کی کامل و صحیح تصویر کشی کی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور گندی ہوئی شہوت کی جھلک نہیں۔ ناول میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور وہ واقعیت ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔ "ثروت آرا" کی زبان اسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے ایک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ منہ سے بول رہا ہے کہ یہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔

"ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر، تہذیب اور تمدن رکھتی ہے۔ اسکو پڑھکر دلی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اسکے مطالعہ سے وہ محاورے جو دلی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔ ہر پڑھی لکھی خواتین کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے ([illegible])

قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے ([illegible])

ملنے کا پتہ

دفتر رسالہ "ادیب" دہلی

فلم ''بیگم'' میں نسیم

THE ADEEB

DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only; single copy Rupee one
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi
Edited by Rashid-ud-din Ahmad M.A. and M. I. Wahidi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal Delhi.

THE ADEEB DELHI
ماہنامہ ادیب
(دہلی)

اشوک کمار اور نسیم فلم ''بیگم'' میں

قیمت فی کاپی ایک روپیہ علاوہ محصول

ادیب

ایڈیٹرز :- سید محمد ارتضیٰ واحدی ——— فصیح الدین احمد ایم اے

جلد ۱۰	دسمبر ۱۹۴۵ء و جنوری ۱۹۴۶ء	نمبر ۲ و ۳

فہرست مضامین

(محمد امین احمد نے مسلم ... پرنٹنگ پریس ... میں چھپوا کر دفتر ادیب ... سے شائع کیا)

اچھوں کی اچھی باتیں

(از واحدی)

حاجی امداد اللہ صاحبؒ پچھلی صدی میں ایک اللہ والے بزرگ گزرے ہیں۔ تھانہ بھون یا ضلع مظفر نگر کے کسی اور قصبہ کے رہنے والے تھے۔ مجھے حاجی صاحب کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔ البتہ بچپن سے ان کا نام سنتا آیا ہوں اور بچپن سے دو شخصوں کا دل پر خاص اثر ہے۔ ایک مولانا فضل الرحمن صاحبؒ کا اور ایک حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا شاید اس لئے کہ مولانا فضل الرحمن صاحب کے میرے والد مرید تھے اور حاجی امداد اللہ صاحب کے میرے پھوپی زاد بھائی مولوی حمزہ صاحب

حاجی امداد اللہ صاحب اوسط درجہ کے پڑھے لکھے انسان تھے۔ مگر مولوی حمزہ صاحب کی طرح ان کے بہت سے ممتاز عالم مرید تھے۔ بانیان مدرسہ دیوبند مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی رشید احمد صاحب جیسے حضرات ان کے مریدوں میں شامل ہیں۔ مولوی محمود الحسن صاحب اور مولوی اشرف علی صاحب بھی ان ہی سے بیعت تھے۔ غالباً علما کبھی کسی درویش کے ایسے گرویدہ نہیں ہوئے ہونگے جیسے حاجی امداد اللہ صاحب کے تھے۔ مولوی اشرف علی صاحب کی مرتب کردہ ایک کتاب "کمالات امدادیہ" حال میں مجھے ملی ہے۔ اس کے چند اقتباسات یہاں درج کرتا ہوں۔ بیان سارا مولوی اشرف علی صاحب کا ہے۔ میں نے صرف زبان آج کل کی کردی ہے۔

ایک دفعہ حاجی امداد اللہ صاحب سے کسی نے کہا کہ فلاں آدمی آپ کی برائیاں کرتا رہتا ہے۔ اور یہ یہ کہتا ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا "وہ تم سے زیادہ لحاظ دار ہے۔ اس نے کم از کم میرے منہ پر تو یہ باتیں نہیں کہیں اور تم نے منہ در منہ کہہ دیں۔" مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں کہ خوشامدیوں اور چغلخوروں کی ایسی ہی ہمت شکنی ہوا کرے تو فتنہ و فساد کے دروازے بند ہو جائیں ؂

حاجی امداد اللہ صاحب سے [illegible]

ایک اور مولوی صاحب (مولوی رحمت اللہ) جو ہندوستان سے [illegible] ہجرت کر گئے تھے۔ لیکن ان کے تعلقات سلطان ترکی سے بہت تھے [illegible] آتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ قسطنطنیہ سے [illegible] تشریف لائے اور حاجی امداد اللہ صاحب سے سلطان کے تعریف و توصیف کرکے کہا اگر آپ اجازت دیں تو آپ کو سلطان سے ملواؤں۔ حاجی صاحب نے فرمایا کیا نتیجہ ہوگا زیادہ سے زیادہ سلطان میرا معتقد ہو جائیگا۔ پھر آپ دیکھیے کہ آپ کا معتقد ہوا تو یہ نتیجہ نکلا کہ بیت السلطان سے قرب ہے اور بیت اللہ سے [illegible] البتہ آپ سلطان کی بابت کہتے ہیں کہ عادل ہے تو حدیث میں آیا ہو کہ سلطان عادل کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ سو اگر ہو سکے تو آپ سلطان سے میرے حق میں دعا کرا دیجئے۔ مگر ایک بادشاہ سے یہ خواہش کہ کسی فقیر کے واسطے دعا کرے عرفاً آداب سلطنت کے خلاف ہے۔ لہذا بس اتنا کہیے گا کہ میرا سلام کہہ دیجے گا۔ وہ جواب میں وعلیکم السلام ضرور کہے گا اور اس طرح دعا ہو جائیگی"

مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں۔ اس حکایت سے حاجی صاحب کا غیر اللہ سے استغنا ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن دنیاوی دولت اور جاہ کو ٹھکرا دینے کے بعد حاجی صاحب شیخ الوقت اور مرجع الفضلاء ہو کر سلطان سے دعا کے طالب ہیں۔ یہ حاجی صاحب کا انتہائی انکسار ہے۔ حاجی صاحب نے استغنا اور تواضع دونوں کو سمو دیا اور استغنا میں جو تھوڑا سا تکبر کا شائبہ پیدا ہوتا تھا اُسے کھو دیا ؂

ایک دفعہ مولوی محمد قاسم صاحب نے عرض کیا۔ "حضرت میرا ایک جگہ نوکری کا تعلق ہے۔ اگر ارشاد ہو تو چھوڑ دوں" حاجی صاحب نے فرمایا "مولوی صاحب! معلوم ہوتا ہے ابھی طبیعت میں تردد ہے اور یہ دلیل ہے خامی کی۔ ایسی حالت میں تعلقات کا ترک موجب تشویش قلب ہو سکتا ہے۔ جب تردد دور ہو جائیگا طبیعت تعلقات سے خود بخود اتنی نفور ہوگی کہ مشوروں کی حاجت نہ رہیگی"

مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں۔ بعض مشایخ ترک تعلقات کا دفعتہً حکم کر دیتے ہیں۔ چونکہ طبیعت ابتدا سے تعلقات کی خوگر ہوتی ہے تو قلب پر کسی خاص کیفیت کے پیدا ہوئے بغیر تعلقات کا ترک فائدہ کی بجائے نقصان پہنچاتا ہے۔ حاجی صاحب اپنے مریدوں کو ہمیشہ یہی تعلیم دیا کرتے تھے کہ دنیائے حلال کو اپنے ارادہ سے کبھی مت چھوڑو ؂

حافظ محمد ضامن صاحب حاجی صاحب کے پیر بھائی تھے۔ اور بڑے

باکمال بزرگ تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ حاجی صاحب سے ذکر کیا کہ خدا معلوم کیا بات ہے کہ مجھ سے مرنے کو دل چاہتا ہے۔ اور ایسی کیفیت ہے کہ سکون نہ ہوا تو کہیں میں خودکشی نہ کر بیٹھوں۔ چونکہ موت کی تمنا ممنوع ہے۔ مجھے بڑا تردد ہے۔" حاجی صاحب نے فرمایا "حضرت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقام ولایت عطا کیا ہے موت کی ایسی تمنا تو ولایت کی علامت ہے۔" پھر آیت پڑھی ان زعمتم انکم اولیاء اللہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین۔ مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں" حاجی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ حدیث میں مطلق موت کی تمنا کو برا نہیں کہا گیا بلکہ اس موت کی تمنا کو برا کہا ہے کہ دنیاوی تکلیف سے ناگزیر ہو۔ حدیث میں یہ لفظ صاف موجود ہیں۔ بضر نزل لہٗ۔ موت کی تمنا اللہ کے دیدار کے شوق میں اللہ سب کو دے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے وہ موت ہی کی تمنا تو کرتے تھے۔

ایک دفعہ حاجی صاحب یہ فرما رہے تھے کہ بلا اور مصیبت بھی نعمت ہے۔ تقریر بڑے زور شور سے جاری تھی حاضرین پر خاص اثر طاری تھا کہ یکایک کوئی شخص حاضر خدمت ہوا جس کا ہاتھ گل رہا تھا۔ رومال گلے میں بندھا تھا اور اس میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ عرض کرنے لگا۔ حضرت! سخت مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس سے نجات حاصل ہو۔ مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں کہ اس وقت مجھے وسوسہ ہوا کہ دیکھیں اب حاجی صاحب کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ابھی بلا اور مصیبت کو نعمت قرار دے چکے ہیں۔ اگر اس شخص کے واسطے دعا کرینگے تو گویا یہ کہیں گے کہ اسے نعمت سے محروم کر دیا جائے۔ اور دعا سے انکار فرماتے ہیں تو ایک امیدوار ناامید ہوگا۔ شیخ کامل کو طالب کے درجہ پر نیچے اترنا پڑتا ہے۔ طالب سے شیخ کامل یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ اس کے درجہ پر یکایک آ جائے۔ غرض میں اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا اور حیران تھا کہ حاجی صاحب نے ارشاد کیا۔ "بھائیو! ہاتھ اٹھاؤ اور دعا کرو کہ یا الٰہی ہم جانتے ہیں کہ یہ بلا بھی نعمت ہے لیکن اپنے ضعف کے سبب ہم سے اس نعمت کا بوجھ نہیں سنبھلتا۔ لہٰذا یہ نعمت صحت کی نعمت سے بدل ڈال۔" مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں "میں یہ دعا سنکر دنگ رہ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ علما کے الفاظ بہت دیکھے عالم معانی حاجی صاحب ہی کو پایا" +

ایک دفعہ حاجی صاحب کے پاس دو طالب علم آئے۔ ایک کا دعویٰ تھا لاصلوٰۃ الا بحضور القلب (دل پوری طرح یکسو نہ ہو تو نماز نماز کامل نہیں ہوتی) دوسرا کہتا تھا حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "میں نماز میں لشکر کی تیاری کی فکر کیا کرتا ہوں" (لاجہز جیشی وانا فی الصلوٰۃ) اس سے ظاہر ہے کہ نماز کے لئے حضور قلب اور یکسوئی ضروری نہیں ہے۔ ورنہ حضرت عمرؓ کی نماز کو نماز ناقص کہنا پڑیگا۔ حاجی صاحب نے فرمایا "حضرت عمرؓ کا نماز میں لشکر کی تیاری کی فکر کرنا حضوری قلب اور یکسوئی کے منافی کیسے ہو گیا۔ وہ عین حضوری قلب اور یکسوئی ہے۔ بادشاہ کی طرف سے کسی کو کوئی خدمت سپرد ہو اور وہ دربار کی حاضری کے وقت اس خدمت کی بابت کچھ غور و فکر کرے اور کچھ سنے تو یہ تو بادشاہ سے لگاؤ کا ثبوت ہے۔ حضرت عمرؓ کو اللہ تعالیٰ نے خلافت پر فائز کیا تھا اور نماز اللہ کے دربار کی حاضری کا نام ہے۔ تو نماز میں حضرت عمرؓ کا خدمت خلافت کو نہ بھولنا کمال حضوری قلب و یکسوئی تھا۔ نماز میں خدمت خلافت سے علاوہ ادھر ادھر کا خیال آتا تو بے شک حضوری قلب و یکسوئی کے منافی تھا۔ حضرت عمرؓ نماز میں حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر لشکر کی تیاری کے متعلق استخارہ اور استشارہ کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی تیاری لشکر کو ہمیں اپنے وساوس اور خطرات پر قیاس نہ کرنا چاہیئے۔" مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں" حقیقت میں علم رسمی محض لفظ پرستی ہے بمعانی رسی اور حقائق شناسی اولیاء اللہ کا ہی حصہ ہے" ؛

ایک دفعہ کسی شخص نے حاجی صاحب کی طرف سے جعلی خط بنا کر کسی امیر سے کچھ رقم وصول کر لی۔ ایک مرید نے عرض کیا، ایسے غلط کار کو سزا ملنی چاہیئے۔ حاجی نے فرمایا" بھائی! مجھ سے اسے دین کا فائدہ نہیں پہنچا تو مردار دنیا کا فائدہ تو ہو جانے دو۔ شرم کی بات ہے کہ اس میں بھی بخل اور اس سے بھی دریغ کروں۔" مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں" جعلی خط بنانے والے کی حرکت سے حاجی صاحب کی سبکی کا بھی امکان تھا۔ اس پر غصہ آنا چاہیئے تھا۔ مگر حاجی صاحب نے مطلق پرواہ نہ کی۔ اور بالکل ایسا سمجھا جیسے کسی نے ان کے نام سے کسی سے سنگریزہ مانگ لیا ہو۔ اتنی سی بات کو کیا اہمیت دی جائے" ؛

حافظ عبدالرحیم صاحب تھانوی حاجی صاحب کے مرید خاص راوی ہیں کہ مکہ معظمہ کے ابتداء قیام میں حاجی صاحب پر اکثر فاقوں کی نوبت گزر جاتی تھی۔ ایک دفعہ کئی وقت کا فاقہ تھا۔ حاجی صاحب حرم شریف میں اللہ کی عبادت کر رہے تھے کسی شخص نے حاجی صاحب سے کہا مجھے اپنی یہ لنگی عنایت فرمائیے جو سامنے پڑی ہے۔ آپ نے بلا تامل لنگی اسے دیدی۔ تھوڑی دیر میں وہ شخص

پھر الماری میں رکھ دیا۔ حاجی صاحب عبادت سے فارغ ہوئے تو دیکھا لنگی ہی
[illegible] رہے ہیں۔ حاجی صاحب سمجھے کہ امانت سنبھال کر چھوڑ
جاتا ہے۔ کئی دن [illegible] مذکور دوبارہ دکھائی دیا۔ حاجی صاحب نے اُس سے
فرمایا "میاں! امانت اس طرح رکھا کرتے ہیں کہ مجھے بتایا تک نہیں۔ میرے
دیکھنے سے پہلے کوئی اُٹھا کرلے جاتا تو میں خواہ مخواہ الاستہ مندہ ہوتا۔" اُس
نے عرض کیا "حضرت! وہ تو آپ کی نذر ہے۔ آپ اپنے صرف میں لائیے۔"
مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حاجی صاحب
کیسے مستقل مزاج، کیسے ثابت قدم، کیسے مستغنی اور کیسے سیرچشم تھے اور کیسے
سخی بھی۔ تہی دستی میں کپڑا دینے سے تامل نہ کیا۔ ینفقون فی السراء والضراء
کے یہی معنی ہیں۔ ثانیاً جب کپڑا واپس آگیا تو وسوسہ نہ ہوا کہ شاید کچھ دے گیا
ہو۔ عبادت میں مشغول رہے۔ حالانکہ قرینہ یہ بتلاتا تھا اور ضرورت کے وقت بڑے
بڑے مستقل مزاج لڑکھڑا جاتے ہیں۔ پھر رقم دیکھکر بھی ذہن ادھر نہیں گیا کہ
میرے لئے ہے۔ امانت کا خیال کیا اور رقم پاس ہونے کے باوجود فاقہ جاری رکھا۔
اور حافظ عبدالرحیم صاحب کہتے ہیں کہ نذر قبول کرکے بھی آپ جمع نہیں کیا کرتے
تھے فوراً خرچ کر ڈالتے تھے۔

حاجی صاحب سلطان ابراہیم ادہم کی اولاد میں سے تھے۔ سلطان ابراہیم
ادہم کے مزار کی تولیت خالی ہوئی تو بعض مشائخ نے حاجی صاحب کو اس جگہ کے
لئے تجویز کیا۔ مزار کے ساتھ کافی جائداد وقف تھی اور اُسکی آمدنی کا ایک حصہ
متولی جائز طریق سے لے سکتا تھا۔ مشائخ کا منشا یہی تھا کہ حاجی صاحب کی
کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے اس طرح اطمینان کی صورت ہو جائیگی۔ حاجی
صاحب کو وطن چھوڑنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ نائب کام کرتا اور احکام یہاں
سے پہنچتے رہتے۔ حاجی صاحب سے جب اس تجویز کا ذکر کیا گیا تو آپ نے
فوراً جواب دیا "اولاد ہونے کی وجہ سے مجھے متولی بنایا جا رہا ہے۔ حضرت
سلطان نے تو سلطنت بلخ پر لات ماردی تھی اور میں اس دُنیا کو اختیار کروں۔
پھر اولاد خلف کب رہا۔ اور اس خدمت کے لئے خلف ہونا چاہیئے۔ خلف
بنناہے تو اقتدا لازمی ہے۔"

ایک دفعہ حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا "بعض درویش امراء کی
جو اُن کے پاس آتے ہیں تحقیر کرتے ہیں اور اسے استغنا سمجھتے ہیں۔ یہ استغنا
نہیں تکبر ہے۔ کیونکہ جو امیر تمہارے پاس آتا ہے وہ امیر اور دُنیا دار کی حیثیت
سے نہیں آتا۔ دیندار اور طالب [illegible] ہے۔ بزرگوں کا قول ہے
نعم الامیر علیٰ باب الفقیر اور بئس الفقیر علیٰ باب الامیر۔ تو جب امیر فقیر
کے دروازہ پر آگیا تو نعم الامیر ہو گیا۔

ایک دفعہ کسی شخص نے عرض کیا۔ حضرت! اللہ کا ذکر کرتا ہوں مگر کچھ
نفع نظر نہیں آتا۔ حاجی صاحب نے فرمایا "اللہ کا نام لیتے ہو یہ کیا تھوڑی
بات ہے۔ اللہ کا ذکر کرنا خود نفع ہے۔"

(از فصیح الدین احمد)

میری نظر میں

نوٹ:۔ نومبر میں یہ مضمون شائع ہوا تھا مگر اس میں کتابت کی غلطیاں بکثرت رہ جانے کی وجہ سے اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ (فصیح الدین احمد)

شیخ میاں محمد اسلم صاحب کو افسانہ نگاری اور ناول نویسی کی وجہ سے اردو داں طبقے میں کافی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ اور جن لوگوں نے ان کی تصانیف پڑھی ہیں انہوں نے اکثر کتابوں میں ان کی تصویر بھی دیکھی ہوگی۔ مگر ہندستانی فوٹوگرافر کو صرف ایک کام آتا ہے یعنی وہ اپنے گاہک کی تصویر نہایت خوبصورت پیش کرنے کا عادی ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح نقش و نگار تصویر سے اکثر ظاہر نہیں ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی بت کی تصویر کھینچ کر رکھدی گئی ہے۔

آج میں اسلم کی ایک قلمی تصویر پیش کرنی چاہتا ہوں۔ وہ اسلم جس نے کم و بیش ساٹھ ہزار صفحات سیاہ کئے ہیں اور جسکی تصانیف کی تعداد قریباً ایک سو ساٹھ تک پہنچ چکی ہے۔ جن میں سے بعض بعض کتابیں سات سو صفحے پر مشتمل ہیں۔ اسلم نے صرف افسانے اور ناول ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ بعض مضامین کے مجموعے بھی شائع کئے ہیں۔ لیکن دنیا محض ناول نویس کی حیثیت سے ان سے واقف ہے۔

میں اسلم کے حسب و نسب سے واقف نہیں۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ ان کا خاندان لاہور کے معزز شریف اور متمول گھرانوں میں شمار ہوتا ہے جس طرح حیدرآباد دکن میں ہر شخص کو مولوی یا مولانا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اسی طرح لاہور میں ہر شخص کو شیخ صاحب تصور کیا جاتا ہے۔ اسلم شیخ صاحب بھی ہیں اور میاں صاحب بھی۔ یہ شیخ ہیں یا نہیں۔ میں نہیں جانتا۔ مگر واقعی یہ "میاں" ضرور ہیں۔ (دہلی کی زبان میں "میاں" ایک سیدھے اور شریف آدمی کو کہتے ہیں)

لاہور میں جس جگہ ان کی موروثی حویلی ہے اُسے بارود خانہ کہتے ہیں۔ شاید شاہی زمانے میں یہ شاہی میگزین ہوگا۔ بارود خانہ سے ذرا آگے بڑھئے تو ہیرا منڈی آتی ہے۔ ہیرا منڈی میں "الماس" "ٹلمنچہ" "ہیرا" اور "گلنار" بستی ہیں۔ گویا یہ دہلی کا چاوڑی بازار ہے۔

میاں صاحب کی حویلی بہت قدیم معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ڈیوڑھی ایسی شاندار ہے کہ ہاتھی یا اونٹ سوار بآسانی اُس کے اندر جا سکتا ہے۔ جس محلے میں یہ رہتے ہیں وہاں کی ساری جائداد ان کی ملکیت ہے۔ اسکے علاوہ پنجاب میں جگہ جگہ ان کے وسیع مربعے موجود ہیں۔

اسلم کی عمر غالباً پچاس برس سے متجاوز ہوگی۔ لمبا چہرہ۔ لمبی ناک پچکے ہوئے گال۔ لمبی لمبی مونچھیں۔ گھٹی ہوئی ڈاڑھی۔ چندیا صاف۔ صرف قلمیوں میں کچھ بال نظر آتے ہیں۔ دانت پورے معلوم ہوتے ہیں۔ پان سگریٹ سے نفرت ہے۔ حقہ بھی نہیں پیتے دیکھا۔ ہاتھ پاؤں لمبے مگر گوشت کم۔ گفتگو میں ملائمت اور اٹک۔ سچا اور پکا دیندار آدمی۔ ہیرا منڈی کے قرب میں رہکر بھی کبھی زندگی کو ان جواہر ریزوں سے مالا مال نہیں کیا۔ اولاد سے محروم۔ طبیعت میں صفائی اور ستھرائی۔ لمبا کالر دار کوٹ۔ ریشمی قمیص۔ اور شلوار۔ سر پر سرخ ترکی ٹوپی۔ گلے میں نکٹائی۔ دوست کا دوست اور دشمن کا بھی دوست۔ مہمان نوازی سے خوش۔ بلکہ مہمان کو خدا کی رحمت سمجھنا۔ مہمان کے ساتھ سایہ کی طرح رہنا۔ یہ ان کی خصوصیات ہیں۔

ان کے سگے ماموں بقول اسلم صاحب "جانگلی" ہیں۔ "جانگلی" معلوم ہوا اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو راوی کے اُس پار خانہ بدوش قبائل کی طرح رہا کرتے تھے۔ ان کے پاس مویشیوں کے گلے ہوتے تھے جس جگہ ہریاول دیکھی ڈیرے ڈال دیئے۔ پھر آگے چل نکلے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسلم صاحب کو شکار کا بے تحاشہ شوق ہے اسی وجہ سے ان کے ہر ناول میں اور کم و بیش ہر افسانے میں بندوق اور شکار کا ذکر ضرور آتا ہے۔ خانہ بدوش لوگ ایک قسم کی نظم خوانی بھی کرتے تھے جس کو ان کی زبان میں "ڈھولا" کہتے ہیں۔ "ڈھولے" عموماً اونٹ کی پیٹھ پر یا دیکھا سے دور درخت پر بیٹھکر بولے جاتے تھے۔ جہاں سے ڈھولا کہنے والے کی آواز سامعین تک برابر آتی رہتی تھی۔ مگر وہ اُن کو دکھائی نہ دیتا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ اسلم کو موسیقی کا بھی کچھ شوق ہے۔ اور اُن کے ناولوں میں اشعار اور گیت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ہیرا منڈی کا قرب حاصل ہے اس لئے کبھی کبھی کسی رقاصہ کا بھی ذکر آ جاتا ہے۔

کوئی مہینہ جاتا ہوگا کہ اسلم کی کوئی نہ کوئی کتاب ریویو کے لئے نہ ملتی ہو۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اتنے بے شمار افسانے اور ناول لکھنے کے لئے ان کے پاس کہاں سے وقت آتا ہوگا۔ مگر جو زندگی کے حالات اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ فکر معاش سے مستغنی۔ اولاد کی فکر سے سبکدوش۔ ایسا شخص جتنا بھی لکھے کم ہے۔

[illegible]

بیٹھک کے سامنے بالو قادر یرواتع ہے۔ یہ بھی پُرانی وضع کی عمارت ہے [illegible] چھوٹا سا صحن جس میں گملے رکھے ہوئے ہیں۔ لباس کی طرح ان کی بیٹھک میں بھی مغرب اور مشرق دونوں باہم ملتے نظر آتی ہیں۔ کرسیوں اور میزوں کے ساتھ قالین اور چاندنی بھی موجود ہے۔ دیواروں پر بیشمار فوٹو اور قطعات آویزاں ہیں۔ جانشین پر کثیر تصاویر ان کی گود لی ہوئی مرحوم بھانجی اصغری کی موجود ہیں۔ اسلم صاحب کے ہاں چونکہ کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اس لئے انہوں نے اپنی بہن کی ایک کمسن لڑکی کو متبنیٰ کر لیا تھا مگر قدرت کو ان کی گود بھری رکھنی منظور نہ تھی۔ ان کی نشست نیچے چاندنی پر بھی ہوتی ہے اور کرسیوں پر بھی۔ ان کی ساری تصانیف اسی جگہ پیدا ہوتی ہیں۔

اسلم صاحب کی تعلیم کے متعلق مزید تفصیلات معلوم نہیں۔ مگر اتنا ضرور سننے میں آیا ہے کہ وہ میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے۔ سر محمد اقبال مرحوم کے پرستار گرودوں میں تھے۔ روزانہ شام کو یہ سیر کر کے جب واپس آتے تو انارکلی میں ڈاکٹر اقبال کے مکان پر پانی پینے کے لئے رک جاتے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے کسی انگریزی نظم کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ اور کلاس روم میں بورڈ پر لکھ دیا ڈاکٹر اقبال کی جب اس ترجمہ پر نظر پڑی تو انہوں نے نصیحت کی کہ "اسلم تم کو چاہیے کہ کچھ نثر لکھو۔ اس سے تم کو کچھ فائدہ نہ ہوگا" وہ دن اور آج کا دن اسلم نے قلم اٹھائی اور ایسی اٹھائی کہ اردو مصنفین میں ناول نگاری میں اپنے لئے ممتاز جگہ پیدا کر لی۔

ان کے پبلشروں کی تعداد بھی بکثرت موجود ہے۔ جس طرح کثیر الاولاد والدین اپنی اولاد کو بخوشی دوسروں کو متبنیٰ بنانے کے لئے دیدیتے ہیں اسی طرح اسلم صاحب نے شاید کسی کتاب کا بھی حق تصنیف اپنے حق میں محفوظ نہیں رکھا۔ بلکہ پبلشروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ان کے موجودہ پبلشر مکتبہ دار البلاغ میو ڈومحمد نگر لاہور ہیں۔ جو اب تک اسلم کی بیس بائیس کتابوں کا حق اشاعت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ دنیا اسلم کو "گناہ کی راتوں" کے مصنف کے اعتبار سے نہیں بلکہ ان کی باقی تصنیفوں کی وجہ سے یاد رکھے۔

اسلم کی فسانہ نگاری کے متعلق چند فقرے ضروری معلوم ہوتے ہیں اسلم کی فسانہ نگاری کا حسن پہلی نظر سے گذر چکا ہے۔ اب صرف یہ بتانا باقی ہے کہ وہ افسانہ کیونکر لکھتے ہیں۔ اس کے متعلق خود ان کا قول ہے کہ افسانہ کا پلاٹ ان کو زندگی کے ہر موڑ پر نظر آتا ہے۔ مثلاً کیلے کے چھلکے پر سے کسی کو رپٹتے ہوئے دیکھ لینا۔ مرغی کا انڈوں پر بیٹھنا۔ گائے کے بچھڑے کا ماں کے تھنوں

[illegible]

چوہے کا روٹی کے ٹکڑے کے لالچ میں پنجرے میں پھنس جانا۔ یہ باتیں ان کیلئے افسانہ بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔ مگر افسانہ کے پلاٹ کو ذہن میں مکمل تیار کرنے سے پہلے اُن کو ایک مناسب نام کی ضرورت ہوتی ہے۔ نام رکھے بغیر کبھی افسانہ لکھنا شروع نہیں کرتے۔ اور افسانہ لکھنے کے بعد اس وقت تک شائع نہیں کرتے جب تک چند معتمد دوستوں کو پہلے سُنا نہ لیں۔ چنانچہ اُن کے دوستوں کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمہ تن گوش ہو کر اُن کے افسانے کو سنیں۔ افسانہ سُنانے میں ان کو داد لینی منظور نہیں ہوتی بلکہ ان کی رائے اس لئے طلب کرتے ہیں کہ افسانہ کی خامیوں کو دور کیا جا سکے۔ یہ ہٹ دھرم نہیں ہیں۔ اگر ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو اُسے تسلیم کرنے میں دیر نہیں کرتے۔ خود ان کا قول ہے کہ جب افسانہ ان پر طاری ہوتا ہے تو دنیا کی کسی چیز میں انہیں دلچسپی نہیں رہتی۔ یہ کاغذ اور قلم دوات لیکر بیٹھ جاتے ہیں اور جو کچھ دماغ میں ہوتا ہے اُسے نکال کر کاغذ پر رکھ دیتے ہیں۔ گھر میں بچوں کا شور یا بڑوں کی بات چیت اُن کے کام میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر ریڈیو آہستہ آہستہ چلتا ہے یا گراموفون ریکارڈ بجتا ہے تو ان کو اس کام میں اور بھی امداد ملتی ہے۔

ان کے دوستوں کے نام بھی مجھے معلوم نہیں۔ گفتگو میں دو نام اکثر ان کی زبان سے سُننے میں آتے ہیں "بخاری اور تاج۔ یعنی پروفیسر احمد شاہ بخاری اور سید امتیاز علی تاج"۔ ان دونوں کو یہ اپنا سچا رفیق سمجھتے ہیں۔ اسلم کو میلوں، تماشوں، کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ البتہ سینما ضرور دیکھتے ہیں۔ مگر یہ شرط ہے کہ کوئی افسانہ اس وقت ان پر نازل نہ ہو۔ افسانہ نازل ہوتے وقت ان کو خورد ونوش کی بھی خبر نہیں رہتی سینما میں جس خاص سین کی تعریف سنکر دیکھنے جاتے ہیں اُسے دیکھکر باہر آجاتے ہیں۔ تمام وقت سنیما میں نہیں بیٹھتے۔

یہ خاکہ میں نے میاں محمد اسلم صاحب کا اپنے زاویہ نگاہ سے کھینچا ہے ممکن ہے دوسروں کی نظر اُن کو کسی اور طرح دیکھتی ہو۔ مگر مجھے دوسروں سے کیا واسطہ؟ اس مضمون میں اسلم صاحب کی تصانیف پر رائے زنی کرنے کا میرا ارادہ نہیں۔ البتہ اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ ان کے بعض ناول ایسے ہیں کہ ان کو بہت کامیابی کے ساتھ پردۂ فلم پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔

کیا ہم انسان ہیں؟

(از جناب قاری عباس حسین صاحب)

دُنیا کب پیدا ہوئی یا بنی؟ اسے کس نے بنایا؟ اور کیونکر بنایا؟ یہ سب سوالات عالموں اور حکیموں کے حل کرنے کے ہیں۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ دُنیا بن گئی اور موجود ہے۔ خدا نے اسے اپنے حکم سے بنایا۔ جو لوگ خدا کے قائل نہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ جس کسی نے دُنیا کو بنایا اس نے اسے نہایت حسین و جمیل بنایا۔ نیلا آسمان اس پر سُورج اور چمکتے چاند تارے سب بآنگ دہل کہہ رہے ہیں کہ کسی نے ہمیں ایک حسین و جمیل مجلس کی زیبائش و آرائش کے لئے بنایا تھا۔ زمین پر سبزہ اور طرح طرح کے پُھول ایک زبردست صنّاع کی تصدیق کر رہے ہیں۔ دریا پہاڑ چشمے غرض ہر منظر قدرت کی صنّاعی پر بڑے زور شور سے شہادت دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ خدا نے یا قدرت یا جو نام بھی رکھ لو اُس نے ایک نہایت حسین اسٹیج تیار کیا اس کا منشا ہوگا اور ہونا چاہیئے کہ اس سٹیج پر جو ایکٹر کام کریں گے وہ اسکی دل آویزی کو چار چاند لگا دیں گے۔ جو کوئی بھی آسمان شجر حجر کا پیدا کرنے والا ہے اُس نے ان سب کو اطاعت اور فرمانبرداری کی وہ تعلیم دی ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر لحظہ اسکے مقرر کردہ نظام اور اُس کے اشارے کے مطابق صدیوں سے حرکت کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ سُورج صبح نکلتا ہے اور شام کو ڈوب جاتا ہے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ مشرق کی جگہ مغرب سے نکلا ہو اسی طرح چاند تارے سب کے سب ایک نظام اور ایک حکم کے مطابق گردش کر رہے ہیں۔ نباتات جس خاص ضابطہ کے ماتحت ازل سے پیدا ہوتی تھی آسی ضابطہ کے ماتحت آج بھی پیدا ہو رہی ہے۔ پُھول اسی ضابطہ کے ماتحت کھلتا اور مُرجھا جاتا ہے۔ اس نظام میں حبّہ بھر فرق نہیں آتا۔

جو اسٹیج اس دلکشی اور دل آویزی کے ساتھ ترتیب دی گئی اُس میں ایک ایکٹر داخل ہوتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ اس ایکٹر کو خدا نے وہ نعمت دی جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دی تھی۔ وہ اس کا شعور تھا لیکن علمائے قدیم نے جو پس منظر ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ نافرمانی کرنے کی پاداش میں زمین پر پھینکا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسکو درغلانے والی بیگم صاحبہ بھی دُنیا میں پہنچ گئیں۔ اسے ان یہی کہ خدا نے! آدم کو دانہ گندم کھانے سے منع کیا تھا شیطان نے اماں حوا کو بہکایا اور آدم بہکانے میں آئے اُنہوں نے گندم کھایا اور وہ معہ اماں حوا کے جنت سے نکال کر دُنیا میں پھینک دیئے گئے۔ خدا معلوم انسان اول کا یہ قصور ہے یا جھلایا ہمارے شعور کا کہ جس وقت سے اِنسان دُنیا میں پیدا ہوا دنیا میں ایک خلفشار برپا ہے۔ نافرمانی کا ایک جذبہ ہے جو ہر کہ ومہ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ جب سے تاریخ موجود ہے اس وقت سے یہی دیکھتے ہیں کہ دُنیا ہنگامہ اور فساد کی آماجگاہ ہے۔ ہر طرف اور ہر جگہ لڑائی جھگڑا قائم ہے۔ یہ ازلی جھگڑا ماں باپ بھائی بہنوں سے شروع ہو کر ملکوں اور قوموں تک جا پہنچا ہے۔ اور ایک دوسرے کے حق پر خنجر چلاتا نظر آتا ہے۔

خدا نے قدرت نے یا مصلحین نے نافرمانی انسان کو قابو میں رکھنے کیلئے سینکڑوں ادارے قائم کئے لیکن آج تک کوئی بھی کامیاب نہ ہوا۔ سوچنے کی بات ہے کہ قدرت نے جانوروں میں سے ایک جانور کو عقل دیکر اسے فرعون بے سامان بنا دیا یا وہ خود بنا؟

قدرت کی خوش مذاقی جس کا مظہر کائنات کا ذرہ ذرہ ہے دیکھکر یہ کہنا چاہیے صحیح ہو لیکن مشکل ہے کہ اُس نے انسان کو عقل دیکر خود کائنات میں خلفشار پیدا کر دیا۔ اِس لئے ہمیں ماننا پڑیگا کہ انسان کو جو نعمت دی گئی وہ اس کا متحمل نہ ہو سکا اور اس کی عقل اُس کی بیہمانہ قوت پر غالب نہ آسکی بیہمانہ خواہشوں میں تلاشِ عیش تھی اور خواہش اقتدار ان دونوں خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی عقل اور اپنے علم کو اور قدرت کے لازوال خزانوں کو بے دریغ صرف کرنا شروع کیا اور اُسے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے نئے نئے ناموں اور نئے نئے طریقوں سے شاید اپنے نفس کو بھی فریب دیا ہو لیکن اُس نے یقیناً فریب دیا۔ دوسروں کو حتیٰ کہ قدرت کو اور خدا کو۔

قدرت کا نافرمان بندہ کبھی مذہب کے نام پر لاکھوں بندگانِ خدا کا خون کر ڈالتا ہے۔ اور کبھی تہذیب کے نام پر۔ کبھی قومیت کے نام پر کبھی قیام امن کے نام پر۔ ہوا یہ اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کبھی ہابیل قابیل کو مار ڈالتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی حضرت یوسفؑ کو کنوئیں میں گراتے ہیں کبھی رستم اسفندیار کی چھاتی پر چڑھا ہوا ہے۔ کبھی ... بزم ... کی ساڑھی کھینچ رہی ہے۔ راون سیتاجی کو اغوا کئے لئے جا رہا ہے۔ کربلا کے تپتے ہوئے ریگستان میں حضرت امام حسینؑ کا لاشہ بے گور و کفن چھوڑ دیا گیا۔ اہل بیت کی بے حُرمتی ہو رہی ہے۔ معصوم بچے پیاس سے بے جان ہو کر جان دے رہے ہیں

[illegible]

سرنگوں وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر انسان نہیں۔

قدرت انسان کو ایک بلند اخلاق کا مالک دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے جو کچھ بھی دیکھا ہو ہم نے یہ دیکھا کہ ایک کو ایک کھائے جاتا ہے۔ آپ کہیں گے نظام قدرت یہی ہے کہ چھوٹے کو بڑے کھا جاتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں یہی وہ منظر تھا جس کو دیکھکر خدا کے ایک بندے نے راج پاٹ کو تج دیا تھا اور ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن اس کا مشن بھی ناکام ہوا اور اس کے پیروؤں نے بربریت کی وہ وہ مثالیں پیش کیں جن پر دنیا شرماتی ہے۔

تاریخ پر نظر ڈالیے دنیا کے کونے کونے میں جنگ و جدل شرو فساد کی آگ نہیں بھڑکی جس نے نظام عالم کو درہم برہم نہ کیا ہر جگہ بھائی نے بھائیوں کے گلے پر چھری چلائی ہر جگہ اپنوں کے لاشے اپنوں کے ہاتھوں خاک و خوں میں تڑپتے دیکھے گئے۔

خدا کا نافرمان بندہ دنیا میں یہ کر رہا تھا قدرت شاید اسے عقل و شعور دیکر پچھتا رہی ہوگی کہ اس نے دست انتقام بلند کیا جس جس نے اور جس جس وقت میں نافرمان بندوں نے۔ نافرمان قوموں نے منشاء قدرت کے خلاف کام کیا اس نے انہیں کچل کر رکھدیا۔

یورپ میں عیسائیوں کے ساتھ کیا ہوا۔ ایشیا میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا۔ ہندستان میں ہندوؤں کے ساتھ کیا ہوا۔ قدرت کا ایک چکر ہے جو چل رہا ہے۔ انسان اس میں پسا جا رہا ہے۔ یہ نافرمان بندوں کی فرعونیت کی سزا تھی کہ قدرت نے جنگ عظیم کی صورت میں اس کا انتقام لیا کہنے کو جنگ عظیم ختم ہو گئی۔ لیکن جس وقت تک مجرم ہوتا ہے اسکی سزا ملنی مقدر ہے۔

غیر انسانی جرائم کی سزا آج بھی مل رہی ہے اور کل بھی ملے گی۔ دنیا کے نزدیک قدرت کی جانب سے سنگین ترین سزا کچھ بھی ہو لیکن میرے نزدیک قدرت کی طرف سے سنگین ترین سزا یہ ہے کہ قوم کو گروہ کو یا فرد کو اس حالت میں پہنچا دیا جائے جس کا شکوہ خدا سے جوش نے اس طرح کیا ہے؎

آدمی جب آدمی کے پاؤں پر رکھتا ہے سر
میں تڑپ جاتا ہوں تو خاموش رہتا ہے مگر

مگر اے نافرمان انسان! کبھی تو نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ افراد گروہوں یا اقوام کی انتہائی جزا ہے یا سزا ہے ان افعال کی جو ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ تجھے یہ سزا ملتی ہے اور ملیگی۔ اس وقت تک ملیگی جب تک تجھے اپنی پستی کا احساس نہ ہو جائے اور تو خود اپنی حالت کو بدلنے کی سعی نہ کرے۔

[illegible] اپنی حالت بدلنے [illegible]

اپنی حالت کے بدلنے کا خیال جب تک عملی صورت اختیار کرتا ہے جو انسان محسوس ہوتا ہے کہ بے غیرتی کی زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہے اور جب وہ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے زندگی کو تج دینے کے لئے تیار ہے تو دنیا کی کوئی قوت اُسے غلام نہیں رکھ سکتی۔ ایک فلمی ڈرامے میں ایک فاتح کی زبان اس وقت جب وہ مفتوح کی لاش پر کھڑا ہوا تھا مصنف نے یہ الفاظ کہلوائے تھے

"ہم اسکی قدر کرتے ہیں جو جینا جانتا ہے اور ہم اسکی پرستش کرتے ہیں جو مرنا جانتا ہے"

موت کو صرف وہی لبیک کہہ سکتا ہے جو آزادی کو کم از کم عفت و عصمت سے زیادہ سمجھے۔ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ بلکہ یہ وہ الفاظ ہیں جو ترکی کے مشہور آدمی جہاز حمیدیہ کے کمانڈر رؤف پاشا نے اس وقت ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر پرائیویٹ صحبت میں کہے تھے۔ جب وہ دہلی آئے ہوئے تھے انہوں نے ہندستان کے جذبۂ آزادی کے متعلق کہا تھا:۔

جس وقت تک ہندستانیوں کے دلوں میں آزادی کی اہمیت اپنی بہو بیٹیوں کی عصمت کے برابر بھی نہ ہو وہ آزادی حاصل نہیں کرسکتے۔ اس کی مثال انہوں نے یہ دی تھی کہ ترکہ تقسیم ہو رہا ہے۔ بھائی تقسیم پر جھگڑ رہے ہیں۔ اتنے میں آواز آتی ہے کہ کوئی غیر محرم حرم میں گھس آیا اس وقت اگر وہ آدمی کے بچے ہیں تو تقسیم کرنے کا خیال ان کے دل سے محو ہو جائیگا اور وہ پہلے اسے حرم میں سے نکالنے کی کوشش کریں گے۔

پاشا موصوف کے الفاظ ہر اس موقعہ پر میرے کانوں میں گونج اٹھتے ہیں جب میں دیکھتا ہوں کہ آزادی اور رفعت تو ایک طرف، خدا کے افرا ہندستانی بندے ہڈیوں پر کتوں کی طرح لڑتے ہیں۔ اور رفعت کے متوقع اور سربلندی کے امیدوار ہیں۔ لیکن میں تو کہتا ہوں اور صاف کہتا ہوں ہم سب کچھ ہو سکتے ہیں انسان تو نہیں ہو سکتے۔ وہ ہم کو وہ کچھ حاصل ہو سکتا ہے جو انسان کے لئے ہونا چاہیئے ——— ——— ہم پر کیا منحصر ہے دنیا آج خدا کے نافرمان بندوں سے پٹ رہی ہے۔ اور انسانوں سے خالی۔ شاید مزید ابتلا و آزمائش جو دنیا کے سر پر منڈلا رہی ہے لاکھوں اور انسانوں کو فنا کرکے کچھ انسان پیدا کرے جو خدا یا قدرت کی ابتدائی منشاء کے مطابق دنیا کو جہنم بنانے کی بجائے جنت بنا دے۔

سائل دہلوی

(آغا بابر علی آفتاب قزلباش)

بارش بخیر! ۲۴ دسمبر ۴۶ء کی ایک دوپہر بڑی آب و تاب سے روشن تھی۔ منشی مہاراج بہادر برق آنجہانی حضرت ساحر دہلوی کے شاعرے سے سواری لیکر آئے اور اپنے محبوب استاد حضرت آغا شاعر قزلباش مرحوم سے اصرار کیا کہ پنڈت امرناتھ صاحب ساحر نے منت کی ہے کہ آپ مشاعرے میں ضرور تشریف لائیے۔ آپ میری خاطر سے مشاعرے میں تشریف لے چلئے۔ میں بھی مشاعرے کا ذکر سنکر برق صاحب کے ہمراہ ہولیا۔

پنڈت جی ہر سال اپنے ذاتی صرفہ سے بہت بڑے پیمانے پر قدیم وضع کے مشاعرے کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ باہر سے بھی مشاہیر شرکت کرتے تھے۔ دلی کے تمام تلامذہ اور پختہ کار شعرا کے علاوہ اساتذہ بھی شریک ہو کر مشاعرے میں چار چاند لگاتے تھے۔ اللہ اللہ اب نہ اُردو کے پرستار حضرت ساحر اس دُنیا میں موجود ہیں، نہ کوئی ایسا ڈھنگ کا مشاعرہ دیکھنے میں آتا ہے۔

اس وقت میرے شعور کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ تاہم مجھے اتنا یاد ہے کہ مولوی افضل حسین صاحب ثابت اور نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دیگر شعرا کے علاوہ وہاں تشریف فرما تھے

برق صاحب اور حضرت آغا شاعر کے وہاں پہنچنے پر پنڈت جی چمکدار آنکھیں اور متبسم چہرہ لئے ہوئے آگے بڑھے اور اپنے نو وارد مہمانوں کو سائل صاحب کے پاس لا بٹھایا۔

میں نے سائل صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ گورے، چٹے، سفید ترشی ہوئی ڈاڑھی، بھاری جسم انگرکھے سے مزین، چوگوشی ٹوپی اوڑھے ہوئے جو اب بھی خال خال تیموری گھرانے کا کوئی فرد دلی میں پہنے ہوئے نظر آجاتا ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں جن میں سے شرافت جھلکی پڑتی تھی۔

سائل صاحب نے اپنی غزل پڑھی، مشاعرے میں صدائے آفریں اور نعرۂ تحسین سے گویا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ سائل صاحب مسکراتے جاتے، جھک جھک کر آداب بجالاتے تھے۔ اور ایک ایک شعر بصد اصرار دو دو تین تین بار پڑھتے تھے۔

اُن کا ترنم، ان کی طرز ادائیگی سبحان اللہ! شعر و ترنم کے باہمی امتزاج نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی جو زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کا یہ مطلع مجھے آج تک یاد ہے ؎

تر دامنی کے ڈر سے ہے زاہد عذاب میں
ہم کو ملے تو ہم تو نہالیں شراب میں

سامعین، شعرا، پنڈت جی، ثابت صاحب اور حضرت آغا شاعر بے اختیار داد دے رہے تھے۔ اور نواب صاحب جھوم جھوم کر شعر پڑھ رہے تھے۔

اسی بائیس خواجہ کی چوکھٹ یعنی دلی کی خاکِ پاک سے کیسے کیسے کاملین فن اور کیسے کیسے یگانۂ روزگار پیدا ہوئے۔ جن کی اپنی شہرت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا۔ ہندستان کی تاریخ میں دلی کو ہمیشہ ہی سے بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے ؎

یہ دلی وہ ہے کہ زمیں، آسمان کا دل تھا	یہ دلی وہ ہے کہ تاج دنشان کا دل تھا
یہ دلی وہ ہے کہ ہندستان کا دل تھا	یہ دلی وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا

یہی تو علمی مشاغل سے مہر درخشاں تھی
یہ خاک وہ ہے جو علم و ہنر کا معدن تھی　　(آغا شاعر)

اُردو غزل گوئی میں نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی بہت نام آور ہوئے۔ داغ کی جادو بیانی، اُن کی معاملہ بندی، شُستہ و رفتہ فلو مطلے کی دھلی دھلائی زبان کی وجہ سے تمام ہندستان میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ داغ کے مشہور شاگردوں مثلاً احسن مارہروی۔ آغا شاعر قزلباش۔ سیماب اکبرآبادی ذار دہلوی۔ نوح ناروی۔ جوش ملسیانی وغیرہ میں نواب صاحب بہت ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ آپ کے دادا نواب ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو سٹیٹ نیر تخلص کرتے تھے۔ اور آپ کے والد ماجد نواب شہاب الدین خاں صاحب ثاقب بھی نہایت خوش گو شاعر تھے۔ ایسے ماحول میں رہکر بچپن ہی سے آپ کو شاعری کا شوق پیدا ہوگیا۔ اور آپ شاہزادہ مرزا عبدالغنی ارشد کے شاگرد ہوگئے۔ بعد ازاں نواب فصیح الملک بہادر داغ کے نہ صرف تلامذہ میں داخل ہو گئے بلکہ داغ صاحب کی متبنّی دختر سے آپ کی شادی ہوگئی۔ گویا شاعری آپ کو ورثے میں ودیعت کی گئی تھی۔ خود فرماتے ہیں ؎

تاج ارشد، جام غالب، ماہ داغ
سائل اندر کاسہ دارد سہ چراغ

جن کو قدیم تہذیب ایک آنکھ نہیں بھاتی ان کو تو خیر جانے دیجئے۔ مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ سائل صاحب نہایت سختی سے اپنی پرانی وضع کے پابند

ہیں۔ آپ انسانیت اور اخلاق کا نمونہ اور گوشۂ تہذیب کی یادگار ہیں۔ اس وقت بھی آپ دلّی کی مٹتی ہوئی تہذیب کے حامل ہیں۔ بے انتہا منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ ایک جگہ آپ خود ہی رقم طراز ہیں :-

"میں اپنے معاصرین میں درجۂ امتیاز نہیں رکھتا۔ میرے ذوقِ ادب نے میرے اس شغل کو جاری رکھا جس سے جلبِ منفعت یا ہوائے شہرت کا کچھ تعلق نہیں۔ میرا کلام ایسے محاسن سے معرا ہے جو شاعری میں ہونے چاہئیں۔ اپنے شوق کو میں نے اپنے اہلِ وطن اور مادری زبان تک محدود رکھا ہے۔ میرے کلام میں وہ خوبیاں نہیں جو میرے ہم عصروں کو خدا نے عطا فرمائی ہیں۔ نہ میں نے ان کی تحصیل میں جد و جہد کی۔ نہ فصیح و بلیغ ہونے کا مجھے دعویٰ! دلّی کی بولی بولتا ہوں اور بس!"

ان کی شاعری میں ان کی شخصیت اور ان کے کیریکٹر کا عکس جھلکتا ہے ان کی شاعری واقعیت پر مبنی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات کا سیدھے سادے پیرائے میں ذکر کرتے ہیں۔ اظہارِ بیان میں نرمی، لوچ، تازگی، شگفتگی اور مترنم الفاظ کی روانی پائی جاتی ہے۔ بہت سادے اور ہلکے پھلکے شعر بہت بے تکان نظم ہو جاتے ہیں۔ جن میں انہیں مطلق کوئی تکلیف نہیں کرنی پڑتی۔ بلا ارادہ محاورے آسانی سے نظم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قدرتِ بیان کا یہ عالم ہے کہ لفظوں کی نشست سے فن کاری اور صناعی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دلّی سکول سے تعلق کی وجہ سے زبان میں بے حد شیرینی اور مٹھاس ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

سامنے آجائے ممکن نہیں تخفیف نہ ہو   دیکھ جا آکے ذرا گر تجھے تکلیف نہ ہو
پوچھیں مجرم کا جو چاہیں مجھے مجرم ٹھہرائیں   شرط یہ ہے کہ وہ تصنیف ہو تالیف نہ ہو

تیرے غریب نے کے دل مبتلا لیا   مجھ کو غریب جان کے تم نے بٹھا لیا
بنک کے دماغ ہے کرتے پھرے ہیں حساب   کیا جانے مے فروش کے کتنا دیا، لیا

تیری سادگی آرائشِ زیور سے بڑھ کر ہے
خدا کے فضل سے تو تو رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

ذوقِ جانی کو نزاکت نے تری سمجھا ہے کیا   بال بھی بیکا نہ ہوگا خنجرِ فولاد سے

روضۂ حشر میں کچھ گل نہ کھلا دے کوئی   داورِ حشر پہ تہمت نہ لگا دے کوئی

معاملہ بندی، روزمرہ جو دلّی سکول کے اساتذہ کے ہاں بہت نمایاں ہے۔ سائل صاحب کے کلام میں بہت [illegible] ہے ؎

اگر ہم تم کو منہ اپنا دل اپنے دکھا سکتے   ہمیں [illegible]

کل شب کو بزم سے میں عدو میہمان تھا   بگڑو نہیں، خفا نہ ہو، جانے دو وہ یہاں تھا

اب ہو گیا ہے ان کا بھتیجا بناؤ کا   یہ دیکھنا ہے تن کے وہ کس پر جائیں گے

نشانے پر لگا کرتے ہیں سیدھے تیر پلکوں سے   تم اپنے ناوکِ مژگاں نہ کج سمجھو نہ خم جانو

ان پر خارجی اثرات بالکل نہیں معلوم ہوتے۔ داخلی طور پر شعر و نغمہ انہیں اکساتا ہے۔ اور وہ خالص اپنے دل کی باتیں ایسے پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ سہل ممتنع کا شاہکار بن جاتا ہے۔

سائل صاحب رئیس ابن رئیس ہیں۔ اس پر ان کے مزاج میں بیحد انکسار ہے۔ غالباً اسی لئے اپنا تخلص سائل رکھا ہوگا۔ مگر کہیں کہیں مقطع میں جہاں سائل لکھا ہے وہاں ان کے ذاتی تجربے نے بڑا لطیف شعر بنا دیا ہے ؎

نام سائل ہے مگر چشمِ طمع سے اس نے   کبھی دیکھی ہی نہیں صاحبِ زر کی صورت

سائل سمجھ کے تم نہ حقارت سے دیکھنا   نواب پانچ پشت سے اس کا خطاب ہے

تجھے نواب بھی کہتے ہیں شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں ترا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

نسبتِ داغ سے دلّی کی زباں سے سائل   شاعری کا تری دنیا میں بھرم ہے تو ہی

شوخی شراب اور زاہد کے باب میں بہت نمایاں ہو جاتی ہے ؎

پیرِ مغاں کی طرزِ سخن لاجواب ہے   زاہد کی جب سنو گے وہی [illegible] کی شکایت

شیخ میخانے میں ہشیار ذرا چلئے گا   منہ کے بل گرتے ہیں جب پیر پھسل جاتے ہیں

یہ مسجد ہے یہ میخانہ تعجب اس پہ آتا ہے   جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ پس خوردہ ہے پیرِ میکدہ کا شیخ کا وہ ہے   تبرک ایک کو سمجھو، دوسرے کو محترم جانو

داہ کی رہ و رسم سے تو بہ کا خطرہ   بیخوار سے بہتر نہیں یارانہ کسی کا

ہیں اگر شوق سے پیتا تو یہ بے شک تھا گناہ
میرا کیا بس ہے اگر منہ سے لگا دے کوئی

ایک رند سے آشام اپنے ساقی پر بجائے لجاجت اور منت سماجت کے کس خوبصورتی سے طنز کرتا ہے۔ جام سے کو لبالب نہ ہونے کو ساقی کی تنگ ظرفی کہنا اور پھر کس التزام سے ؎

ساقی تنگ ظرف ایک ہی جام   وہ بھی اترا ہوا کناروں سے

صدیوں سے دنیا ایک ہی ڈگر پر اور ایک ہی ڈھرے پر چل رہی ہے وہی آلام و مصائب، وہی فلک کج رفتار کے ظلم وستم کی شکایت، وہی گریہ زاری اب تک موجود ہے۔ غم عشق و غم روزگار نہ جانے کب سے بنی نوع آدم سے وابستہ ہے۔ سائل صاحب بھلا ان لذتوں سے کیسے بچ سکتے تھے۔ مگر ان کے ہاں گریہ وزاری کی بجائے لذت غم سے وابستگی کی آن بان پائی جاتی ہے۔ ان کی وسیع القلبی اور بے نیازانہ پن اس میدان میں بھی انہیں اپنے بیشتر معاصرین سے منفرد بنا دیتی ہے ؎

ہیشہ رہتے ہیں داغ جنوں ہرے اپنے   خزاں کی رت میں بھی رہتے ہیں کس بہار سے ہم

پھر ہے بہار ناز ستم گر کی آرزو   سینہ وفور داغ سے پھر گلستاں ہوا

اس قدر لطف اسیری کا ملا ہے صیاد   یاد مطلق نہ رہا مقصد پرواز مجھے

سائل صاحب کے کلام میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں جن میں انہوں نے اپنے آرٹ کو قائم رکھتے ہوئے ہلکا سا تغزل بھی شامل کر دیا ہے ؎

کیا حال بیقراری خاطر بیاں کروں   اس نامراد دل کا سکوں اضطراب ہے

آئی لگی پہلے سے یہ آواز مجھے   پھونکے دیتی ہے مری پردگی راز مجھے

وہ آشوب تجلی ہنس، ہا ہے گو پس پردہ
مگر عکس تبسم آپڑا ہے سارا چلمن پر

یہ شعر ان کی وضعداری اور کیرکٹر کی مضبوطی کا آئینہ دار ہے ؎

لب و بیسے ہم سے نے حرم جائیں تو کیونکر
اہل ہے یہ شب جدھر آئے ادھر آئے

میرا ارادہ تھا کہ سائل صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر آن ہی سے ان سے پسندیدہ اشعار لکھوں گا۔ مگر افسوس صد افسوس دلی کا وہ آخری شاعر بھی منوں خاک کے نیچے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا سویا۔ نیک سیرت و پاک باطن جواں بخت و جواں سال اردو کے فدائی گوند مہندر سنگھ صاحب بیدی سحر جن کا دل تعصب کی لعنت سے پاک اور ہمدردی کے جذبے سے لبریز ہے ان کی وساطت سے سائل صاحب کے انتقال کی خبر دلی میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور دوسرے دن وہ شاعر شیریں مقال اپنے خاندانی قبرستان میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار کے پاس سپرد خاک کر دیا گیا۔ دلی کے ماہناموں میں سائل کے متعلق حسب توفیق لکھا گیا۔ لیکن مجھے چمنستان کے ایڈیٹر آغا سرخوش صاحب قزلباش دہلوی کے پر خلوص جذبات جو انہوں نے مرحوم کی خدمت میں اظہار عقیدت کے طور پر چمنستان میں ظاہر کئے ہیں، زیادہ پسند آئے۔ وہ سطریں میں یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔

"پندرہ ستمبر ۴۵ء کو مرحوم دلی کی تہذیب و شائستگی اور قدیم شاعری کا آخری مہذب شاعر، بزم شعر میں دلکش ترنم کا بانی، اور سچا انسان بھی دنیا سے اٹھ گیا۔ وہ بہترین انسان نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی تھے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر نواب صاحب مرحوم و مغفور ایک نامور شاعر بھی نہ ہوتے تب بھی وہ اس عصر جدید میں پیار کرنے اور پوجنے کی حد تک پیارے تھے۔ وہ نہ صرف ہماری مٹتی ہوئی تہذیب کے آخری علمبردار ہی تھے بلکہ وہ گزری ہوئی صدی کے ایک باب تھے۔ دلی میں وہ آخری آدمی تھے۔ جن میں سے دلی اور دلی والوں کی سچی تاریخ ہمت، خلوص، مہمان نوازی اور علم و عمل کی جھلکیاں بکی پڑتی تھیں۔ ایسے وسیع الظرف، وسیع الاخلاق، وسیع النظر صاحب دل اور صاحب احساس انسان کی موت دلی کی بدنصیبی اور ویرانی کی بین دلیل ہے۔

رہے ہمیشہ نام اللہ کا !!"

کامیابی کی کُنجی

(از واحدی)

کامیابی دُنیا کے اعتبار سے ہو یا دین کے اعتبار سے مُسلمان کو حاصل کرنی ہو یا نامُسلمان کو۔ اُس کی ایک ہی کنجی ہے۔ قفل الگ الگ اور مختلف کارخانوں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں مگر وہ کھلیں گے ایک ہی کنجی سے۔ مزارع بھی اُسی کنجی کو لگا کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ تاجر بھی اسی کنجی کو لگا کر اور صناع بھی اسی کنجی کو لگا کر۔ ہر علم اور ہر عمل کے لئے اُس کنجی کی ضرورت ہے۔ ایٹم بم اُسی کنجی کی مدد سے بنا اور ایٹم بم سے بڑھکر چیز اُس کنجی کی مدد سے بن سکتی ہے اور ایٹم بم جیسی چیزوں کا سدّباب بھی اسی کنجی سے کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ خدا اُس کنجی کی مدد سے ملتا ہے۔ وہ کنجی جس کے پاس نہیں وہ خدا سے بھی دُور اور دُنیائے دوں سے بھی محروم۔ وہ کنجی ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ کسی کام کے سیکھنے اور سیکھ چکنے کے بعد علم کے مطابق عمل کرنے میں جو دُشواریاں ہوتی ہیں وہ دُشواریاں اُس کنجی کی مدد سے دُشواریاں نہیں رہتیں۔ بلکہ سیکھنے میں بھی لُطف آتا ہے اور عمل کرنے میں بھی لُطف آتا ہے۔ وہ کنجی سیکھنے اور عمل کرنے دونوں کے بوجھ کو پھول جیسا ہلکا کر دیتی ہے۔ اُس کنجی کو بازاروں میں نہ تلاش کیجیے۔ وہ آپ کے پاس موجود ہے۔ آپ کے اندر موجود ہے۔ دماغ سیکھتا ہے۔ ہاتھ پاؤں عمل کرتے ہیں۔ اس کنجی کا ٹھکانا دل ہے۔ لیکن سو میں سے سو انسان اگر سیکھ سکتے ہیں اور سو میں سے دو چار علم کے مطابق عمل کر سکتے ہیں تو لکھوکھا انسانوں میں سے کہیں ایک انسان کے دل کو یہ شرف میسر آتا ہے کہ اُس کنجی کو جگہ دے۔ اسی کنجی کے فقدان سے عالم بے عمل ہیں اور عامل بے کیف۔ اس کنجی کے بغیر اللہ کا کلام پڑھا جاتا ہے تو وہ بھی گلے میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ "یقرؤن القران لایجاوز حناجرہم"۔ نہ نیچے اُترتا ہے نہ اوپر چڑھتا ہے۔ نہ دل پر اثر کرتا ہے نہ دماغ پر اثر کرتا ہے۔ اس کنجی کا نام ہے حال۔ عام زبان میں اسے لگاؤ کہہ لیجیے، لگن کہہ لیجیے۔ لَو کہہ لیجیے۔ چیٹک کہہ لیجیے، دُھن کہہ لیجیے۔ خاص زبان میں اُسے "حال" کہتے ہیں۔ جو کام لگاؤ سے کیا جاتا ہے وہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور جس عمل میں دُھن ہوتی ہے وہ کامیابی تک ضرور پہنچاتی ہے۔ آج عربی مدارس کے اکثر طلبا پڑھتے پڑھتے بڈھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ اور سند بھی لے لیتے ہیں وہ کورے کیوں رہتے ہیں؟ ان میں لگاؤ، دُھن اور حال کی کمی ہے۔ انہی عربی مدارس بلکہ عربی مکتبوں کی تعلیم پہلے بڑے بڑے آدمی پیدا کیا کرتی تھی۔ اب کیا ہو گیا کہ انگریزی پڑھے لکھے جیسے آدمی بھی عربی مدارس سے نہیں نکلے۔ باعث وہی ہے کہ اب عربی مدارس میں پڑھنے کے لئے کوئی نہیں جاتا۔ عربی مدارس کے طلبا کو پڑھنے سے لگاؤ اور پڑھنے کی دُھن نہیں ہوتی۔ پڑھنا کسی پر چھا نہیں جاتا۔ پڑھنا کسی پر طاری نہیں ہو جاتا۔ پڑھنے کے حال سے سب خالی رہتے ہیں۔ حال ہو تو حالت تحویل و تبدیل ہو۔ انگریزی پڑھے لکھوں میں بھی بہت سے ایم اے بی اے ایسے دکھائی دیتے ہیں جنہیں خاک کچھ نہیں آتا۔ سند پاس ہونے کے سوا کوئی عمل اُن کا پڑھے لکھوں کا سا نہیں ہوتا۔ وہ پڑھتے لکھتے نہیں تو شاید بہتر انسان رہتے۔ اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ ان کا علم ان کے گلے کے نیچے نہیں اُترا۔ اُن کے دل میں علم کی چیٹک اور دُھن نہیں تھی۔ وہ محض بھیڑ چال کے طور پر ایم اے۔ بی اے ہو گئے۔ ان پر علم حاصل کرنے کا حال طاری نہیں ہوا۔

حال کیا چیز ہے؟ آپ کبھی کسی قوالی کی محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ گانا سُنتے سُنتے کوئی کوئی صاحب رقص کرنے لگتے ہیں۔ آپ نے سُنا ہو گا اس رقص کو حال کہا جاتا ہے۔ یعنی گانا تو ہزاروں سُن رہے ہیں لیکن ان صاحب پر گانے کا ایسا اثر پڑا کہ یہ تلملا اُٹھے اور اپنے آپے میں نہ رہے۔ ان کی حالت تحویل (یعنی تبدیل) ہو گئی۔ یعنی یہ ویسے نہیں رہے جیسے ذرا دیر پہلے تھے۔ اس حال کی بعض دفعہ تو اتنی شدت بڑھ جاتی ہے کہ انسان مر جاتا ہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کا اسی حال میں انتقال ہوا تھا۔ قوال نے یہ شعر گایا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

اور حضرت خواجہ صاحبؒ پر کیفیت طاری ہو گئی یہاں تک کہ انتقال فرمایا۔ ہمارے سامنے کی بات ہے۔ ابھی چالیس برس نہیں گذرے حضرت مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے اجمیر شریف میں اس شعر پر حال کھیلتے کھیلتے جان دیدی تھی۔

گفت قدوسے فقیرے در فنا و در بقا
خود بخود آزاد گشتی خود گرفتار آمدی

قوالیوں کا حال عارضی ہوتا ہے۔ یہ کبھی کبھی معمولی آدمیوں پر بھی طاری ہو سکتا ہے۔ اور ایک درجہ تک سب ہی پر طاری ہوتا ہے۔ قوالی کی مجلس کی فضا سب کو کچھ نہ کچھ متاثر کر دیتی ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ کسی کو اللہ نے پتھر کا دل عطا فرمایا ہو یا قوالی ہی قوالی نہ ہو تو ان صورتوں میں تاثر کا سوال نہیں پیدا

ہوتا ہے کہ جس لگاؤ، لگن، چیٹک، دھن یا حال کو میں ہر کامیابی کی کنجی بتا رہا ہوں وہ اس حال کے مشابہ ہے جو قوالیوں میں کسی پر طاری اور کسی پر طاری ہوتے آپ نے دیکھا ہوگا۔ قوالیوں کا حال غیر راسخ اور غیر مستقل ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ختم ہو جاتا ہے جس حال سے کامیابی نصیب ہوتی ہے وہ حال راسخ اور مستقل ہوتا ہے۔ ہر وقت ایک ہی چیز کا خیال، ایک ہی چیز کی دھن۔ ایک ہی چیز کا عشق اور ایک ہی چیز کی لگن اس چیز تک اور اس محبوب تک نہ پہنچائے ممکن نہیں۔ آپ بڑی سے بڑی چیز بھی اسی لگن اور اسی حال کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اچھی سے اچھی چیز بھی۔ ابولہب نے بھی اسی لگن اور حال کی وجہ سے شہرت دوام پائی اور ابوبکر بھی اسی لگن اور شہرت کی وجہ سے ابوبکر بنے۔ یہی کنجی قارون کے خزانے کو کھولتی ہے اور یہی خدا تک لیجاتی ہے۔ اسی حال کے طفیل تیمور لنگ تیمور صاحبقران ہو گئے اور نادر گڈریا نادر شاہ کہلایا۔ اور اسی حال نے سینکڑوں معمولی حیثیت اور معمولی پڑھے لکھے آدمیوں کو بلکہ بے پڑھے لکھے اور ادنیٰ پیشے کرنے والے آدمیوں کو خدا سے ملا دیا۔ اور پھر شہنشاہوں کے سر پر بٹھا دیا۔ جناح اور جواہر لال بھی اپنے اپنے حال کے مطابق کامیاب ہیں۔

میرے ایک دوست تھے۔ دلّی کے پنجابی سوداگروں میں سے۔ اُن کی میرٹھ کے پنجابی سوداگروں میں کسی کے ہاں شادی کی بات چیت ہو رہی تھی پنجابی سوداگر عموماً اتنی تعلیم حاصل کیا کرتے ہیں جتنی کی سوداگری میں ضرورت پڑتی ہے میرے دوست بھی ایسے ہی تعلیم یافتہ تھے۔ اتفاق سے لڑکی جس سے رشتہ ٹھیرنے والا تھا کچھ تعلیم یافتہ تھی یا کم از کم اُس کے متعلق میرے دوست کو یہ گمان ہو گیا کہ وہ تعلیم یافتہ شوہر چاہتی ہے۔ بس یہ گمان ہونا تھا کہ میرے دوست نے کاروبار تو چھوڑ دیا اور پڑھنے کے پیچھے پڑ گئے۔ سب سے پہلے اُنہوں نے انگریزی پڑھی بغیر دوسرے کی مدد کے۔ پھر انگریزی کے ذریعہ عربی فارسی پڑھی۔ انکی انگریزی دانی کے متعلق مشہور پادری ریونڈ اینڈریوز نے ایک دفعہ کہا تھا کہ یہ انگریزی زبان نہیں جانتے۔ انگریزی زبان کے عالم ہیں۔ عربی، فارسی پر بھی انہیں اتنا ہی قابو تھا۔ وہ صرف زبانوں پر قابو پانے کے شائق تھے۔ اُنہیں انگریزی، اُردو، عربی فارسی کے علاوہ گجراتی بھی آتی تھی، پشتو آتی تھی، ترکی آتی تھی، ہندی آتی تھی۔ انکا کاروبار بگڑ جانے کی وجہ سے اس لڑکی کی شادی کہیں اور ہو گئی۔ مگر زبانیں سیکھنے کی جو لو وہ لگا گئی تھی اُس لو نے میرے دوست کو بے مثال زبان داں بنا دیا۔ اُنہوں نے بس زبانوں سے شادی کرلی۔ اُن پر پڑھنے کا ہر وقت ایک حال طاری رہتا تھا۔ گھٹنے تک پاجامہ پھٹا ہوا ہے اور پبلک لائبریری میں بیٹھے "پاؤنیر" پڑھ رہے ہیں۔ [illegible] چلی آ رہی ہے اور وہ کتاب پڑھنے میں مستغرق ہیں۔ اُنہیں زبانیں پڑھنے کا جنون ہو گیا تھا۔ اور اسی لئے اُنہیں زبانیں آ گئی تھیں۔ بغیر مجنوں بنے کوئی لیلےٰ حاصل نہیں ہوتی۔ کامیاب وہی ہوتا ہے جسے اُس چیز کا جنون ہو جائے جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے جس کے آگے وہ سب کچھ بھول جائے۔ میرے دوست نے زبانیں سیکھنے کی خاطر کاروبار ہی نہیں چھوڑا تھا بلکہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ انہیں اپنی شہرت مدِ نظر نہیں تھی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ انہیں کوئی جانے۔ اُن کی زبان دانی کا کسی کو علم ہو۔ انہیں اس لڑکی کی یاد بھی نہیں ستاتی تھی جس کے واقعی یا فرضی اشارے سے اُنہوں نے پڑھنا لکھنا شروع کیا تھا۔ صرف اس کا یہ اشارہ دل پر جما ہوا تھا اور وہ اس اشارے کی تعمیل کر رہے تھے۔ ایسا صاحب حال انسان میں نے نہیں دیکھا۔ نہ اللہ کیلئے مٹنے والا نہ دُنیا کے لئے مٹنے والا۔ میرے پاس بھی کامیابی کی یہ کنجی نہیں ہے اور آج کل کے تمام مسلمانوں کی طرح میں نے نہ خدا کو پایا نہ دُنیائے دوں کو۔ لیکن اپنی اس محرومی ہی پر غور کرتے کرتے میں سمجھ گیا کہ نہ پانے کی وجہ کیا ہے۔ دُنیائے دوں اور خدا دونوں کو جتنا جتنا میں نے حاصل کرنا چاہا اتنا اتنا وہ دونوں حاصل ہوئے بھی۔ حاصل بھی ہوئے اور کھوئے بھی گئے۔ حاصل ہونے اور کھوئے جانے نے بھی مجھ پر یہ راز افشا کیا کہ دُھن کی ضرورت ہے۔

آپ کو اپنے بیوی بچوں سے تو ضرور تعلق ہوگا۔ بیوی بچوں کی خاطر انسان جو جو پاپڑ بیلتا ہے اور بیوی بچوں کی پرورش کی انسان کو جیسی دُھن رہتی ہے کم از کم ویسی دھن ہر اس کام کی ہونی چاہیئے جس میں کامیابی حاصل کرنے کا ارادہ ہو۔ بیوی بچوں کی بیماری کے مقابلہ میں انسان اپنی بیماری کو نہیں گردانتا۔ انسان اپنا پیٹ کاٹتا ہے اور بیوی بچوں کا پیٹ بھرتا ہے۔ انسان اپنے آرام پر بیوی بچوں کے آرام کو ترجیح دیتا ہے اور اس میں اُسے لطف حاصل ہوتا ہے۔ اتنی لگن کے بعد ممکن نہیں کہ کوئی انسان کامیاب نہ ہو۔ ہر شخص اپنے معیار کے مطابق اپنے بیوی بچوں کی آسائش کے سامان ضرور فراہم کرلیتا ہے اور جس شخص کو بیوی بچوں کی بھی لگن نہیں ہوتی اُس کے بیوی بچے بھوکے مرتے ہیں۔ یہ خدا کا بڑا کرم ہے کہ اس نے بیوی بچوں کے حقوق مقرر کرنے کے ساتھ بیوی بچوں کی محبت عام کردی ہے۔ ورنہ دُنیا تباہ ہو جاتی۔ ساری دُنیا کا وہی حال ہو جاتا جو اُس ایک شخص کے گھر کا رہتا ہے جسے بیوی بچوں کی لگن نہیں ہوتی۔ دل چاہتا ہے کہ خدا اپنی لگن ایسی دیدے کہ جینا اور مرنا اس کے لئے ہو جائے۔ بیوی بچوں سے تعلق اسی کے حکم کی تعمیل کے لئے ہو۔ کمانا دھمانا اسی کے حکم کے مطابق ہو۔ دُنیا کے سب کام کریں مگر صرف اُس کے حکم

کامیابی کی کُنجی

(از واحدی)

کامیابی دُنیا کے اعتبار سے ہو یا دین کے اعتبار سے مُسلمان کو حاصل کرنی ہو یا نامُسلمان کو۔ اُس کی ایک ہی کُنجی ہے۔ قفل الگ الگ اور مختلف کارخانوں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں مگر وہ کھلیں گے ایک ہی کُنجی سے۔ مزارع بھی اسی کُنجی کو لگا کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ تاجر بھی اسی کُنجی کو لگا کر اور صنّاع بھی اسی کُنجی کو لگا کر۔ ہر علم اور ہر عمل کے لئے اسی کُنجی کی ضرورت ہے۔ ایٹم بم اسی کُنجی کی مدد سے بنا اور ایٹم بم سے بڑھکر چیز اس کُنجی کی مدد سے بن سکتی ہے اور ایٹم بم جیسی چیزوں کا سدّباب بھی اسی کُنجی سے کیا جا سکتا ہے۔ حتّیٰ کہ خدا اسی کُنجی کی مدد سے ملتا ہے۔ وہ کُنجی جس کے پاس نہیں وہ خدا سے بھی دُور اور دُنیا و دین سے بھی محروم۔ وہ کُنجی ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ کسی کام کے سیکھنے اور سیکھ چکنے کے بعد علم کے مطابق عمل کرنے میں جو دُشواریاں ہوتی ہیں وہ دُشواریاں اُس کُنجی کی مدد سے دُشواریاں نہیں رہتیں۔ بلکہ سیکھنے میں بھی لطف آتا ہے اور عمل کرنے میں بھی لطف آتا ہے۔ وہ کُنجی سیکھنے اور عمل کرنے دونوں کے بوجھ کو پھول جیسا ہلکا کر دیتی ہے۔ اُس کُنجی کو بازاروں میں نہ تلاش کیجیے۔ وہ آپ کے پاس موجود ہے۔ آپ کے اندر موجود ہے۔ دماغ سیکھتا ہے۔ ہاتھ پاؤں عمل کرتے ہیں۔ اس کُنجی کا ٹھکانا دل ہے۔ لیکن سو میں سے سو انسان اگر سیکھ سکتے ہیں اور سو میں سے دو چار علم کے مطابق عمل کر سکتے ہیں تو لکھو کھا انسانوں میں سے کہیں ایک انسان کے دل کو یہ شرف میسر آتا ہے کہ اس کُنجی کو جگہ دے۔ اسی کُنجی کے فقدان سے عالم بے عمل ہیں اور عامل بے کیف۔ اس کُنجی کے بغیر اللہ کا کلام پڑھا جاتا ہے تو وہ بھی گلے میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ "یقرؤن القرآن لایجاوز حناجرہم"۔ نہ نیچے اُترتا ہے نہ اوپر چڑھتا ہے۔ نہ دل پر اثر کرتا ہے نہ دماغ پر اثر کرتا ہے۔ اس کُنجی کا نام ہے حال۔ عام زبان میں اسے لگاؤ کہہ لیجیے۔ لگن کہہ لیجیے۔ اُپک کہہ لیجیے۔ چیٹک کہہ لیجیے۔ دُھن کہہ لیجیے۔ خاص زبان میں اُسے "حال" کہتے ہیں۔ [illegible] جو کام لگاؤ سے کیا جاتا ہے وہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور جو عمل میں [illegible] ہے وہ کامیابی تک ضرور پہنچاتی ہے۔ آج عربی مدارس کے اکثر طلبا

پڑھتے پڑھتے بڈھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ہیں [illegible] رہتے ہیں؟ اُن میں لگاؤ، دُھن اور حال کی کمی ہے۔ انہی عربی مدارس نے عربی کتبوں کی تعلیم پہلے بڑے بڑے آدمی پیدا کیا کرتی تھی۔ اب کیا ہو گیا کہ انگریزی پڑھے لکھے جیسے آدمی بھی عربی مدارس سے نہیں نکلے۔ باعث یہی ہے کہ اب عربی مدارس میں پڑھنے کے لئے کوئی نہیں جاتا۔ عربی مدارس کے طلبا کو پڑھنے سے لگاؤ اور پڑھنے کی دُھن نہیں ہوتی۔ پڑھنا کسی پر چھا نہیں جاتا۔ پڑھنا کسی پر طاری نہیں ہو جاتا۔ پڑھنے کے حال سے سب خالی رہتے ہیں۔ حال جو حالت تحویل و تبدیل ہو۔ انگریزی پڑھے لکھوں میں بھی بہت سے ایم اے بی اے ایسے دکھائی دیتے ہیں جنہیں خاک کچھ نہیں آتا۔ سند پاس ہونے کے سوا کوئی عمل اُن کا پڑھے لکھوں کا سا نہیں ہوتا۔ وہ پڑھے لکھے نہیں تو شاید بہتر انسان رہتے۔ اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ ان کا علم ان کے گلے کے نیچے نہیں اُترا۔ اُن کے دل میں علم کی چیٹک اور دُھن نہیں تھی۔ وہ محض بھیڑ چال کے طور پر ایم اے۔ بی اے ہو گئے۔ ان پر علم حاصل کرنے کا حال طاری نہیں ہوا۔

حال کیا چیز ہے؟ آپ کبھی کسی قوالی کی محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ گانا سُنتے سُنتے کوئی کوئی صاحب رقص کرنے لگتے ہیں۔ آپ نے سُنا ہو گا اس رقص کو حال کہا جاتا ہے۔ یعنی گانا تو ہزار لوگ سُن رہے ہیں لیکن ان صاحب پر گانے کا ایسا اثر پڑا کہ یہ تلملا اُٹھے اور اپنے آپے میں نہ رہے۔ ان کی حالت تحویل (یعنی تبدیل) ہو گئی۔ یعنی یہ ویسے نہیں رہے جیسے ذرا دیر پہلے تھے۔ اس حال کی بعض دفعہ تو اتنی شدّت بڑھ جاتی ہے کہ انسان مر جاتا ہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا اسی حال میں انتقال ہوا تھا۔ قوال نے یہ شعر گایا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اور حضرت خواجہ صاحب پر کیفیت طاری ہو گئی۔ یہاں تک کہ انتقال فرمایا۔ ہمارے سامنے کی بات ہے۔ ابھی چالیس برس نہیں گذرے حضرت [illegible] صاحب الہ آبادی نے اجمیر شریف میں اس شعر پر حال کھیلتے کھیلتے جان دی تھی

گفت قدوسی فقیرے در فنا و در بقا
خود بخود آزاد گشتی خود گرفتار آمدی

قوالیوں کا حال عارضی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی [illegible] بھی طاری ہو سکتا ہے۔ اور ایک درجہ تک سب پر طاری ہوتا ہے۔ قوالی کی [illegible] نفاست کو کچھ نہ کچھ متاثر کر دیتی ہے۔ الا ماشاء اللہ کسی کو [illegible] دل عطا فرمایا ہو یا قوالی ہی قوالی نہ ہو تو [illegible]

ساجدہ بنت دانش شاہجہانپوری

(از جناب اشرف علی خاں صاحب ایم اے شاہجہانپوری ایڈیشنل انسپکٹر الہ آبادی)

عطیات فطرت عام ہیں۔ مرد ہوں یا عورت۔ حسب استعداد مشیت افراد کو اپنے عطیات سے بہرہ اندوز کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرد اور عورت دو جداگانہ تیری خمیر کے حامل ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ طرز جنس کرخت ہونیکی وجہ سے عورت کی فطری صلاحیتوں پر اس نوعیت سے چھاپہ مارے کہ اسکو اپنی حقیقت سے آشنا ہونے دے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مرد نے عورت پر ان رُخوں سے حکمرانی کی کہ صنف نازک ایک عرصہ تک اپنے وجود کی اہمیت کو نہ سمجھ سکی۔ اس کو جاہل رکھا گیا۔ اور علم محض مردوں کی میراث قرار پایا۔ اس کو حق حاصل نہ تھا کہ وہ قدرتی مناظر۔ دریا۔ پہاڑ۔ جھیل۔ سبزہ۔ تارے اور آسمان وغیرہ کی تفریح سے اپنے دماغ و دل کو مسرور کرتی۔ سوسائٹی کے بگاڑ اور بناؤ پر رائے زنی کرنے کا محض مرد مستحق تھا۔ عورت اپنے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار کر ہی نہ سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ دور ختم ہوا اور دنیا کے ملکوں میں بیداری پیدا ہوئی۔ ہندستان کی سرزمین میں علامہ راشد الخیری نے صنف نازک کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے رات دن ایک کر دیئے۔ عورتوں میں تعلیم کا دخل ہوا۔ انتہا یہ کہ صنف نازک مردوں کے دوش بدوش ہر شعبہ میں نظر آنے لگی۔ "چپ کی داد" ہوس گویائی کی "فریاد" کے روپ میں جلوہ افروز ہوئی۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن عورت نے علم حاصل کر کے اور مردانہ وار میدان عمل میں قدم رکھ کر نسائیت کو اجاگر نہ کیا جس راہ پر مرد چل رہے تھے بس وہی راہ اس نے اختیار کی اپنے مخصوص اوصاف کو مد نظر رکھکر نہ تو علم حاصل کیا اور نہ عمل کیا۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ علم عقل اور دل پر پتھر پڑنے ڈال دینے کے اور کچھ نہ کر سکا۔ مردوں کی تقلید میں عورتوں کی مجبوری اس انتہا کو پہنچ گئی کہ مرد کی ذات سے تو توقع ہے کہ وہ خود غرضی کے بعد شعار اور انسانیت شکن ماحول سے فرار پر آمادہ ہو جائے لیکن صنف نازک کے دل و دماغ کے کوشش ملتے نظر نہیں آتے۔ علم حاصل کرنے کے بعد بے حیائی۔ فحاشی۔ بیباکی۔ دلیری۔ ریا۔ دروغ بافی۔ تضیع اوقات۔ اسلام کے احکامات سے نفرت۔ مذہب سے ناواقفیت۔ مغربی تہذیب کی تقلید۔ بیجا ترقی کے صحیح مفہوم سے عدم واقفیت وغیرہ وغیرہ اس قسم کے وہ صدہا امراض پیدا ہو گئے کہ ایک

ایسے وجود کی ضرورت تھی کہ جو دُکھے ہوئے دل سے عورتوں کی مجبوریوں کو معرض تنقید میں لا کر انہیں صحیح راہ پر گامزن کرے۔ تلخ جواب سُنے اور خاموشی سے اپنے ارادہ میں اٹل رہے۔ ہمیں انتہائی مسرت ہے کہ مشیت نے یہ فخر ہندستان کی سرزمین یعنی شاہجہانپور کو عطا کیا۔ ساجدہ بنت دانش شاہجہانپور سے وابستہ ہیں اور آج ان کا وجود اہل نظر کے سامنے حضرت دنیائے شاعری ہی نہیں بلکہ فہم و عقل اور تنقید صحیح کے مسئلہ میں ایک خاص طرز کا مالک ہے۔ قبل ازیں کہ میں موصوفہ کے کلام کا تجزیہ کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے پس منظر پر بھی کچھ روشنی ڈالدوں میرے خیال میں شاعر کی زندگی کا پس منظر بہت کچھ اسکی تعمیر اور تخریب کا باعث ہوتا ہے۔

ولادت اور ایام طفولیت

ساجدہ بنت دانش سنہ ۱۹۲۰ء میں موضع نگریا قصبہ شاہ آباد ضلع ہردوئی میں پیدا ہوئیں آپ سبحان علی خاں صاحب پنشنر سب انسپکٹر کی دختر نیک اختر ہیں۔ بدقسمتی سے ۲ سال کی عمر میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ عرفان علی خاں عرف مقبول میاں آپ کے برادر خورد تھے جن کا انتقال میرٹھ میں ۱۸ سال کی عمر میں موٹر کے حادثہ سے ہوا۔ موصوفہ کا مرثیہ وفات برادر پر دلی تاثرات کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ کے والد صاحب نے دوسری شادی کر لی اور جیسا کہ بالعموم مسلم ماحول میں ہو رہا ہے یہ حساس وجود بھی سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سے خوب پامال ہوا۔ دونوں بہن اور بھائی پر سوتیلی ماں نے دل کھول کر اپنے حربے استعمال کئے۔ اس درد و اندوہ نے موصوفہ کے دل و دماغ پر بہت اثر کیا۔ خدا کی یاد میں مشغول ہو جانا اور صبر کرنا اپنا شعار بنا لیا۔ والد صاحب اپنی سادہ مزاجی سے اپنی بیگم صاحبہ کی تیر اندازیوں اور نیش زنیوں کو نہ سمجھ سکے اور متعدد پریشانیوں کا باعث بنتے رہے۔ ساجدہ صاحبہ کی "سوتیلی ماں" پر نظم اس سلسلہ میں مطالعہ کے قابل ہے۔ آپ کا اس زمانہ میں یہ اصول تھا کہ پنج وقتہ نماز پڑھنا۔ تنہائی میں اشکباری کرنا اور کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ اس کتب بینی نے ایک خاص قسم کی استعداد پیدا کر دی تھی۔ ہر چند شعر و شاعری کی دُنیا سے واقف نہ تھیں۔ لیکن درد و غم نے اُس وقت یہ شعر خود بخود اضطراری قلب سے برآمد کر دیا تھا

ہاں مادر شفیق کا جب سر سے اُٹھا سایا
دُشمن کے لبادہ میں آت باپ نظر آیا

ایسے پریشان ماحول میں زندگی کے تقریباً ۱۸ سال گزرے۔ سوتیلی ماں کو فکر لاحق ہوئی کہ انہیں گھر سے نکالا جائے۔ اور دار حفظی نے انتہائی عجلت سے کام لیا۔ میرے کرم فرما منظور حسین خاں صاحب ایم اے شاہجہانپوری کے ہاتھ میں موصوفہ کا دامن دیدیا گیا یعنی عمر بھر کیلئے اپنے وطن اور میکے سے جلاوطن کر دی گئیں شادی

کے بعد حالات نے کبھی رُخ نہ کیا اور اس طرح آج تک وہ دیدارِ پدر کے لئے بیقرار ہیں۔ یہ ہے آپ کی شادی سے پیشتر کا پس منظر جس میں سوائے مصائب کے سرت ایک بھی نظر نہیں آتا۔

شادی کے بعد شادی کے بعد موصوفہ نے اپنے پاس ایسے فرد کو دیکھا جو علمی اور روشن خیالی کی دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتا محترمی منظور حسین صاحب نے موصوفہ کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کی صد ہا صورتیں کیں اور اس زندگی میں ان کو کچھ زندگی نظر آئی۔ یہاں آکر آپ نے منشی فاضل اور اعلےٰ قابلیت کے امتحانات پاس کئے۔ آپ کی ذہن کی تیزی کو منظور صاحب نے نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا اور اسکو صحیح راستوں پر لگانے کی انتہائی کوشش کی۔ زنانہ رسائل منگا کر دیئے۔ عمدہ قسم کی کتابوں کا ذخیرہ فراہم کیا۔ چونکہ موصوف خود نہایت سلجھے ہوئے اور صائب الرائے قسم کے انسان ہیں لہذا یہی اثر موصوفہ کے دل و دماغ پر پڑا۔ رسائل میں عورتوں کی شعر و شاعری کو پڑھکر ساجدہ صاحبہ اکثر جیں بجبیں نظر آتی تھیں اور منظور صاحب اس چیں جبیں کو مفید مطلب سمجھکر اپنی گفتگو سے صحیح راہ کی جانب ڈھالنا چاہتے تھے۔ موصوفہ کا اعتراض تھا کہ عورتوں کے لئے کھلے بندوں عشقیہ قسم کی شاعری قطعاً سازگار نہیں۔ آجکل کی تعلیم یافتہ عورت عورتوں کی ترقی کیلئے کچھ نہیں کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور موصوف ان میں ہاں ملا کر اس جذبہ کو ابھارتے رہے۔ چونکہ ساجدہ صاحبہ میں اردو اور فارسی کی اچھی خاصی استعداد موجود تھی۔ ایک روز نظم بعنوان "درسِ بقا" کہکر منظور صاحب کے سامنے پیش کی۔ ہر چند اس نظم میں قانونی اعتبار سے چند خامیاں تھیں لیکن معنوی حیثیت سے بہت بلند چیز تھی۔ منظور صاحب نے بہت تعریف کی اور خود اصلاح کی۔ یہ تھی وہ پہلی نظم جو عصمت ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اور جس پر حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانسن کالج آگرہ نے تنقید کا صحیح حق ادا کیا۔ بعد ازاں عورتوں کی صحیح ترقی کے خیال کو نصب العین بنا کر موصوفہ نے شعر گوئی شروع کی۔ شادی کے تقریباً تین سال بعد عرفان علی خاں عرف مقبول میاں برادر خورد کے انتقال کے حادثہ نے موصوفہ کی دنیائے دل تباہ کر دی۔ ایک بھائی۔ اور وہ بھی نہایت تنومند۔ ذی علم اور بہن سے محبت کرنے والا۔ دنیا تاریک نظر آنے لگی۔ "تاثرات" موصوفہ کی ایک نظم ہے جس میں مرگِ برادر پر بہن نے نوحہ کیا ہے۔ لیکن کتنا اچھا نتیجہ اس غم کا نکالا ہے۔

سخن سنجی مطالعہ کے دوران میں احسان بن دانش کا مختلف کلام بھی دیکھنے میں آیا۔ اور خود احسان کے کلام سے متاثر ہو کر آپ نے اپنا قلمی نام ساجدہ بنت دانش تجویز کیا یعنی احسان اگر ابن دانش ہیں تو یہ بنت دانش۔ آپ کی [illegible] جیسے درد انگیز جذبات کارفرما ہیں۔ آپ نے اپنا استاد کسی کو نہ بنایا۔ البتہ نظمیں منظور صاحب کو دکھاتی رہیں۔ اور صاحب موصوف نشاد اصلاحیں دیتے رہے دماغی صلاحیت، حساس دل اور درد و غم کے بہترین امتزاج نے آپ کی عمارتِ سخن کو بہت بلند کر دیا ہے۔ شعر و شاعری کے متعلق خود موصوفہ صاحبہ کے نظریے ملاحظہ ہوں۔

جنبشِ لب سے اُٹھاتی ہوں نقابِ فطرت
نغمۂ درد ہے آئینۂ اسرارِ حیات
دستِ دل میں نہیں بیکار سخن کا دامن

ہوں اس دور میں نغمہ سنج مسلماں — فروزاں ہے سینے میں اک شمع ایماں
مری لے ہے آئینہ دارِ صداقت — مرے نغم سے کاخِ تصنّع ہے لرزاں
مری نظم عبرت اثر آئینہ وہ — سکندر بھی دیکھے تو رہ جائے حیراں
اُٹھاتی ہوں معنی کے چہرہ سے پردہ — پسند آج مجھکو نہ تقلیدِ نزیاں
شکوہِ مجسم روحِ شعر و سخن ہے — میں اس دور کی ہوں عش سے گریزاں
میں پیغمبرانہ حقیقت کی قائل — یہاں ساحری مشغلۂ سخنداں

شاعری کیا ہے روح و دل کا پیام — آپ بیتی کا اک انوکھا نام

ظاہر ہے کہ ایسے پاکیزہ اور بلند نظریوں کا شاعر اس دور میں مفقود ہے۔ آپ کی شاعری تقویتِ فحاشی اور سطحی قسم کے خیالات سے پاک ہے۔ آپ چونکہ میکے اور سسرال دونوں جانب سے ایک شریف اور آزنے خاندان سے منسلک ہیں۔ لہذا اکثر اسی احول کی کمزوریاں تجربہ کے معیار پر رکھ کر آپ نے نظم کی ہیں۔ آپ نے عورتوں میں بہت سے نقائص دیکھے۔ غیبت۔ دروغ بہتان تراشی۔ نام و نمود کی خواہش۔ شوہر کی جانب سے عدم رغبت۔ حکومت شان و شوکت۔ [illegible] وقت کا ناجائز مصرف۔ رات دن پان چبانا۔ بچوں کی جانب سے لاپرواہی نسل آئندہ کی جانب سے بےخبری تعلیم کی خرابی۔ آزادی اور بےباکی وغیرہ انہیں نقائص پر تنقید صحیح آپ کی اکثر و بیشتر نظموں کا موضوع ہے۔ جن ذیل میں موصوفہ کے مختلف کلام سے شعر کا پیش کیا جائے گا۔

مذہبی جذبہ تقریباً تمام شعر و شاعری کی روح رواں یہ جذبہ ہے۔

[illegible] سے علمی اور عملی فرائض کو دیکھ کر ساجدہ صاحبہ کو انتہائی [illegible] ہوتا ہے۔ اس جذبہ کا سامنے کا رخ یعنی پانچ وقت کی نماز ہی [illegible] وحدت توحید پرستی اور معرفت کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ رابعہ بصری کا نام اکثر جگہ ان کی نظموں میں ملتا ہے ؎

[illegible] جہاں صورت ماری — کیا رابعہ بصری کا نہیں نام سنا ہے

[illegible] رابعہ بصری پڑھو اے — میثاق اولیں کی ہے روداد مومنہ

سے موصوفہ کی بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے۔ آپ مذہب کے سطحی رخ کو پسند نہیں فرماتی ہیں بلکہ روح و دل کو تجلیات ابدی سے ہم کنار دیکھنا چاہتی ہیں۔ مومنہ موصوفہ کی ایک کامیاب نظم ہے۔ چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

خوش ہے کہ دل متاعِ تجلی سے ہم کنار — دنیا کی گو نظر میں ہے ناشاد مومنہ
ہر سانس وقفِ ذکر ہے ہر لمحہ حرفِ فکر — اللہ کا ہے دہر میں ارشاد مومنہ
ثابت قدم براہِ شریعت ہے مثلِ کوہ — باطل کے حق میں صورتِ جلاد مومنہ
صبر و رضا، قناعت و عفت، حیا و حلم — رکھتی ہے یہ صفات خداداد مومنہ
[illegible] شرح قلب بانِ نظر سے کچھ — ہوتی نہیں ہے اہلِ فریاد مومنہ

ساجدہ صاحبہ "مومنہ" میں صبر و رضا، قناعت و عفت اور حیا و حلم جیسے خصائل کو دیکھنا پسند فرماتی ہیں۔ مومنہ کا یہ کردار ہونا چاہئیے کہ زبان سے اُف نہ کرے بلکہ اُس کی نظریں روداد قلب کی ترجمان ہوں۔ دنیوی غم و رنج اسکے [illegible] ڈگمگا سکیں۔ دوسری جگہ کیا خوب فرمایا ہے ؎

چھو دنیاوی مصائب کو مجھ سے یار کے جلوے
تو ایسے عشق کی تشہیر ہرگز ہو نہیں سکتی

"شمع ایمان" ایک نظم کا عنوان ہے۔ اس نظم میں موصوفہ نے اپنے نظریۂ شاعری کا خاکہ پیش کیا ہے ؎

ہاں اس [illegible] نغمہ سنج مسلماں — فروزاں ہے پہلو میں اک شمعِ ایماں
[illegible] صداقت — مرے دم سے کاخِ تصنع ہے لرزاں
میں بیشک [illegible] سوزِ جگر ہوں — وہ سوزِ جگر جو ہے سرتاجِ انساں
[illegible] بدل دے — کہ حق بات کہہ کر نہ ہوں میں پشیماں
[illegible] کی نہ پائی — صداقت نہ سمجھا کسی کی خواہاں
[illegible] — مرا اس دور کی ہوا و ہوس سے گریزاں
[illegible] حقیقت کی قندیل — یہاں ساحری منہ تکے سخنداں

اس نظم میں موصوفہ نے عصر حاضر کی شاعری پر نہایت [illegible] تنقید کرکے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔ عجمی اثرات نے مسلمان کے دل و دماغ پر "سوتا" نوتنا" جو چھاپہ مارا اور ہماری شاعری کو جو بانٹہ آور بنا دیا اظہر من الشمس ہے۔ اوراق تاریخ شاہد ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان ہی صحیح قسم کا شاعر بن سکتا ہے۔ "شاعری جزویست از پیغمبری" اس کا نصب العین ہے۔ اسی مذہبی جذبہ کی آبیاری نے ساجدہ صاحبہ کو نہایت توحید پرست بنا دیا۔ "کون ہو تم" آپ کی ایک نہایت کامیاب نظم ہے ؎

آبشاروں کے ترنم میں نہاں کون ہو تم — گوشِ حساس میں فردوس نشاں کون ہو تم
[illegible] میں انجم افلاک کے ملبوس ضیا — چشمِ دل کیلئے حسرت کا سماں کون ہو تم
بادۂ عشق سے سرشار دلِ اہلِ نظر — داغِ کشمکش سود و زیاں کون ہو تم
عاشق ہے ہر ایک گام پہ کیوں حیدر کنا — باعثِ مژدۂ اندوہ و فغاں کون ہو تم
کس تخیل میں خدا جانے ہے قمری بے تاب — قامت سرو کے پیکر میں نہاں کون ہو تم
رازِ در راز ہے گلشن کی حقیقت اب تک — گل کے پردہ میں ہیں خندہ دہاں کون ہو تم

ساجدہ دیدہ حرم کیا ہیں، نظر کی تنگی
کہ یہاں کون ہو تم اور وہاں کون ہو تم

حواس خمسہ ظاہری و باطنی آپ کے روبرو توحید کے ورق گردانتے نظر آتے ہیں اور آپ کثرتِ رنگ و بو میں ایک وحدت کو جلوہ فگن دیکھ رہی ہیں۔ "تو ہی تو" والی نظم میں ساجدہ صاحبہ اسی جذبہ اور اسی تخیل توحید کو دوسرے طرز سے ادا فرماتی ہیں ؎

گلشنِ دنیا کے عبرت خیز نظاروں میں تو — مانوں میں عیش کے پر لطف نقاروں میں تو
تھا دمِ شام کے ماتھے پہ اک رنگیں جبین — چاندنی، قوس قزح، مہتاب و تاروں میں تو
ابرِ تیرہ، بحرِ طوفاں، زہے تیری ادا — ناخدائے کشتیٔ مغموم منجدھاروں میں تو
بے سبب ہرگز نہیں ہے قلبِ مضطر کی تڑپ — چشمۂ سیماں کی آہستہ رفتاروں میں تو
سرمدی نغموں میں ہے کھویا ہوا دل اندنوں — موسمِ برسات کی ہاں موسلا دھاروں میں تو
چشم حیراں، روح بریاں، مضطرب قلب و جگر — جھلکیاں تاری نظر ہے رقت ان چاروں میں تو
جا رہی تھی ڈھونڈنے گلہائے رنگا رنگ میں — یک بیک مٹ مل گیا مجھ سے [illegible]

تیرے ہاتھ ہم کو ہے لبیک کہتی ساجدہ
کچھ عجب انداز سے پنہاں ہے سوفاروں میں تو

سماجی صلاح

یا بہ الفاظ دیگر ساجدہ صاحبہ کی تنقیدی شاعری۔ عورتیں [illegible] عادت طعنہ زنی کی بہت ہوتی ہے۔ اپنے آپ کے سامنے دوسرے کا وجود اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس مرض کی اصلاح اگر ہوتی تو طرح طرح کے

[illegible]کی تجزیہ مرقع بن جاتا ہے۔ ساجدہ صاحبہ قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے بس نسوانی عادت سے بہایت صحیح کام لیا۔ یہاں نفس حسد آمیز کا طعنہ نہیں بلکہ تعصب و فاشعار اور حسرت آگیں کی خواہش ارتقا جو سچی تنقید کی شکل میں جلوہ فروز ہے۔ موصوفہ کی سب سے پہلی نظم "درس بقا" ہے جس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہماری بالغ نظر شاعرہ خواہران بزم کے معیار زندگی کو بلند کرنا چاہتی ہے اور ان کے روح و دل کو اپنی حقیقت سے آشنا کرانا چاہتی ہیں۔

بیدار ہو بیدار کہ فرصت ہے بہت کم　　تکلے یہ تلاش اثر دیدۂ پر نم
یہ دور پرکشاکش ہے علم و ہنر کا مخزن　　بیگانۂ اخلاص و وفا روح سے برہم
کچھ خواہر من! عہد ازل کا بھی پتہ ہے

اے بےخبر مقصد و بیگانۂ منزل　　ہے بادۂ اسرار سے لبریز ترا دل
نیرنگئ دنیا پہ تری عقل ہے شیدا　　پہلو میں ہر دل لیلئ خوش رنگ کا محمل
یہ راز فقط روح کی تختی پہ لکھا ہے

مغرب کی اداؤں نے تجھے اور بھی کھویا　　مشرق تری رفتار پہ جی کھول کے رویا
رنگینیٔ صورت کے نئے ڈھنگ نکالے　　پوڈر کو ملا چہرہ پہ گیسو کو تراشا
صد حیف کہ رخ جانب بتخانہ پھرا ہے

اک نظارہ بے باک ہے سوئے چمن دیکھ　　زنداں میں تری روح ہے بیتاب، بدن دیکھ
اس جامۂ رنگیں کو تو زینت نہ سمجھنا　　نظروں سے تری آہ دل مردہ کا کفن دیکھ
اے ساجدہ یہ آہ تری درس بقا ہے

شروع سے آخر تک کہیں اپنے وجود کو مہتمم بالشان بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ بہایت شریفانہ انداز میں عورتوں کے دل و دماغ سے جہالت کے پردوں کو اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

ایک بزم شادی میں ساجدہ صاحبہ کو شرکت کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک مغرور اور نخوت پسند بیگم اور ایک سچی اور وفادار خادمہ کو دیکھ کر سوسائٹی کی پست ذہنیت کا جو اندازہ ہوا اسکو تنقیدی رنگ میں "خادمہ اور بیگم" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

"تقریب شادی میں مجھے ایک مرتبہ جانا پڑا۔ اور وہ کچھ دیکھا کہ دل تڑپ اٹھا۔ مختلف لباسوں والی عورتیں مشرقی تہذیب سے معرا اور مادیت کے سمندر میں سفینہ حیات کو کھینے والی موجود تھیں۔ لیکن خاص ایک نخوت پسند بیگم تھیں جن کی چتون سے خادموں پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ انہیں میں ایک خادمہ تحفہ مشفق جتا تھی۔ صوم و صلوٰۃ کی بہایت پابند۔ صبح صادق سے پہلے وہ اٹھتی۔ ذکر حق کرتی۔ تلاوت کلام پاک کرتی۔ جھاڑو دیتی۔ برتن مانجھتی۔ جب نو بجے بیگم صاحبہ اپنا سر

اٹھاتیں [illegible]
اسی طرح رہتا ہے شب تک [illegible] تھی۔

قدردان لیکن نہ کوئی خدمت بیگم کا تھا　　[illegible] بے فضا
طعنہ و تشنیع کا آماجگہ اس کا وجود　　چبھتیاں کستی تھی اکثر دل میں ہنگام [illegible]
خادمہ کو دیکھ کر منہ کو کلیجہ آ گیا　　نیکیوں کا تاج کوئی دنیا میں نہیں [illegible]

اس کے بعد اپنے تاثرات قلبی کو امید افزا شکل میں پیش فرماتی ہیں۔

شاد باش اے خادمہ اے رہبر دنیا و دیں　　رائیگاں تیرا عمل کوئی بھی جا سکتا نہیں
میں دلاؤں گی تجھے دنیا میں محنت کا ثمر　　آسماں کو لاؤں گی اک دن زمیں پر کھینچ کر
مشتعل دل میں کروں گی آتش احساس کو　　کم کروں گی بیکسوں کے قلب کے آلام کو

آخر میں ان بیگم رنگین جمال اور نخوت پسند کو ایک درس دیتی ہیں۔

عصمت و عفت سکون روح عقبیٰ کا خیال
طرۂ اسلام ہیں اے خواہر رنگیں جمال

کتنی بصیرت افروز اور پاکیزہ نظم ہے۔

غلط تعلیم نے مرد اور عورت کو جس حد تک غارت کر رکھا ہے محتاج بیان نہیں۔ یہ غلط قسم کی تعلیم سوسائٹی کو قعر مذلت میں غیر مرئی طور پر گرا رہی ہے۔ ساجدہ صاحبہ اس حقیقت کی تہہ تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ صحیح نظریہ تعلیم کو پیش کرتی ہیں۔ موصوفہ کی ایک نظم ہے "تعلیم و تربیت" اس میں یوں رقمطراز ہیں:-

وہ علم جو ہے کاشف اسرار دل و روح　　ہر گام پہ جو ضامن حد دانش و فرہنگ
یہ علم نہیں ساحر الموط کا جادو　　لشکر میں سرایت کئے ہے نیک کا نیرنگ
تعلیم جہاں اب ہے تعلیم خدا اور　　درویش کی ٹھوکر میں ہے شاہ کا اورنگ
عورت ہو کہ ہو مرد ہیں بہکے ہوئے دونوں　　ہیں دور مقاصد سے ابھی [illegible] فرہنگ

آپ کی نظروں میں علم وہ کیمیا ہے جو انسان کے پنہاں لمعات کو اجاگر کرتا ہے اور اس کے درجہ کو بلند کرتا ہے۔ اس قسم کے علم کی روشنی سے مرد اور عورت دونوں ناواقف ہیں۔

"پڑوسن" کی نظم میں تو ساجدہ صاحبہ نے اس تنقیدی جبلت کے صحیح رنگ کو منتہائے عروج پر پہنچا دیا ہے۔

"آمنہ ایک سہیلی نے مجھ سے یہ شکایت کی کہ اے میری بہن! میری ایسا برا پڑوسن ملا ہے کہ کسی دن میرا ذوق علم و فن برباد ہوتا رہتا ہے۔ پڑوسن مال و دولت کی پجارن ہے۔ بیکار ہے کچھ نہیں ہے۔ اور وہ ادبی نہیں جانتی علم و تہذیب سے اسے مس نہیں۔ ہمیشہ رذائل کے ہم نشیں رہتے ہیں۔ پڑوس [illegible]

اور تنہا کہ اس کا سوز و شب کا مشغلہ ہے ہمیشہ تیوری چڑھی رہتی ہے۔ یہاں نے سہیلی سے کہا کہ تہذیب عورت کی لگام مرد کے ہاتھ میں ہے۔"

مرد اگر چاہے تو عورت ہو نغمائی رکند　　ساز روح و عقل عورت کا بجے ہر ایک تار
مرد اگر چاہے تو عورت علم کو ہو بہرہ ور　　علم وہ جو دیدۂ دل میں کھیے پید النظر
علم وہ جو آشنا کرشے رموز ذلت سے　　بات دل کی چھیڑ دے جو زندگی کی بات سے
روح کو ستواں نغمے بلندش ہونے نہ دے　　تخم حرص و مکر کشتِ دل میں جو بونے نہ دے
ہے وہ علم جو ہو عنصر زیب بدن　　ہو نہ تعمیر حیاتِ دل کی جس کو کچھ لگن

کتنے صاف طور پر علم کے صحیح رخ کو پیش کیا ہے۔ اس دور کی شاعری میں یہ بات کہاں ؎

بات دل کی چھیڑ دے جو زندگی کی بات سے

آب زر سے نہیں بلکہ آبجات سے لکھنے کے قابل مصرعہ ہے۔ اسکے بعد مرد کی معاشی زندگی کے نقائص کا اظہار کیا ہے مرد بھی جاہل مطلق ہے۔ مادیت کا کھلونا ہے ؎

تشنہ ذہن مرد پشیمان شعلہ بار ہے　　ارتقائے روح عورت کس قدر دشوار ہے
آخر میں مرگِ روح پر ماتم و نوحہ ہے۔

الغرض ہر روح کا بجھنے کو نورانی چراغ　　دامنِ انسانیت پر مرد و عورت ہیں داغ

اور پھر اپنی سہیلی کو مشورہ دے رہی ہیں ؎

خواہر من دیپیے جلوت نہ ہو اس دور میں
دل نہیں سکتی ہیں ہرگز حسب منشاء عورتیں

انہیں احساسات نے موصوفہ کو بہت کچھ گوشہ نشین بنا دیا ہے میرا ذاتی خیال ہے کہ ساجدہ صاحبہ نے یہ نظم میرٹھ میں کہی ہے اور یہیں دہلی کو ئی نہیں بلکہ خود اپنی پڑوسن سے پریشان تھیں۔ جس زمانہ میں میں منظور صاحب کے یہاں میرٹھ میں مقیم تھا موصوفہ کو کوئی شغل اور مہذب پڑوسن نہ ملا تھا۔ بلکہ بالکل یہی نقشہ تھا۔ اور غالباً اسی جذبہ سے متاثر ہو کر انہوں نے "دل ڈھونڈتا ہے جنکو وہ صحبتیں کہاں ہیں" والی نظم لکھی ہے۔ اس نظم کے بھی چند بند ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

مجبور عیش و بستانِ آفت زینتِ زماں ہیں　　انگشت نمائے رعنا مصروفِ پائمال ہیں
اسد جبکبر و نخوت ہر گام پر عیاں ہیں　　یہ طائران زریں مائل بہ آسماں ہیں
مسلم زنانخانے عبرت کی داستاں ہیں
دل ڈھونڈتا ہے جنکو وہ صحبتیں کہاں ہیں

محفل میں جلوہ فرما ہیں بیگماتِ عالی　　تدبیر تنزلی سے جن کے دماغ خالی
خوش بیٹھی ہیں قیلا بدست مثلا ابالی　　ایجاد کر رہی ہیں تہذیب اک نرالی
مسلم زنانخانے عبرت کی داستاں ہیں
دل جنکو ڈھونڈتا ہے وہ صحبتیں کہاں ہیں

عزلت نشین ہوئی ہیں کچھ سوچ کر یہاں ہمدم　　جو پاک قلب مضطر ہر لحظہ چشم پر نم
دامانِ زندگی پر اک داغ بدنما ہم　　اے ساجدہ سنائیں کس کو فسانۂ غم
مسلم زنانخانے عبرت کی داستاں ہیں
دل جنکو ڈھونڈتا ہے وہ صحبتیں کہاں ہیں

اسی قسم کی تنقید ایک ردیف اور قافیہ سے بہت کچھ آزاد نظم میں موصوفہ کے یہاں نظر آتی ہے۔ "سلام" اِس نظم کا عنوان ہے۔

"سلام۔ ایسی تہذیب کو اے خواہر من میرا سلام"

اس سلسلہ میں عورتوں کی تہذیب جدید کے نقائص کو طشت از بام کیا ہے عورتوں کی نقش پرستی سجدۂ بوالہوسی اور ترقی پسند ادب کے گلچھروں پر طنز ملیح ہے۔

حسن اور عشق ہیں بے باک ایسے
جیسے راشد کی ہیں نظمیں آزاد
بےحیائی نے بچھایا ہے یہ تہذیب کا دام
ایسی تہذیب کو اے خواہر من میرا سلام

عورتوں کا سنیما میں نازیبا حد تک شریک ہونا۔ ہر رات کو سنیما ہالوں میں جلوہ افروز ہونا۔ بچوں کا گھر پر سسکنا اور بلکنا انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا ؎

بچے آغوش محبت کو ترستے ہیں مدام
بوسہ ہائے لبِ مادر ہیں مثالِ دشنام
الغرض وہ تو سنیما کے لئے ہوئیں سوار
عبرتِ دل نے کہا مجھ سے کہ تو گھر کو سدھار
گھر بھی خم ہی مینا ہے یہی ساقی و جام
ایسی تہذیب کو اے خواہر من میرا سلام

دہلی کی ایک گریجویٹ خاتون نے ساجدہ صاحبہ کو ایک آل انڈیا زنانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دی۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا اگر شریک نہ ہوئیں تو حشر میں رسولِ کریم کی روح بازپرس کرے گی۔ چنانچہ موصوفہ کو بہت صدمہ ہوا اور فوراً ایک خط جواباً ارسال کیا کہ عدم شرکت کی صورت میں روحِ رسول کا بازپرس کرنا کہاں سے ثابت ہے۔ عقلی یا نقلی کوئی دلیل ہونی چاہیئے۔ جواب یہ

گویا کہ چونکہ یہ مشاعرہ اس غرض سے منعقد ہو رہا ہے کہ اس کے ذریعہ جو رقم حاصل ہو وہ مسلم لیگ کے الیکشن فنڈ میں دی جائے۔ وہ مسلم لیگ جو فاروق و صدیق پیدا کرے گی۔ لہٰذا روحِ رسول کا بازپرس کرنا قرینِ عقل ہے۔ عقل کی اس کجروی پر ساجدہ صاحبہ کو بہت افسوس ہوا۔ موصوفہ خود مسلم لیگی ذہنیت کی ہیں۔ خاموش ہوگئیں۔ لیکن چند روز کے بعد اس شدید احساس سے ایک نظم موزوں کرائی جس کا عنوان ہے "ترکستانی راہ"۔ اس نظم کا ماحصل یہ ہے کہ "میری بہن! آپ کے گرامی نامہ نے عجب طرز سے زخمِ دل پر نمک پاشی کی۔ مشاعرہ کا مدعا کچھ بھی ہو لیکن روحِ نبی کا واسطہ کیا معنی! آپ شاعراتِ ہند کی یکجائی سے ٹکٹ کی رقم حاصل کر کے مسلم لیگ کو فربہ کرنا چاہتی ہیں۔ میری عقلِ ناقص میں یہ ذہن کی کجروی ہے۔ لیگ کی کامیابی میرے دل کی عین خواہش ہے۔ فردِ مسلم کا ارتقا میری دلی تمنا ہے۔ لیکن ؎

آپ کے ہیں ارتقا کے نظریہ سے اختلاف — رنڈیوں کے زر سے تعمیرِ حرم ہے ابھی

بعد ازاں تاریخی شواہد سے مسلمان کے صحیح ارتقا کی عکاسی کی ہے۔

تحفۂ ناپاک سے رسوا ہوا شیخِ حرم — جب خلافت سلطنت کی شکل میں ڈھالی گئی
ملکِ امیہ اور بنو عباس کا جاہ و جلال — اشتہائے نفس کی آسودگی شاہنشہی
ہاں خلافت کا تو خاکہ تک تصور میں نہیں — قابلِ ماتم مسلماں کی نگاہِ برتری

اس کے بعد اسلام کی موجودہ زوال یافتہ حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زوال کے تمہیدی عناصر کا صحیح علم ہونا ضروری ہے۔ ترقی کچھ نہ ہو اور خواہ مخواہ ترقی ترقی پکارنا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔

کلمۂ توحید رسمِ مذہبِ اسلام ہے — روح میں ڈوبی صدا اس دور میں گمنام ہے
روح افزا نورِ وحدت ہے حجاب اندر حجاب — اسوۂ حسنہ کا چرچا گفتگوئے عام ہے
عقل کو حاصل نہیں اسلام کا فہمِ سلیم — یہ ترقی رہ گئی بادۂ گلفام ہے
جن رگوں سے پردۂ اسلام پر پردے پڑے — ان رگوں کا جاننا فرضِ خواص و عام ہے
وہ عجم کی شان آئی وہ فلسفہ یونان کا — نرغۂ ظلمات میں کب سے جلوۂ اسلام ہے
ڈھونڈ لائے عقل کو اسلاف کا قلب و جگر — روح و دل کے واسطے افسوس مشکل کام ہے
پھینک اٹھا کر جھٹک دے اپنا دامانِ خیال — ایسی ہستی آج کل من جملۂ اوہام ہے
از سرِ نو ہو جو تعمیرِ خودی میں منہمک — اک مسخر اس نگہ میں گردشِ ایام ہے
خواہرِ من ساجدہ ہمت شکن ہرگز نہیں — صبح وہ کیسے کہے بال و پر وجہ شام ہے

آپ کی یہ راہ تو جاتی ہے ترکستان کو
کیجئے بدنام مت للہ پاکستان کو

درد و غم | یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ درد و غم ساجدہ بنتِ دانش صاحبہ کے رگ و پے میں خونِ جگر کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔ بچپن ہی میں مصیبت نے موصوفہ کو یہ چاشنی چکھا دی اور رفتہ رفتہ یہ چاشنی شیرینیِ حیات بن گئی۔ ان کا مقولہ ہے کہ "درد میرے دل کو سکون بخشتا ہے اور میں اسے درد کا شاکی نہیں سمجھتی۔ کسی کو غمِ معشوق لگتا ہے اور مجھ کو بچپن سے غمِ دنیا ملا۔ یعنی وہ غم جو دنیا کے سلسلہ میں مجھ تک پہنچا۔ لیکن ؎

غمِ دنیا بنا غمِ معشوق — رفتہ رفتہ ہوا ہے بحث تمام

آپ کا یہ جذبہ مجھے بہت پسند ہے اور جس رنگ میں یک بیک آپ ذہن کے رجحان کو اس جانب مائل کر رہی ہیں اس دور میں آپ کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا ؎

جو دنیاوی مصائب کو سمجھ لے یار کے جلوے — تو ایسے عشق کی تشہیر ہرگز ہو نہیں سکتی
مٹا ہے وہ شکستہ دل میں جلوہ بن کے نکلیں گے

اسی قسم کی مثالیں ہیں۔ آپ کی ایک نظم ہے "نشاطِ زندگی" خوب نظم ہے۔ ساجدہ صاحبہ نے نہایت صحیح جذبہ کے ماتحت یہ نظم کہی ہے۔

نشاطِ زندگی ہے درد کو لذت بنا لینا
سکونِ قلب ہے دنیا رہائے داغ پا لینا

لہو اپنے رگوں سے چھوڑ دیں جس دم مصیبت میں
میسر ہو نہ اک پنکھا بھی جب زندانِ کلفت میں
شکایت کچھ نہ کرنا دل کی آہوں سے ہوا لینا

خوشی کے پھول میں بھی چاہتی تھی توڑنا خواہر
کہا مالی نے مرجھایا ہوا اک پھول دکھلا کر
سرابی رنگ سے زیبا ہے دامن کو بچا لینا

پھنسی گردابِ حیرت میں وہ دیکھی صنعتِ صانع
مری کشتی نہ سطحِ بحر پر پھر رہ سکی قانع
خدا اہلِ نظر اس سمت ہی لنگر اٹھا لینا

ہر اک ہستی سراپا مادیت تشنۂ تنویر
بہت مشکل سے ملتی ہے جہاں میں درد کی اکسیر
مری خاکسترِ دل سے تم اک چٹکی اٹھا لینا

یہ کوئی زندگی ہے خواہشوں پر اپنی دم دینا
حیاتِ چند روزہ کے لئے اور دل کو غم دینا
ستم ہے جنتِ دانش اسی جگہ نام دھا لینا

ان اشعار کا مطالعہ ہمیں ساجدہ صاحبہ کی شخصیت کا حامل بلند تر

بچے پر مجبور کر دیتا ہے۔ "خواب جوانی" کی تعبیریں کرنے والے تو مرد اور عورت دونوں قسم کے شاعر موجود ہیں۔ مگر "کتاب دل" کی تفسیر اس دور میں محض ساجدہ بنت دانش ہی کا حصہ ہے۔

جیسا کہ تمہید میں کسی جگہ لکھ آیا ہوں شادی کے تقریباً تین سال بعد ساجدہ صاحبہ کے برادر عزیز مقبول میاں کا انتقال ہو گیا۔ میرٹھ میں ایک موٹر لاری کی زد سے جانبر نہ ہو سکے۔ چونکہ یہی صرف ان کے ایک بھائی تھے اور وہ بھی نہایت تنومند، ذی علم اور بہن سے محبت کرنے والے۔ دنیا نظروں کے سامنے تاریک نظر آنے لگی۔ یہ سنا ہے کہ مہینوں اس صدمہ میں پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا۔ اسی زمانہ میں مرگ برادر پر ایک مرثیہ لکھا جو عصمت میں شائع ہوا۔ میں اس مرثیہ کو بجنسہ نقل کئے دیتا ہوں۔ درد و غم کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ؎

جگر کا خون درد و غم کا ٹکڑا بن کے نکلیں گے
مرے آنسو جہانِ دل کا نقشا بن کے نکلیں گے

مبارک ہو مشیت کو مرا رونا مبارک ہو
مرے ارمان کو دنیا سے اٹھا لینا مبارک ہو
شرارے میری آہوں کے تماشا بن کے نکلیں گے

میاں مقبول اور میں خشک ٹہنی کے دو پتے تھے
مظالم کی ہوائے تند سے در پے رہا جن کے
وہ مظلوموں میں عبرت کا فسانہ بن کے نکلیں گے

فرشتو درج کر لو یوں تو مرتا اک زمانہ ہے
مگر اس بیکسی مرگ کا خونیں فسانہ ہے
قیامت میں جگر کے داغ دعویٰ بن کے نکلیں گے

قاتل کا رجب منصف نہ پایا اس زمانے کو
گئے وہ پیش داور ماجرائے غم سنانے کو
وہ کم بختی خواہر کا سہارا بن کے نکلیں گے

میں ہر صدمہ کو خاموشی سے دیتی ہوں جگہ دل میں
سکوت حشر پرور ہے چھپا آغوش بسمل میں
یہ قطرے ایک دن طوفان دریا بن کے نکلیں گے

ہلائے دل کو طغیانی غم سے تھم تو ڑتی رہتی
مشیت کے مخالف ساجدہ میں کچھ نہیں کہتی
سنا ہے ٹوٹے دل میں چھالا بن کے نکلیں گے

یہ نوحہ کتنے تپاں اور پاکیزہ جذبات سے لبریز ہے۔ ساجدہ صاحبہ نے نتیجہ کیا اچھا بر آمد کیا ہے۔ بالکل ماحول سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔ اور دنیائے انسانیت کی اصل حقیقت۔ اس حادثہ کے بعد ساجدہ صاحبہ کا کلام بہت دردناک ہو گیا۔ جو کچھ بھی کہا اس میں ایک خاص قسم کی درد کی چاشنی موجود ہے۔ اور یہ درد ہی ان کا ماحصل حیات بن گیا ہے۔

احساسات و تخیلات و تجربات

ساجدہ بنت دانش صاحبہ نہایت صحیح احساس و خیال کی مالک ہیں۔ کبھی دل و نظر کو ڈگر سے ہٹنے نہیں دیتیں۔ چونکہ نام و نمود کی دنیا سے کوئی رغبت نہیں لہٰذا جو کچھ محسوس کرتی ہیں آزادانہ صفحۂ قرطاس پر لے آتی ہیں۔ سوتیلی ماں کے جور و تشدد کے مشاہدے اور تجربے سے متاثر ہو کر بعنوان "سوتیلی ماں" ایک نظم آپ نے کہی ہے۔ مگر احساس و خیال کی کتنی صحیح ترجمانی کی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

وہ ناگن جس کے کاٹے کا نہیں منتر زمانے میں — وہ خنجر نکلت آتا ہے جسے ٹکڑے اڑانے میں
وہ آتش منہمک جو کشتۂ ہستی کے جلانے میں — وہ پانی جس کے چھینٹے طاق اکم غاں اٹھاتے ہیں
وہ آندھی جو ہے ماہر کشتی بیکس ڈبانے میں

وہ جس کا ہر نفس آلودۂ زہر ستم رانی — وہ جس کے ہر قدم میں منتشر اندازِ جا پانی
وہ برچھی کی طرح کھبتی ہو جس کی چین پیشانی — وہ جس کا دم ہے معصوموں کے حق میں قہر یزدانی
وہ دل گلتا ہے جس کا بستر خونیں فسانے میں

جسے بخشا گیا رمزِ ازل قلب حسد آگیں — عناصر دشمن انسانیت اور روح مست کیں
خود مجرمانے کا رہے قانون بے آئین — جسد اک پیکر ناری مذہب ہے نہ کوئی دیں
ہے گویا خواہر شیطاں قدم کو ڈگمگانے میں

وہ قاتل سیکڑوں معصوم جس نے قتل کر ڈالے — بہائے جس نے اکثر گھر کے اندر خون کے نالے
وہ بیکس جس کی میت پر نہیں سر پیٹنے والے — ستم قانون کے منہ پر لگے ہیں ساجدہ تالے
خدا جانے تذبذب کیا عدالت کو ہے آنے میں

چونکہ اپنا ذاتی تجربہ ہے لہٰذا دنیائے محسوسات میں ایک طوفان بپا کر دیا ہے۔

ساجدہ صاحبہ کا صرف ایک لڑکا ۳ سال کا ہے جس کی نشو و نما کے بارے میں نہ معلوم وہ کیا کیا ارمان و تمنا اپنے آغوش دل میں چھپائے ہوئے ہیں "مادر و بچہ" موصوفہ کی ایک نہایت کامیاب نظم ہے جس میں ایک مسلمان ماں اپنے بچے کو مخاطب کر کے کچھ اپنے ارادوں کا اظہار کر رہی ہے۔ میں یہ نظم من و عن نقل کر رہا ہوں تاکہ مشتے نمونہ از خروارے موصوفہ کی ان کچھ آرزوؤں کا جو اپنے بچے مسمی عرفان کے مستقبل سے وابستہ ہیں معیار معلوم ہو جائے۔

مغربی جزیروں کی کہانیاں

(از جناب جیمز لنسٹیل ہوٹسن)

میں مغربی جزیروں کے ایک جزیرہ آئیونا میں بیٹھا یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ مضمون لکھتے وقت اس جھونپڑی کی نالی دار ٹین کی چھت اور دیواروں سے بارش کا پانی ٹکرا رہا ہے۔ اور کھڑکیوں پر بوچھاڑ پڑ رہی ہے ایک ہفتہ سے قدرتی مناظر کا پینٹر یعنی میرا میزبان صحیح معنوں میں کوئی کام نہیں کر سکا۔ بارش اور ہوا نے کام نہیں ہونے دیا۔ اس کے برعکس میرے پاس کام نہ کرنے کا کوئی بہانہ نہیں ہے۔ جس پر مجھے افسوس ہے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر جانسن نے یہاں کہا تھا کہ اس جزیرہ میں جس شخص کے تقدس میں اضافہ نہ ہو (جہاں ۱۳ صدیاں پہلے سینٹ کولمبا نے آکر عیسائیت پھیلائی تھی) اس پر رشک کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس کے فلسفہ کے مسائل پر غور کرنے کی قوتوں میں بھی اضافہ نہ ہو تو وہ عجیب شخص ہوگا کیونکہ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں موسلادھار بارش کے بعد شدت کی دھوپ پڑتی ہو۔

لیکن آئیونا میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک آدمی یہاں امن سے رہ سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہاں ایک موٹر ٹرک ہے لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں۔ ہم بندرگاہ کے پل سے جو ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے اپنے تھیلے اس جھونپڑی میں گھسیٹ کر لے آئے تھے۔ رات کے وقت ہم بیل گاڑی میں بیٹھ کر لکڑی کی اس جھونپڑی میں گئے جو ڈاک خانہ ہے تاکہ اپنی ڈاک لے آئیں۔ اس گھر میں کوئی عورت کام نہیں کرتی۔ پینٹر اور ماہر نباتات اور ایک ڈرامہ نویس نیز آپ کا یہ حقیر خادم گھر کا کام کاج خود کرتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔ باتوں کا موضوع بھوت پریت۔ بغیر سر کے شاہسوار۔ سبز پوش خاتون۔ چار لمبے دانت (جن میں سے ایک کے چہرے سے خباثت ٹپکتی ہے) ساحل پر اکیلے رہنے والے دو مائی ہر جا کرتے ہیں۔ ان سب ہم زادوں کی تصدیق وقتاً فوقتاً مختلف ایسے لوگوں نے بھی کی ہے جن کو زیادہ دیانتدار کہا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں "آہ! ان پہاڑوں میں عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں۔ آپ کو جھیل میں جہاز چلنے کی آواز آئیگی۔ ایک ایسا خوبصورت جہاز جسے کوئی نہیں جانتا۔ اور جس وقت اسے دیکھا جاتا ہے تو وہ گم ہو جاتا ہے۔ گم کیا گھل جاتا ہے۔

ہاں ——— صرف ہم زاد ہی غائب نہیں ہوتے۔ لوگ بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ سر والٹر اسکاٹ نے لکھا ہے کہ ۱۳۰ سال پہلے آئیونا کی آبادی ۴۰۰ آدمیوں پر مشتمل تھی۔ ستر سال ہوئے یہاں ۲۴۳ آدمی رہ گئے۔ ۱۵ سال پہلے اس جگہ ۱۴۱ آدمی تھے۔ آج یہاں ستر سے زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ سکول میں صرف چار طالب علم ہیں اور وہ بھی تین جماعتوں میں۔ پہلی جماعت میں ۷ سال کا ایک بچہ ہے۔ دوسری میں نو سال کی دو لڑکیاں ہیں اور تیسری جماعت میں تیرہ سال کا ایک لڑکا ہے۔ میں نے لڑکے کو دیکھا ہے۔ اس کی آنکھیں نیلی اور چہرہ اور ٹانگیں ہوا اور بارش کی وجہ سے سرخ تھیں۔ وہ چار گائیں دودھ دوہنے کے لئے لیجا رہا تھا۔ آپ کہیں کہ یہ آئیونا کا قابل فرزند ہے کیونکہ وہ دودھ دوہ سکتا ہے۔ اسکاٹستانی زبان بول سکتا ہے اور جغرافیہ کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتا ہے (مجھے اس میں ملاح کی صفات نظر آتی تھیں) مگر افسوس اس کا تعلق رد رتھر گلن گلاسکو سے ہے۔

مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ گمرکے ہوئے اس کسان نے جس نے دوسری عالمگیر جنگ میں ہوم گارڈ کی کمان کی تھی اور جسے فوجی اعزازات کے ساتھ ایک جرمن ہوا باز کو دفنانا پڑا تھا کسی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ دفنانے کے صحیح طریقے کا علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ سخت ناراض تھا ہوم گارڈ کے ایک سپاہی نے اپنی بندوق پتھر کی دیوار پر رکھ دی تھی۔ لیکن جب سلامی کا فائر کرنے کا وقت آیا تو وہ اسے نہ مل سکی) اس کے علاوہ گمرکے ہوئے اس کسان نے مجھے بتایا "آئیونا میں ایک بھی نوجوان نہیں۔ پچھلے بیس سال سے یہاں کوئی شادی نہیں ہوئی۔" لیکن جب میں نے اس بات پر بھی حیرت ظاہر کی تو اس نے مجھے سمجھایا کہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو بھائی بہن اپنے چھوٹے سے کھیت پر کام کرتے کرتے جوان ہو جاتے ہیں۔ بہن اس لئے شادی نہیں کرتی کہ وہ اپنے بھائی کو کس پر چھوڑے۔ اور بھائی اس لئے شادی نہیں کرتا کہ شادی ہو جانے کے بعد اسے کھیت چھوڑنا پڑے گا۔ اس لئے کہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے دو عورتیں ایک ہی مکان میں نہیں رہ سکتیں اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ نئی آنے والی بیوی گھر کی مالکن بن جائے۔ جبکہ اس کے آنے سے پہلے بہن گھر کی مالکن رہ چکی ہو۔ چنانچہ بہن بھائی ساتھ ساتھ رہتے رہتے بڑھے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے بات خوص رکھتا ہو اور اس وقت تک شادی نہ کرے جب تک کہ وہ مر نہ جائے!

لے ستر آدمیوں کی آبادی! صرف چار طالب علموں کیلئے ایک سکول۔ ہندستان کو اس پر رشک کرنا چاہیئے۔

فرض کیجئے کہ ایسا ہی آدمی ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے جو دریا کے پار بارہ میل کے فاصلے پر رہتی ہے۔ یہ شخص ہفتہ میں ایک رات اپنی کشتی لیکر بارہ میل کا یہ فاصلہ طے کرتا ہے لیکن دوسرے دن صبح ۶ بجے تک اسے اپنے کھیت پر کام کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

کھیتوں پر کام کرنے والے یہ آزاد لوگ خواہ کتنے ہی غریب ہیں لیکن وہ صنعتی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑنا نہیں چاہتے اور جب وہ ہلکی صنعتیں قائم کی جائیں گی جن کے قیام کی بڑی خواہش پائی جاتی ہے تو بلاشبہ یہ ایک بڑا دقت طلب مسئلہ ہوگا۔

مجھے اسکائی کا ایک واقعہ یاد پڑتا ہے جہاں سولھویں اور سترھویں صدی کی لڑائیوں کے دوران میں ایڈنبرا کا ایک باقاعدہ گروہ اس جگہ کے علاقوں پر اپنے جھوٹے دعوے ثابت کرنے کے لئے کھیتوں پر کام کرنے والوں کو دھوکا دیکر اور انہیں کوئی نشہ آور چیز کھلا کر جہازوں پر بٹھا دور دراز ملکوں کو لے جاتا تھا اور اس دوران میں ان کی جھونپڑیوں کو آگ لگا دی جاتی تھی اور ان کی زمینیں چھڑا لی جاتی تھیں۔

اس سے بحث نہیں کہ یہ واقعات کہاں تک صحیح ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ اسکائی کے باشندے کئی بار پچھاڑے اور کچل لئے اور نہتا بیاں بچاتے ہوئے آئے ہیں اور انہوں نے زمینوں پر اپنے دعوے پیش کئے ہیں نئے مکانات کی بنیادیں رکھی ہیں اور ان مکانوں کو کافی سے زیادہ مکمل کر لیا ہے (ان میں بعض بالکل عمدہ نہ تھے) کہ قانون کے پنجے نے انہیں آ دبوچا۔ اور اس سے پہلے کہ انہوں نے ان علاقوں کی دو فصلیں بھی کھائی ہوں قانون اپنا کام انجام دے سکتا ہے۔

لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آئیونا کے لوگوں کی حالت کس قدر بہتر ہے۔ ان کے کھیتوں کی تعداد ایک درجن کے قریب ہے اور سیاحوں سے انہیں تھوڑے بہت پیسے بھی مل جاتے ہیں۔ یہاں کے وہ ۱۳ گھوڑے جو میں گن سکا ہوں اور بے شمار بھیڑ بکریاں کافی عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس چار میل لمبے جزیرے کے دونوں طرف لمبی اور پتلی مشترکہ چراگاہیں واقع ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ سے تباہ شدہ برطانیہ کے درمیان آئیونا اگر ہر اعتبار سے نہیں تو بعض لحاظ سے تو ضرور ایک چھوٹا سا نخلستان معلوم ہوتا ہے ایسے زمانے میں جبکہ برطانیہ میں دودھ کی اتنی قلت ہے ہمیں یہاں عمدہ سے عمدہ دودھ ملا دیہی نہیں بلکہ یہاں مکھن انڈے سب کچھ مل سکتے ہیں لیکن اگر آئیونا اور مل کے درمیان کی آبنائے میں جس میں سے آئیونا کے گھوڑوں اور دوسرے مویشیوں کو اکثر تیر کر آنا پڑتا ہے۔ طوفان آیا ہوا ہو تو ڈاک نہیں آتی۔

یہاں آنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باقی دنیا سے ہمارا تعلق منقطع ہو گیا ہے۔ [illegible] ناپید ہے۔ کچھ سال ہوئے آئیونا میں ایک گدھا لایا گیا تھا مگر اب یہاں کوئی گدھا نہیں پایا جاتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جب یہ گدھا یہاں پر آیا تو کالا پانی بیچنے کے گھونٹ سے گودی میں لپک پڑے۔ انہوں نے گدھا کبھی نہیں دیکھا تھا اور یہ ان کیلئے ایک بھوت سے کم نہ تھا۔ اسکے علاوہ گدھا بار برداری کے کام کے لئے بھی یہاں مفید ثابت نہ ہوا ممکن ہے سہمے ہوئے گھوڑوں نے گدھے کو بھی ڈرا دیا ہو۔

یہ باتیں دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے کی ہیں۔ جنگ کی وجہ سے یہاں بھی کچھ تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔ یہاں کے تقریباً ایک درجن نوجوان جنگ پر گئے تھے اور ان میں سے ابھی تک ایک بھی واپس نہیں آیا ہے۔ مجھے ایک دو ایسے جوانوں سے ملنے کا موقع ملا جو ساحل کی پاسبانی کرنے والے سپاہیوں کی خاکی جیکٹیں پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے آبنائے میں تیرتی ہوئی سرنگوں کو رائفلوں سے اڑانے کے واقعات بیان کئے۔ ہوم گارڈ کے بیس سپاہی صبح شام گشت لگاتے تھے۔ جنگ سے پہلے آئیونا میں ٹوئیڈ کی قسم کا کپڑا بننے کیلئے ایک ہی جلاہا تھا لیکن آج کل وہاں کوئی جلاہا نہیں۔ ایک بھورے رنگ کی چوکوشیہ بادبان والی کشتی کے بجائے اب ایک موٹر بوٹ مسافروں کو لاتی اور لے جاتی ہے۔ یہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد بہت کم ہے۔ گاؤں کا ایک ایسا قدرتی میدان جس سے بہتر میدان ملنا مشکل ہے یہاں بیکار پڑا ہے۔ اور کوئی کھیلنے والا موجود نہیں۔

پرانی گرجا کی مرمت کا کام جاری ہے۔ یہ گرجا یہاں کے ہی پتھروں سے بنا ہے اور وہ پتھر ایسے ہی بے ترتیب ہیں جو پتھر کی دیواروں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا رنگ گلابی اور ارغوانی ہے۔ گرجا کے صحن میں اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، ناروے اور فرانس کے بادشاہ دفن ہیں۔ یہاں ان کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ اور گھاس میں چھپے ہوئے قبروں پر لگے ہوئے پتھر ان کی تائید کرتے ہیں۔ یہیں یہاں پر اس جنگ کے بھی آثار پائے جاتے ہیں۔ ان پرانی قبروں سے تقریباً بیس گز کے فاصلہ پر ان گمنام تاجر ملاحوں کی قبریں ہیں جو سنہ ۱۹۴۰ء میں یہاں کنارے پر آ لگے تھے۔ دوسرے مقامات کی طرح آئیونا کی پرانی تاریخ اور جدید تاریخ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ وہ لوگ جو سائنس پر لعنت بھیجتے تھے اور انہیں شیطان کی آوازیں کہتے تھے اب ریڈیو سنتے ہیں۔ وہ لوگ جو آج کل ہر جھونپڑی میں پانی پہنچانے کیلئے پائپ لائن بچھا رہے ہیں۔ ان لوگوں کی یادگاروں کو دیکھتے ہیں جو ان سے ایک ہزار سال پہلے گزرے ہیں جہاں کبھی تیل کے لیمپ کے علاوہ کسی اور چیز کی روشنی نہیں ہوتی۔ اب بجلی کی روشنی ہونے والی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جو تبدیلیاں یہاں واقع ہو چکی ہیں یا آئندہ واقع ہونے والی ہیں انہوں نے خود یہاں کے رہنے والوں میں بہت کافی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

(از جناب ایم۔ اسلم)

جیل کے داروغہ کی بیوی کلثوم ایک بہت نیک اور رحمدل عورت تھی۔ جیل میں جو عورتیں قید ہوکر آتیں ان میں سے وہ کسی نہ کسی کو اپنے پاس بلالیتی۔ اور ہر وقت اس کوشش میں لگی رہتی کہ وہ جب جیل سے جائیں تو ان کا اخلاق سدھر جائے۔ بعض اوقات اسے ایسی عورتوں سے سابقہ پڑتا جو نیکی کا نام سننے سے بھی گریز کرتیں۔ اسی قسم کی عورتوں میں ایک زرینہ بھی تھی۔ زرینہ قوم کی پٹھان تھی۔ خاصی خوبصورت اور جوان عورت تھی۔ لیکن اُس کی ایک ایک بات ایک ایک حرکت صاف بتلاتی تھی کہ یہ نوجوان قیدن دُنیا کی بساط میں شطرنج کے اُس گھوڑے کی طرح ہے جو ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے۔

زرینہ کو جیل میں بہت روز ہو چکے تھے لیکن اس کا تقریباً تمام وقت داروغہ کی بیوی کے پاس ہی گذرتا۔ کلثوم کو اس سے بہت ہمدردی ہوگئی تھی۔ جسکی وجہ غالباً زرینہ کی جوانی تھی۔ گو کلثوم نے زرینہ سے یہ آج تک نہ پوچھا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں سزا ملی ہے۔ لیکن اُسے کسی وقت کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا کہ یہ قیدن بہت مصیبت زدہ ہے۔ کلثوم جب اُسے زندگی نیک بن کر گزارنے کی تاکید کرتی تو زرینہ خوب ہنستی۔

ایک روز زرینہ کسی بات پر ہنس کر بولی۔

"بی بی جی! معلوم ہوتا ہے آپ کو دُنیا کا کچھ تجربہ نہیں۔ آپ کی دُنیا تو بس آپ کا گھر ہے۔ وہی کنوئیں کے مینڈک والی بات! زمانے کی چکی ہر وقت چلتی رہتی ہے اور جو اس کی زد میں آتا ہے پس جاتا ہے لیکن وہ لوگ جو دُنیا اور دُنیا کے قوانین سے بغاوت کرتے ہیں کبھی گھاٹے میں نہیں رہتے۔ اور وہ لوگ جن کے نام سے بھی دُنیا والے بیزار رہتے ہیں ان کی زندگی دوسروں سے کچھ زیادہ ہی کامیاب ہوتی ہے۔ جو وقت مجھ پر ضائع کرتی ہیں کسی اور طرف توجہ کریں تو کچھ فائدہ بھی ہو۔"

زرینہ! "کلثوم نے جواب دیا۔" مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم پر کوئی ایسی اُفتاد پڑی جس سے تمہارا دل نیکی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ یا شاید تمہارے صاحب ہی کا خلل ہو۔ بہرکیف مصیبت ہو یا رنج و غم اس کا ایک ہی مداوا ہے۔ انسان خدا کو یاد کرے۔ خدا کی یاد سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔"

"واہ بی بی جی!" زرینہ نے ہنس کر کہا۔" اس خدا کو کیا یاد کرنا جو اپنے بندے کو ہی بھول جائے۔"

"استغفر اللہ! کلثوم بولی۔" زرینہ سوچو تو تم کیا کہہ رہی ہو۔ لیکن! خدا کبھی اپنے بندوں کو نہیں بھولتا۔ ہاں! قدرت کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔"

زرینہ بولی

"ممکن ہے کہ جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں وہ سچ ہو۔ لیکن میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ دُنیا تو محض اندھیر نگری ہے اور اس اندھیر نگری پر اگر دارائی اور حکومت ہے تو وہ ابلیس کی ہے۔"

"تو گویا!" کلثوم نے ہنس کر کہا۔" تمہیں بھی ابلیس کے نقش قدم پر چلنا پسند ہے۔ لیکن معلوم بھی ہے کہ ابلیس کے نقش قدم پر چلنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

"دوزخ ملے گا!" زرینہ نے جواب دیا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ دُنیا کے دوزخ سے کچھ زیادہ خوفناک نہ ہوگا۔"

کلثوم نے کہا

"اسی لئے تو مجھے یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ تم پر ضرور کوئی بپتا پڑی ہے جو تم خدا کی بھی منکر ہو۔ اور دُنیا سے بھی باغی ہو رہی ہو۔"

"نہیں بی بی جی!" زرینہ نے جواب دیا۔" میں خدا کی منکر نہیں میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ جو خدا اپنے بندے کو بھول جائے اُس خدا کو یاد کیا کرنا۔ رہی دُنیا! تو دنیا نے خود مجھے سرکشی کا راستہ دکھایا ہے۔"

"سنیئے میں آج آپ کو اپنی سرگذشت سناتی ہوں۔ لیکن یہ پہلے ہی بتائے دیتی ہوں کہ میری زندگی کے حالات اتنے گھناؤنے ہیں کہ آپ کو میرا اپنے پاس بیٹھنا بھی پسند نہ ہوگا۔ اور آپ کو میرے نام سے بھی نفرت آنے لگیگی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں قوم کی پٹھان ہوں۔ میرا باپ نسواڑی کی دکان کرتا تھا۔ میری عمر اٹھارہ انیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ماں کو مرے بہت روز ہو چکے تھے اور میرے باپ کو میری شادی کا فکر تھا۔ مشکل یہ تھی کہ شہر میں نہ کوئی ہماری برادری تھی نہ ہمارا لوگوں سے کچھ ایسا میل جول تھا۔ میرے باپ کا جن لوگوں سے میل جول کچھ زیادہ تھا وہ بھی ہمارے ہی ہم قوم تھے۔ ان میں سے

ایک شخص جعفر خاں بھی تھا۔ ... انیس سال کی ایک ... [illegible]

سا آدمی تھا لیکن لباس بہت عمدہ پہنتا۔ اور ہمارے ہاں بھی اکثر آیا جایا کرتا۔ مجھے اس شخص سے کچھ قدرتاً ہی نفرت رہتی اور جب وہ آتا میں عموماً اس سے الگ الگ رہتی۔ ایک روز میرے باپ نے مجھ سے کہا کہ جعفر خاں اپنے بھتیجے کے لئے میرا رشتہ مانگتا ہے۔ اس کے بھتیجے کا نام قاسم خاں تھا اور باپ نے مجھے بتلایا کہ قاسم بہت خوبصورت جوان آدمی ہے۔ اور اپنے چچا کے کاروبار میں اسکا ہاتھ بٹاتا ہے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ باپ کی باتوں سے یہ بھی میں نے جان لیا کہ وہ حامی بھر چکا ہے۔ اس خیال سے تو میں بھی خوش تھی کہ میرا ہونے والا شوہر ایک خوبصورت جوان آدمی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ تعجب بھی تھا کہ میرا باپ قاسم کے حالات سے ناواقف ہوتے ہوئے کس طرح میری شادی اس سے کرنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔ رہا جعفر بظاہر تو وہ شریف آدمی ہی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے متعلق بھی میرے باپ کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کا کیا کاروبار ہے۔ اور کس کینڈے کا آدمی ہے۔

بہرکیف! کچھ روز بعد میری شادی قاسم خاں سے ہوگئی۔ میں جب سسرال پہنچی تو یہاں دو تین عورتیں جن کے رنگ ڈھنگ سے مجھے کچھ بیباکی سی نظر آتی تھی میری پیشوائی کے لئے موجود تھیں۔ میں عصر کے بعد سسرال آئی تھی۔ اور یہ عورتیں شام ہوتے ہی وہاں سے چلی گئیں۔ گھر میں صرف ایک بڑھیا تھی جو نوکرانی معلوم ہوتی تھی۔ رات ہونے پر یہی بڑھیا مجھے حجلۂ عروسی میں لے گئی۔ اور قاسم کے آنے تک میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ جب قاسم آیا تو وہ بھی اٹھ کر چلی گئی۔ قاسم میرے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اور مجھ سے پیار و محبت کی باتیں کرنے لگا۔ میں بھی کسی وقت ہوں ہاں کردیتی یا اسکی باتوں پر ذرا مسکرا دیتی۔ بیٹھے بیٹھے جمائیاں آنے لگیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ زرینہ میں آج بہت تھک گیا ہوں مجھے تو اب نیند آرہی ہے۔ میرے خیال میں اب سوجانا چاہیئے۔

پلنگ کے پاس ہی ایک کرسی پر میرے شب باشی کا لباس رکھا تھا۔ میں نے جو ذرا کرسی کی طرف دیکھا تو وہ ہنس کر بولا۔ سمجھا! میرے سامنے لباس تبدیل کرتے تمہیں شرم آتی ہے۔ لیکن کب تک۔ لو! میں منہ پر لحاف ڈال لیتا ہوں تم لباس تبدیل کرلو۔ لیکن میں مسکرا کر خاموش ہورہی۔ "میں باہر چلا جاؤں" اس نے پوچھا۔ میں پھر مسکرا دی۔ "زرینہ جب تک تم ہاں نہیں کہوگی میں بھی باہر نہیں جانے کا۔" میں نے ہنستے ہنستے ہاں کہدیا۔ اور وہ اٹھکر باہر چلا گیا۔ میں نے پلنگ سے اٹھکر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ اور لباس تبدیل کرکے چپکے سے کنڈی کھول کر لحاف اوڑھکر لیٹ گئی۔ میرے لیٹتے ہی دروازہ کھلا۔ پھر دروازہ بند ہونے اور کنڈی لگانے کی آواز آئی۔ پھر کمرے میں اندھیرا ہوگیا۔ اور

اور وہ بیچاری ... [illegible]

جب میں بیدار ہوئی تو میرے شوہر کی جگہ جعفر خاں تھا۔ [illegible] ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے سینے میں چھری گھونپ دی ہے۔

"استغفراللہ!" بے اختیار کلثوم کے منہ سے نکلا۔ "توبہ ہے!"

"توبہ ابھی سے کیا؟" زرینہ نے کہا "صبر کیجئے ذرا۔ توبہ کے [illegible] ابھی آئیں گے۔ میں کوئی بچہ نہیں تھی۔ انیس سال کی جوان لڑکی تھی۔ مجھے اپنی بے آبروئی کا پورا پورا احساس تھا۔ ایک رات کی دلہن اور اس پر یہ مصیبت۔ خدا کی قسم! اگر اس وقت کوئی چھری یا چاقو میرے پاس ہوتا تو اس کافر کے سینے میں گھونپ دیتی۔ میں پلنگ سے اتری اور جلدی سے لباس تبدیل کیا۔ میں غصہ سے کانپ رہی تھی اور وہ مردود سو رہا تھا۔ اور تو کوئی چیز میرے پاس نہیں تھی وہی ایک کرسی تھی۔ بے اختیار میرا ہاتھ کرسی کی طرف اٹھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں کرسی اٹھاؤں جعفر مسکراتا ہوا اٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پلنگ کی طرف کھینچنے لگا۔ لیکن میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ کہنے لگا۔

"زرینہ غصہ تھوک دو اب! ادھر آؤ میرے پاس۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ نہ میرے آنسو نکلتے تھے نہ میں زبان سے کچھ کہتی تھی بس خشمگیں نگاہوں سے اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

"زرینہ! تمہیں شاید یہ تعجب ہو رہا ہے کہ قاسم کی بجائے میں اس وقت یہاں کیوں ہوں۔ زرینہ مجھے تو تم سے اس روز سے محبت ہے جس روز میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ اب جو ہونا تھا سو ہوچکا۔ آج سے تم میری ہو۔ اگر عقلمند ہو تو سوچ لو کہ غل مچانے سے اب کچھ نہ ہوگا۔"

میں نے لپک کر دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی میرا ارادہ تھا کہ اسی وقت اپنے باپ کے پاس چلی جاؤں۔ اور جو کچھ مجھ پر گزری ہے اس سے جاکر کہوں۔ لیکن باہر کا دروازہ بند تھا اور اس میں قفل پڑا ہوا تھا۔ جعفر بھی میرے پیچھے ہی آگیا اور بولا "زرینہ ہوش کرو۔"

"دروازہ کھولو!" میں نے غصہ سے کہا "میں اپنے گھر جاؤں گی۔"

"باپ کے پاس فریاد لیکر جاؤ گی" جعفر نے مسکرا کر کہا۔ لیکن ایک بات سن لو پہلے۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہ ہو۔ تمہارا باپ چونکہ سرکاری مال ہضم کرچکا ہے اگر میں ایک لفظ بھی کہدوں تو کم از کم سات سال کے لئے جیل بھیج دیا جائے۔ سن لیا۔"

اتنا کہکر جعفر نے چابی لگا کر قفل اتار دیا اور بولا

"دروازہ کھل گیا ہے جانا ہو تو چلی جاؤ۔"

"بی بی جی!" زرینہ آبدیدہ ہو کر بولی "میری اس وقت کی بے چارگی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی ہے۔ جعفر نے مجھے ڈرانے کو صرف دھمکی نہیں دی تھی۔ بلکہ اس نے جو کچھ کہا تھا [illegible] کہا تھا۔ اور مجھے بھی معلوم تھا کہ پولیس میرے باپ کی ٹوہ میں لگی رہتی ہے۔

میں [illegible] بیچارے کی گھڑی تھی اور غصہ کی جگہ ندامت اور رسوائی کے آنسو میری آنکھوں سے نکل رہے تھے۔ اور جعفر ایک چوکی پر خاموش بیٹھا تھا۔ اتنے میں اوپر سے قاسم بھی آ گیا۔ آتے ہی جعفر سے دست و گریبان ہو گیا دونوں گالیاں بکنے لگے اور دھینگا مشتی ہونے لگی۔ قاسم دبلا پتلا تھا اور جعفر طاقتور۔

جعفر نے اسے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا اور اس کا گلا دبوچ کر بولا۔

"اگر تم نے میرے متعلق کسی سے ایک لفظ بھی کہا تو تم دونوں کو ذبح کر ڈالوں گا۔"

شور و غل کی آواز سن کر وہ بڑھیا بھی جو غالباً اس وقت تک سوتی تھی آ گئی۔ اور قاسم غریب کی گلو خلاصی کروائی۔ اس بک بک جھک جھک سے مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ جعفر نے رات بہانے سے قاسم کو کوٹھری میں بند کر دیا تھا اور پچھلے وقت اس کا دروازہ کھول آیا تھا۔

قاسم غصہ سے بولا۔

"خیر! سمجھ لوں گا کسی وقت تم سے۔ زرینہ چلو! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

جعفر گرج کر بولا

"کس کی مجال ہے جو گھر سے قدم باہر نکالے۔"

"کون روکنے والا ہے ہمیں!" قاسم نے پوچھا۔

"میں!" جعفر نے جواب دیا۔ "جس نے تمہارے بیاہ پر دو ہزار روپے خرچ کئے ہیں۔ لاؤ میرے روپے دیدو اور بیوی کو لے جاؤ۔ لاؤ نکالو۔"

"دیدوں گا روپے بھی!" قاسم نے جواب دیا۔

اور جعفر بولا "تو جب تک روپے نہ دو گے زرینہ بھی نہیں جا سکتی۔"

بڑھیا میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر لے آئی۔ پھر قاسم بھی آ گیا اور وہ میرے پاس بیٹھ کر بالکل بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اللہ جانے بی بی جی اب مجھے اس کی بے دست و پائی پر اس وقت بہت ترس آیا۔ کچھ دیر بعد ہی کل والی دونوں عورتیں آ گئیں۔ جو بعد میں مجھے معلوم ہوا رنڈیاں تھیں۔ ان کے آتے ہی قاسم اٹھ کر چلا گیا۔ اور وہ دونوں مجھ سے بیہودہ مذاق کرنے لگیں۔ بڑھیا ناشتہ لے آئی اور [illegible] کے اصرار سے [illegible] نام کو کچھ کھا پی لیا۔ کھانا کھانے کے بعد یہ دونوں [illegible] گئیں۔ میرا ارادہ تھا کہ جب میرا باپ مجھے یہاں سے لے جائیگا تو پھر خواہ کچھ بھی ہو اس گھر میں کبھی قدم نہ رکھوں گی۔ میں تمام دن باپ کے آنے کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہ آیا۔ اسی طرح دو روز اور گذر گئے۔ وہ بڑھیا کم بخت کسی وقت قاسم اور مجھے تخلیہ میں بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقعہ نہ دیتی۔ اور رات کو جعفر کے پنجے میں گرفتار رہتی۔ تیسرے دن صبح صبح میرا باپ آیا۔ جعفر اور بڑھیا بھی ساتھ آ گئے ان دونوں نے مجھے باپ سے علیحدہ بیٹھ کر کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ اور وہ اللہ کا بندہ بھی کوئی بیس پچیس منٹ بیٹھ کر چلا گیا۔

بی بی جی! دعا کیجئے کہ کسی کی ماں نہ مرے۔ ماں ہوتی تو شاید میری شکل صورت دیکھ کر ہی اسے کچھ فکر ہوتا اور وہ مجھ سے خود پوچھتی۔ لیکن باپ کا برتاؤ دیکھ کر تو مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں ایک بوجھ تھی جو اس نے اتار پھینکا تھا۔ یا اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا تھا اور اب اسے مجھ سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ جا چکا تھا اور میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ مجھے جو کچھ کہنا تھا اس سے کہنا تھا سب کے سامنے کیوں نہ کہہ دیا۔ اس وقت میری زبان پر کچھ خاموشی کی مہر لگ گئی۔

میری شادی ہوئے ساتواں دن تھا کہ ایک روز قاسم نے مجھے بتایا کہ میرا باپ پولیس کے خوف سے شہر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ اس طرح میری رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔

مردانے میں صبح سے بہت رات گئے تک ٹکے سیر چھلی بکتی تھی۔ کیونکہ جعفر کا مکان جواریوں کا اڈا تھا۔ کبھی کبھی ناچ گانا بھی ہوا کرتا ——— پہلے دن کے واقعہ کے بعد قاسم اور جعفر ایک دوسرے سے شیر و شکر نظر آتے تھے۔ حالانکہ قاسم کو جب کبھی میرے پاس بیٹھنے کا موقع ملتا تو وہ جعفر کے خلاف بہت زہر اگلا کرتا۔ اور ہمیشہ اپنی بے بسی اور مجبوری کا مجھے یقین دلایا کرتا تھا۔ اور میں بھی اسے بالکل مجبور اور لاچار سمجھتی۔ وہ کبھی مجھ سے اختلاط بھی کرتا۔ کیونکہ بڑھیا اب ہمارے کسی کام میں دخل نہ دیتی تھی۔ لیکن ایک روز مجھ پر وہ خوفناک حقیقت بھی کھل گئی جس کے خیال یا تصور سے ایک جوان عورت موت کو زندگی پر ترجیح دیتی ہے۔ قاسم اس جوہر سے بالکل محروم تھا جس سے مرد مرد کہلاتا ہے۔ مردانے اور زنانے کے گھر سے دیوار بہ دیوار تھے اور دونوں کے درمیان صرف ایک ہی دروازہ تھا۔ ایک روز جعفر اور قاسم بیٹھے باتیں کر رہے تھے مجھے جو اپنے نام کی بھنک پڑی تو میں دروازہ سے کان لگا کر سننے لگی۔ اس روز دونوں میں جو دھینگا مشتی ہوئی تھی وہ محض ایک کھیل تھا جو مجھے دھوکا دینے کیلئے کھیلا گیا تھا۔ جعفر کے تو میں خون کی پیاسی تھی ہی لیکن اب مجھے قاسم سے بھی سخت نفرت ہو گئی۔ جعفر شراب پیتا تھا اور اکثر مجھے مارا پیٹتا۔ کچھ روز تو میں پٹتی رہی۔ آخر میں بھی پٹھان کی بیٹی تھی۔ میں بھی ہاتھ کا

جب ہاتھ سے اور لات کا لات سے دینے لگی۔ [illegible]

تھا نہیں بس سارا دن بیکار بیٹھی رہتی یا باورچی خانہ میں بڑھیا کے پاس جا بیٹھتی یہ بڑھیا بھی زبان کی میٹھی اور دل کی کھوٹی تھی۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگی۔

" زرینہ! کیا بنے گا تمہارا۔ اس جہنم میں کب تک پڑی رہو گی؟"

" جب تک خدا ڈالے رکھے گا" میں نے جواب دیا۔ " میری فریاد تو خدا سے ہی ہے۔"

بڑھیا بولی۔ "یوں کب تک گھٹ گھٹ کر مرو گی۔ کچھ تمہیں بھی ہاتھ پاؤں ہلانے چاہئیں۔"

" میں کیا ہاتھ پاؤں ہلا سکتی ہوں" میں نے جواب دیا

لیکن پیشتر اس کے کہ بڑھیا کچھ جواب دے قاسم آگیا اور مجھے علیحدہ بلا کر پوچھا۔

" بڑھیا تم سے کیا کہہ رہی تھی؟"

" تمہیں اس سے کیا؟" میں نے ذرا غصہ سے کہا۔

" کہیں اسکے بھترے میں نہ آجانا" قاسم بولا " مار آستین ہے یہ تو۔"

" اور تم؟" میں نے اسکی طرف حقارت اور نفرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ " نامرد بھی اور بے غیرت بھی۔"

آج پہلا روز تھا کہ میں نے قاسم سے اس طرح کہا۔

قاسم بولا " زرینہ بہت افسوس ہے۔ میری مجبوری جانتے ہوئے بھی مجھے الزام دے رہی ہو۔"

" مجبوری نہیں!" میں نے جواب دیا۔ " بے غیرتی کہو۔ تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟"

میں غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ میں نے جھپٹ کر قاسم کو پلنگ پر گرا لیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ کر پوچھا۔

" مردود سچ بتا تم نے مجھے کیوں دھوکا دیا۔ بول۔ ورنہ مار ڈالونگی ابھی۔"

" میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا" اُس نے گلے پر سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا " جو کچھ ہوا ہے اس کا ذمہ دار جعفر ہے۔"

" تو تم مجھے کسی اور جگہ کیوں نہیں لے چلتے" میں نے اُس کے گلے پر سے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

" کہاں لے چلوں؟" وہ اُٹھتے ہوئے بولا " تم جعفر کو نہیں جانتیں وہ ہمیں زندہ نہ چھوڑے گا۔"

" میں بھی پٹھان کی بیٹی ہوں" میں نے غصہ سے کہا " میں تم دونوں کو وہ

[illegible]

قاسم اُٹھ کر چلا گیا۔ اس واقعہ کے کچھ روز بعد قاسم میرے پاس آیا۔ رات کا وقت تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ " زرینہ! چلو جعفر نے تمہیں بلوایا ہے۔"

" کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

" بیٹھک میں دوستوں کے پاس بیٹھا ہے۔" قاسم نے جواب دیا۔

میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا جواب دوں کہ جعفر آگیا۔ اُس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ آتے ہی مجھے ایک لات مار کر بولا۔

" میں نے تمہیں بلایا تھا۔ آئی کیوں نہیں؟"

" میری مرضی!" میں نے بھی غصہ سے جواب دیا۔ " میں نہیں جاتی۔"

" جائے گا تو تیرا باپ بھی۔" جعفر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بیٹھک کی طرف کھینچنے لگا۔

میں نے اس زور سے اُس کے لات ماری کہ وہ لڑکھڑا کر گرا لیکن گرنے کے ساتھ ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور مجھے چوٹی سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ قاسم ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ جعفر غصہ سے بولا۔

" ابے کھڑا کیا تماشہ دیکھتا ہے پکڑ لے اسکی ٹانگیں۔"

میں جس قدر مزاحمت کر سکتی تھی میں نے کی۔ لیکن یہ دونوں مجھے کھینچ کھانچ کر لے ہی گئے۔ میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں تین چار آدمی بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے۔

جعفر بولا " زرینہ! ادھر آکر بیٹھ میرے پاس۔ اور ہم کو شراب پلا۔"

لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ اُٹھ کر مجھے مارنے لگا۔ " مت مارو۔ مت مارو۔" دو ایک نے کہا۔ مگر وہ کب ٹلنے والا تھا۔ میں نے لپک کر سوڈے والی بوتل اٹھالی اور اُس کے سر پر دے ماری۔ جعفر کا سر پھٹ گیا اور چکرا کر وہیں بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا۔ اور خون نکلنے لگا۔ میں اس وقت غصہ سے آگ بگولا ہو رہی تھی۔ میں نے ایک اور بوتل اٹھالی۔ لیکن قاسم نے میرے ہاتھ سے بوتل چھین لی۔ جعفر کے دوستوں میں سے ایک آدمی جس نے کوٹ پتلون پہن رکھا تھا اُٹھ کر میرے پاس آیا اور بولا۔

" زرینہ! ہاتھ تو دکھلاؤ ذرا۔ خون بہت نکل رہا ہے۔"

" ہٹ جاؤ تم۔" میں نے غصہ سے کہا۔

لیکن اس نے اپنا رومال پھاڑ کر پٹی بنائی اور پانی میں بھگو کر زخم پر باندھ دی۔ جعفر کا نشہ بھی غالباً کچھ اتر چکا تھا۔ بیٹھے بیٹھے بولا۔

"زرینہ! معلوم ہوتا ہے تمہاری قضا تمہارے سر پر کھیل رہی ہے"

"میں اکیلی نہیں مرونگی" میں نے بھی گرج کر جواب دیا۔ "تم بھی میرے ساتھ مرو گے۔"

جعفر! دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا تھا۔ ایک شخص اٹھکر اس کا زخم دیکھنے لگا۔ پھر کہنے لگا کہ زخم بہت گہرا معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھانا چاہیئے

جعفر بولا۔ "پٹی باندھ دو۔ ٹھیک ہو جائیگا۔"

قاسم ایک پھٹی ہوئی چادر اٹھالایا اور دونوں نے ملکر جعفر کے سر پر پٹی باندھ دی۔ میں بیٹھک سے نکلکر اپنی کوٹھری میں آگئی۔ اور اندر سے کنڈی لگاکر لیٹ رہی۔

اگلے روز قاسم سے مجھے معلوم ہوا کہ جعفر کے سر سے رات بھر خون نکلتا رہا ہے۔ اسلئے بہت تکلیف رہی ہے۔ صبح وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے زخم میں سے بوتل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکالا۔ اور جعفر سے کہا کہ دو تین روز پلنے جلنے نہیں میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ دو تین روز تو اس کافر کے گزند سے محفوظ ہونگی۔ کھانے کے وقت جب قاسم پھر مجھ سے ملا تو اس نے بتایا کہ جعفر کو بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔ اس طرح وہ دن بھی آرام سے گذر گیا۔ رات قاسم نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر جعفر کو دیکھنے آیا تھا۔ جعفر کا بخار ابھی تک نہیں اترا۔ بڑھیا دن بھر میں تین چار بار بیٹھک میں گئی۔ لیکن مجھ سے کوئی بات چیت نہ کی۔ اگلے روز میں کھانا کھانے کے بعد اپنی کوٹھری میں لیٹی تھی کہ بڑھیا آگئی اور میرے پاس پلنگ پر بیٹھکر بولی:۔

"زرینہ! تم چاہو تو آج قید سے نکل سکتی ہو۔"

میں نے تعجب سے اسکی طرف دیکھا۔ وہ کہنے لگی۔ "جس شخص نے تمہارے ہاتھ پر اپنا رومال پھاڑ کر باندھا تھا۔ اس کا نام مشرف ہے۔ مشرف بڑا بارسوخ آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اس کے ساتھ رہنا پسند کرو تو وہ ہر طرح سے تمہاری مدد کرے گا۔"

میں بلا سوچے سمجھے مشرف کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی۔ اور بڑھیا نے اسی رات کوئی بارہ بجے کے بعد مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ میں جب باہر نکلی تو گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک آدمی کہیں اندھیرے میں سے ہی میرے پاس آیا اور بولا کہ میرا نام مشرف ہے۔ میں فوراً اس کے ساتھ ہولی۔ گلی کے نکڑ پر تانگہ کھڑا تھا۔ ہم دونوں اس پر سوار ہو گئے اور مشرف مجھے اپنے مکان پر جو جعفر کے مکان کی طرح ایک غیر آباد گلی میں تھا لے آیا۔ مجھے مشرف کے پاس آئے پانچ سات روز ہوئے تھے۔ ایک روز میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جس روز اس نے مجھے پہلی بار دیکھا تھا اس نے اسی روز سے مجھے حاصل کرنے کی دل میں ٹھان لی تھی اور بڑھیا کو ہمراز بنانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ آخر پیسے کا لالچ بڑھیا کو ڈھب پر لے ہی آیا۔ میرا خیال تھا کہ مشرف مجھ سے شادی کرے گا لیکن مشرف تو جعفر سے بھی زیادہ ملعون اور پاجی نکلا۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ بڑے بڑے عہدہ داروں کو عورتیں مہیا کیا کرتا۔ اور یہاں آکر مجھ پر وہی مثل صادق آئی کہ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا۔ دونوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ جعفر جتنا تند مزاج اور سخت گیر آدمی تھا مشرف اتنا ہی زبان کا میٹھا اور چال سے کام لینے والا تھا۔ تو خیر! جو رسوائی میرے مقدر میں تھی یہاں بھی مجھے اٹھانی پڑی۔ اب آپ ایک روز کا واقعہ سنیئے۔ رات کا وقت تھا کوئی ایک بجا ہوگا مشرف کے ساتھ ایک شخص کے ہاں سے واپس آرہے تھے۔ گلی میں پہنچے تو یہاں بالکل اندھیرا تھا۔ مشرف آگے آگے تھا میں پیچھے پیچھے تھی۔ جب ہم مکان پر آئے تو مشرف نے ٹارچ روشن کر کے قفل کھولا۔ میں اندر چلی گئی۔ لیکن جب مشرف اندر داخل ہونے لگا تو کسی نے روک لیا۔ میں نے آواز پہچان لی۔ یہ جعفر تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ ہمارے پیچھے آیا ہے یا پہیں کہیں کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ جعفر اندر آنا چاہتا تھا۔ اور مشرف اسے دروازے پر ہی روک رہا تھا لیکن جعفر کسی نہ کسی طرح اندر آہی گیا۔ میں جلدی سے اپنے کمرے میں جو بالائی منزل پر تھا چلی گئی۔ اور اندر سے دروازہ بند کر کے ذرا سی کھڑکی کھول کر دیکھنے لگی۔ دونوں صحن میں کھڑے تھے۔ جعفر سے میرے ہی متعلق جھگڑا ہو رہا تھا جعفر چاہتا تھا کہ مجھے ساتھ لے جائے اور مشرف اس کے لئے تیار نہ تھا۔

جعفر کا لہجہ مصالحانہ تھا وہ اپنے احسانات گنوا رہا تھا اور مشرف اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ اور کبھی غصے سے دھمکیاں بھی دینے لگتا۔ اس وقت ہلکی ہلکی چاندنی پھیل رہی تھی۔ پہلے تو مجھے ان کے سایے ہی نظر آتے تھے لیکن اب صاف نظر آنے لگے۔ تو خیر بات بڑھتی گئی اور اب دونوں میں گالی گلوچ ہونے لگا۔ اچانک مشرف نے چاقو نکال لیا۔ جعفر بھی غالباً تیار ہو کر آیا تھا۔ دونوں کے چاقو بجلی کی طرح چاندنی میں چمکے۔ جعفر نے مشرف کے پیٹ میں چاقو مارا اور اسکی انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ اور وہ فرش پر اوندھے منہ گرا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ جعفر سنبھلے ایک اور آدمی ہاتھ میں چھری لئے جعفر پر جھپٹا اور چھری اس کے سینے میں گھونپ دی جعفر گھائل ہو کر گرا۔ یہ قاسم تھا۔ قاسم چپکے سے باہر نکل گیا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور سخت دہشت زدہ سی ہو رہی تھی۔ پڑوس والے بے خبر سوئے تھے۔ اسی وقت پہرہ دار گلی سے گذرتا تھا۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ایک دو آوازیں دیں۔ لیکن جب کچھ جواب نہ ملا تو وہ اندر آگیا۔ میں کھڑکی سے دیکھ رہی تھی صحن میں دو لاشیں دیکھکر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ اور پڑوس والوں کو آوازیں دیکر جگانے لگا تھوڑی دیر بعد پانچ سات آدمیوں کے ساتھ میرے مکان میں آیا اور پھر آواز دی۔

لیے کوئی گھر میں سے بھی باہر نہیں۔ لیکن میں نے پھر بھی [illegible]
پھر میاں جعفر اوپر آ گیا اور زور زور سے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا
آخر میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ آتے ہی کہنے لگا کہ تمہارے گھر میں دو خون بھی ہو گئے
اور تم مزے سے سو رہی ہو۔ میں اس کے ساتھ نیچے آ گئی۔ مشرت مر چکا تھا۔ جعفر
ابھی سانس لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس والے بھی آ گئے۔ جعفر اور مشرت
کو چارپائیوں پر ڈال کر مکان سے باہر لے گئے۔ پھر پولیس نے مجھ سے بھی چلنے کو
کہا۔ میں بھی دروازہ بند کر کے ساتھ ہو لی۔ یہ لوگ مجھے پولیس کی چوکی پر لے آئے۔
اور ایک سب انسپکٹر نے مجھے بیان لکھوانے کو کہا۔ میں نے کہا کہ جب مجھے کچھ معلوم
ہی نہیں تو میں کیا بتا سکتی ہوں۔ بہر کیف دو ایک باتیں جو بتانی ضروری تھیں وہ
میں نے بتا دیں۔ اس وقت چوکی کے گھڑیال نے تین بجائے۔ میں نے جب جانے
کی اجازت مانگی تو جواب ملا کہ مجھے ابھی گھر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ ایک
سپاہی مجھے اپنے ساتھ ایک مکان پر جو چوکی کے احاطے ہی میں تھا لے گیا۔ اور
یہاں وہی افسر بیٹھا تھا جس نے ابھی ابھی میرا بیان لکھا تھا۔ سپاہی تو مجھے چھوڑ
کر چلا گیا۔ اور میں صبح تک اس افسر کی ہوس رانیوں کا شکار بنی رہی۔ تین چار روز ان
لوگوں نے مجھے وہیں روکے رکھا۔ اور ان تین چار روز میں مجھ پر جو گذری اور جس جس طرح
ان لوگوں نے مجھے رسوا کیا اب آپ سے کیا عرض کروں۔ پولیس نے قاسم کو بھی
تفتیش کے دوران میں زیر حراست کر رکھا تھا۔ لیکن ہمیں ایک دوسرے سے بات
کرنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ آخر مجھے ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور یہاں
میں نے شادی کے روز سے اس خونی رات تک کے سب واقعات ترتیب وار
بیان کئے۔ اور وہ لوگ جن کے پاس مشرت مجھے لیجایا کرتا تھا ان میں سے جن
جن کے نام مجھے یاد تھے وہ بھی لکھوا دیئے۔ ان لوگوں میں کچھ سرکاری عہدہ دار بھی
تھے۔ میں نے عدالت سے خاص طور پر پولیس والوں کی دست درازیوں اور ظلم
کی فریاد کی۔ لیکن میرے پاس چونکہ کوئی ثبوت نہ تھا اس لئے کسی کے خلاف کوئی
کارروائی نہ کی گئی۔ ہاں! پولیس کا عہدہ دار میری وجہ سے بہت روز پریشان رہا
لیکن کچھ ثبوت نہ ہونے کے باعث اسکا بھی کچھ نہ بنا۔ رہا قاسم تو قاسم کا میں نے
دیدہ دانستہ نام نہ لیا۔ کیونکہ مجھے امید تھی کہ اب وہ ہمیشہ مجھ سے محبت کرے گا۔

آخر طویل پریشانیوں کے بعد ہمیں اس مصیبت سے نجات ملی۔ جب
ہم دونوں اطمینان سے بیٹھے تو میں نے قاسم سے کہا کہ جس وقت اس نے جعفر کو
گھائل کیا تھا میں دیکھ رہی تھی۔ یہ سنتے ہی قاسم کا رنگ اڑ گیا۔ لیکن وہ مسکرا کر
بولا" زرینہ! وہ تو میں نے اس کافر سے تمہارا انتقام لیا تھا۔ میں مسکرا کر خاموش
ہو رہی۔ چونکہ شہر میں سب پولیس والے میرے مخالف تھے اس لئے ہم دونوں
اختیار کر لی۔ لیکن گو میں ایک رنڈی سے بھی بدتر تھی [illegible]
یہ پیشہ اختیار کرنا مجھے پسند نہ تھا۔ ہم نے پان کی دکان کھول لی اور قاسم
نے وہیں قماربازی کا اڈا قائم کر لیا۔ کچھ روز اطمینان سے بسر ہوئے۔ لیکن اتفاق
سے وہی انسپکٹر یہاں تبدیل ہو کر آ گیا۔ ایک روز اتفاق سے اس نے مجھے
بھی دیکھ لیا۔ اب ہمارا اس جگہ رہنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ ادھر ہم یہ شہر
چھوڑنے کی فکر میں تھے ادھر اس انسپکٹر نے پے در پے دو تین مقدمے میں میرا
چالان کر دیا۔ آخر عدالت سے مجھے سزا ہو گئی۔ اور اب یہاں آپ کے پاس موجود
ہوں۔ بی بی جی! ذرا خیال تو فرمائیے کہ مجھ پر کیا کیا مصیبتیں پڑیں۔ لیکن کس لئے؟
محض میرے باپ کی وجہ سے جس نے دیدہ دانستہ مجھے اندھے کنوئیں میں گرا دیا۔
لیکن اکیلی میری ہی زندگی تباہ نہیں ہوئی بلکہ ایک مدت ان اخلاق سوختہ لوگوں میں
رہکر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے واقعات عموماً ہوتے رہتے ہیں۔ اور والدین کی
بے اعتنائی کی وجہ سے بیسیوں لڑکیوں کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

کلثوم یہ داستان سنکر سناٹے میں آ گئی اور دونوں کچھ دیر خاموش
بیٹھی رہیں۔ آخر کلثوم نے پوچھا" تو اب کیا سوچا تم نے؟"

زرینہ جس کا دل پیہم حوادثات اور مصائب کی وجہ سے غالباً سخت ہو گیا
تھا مسکرا کر بولی۔

"اب تو آخری سہارا یہ جیل کی کوٹھری ہی نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہاں اور
نہیں تو انسان کو دونوں وقت کھانا تو مل جاتا ہے۔ یہاں سے نکلوں گی تو پھر
وہی پہلے کرتب ہونگے۔ کیونکہ زندگی کے دن کاٹنے کی کوئی اور صورت بھی تو نظر
نہیں آتی۔"

"نہیں! نہیں!!" کلثوم بولی" اب تم نیک بنکر رہنے کی کوشش کرو اور
گناہوں سے توبہ کرو۔ خدا اپنے بندوں کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ اگر تم نیکی کا راستہ
اختیار کرو گی تو خدا بھی ضرور تم پر رحم کریگا۔"

"بی بی جی!" زرینہ آبدیدہ ہو کر بولی۔ مجھے یہ بتلائیے کہ میں نے کیا
جرم کیا تھا۔ کیا خطا کی تھی جسکی پاداش میں میری جوانی اور زندگی تباہ ہو گئی؟"

"زرینہ!" کلثوم نے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ خدا کا کوئی کام حکمت
سے خالی نہیں ہوتا۔ ہر تکلیف کے بعد راحت بھی ملی ہے۔ تمہیں دنیا کا کافی تجربہ
بھی ہو چکا ہے۔ غلط راہ پر چلنے کے نتائج بھی تم دیکھ چکی ہو۔ اب ان باتوں سے
توبہ کرو۔ خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگو۔ جس نے پیدا کیا ہے وہی سب کا رازق ہے۔
کیسے ہو سکتا ہے کہ اسکی بارگاہ سے اس کا کوئی بندہ محروم رہے۔ تم [illegible]

بہو گرنیک بن جاؤ گی اللہ تمہارے لئے کوئی بہتر صورت پیدا کرے گا"۔

زرینہ روپٹے سے آنسو پونچھ کر اور ایک لمبا سانس لے کر بولی۔

"بی بی جی! آپ جو کچھ فرماتی ہیں سب ٹھیک ہے۔ سچ ہے۔ لیکن میں اب اتنی دور جا چکی ہوں کہ واپس آنا میرے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔"

یہ کہکر وہ پھر رونے لگی۔ کلثوم بڑی محبت سے بولی۔

"زرینہ! انسان کو خدا کے فضل سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تمہارے آنسو بلا وجہ نہیں۔ یہ آنسو بہت مبارک ہیں۔ یہ آنسو اس بات کی دلیل ہیں کہ تمہارے دل میں نیک بن کر رہنے کی آرزو موجود ہے اور تمہیں اپنی ذلت اور بربادی کا احساس بھی ہے۔ تم فکر مت کرو! مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا انشاءاللہ تمہاری مدد کرونگی۔"

زرینہ اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سائے ڈھل چکے تھے۔ صحن میں جو پھولوں کے گملے رکھے تھے دو تین تتلیاں ان میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں اور فضا میں اداسی سی پھیل رہی تھی۔ +

اندھیرا

(از جناب تصدیق سہاوری)

یہ ایک سیدھی سچی کہانی ہے ـــــــ

گاؤں سے نکل کر جہاں دو پگڈنڈیاں مل جاتی ہیں وہاں ایک پرانی دھرم شالہ ہے۔ جس کے صحن میں پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ کیاریوں کے وسط میں ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ مندر کے نزدیک ایک پرانا کنواں ہے جس کے اندر دن کو بھی اندھیرا رہتا ہے۔ آموں کے قدیم درخت اس دھرم شالہ پر پتوں کا سایہ کئے رہتے ہیں۔ ایک وسیع میدان کے ایک کنارے پر یہ گاؤں ہے۔ اور دوسرے پر شہر۔ ان دونوں آبادیوں کے درمیان یہ دھرم شالہ واقع ہوئی ہے۔ یہاں کی صبح بہت دلکش اور شام بڑی سہانی ہوتی ہے۔

جمال پور کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ موہنی چمارن تھی۔ وہ چھ سال کی عمر میں بیاہ کر آئی۔ اور آٹھ برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالی گئیں۔ سر پر رنگین اوڑھنی کے عوض سفید چیتھڑا ڈال دیا گیا۔ وہ یہ تماشہ دیکھتی تھی مگر سمجھ نہ سکتی تھی۔ عورتوں نے جب چٹکیاں بھر بھر کے رونے پر مجبور کیا تو وہ آنسو بہانے لگی، اسے روتے وقت یہ خیال تک نہ ہوا کہ شوہر مرگیا ہے۔ وہ تو کھال کے پھٹ جانے اور زخم کے مچل جانے سے آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ گھونگھٹ نکالے رہتی تھی۔ یہ اس کی عادت ہوگئی تھی۔ ورنہ اس کے نزدیک سسرال اور میکہ ہم معنی تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میکہ اس کے دماغ میں مٹتے ہوئے نقش کے مانند تھا۔ جیسے ایک طالب علم کتابوں میں پڑھ کر تاج محل کا تصور قائم کرے۔ اس نے سنا تھا کہ باپ مرگیا، ماں شمشان بھومی میں پھونک دی گئی اور بھائی بہن کی سسرال میں پانی پینا بھی پاپ سمجھتے ہیں۔ اس کی دو جٹھانیاں، دو جیٹھ اور ایک سسر تھا۔ وہ صرف ان لوگوں کی گالیاں اور کبھی کبھی گھونسے اور لات ہی کو ماں باپ کا پیار اور سسرال کی آؤ بھگت سمجھتی تھی۔ اس نے کبھی یہ غور نہ کیا کہ دن رات میں ہزاروں دفعہ گالیاں، مارپیٹ، اور دھتکار کیوں پڑتی ہے۔ اس کی دنیا گھونگھٹ تک ہی محدود تھی جس کے باہر دیکھنا اس کے لئے جرم تھا۔ وہ تنہائی میں بھی گھونگھٹ بڑھائے رہتی اور سوتے وقت بھی منہ لپیٹ کر سو جاتی۔

جگیسر نے محنت مزدوری کے راستے کھول دیئے تھے۔ سسر کے حکم کے بموجب وہ بھی گھاس کھود کر شہر کی منڈی میں بیچنے جاتی۔ گاؤں کی بہت سی عورتیں صبح سے شام تک گھاس کی منڈی میں جایا کرتی تھیں۔ وہ کئی مہینے سے گھاس بیچ رہی تھی اور گھر میں اس کی آؤ بھگت بھی ہونے لگی تھی۔ وہ انہیں خوش کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ گھاس کھودنے کی کوشش کرتی اور اسی غرض سے اس نے دھرم شالہ کے نزدیک آموں کے باغ میں جانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے دن وہ کنوئیں میں جھانکی ـــــــ اس کی آنکھیں کنوئیں کے بھیانک اندھیرے کو دیکھ کر تلملا گئیں۔ اس نے گھبرا کر کنوئیں سے سر ہٹا لیا لیکن رفتہ رفتہ وہ اس اندھیرے سے مانوس ہوگئی۔ وہ گھنٹے ہی کنوئیں میں جھانکتی اور ایسا محسوس کرتی جیسے اندھیرا قہقہہ مار کر اسے خوش آمدید کہہ رہا ہے ـــــــ اسے یہ کنواں دھرم شالہ کے پھول اور مندر بہت بھلے لگتے۔ وہ کچھ اس طرح اس ماحول میں جذب ہو جاتی جیسے سسرال سے آ کر میکے کی سہیلیوں میں بیٹھی ہو۔ اس کے کام کی رفتار بڑھ جاتی اور وہ ہر روز بڑا سا گٹھا لیکر سب سے پہلے منڈی پہنچ جاتی۔

وہ کئی دن سے محسوس کر رہی تھی کہ ڈھلتے ہوئے سورج کی میٹھی چھاؤں میں جب بھورے بھورے بادل آسمان پر اٹھلاتے ہوئے چلتے ہیں تو دھرم شالہ میں غٹراتے ہوئے کبوتروں کی آواز اسے بہت پیاری لگتی ہے۔ بھورے بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھ کر اسے اپنے اعضا میں ترنگ محسوس ہوتی اور وہ چند لمحوں کے لئے کھرپی گھاس پر پھینک کر کنوئیں پر آ بیٹھتی۔ اب اکثر چلتے میں اس کا گھونگھٹ لہرانے لگتا تھا۔ اور میلے گھونگھٹ کے چھیدوں میں سے کچھ ہنستی ہوئی صورتیں نظر آ جاتی تھیں۔

گھاس کی منڈی خالی ہوتی جا رہی تھی اور اس کی گھاس نہ بکتی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ سورج کی کرنیں بھی دن بھر کی مشقت کے بعد تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں لیکن گھاس کا گٹھا ابھی تک سامنے رکھا تھا۔ اسے پہلے تعجب ہوا کرتا تھا کہ یہ شہر والے صرف گھاس کے اتنے پیسے کیوں دیتے ہیں پھر اس نے خود ہی نتیجہ نکال لیا کہ یہ لوگ نکمے ہوتے ہیں۔ گھاس کی کوئی قیمت نہیں صرف گھاس کھودنے کی قیمت ہے۔ مگر آج گھاس کے نہ بکنے پر اسے فکر تھی۔ گھر والے بھیڑیئے کی طرح جھپٹ کر اس کی مٹھی میں سے پیسے چھیننے کے عادی ہوگئے تھے۔ سر پر گھاس کا گٹھا دیکھ کر ممکن ہے جان سے مار ہی ڈالیں۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ایک ملائم آواز نے توڑ دیا ـــ

– "گھاس بکاؤ ہے؟ کیا لے گی؟"

"ڈیڑھ روپیہ"

یہ بیوپار کا گر ہے کہ دام بڑھا کر بتائے! تجربہ نے اسے یہ گر سکھا دیا تھا۔

گاہکوں کی حجت کرنے کی عادت ہی ہوتی ہے۔ لیکن آنے والے نے بغیر حجت کے سودا کر لیا ——

"منڈی کے موڑ تک لے چلو۔" گاہک بولا۔

"ہم نا جاتے بابو جی۔" موہنی نے جواب دیا۔

"صرف سڑک پہ پھینکنا ہے۔" اُس نے کہا۔

سڑک تک جانے میں کیا نقصان تھا، وہ اٹھی اور گھاس کا گٹھا سر پہ سنبھال لیا۔ چند قدم پر ایک سفید دروازے کے سامنے گھاس پھینک دی گئی۔

"تو روز ڈال جایا کر گھاس!" بابو جی کہنے لگے۔

"روز؟" اُس نے سوال کیا۔

اور معاملہ طے ہو گیا۔ اُس دن سے موہنی کی گھاس روزانہ بابو جی کے یہاں جانے لگی۔ بابو جی کی پریشانی بچ گئی اور موہنی کا انتظار مٹ گیا۔ اُسے بابو جی کی یہ بات بہت پسند تھی کہ وہ پیسہ دو پیسہ زیادہ ہی دیتے اور بابو جی اس لئے خوش تھے کہ گھاس خود اُن کے گھر پر آ جاتی ہے —— اور ایک دن تو وہ بابو جی کی بہت ہی شکر گزار معلوم ہوتی تھی جب وہ طبیعت خراب ہونے کے باعث بہت کم گھاس لائی اور بابو جی نے بہت زیادہ پیسے دیئے۔ اُس نے گھونگٹ کے ایک چھید میں سے بابو جی کی طرف پہلی دفعہ نظر ڈالی —— اُس نے دیکھا کہ ایک دیوتا اُس کے سامنے کھڑا ہے —— اُس کا گھونگٹ لہرانے لگا ——

بابو جی اُسے اتنے پیسے دیدیتے کہ وہ کبھی تیل کی جلیبیاں اور کبھی گُڑ چنے لیکر کھا لیتی۔ اُسے جلیبیوں سے اچھے گُڑ چنے لگتے۔ اور کبھی کبھی تو وہ پیٹ بھر کر کھا لیتی۔ گھر پر روٹی تک نہ کھاتی۔ سوکھی روٹیوں میں گُڑ چنے کا مزا کہاں تھا۔ لیکن جیٹھانیاں اُس کے روٹی نہ کھانے کو بھی قصور ٹھیرا دیتیں۔ اور طرح طرح کی جلی کٹی سناتیں۔

"کس سے آنکھ لگ گئی ہے۔ اب تو مال اُڑاتی ہے۔"

اُسے یہ بات بہت ناگوار معلوم ہوتی۔ وہ بہت سی باتیں غلط کہا کرتی تھیں مگر اُس نے کبھی تردید نہ کی۔ یہ بات اُس کے دل میں تیر کی طرح لگتی۔ وہ مردوں کی پرچھائیں سے بھی بچتی تھی۔ اُسے یوں بھی مردوں سے نفرت تھی۔ گاؤں کے چھوکرے جب فقرہ کستے تو اس کا دل چاہتا کہ گال پر ایسا تھپڑ دے کہ سارا گال لال ہو جائے اُس نے اپنی عمر میں صرف بابو جی سے دو ایک بات کی تھی۔ بابو جی تو بہت سیدھے انسان ہیں۔ یہ عورتیں کہیں سے بو سونگھ لیتی ہیں —— لے جیٹھانیوں کی یہ بات بُری لگتی تھی۔ جب اُسے کوئی بات بُری لگتی تو وہ رونے لگتی تھی اور رونا جیٹھانیوں کے لئے قصور کا حکم رکھتا تھا۔ وہ لات گھونسے پر اُتر آتی تھیں۔

"روٹی کھا لے ری!" ایک جیٹھانی بولی۔

"میں نا کھاؤں۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں خوب کھا کے آئی ہے۔ کوہو ڈھونڈ رکھا ہے کا؟" دوسری نے چٹکی لی۔

یہ سوال ہی اُسے رلانے کیلئے کافی تھا۔ اُس کا ایک آنسو نکلا اور جیٹھانی نے ایک گھونسہ جما یا۔ وہ بھی آج خوب رونا چاہتی تھی۔ چیخ مار کر رونے لگی۔ دو چار گھونسے اور پڑے۔ وہ مسلسل چیخیں مارنے لگی، ایک جیٹھ ذرا رحمدل تھا۔ وہ بیوی کو منع کرتا ہوا آگے بڑھا جیٹھانی کو اور موقع مل گیا۔

"میری سوت، یہ لے۔" ایک لات جما دی۔

اس جیٹھ کو موہنی بہت نیک جانتی تھی۔ وہ بھی کبھی پوچھ لیتا تھا۔ اسکی بیوی نے یہ سہارا بھی توڑ دیا۔ وہ اپنے میاں سے لڑ پڑی اور سارا قصور موہنی کے سر تھوپا۔ بہت رات گئے گھر والے سوئے۔ وہ جاگتی رہی، اُسکا سر چکراتا رہا۔ دوسرے دن اُسے ہلکا ہلکا بخار ہو گیا۔ اُس نے گھاس بھی برائے نام کھودی شہر جاتے جاتے بخار ہڈی ہڈی میں دوڑ گیا۔ جب اُس نے گٹھا دروازے کے سامنے پھینکا تو پیر کانپ رہے تھے ——

"کیا بات ہے؟" بابو جی نے پوچھا

"کچھ نا"

"تو کانپ رہی ہے۔" بابو جی نے ہمدردی سے کہا۔

اس کا کیا جواب تھا، واقعی وہ کانپ رہی تھی۔ وہ بجائے جواب دینے کے سڑک پر بیٹھ گئی۔

"بیمار ہے کیا؟" یہ الفاظ اُس نے پہلی دفعہ سُنے تھے۔ ورنہ وہ بیمار ہو کر اچھی بھی ہو جاتی تھی اور کوئی یہ بھی نہ جانتا تھا کہ وہ بیمار تھی

"دیکھوں!" بابو جی آگے بڑھ آئے اور کلائی پر انگلیاں رکھ دیں —— اُسے ایسا محسوس ہوا کہ بخار اور تیز ہو گیا۔

"ارے بڑا تیز بخار ہے!" بابو جی بولے "دوا لاتا ہوں"۔ وہ کچھ سوچ بھی نہ سکی اور بابو جی آ گئے۔

"دوا پی لے!"

"میں نا پیوں۔" اُس نے کہا۔

"پاگل —— پی بھی لے!"

"چلی —" اور بابوجی نے شیشے کا گلاس اسکے ہاتھوں میں پکڑا دیا
دوا کڑوی تھی مگر کتنی پُر اثر ——— رات بھر میں اس کا بخار
اُتر گیا۔ دوسرے دن اُس نے گھاس کا بڑا سا گٹھا بنایا۔ اُس نے ایسی ہمدردی
پہلی مرتبہ دیکھی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ ایسے دیوتا کے قدموں میں سب کچھ
ڈال دے ——— وہ گھاس کا گٹھا نذر کرنا چاہتی تھی ——— سیڑھی
چڑھتے ہوئے وہ بڑبڑائی
"آج پیسے نہیں لوں گی۔"
"تیری طبیعت خراب تھی۔ گھاس کیوں لائی" بابوجی دروازے پر
کھڑے تھے۔
"ویسے ہی" وہ چُپ ہو گئی۔
"پیسے لے؟" بابوجی نے پیسوں کو بڑھایا۔ مگر موہنی نے ہاتھ سمیٹ لئے۔
"پیسے نہیں لے گی؟" بابوجی نے مسکرا کر پوچھا۔
"ہونہہ"! اُس نے گردن ہلائی۔
"کھائے گی کیا؟" بابوجی نے اٹھلا کر پوچھا۔
"کچھ نا"
"کچھ تو لے"۔ بابوجی بولے۔ "گھر والے کیا کہیں گے!" بابوجی
نے پیسے پھر بڑھائے۔ اُس نے کچھ پیسے اُٹھا لئے۔
"بس"
"ارے اور لے!"
"نا"
"اچھا" بابوجی ہنس دیئے۔ "آٹھ آنے اور لے لے!"
"نا ——— نا ———"
اُسے آج ضد میں لُطف آ رہا تھا۔ اُس نے اپنا حکم آج تک کسی پر نہیں
چلایا تھا اور اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ ضد کرے۔ خواہ بعد میں گھر والے
کم پیسے دیکھ کر مار ہی ڈالیں ——— اس ضد کا نشہ اُس کے انگ انگ پر
چھایا ہوا تھا۔ بابوجی اندر جا کر دوا لے آئے۔ اور وہ بل کھاتی ہوئی دیکھتی رہی۔
اُس کے گھونگٹ کے ہر سوراخ میں سے بابوجی کی مورتی نظر آ رہی تھی ———
"دوا پی لے" اُنہوں نے چوکھٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سیڑھیاں
چڑھتی ہوئی چوکھٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔
وہ کئی دن تک بابوجی کے ہاتھوں سے دوا پیتی رہی ——— حالانکہ وہ
[illegible]
گھونگٹ اوپر اٹھ جاتا اور چوکھٹ کے سامنے صحن میں بیٹھی رہتی ——— وہ
اس پر بہت مہربان تھے اور وہ بھی بابوجی کو بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی
——— سسر اور جٹھانیوں کی شکایت کرتے وہ لیتے ہی کا بوجھ ہلکا کر لیتی
——— یہی نہیں۔ بلکہ بابوجی اُسے طرح طرح کی چیزیں کھانے کو دیتے
اور منتیں کر کے کھلاتے ——— ایسے کپڑے بھی لاتے جنہیں پہننے کا خواب
میں بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اُس نے ان کپڑوں کو بابوجی کے ہی گھر میں پہن کر اُتار دیا
——— پھر بھی وہ خوش تھی کہ اُس کی قسمت اتنی خراب نہیں کہ پھر کچھ بھی نہ
ملے۔ لیکن وہ عورت تھی اور بابوجی کے ہاتھوں اس کو جہاں عورت ہونے کا
سکھ ملا تھا وہاں سزا بھی مل گئی۔
اب وہ گھر والوں کی باتوں پر دھیان ہی نہ دیتی ——— لیکن ایک
دن وہ جٹھانی کی بات سُن کر چونک پڑی۔ اسکو معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی
ہے ——— اُسے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر اکثر ماں بننے کی خواہش ستایا
کرتی تھی ——— اس کا جی ماں بننے کیلئے بہت چاہتا تھا۔ آج اچانک یہ
سُن کر وہ پہلے تو خوش ہوئی۔ پھر اُس کے چہرے پر مُردنی چھا گئی جب
جٹھانیوں نے کہنا شروع کیا کہ اُس کے لئے ماں بننا برادری کی ناک کٹنا ہے۔
اور عورتیں بھی نہ جانے کیسے بھنک پا گئیں اور وہ بات جواب تک قصبہ میں تھی
پایۂ تحقیق تک پہنچ گئی۔ مختلف سوالات ہونے لگے۔
"اری بتا کہاں جاتی ہے؟" ایک نے پوچھا۔
"سسر میں کون ڈھونڈ لیا ہے؟" دوسری بولی۔
"گونگی کیوں بن گئی؟" تیسری تڑپ کر بولی۔
"تم کھوں کی اجت کھاک میں ملا دی۔" کئی آوازیں آئیں
"گلا گھونٹ دو۔" سسر نے کہا
"گڑ انسی پھیر دو۔" جیٹھ بولا۔
وہ بھوکی پیاسی ایک کونے میں پڑی پڑی کانپتی رہی۔ سورج
دیوتا کے غائب ہوتے ہی اُس نے سُنا کہ جیٹھ آیا ہے۔ اس کی ڈھارس
بندھ گئی۔ جیٹھ آخر جیٹھ ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ تعجب کے ملٹ آچکا تھا
اُس نے ابھی سُنا تھا اور ابھی وہ جیٹھ اندر آ گیا۔
"مار ڈالو حرام جادی کو۔ جیٹھ مت چھوڑو۔" وہ [illegible]
سہم گئی۔
"لے جاؤ اس گھر سے" جیٹھ بولا۔

"میں کیا کروں گا ——— گلا کاٹ دو۔" بھیا نے کراہ کر کہا۔
بھیا کو لوگ پکڑ کر لے گئے۔ آپس میں شور ہونے لگے۔ سب نے اسے تنہا
چھوڑ دیا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی اور دو ہاتھ کی کچی دیوار
پھاند کر بھاگ چلی۔ اس نے دھرم شالے کے کنوئیں پر دم لیا۔ سامنے شہر جانے
والی پگڈنڈی بسنتی کی مانگ کی طرح ہنس رہی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی پگڈنڈی پر
چلی ——— گاؤں کی منڈیر کے قریب بابوجی کا دروازہ امیدوں کے مندر کے
مانند چمک رہا تھا۔ اس نے کواڑوں پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک عورت کی آواز آئی۔

"بابوجی!" اس نے پھر پکارا۔

"کوئی عورت ہے۔" عورت بولی۔

"کوئی بھکارن ہے!" بابوجی کی گھبرائی ہوئی آواز نکلی۔

"اگلے دروازے پر جا۔" عورت بولی

"بابوجی!" موہنی نے پھر پکارا

"تمہیں جانتی ہے ———؟" عورت نے بابوجی سے پوچھا۔

"نہیں جی — بھگائے دیتا ہوں جاکر۔" بابوجی کے چلنے کی آواز
پیدا ہوئی۔

"تم کیوں جاتے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"ابھی آیا" ——— بابوجی باہر آگئے۔

"بابوجی!" موہنی کے منہ سے نکلا۔

"تو کہاں آمری ——— آج بھوجی آگئی ہیں۔"

"بھوجی ———!" موہنی نے حیرت سے دیکھا

"ہاں بھوجی ———" بابوجی نے کواڑ بند کر لئے۔

مکان کا سفید دروازہ موہنی کو سیاہ نظر آنے لگا۔ وہ کچھ نہ سوچ سکی
اور گاؤں کی طرف چل دی۔ قدموں کی چاپ بھی دل کی دھڑکن کو تیز کر دیتی۔
اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا جسم ایک بھاری بوجھ کے نیچے دب کر پھٹا جا رہا
ہے ——— وہ لڑکھڑاتی دھرم شالہ پہنچ گئی۔ سب کے اوپر کالی کالی چمگادڑیں
اڑ رہی تھیں۔ پھولوں کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ مندر کی مورتی نظر نہ آرہی تھی۔
اس نے گاؤں کی طرف دیکھا۔ بہت دور ایک لالٹین کی روشنی نقطے کے مانند چمکتی
معلوم ہوئی۔ وہ بڑبڑائی۔ بھیڑئیے آرہے ہیں۔ پھر اسے روشنی کے نقطے سے
خوف معلوم ہونے لگا ——— جیسے روشنی گھسیٹ کر ختم نہ ہونے والی تاریکی میں قید
کر دے گی۔ جہاں حقارت کی چٹکیاں اسکی شمع کھینچ لیں گی۔ وہ اس روشنی کو نزدیک
نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر روشنی ہر لمحہ اس سے قریب ہوتی جا رہی تھی ———
وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس نقطہ کی طرف نظریں گاڑھ دیں۔ جو ہر آن پھیلتا
جا رہا تھا۔ وہ جس قدر پھیلتا جاتا اس کے اعضاء میں رعشہ پیدا ہوتا جاتا ———
اب وہ روشنی کی حرکت بھی دیکھ سکتی تھی ——— اسے محسوس ہوا جیسے بھوکا شیر
شکار پر جھپٹ رہا ہے۔ اس نے پناہ ڈھونڈنے کے لئے اپنے چاروں طرف دیکھا ———
——— آموں کے درخت اسے پناہ نہ دے سکتے تھے۔ دھرم شالہ اس کی حفاظت
نہ کر سکتی تھی ——— ! مندر اس کی مدد سے قاصر تھا ——— صرف قدیم پختہ کنواں
اسے بچا سکتا تھا ——— اس نے کنوئیں میں جھانکا ——— اسکی نظر سیاہی میں
اترتی چلی گئی ——— یہ اندھیرا ماں کی آغوش کی طرح دلکش تھا ——— ایسا
عاشق دوست جو ہر دکھ سے نجات دلا سکتا ہو۔ اس کا خوف کم ہونے لگا۔ اور آہستہ
آہستہ سکون کے آثار پیدا ہو گئے ——— اس نے روشنی کو پھر دیکھا ——— حقارت
کی لہر اسکے چہرے پر دوڑ گئی ——— اس نے کنوئیں میں ایک دفعہ جھانکا اور اس
کے بازو جنبش میں آگئے جیسے کہیں دور سے آئی ہوئی سہیلی کو دیکھ لیا ہو۔ اور بازو
پھیلا کر وہ اس سے چمٹ جانا چاہتی ہو۔

برگد کی گھنی چھاؤں میں

(از جناب علیم پرویز بی اے)

یہ میرے خیالی جزیروں کی کہانی ہے۔

معاف کرنا نسیم! پچھلے دنوں میں تمہارے نزدیک ہوتے ہوئے بھی کافی دُور ہو گیا تھا۔ یہ شاید اس ذہنی فراری کی وجہ ہے جو اب بھی میرے دماغ میں بسی ہوئی ہے۔ سوچتا ہوں انسان کو زندگی کے عین منجدھار میں تیرنا چاہیئے۔ مگر اکثر میرا دماغ اس دنیا سے کوسوں دُور نکل جاتا ہے۔ حسن و شباب کی ان وادیوں میں جو سورج کی پہلی کرن کی طرح حسین ہیں۔ موجودہ نظام زندگی سے متنفر احساسات بھی دماغ کی پیروی کرتے ہیں اور وادیوں کی رنگینیوں اور لطافتوں میں پھنس کر دائمی طور سے ان کی گود میں پلنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ گریز بے بسی اور ناکامیوں کا نتیجہ ہو مگر انسانی عقل موجودہ ماحول سے اُکتا کر اس سے بہتر کوئی دوسری نجات کی راہ نکالنے سے قاصر ہے۔ زندگی کی تنگ راہوں پر چل رہا ہوں۔ لوگ مجھ کو دیوانہ اور پاگل سمجھ کر اپنی نگاہیں موڑ لیتے ہیں۔ اور میں ان تیرہ و تار راستوں کو طے کر کے اُفق سے بھی دُور نکل جانے کا عزم رکھتا ہوں۔ زندگی کے اہم مشاغل پر لوگوں کی تنگ نظری دیکھ کر میرا ذہنی انتشار بڑھ جاتا ہے۔ سوچتا ہوں کب تک ایسی ذلیل زندگی بسر کرونگا۔ اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالتا ہوں تو خوشیاں ہر وقت اُن کے چہرے سے پھوٹتی رہتی ہیں۔ ان کے تمام لمحات تیز و بلند قہقہوں میں سموئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنا سر تھام کر بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بلی اپنے پنجوں سے میرے دماغ کی رگیں سہلا رہی ہے۔ میری بیداریاں سینے میں طوفان کی شکل میں نمایاں ہوتی ہیں۔ کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر الفاظ میرے مدہم برہم سانسوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں ——— نسیمی کی فریب کاریوں کو جھٹلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب تو اس کا تصور کر کے میرے ماتھے پر شکن پڑ جاتے ہیں۔ اس کے گول چہرے پر سنجیدہ آنکھیں میرے لئے کوئی نمایاں خصوصیت نہیں رکھتی ہیں۔ اس کے شاداب لب اب مجھے تلخیوں کا احساس دلاتے ہیں۔ زندگی رنج و الم کے پل کھڑی ہے۔ اعصابی تھکن اور ذہنی جمود میں مبتلا ہوں۔ تیر چلانے کے ذہنوں میں ذہنی طور سے

کوئی اتنا بلند نہیں جو جھک کر کوئی نئی مشکل دکھا سکے۔ اس وقت بھی بمشکل اپنے منتشر خیالات کو اکٹھا کر رہا ہوں۔ دماغ نیم بیداری کے عالم میں کروٹیں لے رہا ہے۔ اور میں نیند کے شبستانوں میں گھوم رہا ہوں۔ یہ شاید برگد کی گھنی چھاؤں کا اثر ہے جس کے نیچے میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ سونمرگ سے کچھ روز ہوئے واپس آیا ہوں۔ وہاں تو زندگی مجھے ایک نئے روپ میں تھرکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سونمرگ کا نام تو شاید تم نے سنا ہوگا۔ وہاں پہنچ کر انسانی احساسات بھی بلند و برتر ہو جاتے ہیں۔ سونمرگ میں وہ فلک بوس عمارتیں اور چوڑی کشادہ سڑکیں نہیں ہیں جو تم بڑے شہروں میں دیکھتے ہو۔ یہاں کی آبادی عام طور سے غریب ہے اور کچے مکانات اور جھونپڑیاں اُنکی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ آبادی کا کچھ حصہ مفلسی کے باعث درختوں کے جھنڈوں میں بے سر و پا آباد ہیں۔ گرمیوں کے آغاز میں جب برف پگھلتی ہے تو یہ مصیبت زدہ لوگ اونچے پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں اور سردی کے شروع ہوتے ہی پھر ان درختوں کے نیچے اپنے گھر بنا لیتے ہیں۔ سونمرگ کے باشندے زیادہ تر گرمیوں میں کام کرنا پسند کرتے ہیں اور سردی میں بہت کم پیسہ کمانے کی غرض سے اپنے گھروں سے نکلتے ہیں۔ شاید اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ سردیوں میں کم لوگ اس مقام کو دیکھنے آتے ہیں۔ اور دوسری یہ کہ جاڑے کی سخت سردیوں میں وہ کام کرنا گوارا نہیں سمجھتے۔ مگر جاڑے میں وہ لوگ گھروں پر رہ کر بھی دلچسپ مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ دن چھپتے ہی گھر کے لوگ آگ کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ عورتیں شعلوں کی روشنی میں اُون کو صاف کرتی ہیں اور مرد اس اُون سے اپنے لئے موٹے اور بھدے شال وغیرہ بنتے ہیں کبھی کبھی پڑوس کی مرد اور عورتیں ہاتھ بٹانے کی غرض سے دوسرے گھروں میں چلی جاتی ہیں۔ الاؤ کا حلقہ زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اور اس حلقہ کے گرد بے شمار زندگیاں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے عورتوں کی رانوں پر سر رکھے سُرخ شعلوں کی تاب نہ لا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور اسی جگہ سو جاتے ہیں ——— نسیم! وہاں کی زندگی بہت معصوم سادہ اور بے نقاب ہے۔ وہاں کی عورتوں کا حسن کریم، سنو، لپ اسٹک اور نیل پالش کا محتاج نہیں ہے۔ اُن کے جسم پر شوخ اور بھڑکیلے کپڑے زیب نہیں دیتے۔ اُن کے لہجے میں کرختی اور روکھا پن نہیں ہے۔ وہ ہر اجنبی کی آؤ بھگت بہت ہی پُر تپاک طریقے سے کرتی ہیں۔ بعض اوقات جب مرد گھروں پر موجود نہیں ہوتے اور سیاح اُدھر نکل آتے ہیں تو وہ اُن سے نہایت گرمجوشی سے باتیں کرتی ہیں۔ شاید وہ سوچتی ہیں کہ یہ سیاحت کر کے جب اپنے گھروں کو لوٹیں گے

اور لوگ اُن کے دیس اور باشندوں کی رسموں اور خصلتوں کے متعلق پوچھیں گے تو ان کا تذکرہ سیارے ... شاندار الفاظ میں پیش کرینگے۔ اور غیر ملکی باشندوں کی نظروں میں ان کا دیس چڑھ جائیگا۔ ان کے بلند اخلاق اور عمدہ ذہنیت کی یہ ایک روشن دلیل ہے۔ تم کہوگے کہ میں اُن کی ناحق تعریف کر رہا ہوں مگر حقیقت تم ہی بتاؤ کیسے چھپائی جاسکتی ہے۔ سونمرگ پہنچ کر مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار سکون میسر تھا۔ مجھے احساس ہوتا تھا جیسے میرے کاندھوں سے منوں بوجھ اُتر گیا ہے۔ اور میں اپنے آپ کو ایک ایسے جہان میں خیال کرتا ہوں جہاں سرمایہ داری کے بھوت بھیانک قہقہے نہیں لگاتے۔ جہاں کی زمین غریبوں کے خون سے سیراب نہیں ہوتی۔ جہاں انسانیت اور روحانیت کا گلا نہیں گھونٹا جاتا۔ بلکہ اُس کے برخلاف سماج کے ہر فرد کو مساوی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ——— میں جانتا ہوں کہ تم بھی ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتے ہو مگر میرا مطلب مجموعی طور سے اُس جماعت سے ہے جسکی زندگی سیم وزر کے سایے میں گزرتی ہے۔ سونمرگ میں محبت بھی روحانیت سے لبریز نظر آتی ہے مگر وہاں کے رہنے والے اس امر سے قطعی ناآشنا ہیں۔ ذریعہ معاش کی فکر میں انہیں اس نظریہ کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔ سونمرگ کے چھوٹے بازاروں میں کشمیری بچے انڈوں کی ٹوکریاں لئے اکثر انگریزوں اور غیر ملکی لوگوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب سب انڈے بک جاتے ہیں تو وہ مارے خوشی کے گھر دوڑتے ہوئے جاتے ہیں اور انڈوں کی نئی ٹوکریاں لے آتے ہیں۔ وہ دن بھر اپنے تھکے تھکے قدموں سے اسی طرح انڈے بیچ کر اپنے ماں باپ کو خوش کرتے ہیں۔ سونمرگ کے اُتر میں شفتالو اور زردالو کے درخت دورویہ سڑک پر لگے ہوئے ہیں۔ درختوں کے پیچھے دھان کے زرد زرد کھیت ہیں۔ شام کے وقت اکثر اس سڑک پر انگریز گھوڑوں پہ سوار جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انکے پیچھے پہاڑی نوکر انگریزی بچوں کو لئے تیزی سے قدم اُٹھاتے ہیں۔ یہ سڑک پورب کی جانب خم کھا کر راگن نامی جھیل کے پاس سے گزرتی ہے۔ یہ جھیل بہت پرانی اور گہری ہے۔ اس کے دو طرف شمشاد کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اور بقیہ دونوں طرف بڑے بڑے کالے نیلے پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ گرمیوں میں جب پانی جھیل میں کافی مقدار میں آجاتا ہے تو وہ پتھر بھی ڈھک جاتے ہیں اور پانی پر کنول اور کمھن پیالے تیرتے رہتے ہیں۔ سونمرگ میں دن کا اکثر حصہ میں جھیل کے کنارے گزارتا تھا۔ راگن کے کنارے میں ایک کشمیری لڑکی سے ملا تھا۔ اسکے والدین مر چکے تھے اور قریبی اقارب نے اس سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ کی کئی زمینیں تھیں اور اُس کی گزراوقات صرف ان کی آمدنی پر ہوتی تھی۔ عزیز واقارب کی ناراضگی کی وجہ میں نے اس لڑکی سے کرید کرید کر پوچھی اور آخر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھی۔ اُس کے ماں باپ کی موجودگی میں اس کی شادی کہیں رشتے داروں میں طے ہوگئی تھی۔ مگر آخر میں کچھ خانگی معاملات کی بنا پر کچھ کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن جب تک اُسکے ماں باپ زندہ رہے یہ معاملہ دبا رہا اور اُن کے مرنے کے بعد اسکے رشتہ داروں نے اُس سے قطع ترک کردیا۔ اس کا نام پاردی تھا۔ دراصل پاردی ایک خوبصورت شگفتہ کلی کا نام ہے جو ڈنگ مرگ کے قریب کثرت سے دکھائی دیتا ہے۔ اسکی خوشبو بہت خیال انگیز ہوتی ہے۔ اور فی الحقیقت وہ لڑکی بھی پاردی کے پھول کی طرح حسین تھی۔ اس کی آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح تھیں اور اس کا جسم تو موسم بہار کی شفاف پرچھائیوں کی طرح حسین تھا۔ جس روز میں اس سے ملا تھا آسمان پر چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ اور ہم دونوں باتیں کرنے میں اس قدر مشغول رہے کہ دن کا نصف سے زیادہ حصہ گزر گیا

پاردی بولی ——— "مجھے تو بھوک لگی ہے۔"

"میرے پاس بھنا ہوا مرغ ہے۔" میں نے اطمینان بخش لہجے میں کہا۔

"اور میرے پاس اُبلے ہوئے چاول ہیں۔" پاردی نے آنکھوں کو گھما کر کہا۔

اس دن راگن کے کنارے ہمیں کھانے میں بیحد لطف آیا۔ سونمرگ میں جب تک میں ٹھیرا وہ لطف کبھی میسر نہیں ہوا۔ یا یوں کہو کہ پاردی کے حسن اور اسکے طرز بیان نے مجھکو بہت متاثر کیا تھا۔ پاردی کی آواز میں گرتے ہوئے آبشاروں کی آواز پنہاں تھی۔ اس کے خدوخال میں قدرتی رنگ بدرجۂ اتم بھرا ہوا تھا۔ اسکی جوانی اجتناب شکن تھی۔ حالانکہ میں نے سونمرگ میں دیگر لڑکیوں کو بھی دیکھا تھا۔ مگر جو حسن اور شگفتگی پاردی کے چہرے سے ٹپکتی تھی وہ کسی اور میں موجود نہ تھی ——— سونمرگ میں پورے پانچ سال بعد میں ہرنس سے ملا تھا۔ ہرنس سے تم بخوبی واقف ہوگے۔ اسکی صحت اب پہلے سے سنبھل گئی ہے۔ سری نگر میں رہتا ہے مگر اُن دنوں وہ اپنی بیوی کے ساتھ سونمرگ آیا ہوا تھا۔ اُسکی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ جس جگہ میں ٹھیرا ہوا تھا اس کے بالکل مقابل وہ دونوں رہتے تھے۔ تم جانو کہ نئی شادی کی بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ زیادہ تر وہ اپنا وقت چہل قدمی میں گذارتے تھے۔ میں انکی حرکات کو بخوبی اپنے کمرے سے دیکھ لیتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے ہر وقت اتنے

قریب بٹتے جیسے دل اور اس کی دھڑکنیں ——— ہرچنس نے مجھے ایک بار بتلایا تھا کہ اسکی بیوی میدانی علاقوں میں رہنا پسند کرتی ہے۔ تم سے بیٹے کے لئے بہت بے چین تھا۔ اب تم سمجھ گئے کہ یہ سب میرے اونچے اخلاق اور خاطر مدرات کا نتیجہ ہے۔ مگر میرے خیال میں تم یہ خیال کرکے غلطی کروگے۔ یہ چیزیں تو ہر کوئی آسانی مہیا کر سکتا ہے۔ مگر دل سے کسی کی قدردانی کرنا بہت مشکل ہے۔ میرے اس تجزیہ کا تم ضرور برا مانوگے۔ مگر مجھے اسکی بالکل پرواہ نہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خوف و ڈر سے کسی چیز کے برے پہلو نہیں بتاتے۔ تنقید ہمیشہ بیباک طریقے سے ہوتی ہے۔ سوسائٹی کے ہر فرد کو بہت قریب سے دیکھنا چاہئے۔ ڈودر تکرانسانی فطرت کا مطالعہ کرنا بیوقوفی ہے۔ سماج کے ہر فرد کی نبض پکڑ کر دیکھی جانے۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک رقص ہوتا ہے جس کے اندر میں ہر ایک کی حرکات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں۔ مرد اور عورت دونوں اپنے اصلی روپ میں برہنہ ناچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مجھے تو تم سے اب کئی چیزوں پر اختلاف سا ہوتا جا رہا ہے۔ تم کہتے تھے کہ انسانی محبت چاندنی سے بھری ہوئی راتوں میں جاگ اٹھتی ہے۔ مگر میری محبت تو اب تاریک اور اندھیری فضاؤں میں بھی بیدار ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک چاندنی اور اندھیری راتیں دونوں یکساں ہیں۔ دونوں میں مجھے دلکشی مجھکو نظر آتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اندھیری راتیں میری تکلیف دہ ساعتوں کو دوبارہ زندہ کر دیتی ہیں۔ اور میں ان میں بھی ایک لذت پاتا ہوں۔ اور چاندنی راتیں میرے دل میں پھر ایک بار نئی محبت کا جذبہ پیدا کر دیتی ہیں۔ یہ احساس ملا دیتی ہیں کہ محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی ہے۔ میرے اس خیال کی تصدیق ایک سن رسیدہ پہاڑی نے کی تھی۔ جب میں سونمرگ سے کچھ دنوں کے لئے رنگ پور گیا تھا۔ وہ تو کہتا تھا کہ محبت میں انسان کبھی نہیں تھکتا اور محبت کے جذبے کو وہ کھولتے ہوئے پانی سے تشبیہ دیتا تھا جو رگوں میں پہنچ کر ایک اضطرابی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ تمہیں کیا لکھوں کہ اس بوڑھے کی عمر کیا تھی۔ بس یہ جسم پر ایک ایک بال اس کا سفید ہو گیا تھا۔ اس کی نحیف ہڈیاں اس وقت بھی اس کی گزری ہوئی شان اور شوکت کو بتلا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کے ہر قدم پر اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر پھر بھی وہ جی رہا تھا ——— راتوں کو میں نے دیکھا کہ وہ سوتے میں بڑبڑایا کرتا تھا اور جس جگہ میں سوتا تھا وہ بمشکل بیس قدم پر ہوگی۔ نہ جانے کیا کیا وہ اپنے دل سے من گھڑت باتیں نکالتا تھا۔ رنگ پور کے نزدیک بہت سی آبشاریں ہیں۔ راتوں کی خاموش فضا میں گرتے پانی کی آواز مجھ کو کچھ ایسی سنائی دیتی تھی جیسے کہیں دور کوئی بوڑھا شخص بڑبڑا رہا

ہے۔ بعض اوقات تو مجھے کچھ عجیب سا خوف ہونے لگتا ——— لبوں سے نکل رہی ہے۔ بشیشے کی رنگ کی طرح اس کا چہرہ ہر وقت چمکتا ہوا نظر آتا تھا۔ بشیشے نے بچپن سے اپنے سینے میں بالیدہ جذبات پالے تھے وہ ہر وقت اپنی خیالی دنیا میں گم رہتا تھا۔ بشیشے میں خیال کا آدمی تھا کہ مستقبل میں شنے گیسوؤں کے جگمگاتے تارے اس زمین پر اتر آئیں گے اور بہت سی باتیں منکشف ہو جائے گی۔ اس بوڑھے کے اندر ہی میں کچھ بہتر قسم کی چیزوں کی ایک آمیزش دیکھتا تھا۔ رنگ پور سے جو سڑک پہلگام کی طرف نکل گئی ہے اسکے ایک طرف نرم رفتار ایک ندی بہتی ہے اور دوسری طرف بہت سارے کھیت ہیں۔ اس سڑک پر ہر گزرنے والے کی توجہ پہلے ان کھیتوں پر پڑتی ہے اور پھر ان گیتوں پر جو پہاڑی عورتیں کام کرنے کے دوران میں گاتی ہیں۔ یہ کھیت تقریباً سارے شرخ قطعے کے ہیں۔ ان کھیتوں کو دیکھ کر مجھے دھوکا ہوتا تھا کہ زمین اپنا جگر کھونے شرخ خون اگل رہی ہے۔ مجھے پہاڑی گیت سمجھنے کا بہت شوق تھا اور یہ مشکل بھی ڈھنگ سے گیت سن کر آسان ہو گئی۔ چاندنی رات میں ایک دفعہ جب میں سیر کی غرض سے نکلا تو میرا نوکر گھو جو اسی جگہ کا ایک باشندہ ہے میرے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ فضا میں مکمل خاموشی تھی۔ اور ہر چیز چاندنی کی ہلکی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ کہ یکایک میرے کانوں میں کہیں قریب سے گانے کی آواز آئی اور میری توجہات اکٹھی ہو کر اس موسیقی سے پر خیز آواز پر ٹھہر گئی۔ وہ گیت جیسے کچھ گانے کے بھی بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اور میری روح میں داخل ہو کر ایک عجیب گدگدی پیدا کر رہا تھا۔ گھو بولا ——— "آپ کیا سمجھے ہوں گے اسکو؟" اور میں نے جواب میں اپنا سر انکار کی صورت میں ہلا دیا۔ اور پھر اس نے اس گیت کا خلاصہ مجھے بتانا شروع کیا۔ گھو کہتا تھا کہ یہ گیت پریتم کی ناراضگی ظاہر کر رہا ہے۔ وہ بیچاری اکیلی تڑپ رہی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ بلبل بن کر اس کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے بغیر اسے زندگی کی ہر چیز پھیکی سی معلوم ہو رہی تھی۔ اسکی روح کی گہرائیوں میں رنج والم کے نشتر تیر رہے ہیں۔ اور اب بھی وہ ایک امید موہوم کا سہارا لئے جی رہی ہے۔ اس طرح گھو نے میرے سامنے ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کی تھی۔ گلمرگ پہنچ کر میری ملاقات ایک انگریز سے ہوئی جس کا نام مارگونا تھا۔ اس سے اکثر ہندوستان کی سیاست کے متعلق بحث چھڑ جاتی تھی۔ مارگونا کہتا تھا کہ ہندوستانیوں کا نعرۂ آزادی اپنی جگہ بالکل غلط ہے۔ وہ اسکی مثال اس خریدار سے دیتا تھا جسکی جیب پہلے سے خالی ہے اور وہ دوکان پر رکھی ہوئی چیزوں کے خریدنے کیلئے بیتاب ہے شاید اسکی مراد ہندوستانیوں کی نااہلیت سے تھی۔ اس کے کہنے کا مقصد وہ ذہنی

کو ہمیشہ اپنے حلقہ میں لیتا تھا۔ اس کی طبیعت عیاش پسند تھی۔ دنیا کی ہر
عورت اس کے نزدیک ایک مشترکہ چیز تھی۔ لیکن وطن وہ ایک انگریز
لڑکی فلس کے ساتھ اپنے دل کو بہلاتا تھا۔ محبت کے نام سے اسے چڑ تھی۔
گویا محبت کا وجود ماننے سے انکار کرتا تھا۔ وہ تو کہتا تھا کہ مجھے دنیا کے
ہر مرد اور عورت سے محبت بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس کے علاوہ مارکونا
ایک بہت آزاد خیال آدمی تھا۔ فلس کے سرخ ہونٹوں کو وہ بیباکانہ گلمرگ
کے بازاروں میں چوم لیتا تھا۔ کئی دن بعد میں نے اس کو ایک امریکن
لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھے شراب پی
رہے تھے۔ مارکونا کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور وہ بدمستی کے عالم میں
اپنے ہونٹ نئے چہرے پر رکھے ہوئے تھا۔ جب تک وہ گلمرگ میں رہا لوگوں
کی نگاہیں اس پر لگی رہتیں۔ اور اس کے جاتے ہی گلمرگ کے بازار اور
درختوں کے سائے اس کی بیہودہ حرکات سے محروم ہوگئے۔ مارکونا کا ذکر کر کے
مجھے محمد کیتیس کا خیال آجاتا ہے۔ اس نے بھی اپنی زندگی شراب میں غرق
کر رکھی ہے۔ کبھی پہلے اسی برگد کی چھاؤں میں شراب پیتا تھا۔ انشا سے
پہلی ملاقات بھی شاید اسی جگہ ہوئی تھی۔ کون خیال کرسکتا ہے کہ کیتیس
جیسا موٹا اور بھدا آدمی بھی محبت کرسکتا ہے۔ مگر اب تم اگر اسکو دیکھو
تو تعجب کروگے۔ اسکی عادات، اطوار اور طرز گفتگو بدل گئی ہے۔ انشا کی
حسن کاریوں نے اس کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا نقش ڈالا ہے۔ وہ
محبت کو زندگی کا ایک بہترین مشغلہ سمجھتا ہے۔ اور اس کے خیال میں ایک
بلند محبت وہی ہے جو آنسوؤں کے پردوں میں چھپی رہتی ہے۔ اب تو وہ جنوبی
ہند کے میدانوں میں اپنی رہی سہی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ درخت ان کی ملاقاتوں
کا مرکز بن چکا ہے۔ دراصل اس درخت کی آغوش میں ان کی محبت نے
آنکھ کھولی تھی۔ بظاہر تو اس کا سایہ دیکھ کر مجھے اب بھی دو دھڑکتے ہوئے
دلوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اس آواز کو سن کر میرے خیالات
پھر منتشر ہو رہے ہیں۔ میرا دماغی توازن پھر بگڑ رہا ہے۔ میں حیران
ہوں کہ میں تمہیں کس طرح سے اب تک لکھتا رہا ورنہ میری دماغی قوتیں تو کبھی
کی زائل ہو چکی ہیں۔ میرا ذہن حسین فریبوں میں مبتلا ہے۔ سوچ رہا تھا کہ یہ
گلمرگ کی گھنی چھاؤں ہے یا شمشاد کے جھرمٹ اور سبک ندیاں۔ جن میں راگنی
کے کنارے میں پہاڑوں سے ملا تھا۔ اپنی آنکھیں متعدد بار بند کر چکا ہوں۔ اور
جب میں سے چھٹکارا پاتا ہوں تو جب آنکھ کھول لیتا ہوں۔ دماغ پر کچھ عجیب غریب
قسم کے خیالات اس طرح اکٹھے ہو رہے ہیں جیسے آتش پر جلتی ہوئی سرخ لکیر ...

ایک دن — قوم کی نذر

(از محترمہ سلمیٰ رشید صدیقی)

یوں تو ذرا سیاست سے مجھے کم ہی دلچسپی رہی ہے یا یوں کہیے کہ کسی نے آج تک اس بارے میں ہمیں اپنی "ناچیز رائے" کے اظہار کا کوئی موقع ہی نہیں دیا تھا۔ لیکن ادھر جب سے جنرل الیکشن کا اعلان کیا گیا ہے ہمارے کالج میں یک بیک متعدد سیاست داں پیدا ہو گئے۔ اور "کشتِ ویران" سے "ناامیدی" کے بہت سارے امکانات ختم ہوتے نظر آرہے ہیں۔ کالج کے جس گوشے میں بھی چلے جایئے زوردار قسم کی بحث سنن لیجئے۔ تعجب تو ان نازک ادا خواتین کو دیکھکر ہوتا تھا جو فلمی گیت بعینہ ہیروئن کی طرح گنگنایا کرتی تھیں، اور اب سیاست کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کی کوشش میں ہمہ تن مشغول نظر آتی تھیں۔ ہر سمت "قائد اعظم" "مسلم لیگ" "آزاد" "گاندھی" اور "پاکستان" کے نام سنائی دینے لگے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی نئی پکچر کے آنے پر لڑکیوں پر اُس کے دیکھنے کی اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مثلاً سویرے کالج پہنچتے ہی سوالات کی بوچھاڑ اس طرح ہوتی ہے۔ "اے دیکھنا۔ ہم نے سنا ہے "نہوں" آگئی۔ اللہ! اتنی تعریف سنی ہے کہ کچھ بیان نہیں۔ "Dawn" میں وینا کو دیکھا؟ اُف! کس قدر "Sweet" لگ رہی ہے۔ بس غضب معلوم ہو رہی ہے"۔ اسی طرح جب سے الیکشن کا اعلان ہوا ہے — "ارے سنو۔ رات اسٹریچی ہال گئی تھیں؟ واہ خوب ہو! ایسے important لکچرز Miss کرتی ہو۔ سچ، کیا خوب Speech تھی نوابزادہ لیاقت علی خاں کی۔ بس سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ خوشی تو اس بات کی تھی کہ لڑکے خلافِ معمول بیحد اچھی طرح Behave کر رہے تھے۔ اس قدر sweetly بیٹھے رہے غریب بچے! جی ہاں: نوابزادہ نے ذرا تعریف کر دی تھی نا۔ بس یہی وجہ تھی — ورنہ قیامت آجاتی — خیر تو ہاں ایسی عمدہ عمدہ باتیں کہیں اُنہوں نے۔ لڑکوں سے کہنے لگے کہ خواہ آپ لوگوں کو اسال امتحان تک میں شامل نہ ہونا پڑے لیکن ووٹ (Vote) حاصل کرنے کے لئے آپ ضرور دورہ کیجئے"۔ سنا ہے چھٹیاں ہونگی۔ پھر تو بیحد مزا آئیگا۔ اور دیکھو ایسا تو ضرور ہونا چاہئے۔ یقیناً یونیورسٹی میں چھٹیاں ہونی چاہئیں جی ہاں! بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تمام اقوام آزادی حاصل کرنا چاہیں اور مسلمان بیچارے بس ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ پاکستان کا مطالبہ کیا غلط ہے آخر؟ آف قائد اعظم! مسلمانوں کا سچا ہیرا! واہ! ہم لوگ کیوں کسی سے پیچھے رہیں ہم خود ووٹ لینے شہروں اور دیہاتوں میں جائیں گے۔ خواہ ہمیں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔ اپنی قوم کے لئے تو جناب بڑی سے بڑی قربانی کرنی چاہیئے۔

دوسرے دن جب ہم کالج پہنچے تو معلوم ہوا کہ لڑکیوں کی درخواست پر پرنسپل نے اسکی اجازت دیدی ہے کہ وہ علی گڑھ کے شہر میں گروپس Groups کی صورت میں ووٹ لینے جائیں۔ اور ٹیچروں میں سے کوئی نہ کوئی اُن کے ہمراہ ضرور ہو۔ غرضیکہ اسی دن سے لڑکیاں شہر کے چکر لگانے لگیں۔ دوسرے ہی تیسرے دن سے ہمارا قومی فرض کا جذبہ ہمیں بھی اکسانے لگا کہ ہم بھی اس "مجاہدانہ شان" سے بازار جائیں۔ جیسے دوسری لڑکیاں جایا کرتی ہیں۔ لہٰذا ایک دن جب ذرا سویرے کالج پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج تھرڈ پیریڈ میں Test ہونے والا ہے اور — آپا نے کہا ہے کہ اب تک جتنا کچھ پڑھایا ہے اُس تمام میں سے ٹسٹ لیں گی — تو بس ہم گھبرا گئے۔ گھبرانے کی تو بات ہی تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ قومی خدمت کے جذبے نے ہم میں جنم لیا تھا۔ اس قدر غیر دلچسپ، غیر قومی اور غیر شاعرانہ بات سننے سے ہمیں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ لہٰذا فوراً ہی ہم نے خود کو شہر جانیوالے گروپ کے سامنے بحیثیت والنٹیر پیش کر دیا۔ ہماری خدمات قبول کر لی گئیں اور دوسرے ہی لمحے ہم چھ سات لڑکیاں کالے کالے برقعوں میں ملبوس کھٹارا تانگے پر سوار ہو کر شہر کی جانب چل دیئے۔ بازار میں ایک جگہ پہنچ کر تانگے کو رخصت کر دیا گیا۔ اور ہم لوگوں نے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو گائیڈ بنا لیا جو ہم سب کو کسی نئے قسم کا تماشہ سمجھکر ہمارے چاروں طرف گھیرا باندھے آگے، پیچھے ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے۔ لیکن اس بات کا تو ہمیں پہلے ہی بچوں کی مفلسی اور بیچارگی اور سڑک وغیرہ کی گندگی دیکھکر یقین ہو گیا تھا۔ سامنے ہی ایک مکان تھا۔ ہم نے اس میں داخل ہونا چاہا تو پہلے دو عدد بیلوں سے مٹھ بھیڑ ہوئی۔ جو دروازے کی زنجیر سے بندھے ہوئے اونگھ رہے تھے اور نیم وا دروازے میں سے وہ متعجب نگاہیں ہمیں بغور دیکھ رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے اور بیلوں سے بچتے بچاتے ہم دروازے تک پہنچے تو یکلخت ایک دھماکے سے دروازہ بند کر دیا گیا۔ اب ہم لوگ عجیب شش و پنج میں گرفتار تھے بچوں کی دوستی ایسے آڑے وقت میں کام آئی اور ان سب نے مل کر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ اس پر بھی خاموشی رہی تو ایک چھوٹا پھرتیلا سا بچہ بیل کی پشت پر چڑھکر گھر کے اندر کود گیا۔ اور اب ہم اپنے زبردستی کے میزبانوں کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ ہم سب پر مایوسی، افسوس اور ندامت کا غلبہ تھا۔ اور ہمارے میزبانوں پر شفقت

[illegible] اور [illegible] ایک دوسرے [illegible] سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر میں ایک خاتون آگے بڑھیں اور بولیں "لے لا بھی خوب ہے کہ بن بلائے مہمان۔ بیوی! سیر تفریح کا وقت تو اچھا نکالا ہو۔ لیکن ہم کام کاج کرنے والے آدمی ہیں۔ ہمارا وقت تو ضائع مت کرو۔ یہ تو بتاؤ ایسی ماری ماری کیوں پھر رہی ہو؟" ہم نے ٹوٹے پھوٹے اور بے ربط جملوں میں بتانا شروع کیا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کا الیکشن ہونے والا ہے اس میں ووٹ لئے جائیں گے اور چونکہ اب عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہے لہذا آپ لوگوں کے ووٹ کی ضرورت ہے۔ پہلے تو میزبان خواتین اپنے دوپٹوں میں منہ چھپاکر خوب ہنسیں پھر بولیں "یہ مسلم لیگ کیا ہوتی ہے؟" اس کی بھی تشریح کردی تو بولیں "تو یہ ووٹ کیوں چلاتی ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ پرچیاں پڑیں گی" ہم بھی بہت خوش کہ چلو مشکل آسان ہوئی۔ لہذا جلدی سے قلم سنبھالا اور نام پوچھا تو بولیں "واہ یہ بھی خوب ہے۔ ایسے ہی تھوڑی دیدیں گے نام۔" پھر ذرا سمجھا کر بولیں "بات یہ ہے کہ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے پرچیاں پڑی تھیں اور سب نے یوں کہا تھا کہ پرچیاں ڈالو گی اور بابو جی جیت جائیں گے تو تمہارے محلہ کی سڑک بنوا دینگے تمہیں اناج آسانی سے مل جایا کریگا۔ اور کپڑے پرسے کنٹرول اٹھ جائیگا۔ بہن بیوی! اب تک تو کچھ نہ ہوا۔ نہ تن کو کپڑا ملتا ہے نہ پیٹ کو روٹی۔" قصہ مختصر یہ کہ بڑی رد و قدح کے بعد انہوں نے اپنا نام لکھوایا۔ شوہر کا نام پوچھا تو خفا ہو کر بولیں "بی لو! اچھی ووٹ لینے کو آئیں کہ پچیس سال کا بندھا بندھایا نکاح ہی تڑوائے دیتی ہیں۔ تو میں ایسی بے غیرت نہیں ہوں کہ "ان کا" نام اپنی زبان سے نکالوں۔"

وہ یہ کہہ ہی رہی تھیں کہ دروازہ کھلا اور "ان کے" وہ "بڑی شان سے اندر داخل ہوئے۔ بیوی سے صورت حال دریافت کی تو انہوں نے ایک ہی سانس میں ہم سب کی شان نزولیت، موجودہ سیاست اور "ان" کے نام کی ضرورت پر ایک مختصر سی تقریر فرما دی۔ نیاز مند شوہر شریک زندگی کی چرب زبانی سے نہایت متاثر اور مرعوب نظر آرہے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنا نام خود بتایا۔ بیوی نے اس میں "صاحب" کا اضافہ کیا۔ اور ہم سب ہنسیوں سے الجھتے اور بچتے ہوئے —— دوسرے گھر میں نازل ہوگئے۔ اس گھر میں ہماری حسب توقع پذیرائی نہیں کی گئی۔ یعنی نہ کسی نے دروازہ بند کیا اور نہ ہی بن بلائے مہمان کا خطاب عطا فرمایا۔ سامنے کوئی نظر ہی نہیں آیا۔ جب ہم بالکل ہی اندر چلے گئے تو کمرے میں سے کسی کے کھانسنے اور کراہنے کی آواز آئی۔ ہم نے اندر جھانکا تو ایک ضعیف العمر مریض کو دیکھا جو کھانسی کی شدت سے بے حال تھا اسکی عمر کم از کم ستر سال کی تو ضرور ہی ہوگی۔ ہمارا اندازہ تو یہی تھا۔ مریض کو پنکھا جھلتے سے اٹھکر ایک لڑکی آئی —— کافی معقول اور معصوم سی!

[illegible] پچیس سال کی عمر ہوگی [illegible] سے کھڑی ہوگئی۔ ہم لوگوں نے خیال کیا کہ بیچاری مریض کی وجہ سے پریشان ہے۔ اس سے جب ہم نے ووٹ طلب کیا اور مسلم لیگ اور کانگریس کے بارے میں بتانا چاہا تو اس نے کہا کہ وہ الیکشن سے واقف ہے۔ اور ووٹ دینے کیلئے تیار ہے۔ اس نے انگوٹھے کا نشان نہیں کیا بلکہ خود اپنا نام لکھا اور ہمیں خلاف توقع اسکو لکھتے دیکھکر بڑی خوشی ہوئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ تعجب بھی۔ کیونکہ پورے شہر کا چکر کرنے پر بس یہی ایک عورت ایسی ملسکی تھی جو اپنا نام خود لکھ سکی۔ ہم سب اسکی شرافت سے بیحد متاثر ہوگئے اور ہمارے منہ سے غیر ارادی طور پر یہ دعا نکلی کہ "خدا آپ کے دادا جان کو جلد صحت عطا فرمائے تاکہ آپ کی پریشانی دور ہو۔" اس نے جھجھک کر سر اوپر اٹھایا اور بولی "وہ میرے دادا نہیں ہیں۔"

"پھر؟ پھر آخر کون ہیں؟ کون ہوسکتے ہیں؟" لیکن فوراً ہی معاملہ کی نزاکت کو محسوس کرکے ہم سب شرمندہ ہوگئے۔ آخر اپنی شرمندگی کو چھپاتے ہوئے پوچھا "تو آخر وہ کیا بیمار ہیں؟ اور کب سے بیمار ہیں؟" وہ بڑے مطمئن انداز سے بولی "خدانخواستہ وہ بیمار نہیں ہیں —— وہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں —— کم سے کم جب سے میں نے انہیں دیکھا [illegible]" لیکن اب وہ کچھ اداس سی نظر آنے لگی اور اس نے سر جھکا لیا شاید وہ اجنبی انسانوں کی موجودگی میں اپنے آنسوؤں کو رسوا کرنا چاہتی تھی —— اب کیا پوچھنے کی گنجائش اور کیا سننے کی تاب رہ گئی تھی۔ لہذا ہم فوراً اس گھر سے باہر نکل آئے۔

اب ہمارا سابقہ ایک ایسی معزز ہستی سے تھا جنہوں نے ہماری آمد کو مطلق اہمیت نہیں دی۔ وہ ٹاٹ کا ٹکڑا زمین پر بچھا کر اس طرح براجمان تھے گویا گوتم بدھ کی نقل کر رہے ہوں۔ ان کے سامنے چاہیوں کا ایک انبار تھا۔ اور وہ اسے گننے میں اس طرح مشغول تھے گویا سرحد و ملال و خوشی سے گذر چکے ہوں۔ انہوں نے جب ہمارا کوئی نوٹس نہیں لیا تو ہم ان کی خواتین سے مخاطب ہوئے اور آواز میں حد درجہ رقت پیدا کرکے نہایت دردناک پیرائے میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات مسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کشمکش اور مسلمانوں کے حقوق پر اظہار خیال کرنے لگے۔ خواتین ہر جملہ سنکر اپنے بزرگ کے چہرے سے اثرات کا جائزہ لیتیں۔ آخر جب بہت دیر ہوگئی تو ہم لوگوں نے بھی ان کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اب کی بار ہمیں ان کی ڈاڑھی بھی نظر آئی۔ اور عینک بھی: ان کی عینک اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے بیک وقت لال دھاگے "موم" اور ان کی بزرگ ناک" کی مرہون منت اور شکروں سے یکسر بے نیاز تھی!! اب انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور سخت ناگواری کا اظہار فیصلہ کن انداز میں اسطرح پیچ کرکیا "ارے جاؤ

اب آجاؤ۔ بس شکریہ یا ہم نے۔ ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے !!"

ہم نے بوڑھی کی بے ثباتی پر غور کرتے ہوئے ان خواتین سے پوچھا کہ آخر یہ اب تک اس قدر بہرہ کیسے کیسے ہے؟ پہلے بھی تو انہوں نے ہمیں آتے دیکھ لیا تھا اس وقت تو یہ کچھ نہیں بولے تھے۔ آخر اب اس قدر ناراض کیوں ہو رہے ہیں؟" معلوم ہوا کہ وہ ذرا اونچا سنتے ہیں۔ لہٰذا ہماری بیشتر گفتگو ان کے گوش گزار نہیں ہوئی اور ہمیں آتے جاتے وقت وہ دیکھ نہ سکے تھے کیونکہ ہم دائیں جانب کے دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ اور ـــــ ان کی داہنی آنکھ داغِ مفارقت دے چکی تھی۔

اب ہم ایک دوسرے محلے میں داخل ہوئے لیکن یہاں شاید ہماری آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی کیونکہ عورتیں اور بچے ہمیں دیکھنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ اور ہمیں پاگل اور بیوقوف سمجھ کر خوب خوب خوش ہو رہے تھے ـــ نہایت دلچسپ بات یہ تھی کہ جب ہم کسی دروازے کے سامنے سے نکلتے تھے تو نہ صرف بچے بلکہ بوڑھی بوڑھی عورتیں ہمارا مذاق اڑانا چاہتی تھیں۔ یعنی اپنے دوپٹوں میں منہ چھپا کر آواز دیتیں "آؤ۔ آؤ ووٹ لوگی۔ آؤ" اور جب ہم جا کر ووٹ طلب کرتے تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتیں۔ مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ یہ عورتیں بھی مذاق اڑانا جانتی ہیں اور پوری طرح سے ہماری موجودگی سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہیں۔ ایک گھر میں بہت ساری عورتیں جمع تھیں۔ ہم لوگ بے حد خوش ہوئے کہ چلو اتنی بہت ساری عورتیں ایک ہی جگہ مل گئیں۔ وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ کوئی تقریب ہے۔ خوب ڈھول بج رہا ہے اور سب مل کر گا رہی تھیں۔ خدا جانے کس طرح اتنے سے صحن میں سب سما گئی تھیں ـــــ لیکن صحن کے چھوٹے ہونے سے کیا ہوتا ہے دل میں جگہ ہونی چاہیئے۔ اور اس لحاظ سے وہ عورتیں نہایت وسیع القلب معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن اندر قدم رکھتے ہی ان سب نے بغیر ڈھول سے ہاتھ روکے ہمارا نیلی استقبال ان الفاظ میں شروع کیا: "ارے ارے خدا کے لئے باہر نکلو۔ آگئیں یہ کالی بلائیں شگون بگاڑنے۔" ہمارے کالے برقعوں کی مناسبت سے ہمیں "کالی بلائیں" کا خطاب کیا گیا تھا۔ پہلے تو ہم نے سمجھا کہ انہوں نے ڈھول پر اپنا کوئی گیت شروع کیا ہے۔ لیکن جب ہی ان کے تیور دیکھ کر ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ وہاں سے نکلے تو برابر کے گھر میں گھسے۔ وہاں ایک معزز خاتون صحن میں اپنا بکس کھولے بیٹھی تھیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسری معزز خاتون سے کسی خاص مسئلے پر نہایت تیز تیز تبادلۂ خیالات بھی فرما رہی تھیں ہمیں بڑی تیکھی نظروں سے دیکھا۔ اور بڑی بے تکلفی سے بولیں: "کہاں کسی

رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر آنے لگی وہ بنکی تو فرمانے لگیں: "ذرا بوڑھی بُوا تمہاری طرح آزاد تھوڑی ہوں کہ جہاں چاہے منہ اٹھائے چلی جاؤں۔ ہم تو شریف لوگ ہیں ہمیں تو اسی گھر میں مرنا کھپنا ہے۔ میں تو کہیں آجا بھی نہیں سکتی۔ مگر تمہاری طرح بوں گی کہ چلو ہمیں اور ساری پھوہڑ ... بس میرا بڑا تو مجھے کیا چاہیئے۔" بس کمبخت پوچھئے کیا حال ہوا ہمارا یہ سُن کر۔ سب اپنی اپنی جان بچا کر ان کے "آدم خور" شوہر کی آمد سے پہلے ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔

وہاں سے نکلے تو ٹھیک آٹھ کا وقت ہو گیا تھا۔ لہٰذا ہم نے ذرا جلدی جلدی چلنا شروع کیا۔ کچھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم ایک مکان میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی ایک خاتون تشریف فرما تھیں۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ فوراً ہی ذرا گھبرا کر چیخیں ان الفاظ میں کہ "ارے ارے ارے۔ بس بس بس۔ وہیں کھڑی رہو۔" اور پھر اپنے بچے کے ہاتھ سے ایک پتلی سی لکڑی لیکر ہمیں بیٹھے بیٹھے اس طرح ہلانا شروع کیا جیسے پچھلے زمانے کے استادوں کو مکتب میں بچوں کے سامنے کچھ اسی قسم کی حرکت کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اور پھر انہوں نے یہ گل افشانی کی کہ "خبردار جو آگے بڑھیں۔ اے میں پوچھتی ہوں تم کو میرے گھر کا راستہ کیسے معلوم ہو گیا؟ ابھی پرسوں آئیں تو کہنے لگیں کہ ہم بنگال کی مصیبت زدہ ہیں۔ تو بی بی کی مدد کی۔ اب آج پھر یہ قصے بن کر نازل ہو گئیں۔ ہم بھی بال بچوں والے ہیں۔ کہاں تک دے سکتے ہیں۔" جب ہم نے انہیں بتایا کہ بدقسمتی سے ہم مانگنے والیاں نہیں ہیں اور نہ ہی بنگال سے آئے ہیں۔ تو وہ ذرا متعجب ہوئیں اور پوچھنے لگیں "پھر کہاں سے آئی ہو؟" ہم نے سر جھکا کر مسکین شکل بنا کر کہا "کالج سے"۔ بس اتنا سننا تھا کہ قیامت آگئی۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بیٹھ گئیں: "ارے جب ہی تو میں کہوں۔ اے ہے تمہیں شرم نہیں آتی لڑکوں کے ساتھ پڑھتے ہوئے۔ جب ہی تو بیوی دیدوں کا پانی ڈھل گیا ـــــ لے بس جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ تو بہتر ہے۔ میرے منے کے ابا تو ایسی عورتوں سے بھی پردہ کرواتے ہیں۔" خیریت ہوئی کہ منے کے ابا ہی باہر گئے ہوئے تھے۔ "منے کے والد" میں کچھ دیر تک تو بحث ہوتی رہی۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اب کی بار وہ اپنا نام بتانے پر راضی ہو گئیں اور ان کے بزرگ باہر تشریف لے گئے! جب ان سے شوہر کا نام پوچھا تو انہوں نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اور دوسری خاتون سے بولیں: "اے بتلاؤ نا ان کا نام صاحب میں کیسے بتاؤں؟" ان خاتون نے بہت دیر کمسایا کرنے کے بعد نام بتایا۔ ہم لوگوں نے جلدی سے لکھ لیا کہ یک لخت منے کی والدہ چیخیں "نوج یہ کیا نام بتا دیا ـــــ یہ تو میرے جیٹھ کا نام ہے!!" اور اندر کر کے اور جیٹھ

ہم معلوم کر کے جب ہم لوگ چلنے لگے تو ایک بار پھر لکار اٹھیں " اے بیوی! ہم تو لٹے جاتی ہے۔ اللہ رسول کا واسطہ کچھ مدد کرنا ——— نہیں تو اللہ جانتا ہے حشر میں دامنگیر ہونگی " ہم سب نے ان کی تشفی کر کے اور اپنے اپنے دامن سمیٹ کر جلدی سے باہر نکلے کہ کہیں جانے کس وقت ان کی نیت بدل جائے اور بجائے حشر کے وہ ابھی ہمارے دامنگیر ہو جائیں ——— اور یہ ان سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔

اب ہم جس محلہ میں گئے اس کا نام "بھوکی سرائے" تھا۔ اور شاید اس آبادی کا نام اس سے زیادہ موزوں اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کسی نے کس قدر سوچ کر یہ نام رکھا تھا۔ لیکن سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس محلہ میں آکر اس نام سے زیادہ موزوں نام اور کس کے ذہن میں آسکتا ہے۔ واقعی، یہاں بھوکی مخلوق آباد تھی۔ ایسی گنجان اور غلیظ جگہ پر بھی انسان رہتے ہیں؟ رہ سکتے ہیں؟ یہ سوچ کر میرا جی متلا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اپنی خود غرضی پر خود لعنت بھیجنے کو جی چاہنے لگا۔ کسی طرح میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ ان سے کچھ طلب کیا جائے خواہ وہ محض "ووٹ" ہی کیوں نہ ہو۔ اور جب ہم نے کوشش کر کے اپنا سوال ان کے سامنے دہرایا تو جیسے ان کی آنکھیں تعجب اور حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ان کی نظریں صاف کہہ رہی تھیں "ہم سے کسی چیز کی ضرورت ہے؟ تم ہم سے کسی چیز کی طالب ہو؟ یہ کیونکر ممکن ہے؟ ہمارے کان اس سوال سے ناآشنا ہیں۔ یہ کیسا دھوکا ہو رہا ہے تمہیں۔ یہ کیسا مذاق ہے ——— اور ہم سے مذاق کا کون سا موقع ہے ———" ہم نے جیسے ان کے دل کی کہانی سن لی ———

انسانی زندگی ایسی بے رونق ایسی زبوں اور اس قدر ناخوشگوار حالت میں آج تک دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آج زندگی کی حقیقت بے نقاب ہو گئی ہو۔ "حقیقت تلخ ہوتی ہے" یہ سنا ضرور تھا۔ لیکن اس درجہ "تلخ" ہوتی ہے اس کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ افسانوں اور کہانیوں میں زندگی کی حقیقت کی داستانیں بارہا پڑھی تھیں۔ مفلسی کے قصے اکثر سنے تھے۔ اکثر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر زندگی کے ٹھوس واقعات پر بحث بھی کی تھی ——— لیکن وہ سب جیسے جھوٹ اور تصنع تھا۔ انسانی تہذیب کا ملمع جیسے آج اتر گیا تھا۔ یہ انسان ہیں؟ انسان؟ جنہیں سانس لینے کے لئے صاف ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پیٹ بھرنے کی بھی! انسان! جسے آزادی حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور جینے کی تمنا بھی! یہ انسان بھی جی رہے ہیں، جینا چاہتے ہیں اور موت سے ڈرتے ہیں۔ موت سے! جو انہیں اس زندگی سے نجات دلا سکے گی۔ ہمیشہ کے لئے ——— !! لیکن یہ باتیں سوچنے کا وقت ہرگز نہیں ہے۔ اور نہ ان کے لئے یہ باتیں "مجذوب کی بڑ" یا کسی دیوانے کی بکواس سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ یقیناً اپنی زندگی سے خوش اور اپنی حالت سے مطمئن ہیں۔ ان کی آنکھوں سے زندگی کی چمک اور رونق ختم ہو گئی تو کیا غم۔ ان کے دل تو جینے کی آرزو سے لبریز ہیں۔ ان کو تازہ اور صاف ہوا میسر نہیں تو کیا ہوا۔ ان کو خوش ہونے کے مواقع دنیا نہیں دیتی تو کیا فکر۔ وہ ان چیزوں کی پرواہ ہی کب کرتے ہیں۔ وہ صرف زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ زندہ رہتے ہیں ——— اور اسے ہی قسمت کا بڑا احسان سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی اسی نرد و جواہر اور تہذیب سے محروم دنیا میں اپنی خوشی اور اپنے سکون کے لئے جگہ نکال لی ہے۔ ان کی سب سے شادمان دنیا ت ہیں۔ لاتعداد آرزوئیں ہیں اور وہ یقیناً دنیا میں اپنے وجود کی ضرورت شدید ترین طور پر محسوس کرتے ہیں ——— !!

اب رات ہو چلی تھی۔ لہذا ہم نے گھر جانے کی ٹھانی طبیعت کچھ عجیب پژمردہ سی ہو رہی تھی۔ اور بھوک سے عجیب حال ہو رہا تھا۔ کھانے وغیرہ کے بعد یونہی "فروزاں" اٹھا لی۔ تو اس میں سب سے پہلے جن اشعار پر نظر پڑی وہ یہ تھے

افلاس کا پُر ہول نظارہ دیکھ
بیگانگیٔ دہر کا مارا دیکھ
آنکھوں میں نہاں جذبۂ فولاد شکن
پلکوں پہ لرزتا ہوا تارا دیکھ

(جذبی)

مسٹر ایچ۔ پی۔ مودی سابق ممبر ایگزیکٹیو کونسل کا مشورہ

جنگ ختم ہو چکی ہے۔ جنگ کی گرانی کی وجہ سے ہر چیز کے دام چڑھے ہوئے تھے اب امن کا زمانہ آگیا ہے وہ کارخانے جو جنگ کے دوران میں فوج کی امداد کیلئے سامان تیار کیا کرتے تھے اب عوام کی ضروریات کے لئے سامان تیار کرینگے۔ لازمی طور پر چڑھی ہوئی قیمتیں گریں گی۔ یہ وقت روپیہ بیکار ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ جمع کرنے کا ہے۔ گھر پر روپیہ رکھنے سے چوری ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ سونا چاندی یا جائداد خرید لینے سے قیمتیں گرنے پر آدھی سے بھی کم رقم رہ جائیگی۔ روپیہ کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ مندرجہ ذیل مدوں میں روپیہ لگانا ہے :-

- ★ بیمہ پالیسی
- ★ امداد باہمی کی انجمنیں
- ★ بنک کا سیونگ کھاتہ
- ★ ڈاکخانہ کا سیونگ کھاتہ
- ★ سرکاری قرضے
- ★ نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ
- ★ وکٹری بانڈز

روپیہ بچایئے

اور

ہوشیاری سے خرچ کیجئے

فیلڈ پبلسٹی بیورو دہلی نے شائع کیا

پھول بھی رخصت بو بھی "رخصت"

(از محترمہ اختر جہاں بیگم صاحبہ)

میں تو سمجھتی تھی کہ تم مجھے ہمیشہ اسی طرح ستاتی رہوگی۔ کھلکھلاتے ہونٹوں کی پنکھڑیاں بکھرنے والی نہیں۔ وقت کی سوئی سانسوں کے موتیوں کو ایک لڑی میں پروتی چلی جائے گی۔ اور تمہارے گیت —— اس قدر مختصر کیوں تھے؟ تم نے مجھے جی بھر کے ستایا بھی نہیں۔ جھلملاہٹوں کے کچے دھاگے ٹوٹ گئے۔ سورج نکلا ہی تھا کہ بدلی آئی اور کائنات کا چہرہ پھیکا پڑ گیا جیسے صبح کی پہلی مسکراہٹ چہچہوں کو سمیٹ کر آنچل میں گم ہو جاتی ہے ۔۔۔۔۔

احباب! تمہارے بعد بھی یہاں وہی چہل پہل ہے۔ فضاؤں میں گرمیوں کی بکھرتی ہوئی عیدیں اب بھی آتی ہیں۔ نیلگوں آسمان پر چاند کی ریشمی کرنیں اب بھی اپنا سنہرا آنچل لہراتی ہیں۔ اور یہ نیلے سمندر میں بہتے ہوئے روشن کنول —— یہ فردوسی چراغاں —— لیکن تم ان سب ہنگاموں سے بے خبر ہو۔ کیا اچھا ہوتا جو تم بھی زندگی کی راہ پر ہمارے ساتھ ساتھ چلتیں۔ دنیا کا تغیر تمہیں بھی منتخب کرتا۔ زندگی کی سنگینیوں سے لطف اندوز ہوتیں۔ تلخیاں بھی چکھتیں۔ تمہاری ننھی منی سی دنیا میں یہ چاند ابھی تک محض "چندا ماموں" ہی تھا اور یہ کائنات ایک بکھری ہوئی لیکن مبہم سی "سوچ" ایک مختصر سی حیرت جو چہچہوں میں بدل لیتی ہی "ابدی" نیند سو گئی۔

تمہارے مختصر چہچہوں کی صدائے بازگشت ابھی معدوم نہیں ہوئی۔ کیا اچھا ہوتا جو تمہاری یادیں ماضی کے آنچل میں سمٹ سکیں۔ ماضی کے سینے پر یہ گھاؤ گہرا ہوتا جائے۔ یہاں تک کہ اس پر وقت کا مرہم بھی کارگر نہ ہو سکے۔ میں اسی لئے ان خراشوں کو تصور کے نشتر سے کریدتی ہوں۔ لیکن وقت کی آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسو ان کو بھی اپنے ساتھ بہائے جانا چاہتے ہیں میں گھبرا گھبرا کر ان کا دامن تھام لیتی ہوں۔ اگر یہ کھو گئے تو —— اس اندیشے سے میرا دل دھڑکنے لگتا ہے —— یہ وقت بھی کس قدر بے درد ہے۔ —— مجھے اس سے قطعی شکایت نہ ہوتی اگر یہ گزرتا چلا جاتا لیکن مجھے وہیں چھوڑ دیتا جہاں سے تم نے مجھے وداع کیا تھا۔

یوں تو میں نے تمہیں بارہا دیکھا تھا لیکن اس خیال سے نہیں کہ تمہاری عمر کی نس بہت جلد چٹخنے والی ہے۔ اگر پتہ ہوتا تو تمہارا ایک ایک نقش اپنے تصور میں کندہ کر لیتی جسے وقت کا ظالم نشتر بھی نہ کھرچ سکتا تھا —— تمہاری تصویر —— یہ بے جان عکس!! —— لیکن تم میرے تصور میں زندہ ہو۔ یہ بے حس و حرکت نقوش تو مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمہارا ہر عضو بے حس ہو چکا ہے۔ ننھے منے شگفتہ لب ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے سرد ہو چکے ہیں۔ نیلی نیلی جھیلوں میں ہلکورے کھاتے ہوئے روشن ستاروں پر تمہاری بوجھل پلکیں لڑکھڑا کر گر پڑی ہیں ہمیشہ کے لئے!! مسکراہٹوں کا اجالا آنکھوں کا جھلملاتا تموج باتوں کی رسیلی لچک کو موت نے تھپک دیا ہے۔ ابدی خاموشی میں بدل ڈالا ہے —— یہ تصویر میرے تصور کو بے جان کر دیتی ہے —— لیکن تم زندہ ہو جب تک میرے تخیل میں جان ہے۔

اس روز کھانا کھاتے ہوئے تم مجھے نہ جانے کیوں مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ لیکن میں لاپرواہی سے کھانا کھاتی رہی۔ تم میرے تجاہل عارفانہ پر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ "کیا بات ہے؟" میں دانستہ چونک کر پوچھا۔ "خوب! ——" نہ جانے کس طنز سے کہا تم بڑی دیر تک میرے ہنسنے پر مسکراتی رہیں۔

ایک دن تم مغرب کی اذان سن کر وضو کے لئے دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بھاگیں اور جلدی جلدی وضو کر کے میرے پاس جانماز بچھائی اور نیت باندھ لی۔ میں چپ چاپ لیٹی تمہیں تک رہی تھی۔ تمہارا بھولا بھولا چہرہ، ننھے منے سے ملتے ہوئے لب۔ جھکی ہوئی نظریں —— تم نماز پڑھتے وقت کس قدر معصوم نظر آرہی تھیں —— یکایک نماز پڑھتے پڑھتے تمہاری نظریں غیر ارادی طور پر میری طرف اٹھ گئیں۔ نظریں چار ہوتے ہی میں کھلکھلا کر ہنس دی۔ اور تم نے کھسیانے پن سے گردن جھکا کر ہونٹ بھینچ لئے۔ اسی طرح جب دعا کے لئے تمہارے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے تم نے مجھے کو گڑیا پھاڑتے دیکھا۔ اسی وقت دعا قبول کرا کے دھمکانے لگیں۔ اور ہم سب بڑی دیر تک تمہارا مذاق اڑاتے رہے۔

وہی گانا "رک نہ سکو تو جاؤ" کئی بار تم نے اور میں نے مل کر گایا تھا تقریباً روزانہ تمہاری گڑیا اور ان کے کپڑے میرے کمرے میں بکھرے رہتے تھے۔ کتابوں کی اور کمرے کی بے ترتیبی پر میں جھنجھلا جاتی۔ میرے جھنجھلانے پر تم ہنس دیتیں اور میں دانت پیستی ہوئی تمہارے چپت جمانے دوڑتی تو تم کمروں میں چکر دلاتے دلاتے مجھے ہرا دیتیں —— اور اب میرے

کمرے کی صفائی، کتابوں کی ترتیب ـــــ کچھ بھی تو نہیں کرتی ہے میری بیٹیا

ہے کتابیں بکھیر ڈالوں۔ پھر ویسی دھما چوکڑی مچاؤں۔ تمہاری گڑیا، چھوٹا سا ساز و سامان ـــ ننھے منے کھیل تمہارے لئے چشم براہ ہیں ـــــ لیکن یہ نہ جذبات میرے خیالات کے ساتھ ساتھ نہیں گھٹتے۔ تمہارے شگفتہ نقوش پر سرد سرد ویرانیاں چھا جاتی ہیں۔ میرا دل نشی جیسے خنک بوجھ میں دفن ہوتا چلا جاتا ہے اور تمہارا کھلکھلاتا تصور افسردگی سے سر ڈھلکا لیتا ہے۔ ساکت لب ـــــ بند آنکھیں!!
کاش اس سے زیادہ مجھ میں سوچنے کی سکت نہ رہا کرے۔
کبھی کبھی تو مجھے عجیب عجیب خیالات آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تم ابھی کمرے کا پردہ ہٹا کر اچھلتی، کودتی، گنگناتی آجاؤ گی۔ بعض دفعہ تو میں سچ مچ چونک پڑتی ہوں۔ کس قدر احمقانہ امید ہے۔ تم بھلا آسکتی ہو؟ لیکن اس امید کو کیسے چھوڑوں؟ ـــــ مجھے یقین ہے تم کبھی نہ کبھی ملوگی! ضرور ملوگی؟ میں تمہیں مجسم دیکھونگی۔ تمہاری نکھری نکھری چمکیلی آنکھیں۔ بھولا بھالا چہرہ۔ ننھے منے لبوں پر کھیلتی ہوئی معصوم مسکراہٹ! تمہارے ہر نقش میں زندگی سرایت کر جائے گی۔

لیکن کب؟ جب میرا جسم بے جان ہو جائے گا۔ وقت کا کرخت ہاتھ میرے تصور سے رنگ کا قطرہ قطرہ نچوڑ لے گا۔ پھر نظریں صبح و شام کی مسافت طے کرتے کرتے تھک کر گر پڑی ہوں گی۔ جب میری زندگی گہری دھند بن کر کائنات پر چھا جائے گی۔ اس وقت شاید تمہارے خیالات تصورات مجسم ہو جائیں۔ لیکن کیا پتہ؟ اگر تخیل کے سنسان کھنڈروں میں ٹمٹماتا ہوا ننھا سا کنول سراب ہے! ـــــ تو میں شاید اس دنیا کو چھوڑنا کبھی نہ چاہونگی۔ تمہاری کتاب زندگی کے کچھ اوراق" کی گردانی ان کی تحریروں میں از سر نو رنگ بھرنا ـــــ کاش میرا شغل اسی تک محدود ہو جائے ـــــ اب تو تمہیں میرا احساس بھی نہیں چھو سکتا ـــــ تمہارے ننھے منے احساس سے ٹکرائی ہوئی یہ کائنات۔ تمہارے ننھے خیالات سے چھوئے ہوئے احساسات ہی میرا سرمایہ ہیں۔ یہ اس وقت تک رہیں گے جب تک کہ میرے تصور میں رنگ اور ذہن میں سوچنے کی سکت باقی ہے ـــــ

بچوں کا صفحہ

از فیروز الدین احمد

شہنشاہ اکبر کی بہادری

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اکبر کا ایک پیارا ہاتھی مست ہو گیا۔ بہت سارے لوگ اسے پکڑنے کو بھاگے۔ لیکن ہاتھی کو نہیں پکڑ سکے جب اکبر کو یہ خبر پہنچی تو وہ ایک چھجے پر چڑھ گیا اور جب ہاتھی ادھر کی طرف بھاگا تو وہ چھجے پر سے عین ہاتھی کے سر پر کود پڑا۔ لوگوں نے غل مچایا کہ دیو قبضہ میں آ گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا ایک واقعہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی فوج دہلی جا رہی تھی۔ راستے میں ایک دریا پڑتا تھا۔ دریا کا پاٹ بہت بڑا تھا۔ پل بن نہیں سکتا تھا۔ بادشاہ ہاتھی پر بیٹھا ہوا اپنی فوج کی سیر دیکھ رہا تھا کہ ایک ملاح نے کہا حضور! میں سب چیزوں کو تول سکتا ہوں۔ بادشاہ سمجھا کہ شیخی مار رہا ہے۔ کہا کہ اچھا ہمارا ہاتھی تول دو۔ ملاح یہ سنکر ذرا نہ گھبرایا۔ اور ہاتھی کو کشتی میں بٹھا دیا۔ جتنی کشتی پانی میں ڈوبی وہاں پر کھریا کا نشان لگا دیا۔ اور اینٹوں سے بھر دیا۔

بادشاہ اس کی عقلمندی سے بہت خوش ہوا۔ اور اسے ایک گاؤں انعام دیا

بھائی کی محبت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت قیس بن سعد بیمار ہو گئے بہت سے لوگ ان کو دیکھنے کے لئے آئے۔ لیکن ان کے بھائی نہیں آئے۔ حضرت قیس نے فرمایا کہ ہمارا بھائی کیوں نہیں آیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کے بھائی آپ کے قرضدار ہیں۔

حضرت قیس نے فرمایا لوگوں کو خبر کر دو کہ جو کوئی قیس کا قرضدار ہے اس کا قرض معاف کیا گیا۔ یہ سن کر آپ کے بھائی اور بہت سارے لوگ آپ کو دیکھنے کے لئے آئے۔

سلطان ابو العنان کی بہادری

آئیے! آج میں آپ کو سلطان ابو العنان کے عہد کا واقعہ سناؤں۔

ایک دفعہ سلطان کے دار الخلافہ میں ایک ایسا خوفناک شیر آ گیا کہ بڑے بڑے بہادر اس کے ملنے سے لرزتے تھے۔ شیر نے دار الخلافہ میں اودھم مچا رکھا تھا۔ مسافر رات کو راستہ چلتے ہوئے ڈرتے تھے۔ سلطان ابو العنان کو جب یہ خبر ہوئی تو ایک دن نیزہ تھام کر شیر کو مارنے کے لئے چل پڑا۔ ایک دن اس نے شیر کے دہاڑنے کی آواز سنی۔ اور نہایت بہادری سے اس کے سر پر نیزہ مارا۔ شیر اس کی زد سے بچ نہ سکا اور وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

غزل

(ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

بقیدِ یک قافیہ

روزِ اول ہی ظہورِ عشق کامل ہوگیا
خون کے دو چار قطرے جم گئے دل ہوگیا

ہجر کی شب کا گذرنا سخت مشکل ہوگیا
ایک اک تارا مرا ڈوبا ہوا دل ہوگیا

عشق اُن سے کر کے غم سہنے کے قابل ہوگیا
پہلے دل ہی دل تھا اب دل بن گیا دل ہوگیا

پھول بننے بھی نہ پایا چھا گئی پژمردگی
تم نے جس غنچے کو دیکھا وہ مرا دل ہوگیا

ہم نے کیا دیکھا، یہ دیکھا اُن کا جلوہ دیکھ کر
مبتلائے درد و غم اچھا بھلا دل ہوگیا

میں کہوں میرا ہے تو اس کو نہ مانے گا کوئی
آپ کی مٹھی میں جا کر آپ کا دل ہوگیا

وہ نگاہِ ناز سے دیکھیں نہ دیکھیں اس طرف
تیر اتنے آ گئے ترکش مرا دل ہوگیا

چار راتیں چار دن اور اس قدر تبدیلیاں
دوسرے تم ہوگئے اب دوسرا دل ہوگیا

اس سے بڑھ کر کیا دکھائی چشمِ تر اعجازِ عشق
جو گرا آنسو وہی اپنی جگہ دل ہوگیا

کوئے جاناں سے اُڑے تھے چند ذرے خاک کے
بن گیا کوئی جگر اُن میں کوئی دل ہوگیا

اللہ اللہ اس کماں کش کا یہ اندازِ کمال
تیر ابھی آیا نہیں زخمی مرا دل ہوگیا

حُسن کا جلوہ دکھاتا اور کیا اپنا اثر
ابر میں بجلی بنا آغوش میں دل ہوگیا

کثرتِ غم نے ہوا باندھی یہ کوئے یار میں
منتشر ایک ایک میرا ذرہ دل ہوگیا

میں اسے جادو سمجھ لوں یا کرامت آپ کی
کہہ دیا جس گل کو دل ہوجائے وہ دل ہوگیا

رکھ دیا بہرِ تسلی آپ نے دل پر جو ہاتھ
تو یہ میں سمجھا کہ پیدا دوسرا دل ہوگیا

سیکڑوں طوفاں اُٹھیں عشق میں کچھ غم نہیں
نوح کا دل بھی جنابِ نوح کا دل ہوگیا

کلامِ مُلّاؔ

(از جناب آنند نرائن مُلّاؔ)

محبت سے بھی کارِ زندگی آساں نہیں ہوتا
بہل جاتا ہے دل، غم کا مگر درماں نہیں ہوتا

محبت کے عوض میں یاد محبت ڈھونڈنے والے
یہ دُنیا ہے یہاں ایسا ارے ناداں نہیں ہوتا

دلِ ناکام ایسا تو ہی نہیں ہے صرف مشکل میں
اسے اِنکار کرنا بھی تو کچھ آساں نہیں ہوتا

ہنسی میں غم چھپا لینا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں
جو غم در اصل غم ہوتا ہے وہ پنہاں نہیں ہوتا

دیارِ عشق ہے یہ ظرفِ دل کی جانچ ہوتی ہے
یہاں پوشاک سے اندازۂ اِنساں نہیں ہوتا

غرورِ حُسن تیری بے نیازی شانِ استغنا
جبھی تک ہے کہ جب تک عشق بے پایاں نہیں ہوتا

کہیں کیا تم سے ہم اپنے دلِ مجبور کا عالم
سمجھ میں وجہِ غم آتی ہے اور درماں نہیں ہوتا

مآلِ اختلافِ باہمی افسوس کیا کہیے!
ہر اک قطرہ میں شورش ہے مگر طوفاں نہیں ہوتا

صدائے بازگشت آتی ہے ایامِ گذشتہ کی
یہ دِل ویران ہو جانے پہ بھی ویراں نہیں ہوتا

محبت تو بجائے خود اک ایماں ہے اے مُلّاؔ
مُحبت کرنے والے کا کوئی ایماں نہیں ہوتا

(جناب الطاف مشہدی)

آغازِ محبت ہی میں ناشاد کروگے — کیا مجھ کو خبر تھی مجھے برباد کروگے

ہے وقت کی آغوش میں اک ایسا زمانہ — جب راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے مجھے یاد کروگے

خوابوں کے دریچوں سے مجھے جھانکنے والو — کب اُجڑی ہوئی خلوتیں آباد کروگے

کم ظرف محبت بھی ہیں بیداد کے طالب — اب اور کیا ارزانیٔ بیداد کروگے

انسان کو بیکار سی شے جاننے والو! — سایوں سے لپٹ کر کبھی فریاد کروگے

ماضی کی دھنیں حال کے بربط سے ہوں پیدا — کیا ایسا بھی نغمہ کوئی ایجاد کروگے

یہ ذکر ہے الطاف عناصر سے شب و روز
کب قیدیٔ انفاس کو آزاد کروگے؟

موجِ خیال

(از جناب ماہر القادری)

آدمی واقفِ اسرار نہ ہونے پائے
زندگی خواب سے بیدار نہ ہونے پائے

مجھ کو اُس عاشقِ وارفتہ سے کچھ کہنا ہے
ابھی منصور سرِ دار نہ ہونے پائے

چشمِ ساقی کی توجہ کا اثر ہے جب تک
ایک میخوار بھی ہشیار نہ ہونے پائے

کوئی فرصت کی گھڑی میرے لئے بھی اے دوست
آج تو مجمعِ اغیار نہ ہونے پائے

بجلیاں ٹوٹ پڑیں، دورِ خزاں آپہنچا
آشیانے ابھی تیار نہ ہونے پائے

دیکھ او شکوہ گزارِ شبِ فرقت ہشیار!
تیری فریاد دل آزار نہ ہونے پائے

دل نے آغازِ محبت میں دعا مانگی تھی
جیت ہی جیت رہے ہار نہ ہونے پائے

دل پہ جو کچھ بھی گذر جائے مگر اے ماہر
حال شرمندۂ اظہار نہ ہونے پائے

غزل

(از جناب نعمان تاثیر)

ناکامیوں کا دید کی یارا نہیں ہمیں
یوں حسرتِ نگاہ دوبارا نہیں ہمیں

یہ بھی تو اُن کی یاد میں گم ہو کے رہ گیا
دل کا بھی اب تو کوئی سہارا نہیں ہمیں

وہ حسن کی نظر میں ہو یا دل میں عشق کے
کوئی بھی انقلاب گوارا نہیں ہمیں

یوں تھک کے راہِ شوق میں بیٹھے ہوئے ہیں ہم
جیسے کہ انتظار تمہارا نہیں ہمیں

یہ غیر پھر بھی غیر ہیں غیروں کا ذکر کیا
خود اعتماد آج ہمارا نہیں ہمیں

دے مے چکاں لبوں کو تبسم کی زحمتیں
کافی تری نظر کا اشارا نہیں ہمیں

ایمن کی وادیوں میں ہے اک بیکراں سکوت
مدت سے برقِ طور، پکارا نہیں ہمیں

راہِ وفا میں مرگِ تمنا قبول ہے
دل توڑنا کسی کا گوارا نہیں ہمیں

رُخسارِ لالہ گوں پہ بکھرتے تھے جو کبھی
حاصل ان آنسوؤں کا نظارا نہیں ہمیں

نشو و نما کی یا تو نہ تھیں ہم میں قوتیں
یا فطرتِ چمن نے اُبھارا نہیں ہمیں

تاثیر لیں نہ کس کے تبسم نے چٹکیاں
کس کی نگاہِ مست نے مارا نہیں ہمیں

ناصح و شاعر (انسانیت شکن ماحول میں)

ناصح

گر ترقی کا ہے خواہشمند اس ماحول میں — روح پرورِ عہدِ ماضی کا یہاں چرچا عبث
جادۂ بے جا جھوٹ سچ ہے اس جگہ "یکتا" کمال — رلت بازی کے صنم کا حسنِ دل آرا عبث
فخرِ بے جا اور تعلّی خواہشِ نام و نمود — انبساطِ حال کے مُہروں کا ہے شکوا عبث
بحرِ مکر و حرص و خود غرضی میں یہاں دل ڈوب جائے — مرگِ ایثارِ خودی پہ اس جگہ نوحا عبث
زیبِ تن گندم نما خوشرنگ اک ملبوس ہو — چُست کرنا جو فروشی پہ کوئی فقرا عبث
دل ہوائے کسبِ زر میں رات دن اڑتا رہے — سوچنا یاں ہستیِ فانی کا ہے منشا عبث
اس ستم پیشہ فضا میں دردِ دل مفقود ہے — پیش کرنا درد و خونِ دل کا افسانا عبث
الغرض ماحول کے سانچے میں ڈھل جائے حیات — ورنہ ذکرِ بادہ و ساقی و پیمانا عبث

عقل میں بامِ تمنّا تک رسائی کا جنوں!
ہاں رہے گا تا کجا نیچے دروں نیچے بروں

شاعر

ناصحِ ہمدرد تیری شفقتوں پر میں نثار — تو مگر سمجھا نہیں رازِ مقامِ زندگی
قالبِ تدبیر کی رُوحِ رواں تقدیر ہے — موج آسا لب پہ رقصِ روحِ جامِ زندگی
رزق کی تقسیم مرہونِ تصنّع الحذر — یہ تخیل اک محض سودائے خامِ زندگی
یہ ترقی ہے مری ہمت کی اک ادنیٰ کنیز — منحصر لیکن مشیت پر نظامِ زندگی
روبرو ماحول کے سر خم نہ ہونا چاہیے — "در ستیز" مستقل پنہاں پیامِ زندگی
خود حصولِ مدعا کی راہ میں بہکا ہے تو — صبح تیری، میری نظروں میں ہے شامِ زندگی
ہوں ابھی ہر گوشۂ ماحول سے بے بال و پر — جیبِ مسلم آئینہ بردارِ بامِ زندگی
ایسے ماحولِ ستم پیشہ میں ہے وہ بھی وجود — فخر کرتا جس کی سیرت پر ہے نامِ زندگی
منزلِ مقصد کی جانب اڑ رہا ہے اسپِ عمر — قبضۂ اہلِ نظر میں ہے زمامِ زندگی

درمیانِ بحر دامن تر نہ ہونا ہے کمال
دید کے قابل ہے مفہومِ ترقی کا زوال

* ... طیب صاحب ایم اے چیف کنٹرولر آف فیکٹری اکاؤنٹس۔

مجھے معلوم ہے پردیس میں بھی عید آئیگی!

(از جناب حامد رشید ٹونکی)

مجھے معلوم ہے پردیس میں بھی عید آئیگی
فضائیں جھوم جائیں گی، صبا بھی مسکرائے گی
مگر اس دم کسی کی یاد تم کو پھر ستائے گی
اگر ایسا ہو تو مجھ کو بھی تم دلِ شاد کر لینا
مری پچھلی وفاؤں کو خدارا یاد کر لینا

مری یاد آئے اور رونے پہ تم مجبور ہو جاؤ
سکوں کی پاک وادی سے بہت ہی دور ہو جاؤ
نہ پاؤ دل میں طاقت ضبط کی معذور ہو جاؤ
تو ان گذرے ہوئے لمحوں سے دل کو شاد کر لینا
مری پچھلی وفاؤں کو خدارا یاد کر لینا

مری اجڑی ہوئی دنیا کو گر پھر سے بسانا ہو
مرے سازِ جوانی کو اگر پھر گدگدانا ہو
مری پژمردہ کلیوں کو اگر پھر سے کھلانا ہو
تو اقرارِ محبت کر کے مجھکو شاد کر لینا
مری پچھلی وفاؤں کو خدارا یاد کر لینا

کوئی قاصد کسی کے عشق کا پیغام گر لائے
[illegible] نازنیں پھولوں کا گجرا لاکے پہنائے
تمہارے روٹھنے پر وہ سراسر کوئی من جائے
تو مجھ سے روٹھنے کی بھی ادائیں یاد کر لینا
مری پچھلی وفاؤں کو خدارا یاد کر لینا

سمجھتی ہو کسی کو اور میں دل میں بساؤنگا
میں تم سے دور رہکر تم کو شاید بھول جاؤنگا
محبت کی انوکھی اور اک جنت بناؤنگا
ارادہ بھی ہو گر دل میں، دلِ ناشاد کر لینا
مری پچھلی وفاؤں کو خدارا یاد کر لینا

کوئی اودی سی بدلی آسماں پر جب کہ چھائے گی
لرزتی کانپتی بجلی چمک کر تھرتھرائے گی
کسی پردیسی پیتم کی تمہیں بھی یاد آئے گی
تو اپنے ذہن میں مجھکو بھی تم آباد کر لینا
مری پچھلی وفاؤں کو خدارا یاد کر لینا

کسی شاعر کا کوئی گیت جب تم گنگناؤ گی
اُسی لے میں اسی انداز سے جب گیت گاؤ گی
کسی بھولے ہوئے کی یاد پھر سے دل میں پاؤ گی
تو ایسے میں مجھے بھی یاد کر کے شاد کر لینا
مری پچھلی وفاؤں کو خدارا یاد کر لینا

کوئی رنگیں فسانہ جب کوئی تم کو سنائے گا
ربابِ زیست جسکو سن کے تھرتھر کانپ جائیگا
تمہیں پھر سے وہی اپنا زمانہ یاد آئے گا
اگر یوں ہو تو میری یاد کو بھی شاد کر لینا
مری پچھلی وفاؤں کو خدارا یاد کر لینا

غزل

جناب عبدالرشید شیدا کراچی

حیاتِ عشق کے رنگیں فسانے اور ہوتے ہیں
فرشتے جن پہ جھومیں وہ [illegible] اور ہوتے ہیں

جہاں سے دردِ دل کی دولتِ جاوید ملتی ہے
محبت کے وہ پوشیدہ خزانے اور ہوتے ہیں

قفس میں آشیاں کا لطف حاصل ہو تو جاتا ہے
مگر اے دوست پھر بھی آشیانے اور ہوتے ہیں

شہیدوں کا لہو ہوتا ہے عنوانِ حسیں جن کا
تمناؤں کے وہ زندہ فسانے اور ہوتے ہیں

مرادِ ذوقِ جبیں سائی فریبِ حُسن کیوں کھائے
جہاں جھکتے ہیں سر وہ آستانے اور ہوتے ہیں

بشر کی لغزشوں پر جب فرشتے رشک کرتے ہیں
وہ موسم، وہ فضائیں وہ زمانے اور ہوتے ہیں

امینِ آگہی ہوتی ہے جن کی ہر بہاریں لے
ربابِ دل کے شیدا وہ ترانے اور ہوتے ہیں

غزل

جناب قدیر لکھنوی

نظارہ سوز جلوۂ جانانہ ہو گیا
جس نے ملائی آنکھ وہ دیوانہ ہو گیا

جب عام میرے عشق کا افسانہ ہو گیا
کچھ مصلحت سمجھ کے میں دیوانہ ہو گیا

کلیاں بنیں صراحیاں شبنم بنی شراب
جو گل کھلا چمن میں وہ پیمانہ ہو گیا

تھی سبزۂ لحد سے توقع بہار کی
وہ بھی مرے نصیب سے بیگانہ ہو گیا

یوں کہہ رہے ہیں وہ مری دیوانگی کا حال
جیسے میں جان بوجھ کے دیوانہ ہو گیا

دِل رشکِ صد چمن تھا مگر اہلِ حُسن نے
ایسی نظر لگائی کہ ویرانہ ہو گیا

پوچھے تو کوئی اُن سے کہ تم نے قدیر کو
دیوانہ کر دیا ہے کہ دیوانہ ہو گیا

آمدِ شباب

جناب انجام کاشمیری

(۱)

دنیائے حسن جھوم گئی آگیا شباب
جیسے کہ چودھویں کا نکل آئے ماہتاب
جس نے بھی کی حساب میں شوخی بھی بے حساب
معصوم ہو رہا ہے مگر پھر بھی کامیاب

اک بے رُخی کے پردے میں ہے عشق سے خطاب
گویا سوال حسن کا ہے عشق ہی جواب

(۲)

آتا ہے ساتھ لاکھ ادائیں لئے ہوئے
اپنے ہی تیغ کی آپ بلائیں لئے ہوئے
دامن میں ظلم و جور جفائیں لئے ہوئے
امید، آرزو کی فضائیں لئے ہوئے

امرت کے ساتھ ساتھ قضائیں لئے ہوئے
امراضِ عاشقی کی دوائیں لئے ہوئے

(۳)

آتا ہے آن بان سے ہو شان سے شباب
جیسے کہ آسمان محبت کا آفتاب
جیسے کتابِ حسن کی تفسیر کامیاب
جیسے جہانِ عشق کو پیغام انقلاب

جیسے غرورِ حسن کے نشہ سے نیم خواب
جیسے حیاتِ عشق پہ کرتا ہوا عتاب

(۴)

حسرت بنا کہیں، کہیں ارمان بن گیا
ٹکڑے کی غیر سے پہچان بن گیا
مذہب بنا کہیں، کہیں ایمان بن گیا
افسانہ بن گیا کہیں، کہیں عنوان بن گیا

قصرِ حسیں بنا کہیں ایوان بن گیا
القصہ جس جگہ یہ گیا جان بن گیا

ایکٹریس

(از جناب اقبال خلیلی صفی پوری)

لڑکھڑاتی، مسکراتی جھومتی، گاتی ہوئی
آگئی اسٹیج پر اک شکل بل کھاتی ہوئی

ملکۂ حسن و ترنم مرکزِ قلب و نگاہ
منزلِ شہرت کی رہرو، حرص کی گم کردہ راہ

زلف کی بے ہم سجاوٹ سے ہویدا پیچ و تاب
چتونوں میں شوخیاں، آنکھوں میں مصنوعی حجاب

تابشِ غازہ سے چہرہ پر ہوسکارانہ جوش
ہر ادا عصیاں بدامن، ہر نظر عشوہ فروش

سر بسر عریانیِ جذبات میں کھوئی ہوئی
شوقِ کے ... کچھ جاگی تو کچھ سوئی ہوئی

نیم وا آنکھوں سے اک اندازِ عیاری عیاں
گفتگو کے لوچ سے مشقِ اداکاری عیاں

بیچ کر حسن و جوانی اپنی شہرت کا خیال
روئے مستقبل پہ قربان عصمت ماضی و حال

دعوتِ حسن و ادا اپنے پرائے کے لئے
نیم عریاں جسم خالی ہے کرائے کیلئے

نوجوانوں کی امیدیں، چاہنے والوں کی آس
پیکرِ شہوات سے چپکے ہوئے رنگیں لباس

موٹریں، ہیرے، جواہر، کوٹھیاں، سرمایہ دار
رات بھر کی زندگانی اور اتنے غم گسار

ریشمی ملبوس کے پردے میں با صد طمطراق
فلمسازوں کی حریصانہ نظر کا اشتیاق

لیکن اسکی ہر مسرت، ہر خوشی مانگی ہوئی
ہے غرض کل آمد کی زندگی مانگی ہوئی

ڈگمگا جاتی ہے عصمت اسطرح پیتی ہے یہ
دوسروں کی آرزو کیواسطے جیتی ہے یہ

جتنا ظاہر خوشنما اتنا ہی باطن بھی سیاہ
عصمتِ تاریک کے سایہ میں اک روشن گناہ

مالکانِ فلم کی دیکھی ہوئی بھالی ہوئی
ہر حسین نوجواں آغوش کی پالی ہوئی

اسکا باطن اسکے تیغ اسکے تبسم میں نہاں
جانے کتنے صاحبانِ زر کے بوسوں کے نشاں

سر نگوں ہیں پھر بھی اسکے "آرٹ" پر اہلِ علوم
ترک کر کے عزتِ اسلاف کے سارے رسوم

دیکھکر یہ اوجِ نسواں فخر سے اونچا ہی سر
الحذر اے ہند کی تہذیبِ حاضر الحذر

بنتِ حوا فاحشہ کے شہرتی کردار میں
عصمتِ اصنافِ نازک اور بھرے بازار میں

بیٹھ کے تمنا اپنا خود اپنے ہی ہاتھوں سے سمجھ
معصیت عورت کی صورت میں نظر آتی ہے آج

بانگِ درا

سونے والے! اُٹھ سویرا ہو گیا — رات سونے کے لئے تھی سو چکا
کر لے فکرِ حال و مستقبل بھی کچھ — یادِ ماضی میں بہت بس رو چکا
پھر ادا ہوتے رہیں گے واجبات — فرض ہے جو پہلے تو اس کو چکا
وقت کی اب تو خدارا قدر کر — کھونے والے! تو بہت کچھ کھو چکا
عہدِ رفتہ کو کہاں تک روئیگا — رو بھی چک اس کو جو تجھ کو رو چکا
کاٹ زنجیرِ غلامی اے غلام! — ہاتھ آزادی سے تو کیوں دھو چکا
چن لے اب کچھ نیکیوں کے پھول بھی — تو بہت کانٹے بدی کے بو چکا
توبہ کر لے اور اس کو بھول جا — ہو چکا ہونا تھا جو کچھ ہو چکا

تکتے ہیں رضوی کا منہ کیوں سامعین
اس کو جو کہنا تھا وہ کہہ تو چکا

جناب رضوی خیرآبادی

رفعت

جو چاہے رفعت اپنی خصلتِ شہباز پیدا کر — پھر اپنے شہپروں میں قوتِ پرواز پیدا کر
نہ ہو مایوس آزادی سے تو قیدِ غلامی میں — غلامِ غزنوی رہ، خاطرِ ایاز پیدا کر
نہیں ممکن دمِ رفتہ کو پھر واپس بلا لینا — مگر اپنے میں عیسیٰ کی طرح اعجاز پیدا کر
مئے خودداری و ہمت کے ساغر لب بلب بھر کر — پلاتا جائے جو وہ ساقیِ جانباز پیدا کر
شعاعِ نورِ رفعت رہبری کرنے کو حاضر ہے — مگر تو وہ کھینچنے والی نگاہ باز پیدا کر
ہو جو انجام آغازِ تنزل قوم کی خاطر — تو اس انجام کا پھر سے نیا آغاز پیدا کر

اگر مطلوب ہی بیداری قوم و وطن منہاج
تو پھر آواز میں تو صور سا انداز پیدا کر

جناب ایم، وسی، منہاج کیمبلپوری

غزل

جناب مولوی محمد عبدالاحد صاحب یکتا

عمر بھر صبر کیا حشر میں فریاد کروں
ماحصل عشقِ گراں مایہ کا برباد کروں

ظلم کا شکوہ بھی ہو تم بھی ہو میرے دل میں
بھول جاؤں میں کسے اور کسے یاد کروں

تو چمن میں رہے صیاد، بہاریں لوٹے
میں قفس میں بھی رہوں اور نہ فریاد کروں

فصلِ گل ختم ہے، صیاد کا جی چھوٹ گیا
اب یہ کہتا ہے قفس سے تجھے آزاد کروں

سوکھ جاتی ہے زباں، نام اگر لوں اُن کا
دل اُلٹتا ہے اگر دل میں انہیں یاد کروں

آنکھ سے اشک نکلتا ہے نہ دل سے نالہ
ضعف ہے ضعف میں کیا گریہ و فریاد کروں

وصل کی صبح مری موت، تمہاری رخصت
اُس قیامت کی گھڑی کو بھی میں یاد کروں

لطف تو جب ہے زمانے سے نرالا ہو ستم
میں نئی طرزِ فغاں پھر کوئی ایجاد کروں

شادؔ فرماتے ہیں یکتاؔ کی غزل ہے یکتا
ہو جو اُستاد کا ارشاد تو میں صاد کروں

۞ لالہ مرلی دھر صاحب شادؔ خلف الرشید سر لالہ شری رام صاحب

غزل

جناب نیساںؔ اکبرآبادی

جب اپنے دن تھے جب اپنی راتیں گذر چکا ہے وہ اب زمانہ
بدل چکی ہیں اب اُن کی نظریں زمانِ ماضی ہے اک فسانہ

خزاں میں افسردگی ہے کچھ اور نہ کچھ ہے رعنائی بہاراں
دل و نظر کے فریب ہیں سب نہ کچھ قفس ہے نہ آشیانہ

اِدھر مری داستانِ غم ہے اُدھر وہ طنزِ لطیف ان کا
وہ کہہ رہے ہیں سنائے جاؤ بڑا ہی دلچسپ ہے فسانہ

وہ مجھ سے کرتے ہیں روز باتیں انہیں بھی اسکی خبر نہیں ہے
کہ اُن کا طرزِ بیاں جدا ہے تمام باتیں ہیں غائبانہ

زباں پہ مُہرِ سکوت ہے اور نظر سے کرتے ہیں پرسشِ دل
اِس احتیاطِ نظر کے صدقے سمجھ نہ جائے کہیں زمانہ

نہیں ہے اُن کو اگر محبت تو تم ہی نیساںؔ ذرا یہ سوچو
اُنہوں نے پھر کیوں تمہاری جانب نگاہ ڈالی تھی طائرانہ

ساغر

(از جناب صہبا لکھنوی)

اک گراں خاطر اسباب ہے نومیدیٔ شوق !!
اک گذرگاہِ جنوں ہے، سفرِ منزلِ ذوق !!
کس لئے ششدر و حیران و پریشاں نظری؟
وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے پیراہنِ زیست !!
تختِ شاہی نہ رہے قصرِ فرامیں نہ رہے !!
کس لئے دامنِ صد چاک کی پھر بخیہ گری؟
وہی گمنام سے اجداد کے تربت کے نشاں !
خاک سے جسم بنے، پھر ہوئے پیوندِ زمیں !!
سالہا سال سے روندے ہوئے قوموں کے نقوش !!
مشعلِ رہ نہ بنے عشقِ یقیں، حسنِ گماں !
نہ سہی بادِ خنک، تند بگولے ہی سہی !
سینکڑوں سال ہیں ممنونِ وجودِ آدم !!
انقلابات کی قدروں کو فنا بھی تو نہیں !!
ابدیت نہ سہی، موت کے جھولے ہی سہی !
نفسِ سرد نہیں، گرمیٔ انفاس تو ہو !
زندگی بھاگتے سایوں کا تعاقب ہی تو ہے !!
بھاگتے سائے، مشیت جنہیں لوٹا نہ سکی !!
شررِ آہ نہیں، شعلۂ احساس تو ہو !
جاوداں وقت نہیں، لمحۂ فرصت بھی نہیں !!!
میری جاں! حدِ جنوں صرف محبت ہی نہیں !!!

(از جناب مجتبیٰ حسین صاحب)

تیری محبت کا غم لے کے کوئی کیا کرے
خشک لب و چشم نم لے کے کوئی کیا کرے
لے کے کوئی کیا کرے شوق کی افسردہ رات
تیرگیٔ شامِ غم لے کے کوئی کیا کرے
تشنگیٔ موج سے بحرِ رواں بے خبر
حسرتِ امیدِ کرم لے کے کوئی کیا کرے
آرزو، حاصل نہیں، راہ تو منزل نہیں !!
پھر ترا نقشِ قدم لے کے کوئی کیا کرے
عشق فریبِ خیال، قیدیٔ فردا و دی
ہو جو تہی جامِ جم، لے کے کوئی کیا کرے
زیست سراپا نشاط لذتِ کردار سے
لذتِ رنج و الم لے کے کوئی کیا کرے
جادۂ ہستی میں جب عشق کی منزل نہیں
گیسوئے پُر پیچ و خم لے کے کوئی کیا کرے
دل کو سکوں چاہیئے، تازہ فسوں چاہیئے
کہنہ و بے سود غم، لے کے کوئی کیا کرے
کاتبِ تقدیر کا مٹ نہ سکا جب لکھا
خامۂ معجز رقم، لے کے کوئی کیا کرے

ہسپتالوں اور صنعتی اداروں میں نرسوں کی کمی

نرسوں کے لئے بہتر انتظامات اور اعلیٰ تعلیم و تربیت

نرسوں کی کمی

۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو ٹرینڈ نرسز ایسوسی ایشن آف انڈیا کی چوتھی کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں تعلیم و صحت کے ممبر آنریبل سر جوگندر سنگھ نے بھی نرسوں کی کمی کے متعلق اظہار خیال فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس امر پر زور دیا کہ نرسوں کے رہنے سہنے اور ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہتر انتظامات کئے جائیں اور یہ امید ظاہر کی کہ اگر سروس کے حالات کو ترقی دی جائے تو ہسپتالوں میں کام کرنے کے لئے تعلیم یافتہ خواتین کافی تعداد میں اپنی خدمات پیش کر دیں گی۔

اس کمی کا سبب یہ ہے کہ ہندستان میں نرسنگ سروس اور اس کی معاون سروسوں نے اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی جتنی تیزی سے طبی سروسوں نے ترقی کی ہے چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بڑے ہسپتالوں میں ۵۱ ہزار بیمار ہیں جن کی تیمارداری کے لئے ۲۷ ہزار نرسیں ہونی چاہئیں۔ مگر ان کی موجودہ تعداد ۹ ہزار ہے۔ جن میں سے صرف نصف تربیت یافتہ ہیں اور چھوٹے ہسپتالوں میں تو حالت اور زیادہ خراب ہے۔

بہرکیف سروس کے حالات کو سدھارنے کے لئے زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کل ہند نرسنگ کونسل کے قیام کے لئے مرکزی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ایک مسودہ قانون پیش ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ نرسنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ہندستانی سکول قائم کرنے کا مسئلہ بھی زیر غور ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سکول جلد کالج بن جائے۔ جس میں انسٹرکٹروں کا نصاب پڑھایا جائے اور صحت عامہ کے متعلق بھی تربیت دی جائے۔

قحط کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگر زراعت پیشہ لوگ بیماری کے باعث جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور ہو چکے ہوں تو وہ بحیثیت جماعت ترقی نہیں کر سکتے۔ یہ بات شہری آبادی پر بھی صادق آتی ہے۔ مگر ہندستان ابھی تک علاج معالجہ اور صحت و صفائی کے انتظامات کے لحاظ سے دوسرے متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صوبائی حکومتیں ان سروسوں پر اپنی آمدنی کا اوسطاً ساڑھے پانچ فی صدی حصہ صرف کرتی ہیں۔ حالانکہ ترقی یافتہ ملکوں کی حکومتیں ان پر اپنی آمدنی کا تقریباً ۱۸ فی صدی حصہ صرف کرتی ہیں۔ لیکن امید ہے کہ مرکزی حکومت کی مالی امداد کے ساتھ صوبے ترقی کی بہتر اسکیموں پر عمل درآمد کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ان سروسوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ نرسوں کی تعداد میں بھی زبردست اضافے کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زمانۂ جنگ میں نرسنگ سروسوں کو ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کیا گیا۔ لیکن ابھی تک ایسی نرسوں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔ جو عمدہ اور اعلیٰ تربیت حاصل کر چکی ہوں۔

نرسنگ سروسوں کی ترقی کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ اور انڈین ملٹری نرسنگ سروس قائم کی گئی۔ مگر وہ بڑھتی ہوئی جنگی ضروریات کو پورا نہ کر سکی۔ اس کے بعد سرکاری رجسٹرڈ نرسیں اور شہری ہسپتالوں کی نرسیں بھرتی کی گئیں۔ لیکن اس کے باوجود ہندستانی فوجوں کے بیماروں اور زخمیوں کی خبرگیری کے لئے مزید نرسوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور ۱۹۴۲ء میں آگزیلری نرسنگ سروس آف انڈیا قائم ہوئی۔ جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی خواتین شامل ہوئیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ سے بھی نرسوں کے دستے آتے رہے۔ مگر مذکورہ کوششوں کے باوجود نرسوں کی بدستور کمی ہے۔

تعلیم و تربیت کے بہتر انتظامات

حکومت ہند نے نرسنگ کے متعلق صوبوں کے لئے چند معیار تجویز کئے تھے۔ صوبائی حکومتیں ان سے دلچسپی ظاہر کررہی ہیں۔ چنانچہ بمبئی اور صوبہ متحدہ میں نرسنگ سروس کی نگران خواتین مقرر کی جاچکی ہیں۔ مدراس میں نرسنگ کی سپرنٹنڈنٹ سنہ ۱۹۴۱ء ہی میں مقرر کردی گئی تھی۔ اور اب بنگال میں بھی اس کا تقرر عمل میں آنے والا ہے۔

بیرونی ملکوں میں نرسوں کی اعلےٰ تربیت کا سردست چھوٹے پیمانہ پر بندوبست کیا گیا ہے۔ برطانیہ کے بعض ممتاز ہسپتالوں میں ہر سال ۴۲ ہندوستانی نرسوں کو تربیت دی جائے گی۔ دوران آموز کار نرسوں کے لئے وہی سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی جائیں گی جو برطانوی آموزکار نرسوں کے لئے مہیا کی جاتی ہیں۔ ۵ طالبات برطانیہ پہنچ چکی ہیں۔ جن میں سے رویل سسٹر ٹیوٹر کے نصاب کی تکمیل کریں گی۔ حکومت ہند نے بنگال کی ایک خاتون مسس مورد ابسواس کو بھی رائل کالج آف لندن میں اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے۔

دو سال ہوئے سر جوزف بھور کے زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی تاکہ وہ صحت عامہ کا جائزہ لے اور اپنی سفارشیں پیش کرے۔ توقع ہے کہ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ جلد پیش کردے گی۔ اور صحت عامہ کی منصوبہ بندی میں بھی نرسنگ سروس کی ترقی کو خاص اہمیت دی جائے گی۔

ہیلتھ وزیٹر خواتین

اس ضمن میں ڈائرکٹر جنرل میڈیکل سروس و صدر انجمن تپ دق ہندوستان لفٹننٹ جنرل جے، بی۔ ہانس کی وہ تقریر بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی جو انھوں نے تپ دق کے ہیلتھ وزیٹروں کی کلاس کا افتتاح کرتے ہوئے حال ہی میں فرمائی ہے۔ یہ کلاس تپ دق کے کلینک نئی دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔

اس میں آپ نے ہیلتھ وزیٹروں کی اہمیت نہایت پر زور الفاظ میں بتائی جن میں خواتین کثیر تعداد میں شامل ہوں گی۔ اور اس امر پر زور دیا کہ "سینیٹوریم" کے علاوہ "کلینک" بھی کثیر تعداد میں قائم کئے جائیں۔ جو تپ دق کے ابتدائی درجوں کے علاج کے لئے نہایت ضروری ہیں اور ہر کلینک میں کئی اعلےٰ تربیت یافتہ لائق اور سرگرم ہیلتھ وزیٹروں کو مقرر کیا جائے۔

اس کام کے لئے بھی ہندوستانی خواتین کی خدمات درکار ہیں۔ اور وہ انسداد تپ دق کے متعلق بھی نہایت مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں۔

اُردو اور ہندوستانی تصویریں

(از جناب عزیز بریلوی)

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ اُردو ہندو، سکھ اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے کوئی بھی سمجھدار شخص اسے صرف مسلمانوں ہی کی زبان نہیں کہہ سکتا۔ اور یہ نہ صرف مسلمان گھرانوں میں پڑھی اور بولی جاتی ہے بلکہ ہندوؤں میں بھی اتنی ہی مقبولیت رکھتی ہے دورِ حاضرہ کے مشہور ترین اُردو کے ہندو ادیب اور شاعر کرشن چندر۔ اوپندر ناتھ اشک۔ علامہ کیفی۔ جوش ملسیانی۔ عرش ملسیانی۔ آنند نرائن ملا۔ فراق گورکھپوری وغیرہ اُردو کی ہندوؤں میں مقبولیت کی زندہ مثال ہیں۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کے ہر حصہ میں پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ اور بقول سر تیج بہادر سپرو "اُردو زبان ہندو مسلمانوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے۔" اور اُردو کو ہندوستان کی لنگوا فرینکا کہنا بالکل حق بجانب ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ اُردو زبان کی اہمیت کو جانتے ہوئے ہمارے فلم ساز اس سے بلا وجہ کی عداوت کیوں رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستانی تصویریں ہندوستان کے ان حصوں میں زیادہ تر دکھائی جاتی ہیں جہاں کا بچہ بچہ اُردو زبان بولتا ہے۔ مثال کے طور پر رنجیت فلم کمپنی۔ پربھات فلم کمپنی۔ پرکاش پکچرز۔ راج کمل کلامندر اور آج کل نیو تھیٹرز نے قسم کھا رکھی ہے کہ بورڈ آف سنسرز سے جس وقت سرٹیفکیٹ حاصل کیا جائیگا تو تصویر کی زبان ہندی ہی لکھوائی جائیگی۔ خواہ تصویر عربی اور فارسی کے الفاظ سے پر ہو۔ رنجیت فلم کمپنی کی دو تصویریں مجھے خاص طور پر یاد ہیں۔ ایک تو "تہنہ شاہ بابر" ہے اور دوسری "ممتاز محل"۔ جن اصحاب نے ان تصویروں کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ گانے اور مکالمے تمام تر اُردو زبان میں ہیں۔ اور مکالموں میں بیشتر الفاظ عربی اور فارسی کے شامل تھے اور ان تصویروں کی کہانیاں وجاہت مرزا چنگیزی اور منشی دل کی لکھی ہوئی تھیں۔ اور صاف ظاہر تھا کہ تصویروں کی زبان اُردو ہے۔ مگر بورڈ آف سنسرز کا سرٹیفکیٹ تھا کہ تصویر کی زبان ہندی ہے۔ یہ قصور سنسر بورڈ کا نہیں بلکہ پروڈیوسر کا ہے جو اُردو زبان کے ساتھ دلی تعصب رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ پرکاش پکچرز کی اُردو دشمنی ملاحظہ ہو انہوں نے کہانی کی شروع کرنے سے قبل کاسٹ کو ہندی میں لکھنا شروع کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام کو پرکاش پکچرز سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ ابھی تک تو ان کی تصویریں اس وجہ سے چل جاتی ہیں کہ مذہبی زیادہ ہوتی ہیں۔ آخر یہ مذہبی تصویروں کا سلسلہ کب تک۔ اس کمپنی کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب سوشل تصویریں ایک ہفتہ چل کر دوسرے ہفتہ واپس گھر جانے کی تیاریاں کرنے لگیں گی۔ یہی حال نیو تھیٹرز کا ہے۔ ایک زمانہ تھا بچے بچے کی زبان پر نیو تھیٹرز کا نام تھا اور "دیوداس" اب تک لوگوں کو یاد ہے جب سے نیو تھیٹرز نے ہندی کی طرف رجحان کیا ہے اور ملکی زبان کی جگہ موہجاتی جنہ کتابی زبان کہنا چاہیے کو اپنانا شروع کیا ہے۔ نیو تھیٹرز کی تصویروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ یہ وہی نیو تھیٹرز ہے جس میں علامہ آرزو لکھنوی اور کیدار شرما جیسے لوگ تھے۔ اور آج گانے اور مکالمے لکھنے والے ایسے ایسے لوگ ہیں جو خود اس ہندی کو نہیں سمجھ سکتے جو نیو تھیٹرز کی فلموں میں ٹھونسی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بمبئی اور لاہور میں بھی چھوٹے چھوٹے اور کئی ایسے پروڈیوسر موجود ہیں جو جانتے ہیں کہ اُردو ہی ہندوستان کی عام فہم زبان ہے۔ مگر کیا کریں مجبور ہیں۔ ان کے دلوں میں جو تعصب گھر کر چکا ہے وہ انہیں سنسر کے سرٹیفکیٹ پر لفظ ہندی لکھوانے پر مجبور کرتا ہے۔

ہم نے یہ اُردو کش پروڈیوسروں کا ذکر صرف اس وجہ سے کیا ہے کہ آج کل ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں سنیما گھر ہیں جب ملک کی زبان کو بگاڑنے کے لئے فلم سب سے آسان حربہ ہے۔ اور یہ لوگ صرف اُردو زبان کے ساتھ دشمنی نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے ملک کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ کیونکہ اُردو ملک کی زبان ہے۔ اور ملک کے ساتھ دشمنی کرنے والا غدار کہلاتا ہے۔

ہمارا منشا صرف مندرجہ بالا چند پروڈیوسروں سے تھا جو اُردو زبان سے دشمنی کر رہے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ فلمی صنعت میں دور اندیش اور ہوشمند لوگ بھی موجود ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اُردو ملکی زبان ہے اور اس کی خدمت کرنا ان کا فرض ہے۔ مثلاً مسٹر سہراب مودی۔ فضلی برادرز۔ محبوب پروڈکشنز وغیرہ۔ اور یہ لوگ بلا کسی خوف و خطر کے سنسر سے سرٹیفکیٹ پر اُردو لکھواتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ وہ پروڈیوسر جو کسی خاص وجہ سے یا بلا وجہ خالص اُردو زبان میں تیار شدہ تصویر کو بھی ہندی ہی لکھا کرتے تھے۔ مسٹر سہراب مودی۔ محبوب پروڈکشنز اور فضلی برادرز کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی غلطی کا اعتراف کر کے کتابی زبان کی جگہ ملکی زبان کو دیں گے۔ اور اپنی وطن دوستی کا ثبوت دینگے۔

آخر میں ہم اُردو کے شعرا اور ادیبوں سے درخواست کرینگے کہ وہ ایسے پروڈیوسروں کو جس وقت اپنی کہانی مکالمے اور گانے وغیرہ لکھ کر دیں تو اور شرائط کے ساتھ ساتھ یہ بھی شرط پیش کریں کہ سنسر بورڈ سے جس وقت سرٹیفکیٹ حاصل کیا جائیگا تو زبان اُردو ہی رہے گی۔ اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کریں تو ان پر زبان کا سرپرست ہونے کی حیثیت سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مکمل مقاطعہ کر دیں۔

سیٹھ جی۔ڈی۔برلا کا پیغام

جنگ ختم ہو چکی ہے۔ جنگ کی گرانی کی وجہ سے ہر چیز کے دام چڑھے ہوئے تھے۔ اب امن کا زمانہ آگیا ہے۔ وہ کارخانے جو جنگ کے دوران میں فوج کی امداد کیلئے سامان تیار کیا کرتے تھے اب عوام کی ضروریات کیلئے سامان تیار کرینگے۔ لازمی طور پر چڑھی ہوئی قیمتیں گریں گی۔ یہ وقت روپیہ بیکار ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ جمع کرنے کا ہے۔ گھر پر روپیہ رکھنے سے چوری ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ سونا چاندی یا جائداد خرید لینے سے قیمتیں گرنے پر آدھی سے بھی کم رقم رہ جائیگی۔ روپیہ کو محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ: مندرجہ ذیل مدوں میں روپیہ لگائیے:-

روپیہ بچائیے

اور

ہوشیاری سے خرچ کیجئے

- ★ بیمہ پالیسی
- ★ امداد باہمی کی انجمنیں
- ★ بنک کا سیونگ کھاتہ
- ★ ڈاکخانہ کا سیونگ کھاتہ
- ★ سرکاری قرضے
- ★ نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ
- ★ وکٹری بانڈز

نیشنل پبلسٹی بورڈ دہلی نے شائع کیا

کشمیری گیٹ سے اُردو پارک تک

رِٹز سینما میں یونائیٹڈ فلمز کا مُسلم سوشل شاہکار **بھائی جان** بدستور کامیابی کے ساتھ تیرھویں ہفتہ میں چل رہا ہے
"بھائی جان" میں ہندوستانی عورت کو حقیقی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ہر وہ عورت جو کل کو ماں بننے والی ہے اس کی لوح پیشانی پر تو یم کی تقدیر لکھی ہوئی ہے۔ "بھائی جان" میں نُور جہاں اپنی زندگی کے بہترین اور کامیاب رول میں پیش ہوئی ہے۔ شاہ نواز کی اداکاری بہت خوب ہے کرن دیوان۔ انیس خاتون اور مینا کی اداکاری بھی خاصی ہے۔ "بھائی جان" میں اسلامی تہذیب اور تمدّن کو پیش کیا گیا ہے۔ جو قابلِ ستائش ہے۔

اِس سینما کا آئندہ پروگرام پرکاش پکچرز کا سوشل فلم "کویتا" ہے "کویتا" میں رتن مالا۔ انجنا۔ ادما کانت اور جیون کام کر رہے ہیں۔ یہ فلم اس سے قبل لاہور۔ بمبئی اور دیگر مقامات پر کافی کامیابی حاصل کر چکا ہے۔

منروا ٹاکیز میں پردیپ پکچرز کا حمیت نواز شاہکار **پنّا دائی** جمعہ ۱۸ جنوری سے شروع ہو رہا ہے۔ "پنّا دائی" وہ عورت تھی جس نے اپنے اکلوتے بچّے کو اپنے وطن کی حفاظت کے لئے قربان کر دیا جس کی تاریخ میں مثال ملنی مشکل ہے۔ "پنّا دائی" میں چندر موہن۔ درگا کھوٹے۔ انوری وغیرہ نے کام کیا ہے۔

ناولٹی ٹاکیز جمنا پروڈکشنز کا موسیقی نواز سوشل فلم **رتن** گذشتہ ۱۸ ہفتوں سے عوام کی کشش کا باعث بنا ہوا ہے۔ "رتن" کی موسیقی جادو کا سا اثر رکھتی ہے۔ دلّی والے اعلیٰ اور عمدہ قسم کی موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ "رتن" کی موسیقی دلّی میں اس قدر مقبول ہوئی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ کسی زمانے میں "شاردا" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ مگر ہر چیز کا اپنا اپنا وقت ہوتا ہے۔ "رتن" کو مقبولیت صرف دلّی ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان بھر میں ہوئی ہے سینما ہال پر ہجوم اور شہر میں گانوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر گلی کوچے میں بچّہ، بوڑھا، پڑھا لکھا، اَن پڑھ ہر شخص گنگناتا پھرتا ہے۔ اُمید ہے "رتن" گولڈن جوبلی منائے گا۔ "رتن" میں واسکی۔ سورن لتا

کرن دیوان اور منجو لا نے کام کیا ہے۔

جوبلی ٹاکیز میں **ایک دن کا سُلطان** کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس میں مہتاب۔ غلام محمد۔ واسکی۔ اے شاہ اور صادق علی نے کام کیا ہے۔

جمعہ ۱۸ فروری سے ہمینک پروڈکشنز کا دھارمک شاہکار تارامتی عرف راجہ ہریشچندر نمائش کے لئے پیش کر دیا جائیگا۔ "تارامتی" میں شوبھنا سمرتھ رام مراٹھے۔ میناکشی وغیرہ نے بہترین کام کیا ہے۔

میجسٹک سنیما میں شالیمار پکچرز کا جذبۂ آزادی سے بھرپور فلم **غلامی** نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ "غلامی" میں جاپانیوں کے مظالم دکھائے گئے ہیں جو انہوں نے برما پر قبضہ کرنے کے بعد نہتّے اور پُرامن شہریوں پر ڈھائے۔ بے دین اور ظالم جاپانیوں نے برما پر قبضہ کرنے کے بعد مساجد کی بے حرمتی کی اور عورتوں اور بچّوں کو تنگ کیا۔ لوگوں کو بھوکے اور پیاسے مارا۔ آخر میں جاپانی ظلم کا دور ختم ہوا۔ محبانِ وطن اپنے وطن کو ظالم جاپانیوں کے قبضہ سے چھڑانے میں کامیاب ہوتے ہیں اور غدارانِ وطن کو کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں۔ "غلامی" کے گانے شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی۔ اختر الایمان۔ مجاز اور بھارت ویاس کے ہیں۔ ہدایات ودھولنی اور مکالمے کرشن چندر کے ہیں۔ اداکاروں میں رینوکا دیوی۔ مسعود پرویز۔ ڈیوڈ۔ تیواری۔ بھارت ویاس اور راجکماری شکلا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

کُمار ٹاکیز میں جمعہ ۱۸ جنوری سے نو یگ چترپٹ کا سوشل فلم **دن رات** شروع ہو جائے گا سینہہ پربھا ایک عرصہ کے بعد پردۂ فلم پر آئی ہے۔ فلم لائن میں آنے سے قبل سینہہ پربھا میڈیکل کالج میں طالبہ تھی۔ "دن رات" میں گھر چھوڑنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر کا پیشہ اختیار کرتی ہے جو اُس کے لئے نہایت موزوں ہے۔ "دن رات" میں سینہہ پربھا۔ سلوچنا چٹرجی اور ہریش بینرجی نے کام کیا ہے۔

موتی ٹاکیز

میں تلوار پروڈکشنز کا رومان سے بھرپور فلم "اجیتی" دکھایا جا رہا ہے۔ شوخ و چنچل رمولا ایک مرتبہ پھر لوگوں کے دلوں کو لبھانے کیلئے ایک خانہ پروش لڑکی کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ رمولا نے جگہ جگہ اپنی شوخ اور دلربا اداکاری کے مظاہرے کئے ہیں۔ "اجیتی" ایک مایانہ فلم ہے۔ مگر پھر بھی کافی دنوں چلے گی۔ کیونکہ عوام کے مذاق کی بہت سی چیزیں اس میں موجود ہیں۔ ہدایات تلوار اور موسیقی چشتی کی ہے۔ اداکاروں میں رمولا، ستیش، سندر، منورما اور روپ لیکھا ہیں۔

جگت ٹاکیز

میں نیو تھیٹرز کا مزدوروں کا ترجمان شاہکار "ہمراہی" گزشتہ چھ ہفتوں سے بے پناہ رش لے رہا ہے۔

"ہمراہی" میں غریبوں اور مزدوروں کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ غریبوں کی پکار، امیروں کے ظلم کو صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ تصویر بہت اچھی ہے۔ اداکار باوجود نئے ہونے کے بہت کامیاب ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ انہوں نے پہلی مرتبہ پردۂ فلم پر آ کر ثابت کر دیا ہے کہ ان میں اداکاری کرنے کی صلاحیت ہے۔ اداکاران میں بناتا بوس۔ رادھے موہن۔ دیپ مکرجی۔ کنندن اور ہیرالال کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موسیقی بورال کی ہے۔

شاہد لطیف نے نئی کمپنی بنالی

مشہور افسانہ نگار اور ادیب مسٹر شاہد لطیف نے ایک نئی فلم کمپنی اجنتا آرٹ کے نام سے بنائی ہے۔ ان کی پہلی فلم کا نام "بزدل" ہوگا۔ کاغذی کارروائی مکمل ہو چکی ہے۔ اداکاروں کا انتخاب زیر غور ہے۔ مزید معلومات کا انتظار ہے۔

جدن بائی پروڈیوسر بن گئی

مشہور مغنیہ بائی جدن بائی نور طلعت نرگس کی والدہ ماجدہ نے ایک تصویر تیار کرنے کا اعلان کیا ہے جس کا نام "رومیو جولیٹ" ہوگا۔ شوٹنگ عنقریب شروع ہو جائے گی۔

بمبئی ٹاکیز کا "مغل اعظم"

بمبئی ٹاکیز نے "مغل اعظم" کی تیاری کا اعلان کر دیا ہے۔ سین سینریاں اور سیٹ بنائے جانے شروع ہو گئے ہیں۔ کاغذی کارروائیاں مکمل ہو چکی ہیں۔ شوٹنگ عنقریب شروع ہو جائے گی۔

غریبوں اور مزدوروں کی پکار ـــــ سرمایہ دار کے مکر و فریب
نیو تھیٹرز لمیٹڈ کا مزدوروں کا ترجمان شاہکار
مزدورو اٹھو اور سرمایہ دار کو کچل دو تمہارے افلاس کا ذمہ دار یہی ہے
ہمراہی
THE NEW THEATRES LIMITED
اداکاران:
بناتا بوس۔ رادھے موہن۔ دیبی مکرجی
ہیرالال۔ ٹنڈن وغیرہ
جگت سینما میں چوتھا کامیاب ہفتہ
ہمراہی
NEW THEATRES PRESENTS
HAMRAHI
جاری کردہ:
جگت ٹاکیز فلم تقسیم کنندگان دہلی۔ لاہور۔ کراچی

شالیمار پکچرز کے ساتھ پیش کرتے ہیں

"ایک رات" اور "من کی جیت" جیسی تصویریں تیار کرنے والے تین اور شاہکار پیش کرتے ہیں

غلام

ہدایات :۔ ودھوانی

اداکاران :۔ رینوکا دیوی۔ مسعود پرویز۔ تیواری۔ بھارت ویاس وغیرہ

کرشن بھگوان

بھگوان کرشن کی زندگی پردۂ سیمیں پر

اداکاران :۔ نینا بھارت بھوشن وغیرہ

پرتھوی راج سنجوگتا

ہدایات :۔ نجم نقوی

اداکاران :۔ رینوکا دیوی پرتھوی راج

جاری کردہ :۔ شالیمار پکچرز شنکر سیٹھ روڈ۔ پونہ

THE ADEEB
DELHI

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only; single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the *Adeeb can be* returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Chandni Chowk, Delhi
[illegible] & Published from the office of
[illegible] Delhi

THE ADEEB DELHI

ایک اطلاع

ناظرین ادیب کو شاید علم ہوگا کہ "ادیب" ایسے مضامین اور افسانوں کیلئے جو فرمائش پر لکھے جائیں اعزازیہ پیش کرتا ہے جس کی تعداد دس روپے سے پچیس روپے تک ہوتی ہے۔ مضامین کے لئے ذیل کے عنوانات پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) ہندستانی تاریخ کا کوئی نیا پہلو
(۲) آجکل کی ہندستانی اقتصادی حالت
(۳) مشہور ہندستانی شعراء میں سے کسی کے کلام پر تنقیدی تبصرہ

اس اعلان کے جواب میں مضامین رجسٹرڈ ارسال کیے جائیں۔ جو مضامین منتخب ہوکر شائع ہونگے اُن کا اعزازیہ مضمون نگار کو ارسال کردیا جائیگا۔ لیکن اعزازیہ کا تعین اڈیٹر سے ہوگا۔

فصیح الدین احمد
اڈیٹر "ادیب" دھلی

ایک اعلان

"ادیب" کے لئے ایک ایسی تجربہ کار خاتون کی ضرورت ہے جو ادارت اور اشاعت میں معاون ہوسکیں۔ تنخواہ سو روپے ماہوار تک دی جاسکتی ہے۔

فصیح الدین احمد
اڈیٹر "ادیب" دھلی

چندہ سالانہ:- [illegible] علاوہ محصول

[illegible] علاوہ محصول

ادیب

اڈیٹرز:- سید محمد ارتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم اے

جلد ۱۰ | فروری ۱۹۳۹ء | نمبر [illegible]

فہرست مضامین

(فصیح الدین احمد ایم اے نے دیال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ادیب چاندنی محل دہلی سے شائع کیا)

نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد)

رونق (ناول) از قیسی رام پوری۔ شائع کردہ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو دہلی قیمت تین روپے۔ ناول میں مصنف کی تصویر بھی ہے۔

قیسی رامپوری کی نہ صرف افسانہ نگاری مسلم ہے بلکہ ناول بھی ہر اعتبار سے مکمل لکھتے ہیں اور پڑھنے والے کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ قیسی کے افسانے اچھے ہوتے ہیں یا ناول۔

قیسی اب تک بہت سے ناول لکھ چکے ہیں جن میں سے کئی کے دو دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ انکے ناول شروع ہی سے قاری کو اس قدر تیزی سے جذب کر لیتے ہیں کہ انسان انکو ختم کئے بغیر نہیں رہتا۔ "رونق" قیسی رامپوری کا تازہ ناول ہے اور اس قدر دلچسپ ہے کہ اسکو کئی بار پڑھنے کے باوجود طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ ہم اس ناول میں قیسی کو بالکل مختلف رنگ میں دیکھتے ہیں۔ یوں تو قیسی کا ہر ناول اپنی طرز کا جدا ہوتا ہے مگر "رونق" میں ایک خاص نظریہ کو پیش کیا گیا ہے جسکو اب تک کسی نے نہیں سمجھا ہے۔ انسان وعظ و تلقین سے بہت کم اپنی بری عادتیں ترک کرتا ہے۔ انکے سامنے جس قدر ممنوعہ طور پر ایک شے کو لایا جاتا ہے اتنا ہی وہ اسکی طرف لپکتا ہے۔ اس ناول میں قیسی نے گناہ و جرم کا علاج جرم و گناہ ہی کے ذریعہ کیا ہے۔ مگر اس طرح کہ جرم و گناہ کی کراہت قائم ہے اور وہ انسانی حیات کا جزو نہ بن جائے۔

کردار نگاری میں قیسی نے کمال کر دیا ہے۔ شروع ورق سے جو ظہیر کا کیریکٹر سامنے آیا ہے تو اس میں کہیں جھول نہیں پیدا ہوا ہے۔ وہ واقعاتی نشو و نما کے ساتھ چلا ہے۔ اور climax پر بھی نہیں ڈگمگایا ہے۔ زبان و تخیل اس قدر بلند ہے کہ صرف پڑھنے سے لطف لیا جاسکتا ہے۔ افسوس اتنے اچھے ناول کی لکھائی چھپائی اچھی نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پبلشر آئندہ ایڈیشن میں اسکی تلافی کر دینگے۔

برہنہ یہ قیسی رامپوری کا دوسرا ناول ہے اسکے پبلشر بھی رائل ایجوکیشنل بک ڈپو دہلی ہے۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے واقعی ہم برہنہ لوگوں کے درمیان گھر گئے ہیں اور خود بھی برہنہ ہیں۔ اسکو بھی "رونق" کی ایک کڑی کا ناول کہہ سکتے ہیں۔ مگر "برہنہ" "رونق" سے زیادہ تیز و آتشیں ہے۔ بیحد آتشیں۔

جنگ کے شعلے ہندستان کی سرحد کے قریب آکر ٹھنڈے ہوگئے تھے لیکن زمانہ جنگ میں ہندستانیوں نے جو جنگ سے بھی بدتر فضا اندرون ملک پیدا کر دی تھی اسکے ایسے نقشے اس ناول میں قیسی کے مشاق قلم نے پیش کئے ہیں کہ عبرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ ناول نہ صرف وقت کی صحیح آواز ہے بلکہ مستقبل کی بھی ایک گونج ہے۔ اس میں قیسی باغی ہوگیا ہے لیکن اس طرح کہ اس کا بلند نظریۂ حیات یہاں بھی ذرا پست نہیں ہوا ہے۔

قیسی نہ تو روسی لٹریچر سے متاثر ہے اور نہ یورپ کی تحریک سے۔ "برہنہ" میں اس نے اپنے ہی زور فکر سے وہ بات پیدا کر دی ہے کہ دنیا کا ہر انسان اس میں اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔ خاص طور پر ہندستانیوں کو تو اس نے بالکل ہی برہنہ کر دیا ہے۔ سرمایہ دار کو، غریب کو، لا مذہب کو، مذہب کے اجارہ داروں کو، سیاست کے علمبرداروں کو، دھرماتما کو، غرض ہر انسان کے اس نے کپڑے اتار کر اس کو اس کے اصل رنگ میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس تیز ناول کے کردار بھی اتنے ہی تیز ہیں اور بالکل جیتے جاگتے۔ بڑی ہولناک ٹریجڈی ہے یہ۔

پھندا (ناول) از قیسی رام پوری۔ پبلشرز رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ دہلی یہ ناول قیسی رامپوری کے متذکرہ بالا دونوں ناولوں کے علیحدہ موضوع کا حامل ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جس قدر نفسیات عامہ، روزمرہ کی زندگی، الحاد اور گرد و پیش پر قیسی رامپوری گہری نظر رکھتا ہے وہ بہت کم مصنفین کے حصہ میں آیا ہے اس ناول میں قیسی نے بجائے انسان کو پابند مذہب بنایا ہے مگر چونکہ انسان اب مذہب کی بھی پہلی ہی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو یہ عمارت ثریا تک ٹیڑھی چلی جاتی ہے۔ اس میں قیسی نے دو بھائیوں کے کردار کی عکاسی کی ہے۔ بڑا بھائی ایک مسلک کو اپنی روح کا سودا کرکے تھامے ہوئے ہے۔ اس نے مروجہ اسلام کو اسلام نہیں سمجھا ہے بلکہ کامل ڈسپلن کے ساتھ وہ اسلام کی اسپرٹ کا علمبردار ہے۔ دوسرا بھائی بھی اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے مگر روح کا کونہ کنوارہ جانے کی وجہ سے ایک عورت پھندا بنکر اسکے گلے میں اٹکتی ہے۔ وہ اپنے اصولوں میں دیانت کا ثبوت دینے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ تیسرا اہم کردار اس میں ایک اشتراکی کا ہے۔ ان تینوں کرداروں کی ہلکی سی ٹکر ہوئی ہے جس سے خوف ہوتا تھا کہ ناول اب بگڑا اب بگڑا۔ مگر یہاں بھی قیسی نے فن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ سب کچھ کہکر قصے میں گم ہو گیا ہے۔

قیسی کے یہ تینوں ناول ہمیں یقین ہے کہ ملک میں بیحد مقبول ہونگے۔

خاکستر بہار کوٹی کے افسانوں کا مجموعہ۔ پبلشر رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ دہلی۔ بہار کوٹی ایک عرصہ سے نظم، غزل اور مقالات لکھ رہے ہیں۔ مگر افسانہ نگاری کی طرف انہوں نے کم توجہ کی ہے۔ بہرنوع اب انکے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہمارے سامنے ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اب تک زیادہ افسانے نہ لکھکر اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ بہار کوٹی کے افسانے زندگی کی صحیح تصویریں ہیں۔ ہر افسانہ کامیاب ہے۔ صرف کہیں کہیں مقامی رنگ ذرا کھٹکتا ہے گر ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔ بہار کے افسانے جاندار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ انکے دوسرے افسانے بھی اسی قدر کامیاب ہونگے۔ شروع میں اردو کے خدمتگذار قیسی رامپوری کا نہایت سلجھا ہوا مقدمہ بھی ہے۔ بہار کوٹی کی زبان صاف اور کردار اعلیٰ ہیں۔

اُردُو تنقید پر ایک نظر

(از جناب ضیاء الاسلام صاحب۔ پی سی ایس)

اُردو کی پُرانی تنقید کچھ اس انداز کی تھی کہ اسکو تنقید مشکل ہی سے کہا جاسکتا ہے۔ تنقید کیلئے کوئی تلے ہوئے اصول قائم نہیں ہوئے تھے۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ذمہ دار تنقید تقریباً تھی ہی نہیں۔ زیادہ تر شاعر شیریں بیان اور شاعر نغز گفتار کہکر اچھے شاعر کا تذکرہ کردیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور تنقید نہ تھی۔ زندگی سے شاعری کو کیا نسبت ہے۔ اس طرف ہمارے تذکرہ نگاروں نے توجہ کی ہی نہ تھی۔ شاعر یا تصوف کی چاشنی کے لئے شعر کہتے تھے مثلاً میر کہتے ہیں ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

یا خوش وقتی کے لئے جیسا غالب نے کہا ہے ؎

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

نظیر نے البتہ حیات وکائنات کا جائزہ لینے کی کوشش کی اور اس میں انہوں نے ہماری شاعری میں پہلا قدم اُٹھایا۔ اُن کی بہت سی نظمیں ہمارے سوشل نظام کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ نظیر نے جنتا کی نگاہ سے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ یہ خود ایک بڑی تنقید ہے۔ لیکن ہمارے تذکرہ نگاروں نے اس وقت اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ "رُخ وعارض"۔ "کاکل وگیسو" اس زمانہ میں اپنی سادگی اور درازی کے باوجود زیادہ پُرفریب تھے یا سماج کو کوئی کام نہ تھا۔ اس لئے خیالی محبوب شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اُردو تنقید ابھی اس زینہ پر نہیں پہنچی ہے جس پر انگریزی تنقید ہے۔ تنقیدی لٹریچر ہمارے ہاں بہت کم ہے اور جو ہے وہ بھی بہت بلند پایہ نہیں۔ ہمارے نئے تنقید نگار اس معاملہ میں بڑی جانفشانی سے کام لے رہے ہیں۔ اور جو تنقید پیش کی جارہی ہے وہ بلند زاویوں سے لکھی جارہی ہے۔ موجودہ تنقید نگار اوّل اوّل پروپیگنڈے کے دھارا میں بہہ نکلے تھے۔ لیکن انہوں نے اب خود کو سنبھال لیا ہے اور انگریزی تنقیدی ادب کے اصولوں پر ہمارے ادب کو پرکھا جارہا ہے۔

درحقیقت اُردو تنقید انگریزی تنقید سے بہت [illegible] اپنے تنقید نگاروں نے ہم [illegible] انگریزی تنقید کے اصولوں [illegible] حالی نے مقدمہ شعر وشاعری میں اور آزاد نے اپنے مختلف مضامین میں اُردو ادب پر انگریزی تنقیدی اصولوں کے ماتحت خدمہ فرسائی کی۔ آزاد اور حالی نے زبان، محاورہ اور فن کو تو جانچا ہی لیکن اس کے علاوہ خیالات، رجحانات اور سماجی حالات پر خاص طور پر نظر ڈالی۔ اس طرح ہماری تنقید پر انگریزی تنقیدی ادب کا بڑا احسان ہے اور پھر انگریزی کے علاوہ یورپین تنقید سے بھی ہمارے ادیبوں نے فائدہ اُٹھایا۔ ہماری تعلیم چونکہ انگریزی میں تھی اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ ڈاکٹر بجنوری جب غالب پر لکھنے بیٹھے تو انہوں نے غالب کے کلام کا ہومر اور گوئٹے کے کلام سے موازنہ کیا۔ یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ انگریزی اصولوں کے ماتحت ہمارے ادب کا جائزہ لینے سے نرا فائدہ ہی نہیں ہوا مشرقی رُوح کو مغربی قدروں سے جانچا گیا۔ اسی طرح انگریزی شاعری کے ہم پہلو اُردو شاعری کو رکھکر دیکھا گیا اور کہا گیا کہ اس میں بوئے شراب ومحبوب زیادہ اور نیچر کی گلکاری کم ہے۔ زندگی اور سماج پر کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ماتحت نیا ادب پیدا ہوتا ہے۔ جو ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے حیات ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی روح پر کچھ دنوں پردہ سا پڑا رہا۔ یہ پردہ اقبال نے یکسر چاک کردیا۔ انہوں نے رُوح مشرق کو اپنے کلام میں اچھی طرح سے سمویا اور اس کو خوب اُجاگر کیا۔

میرے خیال سے نئے پُرانے کی پہچان کوئی ایسی پہچان نہیں جس کو دُودھ اور پانی کی طرح علیحدہ کیا جاسکے۔ پُرانی تحریکوں سے ہی نئی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔ نئے پُرانے کی بحث ایسی بحث ہے جس سے ادب کو کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ کچھ نئے نقاد مارکسسٹ نظریوں سے ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ جو چیز اس کسوٹی پر پوری اُترتی ہے وہ اچھی ہے۔ اور جو چیز اس سے مطابقت نہیں رکھتی وہ کچھ نہیں۔ لیکن شاعری اور ادب کی گہری قدریں ہمیشہ وہ ہی رہی ہیں جو آج ہیں۔ امیر کا ایک شعر ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اُردو شاعری میں نوع انسان کی محبت اور ہمدردی اور جھوٹے خداؤں کی صنم شکنی بنیادی رُوح کی طرح جاری وساری ہے۔ کبھی یہ رُوح دب گئی ہے کبھی زیادہ اُجاگر ہوگئی ہے۔ لیکن ادب سے کبھی غائب نہیں

ہوئی۔ ان نقادوں کو صرف فنی خوبیوں ۔ حسن بیان اور نشست الفاظ کی طرف توجہ کرتے ہیں، میں نقاد تسلیم نہیں کروں گا۔ ادب کو زندگی سے علیحدہ کرکے نہیں بلکہ زندگی کے آئینہ میں دیکھنا چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا۔ idealism و اب بھی ہماری شاعری میں ایک بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ مجازؔ کہتے ہیں ؎

کہیں نہ چاہوں کہ ہر اک ہاتھ میں پیمانہ ہو

جام اب لطفِ مئے و ساقی و میخانہ نہ ہو

اسی طرح جو نقاد صرف افادی نقطۂ نظر سے ادب اور شاعری کا جائزہ لیتے ہیں اور زبان الفاظ اور تکنیک کی طرف توجہ نہیں دیتے وہ بھی تنقید کا پورا حق ادا نہیں کرتے۔ تکنیک کے نئے تجربوں کو سرے سے ہی برا نہیں خیال کیا جاسکتا۔ میں صرف ان نقادوں کو غیر ترقی پسند کہوں گا جو تکنیک کے نئے تجربوں کے خلاف ہیں اور شاعری اور ادب میں نئے خیالات اور رجحانات کو سمونا برا سمجھتے ہیں۔

اگر آپ تنقید کو مکمل اور غیر مکمل نہیں بلکہ ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کے لیبل لگا کر ہی دیکھنا چاہتے ہیں تو دونوں میں فرق یہ ہے کہ غیر ترقی پسند نقاد چند الفاظ کے خول کو لیکر اس کی تعریف کریگا۔ نظم یا مضمون کے پس منظر سے اسکو کوئی تعلق نہ ہوگا۔ وہ دیکھے گا کہ کہیں زندگی کی گرناگوں نیرنگیوں کا سایہ تو اس پر نہیں پڑ گیا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچے گا کہ مصنف کے دل و دماغ کی کیا حالت ہے۔ اس کے خیالات زندگی کے کن تجربوں سے پھوٹے ہیں۔ اس نے کس تجربہ سے متاثر ہوکر اپنی نظم یا افسانہ یا خاکہ بنایا ہے اس نے کہاں سے وہ تڑپ لی ہے جس نے اس سے وہ نظم وہ افسانہ لکھوایا ہے۔ ترقی پسند تنقید نگار ان سب چیزوں کا جائزہ لیگا۔ وہ مبالغہ اور رمزیت سے گریز کریگا۔ وہ سماجی پس منظر اور زندگی کی گہرائیوں کا جائزہ لیتا ہوا اس نظم یا افسانہ پر غور کریگا۔ وہ دیکھنے کی کوشش کریگا کہ زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو کس طرح شاعر یا افسانہ نگار سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ دیکھے گا کہ کہاں تک اس نظم یا افسانہ میں تنقید حیات کی گئی ہے۔ اسکا اثر مختلف طبقوں پر کیا پڑتا ہے۔ وہ کون سا جذبہ دل میں پیدا کرتی ہے۔ وہ کہاں تک حقیقت سے ہم آغوش ہے۔ یہ پیمانے، یہ قدریں مکمل تنقید کی اصلیں ہیں اور ان سے چشم پوشی کرنا، تنقید نہیں تنقید کا منہ چڑانا ہے۔

پھر بھی یہ خیال کرلینا چاہیئے کہ ہر وہ تنقید نگار جو اشتراکی نقطۂ نگاہ پیش کرتا ہے یا وہ شاعر جو ایک متمول شخص کی حسین لڑکی سے ایک مزدور لڑکے کی موت پر جو اس سے محبت کرتا تھا نوحہ کراتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ کیونکہ ترقی پسندی اس وقت غائب ہوجاتی ہے۔ جب یہ لڑکی خود اپنی لڑکی ہو۔ تنقید کو پرکھنے کے لئے بھی ایک تنقیدی نظر درکار ہے۔ اور میرے خیال سے وہ ہی تنقید ترقی پسند ہے جس میں توازن ہے۔ کیونکہ بغیر توازن تنقید حیات ممکن نہیں۔

(منشور از نشر گاہ دہلی)

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

عارف کے شاگرد

نواب زین العابدین خاں عارف کے سوانح حیات کا ایک اہم حصہ

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ)

مرزا غالب مرحوم سے خاندانی مناسبت رکھنے کی وجہ سے اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے حمیدہ بیگم سے بہتر شاید کوئی اور مضمون نگار اس درجہ ذاتی معلومات نہ رکھنے کی وجہ سے مہیا نہ ہو سکتا (فصیح الدین احمد)

نانی اماں[1] خلد آشیانی نے فرمایا کہ صاحب عالم مرزا فخرو فتح الملک بہادر نواب زین العابدین خاں عارف سے ہی اصلاح اپنے کلام کی کراتے تھے۔

موصوفہ نے فرمایا تھا کہ صاحب عالم بہادر عارف مرحوم کو استادی کی تنخواہ ایک سو بیس روپے ماہوار تا زیست دیتے رہے۔ چنانچہ دیوان عارف میں ایک قصیدہ فتح الملک بہادر کی شان میں ہے اور جس سے اس واقعہ پر صاف روشنی پڑتی ہے ؎

ہے سر پہ میرے سایۂ دامانِ فتح ملک
کیا شکر ہو ادا کرمِ ذوالجلال کے
نیساں میں ابر اُٹھتے ہیں جتنے اِدھر اُدھر
ممنوں ہیں شاہزادۂ دریا نوال کے

عارف کی وفات کے بعد استاد ذوق کو اپنا کلام صاحب عالم نے دکھایا نواب مرزا خاں داغ نے بھی جو بعد میں "بلبل ہندوستان" اور "جہان استاد" کے لقب سے مشہور ہوئے سب سے پہلے زانوئے ادب عارف کے سامنے تہہ کیا۔ داغ کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی کہ خوش قسمتی سے اُن کو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں جیسے علم و ادب کے شیدا اور کامل فن کے تقرب کا فخر حاصل ہوا۔ اور اس بزم ادب میں شرکت کا موقع ملا۔ جہاں ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ چونکہ قدرت نے داغ مرحوم کو طبع موزوں بخشی تھی ایسی صورت میں کہاں خاموش رہ سکتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد سخن طرازی کی جانب مائل ہوئے۔ "ہونہار بروا

کے [illegible] [illegible]

[illegible] گرد کرد یا۔

مرزا تخلص رکھا گیا۔ [illegible]

تھی بلکہ حضرت داغ کی والدہ نے ان سب صاحبوں کو جو جو [illegible] ہوتے تھے پُر تکلف دعوت دی اور سامنے [illegible] تقسیم کی۔

کامل تین سال داغ عارف مرحوم سے اصلاح لیتے رہے [illegible] واقعات نے پلٹا کھایا۔ داغ کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ [illegible] ہی صاحب عالم فتح الملک بہادر ان کے سرپرست بن گئے۔ صاحب عالم خود شاعر تھے۔ رمز تخلص کرتے تھے۔ داغ کا کلام سن کر بہت پسند فرمایا، اپنے استاد یعنی حضرت ذوق کا شاگرد کرا دیا۔ جب ذوق نے مرزا کو اپنا شاگرد کیا تو بجائے مرزا کے داغ تخلص رکھا۔

نکتہ سنج جانتے ہیں کہ اس تخلص کی تبدیلی میں استاد ذوق کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔

عارف کو خطِ نسخ لکھنے کا شوق ہوا تو یہ میر جلال الدین خوشنویس (یہ اپنے وقت میں خط نسخ لکھنے میں یاقوت ثانی تھے) استاد بہادر شاہ ظفر کے پاس حاضر ہوئے اظہار شوق کے بعد استدعا کی کہ زمرۂ شاگرداں میں داخل کیا جاؤں۔ حسن اتفاق اُدھر تو اس زمانے میں عارف کی خوش کلامی کا شہرہ تھا اور ادھر میر صاحب کے دونوں صاحبزادوں نواب مرزا صاحب ظہیر اور امراؤ مرزا انور کو شاعری کا شوق تھا، ایک اچھے استاد کی تلاش تھی۔ میر صاحب کو یہ اچھا موقع ملا اُنھوں نے جواب میں کہا کہ میں تم کو یوں تو شاگرد کرتا نہیں، ہاں

---

[1] نانی اماں مرحومہ نواب معظم زمانی بیگم صاحبہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی صاحبزادی اور نواب زین العابدین خاں عارف کی بڑی بہو تھیں۔ ۱۹ رمئی ۱۹۴۵ء کو آپ نے اس جہانِ فانی سے سفرِ آخرت ۸۰ سال کی عمر میں کیا۔ موصوفہ کو علم الانساب میں بڑی مہارت تھی۔ اور یادداشت غضب کی پائی تھی۔ حضرت غالب کے شیدائی اکثر آپ کی خدمت میں استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتے تھے۔ بزرگوں کی آن بان مرتے دم تک نبھائی۔ افسوس کا شانۂ میری یہ شمع اب گل ہو گئی۔ جس کی روشنی میں دلی مرحوم کا ایک دھندلا سا عکس نظر آ جاتا تھا۔

[2] دیکھئے رسالہ "برہان" فروری ۱۹۴۳ء صفحہ ۱۳۱ تا ۱۳۴ میرا مقالہ "نواب زین العابدین خاں عارف"

بیاد کرتا تھا۔ [illegible]
میرے [illegible] کو شاعری کے رموز بتاؤ اور اس کے نکات سمجھاؤ۔ عارف
نے منظور کر لیا اور یہ معاملہ طے ہوگیا۔ عارف نے خطِ نسخ کی ایسی مشق کی کہ
ایک سال کے اندر استاد نے اصلاح دینی چھوڑ دی اور سند خوشنویسی
لکھ دی۔ مگر یہ دونوں استادزادے تا زیست عارف مرحوم ان سے ہی
اصلاح لیتے رہے۔ کیونکہ دونوں فطرت شاعرانہ رکھتے تھے۔ تھوڑے عرصہ
میں کچھ سے کچھ ہوگئے۔ عارف کی وفات کے بعد بہادر شاہ جنت آرام گاہ
نے اپنے استاد ذوقؔ کا ان کو بھی شاگرد کرادیا۔

آزادؔ، ظہیرؔ اور داغؔ یہ تینوں جواہر پارے جو آسمانِ ادب پر
مدتوں ضوفشاں رہے عارفؔ مرحوم کی اصلاح سے بنے بنائے ترشے ترشائے
استاد ذوقؔ کے ہاتھ آئے چنانچہ اہل نظر پرکھ سکتے ہیں۔ آزادؔ اور ظہیرؔ کے
کلام میں نشستِ الفاظ اور ترکیب و بندش وہی ہے جو مرزا غالبؔ کے
خوانِ نعمت کے ریزہ چینوں کا خاصہ ہے۔ ہاں داغؔ اس نعمت سے محروم
ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی علمی استعداد کم تھی۔

عام لوگوں میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ واقعی اس کے دلدادہ ہوگئے
تھے۔ مگر زبان نے ان کی فطری شوخ طبعی کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگہ
کا کام کیا اور ان کے اس تیکھے انداز پر ایک زمانہ والہ و شیدا ہوگیا۔
مگر داغؔ کا یہ حسنِ کلام غزل تک محدود ہے۔ قصائد، مثنوی بہت پست
ہیں۔ لیکن آزادؔ و ظہیرؔ قادر الکلام شاعر تھے۔ تمام اصنافِ سخن میں انکی طبیعت
کی روانی یکساں تھی۔ جو کچھ کہتے تھے ہموار کہتے تھے۔

کپتان الگزینڈر ہیڈرلے جو مسٹر جیمس ہیڈرلے کا چھوٹا بھائی تھا
اور فرانسیسی النسل تھا عارفؔ کا شاگرد تھا۔ اس غیر ملکی شاگرد کی شاعری
کو عارفؔ کی استادانہ اصلاح نے ایسا اجاگر کردیا تھا کہ وہ اکثر نہایت
سخت زمین اور مشکل قافیہ و ردیف ماہرِ فن استادوں کی طرح تلاش
کیا کرتا تھا۔ اور ایسی زمینوں میں تو شعر خوب کہتا تھا۔ یہ شعر دیکھئے کتنا خوب ہے ؎

کافر ہیں تو عشق میں تنہا بنے نہیں
دنیا میں اور کوئی مسلماں نکالئے

ہیڈرلے آزادؔ کی ذہانت و طباعی آپ پر اس عجیب اور جدید
ردیف کے شعر کو دیکھکر واضح ہوجائیگی۔ کہتا ہے ؎

کس بات کی پھبتی ہے واعظ ہوا ہے چہرہ کیا پُر نور اوہو
تجلّی [illegible] دل پہ آزادؔ کہاں میں اور کوہِ طور اوہو

غالبؔ کی اکثر غزلوں پر آزادؔ نے غزلیں کہی ہیں اور غالبؔ انداز
پیدا کرنا چاہا ہے۔ سنئے! کس مزے سے کہتا ہے ؎

جو گذر چکا ہم پر اس پہ اب گذرتا ہے
کون ہے بجز دشمن اور رازداں اپنا
دل کے خون ہونے کی اور کیا علامت ہے
چشم خوں فشاں اپنی، نالۂ خونچکاں اپنا

غالبؔ کی ایک مشہور غزل ہے "مرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے" اس
زمین میں آزادؔ نے ۳۰ شعر کی ۲ غزلیں کہی ہیں ان کے بعض اشعار بہت اچھے
ہیں۔ دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

گم ہے رکھا ہے جس نے قدم راہِ عشق میں
ہوگی وہ راہ اور جہاں راہبر ملے
وہ دن نہ ہو نصیب جو سلواؤں زخمِ دل
یارب نہ ہم نشیں کو مرے بخیہ گر ملے

لیکن دونوں غزلوں کا بیت الغزل ایک اور شعر ہے۔ لیکن اس شعر
کا رنگ غالبؔ کا نہیں داغؔ کا ہے ؎

کٹوائیں ہاتھ پھر نہ اگر ہو دعا قبول
اک ساغرِ شراب جو وقتِ سحر ملے

غالبؔ کا فیضانِ ترکیب آفرینی بھی عارفؔ کی شاگردی کے باعث آزادؔ
کے اشعار میں نمایاں ہے۔ دیکھئے ؎

مشہور ہو سرِ حلقۂ اربابِ جفا تم
معروف ہیں منجملۂ اصحابِ وفا ہم
ہیں شمع صفت انجمنِ دہر میں آزادؔ
سرگرم رہِ وادیٔ اقلیمِ فنا ہم

شورشِ ہنگامۂ ذوقِ تپیدن تو دیکھئے
زلزلہ کونین میں اپنے دلِ بسمل سے ہے

سکینہ صاحب نے ہیڈرلے آزادؔ کے اچھے اچھے شعر اپنے انتخاب میں
چن کر لکھے ہیں۔ آزادؔ کے یہ بے ساختہ شعر درج سے بالاتر ہیں ؎

وہ نہ آئے تو موت ہی آوے
ہم کو دونوں کا انتظار ہے آج

ے ماخوذ از "یورپین اور اینگلو یورپین شعرائے فارسی اردو" رسالہ آجکل جنوری ۱۹۴۶ء

ن کی باتیں ہمیں یاد ہیں کہ نہیں
ہم سے صاحب کوننگ عار ہے آج

چرخ سے طاقت آزمائی کی
کی تو طالع نے نارسائی کی

آج ہلتا نہیں سر ضعف سے اللہ اللہ
اسی سر سے کبھی دیوار گرائی ہوگی

نام لیتا ہوں ترا کب میں کسی کے آگے
منہ سے بے ساختہ باتوں میں نکل جاتا ہے

آزاد نے عارف کی تعریف میں ایک قصیدہ بہاریہ لکھا ہے اور
رف کی وفات پر ایک طویل مرثیہ مع تاریخ وفات بڑا پُر درد لکھا ہے۔
زاد کا دیوان مطبع احمدی آگرہ سے طبع ہوا تھا۔
الگزینڈر ہیڈلے آزاد نے ۱۲۷۷ھ میں وفات پائی۔
مرزا غالب اپنے چہیتے شاگرد میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں الگزینڈر
شتہر بہ الکھ صاحب مرگیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی
ہ اور مزاج دان تھا۔ اس محرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔
"عالم اسباب ہے اس کے حالات سے ہم کو کیا؟"

رام کشور

(از واحدی)

رائے بہادر ڈاکٹر رام کشور کو میں پینتالیس چھیالیس برس سے جانتا تھا۔ جامع مسجد کے سامنے ایڈورڈ پارک میں جہاں شہنشاہ ایڈورڈ کا بت کھڑا ہے ٹھیک اس جگہ ایک کرکٹ کلب کھیلا کرتی تھی۔ رام کشور بھی اس کلب کے ممبر تھے۔ میری اور مسٹر شمس الاسلام (عرف مولوی) کی عمر بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال تھی۔ اور رام کشور سترہ اٹھارہ کے ہوں گے۔ میں اپنے عزیز خواجہ فضل احمد صاحب شیدا کے ساتھ اس کلب میں جایا کرتا تھا اور مسٹر شمس الاسلام اپنے عزیز مفتی اسلام الحق صاحب مرحوم کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ سب کھیلتے اور ہم دوڑ دوڑ کر دور پھینکی ہوئی گیندیں لاتے۔ پھر رام کشور نے وکالت پاس کی۔ دلی اور لاہور کے چوٹی کے وکلا میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ رائے بہادر کا خطاب پایا۔ دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ مدتوں میں نے اُنہیں نہیں دیکھا۔ اور وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ لیکن میں نے یاد رکھا۔ وہ بھول بھال گئے۔ آخر تیرہ چودہ سال میں میرا اُن کا متعدد کمیٹیوں میں ساتھ رہا۔ پر ہم آپس میں متعارف نہ ہوئے۔ میں سمجھا کیا کہ وہ اغماض کرتے ہیں۔ حالانکہ بات یہ نہ تھی۔ سب سے پہلے میری اُن کی بات چیت عجیب موقع سے ہوئی اور اُس نے مجھ پر بڑا اچھا نقش چھوڑا اور اسی نقش کی یاد میں یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

جامع مسجد کمیٹی میں امام صاحب اور خان بہادر نواب ابوالحسن خاں صاحب کے درمیان کچھ ایسا اختلاف پڑ گیا کہ سُلجھائے نہ سُلجھتا تھا۔ مسٹر نصیح الدین احمد (مالک و ایڈیٹر ادیب) نے ہر دو بزرگوں کو اپنے ہاں جمع کیا اور مجھے اور رائے بہادر رام کشور کو مصالحت کی دعوت دی۔ رائے بہادر رام کشور ایسے ہندو تھے کہ روز صبح مندر اس طرح جاتے تھے کہ ننگے پیر جوتیاں ہاتھ میں لیکر کوٹھی سے موٹر تک پہنچتے اور پھر موٹر سے اُتر کر ننگے پیر جوتیاں سنبھالے مندر میں گھستے ــــ اور وکیل ایسے تھے کہ صرف بات کرنے کی فیس پانسو وصول کرتے تھے۔ مگر اُنہوں نے جامع مسجد کے معاملہ میں اس قدر دلسوزی اور دماغ سوزی سے دو گھنٹے صرف کئے کہ میں حیران رہ گیا۔ نہ صرف وقت مفت دیا بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جامع مسجد کمیٹی کی ابتری سے بے چین ہیں اور دو ممتاز مسلمانوں میں تفرقہ پڑتے دیکھ نہیں سکتے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ آج کل ہندو مسلمانوں میں جو کھینچا تانی ہے اس کی وجہ مذہب ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ مذہب اور خدا سے بیگانگی ہے۔ رائے بہادر خدا پرست بھی تھے اور دنیا کو بھی اُنہوں نے لطف کے ساتھ گزارا۔ وہ بڑی خوش باشی زندگی بسر کرتے تھے۔ مندر کے اندر وہ ہندو دھرم کے پکے پیرو تھے۔ اور مندر کے باہر اُن کا ملنا جلنا غالباً مسلمانوں سے زیادہ تھا۔ اُن کے رہن سہن اور ان کے درجہ کے مسلمانوں کے رہن سہن میں قطعی فرق نہ تھا۔ بلکہ مشرقیت اور دہلویت اُن میں اپنے درجہ کے مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔

ایک روز میں نے اُنہیں بتایا کہ میں آپ کو کلب کے زمانہ سے جانتا ہوں۔ پھڑک گئے ــــ اور نام بنام اپنے ساتھی مسلمان کھلاڑیوں کو پوچھنے لگے ایک سب سے اچھے کھلاڑی کا خاص طور پر ذکر کیا۔ میں نے کہا "وہ بیچارے اب پان چھالیہ کی معمولی دکان کرتے ہیں اور تکلیف میں ہیں"۔ بولے "بھئی! اُن سے کہنا کبھی کبھی ملا کریں۔"

رائے بہادری کا خطاب رام کشور کو خدا معلوم کیوں کر مل گیا تھا۔ مستحق تو وہ "سر رام کشور" کہلانے کے تھے۔ ہاں ــ اُن کا رویہ معتدل رہا تھا کہیں سے نہ لیتے تھے۔ نہ دیتے تھے۔ کچھ اور ترقی کرتے اگر ہنگامے برپا کر سکتے۔ اُن کے رویہ میں ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ کا سکون تھا۔ میں خود کچھ اسی رنگ کا سا آدمی ہوں۔ اس لئے مجھے وہ بے حد پسند تھے۔ میرے قلب پر اُن کی موت کا واقعی صدمہ ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دلی سے وہ شخص اُٹھ گیا جو دلی کی زینت اور سجاوٹ تھا۔ جس پر دلی ہمیشہ فخر کرے گی۔

ڈانٹ

(از جناب قیسی رام پوری)

پانچ سال زندگی کی لمبائی ہی کتنی ہے کہ اس کے پانچ سال انسان ڈاکٹری پڑھنے میں ضائع کر دے۔ ضائع میں اس خیال سے کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹری پاس کر لینے کے بعد اب تو ضروری نہیں ہے کہ بیماروں کی دنیا آپ کا بے چینی سے انتظار ہی کر رہی ہو۔ ہر ننے ڈاکٹر کو مکھیاں مارتے دیکھا ہے۔ لاکھ طبی نقطۂ نگاہ سے مکھیوں کا مارنا اچھا ہے اور ایک ڈاکٹر کو تو ان کو مارنے کا پہلا حق پہنچتا ہے۔ مگر وہ مکھیوں کو نہیں مارتا بلکہ مکھیاں مارتا ہے فعل یکساں ہے لیکن محاورے نے کیا سے کیا مفہوم بنا دیا۔ زندہ باد اردو۔

خیر۔ تو میں جب ڈاکٹری پاس کرکے آیا تو رات دن بیٹھا مکھیاں مارا کرتا تھا۔ جب یہ شغل زیادہ طویل ہونے لگا تو میں نے سوچا کہ جنگل میں جاکر تیتر بٹیر بھی کیوں نہ مار لایا کروں۔ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر کی حیثیت سے میں آخر مار ڈالنے ہی میں کیوں دلچسپی لے رہا تھا۔ مکھیاں مارنا، تیتر بٹیر مارنا ——— اور اگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے مریض آ گئے تو؟ لیکن مریض آ نہیں رہے تھے اور دوائیں میرے پاس بہت تھیں۔ جن کی خاصیت کو میں عملاً آزمانا چاہتا تھا۔ جب مریضوں نے دعلوم اپنی جان کی سلامتی کی خاطر یا میری غیر معروف پوزیشن کی وجہ سے آنے کی تکلیف نہیں کی تو اچھی اچھی دواؤں کو میں نے اپنے پر ہی آزمانا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی دبلا ہو جاتا تھا کبھی موٹا ——— کبھی بیمار تو کبھی تندرست۔

شکار کے لئے نکلنے میں تنہا یہ غرض پنہاں نہ تھی کہ تیتر یا بٹیر مار لاؤں۔ اس میں ایک لالچ اور تھا۔ وہ یہ کہ گاؤں میں جاکر بیماروں کو مفت دوا بانٹوں۔ احمقانہ لالچ تھا۔ اگر گاؤں والے میرے علاج کے خطرے سے بچ بھی گئے تو وہ اچھے ہو کر مجھے دے کیا سکتے تھے۔ کچھ ل تو ان ہی لوگوں سے سکتا تھا جن کی گاؤں والوں کی زندگیوں پر حکومت ہے۔ مگر وہاں تک رسائی نہ تھی۔ اس لئے میں نے اپنی دواؤں کو لاشوں پر ہی آزمانا چاہا۔ گاؤں کے لوگ لاشیں نہیں ہیں تو کیا ہیں۔ ہر اعتبار سے لاش ہیں۔

پھر مفت علاج کرنے میں ایک تجارت اور مقصود تھی۔ کہتے ہیں کہ ملتا ہے۔ اگر وہ دوائی دوا رہے بعض اوقات غریبوں کی مفت طبی امداد کرنے والے ہے تو وہ قرض ہوتا ہے چلتا ہے۔ انگریزی عقیدے کی خرابی سے تعبیر کیجئے۔ میں صریح طور پر دیکھ رہا تھا کہ اس "لین دین" آج بھی یعنی کاروباری زمانہ میں ایک بات بھی تو غرض یا للہیت کے سلسلہ میں نہیں کی جارہی ہے۔ قرابت داری، رسم و رواج، تعلقات، دوستی۔ زندگی گزارنے کے اصول حتیٰ کہ مذہب بھی کاروبار کی ایک منڈی بنا دیا گیا ہے۔ میں بھی اسی منڈی کا ایک کاروباری انسان تھا۔ کیوں نہ خدا کے بارے میں شک کرتا۔ معدودے کتاب میں تو یہ پڑھا ہے کہ خدا کا وجود ہے اور اس کے ماننے والے بڑے بلند کردار کے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر یہ اس کو ماننے کا حیلہ کرنے والے کیا لین دین کر رہے ہیں۔ اوہ! لیکن ہم "پروردۂ ماحول" ہیں۔ اور ماحول؟

دکھائے دیکھئے کیا تقدیر!

غرض مجھے بھی خدا سے سودا مقصود تھا۔ اگر اس کو یہ میری مفت میں غریبوں کو دوا دینے کی ادا پسند آگئی تو ممکن ہے وہ میرے ڈاکٹری کاروبار کو چمکا دے۔ چنانچہ میں شکار بھی کرتا رہا اور گاؤں میں جاکر غریبوں کو مفت دوا بھی دیتا رہا۔ متضاد حرکات میں ایک جنون پر طعنے کی ضرورت نہیں۔ آپ صریح دیکھتے ہیں کہ ایک شخص انتہائی تپاک کے ساتھ آپ سے بغلگیر ہوتا ہے۔ لیکن جونہی بغلگیری کا عالم ختم ہوا پیٹھ مڑی اور آپ پر تبرّہ بازی شروع ہو گئی۔ اسی طرح مصلے پر بیٹھے ہیں اور نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں۔ وہی بات۔ ہم پروردۂ ماحول ہیں۔ اور ماحول ہمیشہ جنون پیدا کرتا ہے۔ اب تہہ میں پہنچ کر موتی چننے والے نہیں رہے بلکہ کیچڑ میں لتھڑنے والے رہ گئے ہیں۔ احمق ڈاکٹر۔ کیا خرافات لے بیٹھا۔

ایک دن میں بندوق پشت پر لئے بائیسکل پر لدا ہوا کچی سڑک پر گاؤں کی طرف جا رہا تھا کہ پیچھے ذرا دور کسی موٹر کے انجن کی دھڑکن سنائی دی۔ میں پہلے ہی کچی سڑک کے بالکل آخری سرے پر چل رہا تھا مگر موٹر نے پھر بھی اپنی شان کے اعلان کے طور پر ہارن کے ذریعہ مجھے ڈانٹا۔ میں سڑک پر اور سکڑ گیا۔ اس کے باوجود وہ مجھے جھاڑیوں پر دھکیلتی اور پیچھے خاک دھول کا ایک طوفان چھوڑتی نکل گئی۔ گڑگڑاہٹ میں میں نے دو تین تھپتھپے سنے اور میں پچھڑے ہوئے پہلوان کی طرح آنکھ ناک میں سے خاک صاف کرنے لگا۔ اگر میری آنکھوں میں خاک نہ بھر گئی ہوتی تو میں گولی سے موٹر کے ایک پہیے کو بیکار کر سکتا تھا۔ دانت پیس کر رہ گیا۔

گاؤں اب بھی دو میل دور تھا۔ راستہ تھا کچا۔ اس لئے بائیسکل پر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ خرگوش نظر آیا جو دور سے میری بائیسکل کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ شکار کا وقت نہ رہا تھا۔ گر مجھے اس کی تواضع کرنی پڑی۔

شام ہو چکی تھی، ورنہ لو اب بھی بدستور چل رہی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ واپس لوٹ جاؤں۔ مگر گاؤں میں تین بچے چیچک سے سسک رہے تھے۔ وسمس اللہ دہیوں کو ملیریا نے چارپائی پر ڈال رکھا تھا۔ اس لئے ارادہ بدل دیا۔ اس وقت یہ تبدیلی فی سبیل اللہ نہیں تھی بلکہ کچھ عادت اور کچھ ڈاکٹری فرض مجھے گاؤں میں لے گیا۔ اور میری حیرت و غصہ کی انتہا نہ رہی ——— وہ موٹر گاؤں کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ وہی کاہی رنگ کی خاک اڑانے والی موٹر!

میں حقارت سے موٹر پہ نظر ڈال کر گذرنے ہی والا تھا کہ قریب کی جھونپڑی سے ایک آدمی واویلا کرتا ہوا میری طرف آیا۔ اور زور ہی سے "ہائے ڈاکٹر صاحب! میرا بچہ ——— !" کا اس نے نعرہ مارا۔

"کیا ہوا ———؟ کیا ہوا تمہارے بچے کو ———؟" میں نے رک کر دریافت کیا۔

"دوپہر کو مر گیا ——— لے گئی اسکو چیچک ماتا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"بہت برا ہوا۔" میں نے اس کے غم میں شرکت کر کے کہا۔ اپنے زیر علاج مریض کے مر جانے پر ڈاکٹر رنج کے بجائے خفت زیادہ محسوس کرتا ہے۔ میری بھی اس وقت کچھ اسی قسم کی حالت تھی۔ بہرنوع بچے کے باپ کو ڈھارس بندھا کر میں اپنے دوسرے مریضوں کو دیکھنے کیلئے ایک طرف مڑا۔ دفعتہً موٹر کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک بلند قامت ادھیڑ عمر کا انسان نکل کر میری طرف بڑھا۔ میں نے قصداً اپنے قدم تیز کر دیئے۔ مگر وہ جلد میرے قریب آ گیا۔

"معاف کیجئے ——— معاف کیجئے ——— کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟" اس نے رکتے رکتے پوچھا۔ اس کے لہجہ میں کسی قدر ندامت کا شائبہ تھا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟ کیا یہ کافی نہ تھا کہ آپ اپنی ناپاک موٹر سے اس تنگ اور کچے راستے میں میری آنکھوں میں خاک دھول بھر کر گذر گئے تھے!" میں نے خفگی سے کہا۔

"میں نہایت شرمندہ ہوں۔ اور معذرت چاہتا ہوں۔" اس نے ندامت سے کہا۔

"خیر ———" میرے دل کا غبار کم ہو گیا اور میں آگے بڑھنے لگا۔

"اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو براہ کرم ذرا تکلیف کیجئے۔ میری بچی کو شاید لو لگ گئی ہے۔ کیونکہ اس کو دفعتہً بخار ہو گیا ہے۔ نوازش ہوگی اگر آپ اسکو آ کر دیکھ لیں گے۔" اس شخص نے کہا۔

"آپ موٹر میں جا کر بیٹھئے۔ میں پہلے اپنے دوسرے مریضوں کو دیکھ آؤں" میں نے کہا۔ اور ایک جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ جب میں اپنے غریب مریضوں کو دوا دے رہا تھا تو موٹر کا کیس برابر میرے خیال میں رہا۔ میرے علاج کے درمیان اب تک موٹر نہیں آئی تھی۔ آج جو آئی تو میرے اندر ڈاکٹری حرص کو چھیڑتی ہوئی آئی۔ غریبوں کا علاج مجھے بار سا معلوم ہونے لگا۔ نفرت سے میں نے ان کو دوائیں دیں اور خوش خوش موٹر کے قریب آیا۔

میں نے بچی کو مفرح دوائیں اور حفاظتی تدابیر اختیار کر کے موٹر ہی میں مریضہ کے قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا شکار اور بائیسکل گاؤں ہی میں رہ گئی ——— موٹر کے مالک کا اصرار سب پر غالب آ گیا تھا۔

قصبہ میں پہنچ کر ہم ایک شاندار مکان میں داخل ہوئے۔ رات بھر مریضہ کے والدین جاگتے رہے اور میں بھی تیمارداری میں مصروف رہا۔ بچی کو افاقہ تھا۔ میرا علاج کامیاب ہو رہا تھا۔ اور میں توقع کر رہا تھا کہ ابھی کم از کم تین چار روز اور میں اس عظیم الشان کوٹھی میں مقیم رہ کر اُونچی فیس بھی کماؤں گا اور ٹھاٹھ بھی کرونگا ——— لیکن صبح ہوتے ہی فیملی ڈاکٹر (جو ایک معروف ڈاکٹر تھا) طلب کر لیا گیا اور مجھے رخصت کر دیا گیا۔

جنگل میں اگر کوئی کانٹا ہمارے چبھ جاتا ہے تو ہم آسانی سے ہاتھ آئے ہوئے ایک دوسرے مضبوط کانٹے سے اُسے کرید کر ڈھیلا کر لیتے ہیں پھر شہر میں پہنچ کر سوئی یا باقاعدہ آلاتِ جراحی کے ذریعہ اُس کانٹے کو نکلوا دیتے ہیں۔ گاؤں میں موٹر والے کو میں بھی اسی قسم کا ایک کانٹا مل گیا تھا۔ جس کے ذریعہ اُسنے چبھے ہوئے کانٹے کی جڑ کو ڈھیلا کیا تھا۔ پھر شہر آ کر سوئی اور آلاتِ جراحی کے مقابلہ میں مجھے حقیر جان کر پھینک دیا تھا۔

تین روز کے بعد میں پیدل اُفتاں و خیزاں اپنی بائیسکل لینے گاؤں پہنچا تو اس کے دونوں پہیوں کی ہوا نکلی ہوئی تھی۔ اور شکار سڑ کر سخت بدبو دے رہا تھا۔ اور اُس سے زیادہ میں خود اور میرا پیشہ مجھے ہوا نکلا ہوا اور متعفن معلوم ہو رہا تھا۔

W. SOMERSET MAUGHAM

نیرنگیِ حیات اور پدرانہ تفکرت

(ڈبلیو سومرسٹ ماڈم)
(مترجمہ جناب مظہر عزیز تقاہیم ایم بی اے (آنرز) ایل ایل بی - پی - سی - ایس)

ہنری گارنٹ کا معمول تھا کہ اپنا دن کا کام ختم کرنے کے بعد شام کو گھر جانے سے پہلے کلب جاکر برج ضرور کھیلتا۔

اُس کے ساتھ برج کھیلنے میں لطف آتا تھا۔ وہ نہایت خوش مزاج کھلاڑی تھا۔ کھیل کی تمام باریکیوں سے واقف ہونے کے علاوہ وہ اپنے پتّوں کا بہترین مصرف جانتا تھا۔ اگر ہارتا بھی تو خوش مزاجی اور شگفتگی کے ساتھ۔ اور جب جیتتا تو اپنے اچھے کھیل کو جیت کا باعث قرار نہ دیتا بلکہ اس کو اتفاق سے منسوب کرتا۔ اگر اس کا پارٹنر (ساتھی) کھیل میں کوئی غلطی بھی کرتا تو وہ بالعموم اسکی غلطی کا جواز پیش کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اس لئے یہ بڑی حیرت خیز بات تھی کہ آج وہ اپنے پارٹنر سے ترشروئی سے پیش آرہا تھا اور اس کی غلطیوں پر غصّہ کا اظہار کر رہا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت خیز بات یہ تھی کہ آج وہ خود خلافِ معمول کھیل میں ایسی غلطیاں کر رہا تھا جن کی اُس سے کبھی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ اور یہی نہیں بلکہ جب اس کا پارٹنر اُس کی کوئی غلطی اُسے سمجھاتا تو وہ چڑچڑے پن کے ساتھ اِس بات پر زور دیتا تھا کہ اُس نے کوئی غلطی کی ہی نہیں۔

مگر جن لوگوں کے ساتھ وہ کھیل رہا تھا وہ سب اُس کے پُرانے دوست تھے۔ اور اُن میں سے کسی نے بھی اس کی بدمزاجی کا بُرا نہ مانا۔

ہنری گارنٹ ایک مشہور فرم میں حصہ دار تھا۔ اُس کے ساتھیوں میں سے ایک کو خیال ہوا کہ شاید اُسے تجارت میں کچھ نقصان ہوا ہے۔

"آج مارکیٹ کا کیا حال رہا؟" اُس نے پوچھا۔

"ٹھیک تھا۔"

ظاہر تھا کہ ہنری گارنٹ کی آزردگی کا باعث کوئی تجارتی معاملہ نہ تھا مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ بات تھی ضرور۔ کیونکہ آج وہ غیر معمولی طور پر سست، متفکر اور پریشان نظر آرہا تھا۔ وہ ایک خوش باش اور خوش گزراں شخص تھا۔ اسکی صحت

بہت اچھی تھی۔ [illegible] ... ہمیشہ [illegible] تھا اور [illegible] کھیلنے [illegible] ... کیا کرتا تھا۔ مگر آج وہ گم سم بیٹھا تھا۔ اُس کے ایک دوست نے یہ خیال کرکے کہ ہنری گارنٹ اس گفتگو میں ہمیشہ دلچسپی لیتا ہے۔ اُس سے پوچھا

"ہنری! تمہارا لڑکا تو خیریت سے ہے۔ بھئی ٹورنامنٹ میں لڑکے نے کمال ہی کر دیا۔" مگر ہنری گارنٹ کا منہ اور زیادہ اُتر گیا۔

"ہوں! اُس کی کامیابی غیر متوقع نہ تھی۔"

"وہ کب مونٹی کارلو (Monte Carlos) سے واپس آیا ہے؟"

"وہ تو کل رات ہی یہاں پہنچ گیا۔"

"اُسے یہ سفر پسند بھی آیا؟"

"ہاں — خیال تو یہی ہے کہ پسند آیا ہوگا۔ مگر یہ نہایت زبردست حماقت تھی اُس کی۔"

"اوہ! مگر وہ کیسے؟"

"بھئی تم بُرا نہ ماننا۔ مگر میں اُس کے بارے میں کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔"

اُس کے [illegible] دوستوں نے حیرت سے اسکی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

ہنری گارنٹ نے مُنہ بنایا اور رُکھائی سے کہا۔

"پارٹنر، تمہاری کال (Call) ہے"۔

کھیل پھر خاموشی اور ایک عجیب کھنچاوٹ کے ساتھ شروع ہوا۔ گارنٹ کی آخری "کال" کے بعد کسی نے "کال" نہ دی اور وہ اتنا خراب کھیلا کہ تین ہاتھ ڈاؤن (Down) ہو گیا۔ کسی نے ایک لفظ نہیں کہا۔ دوسرا گیم (Game) شروع ہوا۔ اور اس "گیم" (بازی) میں اس نے اپنے پارٹنر کے سُوٹ (Suit) کو ڈینائی (Deny) کیا۔

"کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں؟" اس کے پارٹنر نے پوچھا۔

گارنٹ کا چڑچڑاپن اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اُس نے کوئی جواب ہی نہ دیا۔ اور جب بازی ختم ہونے پر معلوم ہوا کہ اسے ریووک (Revoke) دینا پڑا تو یہ اُمید کرنا مشکل تھا کہ اس کا پارٹنر چپ رہے گا۔

"ہنری! تمہیں آج کیا ہو گیا ہے؟ تم گدھوں کی طرح کھیل رہے ہو۔"

گارنٹ بوکھلا سا گیا۔ خود اپنے ہارنے کی اُسے زیادہ پرواہ نہ تھی مگر یہ خیال کرکے کہ وہ اپنے پارٹنر کو ہرانے کا ذمہ دار ہے، اُسے دُکھ ہوا۔ وہ ایک انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اب بھلا وہ کھیلنا چاہیئے۔ میرا خیال تھا کہ چند ربڑ کھیل کر مجھے کچھ ذہنی سکون حاصل ہوگا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ آج مجھ سے کھیلا نہیں جا رہا ہے۔ میں بہت پریشان خاطر ہوں۔"

سب ہنسنے لگے۔

"تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تم پریشان ہو۔"

گارنٹ نے ایک غمگین مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"میں شرط لگاتا ہوں کہ آج جو کچھ مجھے پیش آیا ہے اگر وہ تمہارے ساتھ ہوا ہوتا تو تمہاری بھی ایسی ہی حالت ہوتی۔ میں ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہوں۔ تم میں سے کوئی مجھے اس سے چھٹکارے کی تدبیر بتا سکے تو میں واقعی احسان مند ہوں گا۔"

آؤ ــــ پہلے تھوڑی سی پی لیں۔ پھر بتانا کہ تم پر کیا گزری ہے۔

ہم میں سے ایک بیرسٹر ہے۔ دوسرا ڈاکٹر ہے اور تیسرا ہوم آفس کا ایک ذمہ دار افسر ہے۔ ہم سب تجربہ کار اور زمانہ دیکھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم تمہیں صحیح رائے نہیں دے سکتے تو کوئی نہیں دے سکتا۔

بیرسٹر اٹھ کھڑا ہوا اور ویٹر کو بلانے کیلئے گھنٹی بجائی۔

"میں اسی گدھے ــــ اپنے بیٹے ــــ کے بارے میں متفکر ہوں۔" ہنری گارنٹ نے کہا۔

شراب کا دور چلنے لگا اور ہنری گارنٹ نے اپنی داستان شروع کی۔

یہ لڑکا اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا نام نکولاس تھا مگر پیار میں سب اسے "نکی" کہتے تھے۔ اس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ اس کے علاوہ گارنٹ کے دو لڑکیاں بھی تھیں ــــ ایک سولہ سال کی اور دوسری بارہ سال کی ــــ اور گو یہ بات کتنی ہی عجیب کیوں نہ ہو (کیونکہ ہر باپ اپنی بیٹیوں کو زیادہ چاہتا ہے۔ اور گارنٹ ہر امکانی کوشش اس بات کی کرتا کہ اپنی ہر اولاد سے یکساں محبت کرے) مگر یہ واقعہ تھا کہ وہ سب سے زیادہ اپنے بیٹے ہی کو چاہتا تھا اور ہر چیز اس پر قربان کرنے کے لئے تیار رہتا۔ اور اس میں گارنٹ کی کچھ خطا نہ تھی۔ نکی تھا ہی ایسا لڑکا جو ہر باپ کیلئے قابلِ فخر ہوتا۔

وہ چھ فٹ دو انچ لمبا، مضبوط قویٰ رکھنے والا، سجیلا اور بانکا جوان تھا۔ وہ ہمیشہ سرو کی طرح سیدھا کھڑا ہوتا تھا۔ اس کا سر نہایت خوبصورت تھا۔ بال سنہرے گھونگریالے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ ہونٹ سرخ اور بھرے بھرے تھے۔ جب وہ ہنستا تھا تو اس کے خوبصورت سفید دانت نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ وہ شرمیلا تھا مگر اس کے انداز میں حیا اور بردباری تھی۔

وہ بہت ملنسار، خلیق اور ہنس مکھ تھا۔ نہ صرف شریف اور تندرست والدین کا بچہ تھا بلکہ اس کی تربیت بھی بہت اچھی ہوئی تھی۔ اس کے والدین نے اسے شروع ہی سے اچھے اسکول میں تعلیم دلائی تھی۔ ان تمام اثرات کا نتیجہ ایک ایسے خوش شکل اور حسین نوجوان کی صورت میں رونما ہوا تھا جس کے مثل ہر روز نظر نہیں آتے۔ اس کو دیکھتے ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کا باطن بھی اس کے ظاہر کی طرح پاک و صاف ہے۔ اس کے والدین کو کبھی اس کے بارے میں کوئی فکر لاحق نہ ہوئی تھی۔ وہ کبھی بیمار نہ ہوا تھا اور نہ اس سے کبھی کوئی بیہودگی سرزد ہوئی تھی۔ اسکول کی رپورٹیں اس کی تعریف سے بھری ہوتی تھیں۔ وہ اپنے ساتھیوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ اس نے بہت سے انعامات حاصل کئے تھے اور اپنے اسکول کی فٹ بال ٹیم کا کپتان بھی تھا۔ یہی نہیں بلکہ چودہ برس کی عمر ہی سے اس نے ٹینس بہت اچھی کھیلنی شروع کر دی تھی اور یہ وہ کھیل تھا جسے اس کا باپ نہ صرف پسند ہی کرتا تھا بلکہ خود بھی اچھا کھیلتا تھا۔ اس نے اپنے لڑکے کے اس شوق کو کافی ابھارا۔ چھٹیوں میں اسے ٹینس سکھانے کے لئے بہترین پروفیشنل (Professional) کھلاڑیوں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ سولہ برس کی عمر ہی میں اس نے کئی "لڑکوں کے ٹورنامنٹ" جیت لئے تھے۔ ٹینس میں وہ اپنے باپ کو اس بری طرح ہراتا تھا کہ صرف شفقتِ پدری ہی اس ہار کے اثر کو مٹانے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔

اٹھارہ سال کی عمر میں نکی کیمبرج گیا اور اب اس کے باپ کو یہ خواہش دامنگیر ہوئی کہ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر لینے سے پہلے نکی اتنا اچھا کھلاڑی بن جائے کہ ٹینس میں اپنی یونیورسٹی کی نمائندگی کر سکے۔

نکی میں ایک بڑا کھلاڑی بن جانے کی تمام صلاحیتیں اور علامات موجود تھیں۔ لمبا تڑنگا ہونے کے علاوہ وہ تیز قدم اور تیز نگاہ بھی تھا۔ نہ معلوم کیونکر اسے احساس ہو جاتا تھا کہ گیند لوٹ کر کہاں آئیگی اور اس لئے وہ آسانی سے وہیں پہنچ جاتا تھا۔ اس کی سروس (Service) بلا کی تیز ہوتی تھی اور گیند زمین پر پڑ کر ایسے زاویہ سے اچھلتی تھی کہ اس کا لوٹانا دشوار ہو جاتا تھا۔ اور اس کا سیدھے ہاتھ کا ڈرایو (Drive) تو بہت ہی زبردست تھا۔ الٹے ہاتھ کی گیند وہ اتنی اچھی طرح نہ کھیل سکتا تھا۔ اور اس کی "والی" (Volley) بھی زیادہ صحیح نہ پڑتی تھی۔ اس لئے کیمبرج جانے سے پہلے اس کے باپ نے ان خامیوں کو دور کرنے کیلئے خوب مشق کرائی

تھی جس کے باپ کی دلی تمنا تھی ——— تو اس نے اس کا اظہار کسی سے بھی نہ کیا تھا ——— کہ اس کا بیٹا ومبلڈن ٹورنامنٹ میں کھیلے۔ اور اُسے موہوم سی اُمید اس بات کی بھی تھی کہ شاید نکی "ڈیوس کپ" کے مقابلہ کیلئے منتخب کر لیا جائے۔ جب کبھی عالم خیال میں ہنری گارنٹ اپنے بیٹے کو کسی امریکن چیمپین کو ہرا کر جال پھاندتے ہوئے اور تالیوں اور نعروں کے شور میں مفتوح سے ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھتا تو اس کے حلق میں فرط مسرت سے کوئی چیز اٹک جاتی۔

ہنری گارنٹ ہر سال باقاعدہ ومبلڈن ٹورنامنٹ دیکھنے جاتا تھا اور بہت سے ٹینس کھیلنے والے یا ٹینس میں دلچسپی لینے والے اُس کے دوست تھے۔ ایک شام کسی ڈنر میں اسکی ملاقات کرنل برے بیزون (Colonel Brabazon) سے ہوئی جو ٹینس کا بہت دلدادہ تھا۔ باتوں باتوں میں وہ نکی کے کھیل اور اس بار کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے کھیلنے کیلئے اُس کے انتخاب کے امکانات پر گفتگو کرنے لگے۔

"موسم بہار کا ٹورنامنٹ کھیلنے کیلئے تم اُسے مونٹی کارلو کیوں نہیں بھیجتے؟" کرنل نے اچانک کہا۔

"اوہ! ——— م م م میرا خیال ہے کہ ابھی وہ اتنا اچھا نہیں کھیلتا ہے۔ ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے۔ صرف اٹھارہ برس ہی کا تو ہے۔ کیمبرج گزشتہ اکتوبر ہی میں گیا ہے ——— وہاں جرمنی اور فرانس کے اچھے کھلاڑیوں کے مقابلہ میں نہ جم سکے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ آسٹن اور فان کریم وغیرہ کے آگے وہ نہ ٹھہر سکے گا مگر شاید اُن کے خلاف بھی وہ ایک دو "گیم" (Game) لے ہی لے۔ اور اگر اتفاق سے کسی نسبتاً کم درجہ کے کھلاڑی سے مقابلہ پڑ گیا تو بہت ممکن ہے دو تین "میچ" بھی جیت لے۔ اسے اب تک کسی فرسٹ کلاس کھلاڑی کے ساتھ کھیلنے کا موقع بھی تو نہیں ملا ہے! تم اُسے مونٹی کارلو ضرور بھیجو۔ اسی بہانہ سے اُسے اچھی مشق ہو جائے گی اور اس کا حوصلہ کھل جائے گا۔ یقین مانو، وہاں جا کر وہ بہت کچھ سیکھ لے گا۔ جو یہاں کے ٹورنامنٹوں میں کھیل کر وہ کبھی نہیں سیکھ سکتا۔"

"ہوں! یہ بات تو میں نے کبھی سوچی ہی نہیں ——— مگر میں پڑھائی کے ٹرم (Term) کے دوران میں اُسے کیمبرج سے باہر نہیں جانے دونگا۔ میں نے ہمیشہ اُسے یہی سمجھایا ہے کہ ٹینس تو صرف کھیل ہی ہے اور اسے اس کی پڑھائی میں حارج نہ ہونا چاہیئے۔"

اس پر کرنل برے بیزون نے گارنٹ سے پوچھا کہ ٹرم کب ختم ہوگا اور جواب ملنے پر کہا۔

"اوہ! تب تو اب [illegible] ہوگی۔ جس سے کچھ نقصان نہ ہوگا۔ دیکھو ہنری! اِن دو کھلاڑیوں پر ہم بھروسہ کئے ہوئے تھے انہوں نے آخری وقت میں ہمیں دھوکا دیا اور مونٹی کارلو جانے سے انکار کر دیا۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ ہماری خواہش ہے کہ بہتر سے بہتر ٹیم ٹورنامنٹ کھیلنے کے لئے بھیجیں۔ جرمنی اور امریکہ سے کافی زبردست ٹیمیں آرہی ہیں۔"

"دوست! اب تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اوّل تو نکی اتنا اچھا کھلاڑی نہیں اور دوسرے میں نہیں چاہتا کہ اس کی عمر کے لڑکے کو بلا کسی نگراں کے مونٹی کارلو بھیج دوں۔ میں خود اُس کے ساتھ چلا جاتا مگر مجھے فرصت ہی نہیں ہے۔"

"میں خود جو اُس کے ساتھ ہوں گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میں انگلستان کی ٹیم کے Non playing کپتان کی حیثیت سے وہاں جا رہا ہوں۔ تم اطمینان رکھو۔ میں تمہارے لڑکے کا نگراں رہوں گا۔"

"تم تو اپنے انتظامات وغیرہ میں پھنسے رہو گے۔ میں تم پر اس ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ نکی نے اپنی زندگی میں کبھی انگلستان کے باہر قدم نہیں نکالا ہے۔ اور سچی واقعہ یہ ہے کہ اگر میں نے اسے مونٹی کارلو بھیج دیا تو اُس کے واپس آنے تک مجھے ایک منٹ کو چین نہ آئیگا۔"

یہ گفتگو یہیں ختم ہوگئی اور ہنری گارنٹ اس کے فوراً بعد ہی اپنے گھر چلا گیا۔ اپنے بیٹے کے کھیل کے بارے میں کرنل برے بیزون کی رائے سُنکر وہ اتنا زیادہ خوش ہوا تھا کہ یہ تمام قصہ اپنی بیوی سے بتائے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم نے کچھ سُنا بھی۔ کرنل کا خیال ہے کہ نکی مونٹی کارلو میں انگلینڈ کی طرف سے کھیلنے کے قابل ہے۔ اس نے نکی کا کھیل دیکھا ہے اور وہ اسکے اسٹائل (Style) کی بہت تعریف کرتا تھا۔ پیاری! تم دیکھ لینا ایک دن وہ ومبلڈن میں "سیمی فائنل" کھیلے گا۔"

گارنٹ کو یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ مسز گارنٹ نے خلاف توقع نکی کو مونٹی کارلو بھیجنے کی کوئی مخالفت نہ کی۔

"ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ میرا بچہ بہت نیک ہے۔ آج تک اُس نے کوئی برائی نہیں کی۔ یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں کہ وہ برائی کی طرف مائل ہو جائے گا۔"

"مگر اُس کی پڑھائی کا بھی تو خیال ہے۔ ٹرم ختم ہونے کو ہے۔"

"مگر تین دن میں کون سا بڑا حرج ہو جائیگا! ایسا موقع بار بار نہیں آتا۔ نکی کو یہ معلوم ہو تو وہ کتنا خوش ہوگا!"

ٹھیک ہے۔ مگر میں اسے مونٹی کارلو جانے دونگا۔ میں نے اسے کیمبرج صرف ٹینس کھیلنے کیلئے نہیں بھیجا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بہت نیک ہے اور مستقل مزاج بھی ہے۔ مگر ابھی اس کی اتنی عمر نہیں کہ مونٹی کارلو جیسی جگہ اکیلا بھیج دیا جائے۔

"تم کہتے ہو کہ بین الاقوامی کھلاڑیوں کے مقابلہ میں وہ نہ جم سکے گا، مگر کون کہہ سکتا ہے؟ ——— کھیل ہی تو ہے!"

ہنری گارنٹ نے لمبی سانس لی اور سوچنے لگا ——— گھر واپس آتے ہوئے کار میں اسے خیال آیا تھا کہ آسکن کی تندرستی اچھی نہیں اور فلاں کریم کا کھیل بھی آج کل معمول سے کچھ اترا ہوا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کیلئے فرض کر لیا جائے کہ نکی کی قسمت نے یاوری کی تو ——— اور اس کے بعد پھر وہ کیمبرج کی ٹیم میں تو ضرور ہی لے لیا جائے گا ——— مگر یہ سب خیالی پلاؤ ہیں۔

"نہیں ڈارلنگ! یہ ممکن نہیں۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کر دیا ہے اور اب میں اپنا ارادہ نہ بدلوں گا۔"

مسز گارنٹ چپ ہو گئیں۔ مگر اگلے دن ہی اس نے یہ سب باتیں نکی کو لکھ دیں اور یہ بھی لکھ دیا کہ اگر وہ مونٹی کارلو جانے کیلئے اپنے باپ کی اجازت لینا چاہے گا تو وہ اپنے طریقہ پر اس کی مدد کرے گی۔ اس کے دو تین دن بعد ہنری گارنٹ کو نکی کا خط ملا۔ جس کے حرف حرف سے اشتیاق اور بیتابی کا اظہار ہوتا تھا۔ نکی اپنے ٹیوٹر (Tutor) سے مل چکا تھا۔ جو خود ٹینس کا کھلاڑی تھا اور "پرووسٹ" (Provost) سے بھی اپنے متعلق کرنل برے بیزولن کی رائے بیان کر چکا تھا۔ ان دونوں کو ٹرم کے ختم ہونے سے پہلے نکی کے مونٹی کارلو جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ان دونوں ذمہ دار ہستیوں کا خیال تھا کہ نکی کو ایسا اچھا موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ خود نکی کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ تین چار دن میں پڑھائی میں کون سا حرج واقع ہو جائیگا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر اس بار اسے مونٹی کارلو جا کر کھیلنے کی اجازت دیدی گئی تو وہ اگلی ٹرم میں بڑی توجہ، یکسوئی اور محنت سے پڑھے گا۔ نکی نے بہت مدلل اور معقول خط لکھا تھا۔

مسز گارنٹ نے ناشتہ کی میز کے پاس بیٹھے ہوئے اپنے شوہر کو یہ خط پڑھتے دیکھا اور اس کے چہرے پر جو تکدر اور تردد کے آثار نمایاں تھے اُن کی پرواہ نہ کی۔ گارنٹ نے خط پڑھکر بیوی کے آگے پھینک دیا۔

"نہ معلوم کیوں تم نے نکی کو وہ بات کا ذکر میں نے صرف تم ہی سے کیا تھا ——— یہ بہت بُرا ہوا ——— مونٹی کارلو جانے کے لئے مشتاق اور بے چین بنا دیا ہے۔ اب اُس کا دل پڑھائی میں کیا خاک لگے گا"

"مجھے تو اس کا خیال بھی نہ تھا کہ وہ ایسا بیتاب ہو جائیگا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اسے یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ کرنل برے بیزولن اس کے کھیل کے بارے میں کتنی اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی کسی کو اسکے متعلق صرف بُری باتیں ہی کیوں بتایا کرے۔ نکی کو میں نے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ اُس کا مونٹی کارلو جانا بالکل ناممکن ہے۔"

"مگر تمہیں اندازہ نہیں کہ تم نے مجھے کتنی بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ اگر مجھے کسی بات سے نفرت ہے تو اس سے کہ میری اولاد میرے بارہ میں یہ خیال کرے کہ میں اُن کی تفریح میں خلل ڈالتا ہوں اور ظالم ہوں۔"

توبہ! توبہ!! خدا نہ کرے۔ میرا نکی کیوں ایسا خیال کرنے لگا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ سمجھے گا کہ تم بعض اوقات اپنی بات پر اڑ جایا کرتے ہو مگر مجھے یقین ہے کہ وہ اتنا سعادتمند بچہ ہے کہ یہ ضرور سمجھ جائے گا کہ تم اس کی بھلائی کی خاطر سختی کر رہے ہو۔"

"او خدا!"

مسز گارنٹ کا زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جنگ آدھی جیتی جا چکی ——— اوہ! مردوں سے حسب خواہ کام کرا لینا کتنا آسان ہے!

دکھانے کو تو ہنری گارنٹ اڑتالیس گھنٹے تک اپنی ہٹ پر اڑا رہا مگر آخر کار مان گیا۔ اور دو ہفتے بعد نکی کیمبرج سے لندن آگیا جس دن صبح کو وہ مونٹی کارلو جانے والا تھا اس سے پہلی رات کو جب مسز گارنٹ اور اسکی بڑی لڑکی کھانے کی میز سے اٹھکر دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو ہنری گارنٹ نے سوچا کہ نکی کو نصیحت کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔

"میری خواہش نہ تھی کہ تم اکیلے مونٹی کارلو ——— مگر چونکہ اب تم جا ہی رہے ہو تو مجھے اُمید ہے کہ تم اپنے ہوش و حواس بجا رکھو گے میں تین چیزوں کے خلاف تم کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی چیز جُوا ہے ——— جُوا نہ کھیلنا

دوسری چیز قرض ہے ——— کسی کو قرض روپیہ نہ دینا

اور تیسری اور سب سے خطرناک چیز عورت ہے ——— عورتوں سے کوئی واسطہ نہ رکھنا

اگر تم نے ان تینوں باتوں پر عمل کیا تو تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ان کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔"

"بہت اچھا ابا۔"

"دیکھو! یہ میری آخری ہدایت ہے۔ مجھے دنیا کا بہت تجربہ ہے اور تم یقین رکھو کہ میں یہ سب تمہارے بھلے ہی کیلئے کہہ رہا ہوں۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی نصیحت کو یاد رکھوں گا۔"

"تم بڑے اچھے بیٹے ہو۔ آؤ اب دوسرے کمرے میں چلیں۔"

مونٹی کارلو میں نکی نے ڈاکسٹن کو ہرایا نہ خان کریم کو۔ مگر اس نے اپنا بعد بھی نہ گرائی۔ اس نے ایک ہسپانوی کھلاڑی کے خلاف غیر متوقع طور پر ایک میچ جیتا اور آسٹریا کے چیمپین کو ہراتے ہراتے رہ گیا۔ اور ایسا مقابلہ کیا کہ لوگ عش عش کرتے رہ گئے۔ مکسڈ ڈبلز (Mixed doubles) میں وہ سیمی فائنل تک پہنچا اس کی جاذب نظر شخصیت سے سب مسحور ہو گئے اور وہ خود اپنے آپ سے بہت خوش ہوا۔ سب نے اس کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ اس میں ترقی کی بڑی صلاحیتیں ہیں اور کرنل بروسے بیرون نے کہا کہ فرسٹ کلاس کے کھلاڑیوں کے ساتھ کچھ دن اور کھیل کر وہ اپنے باپ کے لئے قابل فخر بیٹا بن جائے گا۔

ٹورنامنٹ ختم ہو گیا اور اس کے اگلے دن ہی اُسے ہوائی جہاز سے لندن واپس ہونا تھا۔ ٹورنامنٹ کے دوران میں چونکہ اُسے اچھے سے اچھا کھیلنے کی دھن لگی ہوئی تھی اس لئے اُس نے ہر بات میں کافی احتیاط کی تھی۔ سگریٹ بہت کم پی تھی اور شراب تو چھوئی تک نہ تھی اور رات کو بھی وہ سویرے ہی سو جاتا تھا۔ مگر ٹورنامنٹ کے ختم ہو جانے کے بعد آخری شام کو اُس کا جی چاہا کہ مونٹی کارلو کی سیر کی جائے جس کے بارہ میں اس نے پہلے سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس دن شام کو ٹورنامنٹ کمیٹی کی طرف سے سب ٹینس کے کھلاڑیوں کو ڈنر دیا گیا۔ ڈنر کے بعد آن سب کے ساتھ اسپورٹنگ کلب (Sporting club) گیا۔ اس کی عمر میں وہاں جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔

"مونٹی کارلو" کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اس سے پہلے نکی نے سنیما کے علاوہ اور کہیں "رولٹ" (Roulette) کھیلا جاتا نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہاں کی ہماہمی دیکھ کر گھبرا سا گیا اور وہیں میز کے پاس کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ مختلف جسامت کے "chips" (ٹکلیاں) سبز میل کلاتھ پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ "کروپیر" (Croupier) نے پہیئے کو تیزی سے گھمایا اور ایک سفید گیند کو بیچ میں پھینک دیا۔ ایک کبھی ختم نہ ہونے والی ساعت کے بعد (کیونکہ اُس وقت ایسا ہی معلوم ہوتا تھا) گیند رکی اور ایک دوسرے کروپیر نے ہارنے والوں کی ٹکلیاں سمیٹ لیں۔ اس کے بعد نکی اُس جگہ گیا جہاں "روژ۔ اے۔ نوار" (Rouge-et-Noir) کھیلا جا رہا تھا۔ مگر وہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور [illegible] گئی جہاں "بکارا" (Baccarat) کی بازیاں [illegible] بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہاں پہنچتے ہی اُسے ایک طرح کا کھنچاؤ سا محسوس ہوا۔ دیکھنے والے اور تماش بینوں کے درمیان ایک پیتل کا جنگلہ تھا اور میز کی دونوں طرف نو کھلاڑی بیٹھے تھے۔ میز کے ایک سرے پر "ڈیلر" (Dealer) اور اسکے سامنے دوسرے سرے پر "کروپیر" بیٹھا تھا۔ بڑی بڑی رقموں کی بازیاں لگ رہی تھیں۔ نکی کو ڈیلر کا سپاٹ چہرہ بڑا دہشت ناک معلوم ہوا کیونکہ اسکی آنکھیں تو متحرک اور نگراں نظر آتی تھیں مگر اس کے چہرے کا رنگ [illegible] پہ ہرگز نہ بدلتا تھا۔ نکی کو ہمیشہ کفایت شعاری کے سبق پڑھائے گئے تھے۔ اس کے لئے یہ منظر بہت غیر معمولی طور پر اثر انگیز تھا کیونکہ یہاں کھلاڑی تاش کے ورق پر ایک ایک ہزار پونڈ کی بازی لگا کر اور ہار کر کچھ اثر نہ لیتے تھے۔ اور ہنس کر یا مذاق کر کے ٹال دیتے تھے۔ اتنے میں نکی کا ایک واقف کار اسکے پاس آیا اور پوچھا

"کہو، کچھ جیتا؟"

"میں تو نہیں کھیل رہا ہوں۔"

"بڑی سمجھ کی بات کر رہے ہو۔ یہ بڑا ذلیل کھیل ہے۔ آؤ کچھ پئیں۔"

"اچھا"

پیتے وقت نکی نے اپنے شناسا سے کہا کہ وہ اپنی عمر میں پہلی بار قمار خانے میں داخل ہوا ہے۔

"اوہ! تب تو تم کو جانے سے پہلے کچھ نہ کچھ تفریحاً ضرور کھیلنا چاہیئے۔ مونٹی کارلو آ کر بلا قسمت آزمائی کئے واپس چلا جانا بڑی حماقت ہے۔ اگر بالفرض تم سو فرانک ہار بھی گئے تو کیا نقصان ہوگا!"

"ہاں! یہ تو ٹھیک ہے مگر میرے والد کو میرا یہاں آنا پسند نہ تھا اور جن تین چیزوں کی اُنہوں نے مجھے ممانعت کی ہے اُن میں سے ایک قمار بازی بھی ہے۔"

مگر پینے کے بعد جب نکی اپنے ساتھی سے جدا ہوا تو ٹہلتا ٹہلتا اُسی ٹیبل کے پاس پہنچ گیا جہاں لوگ "رولٹ" کھیل رہے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا۔ "کروپیر" ہارنے والوں کا روپیہ سمیٹ لیتا تھا اور جیتنے والوں کو ادا کر دیتا تھا۔ اس سے انکار نہ کیا جا سکتا تھا کہ یہ کھیل بہت دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔ نکی نے ابھی تو [illegible] بازی کھیلنے کا ارادہ تو نہیں کیا تھا۔ صرف [illegible] یہ دونوں باتیں ایک ترغیب تھیں۔ اس کا [illegible] کون سا بڑا [illegible] اگر بلا قسمت آزمائے جانا سخت حماقت ہو تو وہ کتنا خوش [illegible]

ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب دنیا ہے جس کا تجربہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے سو فرانک کا ایک نوٹ اپنی جیب سے نکالا اور اسے "اٹھارہ" نمبر پر رکھ دیا۔ اُس نے یہ نمبر اس لئے پسند کیا کہ یہی اس کی عمر کا سال بھی تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس نے پہیئے کو گھومتے ہوئے دیکھا۔ چھوٹی سی سفید گیند خوب زور سے چکر کاٹنے لگی۔ پہیئے کی گردش کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ گیند کی رفتار کم ہوتے ہوتے پھر تیز ہو گئی ——— اور نکی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ گیند "اٹھارہ" نمبر پر آ کر رُک گئی۔

بہت سی ٹکلیاں اُس کی طرف بڑھا دی گئیں اور اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُن کو لے لیا۔ اُس نے بہت کافی بڑی رقم جیتی تھی۔ وہ اتنا گھبرا سا گیا کہ اُسے دوسری بار داؤں لگانے کا خیال بھی نہ آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسکا ارادہ دوبارہ کھیلنے کا تھا بھی نہیں۔ اُس کے خیال میں بس ایک بار داؤں لگانا تجربہ حاصل کرنے کے لئے کافی تھا۔ اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب دوسری بار پھر "اٹھارہ" نمبر ہی نکلا۔ اس نمبر پر صرف ایک ہی ٹکلی تھی۔

"ارے رے رے، تم تو پھر جیت گئے!" اُس کے پاس جو آدمی کھڑا تھا اُس نے کہا۔

"میں؟ میں جیت گیا؟ مگر میں نے تو کچھ نہ لگایا تھا!"

"کیوں نہیں؟ تمہارے پہلے داؤں کا روپیہ جو تھا۔ یہ لوگ جب تک تم پہلے داؤں کا روپیہ واپس نہ مانگو اُسے اُسی نمبر پر لگا رہنے دیتے ہیں۔ کیا تم کو یہ معلوم نہیں؟"

بہت سی ٹکلیاں پھر اس کی طرف بڑھا دی گئیں۔ اُس نے اپنی جیتی ہوئی رقم کو گنا ——— سات ہزار فرانک! اُسے اپنے اندر ایک عجیب طاقت کا احساس ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے آپ کو بہت عقلمند خیال کرنے لگا۔ "روپیہ پیدا کرنے کا یہ کتنا آسان طریقہ ہے!" اُس نے سوچا اس کے خوبصورت معصوم چہرہ پر گویا تبسم کے جھالر لٹکے ہوئے تھے۔ اتنے میں اُس کی چمکدار آنکھیں ایک عورت کی آنکھوں سے چار ہوئیں جو اُس کے پاس ہی کھڑی تھی، وہ مُسکرائی۔

"آج تمہاری قسمت زور پر ہے!" اُس نے کہا۔

وہ انگریزی بول لیتی تھی مگر غیر ملکی لہجہ نمایاں تھا۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔ میں اپنی عمر میں پہلی بار جوا کھیلا ہوں۔"

"یہی تو دجہ ہے۔ کیا تم مجھے ایک ہزار فرانک قرض دو گے؟ دو گے نا؟ میں اپنا سب کچھ ہار چکی ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد میں تمہاری رقم تم کو واپس دے دونگی۔"

"اچھا۔ لے لو۔"

اُس عورت نے اُس کی ٹکلیوں میں سے ایک بڑی سی سرخ ٹکلی اُٹھا لی اور شکریہ ادا کرتے ہوئے غائب ہو گئی۔ جس آدمی نے نکی سے پہلے بات کی تھی اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

"اب تم اس ایک ہزار فرانک سے ہاتھ دھو لو۔"

نکی کو پسینہ آ گیا۔ اُس کے باپ نے اُسے اس بات کی خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ کسی کو روپیہ قرض نہ دینا۔ اور اب اُس نے یہ کیسی حماقت کی! ایک ہزار فرانک! اور ایسی عورت کو دیدیئے جسے اُس نے پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ مگر واقعہ یہی تھا کہ جب اس عورت نے اُس سے قرض مانگا تھا تو اس کے دل میں کل انسانی نوع کے واسطے رحم کا گویا ایک دریا موجزن ہو گیا تھا اور وہ بالکل انکار نہ کر سکا تھا ——— اور وہ سرخ بڑی سی ٹکلی ——— یہ اندازہ کرنا ناممکن سا معلوم ہوتا تھا کہ اس ٹکلی کی بھی کوئی قیمت ہو سکتی تھی ———

اوہ! کوئی پرواہ نہیں۔ اب بھی اُس کے پاس چھ ہزار فرانک تھے۔ وہ ایک دو بار اور اپنی قسمت آزمائے گا اور اگر نہ جیتا تو واپس ہو جائیگا۔ اُس نے ایک ٹکلی سولہ نمبر پر رکھی جو اس کی بڑی بہن کی عمر تھی۔ مگر وہ نمبر نہ نکلا۔ پھر اُس نے ایک ٹکلی بارہ نمبر پر لگائی جو اُس کی چھوٹی بہن کی عمر تھی مگر وہ نمبر بھی نہ نکلا۔ اس طرح اُس نے کئی نمبروں پر داؤں لگایا مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا جیتنے کا وقت نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ اب آخری بار داؤں لگا کر وہ رُک جائے گا۔ اس مرتبہ وہ جیت گیا۔ اور نہ صرف جو کچھ ہارا تھا وہ سب واپس پا لیا بلکہ اس کے علاوہ بھی کافی رقم اُس کے ہاتھ آ گئی۔ ایک گھنٹے کے متعدد بار ہار جیت کے بعد اُس کے پاس اتنی ٹکلیاں جمع ہو گئیں جو اُس کی جیبوں میں سما نہ سکتی تھیں۔ تب اُس نے واپس ہونے کا ارادہ کیا ——— وہاں ٹکلیوں کو روپیہ سے بدلنے کیلئے "چینجرس آفس" (Changers Office) کے پاس گیا اور اس کی سانس رُکی کی رُکی رہ گئی۔ جب اُن ٹکلیوں کے عوض اس کے سامنے بیس ہزار فرانک کے نوٹ رکھ دیئے گئے۔ اتنی دولت اُس نے اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس نے ان نوٹوں کو اپنی جیب میں رکھا اور واپسی کے لئے مڑنے ہی کو تھا کہ وہ عورت جس نے اُس سے ایک ہزار فرانک قرض لئے تھے اُس کے پاس آئی۔

"میں ہر جگہ تمہیں تلاش کرتے کرتے تھک گئی۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں تم چلے نہ گئے ہو۔ اور مجھے اس خیال سے بہت ہی زیادہ تکلیف ہو رہی تھی کہ نہ جانے تم میرے بارے میں کیا خیال کرو گے۔ یہ لو اپنے ایک ہزار فرانک۔ تمہارا بہت بہت شکریہ!"

نکی شرما کر سرخ ہوگیا اور اس کی طرف حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔
اُس نے اس عورت کے بارے میں کیسی غلط رائے قائم کی تھی۔ اسے کبھی جوئے کے اڈے میں آنے تو کھیلنے کی ممانعت کی تھی اور جوئے ہی سے اُس نے بیس ہزار فرانک پیدا کر لئے تھے۔ اُس کے باپ نے اُسے قرض دینے کی ممانعت کی تھی مگر اُس نے ایک بالکل اجنبی کو کافی بڑی رقم قرض کے طور پر دے دی تھی اور اب وہ اُسے لوٹا رہی تھی۔ در اصل وہ اتنا احمق نہ تھا جتنا اُس کا باپ اُسے سمجھے ہوئے تھا۔ اس کی کسی چھٹی حس نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ اس عورت کو اطمینان سے قرض دے سکتا ہے۔ اور اس کی حس بالکل درست نکلی۔ مگر ان تمام خیالات سے وہ اتنا زیادہ پریشان سا ہو گیا کہ وہ چھوٹی سی عورت اُس کی حالت دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔
"تم کو کیا ہوگیا؟ چپ چاپ میری طرف کیوں گھور رہے ہو؟"
اُس عورت نے پوچھا۔
"واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس روپیہ کے واپس ملنے کی بالکل اُمید نہ تھی۔"
"تم مجھے کیا سمجھے تھے؟ کیا تمہارا خیال تھا کہ میں بھی کوئی ——
با —— زا —— ری عورت ہوں؟"
نکی پھر جھینپ کر شرم سے سرخ ہوگیا۔
"نہیں۔ نہیں —— یہ بات نہ تھی۔"
"کیا میں بازاری عورت معلوم ہوتی ہوں؟"
"نہیں —— بالکل نہیں۔"
اُس کا لباس نہایت سادہ، سیاہ رنگ کا تھا۔ گلے میں سونے کا ہار پہنے تھی۔ اور اس کی سیدھی سادی فراک میں سے اُس کا صاف ستھرا، نرم و نازک بدن جھلک رہا تھا۔ اُس کا چہرہ دلکش تھا اور اُس کے سر اور بالوں کی قطع بھی خوشنما تھی۔ اس نے غازہ کا استعمال کیا تھا۔ مگر اعتدال اور خوش مذاقی کے ساتھ —— نکی کے خیال میں وہ اُس سے عمر میں تین چار سال سے زیادہ بڑی نہ ہوگی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر ایک دلفریب انداز سے مسکرائی۔
"میرے شوہر مراکش میں ملازمت کرتے ہیں اور میں تبدیلی آب و ہوا کے لئے یہاں صرف چند ہفتوں کے لئے آئی ہوں کیونکہ میرے شوہر کا خیال تھا کہ میرے لئے تبدیلی آب و ہوا ضروری ہے۔"
"میں تو اب یہاں سے جانے والا ہی ہوں۔" نکی نے کہا، کیونکہ اور کچھ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔
"اتنی جلدی؟"
"مجھے کل صبح سویرے اُٹھنا ہے کیونکہ میں ہوائی جہاز سے لندن جا رہا ہوں"

[illegible] دیکھا تھا۔"
"اچھا! مگر مجھے بھی یہ کہتے ہوئے خوشی ہے کہ میں نے کبھی بھی تم سے زیادہ اچھا کھیلنے والے بھی نہ دیکھے تھے۔"
"تمہارا کھیلنے کا اسٹائل بہت اچھا ہے اور شروع [illegible] پہنے ہوئے تم بہت اچھے لگ رہے تھے۔"
نکی کوئی بے شرم لڑکا نہ تھا مگر اپنی تعریف سن کر اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ شاید اُس سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے ہی یہ ایک ہزار فرانک دئے گئے تھے۔
"کیا تم کبھی نکر باکر ریسٹوران (Knickerbocker Restaurant) گئے ہو؟" اُس عورت نے پوچھا۔
"نہیں! میں تو وہاں کبھی نہیں گیا۔"
"ارے۔ مگر وہاں گئے بغیر تم کو مونٹی کارلو سے نہ جانا چاہیے۔ چلو۔ وہاں چل کر تھوڑا سا رقص کیا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ وہاں چلکر کچھ کھایا بھی جائیگا۔"
نکی کو اپنے باپ کی نصیحت یاد آئی کہ عورتوں سے بچنا۔ مگر یہ معاملہ تو مختلف تھا۔ اس چھوٹی سی عورت کو دیکھکر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ شریف نہیں ہے۔ اس کا شوہر مراکش میں ملازمت پر تھا۔ جو نکی کے خیال میں سول سروس کا ہی ملازم ہوگی۔ نکی کے والدین کے کچھ دوست بھی تو سول سروس میں تھے اور ان کی بیویاں برابر اُس کے گھر ڈنر پہ آیا کرتی تھیں! گو وہ نہ اتنی جوان تھیں نہ خوبصورت، جتنی یہ عورت اور شرافت میں تو یہ عورت اُن سے ہرگز کم نہ تھی۔ وہ بیس ہزار فرانک بھی تو جیت چکا تھا۔ تھوڑی سی تفریح میں یقیناً کوئی حرج نہ تھا۔
"میں ضرور تمہارے ساتھ وہاں چلوں گا۔" اُس نے کہا۔ "مگر تم کچھ خیال نہ کرنا میں زیادہ دیر نہ ٹھیر سکوں گا۔ کیونکہ میں اپنے ہوٹل میں ہدایت کر آیا ہوں کہ مجھے صبح سات بجے روانہ ہو جانا ہے۔ اور سب انتظام ٹھیک رہے۔"
"جب تم چاہو گے ہم وہاں سے چلے آئیں گے۔"
نکی کو نکر باکر بہت پسند آیا۔ دونوں نے چکن اور انڈے کھائے اور ایک بوتل شمپین پی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رقص کیا۔ اس چھوٹی سی نازک اندام عورت نے اُسے بتایا کہ وہ بہت اچھا رقص کرتا ہے۔ خود نکی کا خیال بھی اپنے بارے میں یہی تھا اور اس ہلکی پھلکی عورت کے ساتھ رقص کرنا نہ صرف آسان بلکہ بہت خوش آیند تھا۔ رقص کے دوران میں جب ان دونوں کی

[illegible] اس رقص کا حصہ ہیں ایک ایسی جھلک بھی ہیں سے اُس کا دل ہاتھوں اچھلنے لگا۔ اتنے میں ایک سانولی سی عورت نے بڑی پاٹ دار آواز میں ایک جذبات انگیز گیت گایا۔ رقص کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ہوا میں ہر طرف سرخوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔۔۔ وہ دونوں اب "والز" (waltz) ناچ رہے تھے۔

"کیا کبھی کسی نے تم سے یہ کہا ہے کہ تم خوبصورت ہو؟" اس عورت نے نکی سے پوچھا۔

"مجھے تو یاد نہیں۔" نکی ہنسا۔ اُس نے سوچا "ارے توبہ! میرا خیال ہے کہ یہ مجھ پر مرنے لگی ہے۔"

نکی ایسا بیوقوف نہ تھا کہ یہ نہ سمجھتا کہ عورتیں اسے پسند کرتی تھیں۔ جب اُس عورت نے اُس سے یہ سوال کیا تو نکی نے رقص کرتے ہوئے اُسے اپنے سینے سے دبا کر چمٹا لیا۔ اُس عورت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک ہلکی سی آہ اُس کے ہونٹوں سے نکلی۔

"میرا خیال ہے کہ اگر ان سب آدمیوں کے سامنے میں تمہارا بوسہ لوں تو یہ ٹھیک نہ ہوگا؟"

"تمہارے خیال میں وہ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟"

اب دیر ہو گئی تھی اور نکی نے کہا کہ اب واقعی اسے جانا چاہیئے۔

"میں بھی واپس جاؤں گی۔" اُس عورت نے کہا۔ "کیا تم مجھے میرے ہوٹل تک پہنچاتے ہوئے جانا گوارا کرو گے؟"

نکی نے بل ادا کر دیا۔ بل کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ نکی کو اس پر تعجب ہوا مگر اس کی جیب میں اتنی دولت بھری تھی کہ اسے کسی قسم کی پرواہ نہ تھی۔ وہ دونوں ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ وہ عورت اُس سے لگ کر اور گھس مل کر بیٹھی اور نکی نے اُس کا بوسہ لیا جسے (نکی نے محسوس کیا کہ) اُس عورت نے پسند کیا۔

"یا خدا! آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!" نکی نے سوچا۔

یہ صحیح تھا کہ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی مگر اس کا شوہر امریکہ میں تھا۔ اور یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ وہ نکی پر لٹو ہو گئی تھی۔ ٹھیک بالکل ٹھیک۔ یہ بھی صحیح تھا کہ اُس کے باپ نے اُسے عورتوں سے دُور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ مگر نکی نے سوچا کہ اُس نے اِس بات کا وعدہ تو نہیں کیا تھا کہ وہ عورتوں سے کوئی واسطہ نہ رکھے گا۔ اُس نے تو صرف یہی وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے باپ کی نصیحت کو نہ بھولے گا۔ اور وہ نصیحت اُسے یاد تھی۔ مگر حالات ایک بات کی اہمیت کو بدل دیتے ہیں۔ یہ عورت کتنی نرم و نازک اور مرطوب تھی۔ ایک نادر و نایاب لطف اندوز ہونے کا جذبہ

[illegible] پہنچتے ہی تو کیا اُسے چھوڑ دیتا انتہائی حماقت کی حرکت نہ ہوگا؟ اس عورت کے ہوٹل پہنچ کر نکی نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر چلتا کر دیا۔

"میں یہاں سے اپنے ہوٹل پیدل جاؤں گا۔" نکی نے کہا "بکر لوکر کی بند ہوا میں اتنی دیر رہنے کے بعد میرے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔"

"آؤ۔ تھوڑی دیر کے لئے میرے کمرے میں چلو۔" اس عورت نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے چھوٹے سے بچے کا فوٹو دکھاؤں گی۔"

"ارے ۔۔۔ تمہارا چھوٹا سا بچہ بھی ہے؟"

"ہاں ۔۔۔ ایک پیارا پیارا ننھا سا بچہ!"

نکی اس عورت کے پیچھے سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ وہ اسکے چھوٹے سے بچے کا فوٹو بالکل نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اُس نے سوچا کہ یہ ظاہر کرنا کہ وہ واقعی دیکھنا چاہتا ہے واجبی آداب ہے۔ اُس کو خدشہ ہونے لگا کہ اُس نے اس عورت کے ساتھ اُس کے کمرے میں آنے کی سخت حماقت کی ہے۔ اُس کے دل میں خیال آیا کہ شاید وہ اُسے اپنے بچے کی تصویر دکھانے اوپر اُس کے لئے جا رہی ہے تاکہ نہایت خوبصورتی سے اُسے یہ جتلائے کہ اس عورت کو سمجھنے میں اُس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ نکی باتوں باتوں میں اُسے بتا چکا تھا کہ اُس کی عمر اٹھارہ برس کی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ وہ مجھے بھی بالکل بچہ سمجھتی ہے۔" نکی نے سوچا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اگر وہ "بکر لوکر" میں شامپین پر اتنا زیادہ روپیہ نہ خرچ کرتا تو اچھا ہوتا۔ مگر اُس عورت نے اُسے اپنے بچے کی تصویر نہیں دکھائی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ پلٹ پڑی۔ دونوں ہاتھ نکی کی گردن میں ڈال دیئے۔ اور نکی کے ہونٹوں سے اپنے دونوں ہونٹ پیوست کر دیئے۔ نکی کی ساری عمر میں کسی نے اس کا اتنا زیادہ جذبات سے مغلوب ہو کر بوسہ نہ لیا تھا۔ وہ اُس کی لذت میں کھو گیا۔

"ڈارلنگ!" اُس عورت نے کہا۔

ایک سیکنڈ کے لئے نکی کو اپنے باپ کی نصیحت یاد آئی ——

مگر پھر وہ سب کچھ بھول گیا۔

نکی ہلکی نیند سوتا تھا اور ذرا سی آواز ہونے پر بھی جاگ پڑتا تھا۔ دو تین گھنٹے کے بعد وہ جاگا لیکن کچھ لمحے نہ سمجھ سکا کہ وہ کہاں ہے۔ کمرہ بالکل تاریک نہ تھا کیونکہ غسل خانے میں ایک روشندان سا تھا اور اس کی روشنی جلتی ہوئی چھوڑ دی گئی تھی۔ اچانک اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی کمرے میں دبے پاؤں اِدھر اُدھر پھر رہا ہو۔ اُس نے دیکھا کہ یہ ایک چھوٹی سی نازک اندام [illegible] تھی۔۔

ہو سکنے ہی والا تھا کہ اس عورت کی کوئی حرکت دیکھکر اُس نے دم سادھ لیا۔ وہ بہت احتیاط سے قدم زمین پر رکھ رہی تھی گویا ڈر رہی تھی۔ کہ کہیں نکی آواز سے اُٹھ نہ جائے۔ چلتے چلتے وہ دو تین بار رُکی۔ ٹھٹکی اور بستر کی طرف دیکھا۔ نکی سوچنے لگا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اُسے جلد ہی معلوم ہوگیا۔ وہ اُس کرسی تک گئی جس پر نکی نے اپنے کپڑے اتار کر ڈال دیئے تھے اور ایک بار ٹھٹک کر پھر نکی کی طرف دیکھا۔ جتنی دیر تک وہ اس طرح رکی ہوئی نکی کی طرف دیکھتی رہی وہ وقفہ ناقابلِ اختتام معلوم ہوتا تھا۔ سکوت اس بلا کا تھا کہ نکی کو محسوس ہوا گویا وہ اپنے دل کی دھڑکن کی آواز بھی سن رہا تھا ——— تب، بہت آہستگی کے ساتھ، چھپ چھپاتے، اُس عورت نے نکی کا کوٹ اٹھایا۔ اُس کی اندر والی جیب میں اپنا ہاتھ ڈالا اور وہ تمام خوبصورت ایک ایک ہزار فرانک کے نوٹ نکال لئے جن کو جیت کر نکی میں خود اعتمادی اور افتخار کا جذبہ پیدا ہوا تھا پھر اُس عورت نے کوٹ وہیں رکھ دیا جہاں سے اُٹھایا تھا اور اُس پر کچھ اور کپڑے ڈال دیئے تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھایا اور ہٹایا گیا ہے۔ اس کے بعد نوٹوں کا بنڈل اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے وہ ایک بار پھر کچھ دیر ساکت وصامت کھڑی رہی۔ نکی نے کسی نہ کسی طرح اپنی اس خواہش پر قابو پایا کہ کود کر اُس عورت کو پکڑ لے ——— اس کی وجہ کچھ تو اُسکی حیرت تھی اور کچھ یہ احساس کہ وہ ایک اجنبی ملک میں ایک اجنبی جوان اور خوبصورت عورت کے سونے کے کمرے میں ہے اور اگر اس عورت نے شور مچا دیا تو معلوم نہیں کیا ہو جائے۔

اُس عورت نے نکی کی طرف پھر دیکھا۔ نکی کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور اُسے یقین تھا کہ وہ عورت اسے سوتا سمجھے گی۔ خاموشی اِس شدت کی تھی کہ وہ عورت خود اپنے سانس لینے کی آواز بھی سن سکتی تھی۔ جب اُس عورت کو یقین ہوگیا کہ اس کی نقل و حرکت سے نکی کی نیند نہیں ٹوٹی تو اُس نے کمال احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے کمرہ طے کیا۔ کھڑکی میں ایک چھوٹی سی ٹیبل پر ایک گملہ میں ایک "سنیریریا" (Cineraria) کا پودا اُگ رہا تھا۔ نکی نے اب خوب اچھی طرح آنکھیں کھول لیں۔ وہ پودا پولی مٹی میں رکھا تھا اور اُسکی جڑیں مٹی میں اچھی طرح پیوست نہ تھیں کیونکہ اس عورت نے بغیر مشکل پکڑ کر آسانی سے اُسے اُٹھا لیا اور گملہ کی تہ میں وہ نوٹ رکھکر پھر اُس پودے کو اسی طرح رکھ دیا۔ چھپانے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہ ہو سکتی تھی۔ کسی کو یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس پھولوں سے لدے ہوئے پودے کے نیچے بھی کوئی چیز چھپائی جا سکتی ہے۔ اُس عورت نے مٹی کو اپنی اُنگلیوں سے اچھی طرح دبا دیا اور پھر بہت آہستگی سے قدم زمین پر رکھتے ہوئے واپس آکر بستر میں چپکے سے گھس گئی۔

"شیری! (Cheri)" اُس نے پیار سے بھری بھری کہا۔

نکی کی سانس بڑے استقامت کے ساتھ چلتی رہی۔ جیسے کوئی شخص گہری نیند میں ڈوبا ہو۔ اُس عورت نے کروٹ بدل لی اور اپنے آپ کو نیند کے سپرد کر دیا۔ نکی گو اس قدر خاموش اور ساکت لیٹا ہوا تھا مگر اس کا دماغ بہت مصروفیت کے ساتھ کام کر رہا تھا جو کچھ اُسکی نظروں کے سامنے ہو گزرا تھا اس پر اُسے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔

" یہ عورت ——— ایک اوباش رنڈی کے سوا کچھ نہیں! اور اس کا چھوٹا سا بچہ اور اس کا مرکشش والا شوہر!

پناہ بہ خدا! یہ تو بُکی چور ہے۔ مجھے بالکل ہی گرھا سمجھتی تھی۔ اگر اس کا خیال ہے کہ وہ یوں مجھے چکمہ دے جائیگی تو وہ غلطی پر ہے۔" اُس نے پہلے ہی سے اپنے دل میں منصوبے باندھ لئے تھے۔ کہ وہ اس رقم کا کیا کریگا جو اُس نے جیتی تھی۔ عرصہ سے اُسے تمنا تھی کہ اپنی ذاتی کار رکھے اور اُسے اپنے باپ سے شکایت بھی تھی کہ اُس نے اُسے کار کیوں نہیں دی۔ ہمیشہ گھر بھر کی خستہ کار میں اِدھر اُدھر پھرنا بھی تو اچھا نہیں لگتا ——— ! خیر وہ بھی بڑے میاں کو سبق دیگا اور خود اپنی کار خریدے گا۔ تقریباً دو سو پاؤنڈ میں ایک بہت نفیس کار مل جائے گی ——— "

اُس نے اس روپیہ کو واپس حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ مگر فوراً کوئی تدبیر اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔ جھگڑا کرنا سخت حماقت تھی۔ وہ ایک اجنبی دیس میں تھا اور ایک انجان ہوٹل میں! ——— ممکن ہے کہ اس مکار عورت کے دوست نزدیک ہی رہتے ہوں۔ وہ لڑنے سے نہ گھبراتا تھا۔ لیکن اگر کسی نے دست بدست جنگ کے دوران میں پستول نکال لیا تو وہ (نکی) کتنا احمق نظر آئے گا!

پھر اُس نے نہایت عقلمندی کے ساتھ یہ بھی سوچا کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ نوٹ اُسی کی ملکیت تھے۔ اگر اس عورت نے حلفاً کہا کہ یہ نوٹ اُس کے ہیں تو وہ اپنے آپ کو پولیس کے چنگل میں پائیگا۔ واقعی اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں اُس عورت کے تنفس سے اُس نے اندازہ کیا کہ وہ سو چکی ہے۔ وہ خوب مطمئن ہو کر سوئی ہوگی کیونکہ اُس نے کسی بلا رکاوٹ اور مزاحمت کے اپنا کام کر لیا تھا۔ نکی کو زیادہ غصہ تو اسی بات پر آ رہا تھا کہ وہ عورت تو اس اطمینان سے میٹھی نیند سوئے اور وہ خود انتہائی پریشانی اور اضطراب کے عالم میں پڑا ہوا جاگا کرے! اچانک اس کے دماغ میں ایک روشن خیال تیر کی طرح در آیا۔ یہ اتنا اچھوتا اور نادر خیال تھا کہ اُسے بہت ضبط سے کام لینا پڑا۔ ورنہ بہت ممکن تھا کہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کیلئے

وہ بستر سے کود کر کھڑا ہو جاتا۔ دو آدمی ایک ہی پل میں کچھ کہتے ہیں، اس عورت
نکی کا روپیہ چرا رہا تھا۔ وہ اس روپیہ کو چوری سے واپس لے لیگا۔ اور اس طرح
عورت اور نکی کے درمیان حساب چک جائے گا۔ اس نے اس وقت تک چپ
چاپ بلاحرکت کئے پڑے رہنے کا تہیہ کر لیا۔ جب تک اسے یقین کامل نہ ہو جائے کہ
وہ عورت واقعی سو رہی ہے۔ وہ ایک غیر معین عرصہ تک ــــــ جو اسے
بہت طویل معلوم ہوا ــــــ اسی طرح لیٹا رہا۔ وہ عورت بلاحس و حرکت
پڑی تھی۔ محض اس کا سانس باقاعدہ چل رہا تھا۔ ایک بچے کی طرح۔

"ڈارلنگ!" نکی نے آخر کار کہا۔

نہ کوئی جواب ملا نہ کوئی حرکت ہوئی۔ وہ عورت دنیا و مافیہا سے بے خبر
پڑی سو رہی تھی۔

بہت آہستہ سے نکی بستر سے باہر نکلا اور کچھ دیر کے لئے وہیں بستر کے
پاس یہ دیکھنے کو کھڑا رہا کہ اس کے اٹھنے سے اس عورت کی نیند تو نہیں ٹوٹی۔
مگر اس عورت کا سانس باقاعدہ جاری تھا۔ اٹھنے سے پہلے نکی نے اس کمرہ کے
فرنیچر، میز، کرسی وغیرہ کی جگہوں کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ ان سے ٹکرا نہ
جائے اور وہ عورت اس آواز سے بیدار نہ ہو جائے۔ ہر دو قدم چلنے کے بعد
وہ ٹھیر جاتا تھا۔ وہ بہت سبک گام تھا۔ اور چلنے میں اس کے قدموں کی آہٹ
بالکل نہیں معلوم ہوتی۔ پورے پانچ منٹ میں وہ کھڑکی تک پہنچا اور وہاں پہنچ
کر رک گیا۔ اتنے میں چارپائی کے چرچرانے کی آواز آئی۔ وہ چونک پڑا ــــــ
مگر اس عورت نے صرف نیند میں کروٹ بدلی تھی! نکی نے اپنے دل پر جبر کر کے سو تک
گنا۔ وہ عورت بے خبر سو رہی تھی۔ پھر کمال احتیاط کے ساتھ اس نے ڈنٹھل پکڑ کر
"نیبر بیریا" کا پودا اٹھا لیا اور دوسرا ہاتھ گملے میں ڈال کر اپنی مٹھی میں سب نوٹ
باہر نکال لئے۔ جب اس کی انگلیاں نوٹوں سے مس ہوئیں تو اس کا دل بلیوں اچھل
رہا تھا۔ پھر اس نے پودے کو اس کی جگہ واپس رکھ دیا اور ہوشیاری سے مٹی دبا
دی۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس کی نظر برابر سوتی ہوئی عورت کے جسم کی طرف تھی۔
مگر وہاں کوئی حرکت نہ تھی۔ تھوڑی دیر ٹھیر کر وہ اس کرسی کی طرف بڑھا جس پر اس کے
کپڑے پڑے تھے۔ اس نے پہلے تو نوٹوں کا بنڈل اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا اور
پھر کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔ کپڑے پہننے میں اس نے پندرہ منٹ صرف کئے کیونکہ
وہ ذرا سا کھٹکا یا آہٹ بھی پیدا کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس دن اس نے ڈنر جیکٹ کے
ساتھ بلاکلف کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس وقت اس نے اپنے آپ کو مبارکباد دی کہ
وہ اس قمیص کو بلا آواز پیدا کئے پہن سکتا ہے اور اگر وہ یہ قمیص نہ پہنے ہوتا تو
مشکل ہوتی۔ بلا آئینہ دیکھے ٹائی باندھنے میں اسے کچھ دقت محسوس ہوئی مگر بہت
عقلمندی کے ساتھ اس نے سوچا کہ ٹائی اگر ٹھیک نہ بھی بندھی تو کوئی حرج
نہیں۔ اب وہ خوش اور مطمئن تھا۔ اور اس کی ہمت بھی بڑھ گئی تھی۔ اور اب
اسے یہ کل واقعہ ایک کھیل سا معلوم ہو رہا تھا۔ آخر کار وہ سب کپڑے پہن کر
تیار ہو گیا۔ صرف جوتے پہننے باقی رہ گئے۔ انہیں اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا
اس کا خیال تھا کہ وہ انہیں کمرے سے باہر نکل کر پہنے گا۔ اب اسے صرف دروازہ
تک پہنچنے کے لئے کمرے کو طے کرنا باقی تھا۔ وہ دروازہ تک اتنی سبک پائی سے گیا کہ
ہلکی سے ہلکی نیند سونے والا بھی نہ اٹھ سکتا تھا۔ مگر دروازہ کو تو کنجی قفل میں پھرا کر
ہی کھولنا پڑتا تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے کنجی پھرائی۔ مگر باوجود ہر احتیاط کے
آواز پیدا ہو ہی گئی۔

"کون ہے؟"

وہ چھوٹی سی نازک اندام عورت اچانک اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ نکی کا دل
گویا اچھل کر منہ میں آگیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے دماغ کا توازن قائم رکھا۔

"کوئی نہیں۔ میں ہوں۔ چھ بج چکے ہیں اور مجھے جانا ہے۔ میں کوشش
کر رہا تھا کہ تمہاری نیند نہ خراب کروں۔"

"اوہ! میں بھول ہی گئی تھی!" یہ کہہ کر وہ عورت پھر لیٹ گئی۔

"اب تم جاگ ہی گئیں، تو لاؤ میں اپنے جوتے پہن لوں۔" نکی بستر کے
سرے پر بیٹھ گیا اور جوتے پہنے۔

"جب تم نیچے اترو تو زیادہ آواز نہ ہونے دینا۔ ہوٹل والے اسے پسند
نہیں کرتے ــــــ اوہ! مجھے کتنی نیند آ رہی ہے!"

"تم اطمینان سے سو جاؤ۔"

"جانے سے پہلے مجھے بوسہ دو۔"

نکی نے جھک کر اس کا بوسہ لیا۔

"تم بہت ہی پیارے ہو۔" اس عورت نے کہا۔

"خدا حافظ!"

نکی کو اس وقت تک اپنے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہوا جب تک وہ ہوٹل
کے باہر نہ نکل گیا۔ اب پو پھٹ چکی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ بندرگاہ میں ماہی گیروں
کی کشتیاں اور بجرے سطح آب پر ساکت پڑے تھے۔ ساحل پر ماہی گیر اپنے روزانہ
کے کام کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سڑکیں خالی تھیں۔ نکی نے صبح کی صاف اور تازہ
ہوا میں لمبے لمبے سانس لئے۔ وہ بالکل تازہ دم اور ہشاش بشاش تھا۔ سینہ تانے
ہوئے، جھومتے ہوئے قدموں سے پہاڑی پر چڑھ کر کیسی نو "(Casino)" کے
سامنے والے باغ میں سے گذر کر وہ اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔ شبنم آلودہ پھول صبح

کی کے دل میں پہلے پہل لڑنے کی طاقت تھی اور وہ ہیرا اور سے کرتا تھا۔ اور اب اس کی آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ مجھے پہلے درجہ کا احمق سمجھتا ہے۔ میں اس سے لاکھ کہوں کہ یہ سب کچھ حسن اتفاق تھا۔ مگر وہ یہی سمجھتا رہے گا کہ یہ سب اس کی اپنی عقلمندی اور ہوشیاری کا نتیجہ ہے۔ مجھے ایسا احساس کبھی آگے چل کر اسے بُری طرح زک نہ پہنچائے۔"

"تم واقعی اس وقت بالکل گدھوں کی طرح باتیں کر رہے ہو۔" اس کے دوستوں میں سے ایک نے کہا۔

"میں مانتا ہوں کہ میری گفتگو احمقانہ ہے اور میں خود اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔ مگر قسمت کو کسی کے ساتھ اس طرح نہ کھیلنا چاہیئے۔ یہ بڑی ناانصافی ہے! آخر تم لوگ یہ کہو گے کہ میری نصیحت اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک تھی؟"

"ہاں! ہاں!! اس سے کس کو انکار ہے!"

"اور وہ گدھا بھی، ضرور نقصان اٹھاتا۔ مگر بچ گیا۔ تم لوگ بھی زمانہ دیکھے ہوئے ہو۔ بتاؤ کہ اب میں اس معاملہ میں کیا کروں؟"

مگر اس کے دوستوں میں سے کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ آخر کار بیرسٹر بولا۔

"سنو ہنری! اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو بالکل کسی بات کی فکر نہ کرتا مجھے یقین ہے کہ تمہارا لڑکا بہت خوش قسمت ہے ——— اور دنیا میں خوش قسمت ہونا عقلمند یا مالدار ہونے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔"

پرند

(از محترمہ بیگم مجیب)

صبح کو عزیزہ بیگم کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اُن کے کان میں یہ آواز آئی۔

"اے بوی دیکھئے! ایک نئی ماما آئی ہے۔"

انہوں نے اُٹھتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"کون سی نئی ماما؟"

"اری او چھوکری ادھر آ۔ بیگم صاحب کو سلام کر۔"

کواڑ کی اوٹ میں ایک لڑکی منہ چھپائے دیوار سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ نصیبن بوا کے پکارنے سے جھجکتی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی اور سلام کے لئے ہاتھ اُٹھایا۔ بارہ تیرہ سال کا سن۔ دُبلی پتلی۔ ایک لچکیلی شاخ کی طرح۔ سانولا رنگ تیز آنکھیں۔ چہرے پر سن سے زیادہ پختگی اور ہوشیاری عیاں تھی۔ بال کٹے ہوئے۔ کپڑے سارے پھٹے ہوئے۔

عزیزہ نے غور سے دیکھا۔

"یہ کہاں سے آئی؟ کون لایا ہے؟"

"اے بوی آج صبح سویرے شبراتی کپتی باغ گئے تھے۔ وہاں یہ واہی تباہی پھر رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا تو اس نے اپنا حال بتایا۔ نگوڑی کے نہ ماں ہے نہ باپ۔ لاوارث لڑکی ہے۔ شبراتی نے کہا ہے کہ بیگم صاحب رکھ لیں تو ثواب کا کام ہے۔" عزیزہ نے ہمدردی سے پوچھا۔

"کیوں تمہارے ماں باپ رشتہ دار کوئی نہیں ہیں؟ تمہارا گھر کہاں ہے۔ تم کیوں اس طرح ماری ماری پھر رہی ہو؟"

"میرا کہیں گھر نہیں ہے۔ سوتیلے باپ نے بہت دن ہوئے مار کر نکال دیا۔ تب تھوڑے دن ماموں کے یہاں رہی۔ پھر نوکری کرلی۔ مگر جہاں میں نوکر تھی وہ بہت بُرے لوگ تھے۔ مجھے مارتے تھے۔ ایک دن بہت مارا تو میں وہاں سے بھاگ آئی۔ تین دن ہوئے ——"

اُس کی آنکھوں میں آنسو شبنم کے قطروں کی طرح جھلک رہے تھے۔

اور لگیں۔ بیچاری کی [illegible] بیان داستان سُنی تھی اور ایک [illegible] عزیزہ کا رحم [illegible] دل ہل سا گیا۔

"ماری ماری پھرنے میں تیری خرابی ہی ہے۔ تو یہاں رہ جائے تو اچھا ہے۔ بول رہے گی میرے پاس؟"

اُس نے آمادگی سے جواب دیا۔

"جی ہاں!"

نصیبن بوا نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یہ سمجھ لے کہ آج سے تیرے نصیب جاگ گئے۔ بڑی اچھی طرح رکھیں گی بیگم صاحب۔ اللہ انہیں بہت سکھ دے۔ مزے میں کھا پہن اور ان کا کام کر۔"

تھوڑی دیر میں گھر بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ ایک لاوارث لڑکی آئی ہے پھر تو وہ اچھا خاصہ ایک تماشہ بن گئی۔ جو آتا وہ اس کے متعلق باتیں کرتا۔ بڑی اچھی لڑکی مل گئی تمہیں۔ بہت ہوشیار ہے اور اچھے ڈھنگ کی معلوم ہوتی ہے اچھا ہے پڑی رہے۔ کام کرے گی اور اس کی زندگی بن جائیگی۔ نہ آتی تو نہ جانے غریب کی کیا گت بنتی۔ ایسی ننھی بھی نہیں۔ چار دن میں سیانی ہو جائے گی۔

عزیزہ نے کہا کہ "ہاں پھر تو اس کا بگڑ چکا ہے نہ معلوم کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا کے آئی ہے۔ لیکن اب بھی سنبھل جائے تو جانئے غنیمت ہے۔"

لڑکی جس کا نام زیبو تھا گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ وہ اتنی جلدی سب سے مانوس اور بے تکلف ہوگئی جیسے برسوں کی رہنے والی ہو۔ بچوں کا پیارا بھیا میرا بھیا کہکر کھلانے لگی۔ اور ہر کام میں شوق و دلچسپی سے حصہ لیتی۔ بتقاضائے عمر کھیل کود کی طرف اسے رغبت ہونی ہی چاہیئے تھی۔ مگر طرہ یہ کہ شوخی و چلبلاہٹ غضب کی تھی۔ رگ رگ میں بجلی سی بھری ہوئی۔ باتوں میں طوفان حشر بداماں لیکن وہ شیرینی اور نرمی جو اُس کے لب و لہجہ میں گھلی ملی تھی کانوں کو بھلی لگتی۔ چہرے پر ہوشیاری اور پختگی کے ساتھ معصومیت کی گھلاوٹ دل کو کھینچ لیتی۔ سب کاموں میں اتنی برق دم تھی کہ کچھ سکھانے بتانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ایک اشارے میں سب کچھ سمجھ جاتی۔ بڑی بوڑھیوں کی نظروں میں تو وہ ایک کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ مگر کیا کرتیں بیگم صاحب کی منظورِ نظر ہوگئی۔ عزیزہ کے اپنے کوئی لڑکی نہ تھی اِس لئے اس کا آنا اور بھی اچھا لگا۔ گھر میں ایک لڑکی کا وجود کشش اور راحت کا باعث ہوتا ہے۔ جب وہ ہنستی تو معلوم ہوتا کہ ساز کے تاروں میں ایک دم جھنکار سی پیدا ہوگئی۔ فضا جاگ سی اٹھی۔ بچوں کو یہ خوش تھی کہ کھیل میں ایک

[illegible] ۔ بات بات ، اکی [illegible] یں ہی جاتی تی ۔ جسے زیبو
کے ذہن آ لے تھے بزرگوں کی نہ جانے کتنی کہانیاں از بر یاد تھیں ۔ سب حیران تھے
کہ یہ کس قسم کی لڑکی ہے جو اتنی سی عمر میں اتنا سب کچھ سیکھ گئی ۔ انسان کی ذہنی
ترقی کا راز کون جان سکتا ہے ۔

عزیزہ نے جلد اس کے لئے نئے کپڑے بنوائے ۔ نیا جوڑا پہن کر وہ
پھولے نہیں سما رہی تھی ۔ گلابی چھینٹ کا پاجامہ ۔ آسمانی رنگ کا دوپٹہ ۔ نئی کالی جوتیاں
کانوں میں چاندی کے بُندے ۔ ہاتھوں میں چوڑیاں ۔ بالوں میں مانگ نکال کر کلپ
لگا لئے ۔ اب اس کی چال میں ایک نئی دلکشی ۔ رنگ میں ایک نئی رونق اور آنکھوں
میں ایک نئی چمک آگئی تھی ۔ عزیزہ کو اس کے کھانے کا بھی بڑا خیال تھا ۔ خاصے
کے کھانے سے کچھ نہ کچھ اسے ضرور دیتیں ۔ وہ اپنی ہم جولیوں سے فخریہ انداز سے
کہتی کہ میں بڑے مزے میں ہوں اور میں بڑی خوش نصیب ہوں جو ایسے اچھے گھر
آگئی ۔ بیگم صاحبہ کو میرا بڑا خیال ہے ۔"

پھر بھی اگر عزیزہ اس کی بعض عادتوں کو سدھارنے کیلئے کوئی اچھی بات
اُس سے کہتیں تو وہ کچھ دھیان نہ کرتی ۔ اسے یہ کھلتا تھا کہ جو کچھ وہ چاہے وہ نہ
کر پائے ۔ اسے کسی قسم کی پابندی پسند نہ تھی ۔ عزیزہ کو اسکی اصلاح کی فکر تھی ۔
کیونکہ وہ بالکل جنگلی پودے کی طرح تھی جس میں کانٹ چھانٹ ضروری تھی ۔ وہ جانتی
تھیں کہ فطرت تو کوئی بدل نہیں سکتا پھر بھی آدمی کو اچھی تربیت ہی آدمی بناتی
ہے ۔ زیبو کی اصلاح کی جائے تو وہ بڑی اچھی لڑکی بن سکتی ہے ۔ مگر یہ کام
انہیں مشکل نظر آرہا تھا ۔

زیبو کو آئے کافی عرصہ ہو گیا ۔ لیکن اُس کی زندگی کا بھید اب تک نہ کھلا
کہ وہ کہاں پلی بڑھی ۔ کہاں کہاں رہی اور اصل واقعات کیا ہیں ۔ اتنے دن میں
اُس نے پچھلی زندگی کی بہت سی باتیں سنا ڈالیں ۔ مگر اس کے بیانات ہمیشہ
بے جوڑ ، اٹکل اور مختلف ہوتے تھے ۔ رات کو اس کا معمول تھا کہ کھانے کے بعد بیگم صاحب
کے لئے شیشے کی صراحی میں پانی میز پر رکھ کر سونے کے لئے چلی جاتی ۔ حسب معمول جب وہ
پہنچی تو بوا نصیبن رضائی میں منہ لپیٹے پڑی تھیں ۔ سردی خوب پڑ رہی تھی وہ بھی
اپنے پلنگ پر گرم لحاف میں لپٹ کر لیٹ رہی ۔ پہلے ایک لمبی سانس بھری پھر پکارا ۔
نصیبن بوا ـــــ اے بوا ـــــ کیا سو گئیں ؟"
نصیبن بوا کو اس وقت سردی کے مارے بولنا بھی ناگوار تھا ۔
"کیا ہے ـــــ ؟ ابھی تو میرا دماغ چاٹنے !"
اس وقت وہ اکثر گزشتہ زندگی کے کچھ واقعات دہرایا کرتی اور نصیبن
بوا کچھ سوتی کچھ جاگتی اس کی مجذوبانہ بڑ سنا کرتیں ۔

"کچھ نہیں ۔ ہم کہہ رہے تھے کہ ہماری اماں ہم کو یاد کرتی ہونگی بہت
دن سے ہم نے اپنی اماں کو نہیں دیکھا ۔"
نصیبن بوا چونک پڑیں رضائی کا کونہ جلدی سے منہ سے ہٹا کر پوچھا ۔
"یہ کیا ؟ یہ تو نے کیا کہا ـــ کیا تیری ماں زندہ ہے ؟"
"ہاں ـــــ تو کیا ہماری اماں مر گئیں ۔ اماں ہیں ۔ ماموں ہیں ۔ ماموں
کی پانچ لڑکیاں ہیں اور ہماری سہیلیاں ہیں ۔ ہمارے سب کوئی ہیں ۔"
"غارت ہو جائے تو ۔ تیرے سب کوئی ہیں تو پھر لاوارث بنی کیوں پھر
رہی تھی ۔ تو ہی نے تو کہا تھا کہ میرے کوئی نہیں ۔"
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ۔
"ایسے ہیں تو ہمیں کیا ـــــــــ باپ اپنا نہ مرتا تو کیوں مصیبت آتی ۔
اماں نے دوسرا نکاح کر لیا ۔ سوتیلا باپ بڑا بُرا تھا اُس نے نکال دیا ۔"
"ماں کی مامتا کہاں مر رہی تھی ۔ جس نے جیتے جی تجھے اپنے سے چھڑا دیا ۔
تباہ ہونے کیلئے ۔ کیسی کٹر ڈائن ماں ہے ۔"
"روئیں پیٹیں ۔ مگر اُن کا کچھ بس نہ چلا ۔ ہماری بڑی آپا ۔ منجھلی آپا ۔ کلو
مشبو چھٹکن ماموں کی لڑکیاں ہیں ۔ سب کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے ۔ ہائے اللہ سب
کہتی ہونگی کہ نہ جانے زیبو کہاں چلی گئی ۔"
"بھائی چپ رہ ۔ میری نیند حرام کرتی ہے ۔ بڑی بکواس سنے تیرے
پاس ـــ چلی بے چلی باتیں کیا کرتی ہے ۔ اور میں نے تجھے سمجھایا کہ نوکروں میں نہ گھسا
کر اور جوان لڑکوں کے ساتھ دھول دھپا نہ کیا کر ۔ مجھے لڑکیوں کے یہ ڈھنگ
اچھے نہیں لگتے ۔ اب کی میں نے دیکھا تو بیگم صاحب سے کہکر گھر سے نکلواؤں گی ۔"
زیبو کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ نصیبن بوا نے جھلا کر کہا ۔
"چپ رہ بہت کھی کھی نہ کر ۔"
دوسرے دن نصیبن بوا کو زیبو کی باتوں کا خیال آیا تو اُنہوں نے بیگم صاحب
کے پاس بیٹھکر کہا ۔
"اور کچھ سنا آپ نے ؟"
عزیزہ کوئی کپڑا سی رہی تھیں ۔ اُن کی طرف دیکھکر بولیں ۔
"کیا ہوا ؟"
"یہ چھوکری عجب عجب تنع (طرح) کی باتیں کرتی ہے ۔ رات کہہ رہی تھی کہ
ماں باپ سب ہیں ۔ اس کا بڑا کنبہ ہے ۔ میں حیران ہوں ۔ کبھی کچھ کہتی ہے کبھی کچھ ۔"
"کوئی کیا جانے ۔ ہونگے سب ۔ وہ تو ٹھیک سے بتاتی نہیں نہ آج تک

کسی نے خبر لی۔ کوئی ہوتا تو کھوج لگاتا۔"

زیبو دوسرے کمرے میں دروازے سے جھانک رہی تھی۔ عزیزہ نے آواز دی۔

"ادھر آ"۔ وہ جھاڑن ہاتھ میں لئے آکے کھڑی ہو گئی۔

"تو نے تو آج تک نہیں بتایا کہ تیری ماں ہے۔ ہمیشہ کہتی ہے کوئی نہیں؟"

وہ سوچتی ہوئی بولی

"ہاں ——— ماں ہیں بیگم صاحب! سب کوئی ہیں تو ہمیں کیا۔ ہمیں تو کسی نے نہ رکھا ——— ایک بہن تھی چھوٹی اُسے سوتیلے باپ نے اتنا مارا کہ وہ مر گئی اور مجھے گھر سے نکال دیا۔"

یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"ماں نے بھی تجھے چھوڑ دیا۔ اُلٹ کر خبر تک لی کبھی۔"

"اماں تو بہت بیمار تھیں۔ جانے اب کیسی ہیں۔ جب میں آئی اُن کے پیٹ ہو رہی تھی۔ کھٹیا پر پڑی رہا کرتیں۔ میں تسلا لگا دیتی۔ اور اُٹھا اُٹھا کر دن بھر پھینکا کرتی۔ ایک دن محلے میں بیر درخت پر چڑھی تھی۔ ایک لڑکے نے میرے ڈھیلا مارا۔ مجھے بھی غصہ چڑھا۔ میں نے اُس کے ڈھیلا کھینچ مارا۔ تو اس کا سر پھٹ گیا۔ اسپر باپ نے مجھے خوب پیٹا اور گھر سے نکال دیا۔ اماں بیچاری روتی رہیں۔ اور ہوں بھلا کیا کر سکتے۔ انھوں نے اپنی دو لڑکیوں کو تو بیاہ دیا۔ اور مجھ کو بیچ ڈالا۔ اتنی موٹی موٹی نوٹوں کی گڈیاں انہیں ملی تھیں۔ مجھے جہاں نوکر رکھا تھا وہاں آیا کو نوٹوں کی ایک گڈی ملی تھی۔"

"کیا تجھے بیچ ڈالا؟"

اُس نے گردن جھکا کر جواب دیا۔

"کیا خبر ——— میرے بیاہ میں بس تھوڑے ہی دن باقی تھے کپڑا گہنا سب تیار رکھا تھا۔"

عزیزہ نے ہنس کر پوچھا۔

"پھر بیاہ کیوں نہیں ہوا؟"

زیبو شرمیلے انداز سے آنکھیں نیچی کرکے مسکراتے ہوئے بولی۔

"اُنہہ اچھا ہوا بیاہ نہیں ہوا ——— میں بیاہ نہیں کرونگی۔ میں تو آپ کے پاس رہونگی۔"

"تم اچھی طرح رہو۔ جب بڑی ہوگی میں شادی کر دونگی۔"

نصیبن بوا نے اس کی طرف دیکھکر طنز سے کہا۔

"ہاں بیچاری ساری عمر ایسے ہی تھوڑی بیٹھے گی۔ اے بیگم صاحب تو تیرا ایسی اچھی طرح بیاہ کرینگی کہ مال جہیز زیور سے تجھے مالا مال کر دینگی۔ ذرا اپنے گن ڈھنگ تو ٹھیک رکھ ——— پھر دیکھنا کیسا بیاہ ہے گی۔"

زیبو کو ہنسی آگئی۔ وہ کمرے سے نکل کے اُٹھی اور جھاڑن کی طرح جاکر سنگھار کی الماری کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اسکے چہرہ کا رنگ اس وقت بدلا ہوا تھا وہ آئینہ کے پاس ایک سوچ میں کھڑی تھی۔ ذرا دیر بعد جھاڑن پھینک کر دھیرے دھیرے عزیزہ کے پاس آئی اور گھٹنے ٹیکتی ہوئی بولی۔

"بیگم صاحب! ایک بات کہیں آپ سے؟"

"کیا؟"

"ہم رہوں گی تو آپ ہی کے پاس۔ مگر میں کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ آپ سے کہوں ——— آپ تھوڑے دن کی مجھے چھٹی دے دیجئے گا۔ ایک بار میں اپنی سہیلیوں کو دیکھ آؤں۔ بس میرا اتنا جی چاہتا ہے اور کچھ نہیں۔"

"کچھ پتہ نشان تو معلوم ہو کہاں جانا چاہتی ہو۔ اور ابھی تمہیں آئے بہت دن بھی نہیں ہوئے۔"

"میں پتہ بتا دوں گی ——— ایک دن میں مسجد میں جاکر دعا مانگی کہ اللہ میاں مجھے سب سے ملا دیں۔"

"یہ کون سی ایسی بات ہے ——— عجب لڑکی ہے کیا اب یہاں رہنے کو دل نہیں چاہتا؟"

زیبو نے ایک کپڑا جو تخت پر رکھا تھا اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"چاہتا کیوں نہیں۔ میں پھر چلی آؤں گی۔ اجازت لیکر جاؤں گی۔"

رفتہ رفتہ زیبو کی طبیعت کچھ اُچاٹ اُچاٹ سی رہنے لگی۔ وہی کام جو وہ منٹوں میں کرکے رکھ دیتی اب گھنٹوں نہ نپٹتا۔ بار بار کہنے پر بھی جی چراتی۔ اسکی روزافزوں شوخیوں سے گھر بھر نالاں تھا۔ عزیزہ بھی بعض وقت اُس کی کیفیت دیکھکر اور شکایتیں سنکر تنگ آجاتیں اور کہتیں۔

"توبہ! یہ کہاں سے میرے سر پر عذاب نازل ہو گئی!"

اُسے راہ راست پر لگانے کی کوششیں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ اسکی شوخیوں کو دبانا بھلا کہیں ممکن تھا۔ جیسے ایک چڑھتی ہوئی ندی تھی۔

ایک روز نصیبن بوا اپنے پلنگ پر پوپلے منہ سے ٹٹول ٹٹول کر بڑے نہایت اطمینان سے ترکاری چھیل رہی تھی۔ زیبو آگے کھڑی ہو گئی اور شرارت آمیز نظروں سے دیکھکر بولی۔

"بوا! اے بوا! تم نے کبھی عشق کیا ہے؟ ——— اگر تمہارا عشق کرنے کو جی چاہے تو بابر کا ظلم دیکھو۔"

یہ سنتے ہی عقیلہ بیگم کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ بہادر لڑکی کو انہوں نے خونخوار نظروں سے دیکھا اور زور سے چیخ کر بولیں۔

"اے لڑکی! اپنے ہوش میں ہے کہ نہیں؟ تو کیوں اتنا اتراتی ہے اللہ کی سنوار تجھ سی فتنہ اور تجھے چٹکیوں پر اڑاتی ہے۔ میں نے تجھے بہت طرح دی لیکن اب یہاں تک نوبت پہنچی ——— آج تک مجھ بوڑھی سے کسی نے ایسی بات نہیں کی۔ ہنسک کیا ہوگا تیری اماں سنے۔ تیرے باوا نے ——— بس کیا جانتی ہے چھوڑو سہی۔ میں تیری ہڈی پسلی توڑ دوں گی۔ اور تمہ مجھ سے بھی حرامزادی کالے ——— میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ ابھی جا تو سے تیری بوٹی بوٹی کروں گی ——— چڑیل حرافہ ———"

زیبو سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ ان کا غصہ اس کے لئے تماشہ بن گیا۔ جب وہ ہاتھ بڑھا کر اسکی طرف لپکیں تو ہنستی ہوئی بھاگی۔ نصیبن بوا سے گوستی اور صلواتیں سناتی رہیں اور لوگ ان کے طرفدار ہو گئے اور دانتوں کے نیچے انگلیاں دبا کر ہے ہے توبہ توبہ کرنے لگے۔

ایک روز بچے ماں کے پاس شکایت لے کر آئے۔

"امی دیکھئے! ہم چیزیں لاتے لاتے حیران ہوئے جاتے ہیں اور روز روز وہ چوری جاتی ہیں۔ آخر کون لے جاتا ہے؟ نہ قلم ہے نہ پنسل۔ رحمان کی کتابیں بھی کھو گئیں۔"

عزیزہ نے حیرت سے پوچھا۔

"کون چراتا ہے؟ یہاں تو کوئی چیز لینے والا نہیں۔"

"امی! یہ زیبو چراتی ہے ——— یہی ہماری سب چیزیں رکھتی اٹھاتی ہے۔"

عزیزہ نے تردید کی۔

"نہیں بیٹے! وہ چرا کر کہاں لے جائیگی؟"

"ضرور چراتی ہے ورنہ کیا ہوتیں۔ ہم آج ہی نئی پنسل لائے تھے اور ابھی غائب۔ پوچھتے ہیں تو کہتی ہے ہم کیا جانیں۔"

عزیزہ نے زیبو کو بلا کر پوچھا

"کیوں زیبو! یہ بچوں کی کتابیں قلم پنسل کیسے غائب ہیں کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"ہم کیا جانیں بیگم صاحب! یہ اپنے کہیں پھینک آتے ہونگے۔"

صفدر نے جھلا کر کہا۔

"بالکل غلط۔ ہم نے کہیں نہیں پھینکا۔ تم ہی نے لیا ہوگا۔"

"اللہ میاں کی قسم ہم نے نہیں لیا۔ ہم کیا کرتے۔"

چھوٹے لڑکے رحمان نے کہا۔

"ہاں ——— اور نیچے بھی لکھا پڑھا نہیں کرتی ہو۔ اور ڈرائنگ بھی بنایا کرتی ہو۔ ہم نے ایک دن اپنا کلر بکس تمہارے پاس دیکھا تھا۔ تم نے چھپا دیا ہے۔"

عزیزہ جھڑک کر بولیں۔

"جا ——— ! ابھی سب چیزیں لا کے دے۔ اب یہ حرکتیں شروع کیں۔"

زیبو نے روہانسی ہو کر کہا۔

"بیگم صاحب آپ کو یقین نہیں آتا۔ میرے پاس کچھ نہیں۔"

صفدر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہم خود اس کی تلاشی لیں گے۔"

"لے لیجئے تلاشی۔"

یہ کہکر وہ بڑی پھرتی سے آگے بڑھی۔ بچے بھی دوڑے۔ اس کی تمام چیزیں گٹھری پوٹلی ڈبے جو کچھ ملا سب بکھیر کر رکھ دیا۔ لیکن ان میں سوا ٹوٹی پھوٹی بیکار چیزوں کے کچھ نہ تھا۔

اس واقعہ کے دو دن بعد گھر میں یہ افواہ اڑی کہ زیبو ریل کے کرایہ کے روپیہ جمع کر رہی ہے۔ سب نوکروں سے تھوڑے تھوڑے لئے ہیں۔ ابھی کچھ کسر رہ گئی ہے۔ عزیزہ اپنی بہن کے پاس بیٹھی تھیں۔ یہ سنکر گھبرا سی گئیں۔ بہن کے ملازم سے جس نے یہ خبر سنائی تھی۔ کہا

"بلاؤ اس کم بخت کو۔ یہ تو بڑی فتنہ نکلی۔"

زیبو سامنے آتے ہی رونے لگی اور اپنی صفائی پیش کی۔

"بیگم صاحب یہ سب جھوٹ بکتے ہیں میں نے کبھی اسے کرایہ کے پیسے نہیں مانگے۔ آپ پوچھ لیجئے۔"

عزیزہ کی بہن آذر نے کہا۔

"اچھا دیکھو! ابھی کھرا اور کھوٹا معلوم ہوا جاتا ہے۔ آپ ہی آپ کوئی تجھے جھوٹ کیوں لگائے گا۔"

اسی وقت نوکروں کو بلا کر تفتیش کی گئی تو انہوں نے بیان کیا کہ صاحب آج صبح سے یہ پیچھے پڑی ہے کہ ہمارے پیسے دیدو۔ اس نے تھوڑے تھوڑے پیسے لا کر جمع کرائے تھے۔ ہمیں کیا معلوم کہ یہ کیسے ہیں۔ آج اس نے مانگے تو ہم نے دیدئیے۔ اور جمعدار سے پوچھ رہی تھی کہ کرایہ کتنا ہے ———

عزیزہ نے گرج کر کہا۔

"کیوں یہ تیری حرکتیں۔ اور اوپر سے سب کو جھوٹا بناتی ہے۔"

زیبو روتے ہوئے بولی۔

"ہم نے یہ کچھ نہیں کہا۔ نہ نے پیسے لگے تھے۔"

"یہ پیسے کہاں سے آگئے تھے تو نے؟"

"اپنے گھر سے لائے تھے!"

نصیبن بوا غصہ سے دانت پیس کر بولیں۔

"بڑی بچاری گھر سے لائی تھی۔ پھوٹی کوڑی تو تھی نہیں تیرے پاس چیتھڑے لگا کر تو آئی تھی۔ کہاں رکھے تھے؟"

"ہمارے نیفے میں رکھے تھے۔"

ایک ملازمہ کلثوم نے آگے بڑھ کر کہا۔

"اے بی بی! یہ بڑی آفت لڑکی ہے۔ اسے تھوڑا نہ جانئے ——

آج حبّا سے اس نے کہا کہ مجھے یہاں سے لے چل۔ کرایہ میں دونگی اپنا ——"

حبّا ایک نوجوان ملازم تھا اور چھٹی لے کر گھر جا رہا تھا وہ فوراً حاضر کیا گیا تو اس نے بیان کیا۔

"حضور! اس نے کہا تھا مگر ہماری کیا مجال تھی۔ یہ کہیں بھاگ جاتی تو ہمارے اوپر الزام آتا۔ اس لئے ہم نے خبردار کر دیا۔"

عزیزہ نے سر پکڑ لیا۔

"اللہ ری لڑکی —— میں اسے ایسا نہیں جانتی تھی۔

انہوں نے غضب آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"کیوں تو کہہ رہی ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے تیرے منہ پر تو یہ کہہ رہا ہے۔"

زیبو کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ آفت زماں انکار کرتی رہی کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔

عزیزہ نے اس کے پاس جتنے پیسے تھے سب اسی وقت لے لئے اور کہا۔

"تجھے یہ سب سوانگ بھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو جہاں جانے کو کہے میں کرایہ دیکر بھیج دوں۔ میں نے تو تیری ہی بھلائی کیلئے تجھے رکھ لیا تھا۔"

اُس نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں کہیں جانا نہیں چاہتی۔"

جب یہ ہنگامہ ختم ہو گیا۔ زیبو معمولی کاموں میں لگ گئی۔ حبّا گھر جا چکا تھا۔ وہ عزیزہ کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"بیگم صاحب! ہمارے اوپر سب نے الزام رکھ دیا۔ اور جو ہم انکی بات کہہ دیتے تو معلوم ہوتا۔ انہوں نے (حبّا) نے خود ہی کہا تھا کہ یہاں کیوں پڑی ہو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ بڑے برے ہیں یہ لوگ ——"

"چل ہٹ —— جب وہ چلا گیا تو یہ باتیں بنانے آئی ہے۔ ایسا تھا تو اس وقت اس کے منہ پر کیوں نہ کہا؟"

"مجھے قسم دیدی تھی انہوں نے۔"

"تم ہی ایسی نہ ہوتیں تو کیسے کوئی کچھ کہتا۔" عزیزہ نے اسکی طرف سے امیدیں باندھی تھیں۔ آج وہ سب ٹوٹ گئی تھیں۔ آج انہوں نے اُسے تنہائی میں اُسے بٹھا کر بہت کچھ سمجھایا بجھایا۔ اونچ نیچ بتائی۔ اس کے دل میں صبر کو تاڑنے کی کوشش کی۔ زیبو سب غور سے سنتی رہی اور قسمیں کھائیں کہ یہاں سے جانے کی اسکو بالکل خواہش نہیں۔ مگر کیا یہ شوخ و چنچل پرند محبت کے سنہرے تاروں میں جکڑے بند رکھ کر خوش رہ سکتا ہے۔ یہ لطیف ماحول، رنگین فضا، امیدوں کی یہ دلفریب دنیا اور اس کی دل آویزیاں اُسے آزادی کی لاانتہا مسرتوں سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔

صبح کی لطیف اور سرور آفریں روشنی اُفق کی طرف آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ روح پرور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے مستانہ وار رقص کرتے ہوئے سوتے ہوئے جذبات کو انداز ناز سے جگا رہے تھے۔ چڑیاں کیف مدہوشی میں آزادی کے خوش آئند گیت گا رہی تھیں۔ زیبو ایک دم چونک پڑی۔ جھٹ اُٹھ کر رضائی لپیٹ لی۔ نصیبن بوا نماز پڑھ رہی تھیں۔ سلام پھیر کر بولیں۔

"آج تو بڑے سویرے اُٹھ پڑی!"

"ہاں —— آنکھ کھل گئی بوا۔ جھاڑو دینے جا رہی ہوں۔ سویرا ہو گیا۔"

یہ کہکر اُس نے جھاڑو جو کونے میں پڑی تھی اُٹھا لی۔ سردی غضب کی تھی۔ مگر زیبو کی رگوں میں بجلیاں سی دوڑ رہی تھیں۔ اور دل میں نئی نئی اُمنگوں کی آگ بھڑک رہی تھی۔

دن چڑھ آیا۔ معمول کے مطابق سب کام دھندے ہو رہے تھے۔ مگر زیبو کہاں ہے۔ سب سے زیادہ اس کی فکر عزیزہ ہی کو رہتی تھی۔ جب وہ ناشتہ کرنے آئیں اِدھر اُدھر کہیں اُسے نہ پایا تو کہا "آج معلوم ہوتا ہے زیبو ابھی تک سو رہی ہے۔ یہ عجیب عادت ہے اس کی۔"

وہ اکثر دیر میں اُٹھتی۔ کوئی پوچھتا تو کہتی میرے سینہ میں بڑا درد ہے اور ذرا سی دیر میں بھلی چنگی ہو جاتی ہے۔

لیکن بستر دیکھا تو خالی پڑا تھا۔ نصیبن بوا نے کہا "وہ تو آج بڑے سویرے منہ اندھیرے اُٹھی تھی میں نماز پڑھ رہی تھی۔ میں نے کہا تو بڑی جلدی آج اُٹھ گئی تو کہا کہ جھاڑو دینے جا رہی ہوں۔ آپ ہی کی طرف گئی ہوگی۔

عزیزہ کا دل کھٹک گیا۔

"میری طرف کہیں نہیں۔ نہ معلوم ہوتی ہے ابھی۔ آخر یہ کہاں ہے۔ ذرا دیکھو تو۔"

نوکروں نے ہر جگہ دیکھا۔ کہیں پتہ نہ تھا۔ آج چڑیا قفس کی سنہری تیلیوں کو توڑ کر آزاد ہو گئی۔ سٹیشن تک آدمی دوڑایا گیا۔ سب طرف سے سب ناکام لوٹے۔ کتنی دلیری سے گئی۔ اس کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہر شخص محو حیرت تھا کہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کیسے بھاگ گئی۔ شعلہ تھی یا بجلی۔

تھوڑی دیر میں خبریں ملنا شروع ہوئیں کہ گھر کی کئی چیزیں غائب ہیں۔ اس کے اپنے کپڑے کا نیا جوڑا۔ بیگم صاحبہ کی پانوں کی چاندی کی ڈبی۔ چاندی کی تھوڑی۔ ایک چھوٹا بکس۔ بچوں کے موزے۔ جوتے۔ رومال۔ صفدر نے اپنی گرم شیروانی دیکھی تو وہ بھی کھونٹی پر سے غائب تھی۔ اُس نے چلا کر کہا "امی ہماری گرم شیروانی بھی زیبو چرا لے گئی۔ کھونٹی پر ٹنگی تھی۔"

اب تو سب اور سٹپٹائے۔ اندھیر ہو گیا۔ بہت کچھ ساز و سامان کے ساتھ گئی۔ پکی چور نکلی۔ غرض سارا دن ایک ہنگامہ رہا۔ بس یہی خیریت تھی کہ کسی بڑی چیز پر ہاتھ نہیں مارا۔ اس سے کیا بعید تھا۔ نصیبن بوا دن بھر کوستی رہیں۔

"اللہ غارت کرے۔ در در کی ٹھوکریں کھائے گی تب پتہ چلے گا۔ دودھ بھات کی تھالی میں لات مار کر چلی گئی۔ اور پھر اتنا سب سامان لیکر گئی۔ اللہ کی مار پڑے۔"

عزیزہ نے کہا "میں جانتی تھی کہ وہ نہ رہے گی۔ مگر اس طرح جانا تو کمال ہی ہو گیا۔ تم نے کسی نے اُسے دیکھا تک نہیں۔ ایسی اُڑن چھو ہوئی۔"

نصیبن بوا نے اپنا ماتھا ٹھونک کر کہا

"کیا بتاؤں بیوی! میں آپ حیران ہوں۔ عقل چرخ ہے ——"

سہ پہر کا وقت تھا۔ دھوپ زرد ہو چلی تھی۔ بچے باہر لان پر کھیل کود رہے تھے۔ کیاریوں میں پھول کھلے تھے۔ ہوا بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ دو اجنبی احاطے کی دیوار کے پیچھے کھڑے آپس میں کچھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ صفدر کی نظر ان پر پڑی تو اُنہوں نے اشارے سے بلایا۔ صفدر بھاگ کر پہنچا۔ ان میں سے ایک نے سوال کیا۔

"میاں یہ کس کا مکان ہے؟"

"رشید صاحب کا۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام صفدر ہے۔"

"آپ اُن کے صاحبزادے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

اُنہوں نے اپنے ساتھی سے کہا

"ٹھیک ہے۔ پتہ چل گیا۔" پھر صفدر سے مخاطب ہوئے

"اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے یہاں سے کوئی لڑکی بھاگی ہے؟"

"جی ہاں —— دو تین روز ہوئے۔ ہمارے یہاں ایک لڑکی رہتی تھی وہ صبح کو بھاگ گئی۔ سب سوتے رہے تھے۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے والد صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے تشریف لائیے۔ میں اُن کو اطلاع کرتا ہوں۔"

رشید صاحب کو اطلاع ہوئی تو اُنہوں نے ڈرائنگ روم میں بلا بھیجا۔

ایک صاحب نے کہا "میرا نام احمد علی ہے۔ مجھے آپ سے کبھی شرف نیاز حاصل کرنے کا موقعہ نہیں ہوا۔ لیکن آپ کے نام سے بخوبی واقف ہوں۔ آپ کی تعریف ہمیشہ سنی ہے۔ شہر میں میری دکان ہے۔ پرسوں شام کو میں اور یہ میرے دوست دونوں بازار میں چلے جا رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک لڑکی مردانے لباس میں ایک گٹھڑی بغل میں دبائے گھوم رہی ہے۔ بال کٹے ہوئے مردانی بولی بول رہی ہے۔ پہلے تو کچھ خیال نہیں کیا۔ لیکن اس کی وضع قطع اور باتوں سے کچھ شبہ ہوا تو غور کیا۔ جب ذرا کھوج کیا تو اُس نے بتایا کہ میں لاوارث لڑکی ہوں اور میں نے اپنا بھیس بدل لیا ہے۔ تب ہم اسے سمجھا بجھا کر اپنے گھر لے گئے۔ اور اس سے کہا کہ جب تک تمہارے لئے کوئی انتظام نہ ہو جائے تم ہمارے گھر میں رہو۔ اس طرح گھومنے میں خطرہ ہے کہ پکڑی نہ جاؤ۔ مگر جب ہم نے اُس کا سامان دیکھا تو اس میں بہت سے کپڑے۔ چاندی کی دو چیزیں اور کچھ کتابیں قلم دوات، کاپیاں نکلیں اور اُن پر آپ کا نام پتہ اور آپ کے صاحبزادے کا نام تھا۔ تب تو یہ پتہ چلا کہ بھاگ کر آئی ہے اور سب چیزیں چرا کر لائی ہے۔ اُس نے خود اقبال کیا۔ اب ہمیں یہ فکر ہوئی کہ آپ کے یہاں اُسے کس طرح پہنچائیں۔ اسی فکر اور تفتیش میں ہم یہاں آئے ہیں۔ لڑکی اور آپ کا کُل سامان ہمارے پاس محفوظ ہے۔ کسی معتبر آدمی کو ہمارے ساتھ کر دیجئے تو ہم اسے یہاں بھیج دیں۔" یہ واقعہ سنکر رشید صاحب کو کمال حیرت ہوئی انہوں نے دونوں صاحبان کا بہت شکریہ ادا کیا کہ اُنہوں نے اتنی زحمت اٹھائی اور یہاں تک آئے۔ اُن سے کہا۔ "اچھا میں اندر خبر کر دوں اور ابھی اس کے لانے کا انتظام کرتا ہوں۔" صفدر جو سب باتیں سُن رہا تھا جلدی اندر بھاگا۔ عزیزہ بیگم دالان میں بیٹھی کچھ پکا رہی تھیں۔ صفدر نے دور ہی سے پکارا۔

"امی! امی!! زیبو مل گئی —— وہ شہر میں ہے۔ ابا جان کے

پاس وہ آدمی اطلاع کرنے آئے ہیں اور [illegible] کرنے کی [illegible] ل گئیں۔"

اتنے میں رشید صاحب بھی آگئے اور مسکرا کر بولے۔

"سنا تم نے قصہ۔ تمہاری زیبو مل گئی اور اس نے مردانے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ بال کٹوا لیئے ہیں۔ آزادی سے گھوم رہی تھی۔ اس طرح پکڑی گئی — خوب لڑکی ہے۔"

عزیزہ سہتا ہا حیرت سے رشید صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔ گھبرا ہٹ سے چھوٹ گیا۔ سارے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہو گئی۔

"بھاڑ میں جائے وہ —— میں نے تو صبر کر لیا تھا۔"

سارے گھر میں اس خبر سے ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ جس نے سنا اس کے ہوش اڑ گئے۔ اتنی سی جان اور یہ حرکتیں۔ کس غضب کی لڑکی ہے۔ رشید صاحب کی بہن نے کہا۔

"خوب ہوا۔ بڑا اچھا ہوا۔ پکڑی گئی —— شہر میں اللہ رکھے بھائی جان کو کون نہیں جانتا۔ کہاں جاتی بھاگ کے۔ بھابی! آپ نے تو کچھ نہیں کیا لیکن اللہ کی مہربانی ہوئی۔ آپ کی چیزیں پھر آپ کو واپس مل جائیں گی۔"

رشید صاحب نے کہا: "اچھا اب ذرا جلدی کرو وہ لوگ بیچارے بیٹھے ہیں۔ انہیں کرایہ کے دام بھی دینا ہونگے۔ اور کسی نوکر کو ساتھ کر دو۔"

عزیزہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"یہ لوگ بھی کیسے شریف ہیں۔ جنھوں نے اتنی تکلیف گوارا کی۔"

زیبو کو بلانے کا انتظام تو ہو گیا مگر فکر یہ تھی کہ اس کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے۔ ایک چور اور آوارہ لڑکی گھر میں کیسے رکھی جائے۔ بدنام کیسے منہ سے چڑھے گی۔

منشی جی ان صاحبان کے ساتھ زیبو کو لینے پہنچے گھر کے قریب آکر احمد علی نے ان سے کہا "منشی جی آپ کہیں چھپ جائیے۔ ورنہ وہ آپ کو دیکھتے ہی بھاگ جائیگی۔ بڑی تیز اور ہوشیار لڑکی ہے۔ آسانی سے قابو میں آنے والی نہیں۔ کسی دھوکے ہی سے ہم آپ کے ساتھ کر سکیں گے۔ اور سب انتظام کر کے آپ کو بلالیں گے۔"

منشی جی ایک دکان میں کنارے بیٹھ گئے۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ زیبو چوڑی دار سفید پاجامہ۔ گرم اچکن پہنے۔ ٹوپی اوڑھے۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑی شان سے سڑک پر ٹہل رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک لڑکی کو کوئی بھی

گئے [illegible] صاحب ہیں۔ نہ کوئی فکر نہ غم۔ آنکھوں میں آزادی کی چمک۔ رگ رگ میں شوخی بھری۔ کبھی کچھ گنگناتی ہے کبھی کسی سے ہنس بول رہی ہے باتیں کر رہی ہے۔ یہ دیکھ کر منشی جی کے ہوش جاتے رہے۔ ان کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اور سکڑ کر بیٹھ گئے کہ کہیں وہ یکایک انہیں دیکھ نہ لے جو سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

سورج ڈوب گیا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ بازار میں بجلیاں جل گئیں۔ اس وقت وہاں کی رونق اور چہل پہل زوروں پر تھی۔ آسمان پر تاروں کی [illegible] گئیں۔ پرندے آشیانوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ مگر انسان بہادر زیبو کا دل آزادی کی دھن میں مست شہر کی پرشور رنگ رلیوں میں مگن آزادی کا ایک رنگین خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہر فریب دل مسرت کی موجوں پر تھرک رہا تھا۔ زندگی کی کشتی آزادی کی تیز لہروں میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ نہ طوفان کا ڈر نہ حوادث کا کھٹکا۔ نہ منزل نہ نشان منزل۔ سنیما گھر سے باجوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ دور پر ایک رکشا والا بھی تانیں لگا رہا تھا ؎

مجھ عندلیب زار کو حسرت نے بٹھا دیا
کم بخت باغبان نے دامن گل چھڑا دیا
جاؤ سدھارو میری جاں! تم پہ خدا کی ہو اماں
بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر قسمت نے گر ملا دیا

زیبو کے کان ادھر لگے تھے۔ اتنے میں احمد علی ایک تانگہ لائے اور اس کے پاس آکر چپکے چپکے کچھ کہا۔ زیبو کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پس و پیش میں پڑی تھی۔ احمد علی نے پھر کہا۔

"بس چلو سوار ہو۔ یہ بڑی اچھی نوکری ہے۔ بالکل اپنے گھر کی طرح آرام سے رہو گی۔ میں روز تمہیں دیکھنے آیا کروں گا۔ ذرا بھی کوئی تکلیف ہو تو مجھ سے کہنا —— جلدی کرو۔"

"آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔"

"ہاں —— تم بیٹھو۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

یہ کہکر وہ اس کی گٹھری اٹھا لائے۔ تانگہ پر رکھ دیا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر کے سوار کیا۔ زیبو نے بیٹھ کر کہا "آپ بھی بیٹھئے۔"

"ابھی بیٹھتا ہوں" یہ کہکر منشی جی کو آواز دی۔

"آجائیے جناب!"

منشی جی ایک جست لگا کر تانگہ پر بیٹھ گئے اور تانگے والے سے بولے

"بھئی ذرا جلدی لے چل۔"

[illegible]

"احمد میاں! —— احمد میاں!! ——"

تانگہ جتنی تیزی سے ممکن تھا بھاگا۔ منشی جی نے کڑک کر کہا۔

"اب بیٹھی رہ چپکی۔ نہیں تو سیدھا تھانے میں پہنچا دوں گا۔"

اُس کا چہرہ فق ہو گیا ایک ایسی ہرنی کی طرح جو راہ فرار نہ پا کر گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھے۔ وہ اضطراب کے ساتھ بیٹھی تھی اور لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ کیا سے کیا ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر وہ صیاد کے چنگل میں پھنس گئی۔ تخیل کی دنیا اُجڑ گئی۔ تارکول کی لمبی سڑک اپنی قسمت کی طرح میلوں تک سیاہ نظر آ رہی تھی۔ رات سنسان تھی اور اس کے دل کی طرح ویران۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے اس کے دل پر چوٹ لگ رہی تھی۔ اس کی نعلوں سے جو چنگاریاں نکلتیں ان سے دل میں وہ رہ رہ کر سوز و جلن پیدا ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سا دکھ اُٹھتا تھا۔ بہت سارا راستہ طے ہو گیا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی۔ اُفق کے کنارے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ حسن کی ضیا بکھر رہی تھی۔ اس کی نور افشانی سے تارکول کی سڑک پر کہیں کہیں سراب کی سی چمک پیدا ہو جاتی۔ زیبو ایک غلاب کی سی کیفیت سے چونک رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے تسکین بخش جھونکوں نے اس کے ہوش و حواس بہت کچھ بجا کر دیئے تھے۔ اُس نے اپنی گردن اور ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھ ڈالے۔ منشی جی کو جب اس کی طرف سے پورا اطمینان ہو گیا تو نرمی سے پوچھا۔

"کیوں زیبو! تو بھلا کیوں بھاگی تھی؟"

اُس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"یوں ہی کچھ جی گھبرایا تھا۔ میں نے کہا ذرا گھوم آؤں۔"

منشی جی نے تمسخر سے ہنس کر کہا

"اچھا تو گھومنے آئی تھی۔ واہ وا۔ چوری چھپے گھومنے کی اچھی ہی۔"

زیبو ذرا دیر چپ رہی پھر بولی۔

"آدھے راستہ پر آ کر جی میں آیا کہ لوٹ جاؤں مگر بیگم صاحب کے ڈر کے مارے نہیں گئی۔"

"ہت تیری کی پاگل لڑکی!!"

گھر آ گیا۔ دونوں اُتر پڑے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ بچے سو گئے تھے لیکن اور سب اس کے انتظار میں ابھی جاگ رہے تھے۔ زیبو کھٹ کھٹ کرتی دلیرانہ انداز سے نوکروں کے کوارٹر میں پہنچی اور بڑے زور سے کہا "السلام علیکم۔"

نوکر ہڑبڑا کر سب کھڑے ہو گئے اور اشتیاق و تجسس کی نظروں سے اُسے دیکھنے لگے۔ گویا کوئی عجیب تماشہ ہو۔ نگران کو تاکید کر دی گئی تھی کہ کوئی اس کو

[illegible] سب سامان کے اس کو بیگم صاحب کے پاس لیکر پہنچے۔ اس درمیان میں زیبو مردانے کپڑے اُتار کر اپنے پہلے والے کپڑے پہن چکی تھی۔ نوکروں کے بار بار کہنے سے وہ جھجکتی ہوئی سامنے آئی اور چوکھٹ پر بیٹھ کر اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹیک دی۔ ایک خوف کی سی کیفیت اس پر طاری تھی اور نو گرفتار وحشی پرند کی طرح تیز سانسیں لے رہی تھی۔ نوکروں نے کل سامان سامنے فرش پر بکھیر دیا۔

رشید صاحب اس وقت اپنی میز کے پاس سر جھکائے بیٹھے کچھ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے نظر اُٹھا کر حیرانی سے دیکھا۔ اوہ اتنا سب لے گئی تھی۔

عزیزہ کے چہرے پر غصہ اور ضبط کی وجہ سے ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ غضب آلود نظروں سے دیکھتی رہیں۔ پھر تاسف اور ملامت کے لہجہ میں بولیں۔

"کیوں زیبو ہم نے تمہارے ساتھ ایسا ہی بُرا سلوک کیا تھا جس کا تم نے ہمیں یہ بدلا دیا۔"

رشید صاحب نے کتاب کا ورق اُلٹتے ہوئے تنبیہاً کہا۔

"اب کی تو یہ بھاگ نکلی تھی۔ لیکن اب میں نے پولیس میں رپورٹ کر دی ہے اگر بھاگی تو فوراً پکڑی جائے گی۔ اور سزا ملے گی۔"

عزیزہ نے کہا "ہاں یہ سمجھ لے کہ تو یہاں سے بھاگ نہیں سکتی۔"

اتنے میں نصیبن بوا لرزہ براندام وہاں پہنچیں۔ ایک لڑکا اُن کا ہاتھ پکڑے تھا۔ کلیجہ بلیوں اُچھل رہا تھا۔ مُنہ سے آواز نکلنا دشوار تھا۔ دھم سے بیٹھ گئیں اور کانپتی ہوئی بولیں۔

"ہائے غضب! خدا غارت کرے۔ پیٹ جائے یہ۔ ہائے میرے بچوں کی اور بیوی کی اتنی چیزیں چُرا کے لے گئی۔ میرے کلیجہ میں ہول سما گئی ہے۔ دو دن سے بھوک پیاس سب غائب ہو گئی۔"

عزیزہ نے نوکر سے کہا کہ انہیں یہاں سے لے جاؤ۔ یہ اس وقت اپنے قابو میں نہیں ہیں۔ عجیب حالت ہو رہی ہے۔ نوکر انہیں پکڑ کر سہارا دیکر لے گئے۔ زیبو بھی دو آدمیوں کی حفاظت میں اپنی جگہ پر پہنچا دی گئی۔

صبح اپنی دلفریبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ ہر طرف نور کی شعائیں بکھر گئیں۔ چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا۔ پھول مسکرا اُٹھے۔ لیکن زیبو آج چپ چاپ بستر غم پر نڈھال پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس میں جنبش کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔ اس کے لئے یہ صبح زندگی کی شب تار تھی۔ طویل اور بوجھل۔ کلثوم نے

پاس وہ آدمی اطلاع کرنے آئے ہیں اور جتنی چیزیں چرا کر لے گئی تھی سب مل گئیں ۔"

اتنے میں رشید صاحب بھی آ گئے اور مسکرا کر بولے ۔

"سنا تم نے قصہ ۔ تمہاری زیبو مل گئی اور اس نے مردانے کپڑے پہن رکھے ہیں ۔ بال کٹوا لیے ہیں ۔ آزادی سے گھوم رہی تھی ۔ اس طرح پکڑی گئی — خوب لڑکی ہے ۔"

عزیزہ سراپا حیرت بنی رشید صاحب کو دیکھ رہی تھیں ۔ کنگھی ہاتھ سے چھوٹ گیا ۔ سارے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہو گئی ۔

"بھاڑ میں جائے وہ —— میں نے تو صبر کر لیا تھا ۔"

سارے گھر میں اس خبر سے ایک سنسنی سی پھیل گئی ۔ جس نے سنا اس کے ہوش اڑ گئے ۔ اتنی سی جان اور یہ حرکتیں ۔ کس غضب کی لڑکی ہے ۔ رشید صاحب کی بہن نے کہا ۔

"خوب ہوا ۔ بڑا اچھا ہوا ۔ پکڑی گئی —— شہر میں اللہ رکھے پیر بھائی جان کو کون نہیں جانتا ۔ کہاں جاتی بھاگ کے ۔ بھابی ! آپ نے تو کچھ نہیں کیا لیکن اللہ کی مہربانی ہوئی ۔ آپ کی چیزیں پھر آپ کو واپس مل جائیں گی ۔"

رشید صاحب نے کہا ۔ "اچھا اب ذرا جلدی کرو وہ لوگ بیچارے بیٹھے ہیں ۔ انہیں کرایہ کے دام بھی دینا ہونگے ۔ اور کسی نوکر کو ساتھ کر دو ۔"

عزیزہ اٹھتے ہوئے بولی ۔

"یہ لوگ بھی کیسے شریف ہیں ۔ جنہوں نے اتنی تکلیف گوارا کی ۔"

زیبو کو بلانے کا انتظام تو ہو گیا مگر فکر یہ تھی کہ اس کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے ۔ ایک چور اور آوارہ لڑکی گھر میں کیسے رکھی جائے ۔ محلے کیسے منہ چڑھے گی ۔

منشی جی ان صاحبان کے ساتھ زیبو کو لینے پہنچے ۔ گھر کے قریب آ کر احمد علی نے ان سے کہا "منشی جی آپ کہیں چھپ جائیے ۔ ورنہ وہ آپ کو دیکھتے ہی بھاگ جائیگی ۔ بڑی تیز اور ہوشیار لڑکی ہے ۔ آسانی سے قابو میں آنے والی نہیں ۔ کسی دھوکے ہی سے ہم آپ کے ساتھ کرینگے ۔ اور سب انتظام کر کے آپ کو بلا لیں گے ۔"

منشی جی ایک دکان میں کنارے بیٹھ گئے ۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ زیبو چوڑی دار سفید پاجامہ ۔ گرم اچکن پہنے ۔ ٹوپی اوڑھے ۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑی شان سے سڑک پر ٹہل رہی ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک نظر میں کوئی بھی

گئے تھے [illegible] صاحب ہیں ۔ نہ کوئی فکر نہ غم ۔ آنکھوں میں آزادی کی چمک ۔ رگ رگ میں خوشی بھری ۔ کبھی کچھ گنگناتی ہے کبھی کسی سے ہوائی بولی میں باتیں کر رہی ہے ۔ یہ دیکھ کر منشی جی کے حواس جاتے رہے ۔ ان کا دم گھٹنے لگا ۔ وہ اور سکڑ کر بیٹھ گئے کہ کہیں وہ بھاگ نہ نکلے اور انہیں دیکھ نہ لے جو سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے ۔

سورج ڈوب گیا ۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا ۔ بازار میں بجلیاں روشن ہو گئیں ۔ اس وقت وہاں کی رونق اور چہل پہل زوروں پر تھی ۔ آسمان پر تاروں کی آنکھیں کھل گئیں ۔ پرندے آشیانوں کی تلاش میں سرگرداں تھے ۔ مگر آشیاں برباد زیبو کامل آزادی کی دھن میں مست شہر کی پر شور رنگ رلیوں میں گم آزادی کا ایک رنگین خواب دیکھ رہی تھی ۔ اس کا جسم فریب دل مسرت کی موجوں پر تھرک رہا تھا ۔ زندگی کی کشتی آزادی کی تیز لہروں میں ہچکولے کھا رہی تھی ۔ نہ طوفان کا ڈر نہ حوادث کا کھٹکا ۔ نہ منزل نہ نشان منزل ۔ سنیما گھروں سے باجوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں ۔ دور پر ایک رکشہ والا لمبی تانیں لگا رہا تھا ۔

مجھ عندلیب زار کو حسرت نے بٹھا دیا
کم بخت باغبان نے دامن گل چھڑا دیا
جاؤ سدھارو میری جان ! تم پہ خدا کی ہو امان
بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر قسمت نے گر ملا دیا

زیبو کے کان ادھر لگے تھے ۔ اتنے میں احمد علی ایک تانگہ لائے اور اس کے پاس آ کر چپکے چپکے کچھ کہا ۔ زیبو کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پس و پیش میں پڑی تھی ۔ احمد علی نے پھر کہا ۔

"بس چلو سوار ہو ۔ یہ بڑی اچھی نوکری ہے ۔ بالکل اپنے گھر کی طرح آرام سے رہو گی ۔ میں روز تمہیں دیکھنے آیا کروں گا ۔ ذرا بھی کوئی تکلیف ہو تو مجھ سے کہنا —— جلدی کرو ۔"

"آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے ۔"

"ہاں —— تم بیٹھو ۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں ۔"

یہ کہہ کر وہ اس کی گٹھری اٹھا لائے ۔ تانگہ پر رکھ دیا ۔ پھر ہاتھ پکڑ کر سوار کیا ۔ زیبو نے بیٹھ کر کہا ۔ "آپ بھی بیٹھیے ۔"

"ابھی بیٹھتا ہوں ۔" یہ کہہ کر منشی جی کو آواز دی ۔

"آ جائیے جناب !"

منشی جی ایک جست لگا کر تانگہ پر بیٹھ گئے اور تانگے والے سے بولے

"بھئی ذرا جلدی لے چل ۔"

تھی ایک آن میں سب کچھ کہہ گئی۔ اس نے زور سے چیخ ماری اور احمد میاں کو پکارا۔

"احمد میاں! ـــــ احمد میاں!! ـــــ"

"تانگہ جتنی تیزی سے ممکن تھا جا رہا تھا۔ منشی جی نے کڑک کر کہا۔

"اب بیٹھی رہ چپکی۔ نہیں تو سیدھا تھانے میں پہنچا دوں گا۔"

اُس کا چہرہ فق ہوگیا۔ ایک ایسی ہرنی کی طرح جو راہ فرار نہ پاکر گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھے۔ وہ اضطراب کے ساتھ بیٹھی تھی اور لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ کیا سے کیا ہوگیا۔ ایک دفعہ پھر وہ صیاد کے چنگل میں پھنس گئی۔ تخیل کی دنیا اُجڑ گئی۔ تارکول کی لمبی سڑک اپنی قسمت کی طرح میلوں تک سیاہ نظر آرہی تھی۔ راستہ سنسان تھا۔ اس کے دل کی طرح ویران۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے اس کے دل پر چوٹ لگ رہی تھی۔ اس کی نعلوں سے جو چنگاریاں نکلتیں ان سے دل میں رہ رہ کر جلن پیدا ہو رہی تھی۔ ایک خشک سا دھک اُٹھتا تھا۔ بہت سارا راستہ طے ہوگیا۔ رات کافی اُٹھی۔ لب اُفق کے کنارے چاند طلوع ہو رہا تھا جس کی ضیا بکھر رہی تھی۔ اس کی لطافت روشنی سے تارکول کی سڑک پر کہیں کہیں سراب کی سی چمک پیدا ہو جاتی۔ زیبو ایک خواب کی سی کیفیت سے چونک رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے تسکین بخش جھونکوں نے اس کے ہوش و حواس بہت کچھ بجا کر دیئے تھے۔ اس نے اپنی گردن اور ماتھے سے ٹھنڈے پسینے کے قطرے پونچھ ڈالے۔ منشی جی کو جب اس کی طرف سے پورا اطمینان ہوگیا تو اُنھوں نے پوچھا۔

"کیوں زیبو! تو بھلا کیوں بھاگی تھی؟"

اُس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"یوں ہی میرا جی گھبرایا تھا۔ میں نے کہا ذرا گھوم آؤں۔"

منشی جی نے تمسخر سے ہنس کر کہا

"اچھا تو گھومنے آئی تھی۔ واہ وا۔ چوری چھپے گھومنے کی ایک ہی۔"

زیبو ذرا دیر چپ رہی پھر بولی۔

"آدھے راستہ پر آکر جی میں آیا کہ لوٹ جاؤں مگر بیگم صاحب کے ڈر کے مارے نہیں گئی۔"

"ہت تیری کی پاگل لڑکی!!"

گھر آگیا۔ دونوں اُتر پڑے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ بچے سو گئے تھے لیکن اور سب اس کے انتظار میں ابھی جاگ رہے تھے۔ زیبو کھٹ کھٹ کرتی دلیرانہ انداز سے نوکروں کے کوارٹر میں پہنچی اور بڑے زور سے کہا "السلام علیکم۔"

نوکر ہڑبڑا کر سب کھڑے ہو گئے اور اشتیاق و تجسس کی نظروں سے اسے دیکھنے لگے گویا کوئی عجیب تماشہ ہو۔ مگر ان کو تاکید کر دی گئی تھی کہ کوئی اس کو کچھ کہے سنے نہیں۔ حکم کے مطابق وہ تین آدمی وہ سب سامان کے اس کو بیگم صاحب کے پاس لیکر پہنچے۔ اس درمیان میں زیبو مردانے کپڑے اُتار کر اپنے پہلے والے کپڑے پہن چکی تھی۔ نوکروں کے بار بار کہنے سے وہ جھجکتی ہوئی سامنے آئی اور چوکھٹ پر بیٹھ کر اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹیک دی۔ ایک خوف کی سی کیفیت اس پر طاری تھی اور نو گرفتار وحشی پرند کی طرح تیز سانسیں لے رہی تھی۔ نوکروں نے کل سامان سامنے فرش پر بکھیر دیا۔

رشید صاحب اس وقت اپنی میز کے پاس سر جھکائے بیٹھے کچھ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے نظر اُٹھا کر حیرانی سے دیکھا۔ اوہ اتنا سب لے گئی تھی۔

عزیزہ کے چہرے پر غصہ اور ضبط کی وجہ سے ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ غضب آلود نظروں سے دیکھتی رہیں۔ پھر تاسف اور ملامت کے لہجہ میں بولیں۔

"کیوں زیبو ہم نے تمہارے ساتھ ایسا ہی بُرا سلوک کیا تھا جس کا تم نے ہمیں یہ بدلا دیا۔"

رشید صاحب نے کتاب کا ورق اُلٹتے ہوئے تنبیہاً کہا۔

"اب کی تو یہ بھاگ نکلی تھی۔ لیکن اب میں نے پولیس میں رپورٹ کر دی ہے اگر بھاگی تو فوراً پکڑی جائے گی۔ اور سزا ملے گی۔"

عزیزہ نے کہا "ہاں یہ سمجھ لے کہ تو یہاں سے بھاگ نہیں سکتی۔"

اتنے میں نصیبن بوا لرزہ براندام وہاں پہنچیں۔ ایک لڑکا اُن کا ہاتھ پکڑے تھا۔ کلیجہ بلیوں اُچھل رہا تھا۔ مُنہ سے آواز نکلنا دُشوار تھا۔ دھم سے بیٹھ گئیں اور کانپتی ہوئی بولیں۔

"ہائے غضب! خدا غارت کرے۔ پھٹ جائے یہ۔ ہائے میرے بچوں کی اور بیوی کی اتنی چیزیں چرا کے لے گئی۔ میرے کلیجہ میں ہول سما گیا ہے۔ دو دن سے بھوک پیاس سب غائب ہو گئی۔"

عزیزہ نے نوکر سے کہا کہ انہیں یہاں سے لے جاؤ۔ یہ اس وقت اپنے قابو میں نہیں ہیں۔ عجیب حالت ہو رہی ہے۔ نوکر انہیں پکڑ کر سہارا دیکر لے گئے۔ زیبو بھی دو آدمیوں کی حفاظت میں اپنی جگہ پر پہنچا دی گئی۔

صبح اپنی دلفریبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ ہر طرف نور کی شعاعیں بکھرنے لگیں۔ چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا۔ پھول مسکرا اُٹھے۔ لیکن زیبو آج چپ چاپ بستر غم پر نڈھال پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس میں جنبش کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔ اس کے لئے یہ صبح زندگی کی شب تار تھی۔ طویل اور بوجھل۔ کلثوم نے

[illegible] — اب تجھے کہیں بھی جانا نہیں۔ بڑی بیچاری بنی بیٹھی تھی۔

" زیبو اب بھی نہ اٹھی۔ اس نے اپنا چہرہ اور چھپا لیا۔ آج کس طرح سب کے سامنے آکر نظریں چار کرے۔ گھر میں اس کے خلاف اس وقت پورا محکمہ قائم تھا۔ عزیزہ بیگم کے اپنے پرائے سب آکر جمع ہو گئے۔ اور سب طرف سے اس کے کان میں یہی آوازیں آ رہی تھیں۔ " ہے ہے بڑا بُرا کام کیا اس نے "

" نکال باہر کرو۔ "

" بہت سی عورتیں اس کے اردگرد آکر بیٹھ گئیں اور اسے جھکا کر لعن طعن کرنے لگیں۔

" الٰہی توبہ بڑا موٹا ہے اس کا دیدہ۔ بیحیا بے غیرت۔ اس سے کیسے گھر سے قدم نکالا گیا۔ اور پھر اتنی چیزیں چرا کے بھاگی۔ اس چھوکری کو ذرا ڈر خوف نہ آیا! اس کے نصیب میں در در کی ٹھوکریں نہ بدی ہوتیں تو ایسا کیوں کرتی۔ ایسی بیوی کے پیر دھو کر پیتی اور شکر کرتی۔ اتنے میں عزیزہ آگئیں۔ عورتیں ادھر ادھر ہو کر اپنے زنی اور سرگوشیاں کرنے لگیں۔ عزیزہ نے اسے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔

" زیبو! سچ سچ بتا دے تیرا یہاں رہنے کو دل چاہتا ہے یا نہیں؟ تو جو کچھ کہے تیرے لئے انتظام کیا جائے۔ کہاں جائے گی؟ "

زیبو آنچل سے منہ چھپائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ " کہیں نہیں! "

" پھر بھاگی کیوں تھی؟ "

" دھوکا ہو گیا! "

" مگر تیری بات کا کیا اعتبار۔ شہر میں جن صاحب کے پاس تھی وہاں رہے گی؟ "

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا " نہیں میں یہیں رہوں گی۔ "

" اور جو پھر بھاگی؟ "

" اب کبھی نہ بھاگوں گی! "

عزیزہ ایک کشمکش و پیچ میں پڑی تھیں۔ نہ رکھتے بنتا نہ نکالتے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے کہا " اچھا جا ہاتھ منہ دھو، ناشتہ کھا لے۔ "

وہ آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ ایک بڑی بوڑھی نے عزیزہ کو سمجھایا۔ " بیٹی! یہ لڑکی تمہارے پاس رہنے کی نہیں۔ آج نہیں تو کل پھر کچھ لے کر بھاگے گی۔ سوچو تو تم کہاں تک اسکی دیکھ بھال کر سکتی ہو۔ یہ آوارہ اور بدمعاش ہے۔ خدا نہ کرے کسی بڑی چیز پر ہاتھ صاف نہ کر دے۔ بڑا خطرہ ہے۔ اسکی عادت ہی ایسی معلوم ہوتی ہے۔ میری رائے میں اسے گھر میں رکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ "

" پھر بتائیے کیا کروں۔ ایک مرتبہ چلی گئی تھی۔ اب پھر میرے گلے پڑی

[illegible]

" یہ سب اسکی باتیں ہیں۔ دیکھ لینا پھر بھی چلی جائے گی۔ اس سے اچھا ہے کہ تم ابھی رخصت کر دو۔ دیکھو میں اس سے بات چیت کرتی ہوں۔ "

یہ کہکر انہوں نے علیحدگی میں زیبو کو بلایا اور کہا۔

" دیکھ تو نے ایسی بُری حرکت کی ہے کہ کوئی تجھے رکھنے کا روادار نہیں۔ تو کہاں جانا چاہتی ہے؟ بول ——— ! "

" میں یہیں رہوں گی۔ اب کبھی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ "

" یہ سب تیری بناوٹی باتیں ہیں۔ ایک مرتبہ کیسے گئی تھی۔ بچے کے پاؤں پالنے میں پہچانے جاتے ہیں۔ تجھے جہاں جانا ہو ابھی چلی جا۔ "

" زیبو کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

" کہاں جا رہی ہے؟ "

" کہیں چلی جاؤں گی! "

اس نے ایک آہنی عزم کے ساتھ جواب دیا۔ اس نے اپنی جوتیاں بھی اتار دیں اور ننگے پاؤں تیر کی طرح وہاں سے نکل بھاگی۔ آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ سب دم بخود حیران کھڑے تھے۔ وہ تو پھر بھاگ گئی۔ یہ کیا؟ ——— ہاں بیچاری کی قسمت میں ٹھوکریں ہی بدی ہیں۔ زیبو اچانک کے پاس جاکر ایک سوچ میں کھڑی ہو گئی۔ کتنے لوگ راستے سے گذر رہے تھے مگر اس کے دل کی کسے خبر تھی۔ اتنے میں ایک واقف کار لڑکا ملا۔

" ارے زیبو! تو یہاں کیسے کھڑی ہے؟ "

" مجھے سب نے نکال دیا۔ "

" نہیں ——— ایسا نہیں ہو سکتا۔ چل میں تیری خطا معاف کرا دوں۔

زیبو نے تامل کیا۔ لیکن وہ سمجھا بجھا کر گھر لے آیا اور اس کی سفارش کر کے چلا گیا۔

زیبو سیڑھیوں پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے گرد پھر مجمع ہو گیا۔ یہ کیا نقشہ ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لعن طعن، صلواتیں۔ سب کی نظروں میں وہ خار کی طرح کھٹک رہی تھی۔ اور ہر شخص اس سے اتنا خائف اور لرزاں تھا۔ جیسے کوئی بلا ہو۔ زیبو کے چہرے پر غم کی سیاہ گھٹا چھائی تھی۔ کلیجہ جیسے چھلنی ہوا جا رہا تھا۔ اتنے لوگوں میں کوئی اس کا ہمدرد نہیں۔ گو عزیزہ نے تو اس سے نکل جانے کو نہیں کہا۔ مگر وہ اس وقت موجود نہ تھیں۔ سب نے اس خیال سے کہ ابھی وہ خالی ہاتھ سے لوٹ آئی ہے۔ پھر چوری کر کے بھاگے گی یہ طے کیا کہ کچھ پیسے دے دلا کر سواری پر بٹھا آئیں اور پھر گھسیٹ کر لے چلے۔

احسان شناس لڑکی

(از محترمہ جمیلہ بیگم صاحبہ)

کرشنا اور رآمو کھیت کے راستے بھاگم بھاگ کہیں گاؤں سے
جا رہے تھے۔ گاؤں کا ناہموار راستہ پیچیدہ اور خاردار۔ ہر قدم پہ کرشنا
الجھتی لڑکھڑاتی چلی جا رہی تھی ——— کم سن کرشنا جس نے شاید اپنے اس مختصر
سے عرصے میں صرف اٹھارہ بہاریں دیکھی ہوں گی ——— کرشنا کی گود میں لاغر سی ایک
بچی بھی تھی۔ جو اس بے موقع سفر کی وجہ سے بہت سخت بے چین ہو رہی تھی۔ رآمو
ایک ۲۴ سالہ نوجوان تھا۔ جو بے روزگاری اور غربت کی انتہائی مصیبتوں کو
برداشت کرنے کے باوجود لقمۂ معیشت کو محتاج ہونے کی وجہ سے اپنے وطن اور
اس کی بے مہریوں کو آدھی رات کی تاریکی میں خیر باد کہکر کسی نئی دنیا کی طرف چلا جا رہا تھا۔
اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح چپکے سے گاؤں سے بھاگ جانے میں اسکی
نسبت بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوں گی۔ اور بہت دنوں تک لوگ اسکی بزدلی پہ
ہنسیں گے۔ مگر کیا کرے کیا ——— کوئی کسی کے آڑے وقت تو کام نہیں آتا۔ کرشنا
اپنے پتی دیو، اپنے پیارے شوہر کے ساتھ جنت سے بھی نکلنے پر افسوس کرنیوالی
نہ تھی مگر نہ معلوم اس وقت کوئی نامعلوم کشش اُس سے یہاں سے نہ جانے کے
لئے کہہ رہی تھی۔ پرانی باتیں یاد کرکے اسکی چھاتی پھٹنے لگی۔ اس کی آنکھوں
سے آنسو بہہ بہہ کر معصوم بچی کے پھول سے رخساروں پر گرنے لگے۔ رآمو
کہہ رہا تھا کہ اسکو ہمیں جدا کرنا ہی پڑیگا۔ اس دشت نوردی میں معصوم بچی کو
ساتھ لئے آذوقۂ حیات کے لئے مارے مارے پھرنا شوہر کو گوارا نہ تھا۔ اُس کی مرضی تھی
کہ بچی کو کسی مشنری خاتون کے حوالہ کر کے تلاش معاش میں سرگردانی کرتا پھرے۔
اس ننھی سی جان کو صحرا بصحرا لیکر پھرنے سے اسکی زندگی کا بھی بھروسہ نہیں کیا
جا سکتا تھا۔ مگر کرشنا ماں تھی ——— ماں! اس کا دل مامتا کی آگ سے
سلگ اٹھا ——— ہائے جیتے جی اپنی بچی کو چھوڑ دوں ——— اپنے کلیجے
کے ٹکڑے کو جدا کر دوں ——— نہیں نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا ———
کبھی نہیں ——— آنسو سیلاب کی طرح آنکھوں سے رواں تھے۔ اُس نے شوہر
سے پھر گڑگڑا کر کہنا شروع کیا۔ مگر آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ پر اُس
نے ہچکیوں کے ساتھ کہا ہی دیا۔

"پتی دیو! مجھ پر کرم کیجئے ——— آئیے ہم اس وقت گھر واپس چلے جائیں
اس وقت میرے ہاتھوں میں دو دو چوڑیاں ہیں۔ انہیں بیچ کر بچی کا ڈاکٹر سے
علاج کراؤنگی ——— میں تمہارا ایک پیسہ بھی اس پر برباد نہ کرونگی۔ جب
تک تم نوکری تلاش کرنا ——— کیا میری بات نہیں سنو گے؟"

"بچی کی وجہ سے میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ جانتی ہو یہ آشنا ہمارے لئے
ایک بار بن گئی ہے۔" جھڑک کر شوہر نے کہا۔ اس کے لب و لہجہ میں ہمدردی
کا شائبہ بھی نہ تھا۔ "ایسی لاغر اور بیمار بچی کے لئے میں اپنی زندگی برباد نہیں
کر سکتا۔ اور نہ میرے پاس اتنا روپیہ پیسہ ہے کہ ڈاکٹر کی فیس دے دوں۔
مودی، بقال کا تقاضہ چکاتا رہوں۔ نوکری یہاں ملتی نہیں۔ تجارت کا گاؤں
میں موقع ہی نہیں۔ پھر کھاؤں کیا اور تم لوگوں کو کیا کھلاؤں؟"

کرشنا اب بڑھکر رآمو کے قدموں پہ گر پڑی۔ "سوامی! روپیہ بہت
مل جائیگا۔ مگر اولاد خریدی نہیں جا سکتی ہے۔ للہ رحم کرو اور اسے بے گناہ
معصوم کو گھر کے کوڑے کی طرح اس وقت نکال کر پھینک دو۔ عیسائی مشنری
ہماری بچی کو لیکر ہمیشہ کے لئے اس کے مالک ہو جائینگے۔ اور ہم ———"

"چپ رہو" قطع کلام کرتے ہوئے شوہر نے ڈانٹ کر کہا۔ "روپیہ
سے ہم سب کچھ خرید لینگے۔ پھر یہ بیمار بچی تو یونہی ہمارے لئے مصیبت ہے۔
کرسچین سسٹر لوگ ہماری نسبت کہیں زیادہ آرام سے اسے پرورش کر لیں گی۔"

کرشنا رو رو کر کہنے لگی "پتی دیو! آپ کی عقل پر نہ معلوم کیوں پردہ
پڑ گیا ہے۔ آج تک کبھی تو آپ نے میری بات کو اس طرح نہیں ٹالا تھا!
تم نہیں جانتے دولتمند بے اولاد والوں سے وہ غریب جنہیں اولاد جیسی نعمت
نصیب ہے کہیں خوش قسمت ہوتے ہیں۔ وہ گھر بھی کیا جس میں بچوں کی چہل
پہل اور چیخ پکار نہ ہو۔ لڑکی ——— وفادار لڑکی کو جدا کر رہے ہو!
مالک پھر بیمار ہیں!!"

رآمو نے ڈپٹ کر کہا۔ "اچھی! اپنی منطق رہنے دیجئے۔ ہمیں تو یہاں
روٹی کے لالے پڑے ہیں۔ آپ کو دوائی ٹھنڈائی کی سوجھی ہے۔" (ایک سخت
قہقہہ مار کر) اب کونونٹ میں اس کا علاج ہوتا رہے گا۔ اور ہمیں قیمتی
دواؤں اور ڈاکٹروں کی فیس سے نجات ملیگی۔ دیکھو! اچھی بیویاں شوہر
کے حکموں پر اپنی تمام مسرتیں قربان کر دیتی ہیں۔ پھر بحث کر۔ وہ کرتو قربانہ
نہیں ہوتی۔ گویا جبراً صبر کرنا ہوتا ہے۔ میں تم جیسی عورتوں سے کہیں زیادہ
سوچتا ہوں۔ اب آئندہ ہماری ترقیوں کی دعائیں کرو۔ پھر تو ہر قسم کی دولت

تمہاری ... میں بجالاؤنگا ۔"

دُور کہیں فضا میں بانسری کی کانپتی ہوئی لہریں ...
اس کا دل گویا چھید رہا تھا ۔ اس نے بچی کو زور سے سینے سے چمٹا لیا ۔ آہستہ
آہستہ کرشنا کے دل میں محبت اور فرض کی جنگ ہو رہی تھی ۔

وہ خاموش اپنے شوہر کے اشارے پر چلی جا رہی تھی جیسے ... کرشنا کا چہرہ اس وقت خوفناک نظر آرہا تھا ۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے ۔ اس پر بیخودی سی طاری تھی کہ اتنے میں شوہر نے کہا ۔

"لو اب ہم گرجا پہنچ گئے ——— جاؤ اندر ——— اور بچی کو سسٹر کے سپرد کر آؤ ۔ میں راستے کے نکڑ پر ٹھیرتا ہوں ۔" یہ کہکر وہ بیٹھ گیا ۔ اور غریب کرشنا کو اس صبر آزما قربانی اور آزمائش کے لئے تنہا چھوڑ دیا ۔ اس کی چال اس وقت مات کھائے ہوئے مہرے کی طرح تھی ۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے تک گئی اور دستک دی ۔ آہٹ پر دروازہ کھل گیا ۔ اس نے مہربان سسٹر کو اپنی داستان سنائی ۔ پہلے تو اس نے کچھ تامل کیا ۔ اور بوڑھی مدر (Mother) کے پاس مشورہ کو گئی ۔ بوڑھی خاتون اس حسین لاغر اندام بچی کو دیکھکر بالکل پسیج گئی ۔ اور اُسکو باقاعدہ لکھ پڑھکر لینے پر آمادگی ظاہر کی ۔ کرشنا ہاتھ جوڑکر بولی کہ "یہ دستاویز میں بعد میں دے جاؤنگی اس وقت تو آپ اس غریب کو دَر دَر کی خاک چھاننے سے بچا لیجئے ۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے گلے سے ایک سنہری زنجیر اُتاری جس کی لاکٹ میں اس کا نام کندہ تھا اور وہ اس بچی کے گلے میں ڈال دی ۔ اور سسٹر سے کہا کہ "میری یہ یادگار اسکے گلے میں رہنے دینا ۔ میم صاحبہ! یہ ہار میری ماں مرحومہ نے میری شادی کے وقت اپنی یادگار مجھے دی تھی ۔ اور آج یہ میں اپنی بچی کو اپنی آخری نشانی دے رہی ہوں ۔" یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ اور پھر کہا کہ "اگر ضرورت پڑے تو اسے فروخت کرکے اس کے لئے آپ خرچ کرسکتی ہیں ۔ لیکن ہوسکے تو مہربانی سے یہ زنجیر اسکی شادی کے وقت اسکی ماں کی یادگار کہکر دیدیجئے گا ۔ آہ ! میں خوشی سے اِس جیتی جان کو اپنے سے جدا نہیں کررہی ہوں ۔ ایسی ہی مجھ پر بپتا پڑی ہے ۔ میم صاحب ! آپ خدا کی نیک بندیوں میں ہیں ۔ ظالم اور خودغرض دُنیا سے آپ الگ ہوچکی ہیں ۔ آپ سے وہ سب ہوگا جو میں تمام عمر نہ کرسکونگی ۔" اُس نے پھر جھک کر آخری بار بچی کی پیشانی کو چوما ۔ اور اپنا فرض ادا کرکے راستہ کے نکڑ پر جہاں رامو کھڑا تھا چلی گئی ۔

شہر آتے ہی لکشمی نے رامو پر اپنا مبارک سایہ ڈال دیا ۔ اُس نے ایک پُرانا روئی کا کارخانہ اونے پونے داموں خرید کر اُس کو اس قدر ترقی دی ۔ اس قدر چمکایا کہ اُس کے نام کا طوطی بولنے لگا ۔ چند ہی مہینوں میں وہ کاروباری اصولوں سے باخبر ہوگیا ۔ وہ دن رات دولت سمیٹنے اور اپنا نام روشن کرنے کی دُھن میں مصروف تھا ۔ روئی کی مِل میں ہزاروں مزدور دن رات کام کرتے تھے ۔ ابھی اس کے کارخانہ میں عروج کا زمانہ آیا ہی تھا کہ جنگ نے اور اضافہ کردیا ۔ پھر تو سونے کی کان سے بڑھکر یہ دولت آفریں ثابت ہونے لگی ۔ لیکن اب دولت کی انتہائی ترقیوں میں بھی اُسے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا ۔ آہ ! فلاکت زدہ انسان سوچتا ہے کہ دولت ہی تمام شے کی بنیاد ہے ۔ اور دولت ہی زندگی کی کامیابیوں کی معراج ۔ لیکن ملک کا ہر دولتمند انسان جانتا ہے کہ سچ مچ دولت کا دوسرا نام مسرت کبھی نہیں ہوسکتا ۔ حالانکہ رامو کے گھر اب دولت کی کمی نہ تھی ۔ کوئی آرام و آسائش کا سامان ایسا نہ تھا جو یہاں مہیا نہ ہو ۔ لیکن دولت اسکی بیوی کے شکستہ دل کا مداوا نہ بن سکی ۔ کرشنا کے لئے یہ دولت، حشمت، عزت اور شان و شوکت بیکار تھی ۔ وہ اندر ہی اندر گھلی جارہی تھی ۔ وہ مثل شمع پگھل رہی تھی ۔ غم اُسے گھلا رہا تھا ۔ دنیا کی کوئی مسرت اس کے دل کی پژمردہ اور مُرجھائی کلی کو کھلا نہ سکی ۔ وہ اپنی معصوم اکلوتی بچی کو زمانۂ غربت میں غیروں کے ہاتھوں شوہر کے حکم سے سونپکر گویا اپنے لئے پروانۂ موت حاصل کرچکی تھی ۔ بہت ہی جلد وہ صاحب فراش ہوگئی ——— ڈاکٹروں نے خون کی کمی تجویز کی جو انتہائی صدمات کے اثر سے پیدا ہوئی تھی ۔ اب بڑے بڑے ماہر طبیب اور بیش قیمت دوائیں جو میسر تھیں اس کے لئے بیکار ثابت ہورہی تھیں ۔ قیمتی دواؤں نے بھی کرشنا کی جان نہیں بچائی ۔ اور نہ ڈاکٹروں کی پیہم سعی مشکور ہوئی ۔

کچھ دن یونہی بیت گئے ۔ پھر گھریلو زندگی کے لئے رامو کا دل بڑی سرعت کے ساتھ بے قرار رہنے لگا ۔ چنانچہ اس مرتبہ اُس نے اپنے ایک ہم پایہ امیر سیٹھ کی لڑکی سے شادی کرلی ۔ یہ لڑکی حسین بھی تھی اور اپنے باپ کی کثیر دولت کی مالک ——— اُدھر رامو بھی اپنی دولت بڑھانے میں دن رات کوشاں تھا ۔ تدابیر اور عمل اُس کے قدم لیتے اور اُسکی سرسعی بارآور ثابت ہوتی ۔ اسے اپنی دولت پر بھروسہ تھا ۔ اس پر اسکو ناز بھی بجا طور پر تھا ۔ اس لئے کہ وہ ایک غریب انسان اپنی سعی پیہم اور جدوجہد کی بدولت آج اتنی بڑی دولت کا مالک تھا ۔ لیکن اس کے باوجود اب ایک اور خلش تھی جو اسکی راحت قلب میں ہلچل ہی مچائے ہوئے تھی ۔ وہ اکثر ساری ساری رات بے چین

احسان شناس لڑکی

(از محترمہ جمیلہ بیگم صاحبہ)

کرشنا اور رآمو کھیت کے راستے بھاگم بھاگ کہیں گاؤں سے دور جا رہے تھے۔ گاؤں کا ناہموار راستہ پیچیدہ اور خاردار۔ ہر قدم پر کرشنا اُلجھتی گرتی پڑتی چلی جا رہی تھی ——— کم سن کرشنا جس نے شاید اپنے اس مختصر سے عرصے کی عمر میں اٹھارہ بہاریں دیکھی ہوں گی ——— کرشنا کی گود میں لاغر سی ایک بچی بھی تھی۔ جو اس بے موقع سفر کی وجہ سے بہت سخت بے چین ہو رہی تھی۔ رآمو ایک ۲۵ سالہ نوجوان تھا۔ جو بے حد دُکھی اور غربت کی انتہائی مصیبتوں کو برداشت کرنے کے باوجود معیشت کو محتاج ہونے کی وجہ سے اپنے وطن اور اس کی بے مہریوں کو آدھی رات کی تاریکی میں خیرباد کہکر کہیں دور چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح چپکے سے گاؤں سے بھاگ جانے میں اسکی نسبت بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوں گی۔ اور بہت دنوں تک لوگ اسکی بزدلی پر ہنسیں گے۔ مگر ایسے کیا۔ کوئی کسی کے آڑے وقت تو کام نہیں آتا۔ کرشنا اپنے پتی دیو، اپنے پیارے شوہر کے ساتھ جنت سے بھی نکلنے پر انتہائی کرنیوالی تھی مگر نہ معلوم اس وقت کوئی نامعلوم کشش اس سے یہاں سے نہ جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ پرانی باتیں یاد کر کے اسکی چھاتی پھٹنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر معصوم بچی کے پھول سے رخساروں پر گرنے لگے۔ رآمو کہہ رہا تھا کہ اسکو ہمیں جدا کرنا ہی پڑیگا۔ اس دشت نوردی میں معصوم بچی کو ساتھ لئے آذوقۂ حیات کے لئے مارے مارے پھرنا شوہر کو گوارا نہ تھا۔ اس کی مرضی تھی کہ بچی کو کسی مشنری خاتون کے حوالہ کر کے تلاش معاش میں سرگرداں پھرے۔ اس ننھی سی جان کو صحرا بصحرا لیکر پھرنے سے اسکی زندگی کا بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر کرشنا ماں تھی ——— ماں! اس کا دل ممتا کی آگ سے سلگ اٹھا ——— ہائے جیتے جی اپنی بچی کو چھوڑ دوں ——— اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو جدا کر دوں ——— نہیں نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا ——— کبھی نہیں ——— آنسو سیلاب کی طرح آنکھوں سے رواں تھے۔ اس نے شوہر سے پھر گڑگڑا کر کہنا شروع کیا۔ گو کہ آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ پر اُس نے بچیوں کے ساتھ ... ... ۔

"پر میرا مجھ پر کرم کیجئے۔ آپ کے ہم اس وقت گھر ... ... ۔ اس وقت میرے ہاتھوں میں دو دو چوڑیاں ہیں۔ انہیں بیچ کر بچی کا ڈاکٹر سے علاج کراؤں گی ——— میں تمہارا ایک پیسہ بھی اس پر برباد نہ کروں گی۔ جب تک تم نوکری تلاش کرنا ——— کیا میری بات نہیں سنو گے؟"

"بچی کی وجہ سے میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ جانتی ہو یہ آفت ہمارے لئے ایک بلا بن گئی ہے۔" جھڑک کر شوہر نے کہا۔ اس کے لب و لہجہ میں ہمدردی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ "ایسی لاغر اور بیمار بچی کے لئے میں اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔ اور نہ میرے پاس اتنا روپیہ پیسہ رہ گیا ہے کہ ڈاکٹر کی فیس دے دوں۔ مودی، بقال کا تقاضہ چکا رہا ہوں۔ نوکری یہاں رکھی نہیں۔ تجارت کا گاؤں میں موقع ہی نہیں۔ پھر کھاؤں کیا اور تم لوگوں کو کیا کھلاؤں؟"

کرشنا اب جھک کر رآمو کے قدموں پر گر پڑی۔ "سوامی! روپیہ بہت مل جائیگا۔ مگر اولاد خریدی نہیں جا سکتی ہے۔ اللہ رحم کرو اور اس بے گناہ معصوم کو گھر کے کوڑے کی طرح اس وقت نکال کر پھینک نہ دو۔ عیسائی مشن ہماری بچی کو لیکر ہمیشہ کے لئے اس کے مالک ہو جائیں گے۔ اور ہم ———"

"چپ رہو۔" قطع کلام کرتے ہوئے شوہر نے ڈانٹ کر کہا۔ "روپیہ سے ہم سب کچھ خرید لینگے۔ پھر یہ بیمار بچی تو یونہی ہمارے لئے مصیبت ہے۔ کرسچین سسٹر لوگ ہماری نسبت کہیں زیادہ آرام سے اسے پرورش کر لیں گی۔"

کرشنا رو رو کر کہنے لگی "پتی دیو! آپ کی عقل پر نہ معلوم کیوں پردہ پڑ گیا ہے۔ آج تک کبھی تو آپ نے میری بات کو اس طرح نہیں ٹالا تھا! تم نہیں جانتے دولتمند بے اولاد والوں سے وہ غریب جنہیں اولاد جیسی نعمت نصیب ہے کہیں خوش قسمت ہوتے ہیں۔ وہ گھر بھی کیا جس میں بچوں کی چہل پہل اور چیخ پکار نہ ہو۔ لڑکی ——— وفادار لڑکی کو جدا کر رہے ہو! مالک پھر بیماری میں!!"

رآمو نے ڈپٹ کر کہا۔ "اچھی! اپنی منطق رہنے دیجئے۔ ہمیں تو یہاں روٹی کے لالے پڑے ہیں۔ آپ کو دوائی ٹھنڈائی کی سوجھی ہے۔" (ایک تلخ قہقہہ مار کر) "اب کونونٹ میں اس کا علاج ہوتا رہے گا۔ اور ہمیں قیمتی دواؤں اور ڈاکٹروں کی فیس سے نجات ملے گی۔ دیکھو! اچھی بیویاں شوہر کے حکموں پر اپنی تمام مسرتیں قربان کر دیتی ہیں۔ پھر بحث کرنے ہو کر تو قربانی نہیں ہوتی۔ گویا جبراً صبر کرنا ہوتا ہے۔ میں تم جیسی عورتوں سے کہیں دور کی سوچتا ہوں۔ اب آئندہ ہماری ترقیوں کی دعائیں کرو۔ پھر تو ہر قسم دولت

[illegible]

دور کہیں فضا میں بانسری کی کانپتی ہوئی لہریں [illegible] تھیں۔ اس کا دل گویا چھید رہا تھا۔ اس نے بچی کو گود سے کلیجے سے چمٹا لیا۔ آہستہ آہستہ کرشنا کے دل میں محبت اور فرض کی جنگ ہو رہی تھی۔

وہ خاموشی سے اپنے شوہر کے اشارے پر چلی جا رہی تھی۔ حسین [illegible] کرشنا کا چہرہ اس وقت خوفناک نظر آ رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ اس پر بےخودی سی طاری تھی کہ راستے میں شوہر نے کہا۔

"لو اب ہم گرجا پہنچ گئے ـــــ جاؤ اندر ـــــ اور بچی کو سسٹر کے سپرد کر آؤ۔ میں راستے کے نکڑ پر ٹھہرتا ہوں۔" یہ کہکر وہ آگے بڑھ گیا۔ اور غریب کرشنا کو اس صبر آزما قربانی اور آزمائش کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ اس کی چال اس وقت مات کھائے ہوئے مہرے کی طرح تھی۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے تک گئی اور دستک دی۔ آہٹ پر دروازہ کھل گیا۔ اس نے ہیڈ سسٹر کو اپنی داستان سنائی۔ پہلے تو اس نے کچھ تامل کیا۔ اور بوڑھی مدر (Mother) کے پاس مشورہ کو گئی۔ بوڑھی خاتون اس حسین لاغر اندام بچی کو دیکھکر بالکل پسیج گئی۔ اور اسکو باقاعدہ لکھ پڑھکر لینے پر آمادگی ظاہر کی۔ کرشنا ہاتھ جوڑکر بولی کہ "یہ دستاویز بھی بعد میں دے جاؤنگی اس وقت تو آپ اس غریب کو در بدر کی خاک چھاننے سے بچا لیجئے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گلے سے ایک سنہری زنجیر اتاری جس کی لاکٹ میں اس کا نام کندہ تھا اور وہ اس بچی کے گلے میں ڈال دی۔ اور سسٹر سے کہا کہ "میری یہ یادگار اسکے گلے میں رہنے دینا۔ میم صاحبہ! یہ ہار میری ماں مرحومہ نے میری شادی کے وقت اپنی یادگار مجھے دی تھی۔ اور آج یہ میں اپنی بچی کو اپنی آخری نشانی دے رہی ہوں۔" یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور پھر کہا کہ "اگر ضرورت پڑے تو اسے فروخت کرکے اس کے لئے آپ خرچ کرسکتی ہیں۔ لیکن ہوسکے تو مہربانی سے یہ زنجیر اسکی شادی کے وقت اسکی ماں کی یادگار کہکر دیدیجئے گا۔ آہ! میں خوشی سے اس جیتی جان کو اپنے سے جدا نہیں کر رہی ہوں۔ ایسی ہی مجھ پر بپتا پڑی ہے۔ میم صاحب! آپ خدا کی نیک بندیوں میں ہیں۔ ظالم اور خودغرض دنیا سے آپ الگ ہو چکی ہیں۔ آپ سے وہ سب ہوگا جو میں تمام عمر نہ کرسکونگی۔" اس نے پھر جھک کر آخری بار بچی کی پیشانی کو چوما۔ اور اپنا فرض ادا کرکے راستہ کے نکڑ پر جہاں رامو کھڑا تھا چلی گئی۔

شہر آتے ہی لکشمی نے رامو پر اپنا مبارک سایہ ڈال دیا۔ اس نے [illegible] داموں خرید کر اس کو اس قدر ترقی دی۔ اس قدر چمکایا کہ اس کے نام کا طوطی بولنے لگا۔ چند ہی مہینوں میں وہ کاروباری اصولوں سے باخبر ہو گیا۔ وہ دن رات دولت سمیٹنے اور اپنا نام روشن کرنے کی دھن میں مصروف تھا۔ روئی کی مل میں ہزاروں مزدور دن رات کام کرتے تھے۔ ابھی اس کے کارخانہ میں عروج کا زمانہ آیا ہی تھا کہ جنگ نے اور اضافہ کر دیا۔ پھر تو سونے کی کان سے بڑھکر یہ دولت آفریں ثابت ہونے لگی۔ لیکن اب دولت کی انتہائی ترقیوں میں بھی اسے اپنی بےبسی کا احساس ہونے لگا۔ آہ! فلاکت زدہ انسان سوچتا ہے کہ دولت ہی تمام شے کی بنیاد ہے۔ اور دولت ہی زندگی کی کامیابیوں کی معراج۔ لیکن ملک کا ہر دولتمند انسان جانتا ہے کہ سچ مچ دولت کا دوسرا نام مسرت کبھی نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ رامو کے گھر اب دولت کی کمی نہ تھی۔ کوئی آرام و آسائش کا سامان ایسا نہ تھا جو یہاں مہیا نہ ہو۔ لیکن دولت اسکی بیوی کے شکستہ دل کا مداوا نہ بن سکی۔ کرشنا کے لئے یہ دولت، حشمت، عزت اور شان و شوکت بیکار تھی۔ وہ اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھی۔ وہ مثل شمع پگھل رہی تھی۔ غم اسے گھلا رہا تھا۔ دنیا کی کوئی مسرت اس کے دل کی پژمردہ اور مرجھائی کلی کو کھلا نہ سکی۔ وہ اپنی معصوم اکلوتی بچی کو زمانہ غربت میں غیروں کے ہاتھوں شوہر کے حکم سے سونپکر گویا اپنے لئے پروانہ موت حاصل کر چکی تھی۔ بہت ہی جلد وہ صاحب فراش ہو گئی ـــــ ڈاکٹروں نے خون کی کمی تجویز کی جو انتہائی صدمات کے اثر سے پیدا ہوئی تھی۔ اب بڑے بڑے ماہر طبیب اور بیش قیمت دوائیں جو میسر تھیں اس کے لئے بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ قیمتی دواؤں نے بھی کرشنا کی جان نہیں بچائی۔ اور نہ ڈاکٹروں کی پیہم سعی مشکور ہوئی۔

کچھ دن یونہی بیت گئے۔ پھر گھریلو زندگی کے لئے رامو کا دل بڑی سرعت کے ساتھ بےقرار رہنے لگا۔ چنانچہ اس مرتبہ اس نے اپنے ایک ہم پایہ امیر سیٹھ کی لڑکی سے شادی کر لی۔ یہ لڑکی حسین بھی تھی اور اپنے باپ کی کثیر دولت کی مالک ـــــ ادھر رامو بھی اپنی دولت بڑھانے میں دن رات کوشاں تھا۔ تدابیر اور عمل اس کے قدم لیتے اور اسکی ہر سعی بارآور ثابت ہوتی۔ اسے اپنی دولت پر بھروسہ تھا۔ اس پر اسکو ناز بھی بجا طور پر تھا۔ اس لئے کہ وہ ایک غریب انسان اپنی سعی پیہم اور جد و جہد کی بدولت آج اتنی بڑی دولت کا مالک تھا۔ لیکن اس کے باوجود اب ایک اور خلش تھی جو اسکی راحت قلب میں ہلچل سی مچائے ہوئے تھی۔ وہ اکثر ساری ساری رات بےچینی

بعد [illegible] ہی گزر گیا۔ نیند حرام ہو جاتی۔ مگر کوئی تدبیر اس کے کام نہ
آتی تھی۔ اب اسکو اولاد کی تمنا بہت ستاتی تھی۔ اس نئی بیوی سے بھی
کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ راتوں کو وہ لاغر بیمار بچی یاد آتی۔ جس کو اس نے
اپنی سنگدلی اور بیدردی سے بیچ ڈالا تھا۔ اس کی تلاش کی اس وقت
اس کے لئے کوشش کی۔ مگر بڑے رئیس اعلیٰ کی لڑکی کو [illegible] گھر
میں کہاں تلاش کی جا سکتی تھی۔ اب وہ کروڑپتی تھا۔ ہندستان کے ہر بڑے
شہر میں اس کی خاص اپنی ملکیت بزنس عمارات موجود تھیں۔ کیونکہ اس کو
عمارات سے خاص دلچسپی تھی۔ عظیم الشان شاندار عمارتیں وہ بنواتا اور ہر قسم کی
آرائش کے بعد اپنے مختصر قیام کے لئے چھوڑ دیتا۔ اس نے اپنی تعمیرات کے
سلسلہ میں کلکتہ میں ایک بہت بڑی عمارت بنوائی۔ اس میں تالاب تیرنے
کے لئے اور میدان سپورٹس کے لئے تیار کرائے۔ لان میں ٹینس اور بیڈمنٹن
کا الگ انتظام کرایا۔ غرضکہ اس کوٹھی میں جس قدر شان و شوکت نمایاں تھی۔
اسی طرح اس کے متفرق فلیٹ کو کرایہ پر دیکر اسے کثیر رقم جمع کرنا بھی مقصود
تھا۔ باغ سے پھولوں اور پھلوں کی کثرت کی وجہ سے الگ آمدنی ہوتی تھی۔
جس وقت یہ عالیشان عمارت بالکل مکمل ہو چکی تو اس نے اس کی خوشی میں
ایک وسیع اور پر تکلف پارٹی کا انتظام کیا۔ جس سے مکان کی شہرت بھی
ہو جانی مقصود تھی۔ کیونکہ اس کے پر تکلف فلیٹ کو حاصل کرنے کیلئے خواہ مخواہ
زیادہ سے زیادہ کرایہ دیکر امیر کرایہ دار لینے پر آمادہ ہوتے۔ دوسرے دوستوں
اور ہم عصروں میں اسکی دریا دلی کی بھی کافی دھوم مچ جاتی ——

پارٹی کے دن آراستہ پیراستہ وسیع ڈرائنگ روم اور دوسرے
کمروں میں صوفے، کرسیوں اور چھوٹی چھوٹی میزوں کی لطیف آرائش ہو رہی
تھی۔ دبیز قالین بچھائے گئے تھے۔ ریشمی پردے اور ریشمی گدے اپنی بہار
الگ دکھا رہے تھے۔ دیواروں پر وسیع سنہری چوکھٹوں میں بڑے بڑے
مصوروں کے حسین شاہکار جو انہوں نے برہنہ عورتوں کے دلکش اور جاذب
نظر اداؤں اور ان کا حسین برہنگی کو ظاہر کرنے میں اپنے فن کی چابکدستی میں
پیش کئے تھے آویزاں تھے۔ میزوں پر گلدان رکھے گئے تھے۔ کمرہ معطر اور
آراستہ تھا۔

مہمان دور اور نزدیک سے آکر اس ایوان میں اس قدر بھر گئے
تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سیٹھ رام داس عرف راموکے عظیم الشان
لان کے خوبصورت اور وسیع احاطے کے اس پار کمپنی باغ تھا۔ اور دریا قریب
ہونیکی وجہ سے اکثر اشنان کرنے والوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ چونکہ آج ایک
تہوار [illegible] تعطیل تھی۔ اس [illegible]
باغ میں عام سکول کے بچوں اور [illegible] کی تعطیل منانے
آئی تھی۔

تپائیوں پر تو کھانے کلاس قسم کی تھیں۔ شراب [illegible] کے
جام اور کبابوں کی پلیٹیں [illegible] کی ہوئی تھیں۔ سیٹھ رامو اس [illegible]
کباب، سموسے، انڈے، کیک اور مٹھائیاں اڑا رہے تھے۔ ایک [illegible]
ہو رہا تھا۔ اور باہر بڑے بوڑھے مذہبی اشنان میں مشغول تھے۔ ننھے بچے
ہنستے کھیلتے کلیلیں کرتے پھر رہے تھے۔ اس وقت سیٹھ رامو اس اپنی کامرانی پر نازاں
ہونے کے باوجود اپنی عیش و عشرت کے جمگھٹ سے علیحدہ ہو کر برآمدے میں
صوفے پر لیٹ گیا۔ اور باہر بچوں کی معصوم دلفریبیوں کو اپنی حسرت بھری نگاہ سے
تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے عمق میں گویا صدیوں کی افسردگی پنہاں تھی۔ اس کا
دل کسی خاص شے کا متلاشی تھا۔

کمروں سے مبہم آوازوں کی ایک بھنبھناہٹ ہوا میں ناچتی نکل رہی تھی۔
اس نے جھلا کر منہ پھیر لیا۔ اور آہستہ سے کہا۔ بھگوان کی قسم ہماری پارٹی میں یہ
مزہ کہاں جو یہ غریب لوگ اور سکول کے بچے اور بچیاں منا رہے ہیں۔ بہت سے دولت
کی حسین تصویریں جو سینکڑوں ہزاروں روپے صرف کرکے ہال کی زینت کیلئے بنائی
گئی تھی۔ اس وقت دریا کنارے کا نہانے والی حسین لڑکیوں کے نیم برہنہ شباب فریب
مجسموں کے آگے ہیچ تھی۔ اس میں دولت مضمر تھی اور ان میں زندگی۔ سیٹھ [illegible]
سے معصوم بچوں کی اچھل کود اور نوجوان لڑکیوں کے ناچ گانے دیکھ دیکھ کر ان کی
جسمانی مد و جزر کا جائزہ لے رہے تھے کہ اتنے میں ان کے کانوں میں ایک نقرئی
ہنسی، ایک دلکش کھلکھلاہٹ کی آواز جو ان کے دل پر مضراب کا کام کر گئی سنائی
دی۔ وہ اس سامعہ نواز کھلکھلاہٹ سے پہلے آشنا معلوم ہوتے تھے۔ اب ہمہ تن
گوش برآواز ہو کر سننے لگے۔ آخر ان سے جب صبر نہ ہو سکا تو چپراسی کو بلا کر
دیکھو یہ کون سی پارٹی یہاں جشن منا رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ بچوں کے [illegible] کے
لڑکے اور لڑکیاں تعطیل منانے آئی ہیں۔ اور سکریٹری صاحب اپنی اکلوتی لڑکی کے
جو اس کلب کی ممدوح، روح رواں اور ان کی آنکھوں کا تارا ہے موجود ہے۔ سیٹھ نے
دل میں کہا۔ کیسے معصوم اور سادہ لوگ ہیں یہ۔ اس کو خیال آیا کہ کس قدر بے مروت
بن کر دولت کے خواب میں اندھا ہو کر اس نے اپنی آنکھوں کی تارا اپنی اکلوتی بچی کو قربان
کر دیا۔ آہ! گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں گاؤں کی لڑکی
کرشنا کی محبت یاد آ رہی تھی۔ کہ کس طرح اس نے اپنی زندگی کی مسرتوں و اپنے جیسے
کے ٹکڑے کو اس کے حکم پر قربان کر ڈالا تھا۔ بے بس عورت! مجبور عورت!! [illegible]

وحشت، دم اور عقل معدوم ہو جاتا ہے۔ کاش! اس وقت کرشنا اس کو ہی مل جاتی تو وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتا۔ ان کو سر پر بٹھاتا اور پچھلی کا بدلہ اپنے آپ کا بدلہ ادا کر دیتا ——

آہ! اس وقت دیری ولولہ تھا ——— بالکل کرشنا کی ایسی شکل و صورت اس کی گرفت ناز بھری تھی۔

وہ پاگلوں کی طرح احاطے سے بھاگ کر نکل گیا۔ اور دریا کے کنارے کھیتوں کے درمیان تھا۔ اس نے پہلے ہی جا کر سکرٹری کو پوچھا۔ ادھیڑ عمر کا معزز تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ سیٹھ سے مصافحہ کیا۔ سیٹھ صاحب نے کہا آپ اندر تشریف لائیے اور ہماری دعوت میں ضرور شرکت کیجئے۔ میں نے اسی نو تعمیر عمارت کا جلسہ کیا ہے اور شہر کے تمام لوگ یہاں مدعو ہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کی پارٹی بھی چھٹیاں منانے یہاں پہنچے گی۔ ورنہ میں آپ لوگوں کو بھی قدم رنجہ فرمانے کو کہتا ——— پھر دیکھی لغزش قبضہ ———
سیٹھ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اتنے میں وہ تین بچوں کے شامل ایک نوجوان چودہ سالہ لڑکی بھاگتی ہوئی سکرٹری صاحب کے پاس آئی۔ ابو جان دیکھئے! دیکھئے!! اس شریر کشن نے اپنی انگلی چاقو سے کاٹ لی ——— فرسٹ ایڈ کا بکس آپ کے ہینڈ بیگ میں ہوگا ——— دیکھئے ذرا ——— !

سیٹھ رام داس اس لڑکی کے خد و خال دیکھ کر اس قدر محو ہو گئے کہ انہیں کچھ بھی یاد نہ رہا۔ کہ وہ سکرٹری سے ابھی کیا باتیں کر رہے تھے۔ چشم تصور میں ان کی حسین کرشنا ان کے سامنے تھی ——— کرشنا بھرپور جوان تھی اور ابھی اس نازک اندام حسینہ نے شباب کی حدود میں قدم ہی رکھا تھا۔ سیٹھ صاحب چونکنا ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ لڑکی جیجی جیجی جس کو سب بچے پکار رہے ہیں کون ہے جناب؟"

"یہ ہماری لے پالک لڑکی ہے۔"

"تو جیجی کہہ کر کیوں بلاتے ہیں اسے؟"

"اس کا نام جیجا ہے۔ ہم پیار سے اسے جی۔ جی کہتے ہیں۔ پہلے ہمارے بدنصیب گھر میں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اب یہی ہماری زندگی کا سہارا ہے۔ ہماری خوشیوں کا مرکز ——— ہماری مسرتوں کی دنیا ———

سیٹھ رام داس جی کے دماغ میں اس وقت خیالات کا طوفان موجزن تھا۔ سے وہ تمام واقعات یاد آ رہے تھے۔ ستارے کی طرح گھومتے ہوئے وہ جینا کے نکھرے ہوئے چہرے کو کسی طرح بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ غور کر رہا تھا کہ وہ کون سی ایسی مقناطیسی کشش ہے جو خواہ مخواہ بھی اس غیر لڑکی کی طرف اس کو کھینچ رہی ہے۔ وہ یکایک چونک کر پوچھنے لگا ——— "اچھا جناب اس لڑکی کا اصلی نام کیا ہے؟ اور کس سے آپ نے اسے گود لیا تھا۔" گویا کسی ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اور اب تک خوفناک منظر اس کے پیش نظر ہے۔ اب ستاروں کے گردش ہوئے واقعات ناچتے دکھائی دے رہے تھے۔

سکرٹری نے جواب دیا: "اس بچی کا اصلی نام لیلا تھا۔ اور میں نے اسے عیسائیوں کی ایک مشن سے لیا تھا۔ اس کا یہ نام ہمیں اس طرح معلوم ہوا کہ اس کے گلے میں ایک سنہری زنجیر تھی اور اس میں لاکٹ کے درمیان لیلا لکھا ہوا تھا ——— خانقاہ کی سسٹر نے کہا تھا کہ یہ اسکی ماں کی نشانی ہے جو اس کی شادی کے وقت اسے دی جائے گی۔"

سیٹھ کا رنگ یہ سنکر فق ہو گیا۔ آہ! جب وہ گاؤں سے شہر میں بھاگ آیا تھا اور تنگ حالیوں میں اس کے دن گزر رہے تھے اس وقت اسی طلائی زنجیر کو فروخت کرنے کے لئے ایک شام اس نے کرشنا سے طلب کیا تھا اور کرشنا نے گم ہونے کا جب عذر کیا تو اس نے اس جاں نثار غریب بیوی کو مارا بھی تھا۔

"اوہ! تو یہ جینا۔ یعنی لیلا میری ہی گم گشتہ بیٹی ہے ——— ! خلق کیا قسمت ہے میری ——— ! پا لیا میں نے اپنی بیٹی کو ———"
زانو پر ہاتھ مار کر اس نے کہا ——— پھر لڑکی کی طرف پیار سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگا۔ اس کم قیمت سوتی ساڑھی اور معمولی لباس میں بھی یہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ——— میری تمام وسیع املاک کی مالکہ نظر آ رہی ہے۔ بھلا گوہر بھی خاک میں چھپ سکتا ہے۔ اس نے فوراً اس معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کا فیصلہ کر لیا اور سکرٹری سے کہنے لگا۔

"جناب! یہ لڑکی دراصل میری بیٹی ہے۔ جس وقت یہ بچی بہت چھوٹی تھی اس وقت میں بے حد غریب تھا یہاں تک کہ بچی کو بھوک فاقہ اور تکالیف سے بچانے کیلئے ہم نے شہر جاتے ہوئے اسے مہربان عیسائی مشن کی پناہ میں چھوڑ دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں؟ میں یہاں کے مل کا مالک ہوں۔ جی ہاں ——— کرشنا مل کا! اگر آپ میری بیٹی مجھے واپس دیدیں تو میں رقم کے علاوہ آپ کو اس مل کا منیجر بھی بنا دونگا۔ آپ کے بشرے سے ظاہر ہے کہ آپ بیحد ایماندار اور خدا پرست انسان ہیں ———!!"

سکرٹری کچھ دیر سوچنے لگا۔ اس کے بعد جواب دیا۔ "اگر یہ سچ مچ آپ کی بیٹی ہے۔ اور آپ کے پاس جانا چاہے گی تو مجھکو اور میری بیوی کو کوئی اعتراض

دیونگا۔ کیونکہ آپ مجھ سے افضل ہیں۔ اور ہمارے آقا۔ ہماری بھی اتنی توفیق نہ ہوگی کہ اس بچی کو آپ کی طرح آرام و عیش و عشرت کے ساتھ رکھ سکیں یا پروان چڑھا سکیں۔ دوسرے ہم اس بچی کو اس عظیم الشان محل سے چاہتے ہیں کہ اس کی بہبودی اور آسائش میں ہرگز مزاحم نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ہم بدنصیبوں بے اولادوں نے جیسے کہ اپنی اولاد کی طرح اپنی جان سے بڑھکر محبت و حفاظت سے اسے پرورش کیا ہے۔ ہم غریب اور معمولی تعلیم یافتہ آدمی ہیں ۔۔۔ ہمارا دل کی منیجری ! نہیں صاحب ہم اپنی ترقی کے لئے یہ چیز سودا نہیں کرنا چاہتا۔ اب یہ فیصلہ خود جمنا کے ہاتھ ہے ۔۔۔ میں اُسے بلاتا ہوں۔ آپ سچ سچ ساری داستان اُسے سنا دیجئے۔ اور اپنی بے انتہا دولت کا بھی اسے یقین دلا دیجئے۔ پھر وہ جو کہے گی میں ماننے کو تیار ہوں۔

سیٹھ جی نے اس فیصلہ پر رضامندی ظاہر کی۔ اس وقت دریا کنارے سے نغمے قہقہے کی لہریں ہوئی موسیقی اس کی سامعہ نوازی کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

بڈھے سکریٹری نے بچی لے پالک بیٹی کو بلایا۔ اس وقت بچوں کے کھیل اور قہقہے موقوف ہو گئے۔ ان کی عاشق پارٹی اب سیٹھ جی اور سکریٹری کے اردگرد جمع ہو گئی۔ جس میں بچے، نوعمر اور اُن کے والدین بھی موجود تھے۔

سکریٹری نے آہستہ آہستہ نہایت متانت کے ساتھ جمنا کو وہ تمام کہانی سنا دی۔ اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ دل چاہتا تھا وہ اس کا کہ جمنا سے گلے مل کر وہ گنگنا اور جمنا کے بہتے ہوئے دھاروں کے نغمے سنا دے۔ اور موجوں کی لے میں وہ دل کے بربط پر ہم آہنگ موسیقی چھیڑ دے۔ سکریٹری کا دل رو رہا تھا کہ آج جمنا اپنے امیر باپ کی موجودگی کو اس کی غریبانہ شخصیت پر ترجیح دیگی۔ عظیم الشان محل کی ملکیت کی تمنا اُس کے دل سے پرانے اور شیریں گھر کی یاد بھلا دے گی۔ جہاں اُس نے کھیل کود کر خوشیوں سے بچپن گذارا تھا۔ اُدھر بوڑھے کے دل میں بیتاب سمندر کے سینے کی طرح کیفِ تلاطم ہو رہا تھا۔ وہ اُمید و بیم کی حالت میں کھڑا سوچ رہا تھا۔

اُدھر جمنا اپنی ارزاں سی سوتی ساڑھی کے آنچل مروڑتی ہوئی ان کی باتیں بغور سن رہی تھی ۔۔۔ آخر میں اُس نے سیٹھ جی کو مخاطب کر کے کہا۔
"اگر آپ واقعی میرے باپ ہیں تو میں آپ کی اس عنایت کا پہلے شکریہ ادا کرتی ہوں ۔۔۔ اور مجھے اس بات کا فکر بھی نہیں کہ واقعی آپ میرے باپ ہیں یا نہیں۔ مشن کی مہربان سسٹر مجھے آپ کی سب باتیں بتا چکی ہیں وہ کہتی تھیں میری بیماری کی حالت میں بے پرواہ بنا کر چلی گئی تھیں اور آپ کی مہربانی سے وہ اپنی زندگی کے دن جیسے تیسے ختم کر کے چل بسی ہوں گی۔ آپ کو بیمار لڑکی سے زیادہ دولت کی طلب تھی۔ وہ آپ کے پاس ہو گی ۔۔۔ اب اس پر قناعت کیجئے ۔۔۔ میرے غریب باپ کو دولت کی حرص نہیں۔ اُن کو عزت اور محبت کی خواہش تھی۔ اولاد کی تمنا تھی۔ اُنہوں نے فاقہ کر کے محنت مزدوری کر کے اپنی تنخواہ سے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی کیا۔ اور جس قدر مہربان سسٹر کا مجھ پر قرض ہوا تھا وہ میرے غریب باپ نے اپنے ایثار سے اُن کا قرضہ چکا کر مجھے بڑے چاؤ سے پالا۔ اُنہوں نے کوئی خدمت کوئی قربانی میرے لئے اُٹھا نہیں رکھی۔ اُنہوں نے میری ناز برداری اور راحت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ میں اُنہیں کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑونگی۔ اور ان کے احسان کا بدلہ محض کیتی ہیں دونگی۔ میری تمنا ہے کہ ان کے حق میں فرمانبردار اور نیک لڑکی ثابت ہوں۔ تاکہ کچھ بھی ان کی مہربانیوں کا حق ادا ہو جائے۔"

جس وقت یہ الفاظ ختم ہوئے اور جمنا خاموش ہوئی میں اسی وقت سکریٹری کی ادھیڑ سن بیوی بھاگتی ہوئی آئی۔ اور جمنا کو سینے سے لگا کر خوشی کے آنسو بہانے لگی۔

میری جان! میری پیاری بچی! تیری سعادتمندی کے آگے ہماری تھوڑی سی خدمت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ تیرا یہ ایثار ہماری حقیر خدمت اور قربانیوں کے آگے بہت بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ تیری یہ سچائی اور وفاداری ہمارے لئے سب سے بڑی احسان مندی کا باعث ہے۔

اس وقت سیٹھ رام داس اس خوش نصیب قافلہ کو حسرت بھری نگاہ سے تک رہے تھے۔ اپنی ناکامی کا صدمہ اُنہیں یاد خود رفتہ بنا رہا تھا۔ وہ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح سست قدم اپنے مہمانوں میں واپس گئے جو اب تک خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔

ایک نواب نے بڑھکر کہا "یار! تو اتنی دیر کدھر غائب ہو گیا تھا؟"
شکست خوردہ سیٹھ نے آزردہ ہو کر جواب دیا "اِن کم عقلوں کو دولت کی قدر و قیمت سمجھا رہا تھا جو دولت کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔"

اعتراف

(از محترمہ حجاب بنارسی)

شاہدہ پیاری! اب تو یہ کچھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کون کمبخت کہے گا؟ تمہارا دعا کی قائل نہیں۔ تمنائیں ضرور ہیں۔ مگر جس بدنصیب کی ایک تمنا بھی بر نہ آئی ہو وہ کس حوصلہ پر آئندہ کرے!!! تمہارے خطوط برابر ملتے ہیں۔ ہر چند جواب نہ دینے کے لئے مجرم ہوں، پر وجوہات بھی تو سن لو! میں پہلے کچھ اور تھی اب کچھ اور۔ بظاہر بیمار نہیں۔ مگر ذہنی طور پر بھی بہت کچھ بدل چکی ہوں۔ تم نے لکھا ہے کہ "دہلی کے ایک ادیب تمہاری ادبی مرتبت کے بیحد قائل ہیں۔ انہیں صنف نازک سے بڑی ہمدردی ہے۔ چار شادیوں کو وہ ظلم سمجھتے ہیں —" لیکن یہ تو دیکھو کہ میرے پاس تعارف کا کوئی ذریعہ نہیں۔ پھر کہاں دہلی اور کہاں تمہارا لکھنؤ — مجھے تمہارے اس سمجھنے کی معاملہ فہمی کا قائل ہے کہ "یہ صرف ادبی خط و کتابت ہے۔" شاہدہ! کیا تم اپنے بدلے مظہر کی خدمتِ ادب کو بھی اتنا ہی سراہتی ہو جس قدر کہ ہیں؟ یا وہ اپنی کسی عزیزہ خاتون کی ادبیت کے بھی اتنے ہی معترف ہیں جتنے ایک نادیدہ دوشیزہ کے؟ یہ شبہ ہے!! غور کرو کیا یہ مراسلت دل کی دھڑکنوں کی پکار نہیں! تمہاری یہ ادبیت ایک کسی خلش کا نتیجہ ہے — ورشاید یہی معاملہ ادھر بھی ہوگا!! ابھی حال ہی میں نے ایک نظم پڑھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت ابھی خود ایک معمہ ہے۔ حل طلب — اپنی نہیں! ہم اپنے ماحول کو — اپنے محسوسات کو — اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں — زندگی بجائے خود ایک فریب ہے — کہو گی کہ چھوٹی ہو کر باتیں بناتی ہے۔ جانتی ہی ہو کہ ہمیشہ ہی بڑی بنتی رہی ہوں۔ میری سنجیدگی پہ تم اور کالج کی لڑکیاں مجھے فلسفی کہا کرتی تھیں — کالج کا فلسفہ ہی کیا؟ پھر میں نے دو سال میں پڑھا ہی کتنا تھا! مگر ہاں اب کچھ "فلسفی سی" ضرور ہو گئی ہوں۔ کتاب زندگی کا ایک ورق حوادث سے اچانک الٹ گیا۔ اور میری نگاہوں نے اس پر ماضی و مستقبل کی داستان پڑھ لی۔

بھائی جان کے انتقال کے بعد جب ابا جان الہ آباد جانے لگے تو ہمیں بھی ساتھ لیتے آئے کہ نئے شہر میں دل بہلے گا۔ اب تک وہ اپنے ایک دوست بیرسٹر مشرودزیر علی کے ساتھ تھے۔ ان کی اکلوتی لڑکی مہر کرنہ ملی کا مجسمہ تھی۔ اس کی وجہ سے میرا وقت بڑی اچھی طرح بیت جاتا۔ ورنہ اکثر بھائی جان مرحوم کو یاد کر کے رویا کرتی تھی۔ مہر فورتھ ایئر میں تھی۔ وہ اکثر کالج کے لڑکوں کا ذکر کیا کرتی تھی۔ مگر بھائی جان کی اچانک موت کا میرے دل پر کچھ ایسا صدمہ تھا کہ کسی سے کوئی دلچسپی ہی نہ رہی تھی۔ تم جانتی ہی ہو شاہدہ! وہ مجھ پر کس طرح جان چھڑکتے تھے! مہر کالج سے اکثر سیدھے ہمارے ہی یہاں آ جایا کرتی تھی۔ ایک دن وہ اماں سے اجازت لے کر مجھے بھی اپنے ساتھ گھر لے جا رہی تھی کہ گاڑی کی کھڑکی کے قریب سے کوئی نوجوان گذرا۔ "سچ کہو خورشید کیسا حسین ہے؟ — خورشید —" "تم جانتی ہو اس کو؟ بڑی متاثر معلوم ہوتی ہو —؟" میں نے کہا — تم جانتی ہو کہ خورشید کس کا نام تھا۔ دل چاہا کہ بھائی کے ہمنام کو پھر دیکھوں۔ مگر سائیکل کہاں کی کہاں پہنچ چکی تھی — کئی دن بعد میں مہر کے یہاں تھی، ہم دونوں دریچہ سے "غروب خورشید" کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ مہر مجھے بنانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اتنے میں پھاٹک کھلا اور خورشید آتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے کہا "لو مہر تمہارا جواب آیا — اب اس کی شرمانے کی باری تھی۔ پھر بھی خورشید اگر برآمدہ میں کھڑے ہو گئے۔" کہئے خورشید بھائی کیسے تکلیف کی —؟" خورشید چونک پڑے اور میں نے بھی چپکے سے پوچھا۔ "تم سامنے جاتی ہو —؟" "نہیں ویسے ہی بات کر لیتی ہوں" — "رضو نے بجانے کیا دیا ہے آپ کو" — یہ کہکر انہوں نے جیب سے کوئی کاغذ نکالا — "یہ تو خط ہے آپ اتنا بھی نہیں جانتے؟ "بات یہ ہے کہ میں پوسٹ مین بننا نہیں چاہتا تھا۔" یہ کہکر وہ مسکرا دیئے۔ "نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے" — "مگر یہ خط ہے کب، یہ تو اچھا خاصا بیماری کے کیڑوں کا البم ہے" — "اچھا ٹھہر جائیے! میں رضو سے کہوں گی کہ آپ اس کی تحریر کو —" "مگر وہ یقین نہ کریگی، میں اس کی تحریر کو موتیوں کا کیس کہہ چکا ہوں" — "تو جناب چوری پکڑی گئی... یہی آپ نے میری تحریر کے لئے بھی کہا تھا —" شاہدہ! میں اس وقت غروب خورشید سے زیادہ "طلوع خورشید" میں محو تھی۔ وہ سرمئی فیلٹ ہیٹ اور بادامی سلک کی قمیص پہنے تھے۔ گلے کے دو بٹن کھلے تھے۔ شاید لاپروہی کے سبب! بالوں کی کچھ لٹیں ان کی صبح پیشانی پر پڑی تھیں — اور آنکھوں میں وہی نشاط انگیز چمک! جو بھائی جان مرحوم کی آنکھوں میں تھی عجب طلائک فریب حسن تھا!!! اچانک ہوا سے دریچی کا پردہ اڑ گیا اور

بھلا اُن سے صاف صاف سامنا ہو لیا ——— گھبری میں انہوں نے
سیدھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال ہی لیں اور منہ بھی پھیر لیا ——— "آپ کی
تعریف ؟" وہ کپکپاتی ہوئی آواز سے بولے ——— "تو آپ تاک جھانک
میں بھی ماہر ہیں ؟" قہر نے شوخی سے جواب دیا ——— "آپ اپنی چلن کی
شرارت کو [illegible] نہ کہیں گی" ! اچانک انہوں نے سنجیدہ ہو کر کہا : "یہ
خط لیجئے" ——— "دیکھئے نا ادھر دیکھیے" ——— قہر نے
پردہ کو ہلکی سی جنبش دیکر کہا خورشید دو قدم بڑھے مگر پھر کھڑے ہو گئے۔
ایک منٹ تک تذبذب میں رہے۔ پھر خط جیب میں رکھکر بولے ———
"کسی ملازم کو بھیجئے۔" قہر نے اونہہ کر کے خط منگوایا۔ ان کے یہاں میلاد
شریف تھا۔ جس میں قہر کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا تھا۔ لکھا تھا کہ "تم اپنی نئی
سہیلی نسرین جہاں کو ضرور ساتھ لاؤ۔ ان کے مضامین پڑھ پڑھ کر ہم نادیدہ
مشتاق ہو گئے ہیں۔" خورشید کے یہاں جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔
اُن کی پانچ بہنیں تھیں۔ ایک جو سب سے بڑی تھیں۔ شاید بہت کم سنی میں
بیوہ ہو چکی تھیں۔ غالباً اسی وجہ سے سب اُن کی ناز برداری کرتے تھے بلکہ گویا
سارے گھر پر انہیں کی حکومت تھی۔ وہ خورشید سے بڑی تھیں۔ باقی سب چھوٹی
تھیں ——— مجھ سے وہ لوگ بڑے اخلاق سے ملیں۔ شاید دو ہفتہ بعد
میں نے رضو کو خط لکھکر اشتراکیت پر (جس کے علم بردار خورشید تھے) ایک
کتاب منگوائی۔ جواب میں ایک چھوٹا سا پرزہ آیا کہ "رضو کہیں گئی ہیں خط رکھ لیا گیا۔"
تم سمجھ سکتی ہو کہ نیچے لکھے ہوئے ایک لفظ خورشید سے مجھے کیسی خوشی ہوئی ہوگی!
مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے بھائی جان مرحوم کو پا لیا ! دو ایک دن بعد
پھر خورشید ہی کی طرف سے ایک طویل خط آیا۔ ابتدا میں انہوں نے لکھا تھا کہ
"رضو مصروف ہے۔ اس لئے اس نے باضابطہ مجھ سے یہ درخواست کی کہ یہ
زحمت (جسے میں عین راحت سمجھتا ہوں) آپ ہی کیجئے۔" خط میں انہوں نے
اشتراکیت کے کئی نکتے واضح کئے تھے۔ کتاب بھی بھیج دی تھی۔ اخیر میں جواب طلب
کیا تھا۔ اور اشتراکیت پر میری رائے دریافت کی تھی۔ مجھے اُن کے مکتوب کا جواب
دینا مناسب نہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن مذہبی طور پر مجھے اُن کی رائے سے اختلاف تھا۔
وہ مذہب کو (خواہ وہ کوئی سا ہو) ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اور میں
ترقی کا زینہ ! اس لئے میں نے اپنی دانست میں خورشید کے خیالات بدلنے
کی پوری کوشش کی۔ میں نے انہیں "بھائی" سے مخاطب کیا تھا۔ لیکن آخر میں خط و
کتابت کی مخالفت کی تھی۔ مگر انہوں نے اس کا جواب تو بے تکلفی سے دیا
اور لکھا کہ "میں بہنوں کی کثرت سے پہلے ہی گھبرایا ہوا ہوں۔ مجھے بھائی والی لکھنے

کی ضرورت نہیں۔ صرف [illegible] ہے ——— یہ بھی ممکن ہے [illegible]
کہ وہ کسی غیر عورت کو اس کے نام سے مخاطب کرنے میں تکلف کرتی ہوں
مگر آپ تو ادیبہ ہیں۔ آپ ایسے موہوم امورات کی کیوں قائل ہیں ؟ [illegible]
سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھے [illegible]
نے خط و کتابت جاری رکھنے پر بہت زور دیا تھا۔ [illegible]
ہماری اس ادبی مراسلت کو اتفاقی طور پر [illegible]
کیوں عمل کریں ! ہر ایک لغزش معصوم ہے۔ [illegible] یہاں۔ تو بے تکلفی سے
پڑھکر کوئی گناہ نہیں۔ میں نے کافی سوچا۔ اصولاً مجھے جواب ضروری نہ تھا
مگر انہوں نے بہت اصرار کیا تھا۔ اچانک مجھے خیال ہوا کہ اگر بھائی جان مرحوم کسی
بات پر مصر ہوتے تو کیا میں انکار کر سکتی تھی ؟ ——— میں نے جواب تو دیا
مگر کمزور الفاظ میں پھر منع کیا۔ ایک دن قہر سے خورشید کے خط کا تذکرہ ہوا
میں نے کہا کہ اُن کے خطوط میں شوخی و رنگینی ہوتے ہوئے بھی بڑی شائستگی ہوتی ہے
اس پر وہ چونک کر بولی ——— "اس دھوکے میں نہ رہنا۔ بڑے گھاگ ہیں وہ

؎ ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

"ایسے معلوم تو نہیں ہوتے" ——— "ہاں ——— دیکھنے میں تو ایک
ہے۔ دیکھا نہیں اُس دن خط دینے میں جھجک رہے تھے آپ ——— " پھر اُس
نے مجھے بتایا کہ اُن کے دھندے ہی یہ ہیں۔ شہر کی کئی حسین لڑکیوں سے اُن کا
ربط ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے مجھے خورشید کی ایک تحریر دکھائی۔ یہ اشتراکیت
پر ایک چھوٹا سا مضمون تھا۔ مگر ان کی فطری عادت کے تحت کچھ رنگین جملے ضرور
تھے۔ میں نے کہا "اس میں تو کوئی خاص بات نہیں ——— !" اس پر وہ ہنسکر بولی
"خاک افسانہ نگاری کرتی ہو تم ، جو اتنا بھی نہ سمجھ سکیں۔ ارے احمق ؎

قصۂ غم الفت کا سنایا نہیں جاتا
اٹھ جاتا ہے یہ پردہ اٹھایا نہیں جاتا

میں کچھ رام ہو جاتی تو وہ اور کھلتے۔ منہ لگایا ہی کب ؟" وہ ڈانٹ بتلا کر بس
——— "پھر اتنی دلچسپی سے بات کیوں کی تھی ——— ؟" میں نے کہا۔
"وہ میرا بگاڑ ہی کیا سکتا ہے ——— قہر خورشید سے ڈرتے کیوں ؟" وہ ناز
سے بولی۔ پھر خورشید کے متعلق اسی قسم کی اور بہت سی باتیں کہیں۔ مجھ سے
نہ سنا گیا۔ بول اٹھی "میں بھائی سمجھتی ہوں اگر ان میں [illegible]
سوائے افسوس کے اور کیا کر سکتی ہوں۔ جہاں تک ہوگا۔ انہیں بدلنے کی کوشش
کروں گی" اس پر وہ سنجیدہ ہو کر بولی "تم جانو بھولی بھالی لڑکیوں کو ورغلانا
کوئی بڑی بات نہیں۔ بالخصوص خورشید کے لئے ——— اللہ نے انہیں کیا کیا دیا

[illegible] بالکل ترک تعلق کر لو ـــــ"

بس گفتگو سے میں ملول ہوگئی۔ اپنے گھر آکر بھی رنجیدہ رہی۔ مگر شاہدہ!
(جانتی ہوں کہ اس اعتراف پر معاف نہ کروگی) مجھے اب بھی خورشید سے نفرت نہ
ہوئی بلکہ ایک ہمدردی پیدا ہوگئی۔ سوچنے لگی کہ کس صورت سے اُن کی اصلاح
ہو؟ دوسرے دن پھر خورشید کا خط پہنچا! وہی عطر بیز نکہت بالش مکتوب!
جس سے (ایوننگ اِن پیرس) اور سگریٹ کی ملی جلی خوشبو آیا کرتی تھی ـــــ
ابتدا کا شعر تھا ؂

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

نسرین سے مخاطب کیا تھا۔ آپ" کے بجائے "تم" لکھا تھا۔ بڑی بے تکلفی سے
خط لکھا تھا۔ "تم مجھے بھی کیوں نہ کہو مگر میں ایک حسین ذہین ادیب ہستی سے
بھائی چارہ گناہ سمجھتا ہوں۔ مجھے بہن کی ضرورت نہیں ـــ ہاں راحتِ رُوح
کے لئے ایک ذہنی رفیق ضرور عرصہ سے تلاش کر رہا تھا۔ اور سمجھتا ہوں کہ وہ
سب کچھ جس کی مجھے جستجو تھی، تم میں موجود ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ میری
ریاضت کا پھل ہے۔ انعام بیشک اعلیٰ ہے۔ شاید میرے حق سے بھی
افضل نسرین! کیا تم اب بھی مجھے "تم" اور "خورشید" نہ کہوگی؟" ایسا ہی
دلنشیں ان کا پورا خط تھا۔ آخر میں تاکید کی تھی کہ "اس مراسلت کا کہیں تذکرہ
نہ کرنا۔" اب تذکرہ تو میں کر ہی چکی تھی شاہدہ! سچ پوچھو تو پہلے مجھے اس کا
خیال ہی نہ تھا کہ یہ سلسلہ ایسا مسلسل اور طویل ہوگا۔ میں نے جواب اُن کی حسب
خواہش ہی دیا۔ "خورشید" تو لکھ دیا مگر "تم" نہ لکھ سکی۔ پھر بھی انتہائی بے
تکلفی سے لکھا ـــــ لیکن اس کا جواب کچھ عجیب رُوکھا پھیکا آیا اور لکھا تھا کہ
"اس خط و کتابت کا ذکر تو کہیں نہیں کیا ہے؟" میں نے جواب پھر بے تکلفی سے
دیا اور اس بیگانگی کی وجہ پوچھی۔ یہ بھی لکھا کہ مہر سے تذکرہ ہوا تھا، میری دلی
خواہش تھی کہ جس طرح ممکن ہو وہ راہِ راست پر آجائیں! مگر میرے خط کا جواب!
آہ شاہدہ! کاش کبھی نہ آیا ہوتا ـــ خط نہ تھا تیر و نشتر سے بڑھ کر
ـــــ کچھ زیادہ مضمون نہ تھا۔ مگر صفحہ میں بڑے بڑے حروف لکھے
تھے جس سے چار صفحے ہوگیا تھا۔ دو چار جملے تم بھی سُن لو۔

"خاتون!

میں آپ کا الطاف نام لینے کو یا کسی قسم کے سلام کو اس وقت تک تیار
نہیں ہوں جب تک ہمارے آپ کے معاملات صاف نہ ہوجائیں مگر لکھ رہا ہوں

[illegible] گا۔ اس کو ثبت یہ
ہمارا آئندہ ربط ہی ظاہر کرسکے گا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے وہ ایک ایسا بھیانک
سانحہ ہے کہ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ آپ شاعرہ ہیں، ادیبہ ہیں۔ حسین و
ذہین ہیں اور عام خواتین سے بلند ہیں (بجز اس فطری کمزوری کے) تو میں
فوراً خط و کتابت بند کر دیتا۔ اور مجھے مطلق افسوس نہ ہوتا! مگر آپ کے لئے
ایک وسیع قلب رکھتا ہوں۔ اس لئے خاموش ہی نہیں ہوگیا۔ بلکہ اتنا کچھ
کہہ رہا ہوں جتنا اپنی کسی غلطی پر شاید اپنے دل سے کہتا۔ حیرت سے زیادہ
صدمہ اور صدمہ سے زیادہ تعجب ہے کہ آپ نے ادیبہ ہوکر میرے خلوص کو
آوارگی سمجھا۔ آپ ترکِ تعلق کرلیتیں۔ مگر یہ کیا؟ آپ نے اس ساختہ بیباکی
سے یہ چاہا تھا کہ میں کھلے دل کی رَو میں بہت کچھ لکھ جاؤں۔ اور آپ اپنی
سہیلیوں میں بیٹھ کر مجھے اپنی تفریح کی آماجگاہ بنائیں۔" اس کے بعد لکھا تھا
کہ میں نے اپنی سہیلیوں میں انہیں مبتلائے محبت بنا کر خوب مذاق اُڑایا ہے
پھبتی کسی ہے، جانے کیا کیا کہا تھا۔ پھر لکھا تھا کہ آپ نے مجھے فریب دیا۔
غرض یہ کہ سارے خط کا مضمون ایسا ہی تھا۔ ظالم نے اپنے خطوط بھی واپس
منگائے تھے۔ یہ لکھ کر کہ "کجا ہماری خط و کتابت کجا آپ کی خیال آرائیاں؟
میری تحریریں واپس بھیجئے۔ وہ خطوط اس لئے نہیں لکھے گئے تھے۔" شاہدہ!
تم باوجود کوشش کے میری اس کیفیت کا اندازہ نہ کرسکو گی جو اس وقت مجھ
پر طاری تھی ـــــ رو رو کر پڑھتی تھی اور پڑھ پڑھ کر روتی تھی! شاید
دو چار قطرے ان کے عتاب نامے پر بھی ٹپک گئے۔ اگرچہ میں نہ چاہتی تھی ـــ
وہ نہ جانے کس جرم کی سزا مجھے دے رہے تھے۔ اور آنسو گویا شکست کا
اعتراف ہے؟ اُنہوں نے اپنی تحریریں بھی منگالیں اور میرے خون جگر کہیں
ان کے پاس رہ جائیں؟ مگر انجام یہی نہیں۔ شاہدہ! سُنتی جاؤ! اس ترک
تعلق کے بعد مجھے اس کا احساس ہوا کہ خورشید میری تاریک زندگی میں
خورشید بنکر طلوع ہوئے تھے۔ اس صدمہ نے مجھے صاحبِ فراش کر دیا۔ میری
علالت اور افسردگی کے سبب مہر نے بھی میرے یہاں آمد و رفت کم کر دی
وہ ہنسنے کھیلنے کی عادی تھی۔ اس میں تفکر نہ تھا ـــــ کچھ عرصہ بعد
میرے یہاں خورشید و مہر کی منگنی کا دعوت نامہ آیا۔ یہ سُنکر میں بے چین ہوگئی
مہر کو خورشید سے نفرت تھی۔ جس طرح بھی ہو میں اسے بچانے کی کوشش
کرونگی۔" یہ عزم کرکے میں مہر کے یہاں گئی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس
ایک تپائی پر بیٹھی تھی ـــــ شاداں فرحاں! چہرے پر ایک
تابانی تھی ـــــ میک اپ بڑی خوبصورتی سے کیا تھا ـــــ مگر میر

بھی اُس کا حُسن خورشید کے مقابلہ میں پھیکا نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی
کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔ "تو تم اس منگنی سے خوش ہو؟" ——— "کیوں
نہیں!" غیر ارادی طور پر اسکی نگاہیں میز پر ایک کھلے ہوئے کاغذ کی طرف
اُٹھیں جس پر کوئی نظم لکھی تھی۔ نیچے خورشید کے مخصوص دستخط تھے جسے میں
نے فوراً پہچان لیا۔ "تمہیں شاید اس وقت کی باتوں کا خیال ہوگا۔" وہ جلدی
کر بولی: "سچ تو یہ ہے کہ وہ ایسے بُرے بھی نہیں اور اس وقت جو کچھ میں نے کہا
تھا وہ ایک لڑکی کی شکلیں سے سُنا تھا اور شاید بہت دن سے خورشید کے پیچھے پڑی
تھی خورشید نے اُسے منہ ہی نہیں لگایا۔ یہاں تک کہ وہ کسی اور پہ فدا ہوگئی۔ میرے
بہت پوچھنے پر آخر اُس نے بتایا کہ" ہاں جب تم نے خورشید کا ذکر کیا تھا تو میں نے
ایک خط انہیں سمجھ کے لکھا تھا کہ "خبردار! نسرین تمہیں بھائی سمجھتی ہے۔ کوئی ایسی
ویسی بات نہ لکھنا۔" بات یہ ہے نسرین! خورشید آخر خورشید ہی تو ہے حسب
عادت کچھ لکھ دیتا اور تمہارے غمزدہ دل کو ٹھیس لگتی۔ اُس نے تو تمہیں دو ہی
خط لکھے تھے نہ۔ مگر مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں سلسلہ ہی نہ بندھ جائے اور مُفت میں تمہاری
بدنامی ہو۔ میری تو تمنا ہے کہ تمہارا دولہا بھی خورشید ہی جیسا ہو۔ مگر عادت میں
اصل نیک ہو۔" شاہدہ! اس وقت میری آنکھوں سے جیسے پردہ ہٹ گیا
——— ! اُف! مہر کو خورشید سے نفرت نہیں محبت تھی۔ اِس لئے وہ ہمارے
درمیان معترض بنی۔ ہم جس منزل پر پہنچنے والے تھے وہ اسے بھلادی [illegible] سے
جان گئی تھی ——— مہر مفکر نہ تھی مگر دنیوی معاملات میں ہوشیار نکلی! وہ مجھ سے پہلے
میرے دل کو بھانپ گئی ——— شاہدہ! میں نے مہر کو معاف کر دیا۔ کیونکہ محبت ہی
نے اُس سے یہ فریب کرائے۔ اور خورشید! خورشید کو بھی ——— مگر اپنے دل کو کبھی
معاف نہ کر دوں گی۔ مہر نے مجھ سے فریب کیا۔ میں نے اپنے دل سے! یا دل نے مجھ سے!
یہ اب تک نہ سمجھ سکی۔ جب میں مہر کے یہاں سے لوٹی تو جیسے برسوں کا تجربہ حاصل کر کے
لوٹ کر مجھے اپنے دل سے محاسبہ کا موقع ملا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ مجھے خورشید سے
کس نوع کی محبت تھی! ایک یا ڈیڑھ مہینہ بعد میں خورشید کے خط کا جواب لکھنے بیٹھی
آنکھیں بھر آئیں۔ اب یہ یاد نہیں کیا کیا لکھا تھا ——— شاید یہی کہ مہر کے
مقابلہ میں آپ ایک پردیسی کا یقین نہ کریں گے۔ میں نے صرف ذکر کیا تھا۔ اعتراض
نہیں۔ آپ کا احترام میرے دل میں ابتدا سے ہے۔ البتہ میں اس کا کوئی ثبوت
آپ کو نہ دے سکی ———" اُمید تو تھی مگر اُنہوں نے اسکا جواب
دیا یہ کہ "تم مجھے ابتدا سے بھائی سمجھنا چاہتی تھیں۔ اب بھائی ہی سمجھتی رہو! شاید
یہ کشتی ہم دونوں کی زندگی کو پار لگا دے۔" ہم دونوں کون؟ یہ میں اس وقت نہ سمجھ سکی
——— مگر اُن کا یہ خط میرے لئے پہلے خط سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا! تم
[illegible] لیا شاہدہ! اس [illegible] کا الزام [illegible] ہم نے [illegible]
بعد میں غلطی کی تھی! ——— اب میں سوچتی ہوں کہ اگر وہ میرے بھائی کے
ہمنام نہ ہوتے اور اُن کی آنکھوں میں وہ مخصوص چمک نہ ہوتی تو کیا میں
اُن سے محبت کرتی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— شاید میں نے بھائی کی
محبت کے سہارے اس نعمت کو پالیا تھا جو کامل زندگی [illegible]۔ مہر
کو الزام نہ دینا شاہدہ! محبت عشق اور سیاست میں سب کچھ جائز ہے
تمہیں معلوم ہے میں اشارہ [illegible] اور رنگین تحریروں سے کبھی [illegible]
خورشید کی طرح کتنوں نے میری قدرت [illegible] کو سراہا تھا؟ [illegible]
——— ؟ یاد ہے جس کا جواب نہ دینے پر تم نے طنز سے کہا تھا ؎

پرستش ہوئی حُسن والوں کی اتنی
کہ بندوں نے سمجھا خدا ہو گئے ہیں

اور میں نے مسکرا کر جواب دیا تھا: "اس میں کچھ ترمیم کرو۔ حُسن والوں کے بجائے "علم
والوں" کر دو!" محبت کے نام پر کس طرح ہنسا کرتی تھی! ایک بار بیچاری جمیلہ
سے کہہ بیٹھی تھی کہ "بھلا انسان کو انسان سے کیا ایسی وارفتگی ہوسکتی ہے۔" اور
اس غریب نے عاجزانہ طور پر کہا پھر کیا آگ ہوا، پانی، مٹی سے ہوسکتی ہے؟"
مگر سُنتی ہو شاہدہ! ؎

ایسی کشتی کو نہیں تابِ تلاطم صد حیف
جس نے منہ پھیر دیئے تھے کبھی طوفانوں کے

نسرین آج اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہے۔ جس کا اسکے نزدیک وجود
ہی نہ تھا۔ فطری تقاضوں سے گریز کرنا سعیٔ لاحاصل ہے ——— اب بھی مہر کے یہاں اکثر
"غروب خورشید" کا منظر دیکھنے چلی جاتی ہوں ——— عموماً وہ سامنے کے میدان
میں شام کی سیر کو جاتے نظر آتے ہیں ——— وہی حسین معصوم! اپنے
سحر سے بے نیاز ——— گو اِن واقعات کو عرصہ گزر چکا ہے لیکن ؎

گو اُن سے وہ اگلا ربط نہیں، گو اُن سے وہ رسم و راہ نہیں
دل اب بھی دھڑکنے لگتا ہے اپنا، جب سامنے وہ آجاتے ہیں

خورشید روز ہی طلوع ہوکر سارے جہاں کو منور کرتا ہے ——— مگر میرا خورشید غروب ہوکر
——— میرے ارمانوں کو ——— میری مسرتوں کو! میری ساری زندگی کو ہمیشہ کیلئے تاریک کر گیا
بھائی کی جگہ خالی ہے۔ خورشید کی جگہ بھی خالی رہے گی۔ کیونکہ ہر شخص کا ایک
خاص مقام ہوتا ہے ——— کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا ———! میں نہ صرف
بھائی کو کھو چکی ہوں بلکہ بھائی کو پا لینے کی کوشش میں اپنی مبہم محبت کو بھی کھو
چکی ہوں ——— لیکن کیا واقعی مجھے خورشید سے محبت ہوگئی تھی۔ مجھے شک ہے۔ مجھے
یقین ہے۔ مجھے شک ہے۔ اور تمہیں؟

پرستار خورشید
"نسرین"

غزل

(ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح الملک حضرت نوح ناروی)

میرے گھر کو دلہن بنائے جا — ساتویں آٹھویں دن آئے جا

کام کے وقت کام آئے جا — میری بگڑی ہوئی بنائے جا

مجھ کو دل یہ صلاح دیتا ہے — وہ نہ آئیں مگر بلائے جا

کچھ توجہ ہو، کچھ تغافل ہو — کچھ منائے جا کچھ رلائے جا

کون کیسا ہے کون کتنا ہے — اہلِ الفت کو آزمائے جا

لطف پینے کا یہ ہے اے ساقی — میں پیے جاؤں تو پلائے جا

اپنا جلوہ نہ تو دکھا مجھ کو — اپنی آواز بھی سنائے جا

تجھ کو ہے اپنے ظلم ہی کی قسم — ظلم ڈھایا تو ظلم ڈھائے جا

کون کہتا ہے اے دلِ خوددار — ان کی محفل میں بے بلائے جا

غنچۂ آرزو ہے کھلنے پر — مسکرائے جا مسکرائے جا

انقلابِ خیال زندہ باد — اک نہ اک رنگ روز لائے جا

عشق میں لطف کیا بغیر اس کے
نوح طوفانِ اشک اٹھائے جا

غزل

(جناب پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی)

غم کی بھرمار ہوئی جاتی ہے　　زندگی بار ہوئی جاتی ہے

جس محبت پہ بھروسا تھا مجھے　　اب وہ آزار ہوئی جاتی ہے

یاد آتا ہے تبسم اُن کا　　سانس تلوار ہوئی جاتی ہے

ناتوانی بھی ترے کوچے میں　　پائے رفتار ہوئی جاتی ہے

جلوۂ بام کو دیکھوں کیونکر　　آنکھ دیوار ہوئی جاتی ہے

ہجوِ مے اور کئے جائے شیخ　　رُوح سرشار ہوئی جاتی ہے

جان بھی تن میں اب اے پردہ نشیں　　شوقِ دیدار ہوئی جاتی ہے

عرضِ حال اور کریں کیا تم سے　　اب یہ بیکار ہوئی جاتی ہے

بار ہے دل پہ ندامت اُن کی　　جیت بھی ہار ہوئی جاتی ہے

سہل گوئی بھی غم و رنج میں جوشؔ
سخت دشوار ہوئی جاتی ہے

غزل

(جناب نواب جعفر علی خانصاحب آثر لکھنوی)

بیقراری مائلِ شوریدگی ہونے لگی
کچھ توجہ میں تری شایدکمی ہونے لگی

ہاں کبھی جانِ تمناکش کبھی مشتاقِ کرم
اب تری بیداد سے دلبستگی ہونے لگی

للہ الحمد آگیا، وہ دورِ نزہت آگیا
سیرِ گلشن رنگ و نکہت سے بری ہونے لگی

اس سے امیدِ تلطف بکیا ہوا ایدل تجھے
شعلہ و شبنم میں کب سے آشتی ہونے لگی

پیش خیمہ جوشِ طوفاں کا تھا ظاہر کا سکوں
میں سمجھتا تھا کہ دل کو یکسوئی ہونے لگی

جہد پیہم ہی حصولِ مدعا سے بے نیاز
زندگی اب ترجمانِ زندگی ہونے لگی

مژدہ باد اے نامرادی کیسی فکرِ عافیت
دل کو پیغامِ مصیبت سے خوشی ہونے لگی

گُل ہو یا کوئی حسیں، زیورِ حیا، زینت حیا
جب یہ پردہ اُٹھ گیا، بے پردگی ہونے لگی

خود شناسی، خود نگہداری کا پھر کیا تذکرہ
آئینہ جب خود پسندی کا خودی ہونے لگی

تو نے باندھے تھے جو منصوبے وہ ایدل کیا ہوئے
اک تبسم پر فقط، آئی گئی ہونے لگی

کیا زمانہ آگیا کیسا چلن بگڑا آثر
وضع کی پابندیوں پر بھی ہنسی ہونے لگی

غزل

(از جناب ماہر القادری صاحب)

وہ جس کا دل لبھا کر رہ گئے ہیں ۔۔۔ اُسے اپنا بنا کر رہ گئے ہیں
نگاہوں کو چُرا کر رہ گئے ہیں ۔۔۔ وہ دل کی زد پہ آ کر رہ گئے ہیں
جوابِ خط پہ وہ عذر مُسلسل ۔۔۔ لکیریں سی بنا کر رہ گئے ہیں
ترے لب پر تبسم تو نہیں ہے؟ ۔۔۔ سِتارے جھلملا کر رہ گئے ہیں
سِتم تمہید ہو شاید کرم کی ۔۔۔ اِسی دھوکے میں آ کر رہ گئے ہیں
نہ پلٹا کوئی بھی راہِ فنا سے ۔۔۔ یہ سب منزل پہ جا کر رہ گئے ہیں

ہم اُن کو داستانِ شوق ماہر
نظر ہی سے سُنا کر رہ گئے ہیں

غزل

(جناب چندی پرشاد صاحب شیدا دہلوی)

دکھادی روشنی عالم میں ہر سُو روئے وحدت کی
زبانِ کلک گویا شمع ہے بزمِ حقیقت کی

اثر اتنا پسِ مُردن بھی ہے سوزِ محبت کا
کہ خورشیدِ قیامت تو ہے میری شمع تربت کی

سمٹ کر کیوں نہ آجائے ہماری آنکھ کے تِل میں
کہ رشکِ زلفِ جاناں ہی سیاہی شامِ فرقت کی

شبِ فرقت کو دھو دھو کر کیا نورِ سحر پیدا
ہمارے دیدۂ تر نے محبت میں یہ خدمت کی

ہوئے جب خشک آنسو لختِ دِل مژگاں پر آئے ہیں
بڑی مدت میں کچھ نوکِ مژہ کی ہم نے دعوت کی

رقیبِ روسیہ کی بزم میں مذکورِ جاناں ہے
ہوائیں آ رہی ہیں آج کچھ دوزخ میں جنت کی

شرابِ معرفت نے رازِ پنہاں کر دیئے ظاہر
ہماری بیخودی قندیل ہے چرخِ حقیقت کی

وہی تو ہے ہر اک صورت میں جو چمکا تھا ایمن میں
بتوں کی شان میں آیت نکالی ہم نے وحدت کی

خیالِ خام میں کیوں عمر کھوئی حضرتِ زاہد
ابھی بس جاؤ بھی حوریں ملیں گی تم کو جنت کی

جسے دنیا کے دُوں کہتے ہیں اسرارِ معانی ہے
ہر اک ذرہ گواہی دے رہا ہے گنجِ حکمت کی

نظر آئی نہیں آنکھوں کو اب تک واہ ری قسمت
ہمارے دل میں یہ تصویر ہے کس بے مروت کی

نہ چھوٹی بُت پرستی خانۂ کعبہ میں بھی اپنی
نگاہوں میں مری تصویر تھی سجدہ کی آیت کی

زباں والے ہیں گونگے کان والے ہو گئے بہرے
کہیں کس سے نہیں سنتا کوئی باتیں حقیقت کی

نہ سمجھے ہائے مٹی خوار کی ظاہر پرستوں نے
شریعت میں طریقت کی، طریقت میں حقیقت کی

دکھائے ہیں کرشمے اُس کی شانِ بے نیازی نے
تکبر یہ ہوا زاہد کو جب ہم نے عبادت کی

سفارش کیا کسی کی ہو یہاں اعمال تلتے ہیں
ہر اک کے واسطے یکساں ترازو ہے عدالت کی

نہاں بھی ہے عیاں بھی تخم میں ہر نخل کی صورت
ذرا دیکھیں تو کیسی صنعتیں ہیں دستِ قدرت کی

کسی کے در کے سجدوں نے کیا ہی پاک عصیاں سے
مٹا دی ہے جبیں سائی نے سب تحریر قسمت کی

جہاں بیں ہو کے خود بینی کو نظروں سے گرایا ہے
نہاں ہے آنکھ کی پتلی میں اک منزل حقیقت کی

بہم ذرّے ملے صورت بنی جب حضرتِ شیدا
نظر آئی کشش دنیا کی ہر شے میں محبت کی

شیدا صاحب کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ شیدا صاحب دلی کے ممتاز شعرا میں تھے۔ اچھی عمر پائی اور سینکڑوں شاگرد چھوڑے۔ پرانی وضع کے مرنجان مرنج انسان تھے ایسے انسان اب نہیں پیدا ہونگے۔ یہ اُن کی غیر مطبوعہ غزل ہے جو انہوں نے اپنی زندگی میں ہمیں بھیجی تھی۔ (ایڈیٹر)

تفسیر عقیدت

خانصاحب جناب حکیم محمود علی خانصاحب ماہر
اکبرآبادی

مجھکو ہے جملہ مذاہب سے عقیدت ماہر
میرے دل میں ہے ہر اک دین کی [illegible]

جی میں بے مہری و نفرت کی نہیں گنجائش
میری ہستی ہے وہ تفسیرِ محبت ماہر

ہر نبی اور ولی سے ہے مرے دل کو لگاؤ
ہر رشی اور منی سے ہے ارادت ماہر

جن سے ہر باغ ہے اک عالمِ صد تازہ بہار
جن سے ہر پھول ہے اک باغِ عشرت ماہر

مرکزِ لطف تھے جو، مرجعِ اخلاق تھے جو
مصدرِ فیض تھے جو منبعِ راحت ماہر

میں نے ہر اک سے لیا درسِ ہدایت برسوں
میں نے ہر اک سے کیا کسبِ سعادت ماہر

مجھکو پہنچا ہے ہر اک دھرم سے فیضِ باطن
میں نے پائی ہے ہر اک دین سے ہدایت ماہر

لیکن اسلام کا ہوں سب سے زیادہ ممنون
فیض پہنچا ہے مجھے جس سے بکثرت ماہر

مجھ پہ احساں ہیں رسولِ عربی کے لاکھوں
خاص ہی خاص مجھے آپ سے الفت ماہر

غزل

جناب قیسی رام پوری

اپنے آئینِ محبت پر مٹا جاتا ہوں میں
زندگی کو فتح کر کے روز رنگ پاتا ہوں میں

بھول جاتا ہوں عقوبت کو بھی ہنگامِ گنہ
لغزشوں کے تند طوفانوں میں بہہ جاتا ہوں میں

دے رہی ہیں حسرتیں مجھکو پیامِ زندگی
دل کے ہر گوشے میں پنہاں کعبہ پاتا ہوں میں

ہے سکوں کی تشنگی سے آرزوؤں کو فروغ
ہر گھڑی بےچینیوں سے دل کو بہلاتا ہوں میں

موت کو خوابِ سبک کی دے کے تعبیرِ حسیں
زندگی کو زندگی کے پھر قریں لاتا ہوں میں

کلامِ مُلّا

(از جناب آنند نراین مُلّا)

دُنیا کے وہی قصے ہیں مگر عنوان بدلتے جاتے ہیں
فطرت قایم ہے اپنی جگہ انسان بدلتے جاتے ہیں

مابینِ خدا و آدم اِک جنگ چھڑی تھی روزِ ازل
وہ جنگ ابھی تک جاری ہے میدان بدلتے جاتے ہیں

ذرات کے تقاضوں پر پہرے ہیں آج بھی رسم و ایماں کے
قیدی کے فقط بہلانے کو دربان بدلتے جاتے ہیں

شر دھا کے اندھیر گھاٹ پہ بھی اب بھگتوں کی بھگتی وہ نہ رہی
ٹھاکر جی سنبھالو ٹھکرائی ججمان بدلتے جاتے ہیں

ہستی کا سفر ہے طولانی اس میں یکرانی نادانی
جو شاہ رہا ہے پاہر ہیں دوران بدلتے جاتے ہیں

نیکی و بدی کے خانوں کی ہر روز لکیریں مٹتی ہیں
تر تیبِ دُعا کی نظروں کے میزان بدلتے جاتے ہیں

مُلّا کو وفا سے بیگانہ کہتا ہے پیارے بھول تری
ہے سلطنتِ دل اسکی وہی سُلطان بدلتے جاتے ہیں

بے قابو سلام

(از جناب سیکش اکبرآبادی)

ہو گیا اِک دشمنِ جاں سے تصادم آج پھر
زخمِ دل کتنا بچایا میں نے پھر بھی چھل گیا

موجِ بُوئے گُل کہیں آ جائے جیسے ناگہاں
اِس طرح کیفِ محبت جان و دل پر چھا گیا

وہ توجہ کی نگاہیں میرے دل کے واسطے
سانپ کے کاٹے ہوئے کو جیسے ساون کی ہوا

اُس کا وہ تیر از کماں جستہ سا بے قابو سلام
وہ مرا پایا ہوا کھویا ہوا سا مدعا

وہ نظر میں اُسکی لاکھوں سوئے ظن یاس آفریں
میں ہر اک انداز سے سرتا بپا عہدِ وفا

ہر تغافل اس کا میری نا اُمیدی پر دلیل
ہر تبسم اُس کا اُمیدوں کا میری خوں بہا

ہر بہانے سے تبسم، ہر بہانے سے نظر
اِک اَدا سے بے تعلق، اک نظر سے آشنا

کُفر و ایماں ایک مرکز پر سمٹ کر آ گئے
بے نیازی کی نگاہوں میں وہ جلوہ ناز کا

اُس کی طفلانہ اَدائیں لے گئیں مجھ کو کہیں
یا مرا بچپن لباسِ نو بدل کر آ گیا

کیا مرے خوابِ محبت کی تو ہی تعبیر ہے
کیا مرے دل کی صداؤں کا مخاطب تو ہی تھا

واقعات

(از جناب قاضی عباس حسین صاحب ظرافت دہلوی)

بڑھاپے میں سوجھی ہے کیا بوڑھے بس — کہ سر میں لگاتے ہیں وہ عطر خس
خداوند! کیسے ہیں یہ بوالہوس — نہ از ہم غیراز تو فریاد رس
تو ہی عاصیاں را خطا بخش و بس

برائے شکار ایک دن جو گیا — نظر دور سے اک ہرن آگیا
جو نزدیک پہنچا تو تھا تیندوا — کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیر کمند ہُوا

ہرن سے کہا شیر نے سن ذرا — تجھے کھاؤں سارا کہ آدھا، بتا
یہ سن کر ہرن عرض کرنے لگا — سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

کچھ بتا تو کہ مدعا کیا ہے — منہ سے تو پھوٹ چاہتا کیا ہے
کچھ خبر بھی ہے اب بجا کیا ہے — دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

جس گلی میں میں رہتا ہوں وہ ذرا تنگ سی واقع ہوئی ہے۔ وہاں ایک کتے صاحب بیٹھے رہا کرتے ہیں۔ جو غالباً کسی انجینیر کی روح رواں ہے۔ اس لئے کہ ناپ تول کر بیچوں بیچ میں بیٹھتے ہیں۔ اب آپ ہی خیال فرمایئے آنے جانے میں سائیکل لانے، لے جانے میں کیسی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ایک دن غصہ میں آنجناب کے متعلق میرے منہ سے چند کلمے نکل ہی گئے۔ مگر قسمیہ عرض کرتا ہوں مجھے بعد میں جو معلوم ہوا کہ آپ عاشق صادق ہیں (سراپا زرد ہیں) اور سگِ لیلیٰ کی اولاد میں سے ہیں تو بہت ہی رنج ہوا۔ میری سخت کلامی اور اُن کا حسرت بھرا جواب ملاحظہ ہو ؎

میں نے کہا سگِ زبوں غصہ تجھ پہ آئے کیوں
راستہ روک کر یہاں تو نے قدم جمائے کیوں
آنکھوں میں بھر کے اشکِ غم بولا یہاں سے جائے کیوں
لیلیٰ ہوئی ہو جس کی گم دل سے نہ بلبلائے کیوں
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئینگے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

خیر صاحب ـــــ وہ تو کتا تھا چھوٹا سا جانور۔ مصیبت یہ ہے کہ ایک سانڈ صاحب بھی کہیں سے وہاں آن براجتے ہیں۔ چونکہ آپ ماشاءاللہ بھاری بھر کم ہیں ان کے رونق افروز ہونے سے سخت مصیبت کا سامنا ہو جاتا ہے۔ سائیکل حقیقی معنوں میں وبالِ دوش ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر کچھ ایسے طمانیت بھرے دل سے ان سانڈ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں گویا ایک بہت بڑی مہم سر کی۔ سانڈ صاحب سے بھی میں نے ایک دفعہ کچھ عرض کیا تھا اور سچ سچ عرض کرتا ہوں کہ غلط فہمی سے میں نے انہیں بھی عاشق سمجھ لیا تھا۔ ڈیل ڈول کا کچھ خیال نہیں کیا کیونکہ ؎ "فراق یار میں گھل گھل کے ہوگئے ہاتھی" ـــــ سن چکے تھے۔ مگر یہ تو عاشق واشق خاک بھی نہ تھے۔ رند تھے پورے رند۔ ایسا جواب دیا کہ میں اپنا سا منہ لیکر رہ گیا ؎

سانڈ سے میں نے یوں کہا بیٹھئے آپ یاں نہیں
اُٹھئے جناب، آپکے باپ کا یہ مکاں نہیں
کہنے لگا نہیں نہیں، اُٹھتے نہیں ہیں۔ ہاں نہیں
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

بادۂ سرجوش

(از جناب ساغر جلیلی بی، اے)

بے نیازِ غمِ ایام سے پیئے جاتا ہوں
روز و شب اور سحر و شام پیئے جاتا ہوں

کچھ اگر ہوش مجھے ہے، تو فقط اتنا ہی
سامنے ہے مئے گلفام پیئے جاتا ہوں

پھر ان آنکھوں سے چھلکتی ہے محبت کی شراب
پھر ہیں وہ مائلِ اکرام پیئے جاتا ہوں

بادۂ بیخودیٔ شوق کو طے کرنا ہے
مَے بہر لحظہ، بہر گام پیئے جاتا ہوں

گردشِ چرخ فسانہ سی ہوئی جاتی ہے
جامہائے سحر و شام پیئے جاتا ہوں

ارتقاء پر ہے مرا مشربِ صہبا نوشی
باندھ کر جامۂ احرام پیئے جاتا ہوں

بے غم و کاہشِ آغاز، بسر کرتا ہوں
بے غم و کاہشِ انجام پیئے جاتا ہوں

مستیاں تیر رہی ہیں نگہِ ساقی میں!
دَور میں ہے مئے گلفام پیئے جاتا ہوں

تلخیٔ بادۂ آلامِ زمانہ معلوم!
ہوں بلا نوش و غم آشام پیئے جاتا ہوں

دیکھنے کے لئے تعیینِ گناہ و بخشش
روز و شب جام پہ میں جام پیئے جاتا ہوں

ترکِ مَے خلد کے دھوکے پہ ہے نادانی شیخ!
یہیں حاصل ہیں مے و جام پیئے جاتا ہوں

کفر ہے محفلِ ساقی میں تمیزِ مَے و دُرد
جیسے ہوتا ہے عطا جام پیئے جاتا ہوں

رُوحِ فطرت کی بھی سرشار ہوئی جاتی ہے
آج یوں جام پہ میں جام پیئے جاتا ہوں

مَے ہے انوار کی اک موج، ہیں روشن جس سے
میری رُوح و دل و ایام پیئے جاتا ہوں

زندگی کروٹیں لیتی ہے خُم و مینا میں
مَے جوانی کا ہے پیغام پیئے جاتا ہوں

سنتِ حافظ و خیام ہے صہبا نوشی
پیر و مُرشد کا ہے پیغام پیئے جاتا ہوں

مَے ہے میرے لئے کونین کا حاصل ساغرؔ
مَے سے ہے شام و سحر کام پیئے جاتا ہوں

غزل

(از جناب نعمان تاثیر)

انکے جلووں کی تمنا کیا کریں — کیوں مذاقِ دید کو رسوا کریں
یوں محبت میں اثر پیدا کریں — وہ ہمیں اور ہم انہیں دیکھا کریں
وہ تو کیا، ہو مضطرب کل کائنات — دل میں اک ایسی تڑپ پیدا کریں
ہم بھی پرتو ہیں کسی کی ذات کا — کیوں نہ اپنی ذات کو سجدہ کریں
دیکھ ہی لیگی نگاہِ شوق انہیں — جسقدر بھی آنکھ سے وہ پردا کریں
سوچ لیں وہ اپنی حسرت کا مآل — دل کی دنیا پھر تہ و بالا کریں
مسکرائے جا یونہی تو عشق میں — لاکھ شعلے قلب سے اٹھا کریں
اسقدر روئیں کسی کی یاد میں — قطرہائے اشک کو دریا کریں
ہے یہی معراج سیلابِ الم — بحرِ غم میں ڈوب کر ابھرا کریں
وقتِ رخصت کانپنے لگتا ہے دل — یوں نہ وہ مڑ مڑ کر ہمیں دیکھا کریں
دل کو خوفِ طعنۂ اہلِ حرم — روح کہتی ہے انہیں پوجا کریں
کر سکے اُن سے نہ شرحِ آرزو — بیخودی تو ہی بتا اب کیا کریں

طور پر جا کر نہ کیوں تاثیر ہم
پیروی شیوۂ موسےٰ کریں

ساقی!!

(از جناب اشعر ملیح آبادی)

مچا ہے بزم میں کہرام ساقی — اُلٹ دے چرخِ نیلی فام ساقی
قسم ہے تجھ کو ایسا جام ساقی — کہ ہشیاری نہ آئے کام ساقی
دہاں پر آیا کس کا نام ساقی — فضائیں گونج اُٹھیں [illegible] ساقی
پلا دے اس طرح ترسوں جام مے کو — یہ سب گردشِ ایام ساقی
یہی دل کی تمنا ہے کہ ہونا — ترے ہونٹوں میں میرا نام ساقی
پلا جسوقت بھی ممکن نظر آئے — نہ کر تخصیصِ صبح و شام ساقی
یہ میرا شوق اور یہ تشنہ کامی — تری رحمت [illegible] جام ساقی
زمیں سے آسماں تک چھا گیا کیف — مجھے بھی اک چھلکتا جام ساقی
مجھے تو دُزدِ پیمانہ ہی دیدے — ترا ہوں بندۂ بے دام ساقی
رگوں میں زندگی کی موج دوڑی — ملا اب جا کے کچھ آرام ساقی
یہ موسم اور مے نوشی اکیلے — کہاں ہے میرا خوش اندام ساقی
مزا جب ہے کہ زاہد رقص فرمائے — پہن کر جامۂ احرام ساقی
عجب کیفیتِ دل ہو رہی ہے — برستی ہے مئے الہام ساقی
میں بدمست ہوں یہ تہمت ہرگز نہیں ہوں — غلط مجھ پر ہے یہ الزام ساقی

کہاں پہنچا دیا اک جام مے نے
رہے تا حشر تیرا نام ساقی

غزل

(جناب رضوی خیرآبادی)

مجھے مشکل میں یوں اندازۂ مشکل نہیں ہوتا
کبھی میں کثرتِ افکار سے بددل نہیں ہوتا

اگر ہونا پڑے منت کشِ امواج بھی مجھ کو
تو پھر میری خودی کو کچھ غمِ ساحل نہیں ہوتا

نہیں کچھ پاسِ غیرت جس کو اس کا ذکر ہی کیا ہے
جو غیرت مند ہے وہ در بدر سائل نہیں ہوتا

جھکا کرتی ہیں وہ شاخیں جو ہوتی ہیں ثمر پرور
وہی ہوتا ہے خودسر جو کسی قابل نہیں ہوتا

لہو کی تیرے ہر ہر بوند فریادی ہے گو بسمل!
مگر قاتل کے منہ پر شکوۂ قاتل نہیں ہوتا

دلِ ناکام پھر لے کام ذوقِ سعیٔ پیہم سے
کفِ افسوس ملنے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا

یقیناً مقصدِ تخلیق کو سمجھا ہوا ہے وہ
فرائض سے کبھی جو آدمی غافل نہیں ہوتا

جو دور اندیش ہیں کوتاہ اندیش اس کو کہتے ہیں
جسے عمرِ رواں میں فکرِ مستقبل نہیں ہوتا

وہ انساں ہے ملک سجدے گزاریں جس کے دامن پر
وہ ذرہ کیا جو ہم دوشِ مہِ کامل نہیں ہوتا

جو روتے دیکھکر ہر ہر قدم پر پاؤں کے چھالے
کبھی وہ راہرو آسودۂ منزل نہیں ہوتا

مرا سوزِ دروں، میری نوا کا فیض ہے رضوی
ترا ہونا تو وجہِ گرمیٔ محفل نہیں ہوتا

غزل

(جناب فاروق محشر بدایونی)

میں اور اُن کا وصف یہ میری زباں کہاں
اِک ذرّہ حقیر کہاں آسماں کہاں

ہم بندگانِ عشق میں ذکرِ فغاں کہاں
یہ آگ تو خموش ہے اس میں دھواں کہاں

ہر شاخ ہے بجائے خود اک برقِ بے اماں
تعمیر ہم چمن میں کریں آشیاں کہاں

ہر غم میں، ہر کشاکشِ ہستی میں، نزع میں
بخشی ہے اُن کی یاد نے تسکیں کہاں کہاں

یہ رات، یہ سکوت، یہ غربت، یہ بے بسی
ایسے میں مجھ کو چھوڑ کے اے مہرباں کہاں

وہ اِس گماں سے چُپ کہ کسی سوچ میں ہیں ہم
ہم اس یقیں میں گم کہ بھلا وہ یہاں کہاں

پھولوں میں، کہکشاں میں، ستاروں میں، چاند میں
فرما رہے ہیں آپ تبسم کہاں کہاں

میں بھی اداس، تم بھی پریشاں، بجا درست
لیکن مری جبیں پہ یہ تابانیاں کہاں

محشر یہ سب اُنہیں کی محبت کا فیض ہے
ورنہ یہ شاعری، یہ غزلخوانیاں کہاں

ترکِ مروت

(از جناب [illegible])

(۱)

میں جو یوں نالہ کشِ دردِ سوا ہوتا ہوں ۔۔۔ بزمِ ہنگامۂ عالم سے جدا ہوتا ہوں
عشرتِ سحر بہاری سے خفا ہوتا ہوں ۔۔۔ میں جو لذت کشِ آلام و جفا ہوتا ہوں

ہمنشیں! یہ روشِ "ترکِ مروت" کیوں ہے؟
نفرت انگیز صدائے دلِ الفت کیوں ہے؟

(۲)

کیا کہوں کیوں نہ میں ترجیح دوں مر جانے کو ۔۔۔ "شمع" کیوں جلتا نہ دیکھے پروانے کو
"صبر" بے رنگ کیا کرتا ہے انسانے کو ۔۔۔ "ضبط" بے پردہ کیا کرتا ہے دیوانے کو

ہمنشیں! مجھ کو مرے شکوہ کی پروا کیوں ہو؟
چشمِ پرشوقِ نظارا ہی سے پردا کیوں ہو؟

(۳)

مجھ کو آلامِ غمِ دہر سہے جانے دے ۔۔۔ چشمِ خونریز کو مت اشک بہے جانے دے
قصۂ کربِ بلا مجھ کو کہے جانے دے ۔۔۔ اپنی قسمت پہ میں ہنستا ہوں ہنسے جانے دے

ہمنشیں! دیکھنا پرواہ نہ کرنا میری
میں ہوں تخریب وہ چاہ نہ کرنا میری

(۴)

ہمنشیں! مجھ سے "مروت" کا طلبگار نہیں ۔۔۔ "مردہ ہوں" مردِ نوازش کا طلبگار نہیں
خواہشِ پرسشِ حالات زباں کار نہیں ۔۔۔ "موت" دشوار ہی، زندگی دشوار نہیں

ہمنشیں! دیکھنا یوں "رنگِ مروت" رکھنا!
مجھ سے نفرت ہی مری "جانِ محبت" رکھنا!

(۵)

چارہ سازِ دلِ مجروح نہ ہونا ہرگز ۔۔۔ اپنی خودداریٔ فطرت کو نہ کھونا ہرگز
لذتِ "دردِ اخوت" کو نہ رونا ہرگز ۔۔۔ داغِ نفرت مئے الفت سے نہ دھونا ہرگز

نسلِ آدم نہ کہیں تیری تماشائی ہو
اور مری "موت" تری باعثِ رسوائی ہو

دوست!

(از جناب انجم نہارسی بی، اے (علیگ)

کچھ مری زندگی یوں موردِ آلام ہے دوست! سنتا ہوں تیرا کرم ان دنوں کچھ عام ہے دوست!
میری آنکھوں کا یہ آنسو تو نہیں قطرۂ آب دلِ خاموش سے نکلا ہوا پیغام ہے دوست!
فصلِ گل بعدِ خزاں آئی ہے گلشن میں مگر زندگی میری ازل ہی سے یوں ناکام ہے دوست!
لوگ کہتے ہیں کہ کھویا ہوا رہتا ہوں میں میری خاموش محبت پہ یہ الزام ہے دوست!
اب وہ احساس نہیں اور وہ طبیعت نہ رہی پھر بھی ہر وقت مرے لب پہ ترا نام ہے دوست!
آج آنکھوں سے جو دل بہہ گیا بن کر آنسو میری بے چین طبیعت کو بھی آرام ہے دوست!
بیوفائی نے بدل دی تری فطرت میری اب وفا بھی تو مرے واسطے آلام ہے دوست!

کیوں یہ بیتابی، یہ افسردہ دلی ہے انجم
اسی باعث تو محبت تری بدنام ہے دوست!

غزل

جناب راغب لکھنوی

مرے دل کی الجھن بڑھا دینے والے وفاؤں کا اچھا صلا دینے والے
بری یا بھلی خیر، گذری شبِ غم سلامت رہیں آسرا دینے والے
کہیں حرف نہ آئے نہ رحمت پہ تیری سمجھ بوجھ کے او سزا دینے والے
ستم ڈھا دیا آمدِ فصلِ گل میں نشیمن کو میرے جلا دینے والے
ذرا آنکھ تو کھول بیمارِ الفت دعا دے رہے ہیں دعا دینے والے
کرم کی ذرا اک نظر پھر ادھر بھی کھٹک درد دل کی بڑھا دینے والے
تجھے کیا خبر کیا گذرتی ہے دل پر نگاہوں سے اپنی گرا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر مرے حال پر مسکرا دینے والے
جہاں تو نے میری وفائیں بھلا دیں بھلا دے تجھے بھی بھلا دینے والے
مٹا دے نشانِ لحد بھی مٹا دے مرے دل کی دنیا مٹا دینے والے

کہیں اپنی منزل سے ہٹنا نہ راغب
کہ پھر آ رہے ہیں، بھلا دینے والے

صوفیٔ ہند

(از جناب کرنل مجید ملک صاحب ۔ ایم ، بی ، ای)

صوفیٔ ہند نے اک روز مریدوں سے کہا
آج حلقہ میں کوئی شخص نہ آنے پائے

آج ہم ایسے وظائف میں رہیں گے مصروف
جن سے دنیا کے شرف اہلِ صفا نے پائے

جن سے سلمانؓ و اویسؓ قرنی زندہ ہیں
جن سے بوذرؓ نے تصوف کے خزانے پائے

ہم کو ہرچند سماع اور غنا ہیں مرغوب
آج لیکن کوئی قوال نہ گانے پائے

صحن مسجد میں کسی قسم کی آواز نہ ہو
جو ہمیں چاہتا ہے لب نہ ہلانے پائے

بلکہ بہتر ہے کہ مسجد سے نکل جائیں سب
تا کہ یکسوئی میں کچھ فرق نہ آنے پائے

یہ سنا حکم مریدوں نے تو مسجد سے چلے
اور یہ ٹھیری کہ کوئی آنے نہ جانے پائے

میں نے اک کونے سے اٹھکر بجسارت یہ کہا
قبل اس کے کہ کوئی مجھکو اٹھانے پائے

حضرتِ شیخ اجازت ہو تو کچھ عرض کروں
ہاں مگر بل نہ جبیں پر کوئی آنے پائے

صوفیٔ ہند کجا بوذرؓ و سلمانؓ کجا
صیدِ اوہام کجا صاحبِ ایقان کجا

آپ کوشاں کوئی مسجد میں نہ آنے پائے
اور وہ کوشاں کوئی مسجد سے نہ جانے پائے

نذرِ اقبال

از خطیبۂ ہند، زہرۂ سخن سیدہ اختر صاحبہ

سرِ طور جلوہ کبھی ترا، کبھی لامکاں کے فراز میں   کبھی بزمِ گنجِ حرا تری، کبھی ریگ زارِ حجاز میں
مرے شوقِ دید پہ رحم کر، کہ مزہ نہیں کوئی راز میں   کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

وہ جنوں کیا؟ کہ نفس نفس جسے بے قراری ہوش ہو   وہ نشاطِ بادہ و جام کیا؟ کہ جس میں کچھ بھی نہ جوش ہو
ہے سرشتِ شوق کا مقتضا کہ نہ ایک لحظہ خموش ہو   طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا؟ جو چھپا ہوا ہے سکوتِ پردۂ ساز میں

تو اُٹھا اُٹھا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ   تو چھپا چھپا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
تو غلاف اوڑھا کے دھر لے اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ   تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکست ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

تری بات میں نہ اثر رہا، نہ سخن میں دلکشیِ سخن   ہے ستم کہ ٹوٹ کے رہ گیا وہ طلسمِ گرمیِ انجمن
نہ تری ہی آنکھ میں اشک ہیں نہ مرے ہی دل میں کوئی لگن   دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں نہ مری حدیثِ گداز میں

تری چشمِ ناز کا آسرا، مرے اضطراب کی بے دلی   کہ بغیر بادِ سحر چمن میں نہ کوئی تازہ کلی کھلی
مری شاخِ خشک بھی جھوم اٹھی، وہ ہوائے لطف و عطا چلی   نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

عجب انقلابِ زمانہ ہے، ہیں تغیرات رواں دواں   نہ وہ ربط ہے نہ وہ ضبط ہے، نہ وہ ارتباط ہے درمیاں
نہ مرے ہی پاس گدازِ دل، نہ تری نگاہ میں نرمیاں   نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

میں ہجومِ شوق میں کھو گیا، یہ مرا قصور، مری خطا   تری بندگی مری جان تھی، ہوا بندگی کا نہ حق ادا
مگر اے کرشمۂ سرمدی مجھے رازِ خاص تو یہ بتا   جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

خوابِ شیریں

(از جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی)

بیداری میں ہم نے تم نے اک خوابِ شیریں دیکھا تھا
بکھرے تھے جو میرے بازو پر کچھ یاد ہے کسکے گیسو تھے

کس نے میری آنکھوں پر پھولوں کا مینہہ برسایا تھا
آسودہ میرے ہونٹوں پر وہ کس کے لعلِ دل جو تھے

وہ کسکے گریباں سے میں نے مہتاب نکلتے دیکھا تھا ؟
بھولا نہیں دل جنکی گرمی، وہ کسکے سیمیں بازو تھے

گنجینۂ گوہر پر میں نے جب کی تھیں محبت کی مہریں
شرما شرما کر سمٹے تھے، وہ کسکے ہلالی ابرو تھے

یوں ناز و تمنا تھے باہم جیسے دو ندیوں کا سنگم
دل سنتا تھا دل کی دھڑکن کچھ قرب کے ایسے پہلو تھے

ہنگامِ رخصت کا تم کو، وہ عالم بھی کیا یاد نہیں؟
لب خشک تھے اور پُرنم آنکھیں سینوں میں دل بے قابو تھے

تا حدِّ نظر اک دیوانہ، مڑ مڑ کر تکتا جاتا تھا
اُس جانب حسرت سے نگراں، دو سہمے سہمے آہو تھے

کب تک کوئی دل کا خون کرے، اچھا ہی کیا تم بھول گئے
اِس یاد میں رکھا ہی کیا تھا کچھ آہیں تھیں کچھ آنسو تھے

پوچھئے !

ساون کی رُت میں کیفِ فراواں نہ پوچھئے
ہر ذرّہ ہے جوابِ گلستاں نہ پوچھئے

پھر پیچ و خم ہیں کاکلِ مشکیں میں قہر کے
اُٹھا ہے کوئی فتنۂ دوراں نہ پوچھئے

سرشاریوں میں مست ہے طوفانِ آرزو
مینا بکف ہیں دست سروشاں نہ پوچھئے

رندوں کی خشتِ خم پہ جبینِ نیاز ہے
کیسا ہے جوشِ سجدۂ مستاں نہ پوچھئے

پھر زندگی کے ساز پہ نغمے ہیں مست مست
ہر شعر میں ہے شرحِ دل و جاں نہ پوچھئے

پھر ولولوں میں جوشِ تمنا میں ہے اُمنگ
پھر سج گئے ہیں زیست کے طوفاں نہ پوچھئے

ناقابلِ بیاں ہے تصور کی کیفیت
بنتا ہے کوئی نزدِ رگِ جاں نہ پوچھئے

میخانہ میں ہے جعفر کعبہ نشیں بھی آج
للہ جذبِ حلقۂ رنداں نہ پوچھئے

از
ب جعفر شیرازی

غزل

اُفق پہ ہیں بادل سُہانے سُہانے
نگاہوں کی حد تک ہیں رنگیں فسانے

فریب آج پھر کھا لیا ہے وفا نے
بہت خوبصورت تھے اُنکے بہانے

ستاروں نے سیکھا ہے دل سے تڑپنا
کہاں سے کہاں تک گئے ہیں فسانے

بہاروں کا موسم تبسم تبسم
جوانی کے لمحے سُہانے سُہانے

مری سادہ لوحی پہ لہرا رہے ہیں
کسی کے شگفتہ شگفتہ بہانے

محبت کی آنکھیں کہیں بھر نہ آئیں
نہ چھیڑ اے دلِ زار غم کے فسانے

ب حسرت صحرائی

افکارِ عالی

(از جناب عالی لکھنوی)

خدائے حسن نے بندہ کو اپنی بندگی دیدی
جو معراجِ الفت ہو گئی پیغمبری دیدی

جگر میں زخم، دل میں درد، آنکھوں میں نمی دیدی
نئے سرے مجھے قاتل نے گویا زندگی دیدی

مذاقِ عشق یہ بھی تیرا اک ادنیٰ کرشمہ ہے
جسے اپنا بنایا تو نے اُسے بیگانگی دیدی

ترے فیضِ قدم سے صحنِ گلشن لہلہا اُٹھا
تری نظروں نے مرجھائے گلوں کو تازگی دیدی

چھپے بیٹھے تھے جنکی آڑ لیکر ہم نشیمن میں
اُنہیں پتوں نے ہٹ کر بجلیوں کی روشنی دیدی

ازل کے دن مجھے اک دل دیا اور وہ بھی مانگے گا
سمجھکر قرضِ حسنہ چار دن کی چاندنی دیدی

مسیحائی کا دم بھرتا ہوا نکلا جو وہ قاتل
حیاتِ عارضی لے لی، حیاتِ دائمی دیدی

کسی کا کیا اجارہ اس میں عالی اپنی قسمت ہے
محبت نے مجھے اپنا سمجھکر بے خودی دیدی

گلِ نسترن

(ایک پیکرِ سیمتن کے نام)

(از محترمہ م رضویہ)

اے گلِ نسترن!
زیبِ صحنِ چمن
جانِ رنگ و ضیا، کیفِ سرو و سمن
تجھ پہ صدقے ہیں باغِ جہاں کی پھبن
رشکِ حورِ عدن
نوبہارِ وطن

اے گلِ نسترن!
روحِ شعر و سخن

سن ذرا اے سراپائے حسن و جمال
دستِ صناعِ قدرت کے رنگیں کمال
تجھ سے شاداب ہے میرا باغِ حیات
اے مری زندگی! اے مری کائنات!
میری فکرِ تغزل کے پروردگار
باغِ تخیل ہے تیرے دم سے بہار
تیری نکہت سے مہکی مری زندگی
اور ملی زندگی کو حسیں روشنی
ہے دعا تو یونہی مسکراتا رہے
مسکراتا رہے، کھلکھلاتا رہے

جرمِ اُلفت (ایک سانیٹ)

(از جناب نوؔر بجنوری)

(ماضی کے حسین لمحو! یہ نظم تمہارے نام ہی کیوں نہ معنون کردوں)

ہائے وہ دن جب شگفتہ تھا تخیل کا چمن

جب تری معصوم آنکھوں میں حجاب آیا نہ تھا

جب تری سادہ جوانی پر شباب آیا نہ تھا

دیکھ سکتی تھی نہ جب تو میرے ماتھے پر شکن

ہم سنوں سے اپنی تجھکو کوئی رغبت ہی نہ تھی

تجھ سے تھے تیرے آذرے مرکنوں کے ساتھ

تیرے کنگن سے سجا کرتے تھے اکثر میرے ہاتھ

تجھکو میرے پاس سے اُٹھنے کی عادت ہی نہ تھی

اور اب تجھکو ہے میری زندگی بھی ناگوار

میرے سوزِ دل سے میری چشمِ نم سے خفگیاں

مجھ سے میری شاعری سے میرے غم سے خفگیاں

اب مگر پردیس ہی رہنے سے ہے تجھکو قرار

کہکشاں زاروں کی حسرت کوئی بدعت تو نہیں!

جرمِ اُلفت کی سزا محبوب! نفرت تو نہیں!!

عشق کی مجبوریاں

(از جناب شاہد دہلوی)

ترے نزدیک ہوتے ہیں تجھ سے دُور ہوتے ہیں
محبت کرنے والے کس قدر مجبور ہوتے ہیں

خدا نے خوگرِ رنج و الم ایسا بنایا ہے
مصیبت کوئی آتی ہے تو ہم مسرور ہوتے ہیں

جو خوشیاں عشق میں ملتی ہیں جانِ زیست ہوتی ہیں
جو صدمے بخشتے ہو تم سبھی منظور ہوتے ہیں

زباں خاموش رہتی ہے نگاہیں کام کرتی ہیں
مسلّم ہے اُن کی محفل کے عجب دستور ہوتے ہیں

ترے در پر جنہیں ہوتا ہے سجدوں کا شرف حاصل
وہ اپنی انکساری پر بہت مغرور ہوتے ہیں

ہوائے عشق نے چھیڑا نہیں ہے جن کے دامن کو
حدودِ غم سے وہ انسان کوسوں دُور ہوتے ہیں

نہ چھوڑا دار پر منصور نے کہنا انا الحق کا
تمہارے چاہنے والے بڑے مغرور ہوتے ہیں

جفا بے اختیارانہ، وفا بے اختیارانہ
نہ تم مجبور ہوتے ہو، نہ ہم مجبور ہوتے ہیں

کوئی دیکھے تو ذوقِ جستجو کی انتہا شاہدؔ
کہ منزل پر بھی ہم منزل سے کوسوں دُور ہوتے ہیں

کیمیاوی طریقے سے خوراک کو بہتر بنانے کے انتظامات

درآمدوں کی وجہ سے بہتر غذائی صورت حال

ذخیروں کو محفوظ کرنے کے سائنسی طریقے

دوران جنگ میں غلوں کی قیمتیں بھی نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھیں اس کی روک تھام کیلئے حکومت نے غلوں کی فراہمی۔ تقسیم اور قیمتوں پر کنٹرول قائم کیا۔ نیز غلوں کے بڑے بڑے ذخیرے جمع کرنے اور ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کیلئے نقل و حمل کے مناسب انتظامات کئے۔ تاکہ قلت والے علاقوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور مقامی قلتوں کی وجہ سے قحط نہ پڑنے پائے۔ اس کے علاوہ فالتو مقدار میں جمع کرنے اور منصفانہ تقسیم کے لئے راشن بندی بھی کرنی پڑی۔ جنگ ختم ہوگئی مگر ابھی تک حالات اعتدال پر نہیں آئے۔ کنٹرول کا سارا انتظام یکایک ختم کر دینے سے لوگوں کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں غلوں کی سخت قلت ہے جس کے انسداد کے لئے اتحادیوں نے واشنگٹن میں خوراک کا مشترکہ بورڈ قائم کیا ہے۔ دنیا بھر کی پیداوار اور اس کی نقل و حرکت دیر میں اعتدال پر آئے گی اس اثنا میں ضروری ہوگا کہ یہ بورڈ تمام دنیا میں مناسب طریقے سے خوراک تقسیم کرتا رہے۔ کیوبک میں متحدہ اقوام کی جو خوراک کانفرنس حال میں منعقد ہوئی ہے اس نے خوراک کی ایک عالمگیر اسکیم مرتب کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ قوموں کو نسل و رنگ کے امتیاز کے بغیر امداد دی جائے۔ اور ان کی غذائی ضروریات پوری کی جائیں۔ اس سلسلہ میں حلقہ وار ادارے قائم کئے جائیں گے اور ممکن ہے کہ حلقہ وار ادارہ ہندستان میں بھی قائم ہو جائے اس عالمگیر نظام کے ساتھ وابستہ رہنے سے ہندستان کو زبردست فوائد حاصل ہونگے۔

بہتر صورت حال

اب ملک میں فالتو غلے کی ذخیرہ گاہیں قائم کر دی گئی ہیں اور ذخیرے بھی موجود ہیں جو آج کل استعمال کئے جا رہے ہیں۔ اور جن صوبائی حکومتوں نے اپنی راشن بندی کی اسکیموں کیلئے جمع کیا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کے ان فالتو ذخیروں میں بھی ہندستان کا حصہ ہے جو خوراک کے مشترکہ بورڈوں کے پاس موجود ہیں۔ گو گذشتہ دو سال میں ہندستان ساری مطلوبہ مقدار نہیں منگوا سکا لیکن نقل و حمل اور تقسیم کے بہتر انتظامات کی وجہ سے خوراک کا عام معیار کم نہیں ہونے پایا۔

یہ بات بھی خاص اہمیت رکھتی ہے کہ دفاعی فوجوں کے مطالبات میں کمی ہو رہی ہے۔ اور اب اندرون ملک میں ریلوں کے ذریعے مال بھیجنا پہلے کی بہ نسبت زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ راشن بندی کے انتظامات بہتر ہوگئے ہیں۔ اور کئی سال کے بعد چاول کی درآمد شروع ہوگئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں ہندستان، برما اور سیام سے ۰۰۰۰۰، ۱ ٹن چاول حاصل کرسکتا ہے اور اس کے لئے ضروری انتظامات ہو چکے ہیں۔ پھر ہندستان کو واشنگٹن کے مشترکہ غذائی بورڈ کی طرف سے ۱۹۴۶ء میں چاول کی جو مقدار ملنے کی توقع ہے وہ ۰۰۰۰، ۱۷ ٹن کی اس مقدار سے جو ہندستان کے لئے پہلے مقرر ہو چکی ہے بہت زیادہ ہوگی۔ اس کے علاوہ ۱۰ لاکھ ٹن گیہوں درآمد کیا جا چکا ہے۔ اس طرح اب قلت والے علاقوں کی ضرورتیں بھی بہتر طریقے سے پوری ہوسکیں گی۔

قیمتوں کا کنٹرول اور راشن بندی

غذائی کنٹرول کے لئے قیمتوں کا کنٹرول لازمی ہے۔ لہذا غلوں کی قیمتیں نہایت احتیاط کے ساتھ مقرر کر دی گئی ہیں۔ حال میں چاول کی انتہائی قیمتوں میں خاص کمی ہوئی ہے۔ راشن بندی کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۵۳۲ شہروں میں راشن بندی ہو چکی ہے جن کی مجموعی آبادی ۵ ½ کروڑ ہے۔ اس کے علاوہ مادکس، بچوں اور صنعتی مزدوروں کے لئے خاص انتظامات کئے گئے ہیں۔

یکم دسمبر کو ختم ہونے والے ہفتہ میں اشیائے خوراک کی ہفتہ وار

ورکنگ کلاس کے متعلق اقتصادی مشیر کا اشاریہ ۲۴۷ء۲ نکلا ہے۔
س کے مقابلہ میں پچھلے ہفتہ کا اشاریہ ۲۳۴ء۵ تھا (بنیاد اگست ۱۹۳۹ء
کا آخری ہفتہ = ۱۰۰)

ذخیرہ گاہیں

راشن بندی کی کامیابی کا ایک سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ
اجناس کی فالتو مقداروں کو سائنس کے اصولوں کے مطابق محفوظ رکھنے کے انتظامات
کئے گئے ہیں اور منڈیوں، ریل کے سروں اور صرف کے مرکزوں میں عارضی اور مستقل
ذخیرہ گاہیں قائم کی گئی ہیں۔ پیداوار کے علاقوں میں بھی بڑے بڑے ذخیرے گاہیں قائم
کی گئی ہیں۔ پیداوار کے علاقوں میں بھی بڑے بڑے ذخیرے رکھے جاتے ہیں اور معائنہ
کیلئے سرکاری انتظامات کئے گئے ہیں۔ ایک اسکیم کے ماتحت مرکزی حکومت اور
صوبائی حکومتیں ذخیرہ گاہیں قائم کر رہی ہیں اور نجی ذخیرہ گاہوں کی تعمیر میں بھی
امداد دی جا رہی ہے۔

بہتر خوراکیں

قحط کے تحقیقاتی کمیشن کی تجویز کے مطابق انسداد قحط کے علاوہ خوراکوں کو
بہتر بنانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ چنانچہ خوراک میں ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا ہے اور
ماہرین کے اشتراک عمل کے ساتھ غذاؤں کو طاقتور بنانے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔
خوراکوں کو کیمیاوی طریقوں سے محفوظ کیا جائیگا۔ مثال کے طور پر مچھلی ہی کو لیجئے
اسے برف کے ذریعہ جمایا جا سکتا ہے، خشک کیا جا سکتا ہے۔ نمک لگا کر محفوظ کیا جا سکتا ہے
اور اسکا سفوف ٹینوں میں بند کیا جا سکتا ہے۔ اس سے لیور آئل بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں جو
ماؤں اور بچوں کیلئے خاص طور پر مفید ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ مچھلی کی آنتوں اور ضمنی
پیداواروں سے کھادیں تیار کی جا سکتی ہیں تاکہ "زیادہ خوراک پیدا کرو" کی مہم کو فروغ حاصل
ہو۔ پھلوں، دودھ اور ترکاریوں کے بارے میں بھی کیمیاوی طریقے اختیار کئے جائینگے
روٹی یا آٹے کی طاقت بڑھانے کیلئے دودھ کا سفوف یا خمیر استعمال کیا جائیگا۔ اور حیاتین کے
مرکبات تیار کئے جائینگے۔ ترکاریاں خشک کرنے کی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش بھی
کی جا رہی ہے۔

اس مقصد کیلئے منظم کوشش کی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے زراعت اور مویشی بانی
کے بورڈ نے فصلوں اور زمینوں کا ایک شعبہ قائم کر رکھا ہے۔ اسکا چھٹا اجلاس نئی دہلی میں
منعقد ہونیوالا ہے جو اس قسم کے مسائل پر غور کریگا۔ آبپاشی کے ذریعہ کاشت، خوراک کی پیداوار
بڑھانے کے طریقے، پھلوں اور ترکاریوں کی کاشت۔ دودھ والے اور دوسرے جانوروں کی نسل میں
اضافہ، زراعت میں مویشیوں کا استعمال، پودے اگانے کے فن کی ترقی اور بیج کی تعداد میں
اضافہ۔

اشتہار زیر دفعہ ۵۔ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی

بحکم جناب سید بشیر احمد صاحب بخاری اسسٹنٹ کلکٹر درجہ اول
جگادھری ضلع انبالہ

رام ایشور داس بالغ و نند لال نابالغ بہ رفاقت رام ایشور داس
برادر حقیقی خود پسران جھنڈو لال ویش جگادھری سائلان

بنام

جہانگیر و محمد شفیع پسران فضلا و فرزندا پسر باسط علی و مسیتا پسر نامعلوم
راجپوت سکنا و کھیڑی رنگھڑان تحصیل جگادھری مسئول علیہم

درخواست برائے تقسیم حصہ سائلان از مشترکہ اراضی تعدادی ۱۷ ماسگہ
کھیوٹ ۱۷/۱ زیر دفعہ ۱۱۱۔ ایکٹ مالگذاری پنجاب

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں جہانگیر و محمد شفیع پسران فضلا وغیرہ
مذکور تعمیل سمن سے دیدہ و دانستہ گریز کرتے ہیں اور روپوش
ہیں۔ اس لئے اشتہار ہذا بنام جہانگیر و محمد شفیع پسران فضلا
و فرزندا پسر باسط علی و مسیتا پسر نامعلوم راجپوت سکنا و کھیڑی
رنگھڑان تحصیل جگادھری مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہم
مذکور تاریخ ۸ ار فروری ۱۹۴۶ء کو مقام جگادھری حاضر عدالت
ہذا نہیں ہونگے تو اس کی نسبت کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاویگی

آج بتاریخ ۵ ر فروری ۱۹۴۶ء کو بدستخط میرے اور مہر
عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط
(بخط انگریزی)

ہندوستان میں آبپاشی اور برقابی کی ترقی

آبپاشی کا مرکزی بورڈ

آبپاشی کی متعدد اسکیموں کی اہمیت

صوبہ متحدہ کی شاردا اسکیم

ہندوستان کا آبپاشی کا نظام دنیا بھر میں سب سے زیادہ عظیم الشان ہے۔ پنجاب، سندھ کی آبپاشی کی اسکیموں کو زبردست کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ لیکن اب تک آبپاشی کی ترقی کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے وہ ملک کی وسعت کے لحاظ سے بہت تھوڑا ہے اور اس سلسلے میں ہنوز بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد جنگ کی تعمیر جدید کی اسکیموں کے تحت آبپاشی کی طرف بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے۔

آبپاشی کی ترقی میں آبپاشی کے مرکزی بورڈ نے نہایت اہم حصہ لیا ہے۔ وہ ۱۹۲۷ء میں "چیف اریگیشن انجینیروں کے پینل" کے نام سے قائم ہوا ہے۔ ۱۹۳۱ء سے یہ بورڈ صوبوں اور تحقیقاتی مرکزوں کے درمیان گہرا تعلق رکھنے کا فرض انجام دے رہا ہے۔ اس کے کتب خانہ میں ہندوستان اور بیرونی ممالک کی آبپاشی کے متعلق جدید ترین لٹریچر کا کافی ذخیرہ موجود ہے جس سے سارے ملک کے آبپاشی کے افسر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس نے ایک شعبۂ اطلاعات بھی قائم کر رکھا ہے جو بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ آبپاشی کے محکمہ کے علاوہ دوسرے محکمے بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اب اس بورڈ میں توسیع کر دی گئی۔ چنانچہ اس کے ارکان میں برقابی کے محکموں کے چیف انجینیر اور حکومت ہند کے چیف انجینیر (جو ہندوستان کے آبی راستوں کے مسائل کو طے کرتے ہیں) بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ بورڈ بعد جنگ کی تعمیر جدید میں زیادہ موثر طریقے سے کام کر سکے گا۔

اس بورڈ کے سولہویں اجلاس میں مسٹر ایف۔ ایف۔ ہاجکنسن صدر بورڈ نے اپنی تقریر میں اس امر پر زور دیا کہ آبپاشی اور برقابی کی اسکیموں کی اہمیت کا اندازہ کرتے وقت صرف یہی نہیں دیکھنا چاہئے کہ ان سے آمدنی میں براہ راست کس قدر اضافہ ہوا بلکہ ان زبردست بالواسطہ فوائد کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے جو قوم، مقامی اداروں، صوبائی حکومتوں اور مرکزی حکومت کو حاصل ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ آبپاشی کی ترقی کے لئے الگ الگ اسکیمیں بنانے کے بجائے متحدہ طور پر اسکیمیں تیار کرنا زیادہ مفید ہوگا۔

بورڈ کے اجلاس میں آبپاشی کی موجودہ اور مجوزہ اسکیموں پر غور کیا گیا اور اس مسئلہ پر بھی بحث مباحثہ ہوا کہ ہندوستان کے بعض بڑے بڑے دریاؤں سے فوائد حاصل کرنے کے لئے "کثیر مقاصد کی اسکیمیں" بنائی جائیں۔

اڑیسہ کے دریاؤں کی ترقی

اس بورڈ کے تحت ملک کے مختلف صوبوں میں کام ہو رہا ہے جن میں اڑیسہ کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ جہاں سیلاب، خشک سالی، قحط اور بیماری کی وجہ سے لوگوں پر سخت مصیبتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ سال بھر میں صرف ایک فصل پیدا ہوتی ہے اس لئے صوبہ کی آمدنی بہت کم ہے۔ [illegible] اپنے مصارف پورے نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسے مرکزی حکومت کی طرف سے [illegible] لاکھ روپیہ سالانہ کی امداد ملتی ہے۔ لیکن اس کے ترقی [illegible]

اگر انہیں ترقی دی جائے تو اسکی خوشحالی میں زبردست اضافہ ہو سکتا ہے۔
ہیں کوئلہ۔ سلوہا۔ کرومیم۔ گریفائٹ۔ باکسائٹ۔ چونا۔ ابرق اور بالسن
بلتا ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی دولت پانی ہے۔ اڑیسہ کے ڈیلٹا میں
میں تقریباً ۸ ہزار مربع میل کا رقبہ شامل ہے۔ مہاندی۔ براہمنی اور
دریاؤں کی معاون ندیاں گزرتی ہیں۔ وہ دریا "بیدا پالنگ" اور
"جو نسبتاً کم اہمیت رکھتے ہیں ڈیلٹا کے اوپر کے تقریباً ۹۷ ہزار
میل کے رقبہ میں سے گزرتے ہیں۔ مہاندی سب سے بڑا دریا ہے۔ جو
مربع میل کے رقبہ میں سے گزرتا ہے۔

اڑیسہ کے دریاؤں کو ترقی دینے سے اڑیسہ کے علاوہ اڑیسہ کی
اور صوبہ متوسط کو بھی زبردست فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اڑیسہ
آبپاشی کی کسی وسیع اسکیم پر عملدرآمد نہیں کرسکتا۔ اس لئے وہاں
سکیمیں نافذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چنانچہ حالیہ کٹک کانفرنس
میں مرکزی حکومت۔ اڑیسہ اور صوبہ متوسط اور مشرقی ریاستوں کی حکومتو
ں کے نمائندے شامل تھے۔ اڑیسہ کے دریاؤں کو ترقی دینے کے امکانات پر بحث مباحثہ
اور سیلاب اور جہاز رانی۔ بجلی کی طاقت حاصل کرنے۔ زمین کو محفوظ رکھنے
کے مسائل پر غور کیا گیا۔ سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ مہاندی کو ترقی دینے کے لئے
مقاصد کی متحدہ اسکیم بنائی جائے۔

اب اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے مرکزی آبی راستوں، آبپاشی اور
ی کا ایک کمیشن اڑیسہ بھیجا جا رہا ہے جس کے صدر آبپاشی کے مشہور انجنیر
بہادر کھوسلہ ہیں۔ یہ کمیشن مہاندی کو ترقی دینے کی سکیم کے متعلق ابتدائی
ت کریگا۔ اور متعلقہ صوبے اور ریاستیں اس کام میں اسکا ہاتھ بٹائینگی

شاردا اسکیم

آبپاشی کی ترقی کے سلسلہ میں صوبہ متحدہ کی شاردا اسکیم بھی خاص
رکھتی ہے۔ شاردا نہروں کی تعمیر ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی اور
ء میں انہیں آبپاشی کے لئے کھول دیا گیا۔ ابتدا میں اس اسکیم سے
۱۲۵ ایکڑ رقبہ سیراب کیا جاتا تھا مگر ۱۹۴۱ء میں اس میں توسیع کردی
ں کی وجہ سے مزید ۱۲۵۰۰۰ ایکڑ رقبہ سیراب ہونے لگا۔ "زیادہ
پیدا کرو" کی مہم کے تحت اس اسکیم کو اور وسعت دی جارہی ہے۔
توقع ہے کہ اب مزید ۲۴۰۰۰۰ ایکڑ رقبہ سیراب ہوا کریگا۔
دریائے شاردا سے بجلی کی طاقت بھی پیدا کی جارہی ہے۔ اس
تجویز کے مطابق تین اسپٹ لگائے جائیں گے جن میں سے ہر ایک ۱۳۸۰۰
کلوواٹ بجلی کی طاقت پیدا کرے گا۔ شاردا نہروں کی برقابی کی اسکیم
نہر گنگا کی برقابی کی قوت ۱۰ ہزار کلوواٹ تک مدد دینے کے علاوہ صوبہ
متحدہ کے سولہ ضلعوں میں سے ہر ایک ۳۰ ہزار کلوواٹ تک بجلی کی طاقت
مہیا کرے گی۔

ٹیوب ویل کے ذریعہ دو لاکھ ایکڑ کی سیرابی

جن علاقوں میں نہروں کے ذریعہ آبپاشی کی سہولت میسر نہیں
ہے وہاں ٹیوب ویل نہایت مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ صوبہ متحدہ میں ٹیوب
ویل کا جو نظام قائم کیا گیا ہے اُس کی وجہ سے اہم کامیابی ہوئی ہے۔
وہاں ٹیوب ویل لگانے کی اسکیم ۱۹۳۰ء میں شروع ہوئی اور اس سلسلے
میں فی الفور تحقیقات شروع کردی گئی۔ پہلے سال ۹ ٹیوب ویل لگائے گئے
اور اُن کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ توقع ہے کہ ۱۹۴۵ء کے ختم
ہونے سے پہلے ۱۷۸۵ ٹیوب ویل کام شروع کردیں گے۔ حکومت نے
مزید ۱۲۰۰ ٹیوب ویل کی منظوری دی ہے۔ ان کی تکمیل کے بعد ان کنوؤں
کی تعداد ۲۲۵۷ ہو جائے گی۔ ایک ٹیوب ویل کے ذریعہ تقریباً ۱ $\frac{1}{4}$
مربع میل کا رقبہ سیراب ہوتا ہے۔ لہذا مذکورہ تعداد کے ذریعہ تقریباً
دو لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوسکے گی۔ اصل اسکیم کے تحت ۱۵۰۷ ٹیوب
ویل لگائے جانے تھے۔ مگر اب اس تعداد میں کافی اضافہ ہوچکا ہے۔ اندازہ
لگایا گیا ہے کہ سال رواں میں پہلے کے بہ نسبت ۷۱ فی صدی زیادہ مالیہ وصول
ہوگا جو اصل تخمینے کے مقابلہ میں ۷ فی صدی زیادہ ہے۔

ہندستانی فلمی صنعت کا مستقبل

(از جناب عزیز پریہی)

خاموش فلموں کا دور ختم ہوا۔ بولتی چالتی تصویریں آنے لگیں۔ لوگوں نے انہیں پسند کیا۔ پروڈیوسروں کی ہمت بڑھی اور اس ہنر سے واقفیت رکھنے والوں نے مختلف قسم کی سوشل کہانیاں شروع کیں۔ اور صنعت نے ترقی کرنی شروع کی۔ اور عوام کے سامنے "دیوداس"۔ "آدمی"۔ "دنیا نہ مانے"۔ "ایک ہی راستہ"۔ "عورت"۔ "پکار" جیسی تصویریں پیش کی گئیں جس وقت یہ تصویریں تیار ہوئی تھیں ہندستانی پروڈیوسروں کے خیال کے مطابق صنعت کافی ترقی کر چکی تھی اور تعلیمیافتہ طبقہ نے اس لائن سے گہری دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی۔ فلم تیار کرنے کے لئے سیلولائڈ ہندستان ممالک غیر سے منگواتا ہے۔ جنگ کا نقشہ [illegible] گیا۔ ہر جہاز کیلئے منزل مقصود تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible] کی کمی ہو گئی اور چور بازار میں اس کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی۔ ایک آزاد اور نئے پروڈیوسر کے لئے تصویر تیار کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا لیکن پھر بھی [illegible] بڑے پروڈیوسروں کی تعداد اس وقت ملک میں تصویر تیار کرنے پر سرکاری پابندی لگنے سے قبل ۱۶۵ تک پہنچ گئی۔ ایک تو جنگ کی وجہ سے مال نہیں مل رہا تھا۔ دوسرے حکومت نے حکم جاری کر دیا کہ کوئی شخص حکومت ہند سے اجازت حاصل کئے بغیر فلم تیار نہیں کر سکتا۔ یعنی ہندستانی فلمی صنعت پر بڑی زبردست مصیبت نازل ہوئی۔ کیونکہ ایک آزاد اور نئے پروڈیوسر کے لئے تصویر تیار کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ سرمایہ دار اور پرانے پروڈیوسروں کیلئے بلیک مارکیٹ کرنے کے لئے سنہری موقعہ پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروڈیوسروں کی تعداد ۱۶۵ سے گھٹ کر ۱۲۳ رہ گئی۔ ان میں بھی زیادہ تر سرمایہ داروں سے رحم و کرم پر گذارہ کرنے والے تھے۔ جنگ کے زمانہ میں جوان، بوڑھے سبھی برسر روزگار تھے۔ لوگوں کے پاس روپیہ عام تھا۔ تفریح طبع کیلئے اور وقت گذارنے کے لئے لوگوں کے نزدیک سنیما ایک عام چیز تھی۔ کل تک جو سنیما دیکھنا حرام قرار دیتے تھے۔ شام کو سنیما ہال پر ٹکٹ خریدنے کے لئے لائن میں کھڑے نظر آنے لگے۔ سڑیل سے سڑیل تصویر بھی مہینوں چلنے لگی۔ جنگ سے قبل جو تصویروں کا معیار تھا گر گیا۔ نہایت لغو اور گھٹیا قسم کی تصویریں عالم آنے لگیں۔ خیر وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ اب وہ گذر چکا ہے۔ اب بیکاری کا دور شروع ہونے والا ہے۔ مگر بیکاری کا دور مستقل نہیں رہے گا۔ ہندستانی صنعتیں ترقی کریں گی۔ قومی حکومت جیسا کہ عام خیال ہے عنقریب وجود میں آئے گی۔ اور صنعتیں ترقی کریں گی۔ ہندستان ایک مرتبہ پھر خوشحال دیکھے گا۔ اور صنعتوں کے ساتھ ساتھ فلمی صنعت کو بھی ملک میں ترقی نصیب ہوگی۔ فلمی صنعت کے چند ہنرمند ابھی حال ہی میں امریکہ کے دورہ سے واپس آئے ہیں۔ انہوں نے امریکہ میں فلمی صنعت کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور محسوس کیا ہے کہ ہندستانی فلم انڈسٹری میں جو خامیاں ہیں انکو کس طرح پورا کیا جائے۔ امریکہ جا کر ان لوگوں نے ہر قسم کے جدید سامان کے آرڈر بک کئے ہیں جن میں اعلیٰ قسم کی مشینری۔ رنگین تصویریں تیار کرنے کا سامان۔ ٹاکی مشین کے پرزہ جات وغیرہ کے آرڈر شامل ہیں۔ مسٹر کدار شرما اور مسٹر چندولال نے انڈین موشن پکچرز پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کو یہ رائے دی ہے کہ ہندستان سے نوجوان اور ہونہار لوگوں کو امریکہ میں فلم سازی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا جائے۔ جو وہاں پر معلومات حاصل کرنے کے بعد ملک میں آکر صحیح طور پر صنعت کی خدمت کر سکیں۔ حالانکہ ہندستانی فلمی صنعت میں اکثریت سرمایہ داروں کی ہے۔ جن کا مقصد صرف روپیہ بٹورنے کا ہے۔ ان کی بلا سے انڈسٹری تباہ و برباد ہو جائے۔ مگر پھر بھی ابھی ایسے لوگوں کا وجود باقی ہے جو سچے دل سے [illegible] دانشمند ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس لائن کو ترقی حاصل ہو اور ممالک غیر کی طرح ہندستان میں تیار کی ہوئی تصویریں بھی بین الاقوامی شہرت حاصل کریں۔ ان لوگوں سے استدعا ہے کہ باقاعدہ طور پر ایک ایسے سکول کی تشکیل کریں جو انڈسٹری کے ہوشیار اور قابل لوگوں کا انتخاب کرے اور دوسرے ممالک میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ہر شخص کے لئے خواہ وہ شاعر ہو یا ادیب ہو، ڈرامہ نگار یا افسانہ نگار ہو یا ڈائرکٹر یا ایکٹر یا فوٹوگرافر [illegible] ناممکن ہے کہ بغیر کسی کی مدد کے ترقی کرے۔ اس وجہ سے ایک ایسے سکول کی اشد ضرورت ہے جو ایسے لوگوں کا انتخاب عمل میں لائے اور ان کو [illegible] بیت بہم پہنچائے تاکہ وہ لوگ بے فکری سے دوسرے ملک میں جا کر معلومات حاصل کریں اور واپس آکر اپنے ملک کو فائدہ پہنچائیں۔

سیلولائڈ کی کمی ۱۹۴۲ء میں شروع ہوئی۔ کیونکہ اس وقت دشمن کا دباؤ بڑھ گیا۔ لہذا تجارتی جہازوں کیلئے مال لانا اور لے جانا مشکل ہو گیا۔ جنگ کے زمانے میں حکومت ہند کے محکمہ نشریات و اشاعت اور اطلاعات نے

…پیچنڈے کا فروخت کرنے کی اور آئندی نیش جاری کردیا کہ
جنوری ۱۹۴۴ء کے بعد سے کوئی شخص بغیر حکومت ہند کی اجازت کے بغیر فلم
تیار نہیں کرسکے گا۔ اور فلم کی لمبائی گیارہ ہزار فٹ سے زیادہ کسی حالت میں
نہ ہوگی۔ اس وقت ہندوستان میں کل ...... ۹۴ فٹ کی درآمد
ہوئی جس میں سے ...... ۱۵ فٹ حکومت کے دفاعی اور دوسرے
پروپیگنڈے کے لئے استعمال کی گئی۔ اور باقی ماندہ ۱۲۳ پروڈیوسروں
میں تقسیم کی گئیں۔ .... ۷ فٹ فلم ہندوستان کے لئے بہت کم
تھی۔ خیر۔ جیسے بھی ہوا وقت گذر گیا۔ اب یہ پابندی بھی ہٹ گئی ہے
اس وقت ۱۶۷ آزاد اور دوسرے پروڈیوسر ہیں۔ اور اُمید کی جاتی ہے کہ
مزید فلم کرنے کے بعد ان کی تعداد میں تیس فی صدی اور اضافہ ہوجائیگا۔ ہندوستان
کے چالیس کروڑ انسانوں کے لئے تمام ملک میں صرف ۱۷۰۰ سنیما ہال ہیں۔
اگر جنگ کی وجہ سے عمارتی سامان پر پابندی نہ ہوتی تو کافی سے زیادہ
سنیما ہال تعمیر ہوچکے ہوتے۔ اب یہ پابندی بھی تقریباً ختم ہوگئی ہے۔
اور عنقریب نئے سنیما ہال تیار ہونے شروع ہوجائیں گے۔ اور اس سال
کے آخر تک سنیماؤں کی تعداد ...۳۹ تک پہنچ جائے گی۔ ۱۹۴۵ء میں جو فلموں
سے آمدنی ہوئی ہے وہ ۱۹۴۲ء سے دگنی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ
دنیا کے بڑے بڑے فلمی تاجر بھی ہندوستان کی فلم انڈسٹری میں گہری دلچسپی
لینے لگے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں کل آمدنی ......۵۳۳ روپے تھی۔ اور
۱۹۴۵ء میں ......۱۱۵ روپے ہوئی۔ جس میں سے تقریباً بیس
فی صدی غیر ملکی تصویروں کی آمدنی مقابل ہے۔

بمبئی جہاں ۷۰ فی صدی فلمیں تیار ہوتی ہیں اب ایشیا کا سب
سے بڑا فلمی مرکز بن جائے گا۔

بحکم جناب سید بشیر احمد بخاری صاحب تحصیلدار جگادھری

رام چند پسر گوبند رام قوم ویش اگروال سکنہ مصطفےٰ آباد تحصیل
جگادھری ضلع انبالہ

بنام

تیلورام پسر سالگرام قوم ویش اگروال سکنہ مصطفےٰ آباد۔ کانشی رام
پسر سالگرام ویش اگروال معرفت لالہ رکھب داس ادر سیر کلمینٹ ٹاؤن
دہرہ دون۔ پھگومل پسر رامانند قوم ویش اگروال سکنہ تھمبڑ تحصیل انبالہ
مالکان وحصہ داران اراضی وماد ھو پسر بدھو۔ ومسماۃ سونا بیوہ پرشادا
وراجی داس وو رام کشن پسران گنگا رام وشنکر لال پسر رتی رام قوم لوہار
سکنہ موضع کول پور تحصیل جگادھری مزارعان موروثی مسئول علیہم
درخواست تقسیم اراضی تعدادی 5 آ ــ 1/61 نمبران خسرہ 88 قطعہ
مندرجہ کھیوٹ نمبر 35 وکھتونی نمبران 92 تا 97 برائے جمعبندی مرتبہ
۱۹۴۰-۴۱ء واقعہ رقبہ کول پور تحصیل جگادھری ضلع انبالہ

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں تیلورام پسر سالگرام قوم ویش
اگروال سکنہ مصطفےٰ آباد وغیرہ مذکور تعمیل سمن سے دیدہ ودانستہ
گریز کرتے ہیں اور روپوش ہیں۔ اس لئے اشتہار ہذا بنام تیلورام
پسر سالگرام وغیرہ مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہم مذکور
تاریخ ۱۸ فروری ۱۹۴۶ء کو مقام جگادھری حاضر عدالت ہذا نہیں ہونگے
تو اس کی نسبت کارروائی یکطرفہ عمل میں آویگی۔

آج تاریخ ۴ فروری ۱۹۴۶ء ہمارے دستخط اور مُہر عدالت
سے جاری ہوا۔

دستخط
(بخط انگریزی)

فلموں کا اعلیٰ معیار اور صنعتی ترقی

(از جناب عزیز سوتی)

زمانہ تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب دوڑ رہا ہے۔ مہذب ممالک صنعتی ترقی کے بلند مقام پر نظر آ رہے ہیں۔ ہمارا ملک اُن سے پہلے بھی پیچھے تھا اور اب بھی پیچھے ہے۔ مگر وہ ممالک جن کی حیثیت ہمارے ملک سے بھی کمتر تھی۔ کیا جنگ کے بعد تعمیری اور صنعتی ترقی کے ضمن میں ہم سے آگے نکل جانے کی سعی نہیں کر رہے ہیں۔ مقابلہ کا یہ جذبہ سب کو یکساں طور پر اکسا رہا ہے کہ دوڑو۔ ورنہ پیچھے رہ جانے والوں کے لئے ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں ؎

اٹھو ورنہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

لہذا ہمارا فرض ہے کہ وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ملک کے ان سرمایہ داروں کو جن کا سرمایہ کسی انڈسٹری پر لگا ہوا ہے جھنجوڑیں۔ اُن کے دل و دماغ پر جو طمع کی کائی جم گئی ہے اسے کھرچ ڈالیں اور صنعتی ترقی کی نئی راہوں پر ان کی رہنمائی کریں۔

آج جبکہ معاشی، تمدنی، سیاسی، تعلیمی ترقی کا انحصار صنعتی ترقی پر منحصر ہے۔ کیا اس زرین اصول سے چشم پوشی ملک اور قوم کو قعر ذلت میں ڈال نہیں دیگی۔ کیا اس خود غرضی کے بھیانک نتائج سے بالغ النظر واقف نہیں ہیں۔ لہذا جہاں ملک میں انڈسٹریاں عروج پر ہیں صنعت فلم سازی کی ترقی ملکی اقتصادیات میں کافی اہم ہے۔

بلاشبہ فلم سازی کی صنعت اس وقت ہمہ گیر صورت اختیار کر چکی ہے۔ اب اس انڈسٹری سے متعلق دقیانوسی خیالات کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی ہے۔ بلکہ یہ انڈسٹری ملک کی دوسری صنعتوں کے مقابلے میں وقعت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ اور بڑے بڑے سرمایہ دار بھی انڈسٹری پر اپنا سرمایہ لگا رہے ہیں اور بڑے پیمانے پر نئے اسٹوڈیوز کے خاکے اس امر کو اچھی طرح واضح کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں صنعت فلم حیرت انگیز ترقی کریگی۔ اور ہندستانی فلمیں غیر ممالک کی فلموں کے مقابلہ میں پیش کی جاسکیں گی۔ جو ٹیکنیک کے لحاظ سے کسی صورت غیر ملکی فلموں سے کم درجہ نہ ہونگی۔

فنی شعور کا یہ دور صنعت فلم سازی کی ترقی کے لئے جہاں مبارک ہوگا وہاں اُن فلمسازوں کے لئے نفرت و حقارت کے نقوش بھی اجاگر کردیگا جو آج اس صنعت کو ذلیل اور رسوا کر رہے ہیں۔ آج ان کی نادانی بدنامی کا پیش خیمہ ہے۔ کیا ہم کل کی رُسوائی سے بچنے والے حساس فنکاروں کے مردہ احساسات میں زندگی کی دمک پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہونگے۔ اگر واقعی فن کار حساس ہیں تو ضرور یہ ایک ملت اس نقطۂ فن کو جانیں گے کہ فنی ترقی ہی میں اُن کی شہرت کا راز مضمر ہے۔

لہذا زمانے کے ساتھ ساتھ فلم کے طریقۂ فن کو بھی بدل ڈالنا فرض ہے۔ کیونکہ دقیانوسی فلم ٹیکنیک بجائے صنعتی عروج کے زوال کا باعث ہوگی اور اس صنعتی زوال کے ذمہ دار نااہل فن ہوں گے جن کے لئے آئندہ نسلوں کے دلوں میں کوئی وقعت نہ ہوگی۔ جب ان کے نئے نئے خیالات کا فقدان ہوگا تو ان کے فن کا زوال لازمی ہے۔

دوسو سے زائد پروڈیوسر

فلم لائسنس نکل جانے کے بعد اب تک دوسو سے زائد درخواستیں کوڈاک کمپنی کے پاس خام فلم کے لئے پہنچ گئی ہیں۔ ان میں سے اکثریت نئے فلمی اداروں کی ہے

کشمیری گیٹ سے اُردو پارک تک

رٹز سنیما یونائیٹڈ فلمز کا مسلم سوشل شاہکار بھائی جان اٹھارہ ہفتوں سے عوام کی کشش کا مرکز بنا ہوا ہے۔ دہلی والے ہمیشہ سے عمدہ اور اعلیٰ چیزیں پسند کرتے آئے ہیں۔ "بھائی جان" جیسی پاکیزہ اور عمدہ تصویر دلی والوں کو بہت پسند آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اٹھارہ ہفتے گزر جانے کے شہر کے آخری کونے کے سنیما میں روزانہ اچھی خاصی رونق ہوتی ہے۔ "بھائی جان" میں نورجہاں۔ انیس خاتون۔ کرن دیوان۔ شاہنواز اور انصاری نے کام کیا ہے۔

منروا سنیما پردیپ پکچرز کا تیار کردہ فلم پنّا دائی دکھایا جا رہا ہے "پنّا دائی" ہندوستان کی وہ عورت تھی جس نے نمک کا حق ادا کرتے ہوئے راجکمار کی زندگی بچانے کی غرض سے اپنے اکلوتے بچے کو قربان کر دیا۔ تصویر میں ہدایات کی خامیاں ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول نہیں ہوئی ہے۔ اس میں چندر موہن۔ درگا کھوٹے۔ گلاب اور گوپ نے کام کیا ہے۔

جمعہ ۲۲ فروری سے نوئیگ چترپٹ کا تیار کردہ حریت نواز شاہکار "پنّا" نمائش کے لئے پیش کر دیا جائیگا۔ "پنّا" میں گیتا نظامی۔ جے راج۔ ڈیوڈ۔ کسم۔ دلیش پانڈے نے کام کیا ہے۔ ہدایات نجم نقوی کی ہیں۔ "پنّا" اس سے قبل لاہور۔ بمبئی اور کراچی میں بہت کامیابی کے ساتھ چل چکا ہے۔

ناولٹی سنیما جمنا پروڈکشنز کا موسیقی نواز شاہکار رتن گذشتہ ۴۴ ہفتوں سے دکھایا جا رہا ہے۔ شائقین کا یہ حال ہے کہ کئی کئی مرتبہ دیکھ چکے ہیں مگر پھر سیلاب کی طرح اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔ "رتن" امید ہے گولڈن جوبلی منائے گا۔ "رتن" کی کامیابی قابل رشک ہے۔ "رتن" میں کرن دیوان۔ سورن لتا۔ جگدیش سیٹھی۔ واسطی۔ مجولا اور راج کماری شکلا نے کام کیا ہے۔

جوبلی سنیما رمنیک پروڈکشنز کا دھانسک فلم تارامتی دکھایا جا رہا ہے۔ "تارامتی" میں امنت امرالکھے۔ بے بی شکنتلا۔ سوبھنا سمرتھ دغیرہ نے کام کیا ہے۔ "تارامتی" مہاجر ہریشچندر کے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ گو یہ موضوع مختلف ناموں سے پردۂ فلم پر پیش کیا جا چکا ہے۔ مگر راجہ نیئنے نے اسے بالکل اچھوتے انداز سے پیش کیا ہے۔

میجسٹک سنیما پنچولی آرٹ پکچرز کی پُر اسرار جاسوسی معاملات سے بھرپور فلم دھمکی دکھائی جا رہی ہے۔ فلم کی کہانی اُردو کے مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ دنیا جانتی ہے کہ تاج اُردو کا ادیب ہے۔ ہندی سے اُسے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ مجھے سنسر بورڈ کا سرٹیفکیٹ پڑھکر بڑی حیرت ہوئی کہ فلم کی زبان ہندی ہے۔ کیا تاج کے پاس اس کا کوئی جواب ہے۔ اگر ہے تو اخبارات کے ذریعہ اس کا اعلان ہونا چاہیئے۔

تصویر اچھی خاصی ہے۔ راگنی اور الناصر کی جوڑی بہت اچھی ہے۔ موسیقی بھی قابل داد ہے۔ فوٹوگرافی بھی خاصی ہے۔ ہدایات روندرا دوے کی ہیں۔

کمار سنیما نوئیگ چترپٹ کا موسیقی سے بھرپور فلم دن رات دکھایا جا رہا ہے۔ دن رات میں مزاح موسیقی اور رقص کچھ اس انداز کا ہے کہ خواہ مخواہ تعریف کرنے کو دل چاہتا ہے۔ سنیہہ پربھا ایک عرصے بعد پردۂ فلم پر آئی ہے۔ اور وہ بھی اپنی زندگی کے بہترین رول میں۔ سنیہہ پربھا نے لیڈی ڈاکٹر کا پارٹ کر کے کمال کر دیا ہے۔ سنیہہ پربھا کے ساتھ پریشں بنرجی۔ وسنت تھینگڈی۔ سلوچنا چٹرجی اور ڈیوڈ نے کام کیا ہے۔

موتی سنیما شوخ اور چنچل رمولا ایک مرتبہ پھر تلوار پروڈکشنز کی نئی تصویر البیلی میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ "البیلی" کی کہانی اندھے اور بھیک مانگنے والوں کی درد بھری داستان ہے۔ جو سرمایہ دار اور رئیس کے رحم و کرم پر جیتے ہیں۔ اگر امیر چاہتے تو انہیں زندہ رہنے دے۔ اگر چاہے تو زندان میں بند کر دے۔ رمولا نے فقیرنی بنکر امیر کی جاہ و حشم اور غرور کے نشہ سے بند آنکھوں کو کھولنے کی کوشش

کیسے [illegible] کا میاب ہوگی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال یہ ایک کوشش ہوئی ہے۔ ہدایات کی خامیوں کی وجہ سے تصویر میں کچھ [illegible] نہیں ہے۔ رتن لال کے ساتھ ستیش سکندر اور روپ لیکھا نے کام کیا ہے۔ ہدایات معمولی ہیں۔

جگت سنیما

نیو تھیٹرز کا تیار کردہ فلم "بیراہی" دکھایا جا رہا ہے۔ "بیراہی" کی کہانی بہت خوب ہے۔ سرمایہ دار کے ڈھول کا پول کھولا گیا ہے۔ کس قدر خوب کے دماغ سے فائدہ اٹھا کر اپنا نام پیدا کرتے ہیں۔ اداکار تقریباً تمام نئے ہیں۔ مولنے ہیرو کے سیٹھ کا کام بہت لاجواب ہے اگر ہیرو کچھ بہتر ہوتا تو تصویر بہت دلوں چلتی۔ رادھے موہن۔ نبا تابوس اور دیبی مکرجی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موسیقی بوال کی ہے۔

جمعہ ۲۲ فروری سے مسلم سوشل شاہکار زینت نمائش کے لئے پیش کر دیا جائیگا۔ "زینت" خاندان اور دوست کے شہرت یافتہ سید شوکت حسین رضوی کا تیار کردہ ہے۔ "زینت" میں نور جہاں۔ کرن دیوان شاہنواز اور یعقوب نے کام کیا ہے۔ اے شیخ زعلی حکیم اور رمضان نے پیش کیا ہے۔ کہانی وجاہت مرزا کی ہے۔ نغمات ماہر القادری اور نخشب جارچوی کے ہیں۔ یہ تصویر بمبئی۔ لاہور اور کراچی میں ریکارڈ بزنس کر رہی ہے۔ امید ہے دلی میں بھی کافی مقبولیت ہوگی۔

"بہار" نہیں بلکہ "آئی بہار"

چترا پروڈکشنز نے بعض مجبوریوں کی وجہ سے اپنی تصویر "بہار" کا نام "آئی بہار" رکھ لیا ہے۔ اے شنکر مہتہ ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔ ایم ایچ ارشاد۔ اجمل۔ آدشا۔ آدم اور رامیش کام کر رہے ہیں۔

مہیشوری پکچرز کا "کہاں گئے؟"

ہدایت کار نرنجن "کہاں گئے" نہایت سرعت کے ساتھ تیار کر رہے ہیں۔ اس میں چاند۔ برج کپور۔ نرنجن وغیرہ کام کر رہے ہیں۔ نغمات حضرت طاہر کاشمیری اور مکالمے راجندر سنگھ بیدی کے ہیں۔

ایسٹرن پکچرز کا "رنگ محل"

رمضان لکھانی "زینت" کے بعد "رنگ محل" پیش کر رہے ہیں — رنگ محل کی کہانی بہت خوبصورت [illegible] ہے۔ اس میں [illegible] [illegible] اور [illegible] نیلی اور شاہنواز کام کر رہے ہیں۔ تصویر [illegible] مراحل [illegible] میں ہے۔ اور عنقریب نمائش کیلئے پیش کی جائیگی۔

"تاج محل کی بیگم"

"آجاؤ" کے بعد تاج محل پکچرز نے ایک اور تصویر تیار کی ہے۔ [illegible] ہے۔ نسیم ایک عرصہ کے بعد پری چہرہ نسیم "بیگم" کے روپ میں پھر ٹوٹے دلوں کو گرمانے کے لئے پردہ فلم پر نمودار ہوئی ہے۔ دیکھیں کیسی رہتی ہے۔ "بیگم" میں نسیم کے ساتھ ہیرو کا کردار اشوک کمار نے ادا کیا ہے۔ "بیگم" شمالی ہندستان میں میسرز جگت ٹاکیز کے ذریعہ نمائش کے لئے پیش کی جائے گی۔

انڈین نیشنل پکچرز کا قیام

یہ خبر فلمی حلقوں میں نہایت مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ نواب سر لیاقت حیات خاں وزیر بھوپال اسٹیٹ کی سرکردگی میں انڈین نیشنل پکچرز کے نام سے ایک نئی فلم کمپنی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مسٹر گوردھن داس اگروال ایم اے مشینری خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور انڈسٹری کے بہترین ماہر مثلاً مسٹر موراج کپاڈیا چیف اسٹوڈیو آفیسر کاردار پروڈکشنز بمبئی جیسی شخصیتیں شریک ہو چکی ہیں۔ انڈین نیشنل پکچرز کا مقصد اخلاقی اور تعلیمی تصویریں تیار کرنا ہوگا۔ راجہ دھن راج گیرجی اور رائے بہادر دیوان انبا ناتھ سی آئی۔ ای سابق وزیر اعظم ریاست میسور جیسی ہستیاں بھی بورڈ آف ڈائرکٹرز میں شامل ہیں۔ فلم بندی عنقریب شروع ہو جائیگی۔

پنچولی آرٹ پکچرز نے نگار خانوں کا جال بچھا دیا

دلسکھ پنچولی ہندستان کے مشہور پروڈیوسر ہیں۔ آدمی تجربہ کار اور ہوشیار ہیں۔ ترقی کرتے کرتے انہوں نے تین نگار خانے بنا لئے۔ اب تازہ اطلاعات ہیں کہ نصف پنجاب میں پھیلی ہوئی مسلم ٹاؤن سے گذرنے والی نہر کے کنارے چوتھا نگار خانہ بنایا جا رہا ہے۔ چوتھا نگار خانہ بن جانے سے مسلم ٹاؤن کا وہ حصہ جو پنچولی کے قبضہ میں ہے۔ جدید طرز کی شاندار فلمی بستی بن جائے گا۔

پروڈکشن پکچرز کا "شہر سے دُور"

پرایت کار برکت مہرہ "شہر سے دُور" فلم بند کر رہے ہیں۔ کہانی اور مکالمے امتیاز علی تاج نے لکھے ہیں۔ موسیقی پنڈت امرناتھ کی ہے۔

میٹروپالیٹن پکچرز کی "پگڈنڈی"

دلی کے شہرت یافتہ مسٹر رام نرائن دوبے "پگڈنڈی" تیار کر رہے ہیں۔ "پگڈنڈی" کا افسانہ امتیاز علی تاج نے اور نغمے مدھوک نے لکھے ہیں۔

زبردست فلمی سانحہ

یہ خبر فلمی حلقوں میں نہایت رنج اور افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ مشہور فلم سٹار کملا چٹرجی ۲۹ر جنوری کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئیں۔ فلمی شیدائیوں کے دل سے کجن اور بیٹھاوالا کی موت کا زخم ابھی بھرنے نہ پایا تھا کہ کملا چٹرجی کی اندوہناک موت کی خبر لے لے اور گھر کر دیا۔ ہمیں کدار شرما اور سلوچنا چٹرجی سے دلی ہمدردی ہے۔ مرحومہ بالکل اس کلی کے مانند تھیں جو کھلنے سے قبل ہی مرجھا گئی۔

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے

سوشیلا رانی گھر کی رانی بن گئی

معلوم ہوا ہے کہ سوشیلا رانی کا بیاہ ہو گیا ہے۔ بیاہ کے موقعہ پر دلہن کے خاص خاص دوست شریک تھے۔

لیلا چٹنس سابق شوہر کے ساتھ

یقین آئے یا نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تاج محل ہوٹل میں ایک پارٹی کے موقعہ پر لیلا چٹنس اور ڈاکٹر چٹنس (لیلا چٹنس کے سابق شوہر) بڑی دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ اور پارٹی کے اختتام پر سابق زن و شوہر ایک ہی موٹر میں چلے گئے۔ ان کے احباب کا گمان ہے کہ دونوں عنقریب بیاہ کر لیں گے۔

"نوکا ڈوبی" کے بدلے "ملن"

ٹیگور کے ناول نوکا ڈوبی (جسے بمبئی ٹاکیز تیار کر رہی ہے) کا نام بدل کر اب "ملن" کر دیا گیا ہے۔ اس فلم میں دو نئے چہرے پیش کئے جائینگے مشہور بنگالی ادیب اور سیر ٹیپے منتقلی کے ایڈیٹر مسٹر سجنی کانت داس اسے پردہ پر پیش کرنے کیلئے از سر نو ترتیب دے رہے ہیں۔

بیگم پارہ کی شادی

اگر افواہیں سچی ہوں تو سنا گیا ہے کہ بیگم پارہ اور مبارک شادی کر رہے ہیں اسکی خاص وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آج کل ہر جگہ بیگم پارہ اور مبارک ساتھ ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن یہ وجہ معقول نہیں۔ تاہم دیکھئے آئندہ کیا ہوتا ہے۔

جینت دیسائی کا "سوہنی مہینوال"

جینت دیسائی کا "سوہنی مہینوال" تیار ہو رہا ہے۔ اس میں بیگم پارہ مبارک۔ ایشور لال۔ دلشاد نے کام کیا ہے۔

سنیہہ پربھا کی "شکایت"

نوینگ کے آئندہ فلم "شکایت" میں سنیہہ پربھا پہلی مرتبہ ایک مسلم عورت کا کردار انجام دیگی۔ اس فلم کی کہانی محترمہ عصمت چغتائی نے عظیم بیگ چغتائی کے ایک ناول سے اخذ کی ہے۔ ہیرو کے رول میں شیام کی منظوری کی گئی ہے۔

مردولا ماں بن گئی

بمبئی ٹاکیز کے فلم "جوار بھاٹا" کی ہیروئن مردولا کے بیاہ کے متعلق تو آپ جانتے ہی ہونگے۔ خبر ملی ہے کہ اس بیاہ کے نتیجے کے طور پر مردولا ماں بن گئی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بچی مری ہوئی پیدا ہوئی۔

درگا کھوٹے اور ہوائی جہاز

ہندستان میں اگر کسی [illegible] نے ہوائی جہاز خریدا ہو تو وہ درگا کھوٹے ہے۔ حال ہی میں درگا کھوٹے نے ایک ہوائی جہاز کلکتہ میں خریدا ہے اور عنقریب یہ ہوائی جہاز بمبئی آجائے گا۔ درگا کھوٹے کے شوہر رشید ہوا باز ہیں اس وجہ سے موصوفہ کو ہوائی جہاز [illegible] تکلیف کا اندیشہ نہیں۔ اس سہولت کی وجہ سے اب درگا کھوٹے لاہور۔ بمبئی۔ کلکتہ۔ پونہ کی فلم کمپنیوں سے بیک وقت کنٹراکٹ کر سکیں گی۔

Beauty & You
عورتوں کی
خوب صورتی
اور جوانی گلاب کے اس نازک پھول کے مانند ہے جو
ذراسی بے احتیاطی سے کمھلا جاتا ہے۔ چنانچہ سو
میں سے ننانوے عورتیں وقت سے پہلے بوڑھی
ہوجاتی ہیں۔ لیکن ہمدرد کے ماء اللحم نے
لاتعداد عورتوں کو نئے سرے سے تن درست،
اور خوب صورت بنا دیا ہے،
ماء اللحم
MAULLAHAM
"It's a Blood Bank in a Bottle"
دوا نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں تازہ خون ہے
جو حلق سے اترتے ہی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔
ہمدرد کا ماء اللحم عورتوں کا رنگ نکھارتا ہے؛
چہرہ گلاب کی طرح دمکنے لگتا ہے، نسوانی بیماریاں
خود بخود جاتی رہتی ہیں، زچگی کی کمزوری کو فوراً دور
کرتا ہے؛
ہمدرد کا ماء اللحم
تازہ پھلوں، مقوی میووں، صحت بخش غذاؤں اور قیمتی دواؤں کے جوہروں سے دوا سازی کی
جدید مشینوں کے ذریعہ سائنٹیفک اصول پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ دل، دماغ اور اعضاء رئیسہ میں نئی زندگی پیدا کرکے عورتوں
کو نئے سرے سے جوان اور خوب صورت بنا دیتا ہے معالج پورے اطمینان کے ساتھ استعمال کراتے ہیں؛
قیمت فی بوتل پانچ روپے
نمونہ کی شیشی ایک روپیہ چار آنے،
ہمدرد دواخانہ دہلی

نور جہاں

کرن دیوان

شاہ نواز

یعقوب

مجید

جگت سینما کا
اگلا پروگرام

ہدایت کار:
شوکت حسین

جاری کردہ:
جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ دہلی، لاہور

نشاط سینما لاہور میں
اس شاہکار نے زبردست
ہلچل مچا رکھی ہے

THE 'ADEEB' DELHI

مارچ-اپریل ۱۹۳۶

وملا - فلم " پیدرمت یہ اپنا نیرہ " میں

ایک ایسی خاتون کی ضرورت ہی جو ادارت و اشاعت میں معاون ہو سکیں۔ تنخواہ سو روپے ماہوار تک دیجا سکتی ہے۔

منیجر "ادیب" معرفت ہارڈنگ لائبریری دہلی

نیولائٹ

ایک انگریزی فلمی ماہنامہ کے لئے ایک تجربہ کار گریجویٹ کی ضرورت ہی۔ جو اچھی اُردو اور انگریزی جاننے کے علاوہ ٹائپ اور حساب کتاب رکھنے کے کام سے بخوبی واقف ہو۔ تنخواہ سو روپے ماہوار تک دی جاسکتی ہے۔

منیجر نیولائٹ۔ معرفت ہارڈنگ لائبریری۔ دہلی

چندہ سالانہ دس روپے۔ علاوہ محصول — قیمت فی کاپی ایک روپیہ علاوہ محصول

ادیب

دہلی

اڈیٹرز:۔ سید محمد مرتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم اے

جلد ۱	مارچ و اپریل سنہ ۱۹۴۶ء	نمبر ۵ و ۶

فہرست مضامین

[illegible]

نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد)

نقش و نقاش از جناب سلطان حیدر جوشؔ۔ شائع کردہ احمد الدین صاحب نظامی پریس بدایوں۔

سائز ۲۰×۲۳ مجلد قیمت نامعلوم۔ شاید حامد منزل میرس روڈ علی گڈھ سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

جوشؔ صاحب نے اپنے دونوں نظریے یعنی دور بین اور نزد بین باب کے شروع میں بیان کئے ہیں۔ دوربین کو چھوڑ کے۔ نزد بین میں عمر خیام کی مشہور رباعی درج ہے۔

رباعی

زاہد بزبانِ خواجہ گفتا مستی! از خیر گسستی و بہ شر پیوستی

گفتا چنانکہ می نمائم ہستم تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

اس "ناول چہ" کو مصنف نے اپنی چھوٹی دختر عابدہ یعنی عابدہ فخری بیگم کے نام منسوب کیا ہے۔

جناب جوشؔ نے اپنے ناول چہ میں تمہید کو لفظ عینک سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس کا لب لباب ہے۔

بجا اپنا ترانہ تو سنیں تیری صدا کیا ہے؟

جوشؔ صاحب اُردو املا میں اصلاح کے درپے ہیں یعنی صوتی املا کے حامی ہیں۔ اور غالباً ہر لفظ کے ہجے اسی طرح کرنے کے خواہشمند ہیں جس طرح وہ لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً خود کو جوشؔ صاحب ہر بار "خُد" لکھتے ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں ٹھیک ہے۔ مگر جس طرح خود کا و بولنے میں صاف ظاہر نہیں ہوتا اسی طرح عینک کی ع بھی تاوقتیکہ عربی لب و لہجہ اختیار نہ کیا جائے سامعہ نواز نہیں بنتی۔ پھر عینک ع کی بجائے "اینک" کیوں نہیں لکھتے۔ ناظرین اطمینان رکھیں آئندہ پرچے میں جوشؔ صاحب کا جواب شائع ہوگا۔

ناول کا پلاٹ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ ایک نوجوان تعلیم سے فراغت پاکر نقاشی کی طرف اس درجہ مائل ہوتا ہے کہ دُنیا میں فن کاری کے علاوہ اُسے کسی دوسری چیز میں دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ حسین سے حسین عورتوں کے ایسے رنگین مجسمے تیار کرتا ہے کہ وہ خود اپنے عکس کو دیکھکر اُس پر فدا ہو جاتی ہیں۔ مگر اس سنگ دل انسان پر کسی کے حُسن کا جادو نہیں چلتا۔ اس کے اسلاف میں کسی کے پاس زہرہ نام مشہور داشتہ رہتی ہے۔ اُس سے ایک لڑکی مشتری پیدا ہوتی ہے۔ لالہ جی مرحوم مشتری کو اپنی لڑکی سمجھ کر اور ناداری اور بدنامی کی زندگی سے بچانے کے لئے کافی جائداد اُس کے نام کر دیتے ہیں۔

مشتری اس نوجوان آرٹسٹ کا موڈل بنتی ہے۔ اور مورتی نقب باقی ہے۔

نوجوان آرٹسٹ کا ایک مسلمان دوست سلیم بھی ہے جو کم درجہ کا آرٹسٹ ہے اور جس کے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی موجود ہے۔ واقعات اور حالات کی بنا پر ان کو ایک لڑکی سرلا سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

سرلا کا باپ ایک پنشن یافتہ بڈھا آدمی ہے۔ سرلا کی ماں سے جوانی میں کوئی لغزش ہو جاتی ہے اور اُس کے سرلا پیدا ہوتی ہے۔

سردار خاں جو سرلا کا اصلی باپ ہے مرنے سے قبل اپنی تمام جائداد سرلا کے نام منتقل کر دیتا ہے۔

بالآخر سرلا سلیم میں اور مشتری میں کھو جاتے ہیں۔

ناول کا پلاٹ کافی دلچسپ ہے اور نہایت اچھے انداز میں ڈھالا گیا ہے۔ اصلی گتھی جاکر آخر میں سلجھتی ہے۔ اور پڑھنے والے کی دلچسپی ناول کی تو آخر تک برقرار رہتی ہے۔

پلاٹ کے علاوہ ناول میں کئی موضوع ایسے چھیڑ دیئے گئے ہیں جن پر کافی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے آرٹ پر ایک مختصر سی بحث شروع ہوتی ہے۔ آگے چل کر محبت کی باری آتی ہے پھر کہیں کہیں سرمایہ داری اور مزدور پر بھی تبصرہ موجود ہے۔ اِسکے بعد یہ دلچسپ جملہ پڑھنے میں آتا ہے کہ "کسی اولاد کو اپنے باپ کا فطری علم نہیں ہوتا۔ اور والدین کے یقین دلانے پر اولاد کا یقین ہوتا ہے"

بات سولہ آنہ ٹھیک ہے مگر کتنی نازک!

وکالت اور طوائف کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وکیل خواجہ سے پیشگی ہیں اونچی سے اونچی قبر کے نیچے نظر آتا ہے یا اوپر"؟

مگر حضور یہ امر مشاہدہ طلب ہے!

سردار خاں کی جائداد کے تقسیم کے سلسلے میں مقدمہ بازی کا

بھی اچھا منظر دکھا [illegible]

پھر گئے ! انھوں حضرت بخاری اور خداوندانِ ریڈیو کی بھی خوب تعریف کی ہے اور الحق صحیح کی ہے۔ ہر شریف آدمی اِن ریڈیو والوں کے متعلق یہی رائے رکھتا ہے۔ کوئی اتنا دلیر ہے جو کتاب میں بھی چھاپ دیتا ہے اور کوئی صرف میری طرح ؟ ملانے پر اکتفا کرتا ہو!

سب سے دلچسپ سین وہ ہے جب کہ سلیم اپنے اور سرلا کے درمیان مذہب اور روپے کی دو وسیع خلیجوں کو ناقابلِ عبور سمجھکر اپنی سر خود بناتا ہے۔ یہ سرلا کا ایک رنگین مجسمہ ہے۔ جسے وہ اپنے اسٹوڈیو میں اطمینان سے بیٹھکر اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق تیار کرتا ہے۔ سرلا بہت دن کی کشیدگی کے بعد اس کے اسٹوڈیو میں زبردستی داخل ہو جاتی ہے اور اپنے مجسمہ کو ایک پیکرِ حسن و رعنائی دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ اب اُسے اپنی دلکشی اور جاذبیت کا پورا احساس ہو جاتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتی ہے کہ جو شخص اس کے مجسمہ سے اِس قدر والہانہ اُنس رکھتا ہے وہ اس کی اپنی ہستی کی کیا کچھ قدر و منزلت نہ کرے گا۔

اِس ناول چہ کے نئے باب میں پھر آرٹ پر بحث کی جاتی ہے یہ بحث ناول سے بہت دور کی چیز ہے اور مصنف کے مطالعہ کا اچھا اظہار ہے۔ اگر اِس قدر فن کارانہ بحث نہ کی جاتی تو کہانی کا زور جو ذرا یہاں آکر ماند پڑ جاتا ہے تند ہو جاتا۔

جوش صاحب کی زبان مرصع اور شگفتہ ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں یورپ کی ترکیبیں بھی بلا ارادہ قلم سے نکل گئی ہیں۔

آخر میں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ناول کا مطمحِ نظر کیا ہے؟ جواباً عرض ہے کہ جوش صاحب نے اپنے مختلف نظریوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ اس ناول چہ میں پیش کیا ہے۔ اور اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ بظاہر آپ ناول پڑھنے میں منہمک ہوتے ہیں تاہم آپ کے ذہن میں ان کے خیالات اپنا دھندلا سا عکس چھوڑ جاتے ہیں۔

یہ ناول ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

ستارے

مصنفہ محترمہ سیدہ اختر صاحبہ حیدرآبادی۔
ملنے کا پتہ۔ عثمان منزل۔ بنگلور۔

یہ دلچسپ اور نصیحت آموز افسانوں کا مجموعہ ہے جس کے آغاز میں اصغر گونڈوی مرحوم کا ایک شعر درج ہے۔

[illegible]

کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

سیدہ اختر صاحبہ اُن خواتین میں سے ہیں جو اپنی تصانیف کو ملک اور قوم کی بہبودی کے لئے وقف کر چکی ہیں۔ اِن کے افسانوں میں کچھ اور باتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ افسانے ملک کی قومی۔ معاشی۔ معاشرتی۔ اخلاقی [illegible] پہلوؤں کو مدِ نظر رکھکر لکھے گئے ہیں۔ تاکہ افسانوی چٹخارہ کے ساتھ ساتھ مصنفہ کے حقیقی رجحانات اور احساسات کا پرتو بھی پڑھنے والوں کے دلوں پر پڑتا رہے۔ آپ کا ہر افسانہ بجائے خود ایک درس لئے ہوئے ہے۔

آپ کی تحریر میں آزادی۔ بے باکی۔ اپنی جنس کی پستی کا احساس اور اُن کو بلند کرنے کا عزم بدرجہ اولیٰ پایا جاتا ہے۔ یہ ہندوستانی عورت کو ادیب۔ شاعرہ۔ خطیبہ اور خطاط دیکھنا چاہتی ہیں۔ یہ چاہتی ہیں کہ عورت بھی مرد کے دوش بدوش زندگی کی الجھنوں سے دوچار ہو اور اُن کو سلجھانے میں مرد کی شریکِ کار بن سکے۔

بقول حضرت غالب آپ کا نظریہ ہے کہ

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اشکِ تبسم

از محترمہ سیدہ اختر صاحبہ حیدرآبادی۔

مصنفہ کے نام سے بڑے بڑے شہروں کا اُردو داں طبقہ [illegible] واقف ہے۔ ان کی جادو بیانی اور طرزِ تقریر نے ملک میں نمایاں جگہ پیدا کر لی ہے اور اسی لئے خطیبۂ ہند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اُردو ادب سے مصنفہ کو خاص دلچسپی اور لگاؤ ہے اور اکثر بڑے پیمانہ پر مشاعرہ منعقد کرتی رہتی ہیں۔ خود بھی سخن فہم سخن شناس اور سخن گو واقع ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں نثر بھی خوب لکھتی ہیں۔ خصوصاً ان کا خطِ تحریر قابلِ صد [illegible] ہے۔ انکی نثر بھی بہت شستہ اور صاف ہے اور اسکو ملکی اور قومی مسئلوں [illegible] پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے بڑی خوش اسلوبی سے استعمال کرتی ہیں۔ اشکِ تبسم کی جو کاپی ریویو کے لئے آئی ہے اُسمیں اندر مصنفہ کی قلم سے [illegible] درج ہے "مسکراتی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حسین و سرسبز وادی سے آبشار کا پانی گر رہا ہے" یہ فقرہ سرورق [illegible] ہوئی تصویر کی تشریح ہے جس میں ایک حسین خاتون کی بڑی بڑی آنکھوں [illegible] موٹے موٹے آنسو ڈھلک کر رخساروں پر گرتے نظر آرہے ہیں۔

یہ مجموعہ ہے شاعرانہ خیالات کا جنکا قابل مصنفہ نے موزوں [illegible] کے ساتھ نثر میں اظہار کیا ہے۔ قیمت نامعلوم۔ ملنے کا پتہ۔ ناہیدہ [illegible]

(راز واحدی)

انسان کو جتنی محبت اپنے بیٹا بیٹی سے ہوتی ہو' اتنی محبت بیٹا بیٹی کی اولاد سے نہیں ہوتی۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص مکان بنوا رہا تھا۔ وہ راج مزدوروں کا کام دیکھنے کے لئے گھنٹوں دھوپ میں کھڑا رہتا تھا۔ اُس کا باپ زندہ تھا اُسے بیٹے کا دھوپ میں کھڑا رہنا ناگوار گزرتا۔ وہ بیٹے سے کہتا "سایہ کی جگہ کھڑے ہوکر کام دیکھا کرو یا اپنے کھڑے ہونے کی جگہ سایہ کا انتظام کر لو" بیٹا سُنتا اور ٹال دیتا۔ باپ نے کیا کیا۔ ایک روز اُس بیٹے کے بیٹے کو گود میں لیا۔ اور بیٹے کے پاس دھوپ میں آکھڑا ہوا۔ بیٹے نے بگڑ کر پوچھا "اِسے دھوپ میں کیوں لے آئے؟" باپ نے جواب دیا "تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ بیٹے کے دھوپ میں کھڑے ہونے سے باپ کو کیسی اذیت پہنچتی ہے۔" وہ شخص پوتے کو بھی دُکھ دینا نہ چاہتا ہوگا۔ مگر بیٹے کو سمجھانے کے لئے اُس نے پوتے کو دھوپ میں لا کھڑا کرنا بُرا نہیں سمجھا۔ پوتا پوتی اور نواسے نواسی کی اولاد سے اور تعلق گھٹتا ہے۔ اور ان کی اولاد سے اور۔ یہاں تک کہ کوئی صاحب اگر اتفاق سے سوا ڈیڑھ سو برس کی عمر پا لیتے ہیں تو ڈیڑھ سو برس کی عمر میں شادی کر کے وہ نئی دلہن سے تو محبت کر سکتے ہیں۔ لیکن اولاد کی اولاد اُن کے لئے غیروں کے مانند ہو جاتی ہے اور اولاد کی اولاد کا تو کہنا ہی کیا۔ اولاد کی اولاد ان بزرگ کو شاید تبرک خیال کرلے تو کرلے ورنہ اولاد کی اولاد کی ... خود بیٹا بیٹی کو ماں باپ سے وہ تعلق نہیں ہوا کرتا جو ماں باپ کو بیٹا بیٹی سے ہوتا ہے۔ بیٹا بیٹی اپنی بیوی اور اپنے خاوند کے ہو جاتے ہیں۔ اور بچے ہونے کے بعد تو ماں باپ کہاں اور وہ کہاں۔ بے توف ہیں اس بات پر جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ مگر سمجھدار باپ اس کا گلہ نہیں کرتے۔ اُنھیں غالباً یاد رہتا ہے کہ اُن کا عمل بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ یہی تھا۔ خیر یہ تو واقعات ہیں جو ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ لیکن غور کرنا اس پر ہے کہ یہ واقعات ہیں کیوں؟

میاں کی بیوی سے محبت اور بیوی کی میاں سے محبت اور ماں باپ کی بیٹا بیٹی سے محبت کیا محض دُنیا کو بسائے رکھنے کے لئے ہے؟ معلوم ہوتا ہے کوئی ہے ضرور جس نے یہ کھیل رچا رکھا ہے۔ بیٹا بیٹی بھی جب پل بڑھ جاتے ہیں تو ان سے وہ محبت نہیں رہتی۔ جو اُن کے پلنے اور بڑھنے کے زمانہ میں ہوتی ہے۔ اِدھر دیکھا کہ انھیں اب ہماری خدمت کی ضرورت نہیں رہی۔ خدمت کرنی چھوڑ دی۔ اِدھر دیکھا کہ انھیں ہماری مدد کی ضرورت نہیں رہی۔ مدد دینی موقوف ہوگئی۔ اِدھر دیکھا کہ انھیں ہماری محبت کی ضرورت نہیں رہی محبت میں بھی فرق آگیا۔ گویا جو فقط ہمارے سہارے جیتا ہے اُسے سہارا دینے پر ہم مجبور کر دئے گئے ہیں۔ بھتیجا بھتیجی۔ بھانجا بھانجی بالکل ہمارے بچوں کی مثل ہوتے ہیں۔ مگر ہم ان سے اپنے بچوں کی برابر محبت نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ اپنے ماں باپ کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور ہمارے محتاج نہیں بنتے۔ حتٰی کہ اپنے بچے کو کوئی دوسرا پال لے تو اُس سے وہ تعلق نہیں رہتا جو اپنے زیر سایہ پلنے والے بچے سے ہوتا ہے۔ بیوی خاوند کی شریک زندگی بنجاتی ہے اور خاوند بیوی کا شریک زندگی بنجاتا ہے اور دونوں اپنے اپنے ماں باپ اور اپنے اپنے بھائی بہن کو بھول جاتے ہیں۔ اِن حالات سے مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ ایک ذات ہے۔ جس نے دُنیا کو بسائے رکھنے کے لئے محبت کا تماشا رچا رکھا ہے۔ ہم محبت کے ہاتھوں دیوانے بنے ہوئے ہیں اور اپنا تن من دھن بیوی بچوں پر نثار کر رہے ہیں۔ خدا ہمارے اِس دیوانہ پن سے خوش ہوتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ساری دُنیا کے لئے ہم ایسے ہی دیوانے بنجائیں البتہ دُنیا سے محبت کرنا ہمارے اختیار میں دے دیا گیا ہے لو بیوی بچوں کی محبت اضطراری ہے۔ بیوی بچوں سے محبت کرنا کچھ ہماری خوبی نہیں ہے۔ بیوی بچوں پر خدا کی مہربانی ہے کہ اُس نے اپنی دُنیا کو قائم رکھنے کے لئے دلوں کو چیر کر اُن کی محبت بھر دی ہے۔ ہماری خوبی جب ہے کہ خدا کی ساری مخلوق ہمیں پیاری ہو جائے۔ کم از کم اتنی کہ ہم ایک دوسرے کا خون نہ پئیں۔ لیکن محبت غالباً اپنے اختیار اور ارادہ سے کی نہیں جا سکتی۔ محبت دل سے اُمڈا کرتی ہے اور دل میں محبت اللہ پیدا کرتا ہے۔ انسان کے قبضہ میں یہ بات نہیں ہے۔ اللہ جس کو چاہے محبت کرنے والا بنا دے اور جس کو چاہے نفرت کرنے والا بنا دے۔

چندمنٹ چنور کے میلے میں

(جناب ابوالحسن صاحب سیتاپور)

سیتاپور میں عیدکے دوسرے دن چنور کا میلہ نہایت شاندار طور پر منایا جاتا ہے میں بھی بدقسمتی سے میلہ دیکھنے پہنچ گیا۔

پہلی دکان ایک کتابوں والے کی تھی۔ دکان کیا تھا ایک لمبا چوڑا بوریا تھا۔ جس پر ایک چادر بچھی تھی۔ چادر سفید تھی لیکن دکاندار صاحب کے پیروں کے نشانات نے جو کہ مٹی لگ جانے سے خوبصورت اسٹیل معلوم ہوتے تھے اور لاتعداد پان کی پیکوں نے سفید رنگ کی سورت کو مسخ کر دیا تھا۔ دکاندار صاحب نے ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی، جاسوسی اور فلمی کتابوں کا اسٹاک جمع کر رکھا تھا۔ چونکہ ہر قسم کی کتابیں تھیں اس لئے ہر قسم کے لوگ کتابیں خرید رہے تھے۔ مذہبی کتابیں تو طیر سن رسیدہ حضرات خرید رہے تھے جن کی سفید ڈاڑھیوں کے سفید رنگ کو حقے کے متر پہ دھوئیں نے پیلا یا زرد بنا دیا تھا۔ مذہبی کتابوں میں "میلاد اکبر" "صبح کا ستارہ" اور "اسلام کھنڈ" خوب فروخت ہو رہی تھیں۔ اور یہ سفید ڈاڑھی والے فرشتہ خصلت بزرگوں کے حصے میں آگئی تھیں گویا مذہب پرستی محض بڈھوں کیلئے رہ گئی تھی۔ باقی کتابیں جن کو اخلاقی، جاسوسی، ادبی اور فلمی کہنا ٹھیک ہے اُن کو عام طور پر وہ لوگ خرید رہے تھے جن کے بالوں میں لگا ہوا تیل ماتھے اور گردن تک بہہ چلا تھا جن کی مونچھیں گیارہ بجکر دس منٹ بجا رہی تھیں۔ چونکہ جاڑے کے باوجود نکریں پہنے تھے۔ ان کی ننگی ننگی ٹانگوں میں سردی لگ رہی تھی اور جن کے کرتے کا دامن بجائے نیکر کے اندر رہنے کے باہر لٹک رہا تھا۔ بعضوں کے ہاتھ میں ہاکی بطور چھڑی کے تھی۔ اور جو کتابیں خریدتے جاتے تھے اور "جیا بھرا کے چلے نہیں جانا" اور "گھمٹا گھنگھور کا وظیفہ ورد کرتے جاتے تھے۔

اخلاقی کتابوں میں "بیتال پچیسی"، "کوک شاستر" "ہدایت نامہ مرد" بہت نمایاں تھیں۔

جاسوسی کتابوں میں "قاتل حسینہ"۔ "بہرام کا خنجر"۔ "فیروز ڈاکو" اور "انگوٹھی کا اصلی چور" بہت قابل دید تھیں۔

ادبی کتابوں میں "دیوان چرکین" بغضدہ بہت مقبول تھے۔ اور فلمی کتابوں کا تو ذخیرہ کا ذکر ہی کیا۔ لوگ اپنے جوق در جوق خرید رہے تھے۔ جن میں "جھومر کے گانے" "پکھنے گانے" اور "میدان کے گانے" خوب بک رہے تھے۔

ہم نے سوچا کہ آخر آج کل کے رسالوں کے ایڈیٹر "نقد و نظر" کے باب میں آخر ان تصانیف کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ بڑی حق تلفی کرتے ہیں وہ لوگ ـــــ نہ ان بیچارے مصنفین کا ذکر کہیں ہوتا ہے جو اتنی لاجواب کتابیں لکھتے ہیں۔ نہ ان مصنفین میں سے کسی ایک کو "نوبل پرائز" ملا۔ گو کہ یہ لوگ لا آئنے نوبل پرائز" پانے کے حقدار ہیں۔ ارے کچھ نہ سہی بہرحال کوک شاستر کو موجودہ نصاب تعلیم میں داخل ہی کر دیتے۔

کتابوں والے کی دکان کے برابر ہی ایک مولوی صاحب نے تعویذ کی دکان لگا رکھی تھی۔ اور وہ ٹکے ٹکے کے اسم اعظم فروخت کرکے مذہب کی اجارہ داری میں مصروف تھے۔ گویا وہ خود اس بات کا ثبوت دے رہے تھے کہ بیسویں صدی کا اسلام تعویذوں تک محدود ہے۔ ان کی ریش مبارک سفید سفید نرم ریشمی، ان کی نورانی پیشانی، ان کی مسکین صورت، ان کی دیانتداری اور فرشتہ خصلتی کو ظاہر کر رہی تھی۔ بے اولادوں کو اولاد ہونے کی بشارت، ناامیدوں کو امید کی بشارت۔ اندھوں کو پیغام بصارت بے نوکری والے لوگوں کو پیغام ملازمت۔ "آگیا بھئی آگیا مراد آباد کا تنھے شاہ آگیا" شاہ جی کی چرب زبانی واقعی قابل داد تھی۔ اسی چیز نے ایک بہت بڑے مجمع کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

دو قدم چل کر ایک کباب والے کی دکان تھی۔ اس دکان پر بہت مجمع تھا اور شاید لوگوں کے لئے یہی ایک سوغات تھی جسے گھر لے جانے کیلئے دل کی ہو رہی تھی۔

تیل کی گلا گھونٹنے والی لطیف خوشبو اور فضا کو معطر کرنے والا دھواں چاروں طرف گلی میں گھومنے والے آوارہ کتوں کی طرح منڈلا رہا تھا۔ تین طرف کا رکھا ہوا پاک و صاف قیمہ جس میں بہت سی بھنبھنانے والی مکھیاں بطور سیاہ مرچ کے پڑ چکی ہونگی۔ آج اسی قیمے کو نہایت ہی نفاست کے ساتھ کبابوں میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ دھوئیں اور تیل کی بدبو سے میرا سر چکرانے لگا اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے دھواں مجھ سے کباب نہ خریدنے کا انتقام لے رہا ہے۔ دھوئیں کے مختلف مرغولے تیرنے والی فضا میں مجھے گندگی سا لگتا ہوا معلوم ہونے لگا میں دماغ میں گھسنے والی تیل کی بدبو سے مرعوب ہو کر کھانستا ہوا آگے بڑھا۔

کباب والے کے بعد ایک پٹی والے کی دکان تھی۔ پٹی شاید حال ہی
میں ایجاد ہوئی ہے۔ گراموفون کی پلیٹ کی طرح گول گول گڑ یا شکر کی بنی ہوئی
ایک بڑی سی سینی میں رکھی تھیں۔ گڑ کی پیلی پیلی پٹی میں چنے کی دال کو نہایت
خوبصورتی اور صفائی کے ساتھ چپکا یا گیا تھا اور یہ دال اس طرح چپکی ہوئی معلوم
ہوتی تھی جیسے غریب پٹی کے چیچک نکل آئی ہو۔ برسات اور گرمیوں کے موسم
میں اس غریب پٹی پر بیسیوں مکھیاں چپٹ چپٹ کر کاٹتی رہتی ہیں۔ ایک تو بیچاری
کے چیچک نکلی ہوئی دوسرے مچھروں کا ستانا بڑا غضب ڈھاتا ہے۔ بڑے تعجب
کی بات ہے کہ لوگ اسی چیچک کی مریضہ کو "کڑکڑ" کرتے ہوئے ہضم کر جاتے
ہیں۔

"گلاب کا مزا پٹی میں" پٹی والے نے نہایت کرخت آواز سے چلا کر
کہا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے فضا میں ایک بہت بڑا پتھر اچھالا ہو اور
بعد میں وہ میرے سر پر ایک زور کے دھماکے سے گر پڑا ہو۔

اب مجھے پورا پورا یقین ہو چلا تھا کہ ہر ہندستانی ایک بہت بڑا ریسرچر
ہوتا ہے۔ مثلاً آپ اس پٹی والے ہی کو لے لیجئے۔ کتنے دعوے کے ساتھ کہتا ہے
"گلاب کا مزا پٹی میں"۔ یعنی اس نے گلاب کا مزا معلوم کر لیا ہے جب ہی اسکو
پٹی کے مزے سے تشبیہ دے رہا ہے۔ اگر یہی پٹی والا یورپ کا یا امریکہ کا رہنے والا
ہوتا تو آج ساری دنیا اسکو کیمسٹری کا نہایت عقلمند محقق تسلیم کر چکی ہوتی۔ مگر
افسوس غریب ہندستانی ہے۔ توبہ توبہ! ہندستانی ہونا کتنا بڑا گناہ ہے۔

پٹی والے کے پاس ایک چاٹ والا بیٹھا تھا۔ ہر چاٹ والے کو دیکھ کر
مجھے یہی خیال ہوتا ہے کہ ہمارے گذشتہ وائسرائے نے زراعت کی ترقی کے لئے
بہت کوشش کی۔ مگر افسوس چاٹ کی ترقی کی طرف انہوں نے مطلق توجہ نہ کی۔ اب
ہمارے موجودہ وائسرائے کا فرض ہے کہ ہر سکول میں دوپہر کو لنچ ٹائم میں چاٹ کا
انتظام کرنا جاری کر دیں۔ اس غذا میں دودھ سے کہیں زیادہ مقوی اجزا ہوتے
ہیں۔ مثلاً پروٹین اور وٹامن تو بے انتہا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آج کل کے
سائنس داں حضرات کچھ جانتے تو ہیں نہیں ——" اور میں نے دیکھا کہ
چاٹ والے نے اپنی دمہ کی طویل بلغمی کھانسی کے بعد فرش پر بلغم کی ایک موٹی
سی تہہ جمع کر دی۔ پھر اس نے ناک چھنکی اور میلی سی دھوتی میں ہاتھ پونچھ کر
جلدی جلدی آلو چھیلنے لگا۔ پاس ہی چند بچے پتے چاٹ رہے تھے ——
مکھیاں اور بلغمی جراثیم بیٹھ بیٹھ کر اپنا کام نہایت تیزی سے انجام دے رہے تھے
اور —— چاٹ والا اپنا کام —— اور چاٹ خریدنے والے اپنا کام ——
—— [illegible] کے بعد مٹھائی سے آراستہ [illegible]

کو دیکھ سکتے۔

آج حلوائیوں کی دکان پر بناسپتی گھی کی دیوی ایک ننھا ناچ ناچ
رہی تھی۔ اس کے گھنگرو اس طرح بج رہے تھے جیسے وہ احمق ہندستانیوں
کا مضحکہ کر رہی ہو۔ اسکی پائل اس طرح بج رہی تھی جیسے وہ ان بیوقوف
خریداروں کو جو بناسپتی گھی کی مٹھائی خرید رہے تھے کہہ رہی ہو کہ تم کتنے احمق
ہو —— ارے —— ! تم تو ایسے دیس کے باشندے ہو جہاں ہزاروں نہیں
بلکہ لاکھوں گائیں بھینسیں ہر وقت گھی دودھ کی نہریں بہانے پر آمادہ ہوں ——
جہاں اصلی گھی منوں مہیا کیا جاتا ہو وہاں کے باشندے ہو کر آخر —— تم بناسپتی
گھی کی بنی ہوئی مٹھائی کیوں خریدتے ہو —— ارے تم بناسپتی گھی کے خلاف اصلی
گھی کیوں نہیں خریدتے —— اگر اصلی گھی نہیں ملتا تو صبر شکر سے کام لو بناسپتی
گھی یک لخت خریدنا چھوڑ دو —— چند دنوں بعد بناسپتی گھی خود بخود بکنا بند
ہو جائے گا۔

مگر اس کی بھلا کون سنتا تھا۔ اس کے اشارے، اس کی زبان کون سمجھتا
تھا۔ مٹھائی بک رہی تھی اور خوب بک رہی تھی۔

میلے میں ایک فوٹوگرافر کی بھی دکان تھی۔ فوٹوگرافر غریب چونی چونی
میں فوٹو کھینچ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو فوٹو ایک چونی میں کھنچ جائے وہ کتنا عمدہ
نفیس اور فوٹو کھنچوانے والے کی شکل سے کس قدر مشابہ ہوگا۔ یہ فوٹوگرافر بیچارے
جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں جب انہیں پچیس روپے کا کلرک بھی بنانے
سے انکار کیا جاتا ہے تو مجبور ہو کر فوٹوگرافر ہی بن جاتے ہیں۔

"بابوجی! فوٹو کھنچوائیے گا؟" اس نے مجھے اپنی طرف سے گذرتے ہوئے
دیکھ کر کہا۔

"نہیں بھئی!" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا
تھا کہ بھئی یہ چونی لے لے گا۔ میں فوٹو نہیں کھنچواؤں گا۔ اس کی خوددار طبیعت
نے گوارا نہ کیا۔ اس لئے میں نے آج لاپرواہی سے "نہیں بھئی!" کا مختصر سا نفی
میں جواب دے دیا۔

اب سب دکانوں کے بعد ایک چائے والے کی دکان تھی۔ چائے والا
کسی زمانے میں میرا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ لیکن اس نے چوتھی جماعت کے بعد یہ
دکان کھول لی تھی۔ میں اس سے بالکل دوستوں کی طرح ملتا تھا۔ چنانچہ آج بھی اس
کی دکان پر چند شکوے شکایتوں کے بعد ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

"چائے ہو گی؟" میرے پرانے کلاس فیلو سعید خاں نے پوچھا۔

"پینا ہوتا تو خود اپنے ہاتھ سے نکال کر پی لیتا۔ کوئی تکلف تھوڑی ہے۔
گھر میں چائے پی کر ابھی آیا ہوں"

پاس ہی ایک صاحب بیٹھے تھے جن کے کوٹ پر ایک بلے پر "پاکستان لے کے رہیں گے" لکھا تھا۔ دوسری بنچ پر دو کھدر پوش "جے ہند" کا بیج لگائے بیٹھے تھے۔ وہ غالباً ایک پھونے چار ٹانگ کی چھوٹی سی میز پر رکھا ہوا اخبار "تیغ ہیر الڈ" دیکھ رہے تھے۔

کچھ فاصلہ پر دو تین میزوں پر چند پائجامے شیروانی والے چائے پی رہے تھے۔

"صاحب! بڑے جمالی، کمالی اور جلالی بزرگ ہیں۔" ایک مفلوج بڈھے نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"کون؟ یہ جو اسم اعظم تقسیم کرتے ہیں نا؟" ایک بے پھندنے کی ترکی ٹوپی والے نے پوچھا۔

"ہاں! یہ تو ——"

"اماں وہ سندھ کے الیکشن کا کچھ ٹھیک ٹھیک پتہ چلا؟" میرے پاس ایک مسلم لیگی نے جناح کیپ کو ٹھیک سے پہنتے ہوئے کہا۔

"ہوتا کیا صاحب وہاں تو لیگ ہار گئی۔" پونے چار ٹانگ کی میز پر رکھے ہوئے اخبار کو دیکھتے ہوئے ایک کانگریسی نے جواب دیا۔

"اتفاق ہے صاحب ورنہ ——"

"بابو جی ایک پیسہ!" ایک فقیرنی نے اس سیاسی گفتگو کو توڑتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی راہ میں ایک پیسہ!" اس نے لیگی کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہٹ دور ہو! چل بھاگ!!" لیگی نے پاکستانی بلے کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"[illegible] بھلا ہو تمہارا [illegible] آتما۔" فقیرنی نے کھدر پوش کی طرف [illegible]

"[illegible]" کانگریسی نے اپنی گاندھی کیپ [illegible]

"[illegible] سعید خاں! معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس فقیرنی کو آدھے [illegible] سا سمجھ لیا ہے —— نکالو اسے —— یہ تمہاری ہے کون ——؟" لیگی نے سعید خاں سے کہا۔

چل بھاگ یہاں [illegible] نہیں ہیں۔"

"لو بڑی بی" میں نے ایک اکنی اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔" فقیرنی نے میری طرف شکر گزار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ پاکستانی نونہالوں اور بھارت ماتا کے سپوتوں کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر چل دی۔

"میاں آپ کا ایسا فالتو پیسہ ہے تو ہم ہی کو دے دیا ہوتا۔" سعید خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوں ——"

"شیر خان جی! آپ نے بڑا برا کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بھارت درش کے فقیر اگر بھیک مانگنا چھوڑ دیں تو ہمارا دیش آزاد ہو سکتا ہے۔ پرنتو آپ لوگ انہیں بھیک دینا نہیں چھوڑتے۔ ہماری تو یہی اچھا ——"

میں وہاں سے تیز قدموں سے بھاگ آیا۔ سعید خان پکارتے رہ گئے —— میں نے اس میلے میں سے کوئی چیز نہیں خریدی۔ کیونکہ یہ میلہ مجھے ایک ڈرامہ معلوم ہوتا تھا۔ جس میں ہندستانیوں کے ذلیل اعتقاد، اُن کی گندی عادتوں، اُن کے پست مذاق، اُن کے گرے ہوئے کیرکٹر کو نہایت ننگا کر کے دکھایا گیا ہو۔ میں میلے سے بھاگ رہا تھا —— بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا —— خوانچے والوں اور دکانداروں کی کرخت آوازیں دور تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔

مفتی صدرالصدور کا دیوان خانہ

(از جناب خواجہ محمد شفیع صاحب)

میانہ قد کھلتا ہوا رنگ۔ تیز اور پرشور آنکھیں موٹی موٹی بھویں۔ کھلی ہوئی پیشانی۔ سر پر خشخاشی بال۔ متنبہ متوسط اور موزوں ڈاڑھی۔ ۔ یہ ہیں مفتی صدرالصدور صاحب آزردہ۔

سامنے پری چہرہ۔ حور شمائل۔ غلماں حرکات ایک نوعمر لڑکا بیٹھا ہے یہ ہیں میاں سنگی بیگ مفتی صاحب قبلہ کے مصاحب خاص۔ سفید کشادہ پیشانی پر کنارسی بھویں جیسے مصری کے کوزہ پر ہونٹوں کی قطار یا برف پر آبِ جیحون کی دھار ۔۔۔ مہتابی چہرہ پر رخسار گلگوں جیسے چاند میں خوش منظر داغ ... چشم چشمک زن چھپا کی گلی۔ دہن نیم باز اس میں دُرِ دنداں اس طرح چمک رہے ہیں جیسے تختہ عاری انار میں ہاتھی دانت کا چاقو۔ بالوں میں گردن پر کاکل شکیں جیسے زہرہ پر عقرب کا ... رفتار بلا۔ معصاں ... ہوا۔

مکان اُس دور کی مشرقی معماری کا بہترین نمونہ۔ حسن مذاق کی ارفع ... مثال ۔۔۔ کشادہ چبوترہ کے پیچھے متناسب محرابوں کے دالان در دالان۔ ... سامنے خوشنما نہر اس کے گرد سرو کی باڑھ اس طرح کھڑی تھی جیسے پوشیدہ تسلیم کے گرد مہمان۔

مفتی صاحب اور میاں سنگی بیگ۔ چبوترہ پر تشریف فرما ہیں۔ جناب کا انتظار ہے۔ مونڈھے بچھے ہیں کہ مرزا ثریا جاہ تشریف لائے۔ مجسم انسان۔ سیاہ فام۔ آبنوس کا کندہ یا سنگ موسیٰ معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔ موٹے موٹے بھونڈے خدوخال۔ ہاں نگاہوں کی تیزی دل کی گہرائیوں میں اتری جاتی ہے۔ چشم بینا میں آنکھ صدر رس اور معاملہ فہم ہے ۔۔۔ بات کی تہ میں پہنچ جانے والی۔ راز کرید کر نکال لانے والی۔ اشارہ میں معاملہ سمجھ جانے والی۔ کنایہ میں بات پا جائے۔

مفتی صاحب اور میاں سنگی بیگ نے سروقامت تعظیم دی اوّل اللہ کر ... بٹھایا۔ آخر اللہ کرنے پان پیش کئے ملازم نے حقہ سامنے لا کر رکھا

اب سلسلہ گفتگو شروع ہوا۔ مرزا صاحب بولے میں کل دوپہر کو در دولت پر حاضر ہوا تھا۔ آپ تشریف نہ رکھتے تھے۔ باہر کوئی ملازم بھی نہ تھا۔ محل سرا میں کہلوا دیا تھا آپ کو اطلاع ہوئی ہوگی۔

مفتی صاحب مسکرائے اور فرمایا اوہو اب عقدہ کھلا کہ کل حضور تشریف لائے تھے۔ صاحب عالم کل سے اسی شش و پنج میں ہوں کہ کل مرزا مجبر صاحب میرے پاس کون آئے تھے۔ جب احقر گھر آیا تو اہلیہ نے اتنا بتایا کہ کوئی مرزا مجبر تشریف لائے تھے۔ اب خادم کو یہ پیچ و تاب ہے کہ جناب والا صاحب عالم مرزا ثریا جاہ سے مرزا مجبر کیسے ہو گئے۔ اگر اجازت ہو تو اندرون خانہ دریافت کر آؤں۔ پھر یہ تبدیل نام کا راز جناب سے بھی عرض کروں گا۔

مرزا صاحب نے فرمایا صاحب جلدی جائیے مجھے بھی تلاش لگی ہوئی ہے مفتی صاحب اندر تشریف لے گئے۔ یہاں اتنے میں ایک دو احباب اور آ گئے لیکن یہ پچھلی صفوں کے بیٹھنے والوں میں تھے سلام کر کے اپنے مقام پر جا بیٹھے ان کے سامنے خاصدان ملازم لایا وہ بھی سنگی بیگ کا اشارہ پا کر۔

اتنے میں مفتی صاحب برآمد ہوئے۔ چہرہ پر تبسم کھیل رہا تھا۔ فرمایا۔ حضور صاحب عالم کیا عرض کروں عجیب لطیفہ ہے اور لطف یہ کہ وہ بھی اپنی جگہ حق بجانب ہے ۔۔۔ بندہ نواز جس وقت ملازم نے حضور کا نام نامی بیوی سے کہا اس کے سامنے صراحی رکھی تھی اس لئے اس پر یاد کر لیا ان عورتوں کا یہ دستور ہے ہی کہ کسی نہ کسی سہارے سے بات یاد رکھتی ہیں۔ اب جب میں گھر آیا تو صراحی کی بجائے اس کے ذہن میں مجمری آ گئی اور جناب والا کا اسم گرامی مرزا ثریا جاہ سے مرزا مجبر ہو گیا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ناظم علی داستان گو آن پہنچے سلام کر کے پچھلی صف کے ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ مرزا صاحب ان کی جانب ... مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ میر صاحب آپ کی کیا خبر تھی۔ جب پہلی مرتبہ حضور بہادر شاہ صاحب کی خدمت میں داستان سنائی۔ ذرا وہ سارا واقعہ مفتی صاحب کو

میر صاحب سے کہا حضور میں کم و بیش چودہ برس کا تھا کہ والد کا بلاوا کسی ریاست سے آیا۔ ابھی رقم ملنے کی امید تھی لیکن ادھر شاہی ملازمت کا سوال روزانہ کی حاضری کا مسئلہ درمیان۔ آخر کار جہاں پناہ سے دست بستہ چند روز کی اجازت طلب کی نیز یہ بھی عرض کیا کہ غلام زادہ روزانہ حاضر ہو کر داستان پیش کیا کرے گا۔

جو میدان بیان کر رہے تھے وہ مجھے بتا گئے۔ محل اور موقع یہ تھا کہ دربار آراستہ ہے۔ حاجب پردہ اٹھانے کو تیار۔ خانہ زاد بلاناغہ حاضری دیتا رہا۔ مقررہ عرصہ داستان بیان کرتا رہا لیکن پردہ تھا نہ اٹھنے دیا۔ داستان جس میدان میں تھی وہیں رہی ایک انچ نہ سرکی۔ والد نے واپس آن کر مجھ سے پوچھا کہ کس مقام تک پہنچا میں نے عرض کی ابھی پردہ نہیں اٹھا ہے۔ وہ بہت ناراض ہوئے کہا تو گیا ہی نہیں ہوگا مردود۔ اب عتاب مجھ پر ہوگا۔ میں نے کہا۔ میں تو برابر حاضری دیتا رہا ہوں۔ اماں نے بھی تصدیق کی لیکن ان کو یقین نہ آیا بولے گھر سے چلا جاتا ہوگا۔ تم پردہ کی بیٹھنے والی تم کو کیا خبر اپنے یاروں میں آوارہ گھومتے پھرتے ہوں گے ——— غرضیکہ شام کو والد بہت ڈرتے ہوئے گئے۔ کورنشات بجا لانے کے بعد دست بستہ عرض کی کہ نمک خوار معافی کا خواستگار ہے۔ از بزرگاں عطا۔ ارشاد ہوا۔ میر صاحب کس امر کی معافی۔ عرض کیا۔ حضور میرا لڑکا شاید غیر حاضر رہا فرمایا نہیں وہ تو روزانہ آتا تھا۔ عرض کی سرکار جہاں پناہ پردہ پوشی فرماتے ہیں۔ ۔ علاقہ بگوش شکر یہ نہیں ادا کر سکتا۔ شاہ نے پھر کہا میر صاحب یقین جانئے وہ تو روز آتا رہا اور داستان بھی سناتا رہا۔

اب والد متحیر۔ دست بستہ قدم چھو کر عرض پرداز ہوئے اور کہا ظل الٰہی حضور کا سایہ تا قیامت قائم رہے۔ غرض جب والد نے واپس آکر غلام زادہ سے دریافت کیا کہ داستان اب کس میدان میں ہے تو اس نے کہا اسی میدان میں جہاں آپ چھوڑ گئے تھے اور ابھی پردہ بھی نہیں اٹھا ہے۔

زبان دربار سے ارشاد ہوا میر صاحب اس نے صحیح کہا ہم تم کو مبارک باد دیتے ہیں یہ لڑکا تم سے بہتر نکلے گا قدرت نے اسے داستان گوئی کے لئے تخلیق کیا ہے۔ انشاء اللہ تمھارا نام روشن کرے گا۔

مفتی صاحب بولے صاحب عالم میر صاحب کی طاقت لسانی کا جواب نہیں وہ کہیں ان کا بیان ضبط تحریر میں آجائے تو ادبی شاہکار ہو۔ میں تو یہ سامنے کون ٹھہرتا۔

میر صاحب نے کہا۔ آپ کیا فرماتے ہیں خاکسار تو خاک پا بھی نہیں۔ کچھ بزرگوں سے حاصل کیا ہے کچھ ان قدموں میں بیٹھ کر سیکھا ہے۔

ثریا جاہ بولے۔ میر صاحب میں بھی آپ کی خوش گفتاری۔ شیریں بیانی اور حافظہ کا قائل ہوں۔ مفتی صاحب کی جانب مخاطب ہو کر کہا۔ بندہ نواز ایک روز میرے ہاں دعوت پر کچھ انگریز آئے۔ میں نے میر صاحب کو بھی تکلیف دی۔ کھانے کے بعد داستان شروع ہوئی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ انگریز کسی کے ہاں مقررہ وعدہ سے زیادہ نہیں رکتے نہایت پابند اوقات ہیں چنانچہ اس روز گو حسب قرارداد محفل گیارہ بجے برخاست ہونی تھی لیکن ان کے بیان نے ایسا مسحور کر لیا کہ ساڑھے بارہ بج گئے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ اس روز صاحب میں بھی قائل ہو گیا۔ میں تو زندہ جادو کہتا ہوں۔ خدا کی دین ہے۔

میر صاحب کھڑے ہو کر آداب بجا لائے اور کہا آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم

ابھی یہ سلسلہ تکلم جاری تھا کہ استاد میر جان آن پہنچے۔ یہ فی زمانہ جوڑ توڑ میں فرد ہیں۔ اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اس فن میں یکتائے روزگار ہیں۔ احباب ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ نقل محفل بناتے ہیں پر ان کے کھاتے میں نہیں جاتی۔ ایک ایک کوڑی جوڑ کر پیسہ بناتے ہیں پیسوں سے روپیہ اور روپوں سے اشرفیاں جز رسی کو انھوں نے باقاعدہ ایک فن کی شکل دے دی ہے۔ شہرہ اے نہار منہ ان کا نام نہیں لیتے۔ ہاں پیچھے ہیں انہیں شاید یہ خرچ باندھنا نہیں چاہتے تھے محروم رہے۔ اس میں بھی کچھ بہتری ہی تھی ورنہ ان غریبوں پر عجب بپتا پڑتی۔ اپنا دو زخ شکم دل پر پتھر رکھ کر آدھا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ ایک روز نواب شمس الدین خاں نے کہا کہ استاد آخر آپ کو روپیہ جوڑنے میں کیا مزا آتا ہے تو فرمایا بندہ نواز آپ کو ناچ دیکھنے اور پائل کی جھنکار سننے میں جو لذت ملتی ہے وہی مجھے اشرفی کی کھنک میں حاصل ہوتی ہے۔ اپنا اپنا ذوق ہے۔

مجھے دنیا پر تعجب ہے کہ ناجائز خلاف شرع خوشیاں تو دنیا گوارا کر لیتی ہے کوئی کچھ نہیں کہتا لوگ جائز شوق کے مزے آتے ہیں انسان کو کوستے ہیں۔

نواب صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

غرضیکہ یہ کنجوس مکھی چوس بھی آن کر اپنی حیثیت کے مطابق بیٹھ گئے۔ احباب نے نیم نگاہی سے دیکھا ایک آدھ شوخ چشم نے فقرہ کسا یہ بیٹھے گھڑے مسکراتے رہے۔

ایک شخص کھنکارتا ہوا صدر دروازے میں سے داخل ہوا سب سرو قد کھڑے ہو گئے ـــــ بڑی بڑی تیز آنکھیں۔ رنگ سپیدہ شہاب . . . کشادہ پیشانی جس کی تحریروں فکر بلیغ کلھتے دیے رہی تھیں قد شکل سرو جو رفتارِ مہ و سال کے ہاتھوں قدرے جھک گیا ہو۔ لمبے ہاتھ ستواں سی ناک یہ نواب اسد اللہ خاں غالب ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنے قریب بٹھایا سنگی بیگ نے خاصدان بصد ادب پیش کیا غالب نے بیک تبسم بیڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔

زبسکہ ہاں چناں ممنونِ احساں ہو بھوگشتم :

بہ باطن قوتِ دل شد بظاہر سرخ رو گشتم

ملازم باادب نے بہ ہزاراں احتیاط چاندی کا حقہ پیش کیا۔ غالب نے کہا۔

طاش قلیاں میں رکھا ہے اس نے ابر مردہ کو

ڈوب مر رو رو کے تو اے ابر بہمن آب میں

پھر فرمایا استاد ذوق کو خدا غریق رحمت کرے ظالم نے کیسا پیارا شعر کہا ہے۔ مفتی صاحب سچ عرض کرتا ہوں۔ وہ کیا گئے کہ لطفِ مذاقِ سخن گیا۔

یہ شعر اکثر و بیشتر یاد آتا ہے اور تڑپا جاتا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مرزا الٰہی بخش بولے مرزا صاحب ہم تو آپ ہی کے قائل ہیں حالانکہ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔ آپ کی بات آپ ہی کے ساتھ ہے۔

غالب نے کہا۔ یہ جناب کی ذرہ نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ اردو شاعری میں اگر اس خاکسار نے کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ خودداری و استغنا کی ادا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

یا۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ذوق کو محاورہ اور تمثیل پر بڑا عبور تھا۔ نیز بحر علمی اور ہمہ گیری بھی نصیب۔

مفتی صاحب نے فرمایا مرزا صاحب۔ معاف فرمایئے گا اس تبحر کے ہم قائل نہیں ہاں اتنا تسلیم کرنے کو تیار ہیں کہ ہر علم و فن کی . . . اصطلاحات پر انھیں بے شک عبور تھا۔

غالب نے جواب دیا۔ حضور شاعری کے لئے اتنا ہی درکار ہے اس سے زائد کی ضرورت ہمیں نہیں پڑتی۔

مفتی صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ مرزا الٰہی بخش بولے مفتی صاحب کل جو جناب نے اپنا تازہ ترین ایک مصرعہ سنایا تھا ذرا ایک بار پھر ارشاد ہو جائے۔ حضرت غالب نے بھی اصرار کیا۔ مفتی صاحب نے کہا۔ یوں ہی سا ایک مصرعہ ہو گیا تھا عرض کئے دیتا ہوں:

ترکے در آمد خنجر دو یک سانگین مے زدہ

غالب نے روانی کی داد دیتے ہوئے کہا کہ مدتوں کے بعد لفظ سانگین سننے میں آیا ہے۔ واصفانی کے ہاں نظر سے گذرا تھا۔

صاحب عالم مرزا الٰہی بخش کے اصرار پر حضرت غالب نے اپنا تازہ ترین ایک شعر پیش کیا۔ فرمایا

بشر کو ہے نشاط کار کیا کیا ٭ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

صاحب عالم مرزا الٰہی بخش تو فکر میں پڑ گئے ہاں مفتی صاحب نے داد دی۔ صاحب عالم بولے مرزا صاحب یہ نشاط سمجھ میں نہیں آیا۔ غالب نے مفتی صاحب کی جانب دیکھا وہ بولے بندہ نواز یہ فارسی کا نشاط نہیں۔ عربی کا نشاط ہے۔

غالب نے کہا ماشاء اللہ مفتی صاحب مانتا ہوں شعر کے اصل نکتہ کو جناب پا گئے۔ صاحب عالم بولے۔ ہماری اب بھی سمجھ میں نہیں بیٹھا۔ مفتی صاحب نے جواب دیا بندہ نواز عربی میں نشاط کے معنی تعجیل کے ہیں۔ استاد نے دوسرے مصرعہ میں مزا لکھ کر ذرا دھوکہ میں ڈال دیا ہے اور کچھ نہیں۔ اگر نشاط کے معنی مسرت کے لے کر شعر کا مفہوم لیا جائے تو صحیح نہیں بیٹھ سکتا۔ چونکہ لطف حیات تو بے خبری ممات ہی میں ہے۔ اگر کسی انسان کو آج معلوم ہو جائے کہ چھ مہینہ بعد اس کی موت آ گئی ہے تو لطف زیست ختم ہو جائے گا تعجیل کار بڑھ جائے گی۔ جس کو حضرت غالب نے نشاطِ کار کہا ہے۔ اب دوسرے مصرعہ میں مزے کو لیجے جو دھوکہ میں ڈال رہا ہے۔

اگر کسی کے پاس وقت کم ہو اور کام زیادہ تو جتنا جتنا کام سمٹتا جاتا ہے

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

فقیر۔ ہاں ہاں تم نے ٹھیک کہا یہ بحث کرنے کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تعلق دل سے ہے اور اسی لئے اسے دل سے ماننا چاہیئے نہ کہ دماغ سے۔

مسافر۔ بابا آخر آپ آبادی میں کیوں نہیں جاکر لوگوں کو درس دیتے ہیں؟

فقیر۔ بیٹا اول بات یہ ہے کہ یہ نئی تہذیب کے دیوانے ہماری بات کب سنتے ہیں۔ وہ تو نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابھی میری آواز میں اتنی طاقت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ ان نئی تہذیب کے دلدادہ لوگوں کے دلوں میں جگہ کرے۔

مسافر۔ بابا آج میں نے اندھیری رات میں وہ نور دیکھا جو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اندھیری رات کی سیاہی میں راستہ بھول نہیں گیا۔ بلکہ حقیقت سے واقف ہوگیا۔ میں نے رات کے سناٹے میں آپکے گانے کی آواز نہیں سُنی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آواز میں حقیقت بھی شامل تھی جس نے مجھے راہ پر لگا دیا۔ اب میں آپ ہی کے ساتھ رہوں گا۔ اور آپ ہی کے ساتھ ان خیالات کا دنیا پر اظہار کرتا رہوں گا۔

(بجلی کی چمک اور بادل کی دل ہلا دینے والی گرج)

فقیر۔ (کچھ خوشی کے لہجہ میں) اچھا اچھا جو جی چاہے کرنا۔ بابا تو بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اب ذرا سو پھر صبح بات کرینگے +

مشعلِ راہ میری نظر میں

(جوش ملیح ابادی)

نخشب جارچوی ایک خوش طبع اور خوش فکر نوجوان ہیں ان کی شاعری بھی ان کی طرح جوان ہو۔ انکے بیان میں تازگی اور لہجے میں شیرینی کا عنصر بہت خوبی کے ساتھ سمویا ہوا ہے ان کی عشقیہ شاعری سے معلوم ہوتا ہو کہ دیگر غزل گویوں کی طرح اُنکا عشق روایتی اور اُنکا محبوب موروثی نہیں۔ بلکہ یہ اس وادی سے گذرے اور اسکے طوفان سے خود کھیلتے ہیں۔ یہی حال ان کی مناظر پرستی کا ہو۔ اُنہوں نے گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر باغوں، جنگلوں اور کہساروں پر خامہ فرسائی نہیں کی ہو، بلکہ کھلی ہوائیں سیر کر کے حُسنِ قدرت کا مطالعہ کیا ہو جسکے اُبھرے ہوئے نقوش نظروں کو ٹھیرا کر دماغ کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے ذہنی ارتقا اور بلوغ کی گواہی دے رہی ہیں۔ اور پاکیزہ و صالح علامت میں اُنہیں مُبارکباد دیتا ہوں۔

فن کی قیمت

(از جناب وحشی رحمانی)

نجمہ رقص سے فارغ ہو کر جب اپنے ڈریسنگ روم میں واپس آئی تو قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر بہت دیر تک وہ اپنے مجسمۂ حسن و شباب کو والہانہ انداز سے دیکھتی رہی .... اپنے ہر عضو پر تحسین نظریں ڈال رہی تھی .... بار بار مسکراہٹیں اُسکے ہونٹوں پر کھیل رہی تھیں .... وہ خوش تھی اور بہت خوش، اور کیوں نہ ہوتی! آج کی رات اُس کے فنِ رقص کی معراج کی رات تھی ـــــ آج اُس نے اپنے رقص کا فنکارانہ طریقہ پر بہت شاندار مظاہرہ کیا تھا ـــــ آج اُس کے رقص نے فضا میں موسیقی بکھیر دی تھی ـــــ آج اُس کے رقص نے دلوں میں گھنگروؤں کی جھنکار بھر دی تھی ـــــ اُس کے جسم کے لوچ نے کٹر سے کٹر عقیدہ رکھنے والوں کو موم کر دیا تھا ـــــ وہ آج بھی خوش نہ ہوتی؟ .... یوں تو اُس کے رقص سے متاثر ہو کر بڑے بڑے سیٹھ، ساہوکار، مغرورانہ چال چلنے والے لیڈر، سماج و مذہب کے ٹھیکیدار ـــــ جبہ و دستار کی نمائش کرنے والے مولوی، تلک دھاری پنڈت، پارسائی کا دعویٰ کرنے والے نوجوان ـــــ سب ہی اُس کے سنگِ در پر وقتاً فوقتاً اپنی پیشانیاں رگڑ چکے تھے ـــــ مگر "ارشد" .... ایک بلند پایہ ادیب و شاعر، موسیقی کا دلدادہ، رقص کا شوقین اور ساتھ ہی کیرکیٹر رکھنے والا وجیہہ نوجوان ـــــ اُسکے آستانۂ حسن و عشوہ طراز نگاہوں کی دسترس سے ابتک دور تھا .... مگر .... آج باز نے چڑیا کو اپنے پنجے میں دبوچ ہی لیا .... اور ارشد ـــــ ایک زخم خوردہ پرندے کی طرح، آسمان کی بلندیوں سے زمین پر آ گرا .... وہ خوش تھی، اُس کی رگوں میں گرم گرم خون مسرت کی لہریں بنکر دوڑ رہا تھا۔ "ارشد" جس کو وہ چاہنے لگی تھی، وہی "ارشد" جو ایک نگاہِ التفات سے دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا تھا ـــــ آج اُس کے یہ الفاظ اُسکے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے ـــــ "نجمہ! تمہاری کیف آفرین آواز اور نغمے .... اُف تم گاتی نہیں ہو، منتر پڑھتی ہو ـــــ تو ٹوٹے نکالتے ہوئے تمہارے پاؤں، دلوں پر پڑتے ہیں ـــــ تمہاری حرکت ایک بے پناہ کشش اور تمہارا رقص ایک مکمل سحر ہے .... نجمہ! تم رقاصہ نہیں ہو، جادوگرنی ہو ـــــ یقیناً جادوگرنی"

نجمہ خوش تھی اور بہت خوش۔ آج کی رات اُس کے لئے فتح و کامرانی کی زریں رات تھی ـــــ آج اُس نے اُن نگاہوں سے بھی اپنی عظمت و احترام کا خراج وصول کر لیا تھا جو کبھی اُس کی طرف اٹھنا گوارا نہ کرتی تھیں۔ آج اُن ہاتھوں نے اُس کے قدموں پر عقیدت کے پھول نچھاور کئے تھے جن کو وہ صرف دیوتاؤں کے لئے وقف کئے ہوئے تھی .... وہ بار بار اپنے سڈول جسم کا بغور معائنہ کر رہی تھی ـــــ آج اسی نازک جسم نے اپنی انتھک کوششوں کے بعد ایک سرکش اور ضدی نوجوان پر فتح پائی تھی ـــــ اُس نے ہلکا سا جھٹکا دیکر مغرورانہ انداز سے اپنے سر کو اٹھایا اور شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے مسہری پر آ گئی اور پردے چھوڑ دئے ـــــ

نجمہ کے دل و دماغ پر آج کی غیر متوقع کامیابی کا گہرا اثر تھا ـــــ اُس کی نظروں میں وہی مناظر ناچ رہے تھے .... کھچا کھچ بھرا ہوا ہال ـــــ نئی نویلی دلہن کی سیج کی طرح سجا ہوا اسٹیج ـــــ بصد ناز و انداز اُس کی آمد ـــــ تماشائیوں کے ہمت آفریں نعروں سے اُس کا استقبال ـــــ اُس کا ایک شانِ استغنا سے سب پر نظر ڈالنا اور نگاہوں کا گھوم پھر کر "ارشد" پر جم جانا ـــــ ارشد کا بے التفاتی سے رُخ پھیر لینا ـــــ پھر اپنے فن کے اظہار کا آغاز ـــــ اور پھر اُسکو آرٹ کی بلندیوں سے بھی بلند تر پہنچا کر اُس کا اختتام ـــــ ہزاروں حسرت بھری نگاہوں کے ہجوم میں اُس کا اسٹیج سے اتر کر اپنے کمرہ کی طرف جانا ـــــ راستہ میں سینکڑوں عقیدت مندوں کا تحفوں سے اظہارِ عقیدت ـــــ اور آخر میں "ارشد" کا ایک شرمندہ کی طرح آکر اعترافِ شکست ـــــ سب سے زیادہ کامیابی و شادمانی کا .... اُس کا سر گھومنے لگا اور اِن تصویروں کی آغوش میں وہ آسودۂ خواب ہو گئی ـــــ یکایک ایک چیخ کمرے کی فضا میں گونج گئی ـــــ گھبرائی ہوئی، پریشان نجمہ مسہری سے اتر کر قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی ـــــ اُس کے چہرے پر ایک خوفناک اور بھیانک خواب دیکھنے کے آثار نمایاں تھے ـــــ وہ پھر آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے سرو قد، گداز جسم، سیاہ و عنبر افشاں زلفوں، اور تناسبِ اعضا کا جائزہ لے رہی تھی "اُف ....[illegible] جو سکتا ہے بے اختیار [illegible]

منہ سے [illegible] ——— وہ آئینہ کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی ——— ایک لمحہ کے لئے اُس کی گردن نیچے کی طرف جھک گئی؛ پھر مسکرا کر اُسنے آئینہ کی طرف دیکھا۔ اور اُسکے واہمہ نے خواب کے نقش و نگار کو حقیقت کا لباس پہنانا شروع کر دیا ——— اُسکی جوانی بسرعت بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی تھی ——— مجھ حیرت سے منہ کھولے ہوئے دیکھ رہی تھی اور.....

اور پھر اُسنے دیکھا ——— ایک بڑھیا؛ ساٹھ سالہ بڑھیا ——— ہڈیوں پر کھال منڈھی ہوئی ——— جھکی ہوئی کمر ——— ہلتی ہوئی گردن ——— بال روئی کے گالے کی طرح سفید ——— جھریاں پڑا ہوا بے نور چہرہ ——— اندر کو دھنسی ہوئی ویران آنکھیں ——— رعشہ دار ہاتھ پاؤں ——— تنہا۔ اُداس۔ لاچار۔ غمگین۔ مایوس اور.......... اور وہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس منحوس مجسمہ کو ——— اُسنے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا" وہ چیخ اٹھی۔ "کیا فطرت میرے عدیم المثال فن کا یہ انعام دیگی! ——— کیا قدرت مجھ سے یہ رعنائیاں اور یہ دلربائیاں چھین لیگی؟ کیا جوانی میرے کمال کی مظہر ہے؟ ——— ——— ——— اُسنے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لئے، اور پھر ایک نظر بھر کر آئینہ کی طرف دیکھا ——— اُسکی ریشمیں خمدار سیاہ زلفیں، اُسکے دونوں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ ——— اُس کا قدِ رعنا پیامِ شوق کا علمبردار تھا ——— اُسکے نورانی جسم سے ریشمیں لباس ہم آغوش تھا ——— متوالی آنکھوں کی کشتیاں، شباب و جوانی کے سمندر میں تیر رہی تھیں ——— متناسب اعضاء، نہ بھولنے والے خدوخال، ہر چیز اپنی جگہ صناعِ فطرت کی بہترین فنکارانہ صلاحیتوں کی ضامن تھی ——— مگر ——— اب وہ سوچ رہی تھی، "اپنے فن کی قیمت" ——— کیا دنیا والوں کی تحسین و آفرین، میرے فن کی قیمت ہو سکتی ہے؟ ——— گویا اُسکو ہوش سا آتا جا رہا تھا ——— "وہی رٹے ہوئے چند بے معنی تعریفی جملے ——— سسکتی ہوئی نمائشی آہیں ——— بناوٹی آنسو ——— کیا یہی میرے فن کی قیمت ہو سکتے ہیں؟ ——— کیا قدرت مجھے دائمی جوانی عطا کرکے میرے فن کی قیمت ادا نہیں کر سکتی؟ ——— کر سکتی ہے .... مگر نہیں...... وہ ایسا نہیں کر سکتی .... پھر میرے فن کی قیمت ..... ارشد....... ہاں ہاں ارشد......... مگر نہیں ——— وہ بھی اپنے کیریکٹر کی بلندی سے نیچے آ چکا ہے ——— عام آدمیوں کی سطح پر .... اور میرے فن کی قیمت؟ اب اُس سے بلند ہے ———

بدگمانی

(محترمہ نکہت نسیم صاحبہ)

تری نظر کی اداسی میں پڑھ رہی ہوں میں
فسانۂ شبِ عشرت نگارشِ غمِ ہجر
ترے لبوں کی فسردہ سی مسکراہٹ میں
میں سن رہی ہوں کسی رہزنِ سکوں کا ذکر
جبینِ ناز کی شکنیں بتا رہی ہیں مجھے
ترے دماغ سے بل کھا رہی ہو کوئی فکر
جھلک رہی ہے مئے تلخ کام چہرے سے
عیاں ہے ایک فسردہ سی گام چہرے سے
یہ تیرے ساز کے پردوں میں بھر دئے کس نے
فسردہ۔ ٹوٹے۔ لرزتے ہوئے سے کچھ نغمے
شکستِ ساز کی آواز چھپ نہیں سکتی
میں سن رہی ہوں سسکتے ہوئے سے کچھ نغمے
ترے لبوں پہ یہ بہتے ہیں کس لئے آخر
یہ جیتے جاگتے۔ ہنستے ہوئے سے کچھ نغمے
تری نگاہوں میں اک جستجو سی رقصاں ہے
ترے خیال میں اک آرزو سی غلطاں ہے
تری خموشیاں اک راز ہیں مگر پھر بھی
یہ راز میری نگاہوں سے چھپ نہیں سکتا
میں جانتی ہوں کہ ان بہکی باتوں میں
بہت ہی گہرا تسلسل ہے کوئی سویا ہوا
ترے خیال کی کرتا ہے صاف غمازی
بغیر بات ترا یوں ہی مسکرا دینا
یہ میرے صبر و تحمل کا امتحاں تو نہیں
یقین جان کہ میں تجھ سے بدگماں تو نہیں

(افسانہ)

سہارا

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ)

بسنت رُت کی اس پر بہار شام کو خیام کلب کے زندہ دل ممبر بہار دیوتا کی آمد پر خوشیاں منانے میں مصروف تھے جدھر نظر جاتی تھی بسنتی ساریاں اور دوپٹے لہرا لہرا کر بسنت رُت کا سماں پیش کر رہے تھے۔ مردوں نے بھی موسم کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے سرسوں کے پھول اپنے کوٹوں اور شیروانیوں کے کاجوں میں اٹکا لئے تھے۔ کسی شوقین طبع رنگین مزاج کا ہلکے بسنتی رنگ کا کرتا شیروانی کے نیچے سے اپنی جھلک دکھا رہا تھا اور وہ چار نے بسنتی رنگ کے ریشمین رومال مفلر کی طرح گلے میں ڈال رکھے تھے۔

منجمد کر دینے والی سردی اب اپنا آخری زور دکھا کر دم توڑ چکی تھی اور یخ بستہ طویل بے کیف راتوں کا ناخوش گوار موسم ختم ہو گیا تھا۔

اس خوشی میں ہر جانب زندگی کے آثار پائے جاتے تھے ہر انسان میں خون کی روانی سے جو تبدیلی آ گئی تھی اور امیر و غریب اپنے اپنے حوصلے کے مطابق موسم بہار کی آمد پر خوشدلی کا اظہار کر رہے تھے خیام کلب میں بھی ہمیشہ کی طرح آج بسنت پارٹی کلب کی جانب سے ممبروں کو دی گئی تھی۔ موسم کی بہار آفرینی کے باعث اس وسیع مجمع کا ہر فرد دلچسپ بن رہا تھا خدا جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ کھیل کھیلے جا رہے تھے اور کن کن موضوعات پر مباحثے ہو رہے تھے بس باتوں اور قہقہوں کا ایک طوفان تھا جس میں سب بہے جا رہے تھے نوشابہ اپنی ہنستی ہوئی صورت اور دلآویز بذلہ سنجیوں کی بدولت سب میں نمایاں نظر آ رہی تھی۔

کلب کی انجمن ادب کی روح رواں نوشابہ پر موسم کی دل کشی نے بہت اچھا اثر کیا تھا۔ اس کی شگفتہ صورت پر آج شادابی بکھر گئی تھی یوں تو وہ بلبل خوشنوا کے مانند ہمیشہ ہی چہکتی رہتی تھی لیکن اس شام اس کی من موہ لینے والی حاضر جوابی اور دلچسپ باتوں نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا نوشابہ کی ذات متضاد کیفیات کا ایک دل کش مجموعہ تھی۔

وہ جتنی رنگین طبع اور شوخ تھی اتنی ہی بے لاگ اور سادہ طینت بھی۔ اُس کی رومان آفرین فطرت کا یہ عالم تھا کہ ہر شاعر کے اچھے شعر پر جھوم جھوم کر بھری محفل میں بے ساختہ داد دے دیتی اور ثقاہت کا یہ انداز کہ اس کی بزم جمال میں کسی کو شوخ نگاہی کی مجال نہ تھی اس سے ملنے والوں کا حلقہ وسیع تھا اس حلقے میں مشہور شاعر و ادیب بھی تھے اور سیاست داں بھی لیکن کسی خاص انسان سے اس کو دلچسپی نہ تھی ہر فن کار کا وہ احترام کرتی تھی۔ لیکن یہ احترام اُس کے فنی کمالات کا تھا کسی کی ذات سے اس کو عقیدت نہ تھی۔ نوشابہ کی مثال نسیم بہار کے اُس خوشگوار جھونکے کی مانند تھی جو صحن گلشن میں ہر پھول سے اٹکھیلیاں کرتے گذر جاتے اس وقت بھی وہ اس مخلوط مجمع میں... گھری بیٹھی تھی اور حسب معمول سب سے بیک وقت مصروف گفتگو تھی کبھی کبھی چند لمحوں کے لئے وہ کھوئی کھوئی ہو جاتی گویا یہاں سے دور کہیں اور ہے اور یہ اُس کی عادت تھی۔

خدا جانے کن خلاؤں میں اس کی روح گھومتی رہتی تھی اس عالم فانی سے دور! نوشابہ کے تصور میں ایک ایسی ہی شام آ رہی تھی "وہ دلفریب شام" جب وہ بالکل معصوم تھی اس وقت نوشابہ ۱۹ سال کی دوشیزہ تھی کوئی نابالغ بچی نہ تھی لیکن اپنے خیالات کی پاکیزگی اور دل کی معصومیت کے باعث وہ ابھی تک بالکل بچی ہی تھی ایک ناسمجھ بچی! لیکن اس کا یہ الھڑپنا ظالم کیوپڈ کو بالکل نہ بھایا اور اس کے بھولے بھالے دل کو آخر اس ننھے فریب کار نے اپنے جانگزا تیر کا نشانہ بنا ہی لیا۔

دنیائے ادب کا جگمگاتا ستارا فرخ! کامدیو کے روپ میں اس کے سامنے آ گیا اپنی مخصوص ذہانت اور فن کارانہ خوبیوں کے ساتھ اُس نے اپنے من کی بانسری پر نوشابہ کو مدھر رسیلی تانوں میں پریم گیت سنا کے اس کے من مندر میں برہا کی آگ جلائی وہ چنگاری جو اس کے بھولے دل کے کسی کونے میں کجلائی ہوئی پڑی تھی۔ اس کو پریم رس میں ڈوبی ہوئی ہوا دے دے کر فرخ نے بھڑکا دیا۔

ہاں ایسی ہی ایک دلفریب شام کو نوشابہ نے پریم مدھ کا پہلا پیالہ اپنے پریمی کے ہاتھ سے پیا تھا اسی تصور سے اس کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور مسز عباسی نے سوچا کہ میرے ... ہوتے فقرے نے

نوشابہ ہار گئی اپنی اس کامیابی پر نازاں ہو کر وہ اور زور زور سے ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرنے لگیں اور نوشابہ سوچ رہی تھی کہ ایک ایسی ہی دلا ویز شام کو فرخ نے میری سادگی اور الھڑپنے سے پریشان ہو کر کہا تھا کتنی بھولی ہو تم نوشابہ! کاش تم شوخ ہونے کے ساتھ کچھ کچھ دانش بھی ہوتیں اس کے بعد وہ مسلسل نکات و رموز محبت سکھاتا رہا اور پہلو سے مسٹر منصور ترنم لہجے میں . . گنگنا تے۔

تری سادگی سے پریشان ہو کر

تجھے شوخ و رنگیں بنایا ہے ہم نے!

آہ کتنا اچھا کہا ہے جذبی نے نوشابہ عالم تصور سے چونک کر بولی اور منصور اس کی اس بے ساختہ داد پر اس طرح خوش ہو کر جھومے گویا یہ شعر جذبی کا نہیں خود ان کا ہے . . . . اور وہ ہجوم خیال سے گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور اس مجمع سے نکل کر ٹہلتی ہوئی کلب کے پچھلے حصہ میں سکون کی . . تلاش میں چلی گئی سامنے لیموں کے درخت کے نیچے آج بھی وہ بنچ پڑی تھی جس پر کبھی وہ اور فرخ چاندنی راتوں میں گھنٹوں بیٹھ کر محبت کی لطیف . . . سرگوشیاں کیا کرتے تھے ایک جذبہ بے اختیار نے اسے بنچ پر بٹھا دیا اسے یاد آیا ایک ایسی ہی شام کو وہ یہاں بیٹھی تھی . . . . . قمری مہینے کی اولین تاریکیں تھیں۔ اس لئے شام کا اندھیرا ہو جانے پر بھی ہلکی ہلکی چاندنی نے فضا کو منور کر دیا تھا۔ وہ اس رومانی ماحول میں ساکت فرخ کے کاندھے سے سر لگائے دیر تک اور بہت دیر تک چاند کو تکتی رہی . . . . پرکیف فضا نے اس کو مدہوش سا کر دیا اور نشیلی ہواؤں نے لوریاں دیں اور جوانی کی نیند نے کچھ دیر کے لئے اس کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ وہ آدھے گھنٹے یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ سوتی رہی سڑک پر سے گذرتی ہوئی ایک لاری کی گڑگڑاہٹ نے اسے چونکا دیا اور اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پرسکوت فضا پر نظر ڈال کر کہا۔ اس میں سو گئی اور آپ نے جگایا بھی نہیں۔ بے آرام ہو ہو جاتیں فرخ نے بہت پیار بھرے لہجے میں کہا

واہ اچھی رہی دیکھو تو یہاں ہم دونوں کے علاوہ کوئی بھی ہے کس غضب کا سناٹا ہے۔ آٹھ بج رہے ہیں' گھڑی دیکھ کر وہ تنک کر بولی۔ اور فرخ نے سہم کر اس طرح نظریں جھکا لیں گویا نوشابہ کا سو جانا اس کا ہی جرم تھا۔ اس کے اس سہمیں انداز پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی اس وقت بھی اس یاد نے اسے ہنسا دیا۔

اور مسٹر شرما جو نوشابہ سے یہ دریافت کرنے آرہے تھے کہ برج میں' کہا

آپ میری پارٹنر بن سکیں گی یہ سمجھے کہ اُن کو دیکھ کر اسی نے خوشی کا اظہار کیا ہے اور اپنے طرز عمل سے نوشابہ نے شرما جی کے خیال کو پورا کر دیا وہ اُن کے ساتھ کھیلنے کے لئے چل دی۔

برج پارٹی بڑے زور سے جمی اول اول نوشابہ نے بھی اپنی پوری توجہ کھیل کی جانب رکھی اس نے بازی پر بازی جیتی لیکن رفتہ رفتہ اس پر بے حسی طاری ہوتی گئی اور پھر وہ ہال کی روشنی سے ماضی کے دھندلکے میں پہنچ گئی اب وہ بے دلی سے پتے ڈال رہی تھی اور اس کے تصور میں وہ کھیل تھا اور اس کے متعلقات جب فرخ اس کے قریب تھا یہ الفاظ نوشابہ کے کانوں میں گونجے۔ ارے ارے بڑی سفاک ہو تم! واللہ ہم رو دیں گے دو گھنٹے سے مسلسل پیٹ رہی ہو۔

اور اس نے عالم خیال میں فرخ کو بچوں کی طرح منہ بسورتے ہوئے دیکھ کر ایک بڑا قہقہہ لگایا۔

خوب آپ ہار کر بھی اس قدر ہنس سکتی ہیں آفتاب صاحب اپنے لبوں کے کونوں میں پائپ دباتے ہوئے بولے' جب ہارنے والا آپ جیسا ہو تو ہار کر بھی ہنسنا چاہئے۔ نوشابہ نے خوش طبعی کہا اور نظریں اُن کے وجیہہ چہرے پر جما دیں۔

وہ سوچ رہی تھی فرخ کے باپ بیٹے کا انداز بالکل ایسا ہی تو تھا۔ اور آفتاب صاحب اس خیال سے خوش ہو رہے تھے کہ ایک لاپرواہ آزاد طبع لڑکی اُن میں دلچسپی لے رہی ہے۔

کھیلتے کھیلتے اُس نے پتے پھینک کر کہا اب اندر والا کھیلنے نہیں دیتا کاش کوئی شاعر یہاں ہوتا اس وقت شعر سننے کو دل چاہتا ہے اس دلکش موسم میں شعر نہ سننا کفر ہے۔ کفر! آہ اقبال نے کتنا اچھا کہا ہے۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں!

مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

توبہ اللہ تو بہ ایسا بھی شعروں کا کیا شوق نہ جانے کیا خبط ہے تم کو شعر سننے کا اچھا بھلا کھیل غارت کر دیا یہ شاعر بڑے وہ ہوتے ہیں اور تم کو تو اس کا تجربہ بھی ہے۔ پھر بھی ہائے شعر ہائے شاعر کرتی رہتی ہو' نوشابہ کی عزیز سہیلی ریحانہ نے ناز سے منہ بنا کر کہا۔

آخر تو وہ فن کار ہیں ہمیں ہر فن کار کی قدر کرنی چاہئے خواہ اس میں کتنی ہی برائیاں ہوں لیکن اُس کے فنی کمال کے سامنے اپنا سر جھکا دینا ہمارا فرض ہے۔ اور پھر ان فضول کھیلوں میں وقت ضائع کرنے یا دھد موئے

نقرے سنے جانے سے تو بہتر ہے کہ شعر ہی سنے جائیں۔ وہ لمبا سانس لیکر بولی۔
اور اس کے تصور میں فرخ کی روشن آنکھیں عینک کے شیشوں سے جھانکنے لگیں
وہ بھی تو ایک فن کار تھا شاعر نہ سہی لیکن ہے وہ بھی آرٹسٹ آرٹ کی مختلف اشکال ہوتی ہیں۔ اُس کو ایک فن کار سے محبت تھی اس لئے تمام فن کاروں کا وہ احترام کرتی تھی۔ پھر فرخ خود شعر و ادب کا شیدا تھا اس کی ہم نشینی نے تو شاید اس میں شعر و ادب کا اتنا پاکیزہ مذاق پیدا کر دیا تھا وہ تو جو کچھ سوچتی تھی جو کچھ کرتی تھی نیم مدہوشی کے عالم میں فرخ کا خیال اُس کے ہر ذوق کو اُجاگر کرتا تھا اُس کا وجود ظاہری فرخ سے الگ سہی لیکن اُس کی روح اس کا دماغ گویا اُس کا فرخ کا تھا اور اس سہارے پر ہی وہ حقائق کی دنیا سے دور عالم تخیل میں زندگی گذار رہی تھی۔

تقاضا

جناب انجم بی۔ اے (علیگ)

ہر شے کا تقاضا ہے کہ میں آج کہوں کچھ!

کوئل بھی، پپیہا بھی، ہوا بھی ہے گھٹا بھی!
پُر لطف نظارے بھی ہیں، پُر کیف فضا بھی!
اور درد میں ڈوبی ہوئی بلبل کی صدا بھی!

ہر شے کا تقاضا ہے کہ میں آج کہوں کچھ!

پھر چاندنی راتوں کی وہی ریشہ دوانی!
پھر ساری فضا بیخود و سرشار و سہانی!
پھر آج جوانی ہی جوانی ہی جوانی!

ہر شے کا تقاضا ہے کہ میں آج کہوں کچھ!

پھر اشک کا طوفاں ہے وہی دل میں ہے جوشش!
پھر حسن مرے حال پہ اگلا سا جفا کوش!
پھر آج بپا ہے وہی اک محشر خاموش!

ہر شے کا تقاضا ہے کہ میں آج کہوں کچھ

پھر تیری نگاہوں میں وہی اگلی ہیں باتیں!
پھر اُن کی وہی پیار میں ڈوبی ہوئی گھاتیں!

افسانہ

بے گور

از ڈی۔ پی۔ بھٹنا گر۔ گُشتہ
ڈیہرہ دون

سیٹھ اسمٰعیل اب شاذونادر ہی چہار دیواری میں قدم رکھتے تھے۔ انکا
بار ہی اتنا وسیع تھا کہ انھیں اُس حلقہ سے ہی باہر آنے کی فرصت
سرنہ تھی، اُس روز اپنے ننھے صاحبزادے ہمایوں کو جس نے پُر زور
اُنھیں اِس طرف آنے پر بیحد مجبور کیا تھا۔ چاندنی چوک کی سیر کرا سب
ے۔ اور جگہ بجگہ سے کھلونے اور اس کی حسب فرمائش و منشا چیزیں
کر کار کی پچھلی سیٹ پُر کر رہے تھے۔ یونہی سیر کرنے وہ فتح پوری کی
آ پہنچے۔ اپنی کار ایک جانب کھڑی کر کے میوہ فروشس کی دوکان پر
ے۔ بمشکل دس پندرہ منٹ گذرے ہوں گے اسٹیشن پر سے
منگوں اور ننگوں کا ایک غول آتا دکھائی دیا۔ گذشتہ چند ہفتوں
بنگال کی خبریں اخبارات میں نمایاں سرخیوں میں شائع ہورہی تھیں۔
وہاں کے ہولناک واقعات اور دل دوز مناظر کا بڑے درد انگیز پیرایے
ذکر کیا جا رہا تھا۔ یہ بھی تحریر تھا کہ موت کے چنگل سے بچکر نکل بھاگنے والے
میں کہیں آسرا اور پناہ نہ پاکر اب پچھم کے شہروں اور قصبوں میں پناہ
یا ہونے چلے ہیں۔ اور مُلک کے مختلف صوبوں میں ریلیف کمیٹیاں
متیاز مذہب وملت اِن قحط زدگان کی امداد کا حتی الامکان انتظام
ہی ہیں۔ مگر اِن مصیبت کے ماروں کی تو تعداد ہی اِس قدر تھی کہ حالت
ئی سے قابو میں ہی نہ آرہی تھی۔ اور قابو میں نہ آنے کی معقول وجہ بھی
ں۔ جو امداد دینے والی کمیٹیاں یا سبھائیں تھیں اُن کے پاس ایسے
ئے ہی نہ تھے جو آناً فاناً میں جائے وقوعہ پر پہنچکر بے موت مرنے اور
ل سے تڑپنے والوں کی مدد اور حفاظت کرتیں۔ سیٹھ اسمٰعیل نے
ہی چند روز ہوئے جب وہ کلکتہ میں تھے بچشم خود قحط کی تباہ کاری
، روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے ایک انسان پر بیسیوں دوسرے
نوں کو کتوں اور خونخوار بھوکے بھیڑیوں کی طرح جھپٹتے دیکھا۔
ی گندی نالیوں میں بہکر آتے ہوئے چاول کے دانوں اور
ٹی کی جھوٹن کو نکال کر انہیں لذیذ ترین غذا کی طرح کھاتے دیکھا۔
ہراہوں۔ عام رستوں اور گلیوں میں لاشوں کے تودے دیکھے۔
۔ ایک ماں کو اپنے چار چار پانچ پانچ بچوں کے ساتھ یکبا
بیجان پڑے دیکھا۔ وہ بھی دیکھا جس کا اگر ذکر کر دیا جائے تو پتھروں
کے دل بھی آب آب ہوجائیں۔

ابھی کچھ روز ہوئے سیٹھ اسمٰعیل نے جب وہ اپنی کار میں کہیں جارہے
تھے تو اِن عجیب صورت کچھ سانولے کچھ کالے فقیر نما مردوزن کی ایک ٹولی کو
دیکھا تھا مگر اُس وقت اُنہیں کسی خاص مصروفیت کی وجہ سے اِن قحط زدوں
اور بنگال کے واقعہ کا دھیان ہی نہ آیا تھا۔ اُن لوگوں کو اپنی جانب التجا آمیز
نگاہیں ڈالتے دیکھکر اُنہوں نے ایک لمحہ کے لئے اپنی کار کی رفتار ہلکی کر کے
جو کچھ دام اور چاندی کے ٹکڑے یا چھوٹے نوٹ ان کی جیب میں تھے انکی
طرف پھینک دیئے۔ ان کی عادت ہی یہ تھی کہ جہاں کسی فقیر کو دیکھا اور
جو کچھ اس کے مقدر کا نکلا جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسکی جانب پھینک دیا۔

آج ان کالے کلوٹے پورب کے ننگے بھوکوں کی غیر معمولی تعداد
نے سیٹھ اسمٰعیل کی نظروں کے سامنے وہ تمام مناظر جو گذشتہ ایام میں
اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے کلکتہ میں دیکھے تھے پیش کر دیئے۔

آٹھ سالہ ننھے ہمایوں نے بار ہا جب کبھی بھی وہ اپنے غنی اور سخی
والد کے ہمراہ کہیں آیا گیا غریبوں اور بھکاریوں کے لئے اُن کی جیب
اور ہاتھ کو کشادہ پایا تھا۔ وہ بچہ تھا۔ ایک امیر کبیر کا بچہ۔ اور امیروں کے
بچے جس ٹھاٹھ اور راحوں میں پرورش پاتے ہیں اور جن آغوشوں میں انکا
لالن پالن ہوتا ہے اُن کے زیر اثر اِن بچوں سے یہ توقع نہیں رہتی کہ
وہ بھی دُنیا کے واقعات وحادثات یہاں تک کہ سانحات عظیم سے بھی
باخبر اور واقف ہوں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کو دوسروں کی تکالیف کا
احساس ہی نہیں ہوتا۔ دین دکھیوں کے درد وغم کی کہانی سُنکر اُنکے
دل پر چوٹ نہیں لگتی بلکہ وہ اُن کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ اور ایسے ہی
بچے جوان ہوکر جبر واستبداد کی بنا رکھتے ہیں اور غریبوں اور مفلس
اور ناداروں کی ہڈیوں پر اپنی حکومت اور سرمایہ داری کی بنیاد
مضبوط ومستحکم کرتے ہیں۔ وہ تو ایک ایسے شجر بے ثمر کی مانند ہوجاتے
ہیں جن کی ہوا اور سایہ تک مسموم اور زہریلا اثر لئے ہوتے ہیں۔ جو
کوئی بھی ان کی زد میں آجاتا ہے تباہ وبرباد ہوجاتا ہے۔ لیکن ہمایوں تو

ایک ایسے پھولے پھلے درخت کے سایہ میں نشوونما پا رہا تھا جس کی شاخیں دُنیا کے درد کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے تھیں۔

سیٹھ اسمٰعیل پھلوں اور خشک میوہ جات کا جائزہ لے رہے تھے کہ اسی اثنا میں ننھے ہمایوں نے غبارہ والے کو قریب سے گذرتے دیکھا۔ اپنے والد کی پتلون پکڑتے ہوئے بولا۔ ڈیڈی (Daddy) ہم بیلون (غبارہ) لیں گے۔ اور فوراً ایک بڑا بالکی نما غبارہ خرید لیا گیا۔ ہمایوں کھیل میں مصروف ہوگیا۔

بھکاریوں کا ریلا ایک ہلکے سیلاب کی طرح۔ بازار میں ہر سو پھیلتا نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی چند نیم برہنہ۔ نحیف الجثہ۔ مرد و زن اُس طرف جہاں سیٹھ اسمٰعیل اور ہمایوں کھڑے تھے دکھائی دئے۔ اچانک ہمایوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی خوفناک صورتوں اور بھوت کی خیالی تصویروں کی طرح وہ مجسم مفلسی و نکبت کے زندہ نمونے اپنے ارد گرد ایک ناخوشگوار ماحول پیدا کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے کا دامن پکڑے۔ ہاتھ اور کندھوں کا سہارا لئے۔ کمزور ٹانگوں پر اپنے بھوکے جسم کا پنجر اُٹھائے زبردستی قدم بڑھا رہے تھے۔ اِس قافلے میں عورتیں بھی تھیں جوان بھی اور بوڑھی بھی۔ بچے بھی تھے۔ کچھ اپنی ناتواں ماؤں کی آغوش میں۔ کچھ ماں یا باپ کا ہاتھ پکڑے ہوئے۔ جوان عورتوں کا شباب بھوک کی جوالا میں جل کر بھسم ہو چکا تھا۔ اُن کی آنکھوں کا کیف اور اُن کی مستی جو ہر عورت کو شباب کے ساتھ عطا کی جاتی ہے رنج و غم کی نذر ہو چکے تھے۔ منہ سے نکلی ہوئی ہر آہ اور کراہ کے ساتھ فضا میں سموئی ہوئی کیفیت کے ساتھ مل گئی تھی۔ بوڑھی عورتیں موت کا ہاتھ پکڑ کر اِس دُنیا کے خوشحال لوگوں پر حسرت کی نظر ڈال رہی تھیں۔ گود کے بچے کسی ناتجربہ کار بڑھئی کاریگر کے بنائے ہوئے اور ناتراشیدہ لکڑی کے بدنما کھلونے کی طرح چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے اپنی مردہ جسم ماؤں کی بے رس اور سوکھی ہوئی چھاتیوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ کیسا پرہول اور ہیبت ناک منظر تھا۔ اُف ننھا ہمایوں جس نے کبھی ایسی بھیانک صورتیں نہ دیکھی تھیں۔ اِس عجیب و غریب مخلوق کو۔ اِس غولِ بیابانی کو۔ اِن متحرک ڈھانچوں۔ ان قحط زدہ۔ اکال پیڑت۔ بے جان اور نقاہت کے ماروں کو خوف زدہ نگاہوں سے اپنے والد کی آڑ لیکر چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے اِن لوگوں کو وہ کِس دُنیا کی مخلوق سمجھ رہا تھا۔ اِن بھوکے ننگوں کا قافلہ اِس شہر میں۔ اِس امیروں کی نگری میں۔ نہ معلوم کہاں کہاں سے کتنا فاصلہ اور کتنی مسافت طے کرکے آیا تھا۔ اِس شہر کا آب و دانہ ہی شائد اِن بیچاروں کو یہاں کھینچ لایا تھا۔ ورنہ یہاں اپنا کوئی دیس یا وطن نہ تھا۔ یا اُن کا کوئی گھر بار نہ تھا۔ تھا کیوں نہیں۔ سبھی کچھ تھا۔ وہ سب کے سب دور دراز کے رہنے والے۔ خانہ بدوش آوارہ منشین کی طرح بھٹک رہے تھے۔ اور مارے مارے پھر رہے تھے۔ گردشِ دوراں کے ستائے ہوئے۔ بلائے آسمانی کی زد میں آئے ہوئے۔ یہ سادہ لوح دیہاتی۔ شہریت اور شہری تہذیب۔ تصنع و تکلف اور مکر و فریب سے ناواقف آج اپنے گاؤں اور وہاں کے کھیتوں اور ناہموار راستوں اور پگڈنڈیوں کو خیرباد کہکر پیٹ کی جوالا بجھانے کے لئے۔ زبردستی فقیر بن کر شہر کی کنکریٹ اور اسفالٹ کی پختہ سڑکوں پر ٹھوکریں کھا رہے تھے شاہراہ کے ہر دو جانب بڑی بڑی دکانیں۔ قیمتی اور نفیس ترین اور خوبصورت اشیاء سے آراستہ۔ ان غریبوں کی آنکھوں کے سامنے سے سینما کی تصویر کی طرح گذرتی چلی جا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی اتنی عمر میں شائد کبھی بڑے شہر کے درشن کئے تھے یا نہیں یہ کون جانے۔ نہ معلوم بھی اُن کی نگاہیں اِن دکانوں کی سجاوٹ سے اُلجھ جاتی تھیں۔ لیکن اُن میں تابِ نظارہ ہی نہ تھی۔ اُن سب پر بھوک غالب تھی۔ شدت اشتہا سے آنکھیں کھلی ہونے پہ بند ہوگئی تھیں۔ حالت بیداری میں بھی اُن پر نقاہت کو گویا نیند غالب تھی۔ جب وہ چلتے پھرتے ڈھانچے۔ اس غول کے چار پانچ افراد بالکل ہی قریب آگئے تو ہمایوں چیخ کر اپنے والد کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ سیٹھ اسمٰعیل نے مڑ کر دیکھا تو ایک مرد ایک عورت کو بازوؤں پر اُٹھائے اور آتش اشتہا سے جھلے جھلسائے جسم کو چیتھڑوں سے ڈھکے دو نیم عریاں بچوں کا ہاتھ پکڑے بے زبان غریب جانوروں کی طرح خاموش کھڑے پایا۔ آج شاید پہلی بار۔ خلاف معمول اُنہوں نے اِن بھکاریوں کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اِنکو شائد اُن کا اِس طرح دبے پاؤں آنا جو اُن کے ننھے ہمایوں کے خوف کا باعث ہوا ناگوار معلوم ہوا۔ آج نہ معلوم کون سا جذبہ اُن کے دل میں کام کر رہا تھا جس نے اُن کے دستِ کرم کو اُٹھنے سے باز رکھا۔

سیٹھ اسمٰعیل نے جلدی سے میوہ فروش کو پھلوں کی قیمت ادا کی۔ بھکاریوں میں سے کسی نے بھی زبان نہ ہلائی۔ نہ سیٹھ کی حقارت آمیز نگاہوں کا جواب دیا۔ اور نہ دستِ سوال دراز کیا۔ کہ پاس کوئی کاسہ نہ تھا۔ کوئی بھیک مانگنے کا ٹھیکرا نہ تھا۔ وہ کوئی پیشہ

فقیر نہ تھے۔ فاقے نے انہیں فقیر بن جانے پر مجبور کیا تھا۔ اُن کی نگاہیں ہی اظہارِ مدعا کر دیتی تھیں۔ اُن کی خستہ حالی ہی کسی بیان کی محتاج نہ تھی۔

"نہ جانے یہ کمبخت یہاں کہاں سے مرنے کو آگئے ہیں۔ اور یہ بار ایک دو بھی تو نہیں۔ اَن گنت ہیں۔" میوہ فروش نے اِن غریب الوطنوں کی اِن ذلیل الفاظ سے آؤ بھگت کرتے ہوئے سیٹھ اسمٰعیل کو خاموش کرنے کے لئے اُن کی اِس خاموش حقارت کی تائید کی۔

پھلوں کا ٹوکرا اُٹھاتے ہوئے دوکاندار نے مزید کہنا شروع کیا۔ جنگ کے دنوں میں بھی تو اِن مفت خوروں کو کوئی کام سپرد نہیں کیا گیا۔ برساتی کیڑوں کی طرح ان کی تعداد گھٹنے کی بجائے اور بڑھتی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اِس قحط سالی میں جب خود ہمیں ہی دو وقت کھانا میسر نہیں آتا۔ گیہوں کے دانے لعلِ بدخشاں بن گئے ہیں تو بتائیے بھکاریوں کو کہاں سے کھانا دیں۔ مگر اِن لوگوں کو ہماری ایسی مشکل کا احساس ہی نہیں۔ بس جونک کی طرح چپٹ جاتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے میوہ فروش سیٹھ اسمٰعیل کی کار میں وہ ٹوکرا رکھنے چلا گیا۔

(Daddy) ننھے ہمایوں کے مُنہ سے جواب بھی اُن بھکاریوں کو مُڑ مُڑ کر دیکھ رہا تھا آہستہ سے آواز نکلی۔

Yes Darling, Dont be afraid

(ہاں پیارے، مت ڈرو بیٹا) سیٹھ صاحب نے انگریزیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے لاڈلے کو تسلی دی۔

یہ سب لوگ کون ہیں۔ ڈیڈی۔ ہمایوں نے معصومانہ انداز میں دریافت کیا۔

سیٹھ صاحب نے ایک بار اُن کنگلوں کی طرف نگاہ ڈال کر ہمایوں کی طرف رُخ کرکے جواب دیا۔ یہ سب بھیک مانگنے والے ہیں فقیر

اتنے سارے؟ بچے نے ایک جانب سے دوسری جانب اپنی چھوٹی سی انگلی سے خیالی دائرہ بناتے ہوئے پوچھا۔

ان سے بھی زیادہ ہیں۔ یہ سب دوسری جگہ سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ اِن کے دیس میں کال پڑ گیا ہے۔ کھانے کو نہیں ملا۔ ان کے گھر بار سب پانی میں بہ گئے۔ کھیت برباد ہو گئے۔ سیٹھ صاحب نے ہمایوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے استفسار سے کام لیا۔ بچہ ایک لمحہ خاموش رہا۔ اچانک اُس نے پھر سوال کیا۔ (Daddy ڈیڈی۔ یہ لوگ سب ہندو ہی معلوم ہوتے ہیں۔

اسمٰعیل سیٹھ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ سوال ان کے جگر میں تیر بن کر پیوست ہوگیا۔ وہ اِس چوٹ کو برداشت نہ کر سکے۔ اُن کے دماغ میں ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا۔ وہ بھکاری۔ وہ ہندو ہیں یا مسلمان یا کوئی اور۔ اب تو کوئی بھی ہوں سبھی بھکاری ہیں۔ جو ایک کی حالت ہے وہ سب کی ہے۔ سب ننگے اور بھوکے ہیں۔ اِس بلا میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی مبتلا ہوتے ہیں۔ بلا امتیاز مذہب و ملت موت نے دونوں ہی کے گھروں میں تالے لگوا دیئے۔ فرشتہ اجل نے کسی کے ساتھ مُنہ دیکھ کر بھی شکایت نہیں کی۔ معصوم بچّے کی زبان سے نکلے ہوئے ان سادہ الفاظ نے ندائے غیب کا کام دیا۔ وہ ایسا طنز تھا جس کو اسمٰعیل کیا کوئی بھی خوددار برداشت نہیں کر سکتا۔

کون باغیرت یہ نظارہ جانگاہ برداشت کر سکتا ہے کہ شہر کی سڑکوں پر ہزاروں بچّے جوان اور بوڑھے۔ مرد و زن مسلمان اور ہندو بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دے رہے ہوں۔ اور بڑی بڑی حویلیوں میں۔ بنگلوں اور ہوٹلوں میں لذیذ ترین غذاؤں کے دستر خوان لگے ہوں۔ قہقہے اُڑ رہے ہوں۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں اور رنگ رلیاں منائی جا رہی ہوں۔ جو یہ برداشت کر سکتا ہے جس نے برداشت کیا ہے۔ جن سرمایہ داروں اور منافع خوروں نے اپنے ملک کی سرزمین کو اپنی قوم کے افراد کی لاشوں کی تجارت گاہ بنایا ہے وہ کمینے انسان نہیں ہیں۔ وہ حیوان بھی نہیں ہیں۔ وہ دُنیا کی ذلیل ترین مخلوق ہیں۔ اُن کو جہنم کی دہکتی ہوئی بھٹیوں میں جھونک دینا چاہیئے۔

اسمٰعیل سیٹھ کا دل قدرت کی اس طنز کی چوٹ سے تلملا اُٹھا اُنہوں نے ننھے ہمایوں کو جلدی سے آغوش میں اُٹھا کر کار میں بٹھا دیا اور خود اس بھکاری خاندان کی طرف جس کو اُنہوں نے میوہ فروش کی دوکان پر ناراضگی سے دانستہ نظر انداز کر دیا تھا اور اس کی واجب التجا کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور اس کے بھوکے پیٹ پر اُنہوں نے لات مار دی تھی تیز گامی سے لپکے۔ وہ بیچارے زیادہ آگے نہ بڑھے۔ بڑھ ہی نہ سکے تھے۔ بھوک اور ناتوانی نے ان کے پاؤں شل کر دئے تھے۔ چند قدم چل کر ہی وہیں سڑک پر بیٹھ گئے تھے۔

سیٹھ نے اس بھکاری کو دینے کے لئے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کرتے ہوئے نہایت دھیمی آواز سے جو شاید اس کے قلب کی گہرائی سے آ رہی تھی کہا۔ سرکار ہم لوگ بھکاری نہیں ہیں۔ بھوکے اور ننگے ہیں۔ ہمیں تو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور تن ڈھکنے کے لئے کپڑا چاہیئے۔ یہ روپیہ اور پیسہ۔ دھن اور دولت ہمارے بھاگ میں ہی نہ تھے۔ جو ہماری قسمت پھوٹی نہ ہوتی تو ہم آج یوں .... بے چارے کا گلا رندھ گیا۔ اس کی آواز بلند ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے جو کمزوری کے باعث حلقوں میں دھنس گئی تھیں آنسو بہ نکلے۔ ایک سیلاب اشک جو شاید صرف اس کے دل کی آگ کو ہی بجھانے کے لئے اُمڈ آیا تھا اُس کو روتا دیکھ کر اسکی بیوی اور دونوں ناسمجھ بچے بھی رونے لگے۔

سیٹھ اسمٰعیل تذبذب میں پڑ گئے۔ اُن کا دل بھر آیا۔ وہ سوچنے لگے کھانا اور کپڑا یہی دونوں چیزیں آج ان کے ہاتھ میں نہ تھیں۔ آج وہ وقت نہ تھا کہ جب روپے کے بل بوتے پر ہر شخص جس وقت جتنا چاہے اناج اور کپڑا بہ آسانی خرید سکتا تھا۔ وہ کچھ بھی طے نہ کر سکے۔ غریبوں کی آہ و بکا سے اُن کا دل پاش پاش ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگے۔ انسان کو تباہ کرنے کے لئے کیا قدرت کے پاس اور کوئی آسان طریقہ نہیں ہے۔ کیا قدرت بھی ایسا بھیانک انتقام لیتی ہے۔

کال اور اکال میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں ہی تو موت کے دو رُخ ہیں۔ مگر دُنیا میں اِس اشرف المخلوقات کے بھی تو دو ہی طبقے ہیں۔ غریب اور امیر۔ متوسط طبقہ تو کال اور اکال کی درمیانی جانکنی کی حالت کے مانند ہے۔ پھر یہ کال اور اکال کیا صرف غریب ہی کے مقسوم میں ہیں۔ کیا پرماتما کے۔ اس خالق دو عالم کے۔ جو بڑا رحیم اور کریم ہے دربار سے انصاف اُٹھ گیا۔ وہ قہار اور جبار ہے۔ کیا صرف غریبوں کے لئے ہی۔ اُن مفلسوں کے لئے جن کو ایک وقت بھی کھانا میسّر نہیں۔ کیا وہ بھی دُنیا کے ظالموں اور امیروں سے گھبراتا ہے۔ کیا اِس ہولناک تباہی کو روک دینا اُس کی طاقت سے بعید ہے کیا ان کی مدد کی بھی کوئی سبیل نہ تھی۔ آڑے وقت پر تو جانور بھی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ مگر انسان اور خصوصًا اِس دورِ حاضرہ کا اِنسان۔ یہ تو ایسا سفاک اور ظالم ہے اور خالق کی ایسی خراب اور گھٹیا تخلیق ہے کہ جو کینہ پروری میں آپ اپنی مثال ہے۔ جو اپنے دیکھ کو

مصیبت میں دیکھ کر جو اپنے سے کمزور کو آفت میں مبتلا کرکے اس کا مضحکہ اُڑاتی ہے۔ تب ہی تو لاکھوں اِس قحط کے باعث لقمۂ اجل ہو گئے اور اُن میں سب ہی تو شامل تھے۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ وہ گھبرا کر کہنے والے تھے کہ یہ قدرت کا انتقام تھا۔ لیکن کسی نے غیب سے اُن کے کان میں کہا یہ قدرت کا نہیں تھا بلکہ انسان نے انسان سے انتقام لیا تھا۔

وہ اِس بھکاری کے ہاتھوں میں زبردستی نوٹ رکھ کر یہ تاکید کر کے کہ وہ اِس نوٹ کو احتیاط سے رکھے اور کسی دوکاندار سے حسب منشا کھانا خرید لے۔ جلدی سے اپنی موٹر پر واپس آ گئے۔ اور اپنی کوٹھی پر جانے کے لئے کار کو آہستہ آہستہ ڈرائیو کرنے لگے۔ آج ان کے دل پر ایک ناقابل برداشت چوٹ لگی تھی۔ اُن کی طبیعت پریشان تھی اور جذبات میں ایک ہیجان سا ایک مد و جزر سا پیدا ہو رہا تھا۔

بھکاریوں اور راہ گیروں اور بازار میں سودا سلف لینے والوں کی بھیڑ بھاڑ میں اُن کی کار آبِ ساکن پر دھیرے دھیرے سرکنے والی کشتی کی مانند آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اُنھیں خوف تھا کہ مبادا کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ کوئی بھکاری اُن کی زد میں نہ آ جائے۔ کار چلاتے ہوئے وہ سوچنے لگے۔ خدانخواستہ اگر کہیں یہی مصیبت جس نے بنگال کو تباہ کر دیا وہاں سے چل کر ہمارے اور دیگر پڑوسی صوبوں کو اپنے چنگل میں لے لے تو کیا ہوگا؟ ہمارے شہر کی یہ لمبی چوڑی سڑکیں یہ فٹ پاتھ۔ یہ شاہراہیں۔ سب کے سب لاشوں سے پٹ جائیں گے۔ جنگ کی تباہ کاریوں سے بھی زیادہ بربادی کے ہولناک مناظر دیکھنے میں آنے لگیں گے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کا منہ نوچے گا۔ بچے کوڑیوں کے مول فروخت ہوں گے۔ عورتوں کا گوہرِ عصمت صِرف دو چار لقموں کے عوض۔ اُف۔ اور پھر خدا جانے ہمارا کیا حشر ہو۔ یہ غریب غربا خود ہماری ہی پیدا کردہ اس قحط سالی اور اُن کے سر پر زبردستی تھوپے گئے۔ اِس اکال سے تنگ آ کر امیروں کو لوٹ نہ لیں گے؟ کس کو معلوم نہیں کہ اب بھی بہت سی لوگ جگہوں میں اناج کے انبار موجود ہیں۔ اِس لئے ممکن ہے غارت گری تک نوبت پہونچے۔ تو۔ ہم کہاں رہ جائیں گے؟ نہ معلوم کس جذبہ کے تحت ایک ساتھ اُن کا ہاتھ بریک پر پڑ گیا۔ انہوں نے ہایوں کو جو اُن کے قریب ہی بیٹھا تھا

کھینچ لیا۔ انھیں سامنے سے بھکاریوں کا ایک ریلا پھر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اُنہوں نے کار کو ایک جانب کھڑا کر لیا۔ اور اس بھیڑ کو خاموش نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک دُبلی پتلی اور بڑی لاغر سی عورت کمر پر کچھ بوجھ سا اُٹھائے اور ایک دس گیارہ سال کے بچے کو ساتھ گھسیٹتی چلانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے دیگر ساتھیوں کے ہم قدم ہونے کی سعی رائیگاں کر رہی تھی مگر وہ اپنا رفتار قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ پاؤں لرزنے لگے۔ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ اُس نے اپنی کمر کا بوجھ اُتار کر فٹ پاتھ پر ایک طرف رکھ دیا۔ اور خود گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ وہ بے چارہ بچہ بھی ماں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ایک راہ گیر اُس طرف سے گذر رہا تھا۔ اُس نے اس عورت کے کراہنے کی آواز سنی تو رُک گیا "کیا بات ہے مائی"؟ اُسنے ایک بھلے مانس کی طرح ملائم لہجہ میں پوچھا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ بچہ ٹکر ٹکر اس مہربان راہ گیر کی طرف دیکھنے لگا۔ تم بھوکے معلوم ہوتے ہو۔ یہ تمہاری ماں ہے شاید۔ راہ گیر نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔ لو یہ چونّی ہے۔ اِس وقت میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ میں بھی تو مزدور ہوں مزدوری پر جا رہا ہوں۔ وہ دیکھو سامنے روٹی والے کی دوکان ہے۔ ایک ہی سانس میں تمام باتیں کہکر اور بچے کے ہاتھ پر چونّی رکھ کر راہ گیر نے قدم بڑھائے۔ عورت نے گردن اُٹھائی اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے زبانِ گنگ سے بولی۔ بھیّا اتنی کرپا اور کرو ذرا جاکر روٹی لا دو۔ میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ وہ شاید پچھم والوں کی بولی نہیں سمجھتی تھی۔ اِس بے چاری کو کیا خبر تھی کہ اِس کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر آنکھیں حالِ دل کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ جو بات زبان سے ادا نہیں ہوتی وہ آنکھیں کہہ ڈالتی ہیں۔ راہ گیر اِشارہ سمجھ گیا اور دوڑ کر چار روٹیاں اور دال لے آیا۔ لو مائی۔

عورت نے راہ گیر کو نگاہِ تشکر سے دیکھا اور قریب بیٹھے ہوئے بیٹے کے ہاتھ پر ایک روٹی اور دال رکھ دی اور ایک روٹی خود کھالی راہ گیر کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ بولا اور کھالو مائی۔ مالک پھر اور دیگا۔ عورت نے احسانمندانہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے تو دو ایک رکھے ہوئے بنڈل کو کھولنا شروع کیا۔ راہ گیر حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بنڈل میں سے ایک چار پانچ سالہ بچہ جسکی آنکھیں بند تھیں برآمد ہوا اور بیٹا۔ عورت نے نحیف آواز میں پکارا۔ اور پھر اس بچے کو اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کر پکارا۔ مادھو۔ بیٹا روٹی۔ مگر بچے نے جنبش نہ کی۔ مادھو۔ عورت نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور پھر دل پر۔

مادھو۔ اُسنے بچے کو چھاتی سے چپٹاتے ہوئے رو کر پکارا اور زور سے اپنی پیشانی پر دو ہتّڑ مارا۔ اور بے ہوش ہو گئی۔ راہ گیر گھبرا گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی اور جلدی سے قریب کی گلی میں گھس گیا۔ سیٹھ اسمٰعیل بھی اس نظارۂ جانکاہ کی تاب نہ لا سکے اور جلدی سے اپنی موٹر اسٹارٹ کر دی۔ اُن کی نظروں کے سامنے کبھی کلکتہ کی اور کبھی یہ دلی کی سڑکوں پہ بے گور و بے کفن لاشے دوڑنے لگے۔ اُن سے بچنے کے لئے اُنہوں نے موٹر کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

سیاست داں

(از جناب ساغر جلیلی)

(چین کے مشہور افسانہ نگار چینگ تین یہ کا ایک افسانہ)

اگر میں نے اپنے خاندانی شجروں اور دستاویزوں کی چھان بین کی ہوتی تو میرے خیال میں اس بات کا ضرور انکشاف ہو جاتا۔ کہ وہ میرے کسی دور کے رشتہ سے تعلق رکھتا تھا۔ تاہم میں اُسے مسٹر ہواوئی کے نام سے مخاطب کیا کرتا تھا۔ حالانکہ اس طرزِ خطاب کو اُس نے کبھی پسند نہ کیا۔

"بھائی تین یہ! تم بہت ہی ایسے ویسے آدمی ہو" اُس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ "آخر کس لئے مجھے مسٹر ہواوئی کہہ کر پکارتے ہو۔ مجھے محض ہواوئی کہا کرو۔ یا اگر جی چاہے تو کامریڈ وئی ......!"

اپنے نام کی بابت یہ فیصلہ کرتے ہوئے، اُس نے سر پر ہیٹ رکھا اور پھر سلسلہ کلام کو جاری کر دیا۔ "ہم کسی دن بیٹھ کر غپ شپ لڑائیں گے۔ بھائی تین یہ، بخدا مجھے یہ ارمان ہی رہا کہ کبھی تمہارے ساتھ دل کھول کر باتیں کروں۔ مگر افسوس وقت ہی نہیں ملتا۔ تمہیں معلوم ہوگا۔ آج مجھے مجسٹریٹ لی یو نے بلایا ہوا ہے۔ اُس نے دفتر کے اوقات کے بعد کام کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا ہے۔ اپنے اشاف کے لئے۔ اور اپنی تجاویز پر مجھ سے مشورہ طلب کیا ہے۔ اور مجھے تین بجے ایک جلسہ میں شرکت کے لئے جانا ہے......!"

اُس نے اپنا سر جھکا لیا اور زور سے قہقہہ لگایا۔ وہ اس سے پہلے کئی بار مجھے بتلا چکا تھا۔ کہ وہ محنت سے نہیں گھبراتا۔ اور خصوصاً اِس جنگ کے زمانہ میں تو ہر شخص کو کچھ قربانی کرنا چاہئے۔ تاہم انصاف کا تقاضا یہی ہے۔ کہ ہر فرد کو اُس کی بساط اور فرصت کے مطابق ذمہ داریاں تفویض کی جائیں۔

اب دیکھو نا مسٹر وانگ اس وقت تک مجھے [illegible] عدد تار ارسال کر چکے ہیں۔ کہ چن گنگ کی مجوزہ [illegible] کانفرنس میں شرکت کے لئے بذریعہ ہوائی جہاز پہنچ جاؤ۔ لیکن اب تم ہی بتلاؤ میں یہاں کے اُمور کو چھوڑ کر کس طرح جا سکتا ہوں۔"

جھکتے ہوئے۔ اس نے میرے ساتھ جلد جلد مصافحہ کیا اور اپنے رکشا میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

اُس کے ایک ہاتھ میں چمڑے کی خوبصورت نوٹ بک ہمیشہ رہتی۔ اور دوسرے میں ایک مضبوط سیاہ چھڑی۔ بائیں ہاتھ میں وہ ایک موٹی سی طلائی انگوٹھی پہنتا تھا۔ جو اُسکی شادی کی یادگار تھی۔ جب وہ سگار پیتا تھا تو انگوٹھی والی انگلی کو جھکا کر قوس کی طرح گول بنا لیتا۔ اور چھنگلی کو سیدھا رکھتا۔ اس وقت اُس کا ہاتھ آرکڈ[1] کے گلدستہ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

ہمارے شہر کے قلی رکشا کو زیادہ تیزی سے نہیں کھینچ سکتے اُن کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے۔ جیسے کوئی شخص بعد از طعام چہل قدمی میں مصروف ہو۔ لیکن گھریلو رکشاؤں کا معاملہ اسکے برعکس ہے ٹن ٹن..... ٹن...... کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور رکشا چڑیا کی طرح پھر سے اُڑتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ لوگوں کے لئے اتنی جلدی میں رکشا کے واسطے راہ چھوڑنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ چھکڑے نالی میں جا پھنستے ہیں۔ خوانچے والے اپنے سامان کو پیچھے گھسیٹ لیتے ہیں۔ اور غریب راہگیر افراتفری میں سڑک کے اِدھر اُدھر خلاؤں میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسٹر ہواوئی کے ذاتی رکشا کی گھنٹی بلند آواز سے گونجتی تھی۔ اُس کے پہیوں کی آہنی سلاخیں دھوپ میں خوب چمکتی تھیں۔ اور اس سے پیشتر کہ آپ مسٹر ہواوئی کو غور سے دیکھ سکیں، وہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ نیشنل سالویشن ایسوسی ایشن کے ارکان (جو ایسی باتوں سے دلچسپی رکھتے تھے) کی رائے کے مطابق اس کا رکشا تیز رفتاری میں شہر کے تمام رکشاؤں پر فوقیت رکھتا تھا۔

اُسکے نزدیک دُنیا کی سب سے اہم چیز وقت تھی۔ جیسا کہ اُس نے ایک مرتبہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے کہا بھی تھا۔ "میں اپنی نیند کے اوقات میں بھی تخفیف کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ کاش کہ دن چوبیس گھنٹوں سے زیادہ طویل ہوتا۔ قومی اصلاح کا کام اِس قدر کٹھن ہو رہا ہے......!"

وہ اپنی طلائی رسٹ واچ پر ایک تیز نگاہ ڈالتا۔ اُسکے چہرے

[1] آرکڈ ORCHID پھولوں کے پودوں کی ایک قسم ہے جس میں نہایت خوبصورت اور خوشرنگ پھول لگتے ہیں۔

کے پیچھے اور ادھر تن جاتے۔ ہونٹ سکڑ جاتے، اور وہ پوری سرعت کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلتا ــــ اُسے ریلیف ایسوسی ایشن کے اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔

اس عجلت کے باوجود وہ جلسوں میں ہمیشہ دیر سے پہنچتا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا۔ اور سب لوگ اُس کی آمد کے منتظر ہوتے۔ رکشا سے اُترنے سے پیشتر وہ اپنے پاؤں سے گھنٹی کو زور سے دباتا۔ ٹن ٹن ــ ٹن ٹن !!

خیر! وہ ریلیف ایسوسی ایشن کے اجلاس میں جا پہنچا۔ کچھ حاضرین نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اور اطمینان کی سانس لی۔ چند اصحاب نے نفرت سے تیوریاں چڑھا لیں۔ اور غصے سے فرش کی طرف دیکھنے لگے۔ اور ایک تو گھونسا تانے ہوئے اُسے اس انداز سے گھورنے لگا۔ جیسے وہ ہواوئی پر جھپٹ ہی پڑے گا۔

مد ہواوئی کے چہرے پر متانت تھی۔ قدم مضبوط اور بھاری معلوم ہوتے تھے۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے چہرے کی تمام دہشتگی اس خوفناک متانت میں تحلیل ہوکر رہ گئی ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے دروازہ پر رُک گیا۔ تاکہ حاضرین اُسے اچھی طرح دیکھ سکیں۔ اس خودستائی کا مقصد یہ تھا کہ اُن کے دلوں میں اعتماد اور توقیر کے جذبات بھڑک اُٹھیں۔ اُس نے ایک دو بار اپنے سر کو جنبش دی۔ اور نگاہوں کو چھت کی طرف پھیر لیا۔ تاکہ غریب حاضرین کو معلوم ہو کہ ہواوئی کو اُن کی موجودگی کا احساس ہے۔

ہال میں سکوت طاری تھا۔ اور کارروائی کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ اسٹیج کے قریب چند افراد کاغذات کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ وہ اسٹیج سے دور کونے کی ایک نشست پر بیٹھ گیا، پر رعب اور ساکت و صامت ــــ ! آج اس کا ارادہ اجلاس کی صدارت کرنے کا نہیں تھا۔

"آج میں جلسے کی صدارت نہیں کروں گا۔" اُس نے وہیں سے سگار والے ہاتھ کو جنبش دیتے ہوئے پکارا۔ "نیشنل سالویشن ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ اور پھر اسکے بعد لٹریچر کی میٹنگ ہونے والی ہے۔ میں نے ان دونوں تقریبوں میں شامل ہونا ہے۔ علاوہ ازیں میں نے زخمی سپاہیوں کی امدادی کمیٹی کے کام کا بھی جائزہ لینا ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ان مختلف ذمہ داریوں کے باعث مجھے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ اس وقت میں آپ کے پاس زیادہ سے زیادہ دس منٹ صرف کرسکوں گا۔ اور صدارت کے فرائض سرانجام نہیں دے سکوں گا۔ بلکہ اس خدمت کے لئے کامریڈ لی یو کا نام پیش کروں گا۔"

اس مختصر تقریر کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ کر مسکرانے لگا۔ اور اپنی طلائی انگشتری سے کرسی کے بائیں بازو کو طبلے کی طرح بجانا شروع کردیا۔

کامریڈ لی یو نے ایسوسی ایشن کی کارگذاریوں کی رپورٹ پڑھنا شروع کی۔ ہواوئی نے اپنے سگار کو دوبارہ روشن کیا۔ اُسکے چہرے سے مترشح ہو رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں مستغرق ہے۔ یا آہستہ آہستہ کچھ شمار کر رہا ہے۔

"میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اچانک اٹھکر بلند آواز سے پکارا۔ "ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔ اس لئے میں درخواست کروں گا، کہ صاحب صدر اپنی رپورٹ کو حتی الامکان مختصر کرنیکی کوشش کریں۔ اب انہیں صرف دو منٹ اور مل سکیں گے۔"

وہ پھر سگار کے کش لگانے اور رسٹ واچ کو دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ عین دو منٹ کے بعد وہ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بڑبڑاتے ہوئے صدر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"بس، اب بس کردیجئے گا، صاحب صدر نے اپنی رپورٹ ابھی ختم تو نہیں کی۔ تاہم میں اس کی تمام تفاصیل سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ اب مجھے جلد ہی ایک دوسرے اجلاس میں پہنچنا ہے۔ لیکن آپ سے رخصت ہونے سے پیشتر چند اہم تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سگار کے چند کش لگاتے ہوئے اُسنے کچھ دیر تک سوچا۔ اور اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی۔

"میری تجاویز نہایت مختصر ہیں۔ میں صرف دو نکتے پیش کرونگا۔" اُس نے اپنے ہونٹوں کو چٹخارا۔ "پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہر شخص کو نہایت تندہی کے ساتھ کام کرنا چاہئے۔ مجھے اس بات پر زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ لوگ عقلمند ہیں۔ اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں نہایت سرگرم۔ جسکے لئے میں آپ کا نہایت شکرگزار ہوں۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور نکتہ ہے۔ جو آپ کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اور یہی میں اس وقت دوسری تجویز کے طور پر پیش کروں گا۔"

اُس نے سگار کے دو کش لگائے۔ اور منہ سے آہستہ آہستہ دھواں نکالنا شروع کیا۔ بعد ازاں سگار کے لئے ایک اور دیا سلائی جلائی۔

"اور دوسرا نکتہ ہے ہدایت اور رہنمائی کی حاجت۔ نوجوان طبقے کو رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ قومی اصلاح و مفاد کا کام اُسی حالت میں تکمیل پا سکتا ہو جبکہ اُس کی نگرانی اچھی طرح ہو رہی ہو۔ آپ نوجوان ہیں، اور اپنے کام میں نہایت پُرجوش۔ لیکن آپ ہیں ناتجربہ کار۔ اِس ناتجربہ کاری کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ لوگ غلطیوں میں آسانی سے پھنس جاتے ہیں۔ جب تک کہ آپ کے کام کی نگرانی اور رہنمائی نہ کی جائے۔ کوئی مفید نتائج برآمد نہیں ہو سکتے ——— !"

اُس نے اپنے سامعین کے بُشروں پر ایک تیز پھسلتی ہوئی نظر ڈالی ——— اب اُسکے اعضا سے اضمحلال اور پریشانی کے آثار کم ہو رہے تھے۔ وہ مُسکرایا۔ اور پھر سلسلۂ کلام کو جاری کر دیا۔

"نوجوان دوستو! آپ لوگوں کے ساتھ میں نہایت بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کرتا ہوں۔ مجھے عیارانہ، نمائشی چالوں سے نفرت ہے۔ ہم سب لوگ قومی اصلاح کی اہم خدمت میں مصروف ہیں۔ جس کے لئے تصنع کی ضرورت نہیں۔ اِس چیز کے لئے میں آپ حضرات کا شکرگذار ہوں۔ آج مجھے صرف یہی عرض کرنا تھا۔ اب افسوس ہے کہ میں جا رہا ہوں ——— !"

اُس نے ہیٹ پہن لیا۔ نوٹ بک اور چھڑی اُٹھائی۔ پھر ایک لمحے کے لئے چھت پر نگاہ ڈال کر چند مرتبہ اپنے سر کو ہلایا۔ اور ہال سے باہر نکل آیا۔ اُس کا ہیٹ آگے کو بڑھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دروازے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ جیسے کوئی چیز اندر بھول آیا ہو۔ پھر واپس جا کر اُسنے صدر کو اشارے سے ایک طرف بلایا۔ اور آہستہ سے استفسار کیا۔

"آپ کے خیال کے مطابق ہمارے کام میں کوئی خامیاں تو نہیں رہ گئیں؟"

"میں ابھی ابھی سامعین کی خدمت میں عرض کرنے والا تھا۔ کہ ...... !"

مسٹر ہوآدیئی نے اپنی انگلی صدر کے سینہ پر رکھتے ہوئے بات کاٹی۔ "ہاں ہاں! میں اِس چیز کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میرے پاس اب اتنا وقت نہیں کہ آپ کے ساتھ گفتگو کر سکوں۔ جب آپ کے ذہن میں کوئی تدبیر آئے تو مجھے گھر پر مل کر تبادلۂ خیالات کر سکتے ہیں ...... !"

ایک نوجوان قریب ہی بیٹھا اِس مکالمے کو غور سے سُن رہا تھا۔ جب اُس نے دروازہ کیا تو وہ پھوٹ ہی پڑا۔

"مسٹر ہوآدیئی! ہم بد حواد کو آپ کے ہاں تین مرتبہ حاضر ہوئے مگر آپ ایک دفعہ بھی تو گھر پر نہیں ملے۔"

مسٹر ہوآدیئی نے اُس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر جواب دیا "بھئی مجھے سینکڑوں کام ہوتے ہیں۔" اور پھر صدر کے ساتھ سرگوشی شروع کر دی۔

"اور اگر میں آپ کو گھر پر نہ مل سکوں۔ تو آپ مس ہوانگ کے ساتھ گفت و شنید کر سکتے ہیں۔ وہ میری پالیسی سے آگاہ ہیں۔ اور آپ کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہیں۔"

مس ہوانگ اُسکی بیوی تھی۔ تاہم وہ اسے ہمیشہ مس ہوانگ کے نام سے پکارتا تھا۔

یہ تمام باتیں طے کرنے کے بعد اُس نے اپنے رکشا میں قدم رکھا اور لٹریچر ریسرچ سوسائٹی کے اجلاس میں جا پہنچا۔ اسکی آمد سے پیشتر کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ اور ایک صاحب تقریر کر رہے تھے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور انگوٹھی والی انگلی سے تین بار کرسی کو بجایا۔ تاکہ اپنے رنج کا اظہار کر سکے۔

"صاحب صدر!" ——— وہ آخر پکار اُٹھا "چونکہ مجھے ایک اور اجلاس میں شرکت کے لئے ابھی ابھی جانا ہے۔ اِس لئے میں آپ حضرات کے پاس زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکوں گا۔ میں نے چند ایک تجاویز پیش کرنی ہیں۔ اور یہاں سے رخصت ہونے سے پیشتر اُن کا اظہار مناسب خیال کرتا ہوں۔ میری تجاویز دو ہیں۔ پہلی یہ کہ سوسائٹی کے تمام ارکان ادبی کارکن ہیں۔ اور چونکہ ادبی کام اِس وقت نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اِس لئے تمام اصحاب کو نہایت محنت سے کام کرنا چاہئے۔ دوسری تجویز یہ ہے۔ کہ تمام ادبی کارکنوں کو رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ بہتر اور اعلےٰ نتائج برآمد ہو سکیں۔"

پونے چھ بجے شام کو وہ نیشنل سالویشن ایسوسی ایشن کے اجلاس میں جا نازل ہوا۔ اِس مرتبہ اس کا گول چہرہ چمک رہا تھا۔ اور سکون کے آثار ہویدا تھے۔ اُس نے ایک شخص سے آہستہ سے [illegible]

"افسوس آج میں اجلاس کی ابتدائی کارروائی سے محروم رہ گیا ہوں!"

صدر اُسے دیکھ کر مُسکرایا۔ اور مسٹر ہوآدیئی نے جواب [illegible] زبان باہر نکالی۔ جیسے ایک شریر لڑکا کسی تمسخر [illegible] کے سامنے [illegible]

پھر اُس نے مجھ پر ایک تیز نگاہ ڈالی۔ اور ایک مونچھوں والے آدمی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند منٹوں کے بعد اُس نے اس شخص سے دریافت کیا۔

"کہیں رات کو آپ نے زیادہ تو نہیں پی لی تھی؟"

"نہیں تو۔ خدا کا شکر ہے، کہ میں نے تھوڑی ہی مقدار پر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ مگر آپ اپنی سنائیے گا؟"

"تو آپ میری بابت پوچھنا چاہتے ہیں؟" اس نے نہایت متانت سے کہا۔ "مجھے وہ آخری تین جام — شامپین شراب کے تین جام نہیں پینے چاہئے تھے۔ اس شراب کی زیادہ مقدار نہیں برداشت کی جا سکتی لیکن افسوس، مجسٹریٹ تی یو نے جبرًا پلا دی۔ اور میں گھر پہنچتے ہی مدہوش ہو گیا۔ مسز ہوانگ میری حالت دیکھکر خفگی میں کہنے لگیں۔ میں مجسٹریٹ صاحب کی خبر لوں گی۔ ایسی شرارت کے لئے۔ ذرا اُن کی دھمکی بھی ملاحظہ کیجئے گا!"

بعد ازاں اُس نے نوٹ بک سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا، اور جلد ہی دو چار فقرے گھسیٹ کر صدر کے پاس بھیج دیا۔

"آپ ذرا ٹھہر جائیے گا!" صدر نے مقرر کو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مسٹر ہوآ دیئی نے ابھی ابھی ایک ضروری کام پر جانا ہے اس لئے وہ ہم سے رخصت ہونے سے پہلے اپنی تجاویز پیش کرنا چاہتے ہیں۔"

اپنا سر کئی بار ہلانے کے بعد، ہوآ دیئی اپنی نشست سے اُٹھا۔

"جناب صدر!" — وہ جھک کر آداب بجا لایا — "اور محترم بہنوں اور بھائیو!" — اُس نے دوبارہ جھک کر حاضرین کو آداب کیا —

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ کہ آج میں جلسہ میں بہت دیر سے پہنچا ہوں۔ لیکن مجھے جلد ہی واپس چلے جانا ہے۔ ایک اور میٹنگ میں شریک ہونے کے لئے۔ ہماری مجلس عاملہ شہر کے بہترین دماغوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے ہمیں دوسری تمام مقامی انجمنوں کی رہنمائی اور نگرانی کرنا چاہیئے ورنہ ان کے طبقوں میں انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ جبتک کہ ہم لوگ انکی رہنمائی نہیں کرینگے۔ اُن کے تاریک مستقبل کا امکان دور نہیں ہو سکے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قومی اصلاح و مفاد کی اسکیم کے ہر شعبے کو رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور اس لحاظ سے ہماری ذمہ داریاں بہت بھاری ہیں۔ لیکن ہم کبھی بھی جانفشانیوں سے گھبراتے نہیں۔ اس لئے اپنے شانوں پر یہ بوجھ اُٹھانے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ ہماری قوم کو مخلص رہنماؤں کی اشد ضرورت ہے......!"

تقریر ختم کر کے اُس نے ہیٹ سر پر رکھا۔ اور رکشا میں سوار ہو کر کسی دوسری میٹنگ میں شرکت کے لئے روانہ ہو گیا۔

مسز ہوآ دیئی سے جب بھی میری ملاقات ہوتی۔ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی بے پناہ مصروفیتوں کی بابت شکایت کرتیں "انکی حالت قابلِ رحم ہے۔ اتنی فرصت بھی تو نہیں کہ گھر میں کھا سکیں......" وغیرہ وغیرہ۔

"کیا وہ اپنی مصروفیتوں میں تخفیف نہیں کر سکتے۔؟" آخر ایک دن میں نے اُن سے پوچھ لیا۔ "انہیں اپنی سرگرمیوں کو صرف ایک ہی تحریک تک محدود رکھنا چاہیئے۔"

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں، کہ ہر تحریک میں ان کی رہنمائی درکار ہوتی ہے!"

لیکن ایک دن مسٹر ہوآ دیئی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جبکہ مقامی خواتین نے اُس کے مشورہ کے بغیر "انجمن امداد یتیمانِ جنگ" قائم کر لی۔ جب اُسے اس بات کا علم ہوا تو وہ انجمن کے بانیوں کو اپنے گھر بُلا لایا۔ اور اُن سے اس طرح مخاطب ہوا۔

"معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک انجمن قائم کر چکے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو مجلسِ عاملہ کے ارکان میں کچھ اضافہ کر لینا چاہیئے۔"

لیکن جب اُنہوں نے اس تجویز سے نارضامندی ظاہر کی۔ تو وہ چیں بجبیں ہو کر بولا۔ "مجھے یقین نہیں کہ تم لوگ اس انجمن کا کام درست طریق سے سرانجام دے سکو گے۔ کیا تم مجھے یقین دلا سکتے ہو۔ کہ مجلس عاملہ میں نازیبا عنصر کا داخلہ نہیں ہوگا؟ کیا تم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ تم سے کوئی غلطیاں سرزد نہیں ہوں گی؟ بتلاؤ۔ کیا تم ان تمام باتوں کی گرانٹی دلا سکتے ہو؟ آؤ۔ اس کاغذ پر عہد نامہ تحریر کر دو کہ تم اِن باتوں کو پورا کر سکو گے۔ اور جب بعد ازاں تمہاری خامیاں منظر عام پر آئیں گی تو تم لوگ ان کے ذمہ دار ٹھہرائے جاؤ گے۔ یہ کہنے سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ میں ان دنوں باتوں کا زیادہ خیال رکھتا ہوں۔ میرا واسطہ عموماً ایگزیکٹیو کمیٹیوں ہی سے رہتا ہے۔ بہر حال تم لوگ میری بیان کردہ باتوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔ تو تمہاری انجمن ایک غیر فانی ادارہ ہے۔"

جب اُس نے لوگوں کو دو تین بار اسی طرح دھمکایا اور ڈرایا تو اُسے مجلس عاملہ کا ایک رُکن منتخب کر لیا گیا۔ چنانچہ حسب معمول وہ اس انجمن کے اجلاس میں بھی صرف چند منٹ کے لئے شریک ہوتا۔ اور دو چار فقروں کی تقریر کے بعد، اپنی نوٹ بک اور چھڑی سنبھالے چلا جاتا۔

...کشتی پر سوار ہو کر رخصت ہو جاتا۔

ایک رات اُس نے مجھے اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ کیونکہ اُسے کسی دوست نے دیہات سے سور کا نمکین گوشت بطور تحفہ بھیجا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ دو نوجوان طلباء کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

"تم نے آج جلسہ میں شرکت کیوں نہیں کی؟" وہ زور سے چلا رہا تھا "میں نے تمہیں ہدایت کی تھی کہ اور لوگوں کو بھی جلسہ میں شمولیت کے لئے آمادہ کرنا۔ لیکن جب میں تقریر کے لئے اسٹیج پر آیا۔ تو غیر حاضر تھے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم لوگ کرتے کیا رہتے ہو؟"

"میں تو آج "انجمن تعلیم پناہ گیراں" کے جلسہ میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا؟" ایک طالب علم نے جواب دیا۔

مسٹر ہواوبی غصہ میں اُچھل پڑا۔ "یہ کیسی انجمن ہے؟ پناہ گیروں کی تعلیم کے نئے ادارے کی تشکیل؟ انہوں نے مجھ سے مشورہ نہیں کیا۔ مجھے اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟"

"ہم نے تو پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ آپ کو اس انجمن میں شرکت کے لئے مدعو کرینگے۔ لیکن ہم جب بھی آپ کے گھر پر حاضر ہوئے آپکو موجود نہ پایا۔"

"بس! اب مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ تم لوگ کوئی سازش کر رہے ہو!" اُس نے طلباء کو قہر کی نگاہوں سے دیکھا۔ "بتلاؤ۔ سچ سچ بتلاؤ۔ تمہاری انجمن کے اغراض و مقاصد کیا ہیں۔ مجھے صداقت بیانی درکار ہے!"

طلباء کو یہ فقرے ناگوار گذرے اور اُنہوں نے جھنجھلا کر کہا "تم ہمارے اغراض و مقاصد کی بابت کیا معلوم کرنا چاہتے ہو! ہم سب لوگ چین کے سپوت ہیں۔ خفیہ سازش کا کیا مطلب —— تم آج تک کسی اجتماع میں ٹھیک وقت پر شرکت نہیں کر سکے۔ نہ کبھی اجلاس کے اختتام تک ٹھہرے ہو۔ جب ہم تمہارے گھر آتے ہیں تو تم ملتے نہیں۔ ہم تمہارے لئے اپنی سرگرمیوں کو التوا میں نہیں ڈال سکتے۔"

مسٹر ہواوبی نے اشتعال میں اپنا سگار فرش پر پھینک دیا۔ اور میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ "اچھا، کتیا کے بچو! یہ بات ہے" —— وہ دانت پیس رہا تھا اور اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"اب ذرا احتیاط سے رہنا تم!" وہ صوفے پر گر پڑا۔ اور طلباء کو گالیاں بکنے لگا۔ "تم پر خدا کی مار ہو کتیا کے بچو!!"

تقریباً پانچ منٹ کے بعد اُس نے اپنا سر بزدلانہ انداز سے اُٹھایا۔ اور صوفے کے اردگرد نگاہ ڈالی۔ دونوں اشخاص جا چکے تھے۔ اُسنے ایک نہایت [illegible]

"ذرا دیکھنا ان [illegible] آجکل کے نوجوان [illegible] دیکھا تم نے؟"

اِس رات وہ بہت سی شراب پی گیا۔ اور دو بدنصیب طلباء کو واہی تباہی بکتا رہا۔ وہ اِس قدر آپے سے باہر تھا۔ کہ اُسنے غصّے میں ایک چائے کی پیالی زمین پر دے ماری۔ اور جب مسز ہواوبی اُسے سہارا دے کر خوابگاہ کی طرف لے جا رہی تھیں۔ وہ کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے بُڑبُڑایا۔

"کل دوپہر کو ایک اور میٹنگ منعقد ہو رہی ہے"

ہندوستانی کُتّا

(از ڈاکٹر اعظم کریوی)

مانکل دُرگا ریلوے اسٹیشن گنٹکل بنگلور لائن پر ہے۔ پلیٹ فارم سے ریلوے اسٹیشن کچھ اونچائی پر ہے۔ اِس کے بغل میں ایک بڑا پہاڑ ہے۔ اور گھنا جنگل ہے۔ کبھی کبھی رات میں بھیڑیے اور چیتے بھی وہاں آجاتے ہیں۔ عقب میں ایک بڑی گھاٹی ہے۔ گھاٹی کے اس پار پہاڑ پر کسی امیر کا ایک خوبصورت محل ہے۔ اِس گھاٹی سے دو تین چشمے بھی بہتے ہیں۔

مانکل دُرگا اسٹیشن بہت چھوٹا ہے۔ وہاں ایک چھوٹی دوکان بھی ہے۔ گاڑی کے آنے کے وقت دوکان کھلتی اور ایک کُتّا وہاں آجاتا۔ دوکان کچھ اونچی جگہ پر ہے۔ کُتّا نیچے کھڑا ہوا دُور سے مٹھائی یا کچوری کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا اور اِس فکر میں رہتا کہ دوکان کے مالک سے کسی طرح چیزیں رکھتے ہوئے یا تولتے وقت کوئی ٹکڑا نیچے گر پڑے اور وہ ہڑپ کر جائے۔ لیکن سات آٹھ دن میں بھی کبھی ایک ٹکڑا نہ گرتا۔ ہاں کوئی خریدار سات آٹھ دن کا باسی سمجھ کر اگر کوئی چیز نیچے پھینک دیتا تو اُسے مل جاتا۔ وہ اُسے دانتوں سے دبا کر بڑی مشکل سے حلق کے نیچے اُتارتا پھر کھانس کر اُگل دیتا۔ جب گاڑی اسٹیشن سے نکل جاتی تو حلوائی اپنی دوکان بند کر دیتا۔ اور کُتّا چشمہ کا پانی پی لیتا۔ ہوا کھلے پاؤں پھیلا کر گھاس پر لیٹ جاتا اور گھاس کُترنے لگتا۔ وہ ٹڈیوں کے پکڑنے میں بہت ہوشیار تھا۔ کبھی کبھی اُسے اور بھی کوئی شکار مل جاتا۔ جھرنے کا پانی پینے۔ اچھی ہوا میں پھرنے اور جنگلوں میں سیر کرنے کی وجہ سے وہ کافی مضبوط ہو گیا تھا۔ لیکن کبھی بھول کر بھی وہ سامنے کے پہاڑ پر نہیں جاتا تھا۔

ایک دن ایک جنٹلمن ولایتی کتیا لئے ہوئے اُس اسٹیشن پر اُترا۔ پہلی ہی ملاقات میں کُتّا اور کُتیا میں پریم ہو گیا۔ جنٹلمین کے ہاتھ میں موٹی چھڑی تھی۔ اُس کے ڈر سے کُتّا اپنی پیاری کے پاس نہ جا سکا۔ میکہ میں رہنے والی دوشیزہ کی طرح وہ ولایتی کتیا اپنے پیارے کی طرف بار بار دیکھنے لگی۔ دُرگا والا کُتّا لوگوں کی نظریں بچا کر اپنی پیاری کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ کیونکہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے لوگ اسے آوارہ سمجھیں گے۔ اِس جنٹلمین نے کُتیا کو ایک ستون سے باندھ دیا اور آپ کہیں سامان تلانے کے لئے چلا گیا۔ پھر کیا تھا۔ دونوں کتے ایک ہو گئے۔

اسٹیشن ماسٹر اور اجنبی میں کچھ آپس میں باتیں ہونے لگیں۔ اسٹیشن ماسٹر پرانے خیالات کا آدمی تھا۔ جنٹلمین نے کہا۔ "یہ نئی روشنی اور ترقی کا زمانہ ہے۔ ہم آنکھیں بند کر کے گڑھے میں نہیں گر سکتے۔ اب وہ زمانہ گیا کہ چونکہ بڑوں نے ایسا کیا ہے ہم کو مان لینا چاہیئے۔ جی نہیں اب ہم اُنہیں باتوں کو مان سکتے ہیں جو عقل اور بحث کی کسوٹی پر ٹھیک اُتریں۔ دُنیا کی ترقی کے ساتھ ہماری عقل بھی بڑھ رہی ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ہمارے بزرگ بحث کرنا بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ ترقی پسند نہ تھے۔

اسٹیشن ماسٹر۔ "تو کیا آپ ذات پات کو بھی نہیں مانتے"؟

جنٹلمین۔ جی ہاں۔ یہ ذات پات ہی تو سب جھگڑوں کی جڑ ہے۔ کچھ لوگ اپنے کو بڑا سمجھنے لگے ہیں۔ اور پسماندہ قوموں پر حکومت کرتے ہیں۔ مُلک کی نجات اِسی میں ہو سکتی ہے۔ جب ہم ذات پات سے الگ ہو کر آپس میں بیاہ شادی کریں۔

اسٹیشن ماسٹر۔ یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا چاہیئے۔ مگر میں یہ پسند نہیں کرتا کہ ذات برادری سے باہر شادی کی جائے۔

باتیں ختم ہوئیں تو جنٹلمین کمرہ سے باہر نکلا۔ یہ کیا ـــــــــ اس کی ولایتی کتیا۔ ہندوستانی جنگلی کتّے سے پریم ملاپ کر رہی ہے۔ جنٹلمین جو آج چند لمحے پہلے اسٹیشن ماسٹر سے ذات پات توڑ کے صلاح بحث کر رہا تھا ولایتی کتیا کے ساتھ ہندوستانی کتّے کا ملاپ ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ سکا۔ وہ دوڑ کر اُس مقام پر پہونچا اور ہندوستانی کتّے کو موٹے ڈنڈے سے پیٹنے لگا۔ پریم کا بندھن ٹوٹ گیا ـــــــــ بڑی مشکل سے کتا اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اِسے تھوڑی دور جا کر معلوم ہوا کہ اِس کی ران ٹوٹ گئی ہے ـــــــــ سرشار محبت کتیا کو بھی جنٹلمین نے دو چار لاتیں لگائیں۔

شور و غل کو سن کر اسٹیشن ماسٹر بھی اپنے کمرہ سے باہر آگیا۔ اور جب اُس کو حقیقت معلوم ہوئی تو اُس نے جنٹلمین سے کہا۔ "بابو جی!

آپ نے [illegible] اتنا کیوں مارا؟"

جنٹلمین۔ "یہ بھی غنیمت سمجھئے کہ میں نے اُسے جان سے نہیں مارا۔ ابھی جناب یہ خاندانی کتیا ہے۔ میں نے اس کے لائق ایک عمدہ نسل کے کتے کی خریداری کے لئے بہت کوشش کی مگر اب تک میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چونکہ کل یہ [illegible] آئی ہوئی ہے میں اِسے بنگلور لئے جا رہا ہوں وہاں اِسی نسل کا جوڑا مل جائے گا۔"

اسٹیشن ماسٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ جنٹلمین نے تیور بدلا چڑھائیں مگر پھر دونوں میں دوستانہ باتیں ہونے لگیں۔ ولایتی کتیا کی خوبصورتی۔ پیشانی پر لال نشان اور جینور کی طرح دُم دیکھکر اسٹیشن ماسٹر نے بہت تعریف کی اور جنٹلمین سے وعدہ کرالیا کہ اس کتیا کا ایک پلّہ وہ ضرور دیں گے۔

اس جنگلی ہندوستانی کتے کے میل ملاپ سے کتیا کے جسم میں کیچڑ لگ گئی تھی۔ جنٹلمین نے اپنے صندوق سے صابن اور تولیہ نکالا اور کتیا کو خوب اچھی طرح سے نہلا کر اسے تولیہ سے صاف کر دیا۔ اس عرصہ میں گاڑی آگئی اور جنٹلمین اپنی کتیا کو گود میں لے کر ڈبہ میں بیٹھ گیا۔ لنگڑاتا ہوا دیہاتی کتا کچھ دور پر کھڑا ہوا دھیمی غرّاہٹ کے ساتھ کتیا پر الوداعی نظریں ڈال رہا تھا۔ جنٹلمین نے چھڑی ہلائی تو کتا کچھ اور دور ہٹ گیا۔

گاڑی چلی۔ کتیا بار بار دروازہ کی طرف دوڑتی اور کتے کو دیکھنے کی کوشش کرتی۔ لیکن جنٹلمین اُسے زنجیر سے کھینچ لیتا۔ جب گاڑی بنگلور پہنچی تو کتیا نے چلانا اور دوڑنا بند کر دیا اور اپنے مالک کے پاس بیٹھ گئی۔ جنٹلمین پیار سے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور کہا "لیلا تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا" اتنا کہہ کر جنٹلمین نے اس کا منہ چوم لیا۔ کتیا جواب تک دیہاتی کتے کے پیار میں مست تھی جب جنٹلمین نے اُسے چوما تو اُسے ایسا معلوم ہوا گویا کسی غیر نے پیار کیا ہے۔

(۲)

ہندوستانی کتے نے اپنی ران کو جنگلی جڑی بوٹیوں سے رگڑ کر اور جھرنے کی کیچڑ لگا لگا کر تقریباً پندرہ دن میں اچھا کر لیا۔ اور پھر پہلے کی طرح اسٹیشن پر آنے جانے لگا۔ مٹھائی کی دوکان پر بھی اسکی نظریں پڑنے لگیں۔

ایک دن دو طالب علموں نے دوکان سے کچھ خریدا اور وہیں تخت پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ باتیں بھی ہوتی جاتی تھیں۔

ایک "ہمارے یہاں رحم نام کو نہیں۔ بڑے چھوٹوں پر حکومت کرنے [illegible] ہیں۔ [illegible] نہیں [illegible] غریب بھوکوں مر رہے ہیں اور امیروں کو گدوں اور کوچوں پر نیند نہیں آتی۔

دوسرا۔ ہمارے ہندوستانی خود غرض ہوتے ہیں کسی کو مٹھی بھر بھیک دینا بھی پسند نہیں کرتے۔ غریبوں کو نہیں کھلاتے چاہے کتوں کو کھلاتے پھریں۔

دونوں طالب علم انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کو کھاتے دیکھ کر کتا اُن کے قریب پہنچ کر دُم ہلانے لگا۔ ایک طالب علم پاؤں میں بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کتے کے پیٹ میں ٹھوکر مار دی۔ کتے نے دو تین دن سے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ معلوم نہیں وہ ٹھوکر کہیں نازک جگہ پر لگی کہ کتا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سنبھل کر اُٹھا اور وہاں سے بھاگا۔ دوسرے طالب علم نے کتے کے سامنے مٹھائی کا ٹکڑا پھینکا۔ لیکن کتے نے درد کے مارے اُس ٹکڑے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

اُسی دن کا ذکر ہے کہ رات کو پہاڑ سے ایک چیتا اسٹیشن پر آگیا خوف کے مارے کتا اُس دوکان کے نیچے چھپ گیا۔ آدھی رات کا وقت اور چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چیتے کو کتے کی باس مل گئی اور وہ اُس دوکان کے قریب تاک میں بیٹھ گیا۔ چیتا جب اندر منہ ڈالتا تو کتا اُسے نوچ لیتا منہ پھیر کر بیٹھتا تو اُسکی دم اور پیٹھ میں کاٹ کھاتا۔ ایک دفعہ چیتے کو غفلت میں پاکر کتا جھپٹ کر باہر نکلا اور چیتے کی گردن پر اچھی چوٹ لگا کر پھر دوکان کے نیچے گھس گیا۔ اسی طرح دو تین گھنٹے تک کبھی باہر اور کبھی چھپ کر لڑائی ہوتی رہی۔ آخر کار موقع پاکر کتے نے جھپٹ کر اس کا گلا پکڑا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک چیتے کی جان نہ نکل گئی۔ صبح ہوتے ہی سب لوگ جمع ہوگئے اور کتے کی بہادری پر عش عش کرنے لگے۔ جس کتے کو کبھی کسی نے پوچھا نہیں تھا اُسی کتے کی آج قدر ہوگئی۔ اسٹیشن ماسٹر کی فرمائش ہوئی کہ اُسے روزانہ کھانا کھلایا جائے۔ اُس دن شام کو حلوائی نے بھی اپنے خیال سے دریا دلی کی حد کر دی۔ پکوڑی کا ایک ٹکڑا اُڑا لینے میں بھی جو کنجوسی کرتا تھا اُسی نے آج سال بھر کی بچی ہوئی تیل سے بنی ہوئی مٹھائی کی ٹوکری کتے کے سامنے رکھ دی۔ کتے نے شوق سے کھا لیا۔ رات ہوتے ہی اسکے پیٹ میں درد ہوا۔ اور کتا ساری رات کراہتا رہا۔ گھر میں لیٹے ہوئے اسٹیشن ماسٹر اور ہمسایوں نے سوچا کہ شاید چیتا پھر آگیا۔

اب کتا چاروں طرف چین سے پھرنے لگا۔ سامنے پہاڑ والے

جنگل میں گھس گیا اس نے ہر طرح کی جڑی بوٹیوں کو لا کر چاٹا مگر کسی سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بھیگی مٹی نے بھی جواب دیا۔ جھبرے کا (؟) بھی اب اس کے حق میں آبِ حیات ثابت نہ ہوا۔ چلاّنے لگتا گویا گاڑی کے نیچے اس کی کمر دب گئی ہو۔ ایک ہفتہ اسی طرح کراہتے گذرا۔ ایک دن وہ اتر کر چیتے یاجس نے چیتے کو مار ڈالا تھا وہ ایک ہفتہ کی بیماری سے ہی بہت کمزور ہو گیا۔ اس کا پچھلا دھڑ مارا گیا۔ کسی گوشہ میں پڑ کر درد سے کراہنے کی بھی اس میں سکت نہ رہی۔ مٹھائی والی دوکانوں کی طرف دیکھنے سے بھی وہ کانپ اٹھتا۔ پہلے وہ آزادی سے اسٹیشن پر گھومتا تھا۔ ہر کمرہ میں بلا تکلف گھس جاتا تھا۔ لیکن اب تو سب اس سے نفرت کرتے تھے۔

(۳)

چھ مہینے گذر گئے وہ کتّا نہ مرتا تھا نہ جیتا تھا۔ اسی کشمکش میں اسکے دن گذر رہے تھے۔ ایک دن ولایتی کتیا والا جنٹلمین آ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہا "کہئے صاحب کتیا نے بچّے جنے یا نہیں"

جنٹلمین:- "بابو کتیا کو میں بنگلور لے گیا تھا۔ اس نے اپنی ذات کے کتّے کو پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ آپ کے کمبخت دیہاتی کتّے نے میری ولایتی کتیا کو خراب کر ڈالا تھا۔ کتیا نے دو بچے دئے۔ بالکل معمولی دیہاتی مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ اب کے جنے گی تو ضرور آپ کو ایک پلّا دوں گا۔"

اسٹیشن ماسٹر نے کہا "اجی جناب! ہمارا کتّا بہت اچھا اور بہادر ہے۔ کچھ دن ہوئے چیتے کو مار ڈالا تھا۔

جنٹلمین:- اس کمبخت کتّے کا ذکر نہ کیجئے۔ اگر اب بھی وہ مجھے مل جائے تو میں اُسے گولی مار دوں۔

اتنے میں پچھلا دھڑ گھسیٹتا ہوا وہ کتا بھی وہاں آ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہا "یہی وہ کتّا ہے"

اس کو دیکھتے ہی وہ جنٹلمین آپے سے باہر ہو گیا اور ایک چھڑی لگا ہی دی۔ وہ غریب بھاگ دسکا پاؤں اور سر اٹھا کر رونے لگا۔ پورٹر نے اُسے پاؤں سے پکڑ کر دور دھکیل دیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے ہنس کر کہا۔ آپ اتنے ناراض کیوں ہوتے ہیں صاحب" رات کو جنٹلمین اسٹیشن ماسٹر کا مہمان ہوا۔ اسی رات کو اتفاق سے کتّا گاڑی کے نیچے آ گیا جس طرح جرّاح مریض کے جسم کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ اسی طرح ریل نے کتّے کے پچھلے دھڑ کو کاٹ کر الگ کر دیا۔ اور کتّا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

(۴)

اس کے چار مہینے کے بعد وہ جنٹلمین پھر اسٹیشن پر آیا اور اسٹیشن ماسٹر سے کہا "میری کتیا نے جو دو دوغلے بچے دئے تھے اُن میں سے ایک تو مر گیا دوسرے کو میں آپ کے لئے لایا ہوں"

اسٹیشن ماسٹر نے بڑی خوشی سے کتّے کے بچّے کو لے لیا۔ یہ اُن کے دیہاتی کتّے کی یادگار تھا۔ وہ چھ مہینے ہی میں بڑھ کر باپ کے برابر ہو گیا۔ سامنے والے پہاڑ پر نڈر ہو کر سیر کرتا۔ اگر کوئی اُسے مٹھائی کھلانے آتا تو وہ اُسے کاٹنے کو دوڑتا۔ دیہاتی کتوں نے اسے گھیرا مگر اُس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ چیتے اور خرگوش کے بچوں کا شکار کرتا۔ جب کبھی وہ جنٹلمین اسٹیشن پر آتا اور اُس کتّے کو پیار کرنا چاہتا تو وہ ناراضی سے اُسکی طرف دانت نکال کر بھونکنے لگتا۔ گاڑی آنے کا وقت ہوتا تو وہ اسٹیشن سے دور چلا جاتا۔ اُسے گاڑی سے دِلی نفرت تھی۔ ایک دن حلوائی نے اُسکے سامنے باسی مٹھائی ڈال دی۔ اُس نے اُس کی ران سے ایک گوشت کی بوٹی نکال لی۔ سب کہنے لگے یہ کتا نہیں بلکہ چیتا ہے۔ اُس کو انسان سے ایسی نفرت ہوئی کہ وہ بستی چھوڑ کر جنگل میں رہنے لگا۔ کبھی کبھی وہ اسٹیشن کی طرف آ جاتا تھا۔ ہمیشہ اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے سے یا اِس وجہ سے کہ اُس کی شکل کچھ اپنی ولایتی ماں سے ملتی تھی اُس کی دم کے بال جھبرے ہو گئے تھے۔ "جھبرا" "جھبرا" کہہ کر لوگ اُسے پکارتے تھے لیکن وہ پکارنے والوں کی طرف نفرت وحقارت کی نظریں ڈالتا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا۔ آدمی کو کتّے سے نفرت ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن کتّا اور وہ بھی ہندوستانی۔ دوغلا کتّا آدمی سے نفرت کر رہا تھا یہ بات سب کے لئے عبرتناک اور ناقابلِ فہم تھی۔

(ملخص از تلیگو)

انجام

(از جناب امین الدین عارف)

گرمی کی ایک تیز دوپہر تھی ——— باغوں میں گھنے پیڑوں کے سایہ میں گاؤں کی لڑکیاں مختلف کھیل کھیل رہی تھیں۔ ایک طرف گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے شرارتوں میں مصروف تھے۔ سخت گرمی کے باوجود ہر طرف چہل پہل اور رونق تھی۔

گاؤں کی اس پُرسکون دنیا میں راگنی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی گیت الاپ رہی تھی۔ چمپا کے اصرار پر آج اُس نے پھر سے وہی گیت سنایا تھا جس سے کچھ عرصہ پیشتر کسی دوسری سہیلی کی شادی میں راگنی کی آواز کی دھاک بیٹھ چکی تھی ——— فضا میں سریلی آواز مل کر ایک عجیب دلدوز کیفیت پیدا کر رہی تھی ——— جیسے تمام کائنات موسیقی سے جھوم رہی ہو ——— قریب ہی آم کا پیڑ ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر راگنی کی آواز کی داد دے رہا تھا۔ قرب وجوار کی تمام چیزوں پر موسیقی کا جادو چل گیا تھا۔ فضا پر خاموشی طاری تھی اور راگنی کی آواز اس خاموشی کو چیرتی ہوئی دور تک سنائی دے رہی تھی۔ جیسے پپیہا برسات میں اپنا راگ الاپ رہا ہو ؎

ساجن ہم سے روٹھ گئے ہیں   جیسے بندھن ٹوٹ گیا ہو
آنکھوں سے بہتے ہیں موتی   جیسے ہردے ٹوٹ گیا ہو
چھوٹ گئے ہیں چھوٹ گئے ہیں
ساجن ہم سے روٹھ گئے ہیں!!

آؤ منائیں ان کو گوری   پریم میں آخر چنتا کیسی
پیچھے پھر پچھتائیں گے ہم بھی   جب نہ ملے گی ساعت ایسی
چھوٹ گئے ہیں چھوٹ گئے ہیں
ساجن ہم سے ....!!

آواز کا لوچ سننے والوں کو مدہوش کئے ہوئے تھا۔ جیسے کسی ساحر نے اپنے فسوں کے زور سے بیکل کر دیا ہو۔ راگنی خود اتنی منہمک تھی کہ وہ گانا بہت دیر تک گاتی رہی ——— آخر گانا ختم ہوا۔ اور سب تعریف کرتی ہوئی لڑکیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔

سورج کا [illegible] [illegible] سے [illegible] میں پڑ کر ایک عجیب منظر [illegible] کر رہی تھیں۔ [illegible] مغرب میں ایسا نظر آ رہا تھا جیسے تھک کر [illegible] کی پرچھائیں کے بعد مغرب کے دروازوں پر سیاہ پردے پڑ گئے۔

اندھیرے میں راگنی نے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا پایا۔ [illegible] کی چاپ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا ——— ایک لمحہ کے لئے وہ [illegible] کچھ ڈرتا ہوا سا نظر آیا۔ لیکن یہ کیفیت جلد ہی غائب ہو گئی اور مادھو پیڑوں کی آڑ میں سے آتا ہوا نظر آیا۔ اُس نے سر سے ڈھلکا ہوا آنچل درست کیا...

....!! اب مادھو اُس کے قریب آچکا تھا۔

"راگنی کل میں شہر جا رہا ہوں"...... مادھو بولا۔

"شہر......؟" اُس نے تعجب سے پوچھا۔

وہ شہر والوں کی بے وفائی اور بے رحمی کی داستانیں اکثر سنتی رہی تھی۔ اور ابھی حال ہی میں اُس کے گاؤں کا ایک شخص اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی شہر جانے سے کسی دوسری عورت کا شکار ہو چکا تھا۔ "شہر کی عورتیں بڑی چلتی ہوتی ہیں"........ "لیکن مادھو" اُس نے کہا۔ وہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہاں کی عورتیں زبردستی کسی کے گلے تو پڑتی نہیں ہوں گی"۔ ——— وہ دل میں اِن سوالات کو حل کر رہی تھی۔ وہ اسی عالم میں آئندہ آنے والے زمانے کے سپنے دیکھتے دیکھتے اور مستقبل کے بھیانک خطروں کا تصور کرتے ہوئے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ اُسے مادھو سے یہ بھی پوچھنا یاد نہ رہا کہ وہ شہر کیوں جا رہا ہے؟

"کیا سوچ رہی ہو ——— راگنی؟" مادھو کی آواز نے اُسے جیسے خواب سے چونکا دیا ہو۔

"میں سوچ رہی تھی کہ تم نہ جانے کب تک شہر سے واپس آؤ گے" ——— "مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے شہر جا کر؟" راگنی کی آنکھوں میں محبت کے آنسو چمک رہے تھے۔

مادھو نے اُسے سینے سے لگا لیا اور بولا ——— "بھلی ہو گی [illegible] میں بہت جلد واپس آجاؤں گا"۔

راگنی کو چند لمحے کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی روح کو تسکین مل گئی ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ مادھو اسی طرح اُسے سینے سے لگائے رہے یہاں تک کہ دونوں ایک ہو جائیں ———

[illegible] ——— راگنی ایک [illegible] سے

تمنا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں سہیلیوں سے بھی اُسکی طبیعت اُکتا سی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مادھو بیٹھا ہو اُس سے پیار کی باتیں کرتا رہے اور بس۔ کسی اور چیز کی اُسے تمنا نہیں تھی۔ باغوں کی نشست بھی بُری معلوم ہونے لگی تھی اور اُس نے گانا بھی بند کردیا تھا۔ وہ سہیلیوں کے مذاق سے تنگ آگئی تھی۔ اور اُس کی روح کسی گم گشتہ شے کی تلاش میں تھی۔ اور وہ تھا مادھو۔ اُس نے مادھو کی واپسی تک ہر لمحہ اُس کے انتظار کے لئے وقف کردیا۔ ——— اُس کی نظر شہر سے آتی ہوئی ایک ڈنڈی پر بل کھاتی ہوئی دور تک چلی جاتی مگر روز اُس کی تمناؤں پر پانی پھر جاتا۔ اور اُسے گھر کی طرف مایوس لوٹنا پڑتا۔

ایک ہفتہ گذر چکا تھا ——— اُس نے دن بھر انتظار کیا لیکن شام کو مادھو اُس سے نہ ملا۔ اُس نے صبح سُنا کہ مادھو شہر سے واپس آگیا ہے لیکن آج اُس کا گاؤں میں ہوتے ہوئے راگنی سے نہ ملنا اُسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اُس نے سوچا راستہ چلنے سے تھک گیا ہوگا شاید اسی لئے نہیں آیا۔ وہ دیر تک باغ کے سب سے پُرانے آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھی اُس کی راہ دیکھا کی۔ دُنیا میں اُسکی مادھو کی محبت کا راز صرف اِس پیڑ ہی کو معلوم تھا۔ وہ بچپن سے اسی پیڑ کے نیچے کھیلے تھے۔ ان کی جوانی کے حسین لمحات اور ان کی محبت کے پاک جذبات بھی اسی پیڑ کے نیچے پروان چڑھے تھے۔

رات کافی گذر گئی تھی وہ مایوس ہوکر گھر کی طرف چل دی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ ماں آج ضرور خفا ہوگی اور پوچھے گی کہ اتنی رات تک کہاں تھی؟ وہ کیا جواب دے گی۔" وہ بیکار اتنی دیر تک وہاں ٹھہری" اُس نے اپنے آپ کو ملامت کی۔

گھر کے قریب مادھو سے مُٹ بھیڑ ہوگئی .... "مادھو تم باغ میں کیوں نہیں آئے؟" راگنی نے پوچھا۔

"معاف کرنا راگنی ذرا کام میں لگا ہوا تھا ...." "تمہیں بھی دیر ہوگئی ہے اور مجھے بھی کام ہے۔ اچھا کل ملیں گے ......"

اتنا کہہ کر مادھو چل دیا۔ راگنی جیسے پتھر کا مجسمہ بن گئی ....

"کام ...... کام ...... کام" اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ مادھو میں تبدیلی پا رہی تھی۔ اُسے مادھو سے ایسی اُمید نہ تھی کہ وہ اُسے اس طرح سے ٹال دے گا۔ وہ سوچنے لگی "کیا وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا؟ کسی نے اُس کے کان میں کہا" نہیں کچھ ایسی ہی بات ہوگی

ورنہ مادھو کبھی ایسا نہ کرتا" ——— اُس نے دیکھا مادھو دور جاچکا تھا۔

"یہاں کیوں کھڑی ہے؟ کسی کی سخت آواز نے راگنی کو چونکا دیا۔ وہ سہم گئی اُس کا بھائی بازار سے واپس آرہا تھا اُس سے کچھ جواب دیتے نہ بن پڑا۔ وہ اُس کے ساتھ ہولی۔

رامو راگنی کا بڑا بھائی تھا۔ اُس نے دور سے راگنی کو کسی سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ جب وہ راگنی کے قریب پہنچا تو اس نے مادھو کے گھر کے اندر ایک سایہ داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ راگنی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اِس لئے اُسے یقین ہوگیا کہ وہ ضرور مادھو ہی سے باتیں کر رہی تھی۔ اُس نے مادھو سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہ اپنے دل میں مادھو کی بابت نہ معلوم کیا کیا سوچنے لگا۔ اُسے راگنی پر بھی رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ لیکن راستہ بھر وہ نہ بولا۔ گھر پہنچ کر نیم کی کچی ٹہنی سے اُس نے راگنی کو خوب ہی مارا ——— راگنی گونگی بنی ہوئی پٹتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد ماں نے آکر بچالیا۔ جب ماں کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو راگنی کا نکلنا بند کردیا گیا۔

راگنی جب بھی سوچتی کہ یہ سب کیا ہوا۔ تو وہ پہروں روتی تھی اس کا اثر اس کی صحت پر بُرا پڑ رہا تھا۔

دِن اور مہینے گذر گئے لیکن راگنی کو مادھو کی بابت کچھ بھی معلوم نہ ہوا۔ ایک دِن چمپا جو اُس کی بہت عزیز سہیلی تھی اُس سے ملنے آئی۔ راگنی کو اُس سے یہ معلوم کرکے انتہائی قلق ہوا کہ اُس کے بھائی نے مادھو کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں جس پر سمجھ دار مادھو جھگڑے کو کم کرنے کے لئے گاؤں چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔

"لیکن مادھو گیا کہاں ہوگا" ——— "بیچارے کا کوئی تھا بھی تو نہیں جس کے یہاں چلا گیا ——— ایک ماں تھی وہ بھی پچھلے سال مرگئی تھی" ——— یہ خیال آتا تھا کہ راگنی دیر تک روتی رہی۔ چمپا نے بہت تسلی دی۔ لیکن وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اُس نے رات کو خواب میں دیکھا مادھو کہہ رہا تھا ——— " راگنی مجھے معاف کرنا میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف پہنچی ———" اُس نے دیکھا مادھو کے چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی تھی ——— آج وہ بہت پریشان نظر آرہی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ مادھو ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خواب میں پریشان نظر آرہا تھا۔ لیکن وہ اُس کی کیا مدد کرسکتی تھی؟ وہ مجبور تھی ———!!

مادھو کے گاؤں سے چلے جانے کے بعد آہستہ آہستہ راگنی

باہر آنے جانے لگی۔ اب کوئی پابندی نہیں تھی۔ لیکن اب باہر جانے کو اُس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ کسی سہیلی کے کہنے سے تھوڑی دیر کے لئے کبھی کے دن چلی جاتی۔ لیکن وہاں بھی اُسے کچھ خوشی نہ ہوتی تھی۔ اُس کی کچھ پریشان رہنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ اب اُسے ہنستے ہوئے بُرا معلوم ہوتا تھا۔ گانے اُسے بے وقت کی راگنی معلوم ہوتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ خوب روئے اتنا کہ اپنے ہوش بلکہ اپنی جان تک کھو دے۔ اب دُنیا اُس کے لئے تاریک کوٹھری سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اتنی مصیبتوں کے باوجود بھی وہ نہ معلوم کیوں زندہ تھی۔

راگنی نے کہیں پردیس میں جاتے ہوئے دیکھا...... مادھو آرہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا چاروں طرف سناٹا تھا۔ اُس کے قدم جیسے کسی نے زبردستی روک لئے وہ جلدی سے چلے جانے کی کوشش کے باوجود بھی نہ جا سکی۔

"مادھو...... تم؟"...... اُسکی زبان سے بیساختہ نکل گیا۔

"راگنی...... تم چلی جاؤ ورنہ کوئی ––– دیکھ لے گا" ––– مادھو کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

"تم کب آئے؟"...... راگنی نے پوچھا۔

"میں ابھی ابھی آیا ہوں۔...... راگنی...... سامان لے کر واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے شہر میں نوکری مل گئی ہے۔"

مادھو نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کئے جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا تھا۔

"نوکری...... شہر میں؟" اُسے وہ دن یاد آیا جبکہ مادھو پہلی مرتبہ شہر جا رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی چالاک شہری عورت نے مادھو کو اُس سے چھین لیا ہے۔

"میری محبت مجھے واپس کر دو...... مجھے بھول جاؤ راگنی۔"

وہ رو رہا تھا۔

اُس کا لہجہ اتنا موثر تھا کہ راگنی بھی روئے بغیر نہ رہ سکی۔ راگنی نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے اُس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ رو رہی تھی ––– مادھو اُس سے برابر کہہ رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو راگنی"...... مجھے بھول جاؤ" –––

راگنی سے نہ سُنا گیا۔ وہ چل دی۔ وہ سوچ رہی تھی "کیا محبت کا انجام یہی ہوتا ہے؟"

اگلے دن راگنی کے غائب ہو جانے کی خبر سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ رامو کو کئی گاؤں کے آدمیوں نے یہ بھی پتہ دیا کہ ایک دن پہلے اُنہوں نے راگنی اور مادھو کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسکے بعد کسی کو نہیں معلوم کہ مادھو کس وقت گاؤں سے واپس گیا اور راگنی کہاں گئی۔ یہ سُن کر رامو کو یقین ہو گیا کہ مادھو ہی راگنی کو بھگا کر لے گیا۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اُس سے ضرور انتقام لے گا۔

مادھو ابھی ابھی اپنے کام پر سے واپس آیا تھا کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ جوں ہی اُس نے دروازہ کھولا گاؤں کے کئی آدمی اور دو پولیس والے مکان میں داخل ہوئے۔ مادھو کچھ نہ سمجھا کہ کیا معاملہ ہے اُس کے سارے گھر کی تلاشی لینے کے بعد پولیس والوں نے اُسے مارنا شروع کر دیا۔ مادھو نے حیران ہو کر پوچھا "آخر میری خطا بھی تو بتاؤ۔"

"بتا راگنی کہاں ہے؟...... ذلیل...... کمینہ......"

رامو غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ مادھو اسے رامو کی کوئی چال سمجھ رہا تھا بولا "مجھے کچھ نہیں معلوم؟"......

جب مادھو سے کچھ نہ معلوم ہو سکا تو سپاہی اُسے گرفتار کر کے تھانے لے گئے اور وہاں پر بہت مارا لیکن اُسے معلوم ہو تو بتاتا۔

دو دن کے بعد راگنی کی لاش گاؤں کے قریب بہتے ہوئے دریا میں پائی گئی۔ رامو کے گھر رونا پیٹنا پڑا ہوا تھا۔ سب گاؤں والے حیران تھے کہ یہ کیا ہوا۔

رامو نے عدالت میں بیان دیا کہ راگنی نے مادھو کے ساتھ جانے سے انکار کیا اِس لئے مادھو نے اُسے دریا میں پھینک دیا ––– مادھو کو جب عدالت میں راگنی کی موت کی خبر ملی تو وہ پاگل سا ہو گیا۔ اب تک وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ شائد رامو اُسے پریشان کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ لیکن اب اُسے انتہا سے زیادہ صدمہ پہنچا۔ وہ اُسے برداشت کر نہ سکا۔ اُس نے اپنی زندگی بیکار سمجھتے ہوئے سرِ عدالت راگنی کے قتل کا اقرار کر لیا –––

کچھ دن بعد مادھو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا گیا –––

رامو جب گاؤں پہنچا تو گھر پر اسے ایک پرچہ ملا جس میں لکھا ہوا تھا "میں مادھو سے محبت کرتی تھی لیکن اُس سے شادی ناممکن تھی اِس لئے میں اپنی جان دینے پر مجبور ہوں" ––– رامو کے پیروں سے زمین

سپنو

(از جناب بہار کوٹی)

میں فطرتاً عزلت پسند واقع ہوا ہوں اور اُن اوقات کے علاوہ جن میں کسبِ معاش کی غرض سے شورشِ کائنات سے مفر ناممکن ہے بہت کم گھر سے نکلتا ہوں۔

مگر آج دن بھر کے لئے گوشۂ عزلت کو خیرباد کہنا ہی پڑا۔ ایک نیولے کی تلاش میں برسات کا موسم تھا اور ہمارے محلے میں کچھ تو اس وجہ سے کہ بیشتر مکانوں کے فرش کچے ہیں۔ اور کچھ اس لئے کہ یہ محلہ شہر سے دور اور جنگل سے ملحق ہے۔ سانپوں کی افراط ہے۔ اور سانپ بھی ایسے جن کے کاٹے کا علاج ہی نہیں۔ میں ویسے بھی اللہ کی اس مخلوق سے بیحد خائف ہوں ——— کہتے ہیں جس گھر میں نیولا ہوتا ہے اُس گھر میں تو درکنار وہاں سے بارہ پتھر باہر بھی سانپ نہیں پھٹکتا۔ اِسی لئے تو مجھے تلاش تھی نیولے کی۔

احسان نے بتایا تھا کہ رُکمنی گوالن نے نیولے برائے فروخت پال رکھے ہیں۔ رُکمنی کے مکان کا پتہ لگانا مشکل نہ تھا۔ منوہر تالاب کی گھاٹی سے اُترتے ہوئے موڑھے بنانے والے چماروں کی گواڑی کے پاس لوہے کی بڑی پھاٹک میں داخل ہونے پر داہنے ہاتھ پر سب سے پہلے اُسی کا مکان تھا۔

خدا جانے آج اُٹھتے ہی میں نے کس کا مُنہ دیکھا تھا کہ دن بھر پریشان رہا۔ گھر سے نکلتے ہی محلے کی مسجد کے مولوی صاحب سے حجت ہوگئی۔ محلے کے بعض لوگ اُن سے بعض مذہبی مسائل پر استصواب کر رہے تھے۔ اُن کے بے سرو پا استدلال سے تنگ آکر مجھے بولنا پڑا۔ اور مولوی سے مذہبی مسائل پر بے ریش و بروت کا اُلجھ پڑنا کوئی معمولی حادثہ نہیں مولوی صاحب سے اُلجھ کر میں نادم بھی تھا اور مسرور بھی۔ نادم اس لئے کہ میری گفتگو کی مقبولیت سے اُن کے زعمِ پندار کو ٹھیس لگی اور مسرور اس لئے کہ اُن کی علمیت کا بھانڈا چوراہے پر اس طرح پھوٹا کہ محلے کے وہ جہلا بھی جو مولوی صاحب کو دُنیا کا سب سے بڑا مجتہد سمجھے ہوئے تھے۔ میری بے دینی کے باوجود میری قابلیت کے معترف ہوگئے۔

مولوی صاحب سے پیچھا چھڑا کر نیا بمشکل دو قدم گیا ہوں گا کہ ایک نقاب برافگندہ محترمہ سے ٹکر ہوگئی۔ قصوروار میں ہی تھا۔ میں ویسے ہی کھویا کھویا سا رہتا ہوں۔ مولوی صاحب کی حجت نے "سمندِ حواس" پر تازیانے کا کام کیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں کہاں اور کس غرض سے جا رہا ہوں۔ اور نہ یہ کہ جس راہ پر چل رہا ہوں وہ ترکستان کو جاتی ہے یا کعبہ کو۔ محترمہ بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار تھیں۔ شاید اُنہوں نے نیا جوڑا بدلا ہوگا۔ اور اپنی کسی غریب سہیلی پر اپنی پھبن اور اپنے شوہر کی حاتمی اور محبت کا رعب گانٹھنے کے لئے جا رہی ہوں گی۔ اُن کا اندازِ گفتگو بتا رہا تھا کہ وہ اپنے اُس خاص عالم میں مجھ سا خاکسار تو کیا شاہِ ہفت اقلیم کو بھی خاطر میں نہ لائیں اُن کی صورت اگر توبہ شکن نہ تھی تو بُری بھی نہ تھی۔ اور جوانی تو بقول کسے گدھی کو بھی پری بنا دیتی ہے۔ وہ اِسی منزل سے گذر رہی تھیں۔ ایک سانس میں سینکڑوں صلواتیں سُنا ڈالیں۔ میں آنِ واحد میں بے حیا۔ آبرو باختہ۔ کمینہ۔ شریر۔ لچا۔ لفنگا۔ غنڈا۔ آوارہ۔ رذیل۔ اور خدا جانے کیا کیا بن گیا ——— وہ اور بھی خطابات عنایت فرماتیں اگر میں نے گڑگڑا کر معافی نہ مانگ لی ہوتی ——— اپنی معصومیت، خلوصِ نیت اور بے لوثی کا میں نے لاکھ یقین دلانا چاہا۔ مگر نہ صاحب میں نے اُنہیں جان بوجھ کر چھیڑا تھا اور اُن کے اُس مقدس دامن کے داغدار کرنے کی کوشش کی تھی جس کی فرشتے قسم کھا سکتے ہیں۔ اگر قرب و جوار کے بعض صلح جو انسانوں نے بیچ بچاؤ نہ کرا دیا ہوتا تو خدا جانے نوبت کہاں سے کہاں پہونچتی۔ بیچ بچاؤ کرنے والوں میں سے ایک صاحب نے گھٹی ہوئی آواز میں فرمایا۔ پردے کے یہ معنی تو نہیں کہ جسم پر سُرخ یا سیاہ جھول ڈال لینے کے بعد عورت ہر محرم و نامحرم سے بات بات پر اُلجھ پڑے۔ اِن صاحب سے غلطی سے ٹکر لگ جانے سے اُن کی عصمت کے کون سے موتی بکھر گئے۔ عورت نامحرم سے ناشائستہ گفتگو تو کرلے۔ اپنا روئے زیبا تو دکھا دے مگر پردہ جہاں کا تہاں رہے۔ کتنا سادہ لوح ہے یہ انسان میں نے دل میں کہا۔ ہندوستان میں رہ کر اور اس ترقی یافتہ دور میں بھی یہ عورت سے اُس پردے کا متقاضی ہے جس نے عورت کو صحیح نسوانیت کے زیور سے آراستہ کیا تھا۔ یہ ہندی نژاد مسلم خاتون سے اِس پُر آشوب دور میں بھی جبکہ وہ تقلید کے میدان میں اپنی ہمسایہ قوموں کی دیکھا دیکھی سرپٹ دوڑ رہی ہے۔ اسلامی پردے کا متوقع ہے۔

میں انھیں خیالات میں اُلجھ کر منوہر تالاب کی گھاٹی پر پہنچ گیا۔

مونڈھے بنانے والے چاروں کی گوڈی اور لوہے کی بڑی پھاٹک میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

مجھے پھاٹک کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر مونڈھے بنانے والوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ چند شریر لڑکے میری طرف دیکھتے ہوئے "سرونا کہاں بھول آئے مرے نند و تیا" گاتے ہوئے بھاگ گئے۔

پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد دلہنے ہاتھ پر پہلے مکان کی طرف میں بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے میرا خیر مقدم کیا۔ "آؤ بابو جی۔ اندر آ جاؤ۔"

"آپ ہی کا نام رکمنی ہے" میں نے پوچھا۔

"ہاں بابو جی" عورت نے کہا۔

"آپ نیولے بیچتی ہیں" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"نیولے! نیولوں کی کیا کمی بابو جی۔ آپ کے لئے جان حاضر ہے اندر تو آ جاؤ آپ" اُس نے میرے کندھے پر اپنے کھُردرے کالے کلوٹے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا —— ایک ٹوٹا سا مونڈھا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "بیٹھو حضور۔ پان منگواؤں بازار سے تمہارے لئے"

"شکریہ" میں نے کہا۔

"تو آج ہی رات کو چاہیئے" رکمنی نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"نہیں ابھی۔ اِسی وقت" میں نے ماحول کی گندگی اور مکان کی کثافت سے گھبرا کر کہا۔

اِسی اثنا میں غلیظ سے ننگے دھڑنگے لڑکے نے جو دو چار منٹ پہلے سامنے والی نالی کے قریب بیٹھے ہوئے پلوں سے کھیل رہا تھا میرے ہاتھ میں ایک سگرٹ اور پان لا کر رکھ دیا۔

ایک کنسٹبل ہمارے کمرے میں گھُستے گھُستے رُک گیا۔ اور جھجک کے باہر اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ رکمنی لپک کر اُس کے پاس گئی اور اُس کے کان میں خدا جانے کیا کہا کہ وہ اُلٹے پاؤں پھر گیا —— گھر میں ہر طرف کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ برتن بے ترتیبی سے ہر کہیں بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ جگہ جگہ مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ جھینگروں اور چھپکلیوں سے دیواریں اٹی ہوئی تھیں۔

"کہاں ہیں نیولے؟ کتنے پیسے ہوں گے ایک نیولے کے" [illegible] انداز میں پوچھا۔

"دو چار [illegible] ہوں گے [illegible] حضور —— [illegible] یا اپنے گھر پر بلوائیں گے۔ گھر پر آنے کے دو روپے زیادہ ہوں گے۔ آپ پسند [illegible] بعد میں آدھا [illegible] دینا۔ کھرا سودا کرتی ہوں بابو جی —— جو مال میں دیتی ہوں ایسا مال شہر بھر میں کہیں مل جائے تو میرا ذمہ۔ پچیس سال ہو گئے مجھے آپ جیسے بھاگوانوں کی جوتیاں سیدھی کرتے ہوئے۔ بھلا کوئی کہہ تو دے کہ رکمنی نے کسی کو دھوکہ دیا۔ دھوکا دینے سے یہ دھندا چل بھی نہیں سکتا سرکار۔ آپ لوگ [illegible] ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے —— یہاں آ ؤ ری" رکمنی نے آواز دیتے ہوئے کہا۔

چشم زدن میں تین لڑکیاں اپنے بہترین ملبوس میں سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ۱۶۔۱۷ سال سے متجاوز نہ ہوں گی اُن کی عمریں۔ مگر جوانی اُن سے روٹھ چکی تھی۔ جوانی کو روٹھتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے بڑا ہی نازک ہوتا ہے یہ شیشہ ذرا سی ٹھیس لگی اور چکنا چور۔ بعض اوقات تو دیکھ بھال ہی میں ٹوٹ جاتا ہے یہ۔

تینوں نے مجھ پر یکبارگی حملہ بول دیا۔ انگڑائیاں۔ جمائیاں۔ لگاوٹ۔ دُزدیدہ نگاہی۔ کون سا تیر تھا اُن کے ترکش میں جو مجھ پر صرف نہ کیا گیا ہو۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ رکمنی کے اشارے سے تینوں نے مجھے نرغے میں لے لیا۔

رکمنی نے کہا "آپ مجھے وقت بتا دیں۔ اور محلّہ کا پتہ بھی۔ خیر پتہ نہ بتایئے۔ سپاہی جانتا ہوگا۔

پیچھا چھڑانے کی غرض سے میں نے کہا "ابھی آج فرصت نہیں کبھی اور دیکھا جائے گا۔ مکان آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ مگر آدمی اچھا ہونا چاہیئے۔

"اچھا حضور —— ایسا آدمی لاؤں کہ آپ بھی یاد کریں" رکمنی نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

میں تیزی سے پھاٹک کے باہر نکل آیا۔

دوسرے دن دفتر میں تنہا بیٹھا ہوا میں ان واقعات کو دل سے محو کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پہرے کے سپاہی نے آ کر مودبانہ سلام کیا اور ہٹ کر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔

"کیا چاہیئے" میں نے [illegible] پوچھا۔

"کچھ نہیں حضور —— کل [illegible] شروع کیا" کل شام

گستاخی ہو گی جس کے لئے معافی چاہتا ہوں"۔
"کیسی گستاخی" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"مجھے رکمنی کے یہاں ایسے موقعہ پر نہ جانا چاہیئے تھا حضور" جوان نے کہا۔
رکمنی کے نام سے میں چونک پڑا۔ "کیا مطلب" میں نے پوچھا۔
"کل حضور جب رکمنی کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے میں بھی پہنچ گیا دارو غہ جی نے بھیجا تھا حضور۔ وہ خود وہاں نہیں جاتے۔ آپ بھی نہ جایا کیجئے حضور۔ بڑی بدنام جگہ ہے وہ ــــ جب ضرورت ہوا کرے ہم سے کہہ دیا کریں۔ ہم لا دیا کریں گے۔ تمام بڑے حاکموں کے یہاں ہمیں تو لایا کرتے ہیں۔ بڑے کام کی عورت ہے رکمنی حضور۔ جیسے چاہو بلوا لو اُس سے۔ ایسے ایسے آدمی لا کر دیتی ہے کہ دنگ رہ جائیں گے"۔
"پولیس کیوں اجازت دیتی ہے اِس قسم کے جرائم کی۔ کیوں نہیں گرفتار کیا جاتا اِس عورت کو" میں نے کہا۔
"حضور ایک رکمنی ہی کیا اِس شہر میں بیسیوں عورتیں یہی پیشہ کرتی ہیں۔ اور کسی سے چھپی ہوئی ہیں یہ۔ بڑے بڑے افسروں سے یہ کھاتی پیتی ہیں۔ ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ یہ پولیس والوں کو کھلاتی بھی تو ہیں۔ اپنے حلقے کے پولیس اسٹیشن انچارج کو روزانہ اپنی کمائی سے حصہ دیتی ہیں" جوان نے کہا۔
میں چپ ہو گیا
ایک روز رات کو میں کتاب بند کر کے سونے ہی والا تھا کہ میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ مسلسل دستکوں کے بعد میں نے کنڈی کھول دی۔ رکمنی اور ایک نقاب پراگندہ محترمہ لپک کر میرے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ میں حیران تھا کہ کیا کروں۔ پراگندہ محترمہ ابھی سانس بھی نہ لینے پائی تھیں کہ رکمنی نے اُن کا نقاب اُلٹ دیا۔ اور یہ دیکھنے کی زحمت گوارا کئے بغیر کہ محترمہ کا چہرہ کتنا لمبا ہو گیا ہو کہنا شروع کیا
"انعام دلواؤ سرکار۔ اب بیس روپے سے کم نہ ہوں گے۔ بڑی محنت کرنی پڑی ہے۔ حور کا بچہ لائی ہوں۔ آپ کیا یاد کرو گے۔
میں چاہتا تھا کہ بیس روپے دے کر رکمنی اور حور کے بچے دونوں کو رخصت کر دوں مگر رکمنی دس دس کے دو نوٹ لے کر ایسی ہوا ہوئی جیسے نیولے کو دیکھ کر سانپ۔ محترمہ کے جسم پر لرزہ طاری تھا اس خوف سے کہ اس دن کی صلواتوں کا بدلہ آج ہی کھول کر لیا جائیگا۔

یا شاید اِس خیال سے کہ اُن کے اُس دامن کو فرشتے جس کی قسم کھا سکتے ہیں داغدار ہونا پڑے گا۔ میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ محترمہ کی بے کسی پہ نہیں نہ بھارت ماتا کے اُس افلاس کے تصور سے جس نے ہندوستان کی کروڑوں بیٹیوں کو عصمت فروشی پر مجبور کر دیا ہے۔ بلکہ اس احساس سے کہ دیوتاؤں کی اس پوتر بھومی میں خدا جانے کتنی رکمنیاں پرورش پا رہی ہوں گی۔ اور خدا جانے کب تک اِن رکمنیوں کی نسل میں اضافہ ہوتا رہے۔
نیولا اب تک نہیں ملا۔ اور جب تک نیولا نہ ملے نہ اُن سانپوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے جن کی پھنکار کے سامنے کوئی چراغ نہیں ٹھہر سکتا اور نہ اُن سنپولوں کا جو رکمنی کے بھیس میں ہمارے محلوں میں رینگتے پھرتے ہیں۔

غزل

(جناب ذاکر کنجاہی بی۔ اے)

میں سفینہ ڈوبنے پہ شاداں ہوتا گیا
اور میرا ناخدا محوِ فغاں ہوتا گیا

یاد ہیں وہ کمسنی کی بھولی بھولی عادتیں
جانستاں ہوتا گیا جوں جوں جواں ہوتا گیا

میں بھٹک کر راہِ منزل کے قریب ہونے لگا
دور منزل سے کسی کا کارواں ہوتا گیا

نقشِ ہستی کے لئے گویا بقا ہے ہر فنا
اِس طرح سے کچھ مٹا کہ جاوداں ہوتا گیا

جسکا شکوہ تھا مجھے آخر وہ دردِ اضطراب
جس قدر بڑھتا گیا آرامِ جاں ہوتا گیا

ہندوستانی نوجوان

(از جناب ڈی۔ پی بھٹناگر صاحب کشتہ)

اے وطن کی آرزو۔ ہندوستاں کے نوجواں

اے علم بردارِ آزادی سپہ سالارِ قوم
جاں نثارِ ملک، توقیرِ وطن غم خوارِ قوم

وہ دل پُر درد پہلو میں ترے بیتاب ہے
روزِ اول سے جسے بخشا گیا آزارِ قوم

سوزِ غم سے مشتعل رگ رگ میں ہیں چنگاریاں
اے وطن کی آرزو۔ ہندوستاں کے نوجواں

اے پرستارِ وطن اے جاں نثارِ حریت
آشکارا تیرے دم سے ہے وقارِ حریت

خون ہے جوشِ حمیت سے ترا کھولا ہوا
ہے تری ہستی کا ہر ذرہ شرارِ حریت

قصرِ استبداد پر اُٹھ کر گرا دے بجلیاں
اے وطن کی آرزو۔ ہندوستاں کے نوجواں

تو نگہباں اور یوں تاراج ہو جائے چمن
تیرے ہوتے اس طرح بے کیف ہو بزمِ وطن

آہ! یوں افلاس و بیکاری سے ہو کر جاں بلب
سینکڑوں حسرت زدہ رہ جائیں بے گور و کفن

آسماں رہ جائے بن کر کچھ چتاؤں کا دھواں
اے وطن کی آرزو۔ ہندوستاں کے نوجواں

صفحۂ عالم سے یوں مٹ جائے نقشِ آرزو
رنگ یوں لاتا نہیں تیری امیدوں کا لہو

تیری مجبوری کا دُنیا بھر اُڑائے مضحکہ
گنگ ہو جائے مگر تیری زبانِ گفتگو

اُٹھ کے دامانِ جہالت کی اُڑا دے دھجیاں

اے وطن کی آرزو۔ ہندوستاں کے نوجواں

اک قیامت خیز طوفاں میں ہے دُنیا کا سکوں   کاش کروٹ لے ترا خوابیدگی دشمن جنوں

تیری اک جنبش سے ہل سکتی ہے بنیادِ الم   اک نظر میں ٹوٹ سکتا ہے غلامی کا فسوں

حشر ساماں اُٹھ، ہیں تیری منتظر آزادیاں

اے وطن کی آرزو۔ ہندوستاں کے نوجواں

جُھکنے والا ہے درِ تنویر پر ظلمت کا سر   تیرے غم خانہ میں ہونے کو ہے عشرت کی سحر

ہو رہا ہے ذرّہ ذرّہ میں نمایاں انقلاب   ہونے والے ہیں زمین و آسماں زیر و زبر

اب کوئی دم میں بدلنے کو ہے آئینِ جہاں

اے وطن کی آرزو۔ ہندوستاں کے نوجواں

اُٹھ کے گوشِ ہوش سے وقتِ رواں کا سُن پیام   لے اب اپنے ہاتھ میں اشبدیزِ دوراں کی زمام

رزم گاہِ حرّیت میں کود پر مردانہ وار   کہہ سکے کوئی نہ اب تجھ کو زمانے میں غلام

خضر کا دے کام اُٹھ کر تیری گردِ کارواں

اے وطن کی آرزو۔ ہندوستاں کے نوجواں

طرزِ نو سے پھر سجائی جائے گی بزمِ کہن   ہونگے اپنے ہی چمن کے پھول زیبِ انجمن

کفر و دیں کی جنگ میں کشتہ نہ اب ہوگا کوئی   ایک ہی منزل پہ جا پہونچینگے شیخ و برہمن

رشکِ گلزارِ جناں بن جائیگا ہندوستاں

اے وطن کی آرزو۔ ہندوستاں کے نوجواں

بازگشت

(ازجناب حسرت تسکین بی اے)

میں اِس رنگین وادی میں بہت دن بعد آیا ہوں

زمیں رشکِ ارم تھی اِس جگہ کی تیرے آنے سے — فضا یہ گونج اُٹھی تھی کبھی تیرے ترانے سے

تبسم سے ترے ہر چیز یاں کی مسکرا دی تھی — یہاں پہلے پہل تو لے مجھے دادِ وفا دی تھی

یہ چشمہ، یہ چٹانیں اور کچھ اشجار کے سائے — ابھی تک منتظر ہیں کاش پھر اِک بار تو آئے

مناظر کی حسیں آغوش میں مَیں آج تنہا ہوں

کبھی میری طرح تیرا بھی اِس وادی میں آنا ہو

جہاں بھولا ہوا ماضی تجھے بھی یاد آجائے — محبت کا فسانہ تو بھی میری طرح دوہرائے

ترے ہونٹوں پہ پھر گایا ہوا کوئی ترانا ہو

جُدا رہتے ہوئے ملنے کی پیہم آرزو کرنا — حسیں ہے تو حسیں لمحات کی پھر جستجو کرنا

یادِ ایّام

ازجناب مائلؔ انصاری خیرآبادی

خزاں میں، آہ جب برباد ہوتا ہے چمن سارا — جگر سوز اہل دل کو اسکا جب ہوتا ہے نظارا

بہارِ روح پرور کی ہوائیں جب نہیں آتیں — خیالِ باغ سے آزاد ہوتا ہے چمن آرا

شجر کی شاخ پر بیٹھا تھا سر ڈالے گریباں میں — گذشتہ صحبتوں کی یادگار اک مرغ بیچارا

نہ تھا دردآشنا اُسکا کوئی جو وجہ تسکیں ہو — فلک کی کشمکش سے اُف بھی کر سکتا نہ تھا یارا

غریب و ناتواں کی حالتِ ناگفتہ کیا کہیئے — شکستہ پر، کلیجہ شق، دلِ غمناک صد پارا

چمن کی حالتِ ماضی پہ آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا — فلک کو دیکھ کر حسرت سے یہ کہتا تھا بیچارا

بھڑک اُٹھتے ہیں شعلے خود بخود اب صحنِ گلشن میں

غضب کی بجلیاں پوشیدہ ہیں میرے نشیمن میں

شام

(از محترمہ ک۔ ف بیگم صاحبہ)

ہے پُر سکون منظر مخمور ہیں فضائیں　چلتی ہیں دھیمی دھیمی کیا کیف زا ہوائیں

ہر لمحہ چھا رہا ہے ہر چار سو اندھیرا　لینے لگے پرندے اشجار پر بسیرا

کیسا خاموش سا ہے دریا کا نیلا پانی　کم ہو گئی ہے اب تو دریا کی بھی روانی

خاموش سے کھڑے ہیں اشجار سر جھکائے　ہیں محو خواب گل بھی پتوں میں منہ چھپائے

ہلچل وہ اب کہاں ہے دن ہو گیا ہے رخصت　دیوی شب ہے آتی رکھتی قدم بہ عجلت

ہے راجہ چندرماں کی آکاش پر جو آمد　تاروں کی فوج پہلے سے ہو رہی ہے برآمد

سب کو یہ شب سکوں کا پیغام دے رہی ہے　چلتی ہوئی ہوا بھی انگڑائی لے رہی ہے

قانون ہے سدا سے قدرت کا ایک ہمدم　ہر شام کی سحر ہے ہر دن کی رات لازم

نغمات عیش میں بھی آثار ہیں فغاں کے　فصلِ بہار پنہاں پردے میں ہے خزاں کے

رہتا نہیں ہے بیگم یکساں کبھی زمانہ

گردوں کی گردشوں کا سارا ہی یہ زمانہ

غزل

(از جناب نخشب جارچوی)

بے رخی وجہ شکستِ دل کبھی ہوتی نہیں
چوٹ تو لگتی ہے چاہت میں کمی ہوتی نہیں

عشرتِ غم بھی ہمیشہ ایک سی ہوتی نہیں
میں تڑپتا ہوں تو اب انکو خوشی ہوتی نہیں

تم کروگے اور میرے حالِ دل پر تبصرہ
تم سے تو نظریں ملا کر بات بھی ہوتی نہیں

آپ سے تو بے چراغوں کے اجالا گھر میں تھا
اب چراغوں سے بھی گھر میں روشنی ہوتی نہیں

انکے وعدوں کا مجھے کیونکر نہ آئے اعتبار
وعدہ کرتے ہیں تو ہونٹوں پہ ہنسی ہوتی نہیں

یہ تغافل یہ تجاہل یہ ستم یہ کجروی
ایسی باتوں سے محبت میں کمی ہوتی نہیں

سجدہ کرتا ہوں کہ عالم دوسرا ہو جائے گا
سر اٹھاتا ہوں تو دنیا دوسری ہوتی نہیں

مجھکو اے نخشب محبت راس گر آ بھی گئی
ایسے انساں کی زیادہ زندگی ہوتی نہیں

(جناب میرزا مظفر شکوہ)

آکہ سامانِ فروغ انجمن تازہ کریں
بادہ پیمائی کا دستورِ کہن تازہ کریں

چھین لیں بڑھ کے پھر دستِ غیر سے مینا و جام
پھر شرابِ کہنہ سے کام و دہن تازہ کریں

پھر سرودِ ہائے و ہو سے بزم نائے و نوش میں
مسلک رندی کا دیرینہ چلن تازہ کریں

پھر کریں پیدا نئے منصور بطن خلق سے
قصۂ پارینۂ دار و رسن تازہ کریں

پھر ہلا دیں قصر استبداد کے دیوار و بام
داستانِ بازوئے خیبر فگن تازہ کریں

توڑ کر اک نعرۂ مستی سے افسونِ ایاز
غزنوی کے دل میں جوشِ بت شکن تازہ کریں

چوں زدودہ زنگ تیغ آبدارِ کہنہ
گر بخود آئی ہماں برق و شرارِ کہنہ

شمعِ پراَفشاں

(از بہار کوٹی)

باطل کے شکنجے میں ہے۔ ایماں کی خبر لے
آندھی میں تو اس شمع پر افشاں کی خبر لے

تکمیلِ طلب حُسنِ طلب سے ہے عبارت
دامن کے طلبگار گریباں کی خبر لے

ہونٹوں پہ مچلتے ہوئے نغموں پہ نہ اترا
آنکھوں سے اُمنڈتے ہوئے طوفاں کی خبر لے

لاکھوں ہی جہنّم ترے سینے میں نہاں ہیں
مستِ مئے عشرت غم پنہاں کی خبر لے

تعمیرِ نشیمن کا یہ موسم نہیں ناداں
آغوشِ خزاں میں ہے۔ گلستاں کی خبر لے

تسخیرِ دو عالم کی ہوا باندھنے والے
ادبار میں جکڑے ہوئے انساں کی خبر لے

تجھ سے مری آنکھوں کا تدارک نہیں ممکن
تو اپنے لرزتے ہوئے ایواں کی خبر لے

موجِ خیال

(از جناب ماہرؔ القادری)

آدمی واقفِ اسرار نہ ہونے پائے　　زندگی خواب سے بیدار نہ ہونے پائے

مجھ کو اُس عاشقِ وارفتہ سے کچھ کہنا ہے　　ابھی منصور سرِدار نہ ہونے پائے

چشمِ ساقی کی توجہ کا اثر ہے جبتک　　ایک میخوار بھی ہُشیار نہ ہونے پائے

کوئی فرصت کی گھڑی میرے لئے بھی اے دوست　　آج تو مجمعِ اغیار نہ ہونے پائے

بجلیاں ٹوٹ پڑیں دورِ خزاں آپہونچا　　آشیانے ابھی تیار نہ ہونے پائے

دیکھو شکوہ گزارِ شبِ فرقت ہشیار!　　تیری فریاد دل آزار نہ ہونے پائے

دل نے آغازِ محبت میں دُعا مانگی تھی　　جیت ہی جیت رہے ہار نہ ہونے پائے

دل پہ جو کچھ بھی گزر جائے مگر اے ماہرؔ

حال شرمندۂ اظہار نہ ہونے پائے

نیا زمانہ

(از جناب عطا محمد صاحب)

دیکھو دور، افق پہ شفق نے سُرخ پھریرا لہرایا

سُندر سُندر میٹھی میٹھی سُکھ کی چھاؤں یہ لائے گا — یہ سُندر بدرا بن کر سارے آکاش پہ چھائے گا

پھر مانس مانس کو اِسکی چھاؤں میں گیت سُنائے گا — اِس کی چھاؤں میں بیٹھ کے مانس سُکھ کی تان اُڑائیگا

دیکھو دور، اُفق پہ شفق نے سُرخ پھریرا لہرایا

یہ اُنگھور گھٹا برسے گی برسے گی کھُل جائے گی — دُکھ، انیائے روگ کی دُنیا چادر سی دُھل جائے گی

سرمائے کی دیوی اُسدم کڑھ کڑھ کر گھُل جائے گی — ہر اِک بھائی بند کی ہستی سونے میں تُل جائے گی

دیکھو دُور، افق پہ شفق نے سُرخ پھریرا لہرایا

دُکھ، چوری، درد، اور حسد کے بندھن گل کر سڑ جائینگے — ظُلم اور جبر کے کرتا دھرتا گھبرا کر چلّائیں گے

مال اور جان کے بھوکے بندے ڈھونڈے چین نہ پائینگے — سورگ کے باشی دیکھ کے دُنیا والوں کو للچائیں گے

دیکھو دور، افق پہ شفق نے سُرخ پھریرا لہرایا

دُشٹ سماج کے روگی بندھن اپنے سر کو چھُپائیں گے — چین اور امن، سکون، سندرتا ہم پر دھن برسائیں گے

چند نہیں پھر سارے بھائی مِلکر موج اُڑائیں گے — سارے بھائی مِل مِل کر یہ دھرتی پھر سے بسائیں گے

دیکھو دور، افق پہ شفق نے سُرخ پھریرا لہرایا

دُشٹ سماج کے ہر روگی دستور کو بدلا جائے گا — "نیا زمانہ" نوجیون کی نئی اُمنگیں لائے گا

نئے زمانے میں ظالم مظلوم کا سر نہیں کھائے گا — سب کی بھلائی کے جذبے سے ہر مانس مجھا جائیگا

دیکھو دور، افق پہ شفق نے سُرخ پھریرا لہرایا

اوٹ سے جنگ کی یہ کس نے اک پرچم سُرخ اُڑایا ہے — دم بھر میں جو ساری دُنیا اور آکاش پر چھایا ہے

"نیا زمانہ" نوجیون کی نئی اُمنگیں لایا ہے — سب کچھ دُنیا نے دیکھا۔ مزدور کا وقت اَب آیا ہے

دیکھو دور، افق پہ شفق نے سرخ پھریرا لہرایا

بادۂ حافظ کا ایک جام

(حضرت مولینا ابو محمد امام الدین صاحب حافظ رامنگری)

تابِ نظارہ لا سکے ایسی کوئی نظر نہیں
ورنہ وہ برقِ طور سوز طور پہ منحصر نہیں

نالۂ غم رسا نہیں آہ تپش اثر نہیں ——!
سینے میں سنگ و خشت ہیں قلب نہیں جگر نہیں

انجم و ماہ و برگ و گُل دیتے ہیں دعوتِ نظر
حُسن کا کیا گلہ اگر عشق ہی دیدہ ور نہیں

فرطِ تجلّیات سے عالم نیمروز ہے
جلوہ گہِ شہود میں شام نہیں سحر نہیں

ان کے کرم سے کم نہیں انکا ستم مرے لئے
کیسے کہوں کہ مہرباں وہ مرے حال پر نہیں

اپنی خودی پہ عشق کی آپ نگاہ چاہیئے
حُسن کی کیا خطا اگر عشق ہی دیدہ ور نہیں

میرے لئے حرام تھا کیف و سرور جامِ مَے
اک تری چشمِ مست تھی وہ بھی نشاط ور نہیں

جس میں جمالِ دوست کی جلوہ طرازیاں نہ ہوں
میری نگاہِ شوق میں شام ہے وہ سحر نہیں

میرا فسانۂ الم ختم نہ ہوگا تا سحر
ہے تو یہ مختصر مگر اتنا بھی مختصر نہیں

عشق کے ادعا کے ساتھ فکرِ مآل ہو اگر
وہ ہے ہوس وہ عشق کا جذبۂ معتبر نہیں

عشق کا راز دار ہو ایسا نہیں ہے دل کوئی
رمز شناسِ حُسن ہو ایسی کوئی نظر نہیں

جلوۂ جانفروز میں گذری ہے اپنی زندگی
کہتے ہیں تیرگی کسے اسکی مجھے خبر نہیں

حسن تہِ نقاب کیوں جلوہ پسِ حجاب کیوں
کیا کوئی اہلِ دل نہیں کیا کوئی دیدہ ور نہیں

میرے غمِ حیات کو اور بڑھا رہے ہیں وہ
مجھ سے ہیں بے خبر مگر ایسے بھی بے خبر نہیں

بختِ سیاہ میں مرے رات ہی رات ہے تمام
میرے نصیب میں کبھی شام نہیں سحر نہیں

منزلِ مہر و ماہ کو روند چکا ہوں بار بار
مجھ سے بچا ہوا کوئی جادہ و رہگذر نہیں

کون حریمِ حُسن میں تابِ نگاہ لا سکے
اہلِ نظر کو بھی یہاں حوصلۂ نظر نہیں

سوزِ سرور یہ روح ہے دردِ نشاطِ قلب ہے
حافظِ غم پسند کو حسرتِ چارہ گر نہیں

حسنِ پشیماں سے!

ازجناب ساغر جلیلی بی۔ اے

وہ شوق و آرزو کے دن، جوانی کی حسیں راتیں
جنونِ عشق محوِ لذتِ آلام رہتا تھا
کبھی فرصت نہ تھی آنکھوں کو جوئے خوں بہانے سے
تمہاری یاد ہی شغلِ دلِ ناکام رہتا تھا

میں سمجھا تھا، تم اپنے عارضِ رنگیں کی تابش سے
شبستانِ محبت کی فضا پُر نور کردو گے
بہارِ خلد میں کھوئی ہوئی آنکھوں کی گردش سے
نشاطِ سرمدی کے کیف میں مخمور کردو گے

مگر "خوابِ محبت" تشنۂ تعبیر ہی نکلا
وفائے حسن میں رنگِ فریبِ عشق پنہاں تھا
تمہاری نگہ نے کی کچھ نہ فکرِ بخیہ آرائی
جنوں کے ہاتھ سے جب ٹکڑے ٹکڑے میرا داماں تھا

چراغِ آرزو جب تم نے روشن کردیا دل میں
بجھادیں میں نے قصرِ زندگی کی مشعلیں ساری
مگر گُل کردیا اسکو تمہاری بے نیازی نے
مری دنیا پہ حسرت کی گھٹائیں ہوگئیں طاری

جوانی کی اُمنگیں سوگئی ہیں راہ میں تھک کر
نہیں اب کوئی ان کی مرگ پر آنسو بہانے کو
یہ دل تھا، آہ! اسے بھی رو چکا ہوں ایک مدت سے
نہیں اب سوزِ غم بھی حسرتوں کے آزمانے کو

بتاؤ! کس لئے اب چشمِ پُرنم لے کے آئے ہو؟
وفائے عشق کی تُربت پہ کیا آنسو بہانے کو؟
مگر ــــ اس راکھ میں باقی نہیں ہے اک بھی چنگاری
جو پھر آتے ہو شمعِ آرزو دل میں جلانے کو؟

نہ ہوگا فائدہ، میری وفائیں یاد کرنے سے!
خزاں دیدہ گلوں پر شبنم افشانی سے کیا حاصل؟
جنونِ عشق کی سب شورشیں یکسر فسانہ تھیں
بھلادو تم بھی ان کو، اب پشیمانی سے کیا حاصل؟

برقِ سوزاں

جناب اشعر ملیح آبادی

گھٹائیں بل کھا کے اُٹھ رہی ہیں اُفق کی جانب سے والہانہ
ترے کرم کے نثار ساقی! کوئی پیالہ، کوئی ترانہ

جنون و وحشت کا زور کم ہے، فغان و نالہ کا شور کم ہے
عطا ہو پھر اے نگار سیمیں نگاہ کا کوئی تازیانہ

چمک رہی ہے تڑپ رہی ہے اُفق کے ماتھے پہ برقِ سوزاں
مری یہ بے مائیگی تو دیکھو نہ شاخِ گل ہے نہ آشیانہ

صبا سے اُڑ اُڑ کے تیری زلفیں نگاہِ نورس پہ چھا رہی ہیں
دھڑک رہی ہے گھٹا کی چھاتی، لرز رہا ہے خار خانہ

یہ مسکراتی ہوئی سحر ہے کہ اِن کے رُخ پر ہنسی کی موجیں
یہ شام کی بے کسی ہے یارب کہ میرے غم کا کوئی بہانہ

نہ عشق و اُلفت، نہ ہوش و وحشت یہ سب فریبِ نظر ہیں ایلل
کسی کے جلووں کی سب کہانی، کسی کی نظروں کا سب فسانہ

نہ آرزو ہے نہ اب خلش ہے، نہ غم ہے تنہائیوں کا اشعر
خیال ان کا ہے اور میں ہوں، ہر اک ملاقات غائبانہ

ثـــ جذبات

(سحر طراز ثاقب کانپوری)

لیں سبق عبرت کا گر احساس اہلِ لیں سے
ہے مرقعِ زندگی کا شمع جو محفل میں ہے

کس قدر مغرورِ پروانہ تری محفل میں ہے
کیا خبر اسکو کہ کتنا سوز میرے دل میں ہے

۔۔۔ا عالم ہو گیا ہے خوگرِ حسنِ مجاز
بے حجاب آجا کہ یہ دنیا بڑی مشکل میں ہے

دیکھنے سے جسکے مٹ جاتا ہو احساسِ حیات
ایک ایسی بھی کششِ موجِ لبِ ساحل میں ہے

کر رہی ہے مرگِ حسرت اُس طرف آنکھوں کو بند
اِس طرف ذوقِ تماشا دیدہ بسمل میں ہے

کہہ چکا ہوں گرچہ اپنی داستانِ دردِ دل
حسرتِ عرضِ تمنّا پھر بھی میرے دل میں ہے

کر رہا ہے شرحِ دردِ دل زبانِ راز میں
آہ وہ آنسو جو اب تک دیدۂ بسمل میں ہے

کم نہ ہو ذوقِ طلب اے پائے ہمّت المدد
ایک لطفِ خاص حاصل سعیٔ لاحاصل میں ہے

انتہائے یاس میں بھی جوشِ مقصد ہے وہی
عزم کتنا ہمتِ گم کردۂ منزل میں ہے

داستانِ شوق بھی میری نگاہِ یاس میں
اک پشیمانی کا عالم جذبۂ قاتل میں ہے

اہتزازِ روح فرسا، اضطرابِ جانگسل
بُعد میں تھا جو وہی نزدیکیٔ ساحل میں ہے

اُٹھ کے ثاقب گو چلا آیا ہے اُسکی بزم سے
دل کی تسکیں کا مگر ساماں اُسی محفل میں ہے

(جناب بابو شیوم شاد سنہا صاحب ایڈوکیٹ الہ آباد متخلص بہ شادؔ)

بنا کے اپنی حقیقت کا رازدار مجھے ۔۔۔ کیا ہے قطرہ سے اک بحرِ بے کنار مجھے

کھلا کے داغِ محبت دلِ حزیں میں مرے ۔۔۔ جو بے نیازِ خزاں ہو وہ دی بہار مجھے

زہے نصیب کہ تکمیل بندگی کے لئے ۔۔۔ بنا دیا مرے خالق نے خاکسار مجھے

ازل سے لیکے دلِ بے قرار آیا ہوں ۔۔۔ کہاں نصیب نشیمن میں ہو قرار مجھے

خمارِ زیست میں کچھ میں نے التفات نہ کی ۔۔۔ جگانے آئی کلیٔ فطرت ہزار بار مجھے

ہر ایک منزلِ ہستی پہ کارواں کے عوض ۔۔۔ دکھائی دیتا ہے اُڑتا ہوا غبار مجھے

بجھا سکا نہ مری تشنگی سرابِ جہاں ۔۔۔ دکھائے سبزہ و آبِ رواں ہزار مجھے

نہیں ہیں سینۂ سوزاں میں میرے یہ انفاس ۔۔۔ ملے ہیں برق کی چشمک سے کچھ شرار مجھے

تمہارے عارضِ رنگیں کو جب سے دیکھا ہے ۔۔۔ بہار توبہ شکن بھی ہے ناگوار مجھے

ازل میں جب ہوئی تقسیم نعمتِ رحمت
میں شادؔ ہوں کہ ملی چشمِ اشکبار مجھے

کلام راحت

(مسٹر چندر بھان نگم راحت بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل۔ کانپور)

دنیا و دیں کی حد سے بڑھا جا رہا ہوں میں — وہ دور ہٹ رہے ہیں انہیں پا رہا ہوں میں

جھکتی ہے وہ نگاہ جھکا جا رہا ہوں میں — مجھکو سمجھ رہے ہیں وہ سمجھا رہا ہوں میں

ان کے فریبِ حسن پر اترا رہا ہوں میں — دھوکا سمجھ رہا ہوں مگر کھا رہا ہوں میں

جیسے کہ اُس سے دور کا بھی واسطہ نہیں — یوں رشتۂ حیات کو اُلجھا رہا ہوں میں

وہ دیکھتے بھی ہیں تو کنکھیوں سے بار بار — آنکھیں بچا بچا کے پئے جا رہا ہوں میں

گیسو گزیدہ ہوں کسی گیسو دراز کا — زلفوں کی طرح آج بھی لہرا رہا ہوں میں

آنکھوں میں اشک؟ اشک میں خونِ جگر لئے — کس کو بتاؤں آج کدھر جا رہا ہوں میں

دُنیا کے رنج و غم ہیں مرے ہمدم و انیس — موجوں کے پیچ و خم میں بہا جا رہا ہوں میں

منزل بھی پیچھے رہ گئی منزل بہ منزل آج — یوں سعیِ جستجو میں بڑھا جا رہا ہوں میں

راحت رہینِ رقصِ حیات و ممات ہے

مدہوشِ کیفِ حُسن ہوا جا رہا ہوں میں

(جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحر پی سی ایس)

نوٹ:- مقطع ملاحظہ ہو۔ یہ غزل حضور مہاراجہ صاحب شاد کے بلاوے پر پروگرام پورا کرنے کے لئے لکھی گئی تھی لیکن رخصت نہ منظور ہونے کی وجہ سے وہاں خود نہ جا سکا اور احسان دانش صاحب نے میری جگہ یہ غزل پڑھ کر سنائی ——— سحر

یہ لکھا اور ہو جاتا یہ قسمت اور ہو جاتی
اگر تم ملتفت ہوتے مشیت اور ہو جاتی

اگر چشم فسوں گر کی عنایت اور ہو جاتی
دو روزہ زندگی میں غم سے فرصت اور ہو جاتی

امنڈ آتا جو آنکھوں میں کہیں عہد جوانی میں
تو پھر حرمت تری اشک ندامت اور ہو جاتی

شکایت بیوفائی کی سہی تم سے ہمیں لیکن
جو تم ترک جفا کرتے شکایت اور ہو جاتی

تمہارا دل بڑا نایاب ہے یوں بھی خدا رکھے
مگر ٹوٹا ہوا ہوتا تو قیمت اور ہو جاتی

اسی میں خیریت گذری کہ تم تھے مہرباں ورنہ
ستم تم اور اگر کرتے محبت اور ہو جاتی

ارے جنت کے طالب پی جو لیتا دست ساقی سے
فسانہ اور جاتا حقیقت اور ہو جاتی

حسیں ہو اس لئے ظلم و ستم سب ہیں روا لیکن
خدا دیتا نہ گر صورت طبیعت اور ہو جاتی

سحر ہم خود سناتے شاد کو جا کر غزل اپنی
مگر یہ شرط تھی منظور رخصت اور ہو جاتی

کلامِ وحشی

(جناب کرشن سہائے چکداری ایڈووکیٹ کانپور متخلص بہ وحشی کانپوری)

ساقی کی نظر ملتفتِ عام نہیں ہے
لبریزِ مئے شوق سے ہر جام نہیں ہے

یہ دردِ محبت بھی عجب درد ہے جس کا
آغاز ہی آغاز ہے انجام نہیں ہے

یہ راز مجھے خستگیِ دل نے بتایا
ناکامِ محبت کبھی ناکام نہیں ہے

کیا غرش کی کہیئے نہ رکیں عرش پہ بھی جو
اُن نظروں کا مرکز یہ لبِ بام نہیں ہے

ہر گام پہ کانٹوں سے رہِ عشق میں اُلجھوں
اتنا مرا سودائے جنوں خام نہیں ہے

خود لغزشِ مستانہ مری راہنما ہے
اب نقشِ کفِ پا سے بھی کچھ کام نہیں ہے

جس جلوے سے معمور ہیں وحشی کی نگاہیں
وہ جلوہ ترا اتنا ابھی عام نہیں ہے

(۲)

صبح کو راز کھُلا رات کے افسانے کا
شمع خود بھیس تھی بدلے ہوئے پروانے کا

حال بے راہروی پوچھ نہ دیوانے کا
کعبہ منزل ہو اگر رُخ کرے بتخانے کا

اک ورق لے کے مرے عشق کے افسانے کا
کس نے کس نے نہ تہیّہ کیا دُھرانے کا

ابھی اُلٹا تھا ورق عشق کے افسانے کا
کچھ پتہ پھر نہ ملا آپ کے دیوانے کا

وہ مئے ہوشربا دے مجھے پیکر ساقی
کوئی امکاں نہ رہے ہوش میں پھر آنے کا

بیخودی وجہِ سکونِ دلِ ناشاد تو تھی
درد اب کس سے کہوں ہوش میں آجانے کا

نگہِ لطف تری خود جو نہ ہوتی غماز
حشر تک راز نہ کھُلتا ترے دیوانے کا

یاد آتا ہے مجھے دیکھ کے صورت دل کی
ایسا ہی جام تھا ساقی ترے میخانے کا

جب سے ساقی نے دیا دردِ تہِ جام مجھے
میں نہ کعبے کا رہا اور نہ بُت خانے کا

جانے تمہیدِ جنوں ہے کہ یہ تمہیدِ بہار
چاک ہے اب تو جگر تک ترے دیوانے کا

انجمن میں بھی رہا کرتی ہے خلوت اِس کو
ترا وحشی نہیں قائل کسی دیوانے کا

کلامِ ناظر

(جناب حکیم ناظر دھنوی)

وہ بارِ بے گناہ کا شرمار ہا ہوں میں
دُنیا سے منہ چھپائے ہوئے جا رہا ہوں میں

کیا کیا نہ کچھ فریب ترے کھا رہا ہوں میں
اُس پر بھی اعتبار کئے جا رہا ہوں میں

پیکاں ترا ہو یا ترے پیکاں کی ہے خلش
پہلو میں کچھ تو دل کی جگہ پا رہا ہوں میں

تو نے وفا کے نام کو بدنام کر دیا
پھر بھی وفا کا پاس کئے جا رہا ہوں میں

ہونا تھا جو مآلِ محبت وہ ہو چکا
کیا دیکھتا ہے تو مجھے اب کیا رہا ہوں میں

ارمانِ دل بدل گئے صورت میں یاس کی
پھر بھی فریبِ دل کو دئے جا رہا ہوں میں

جب سے ترا خیال ہے دل میں ترے مکیں
دُنیا کے ہر خیال کو ٹھکرا رہا ہوں میں

ہستی کی داستاں کے بھولے ہوئے ورق
یاد آ گئے ہیں کچھ اُنہیں دُہرا رہا ہوں میں

ساحل کی جیسے فکر ہی دل کو نہیں مرے
موجوں سے کھیلتا ہوا یوں جا رہا ہوں میں

ناظر خوشی کا اور نہیں ہے کوئی سبب
وہ مسکرا دئے ہیں تو اِترا رہا ہوں میں

ٹیگور

(از جناب نسیم سیفی صاحب بی۔اے)

واقفِ آئینِ فطرت۔ رازدارِ زندگی　　باعثِ فخرِ وطن رشکِ بہارِ زندگی
تھا عروجِ سوز پہ تیرا شرارِ زندگی　　زندگی تیری تھی خود اک اعتبارِ زندگی

تھا ترا وابستگی سے زندگانی کو قرار
زندگی ورنہ بذاتِ خود تو ہے ناپائیدار

امتیازِ این و آں کا مخمصہ ظاہر تھا مآل　　فخرِ قومیت تری نظروں میں تھا ننگِ خیال
تھا ترے جذبِ اخوت کو میسر وہ کمال　　ہو نہیں سکتا کبھی جو واقفِ قعرِ زوال

تیرے دل کا مدعائے جستجو تھا اتحاد
تیری دنیائے حسیں کا رنگ و بو تھا اتحاد

تجھ سے قائم تھا جہاں میں آدمیت کا وقار　　تیرے ہر لحظے پہ نازاں تھی حیاتِ مستعار
پرتوِ حسنِ ازل تھا تیرے دل سے ہمکنار　　رازِ ہست و بود تھا تیری نگہ میں آشکار

تیری تخئیلِ رسا کو ہر بلندی پست تھی
تیرے نغموں سے زمانے کی ہر اک شے مست تھی

تیری ہر ہر بات میں تھا ایک اندازِ کہن　　ہر نفس تھا اک علمبردارِ تہذیبِ وطن
ماند پڑ جائے جہاں پر خوبیِ رنگِ چمن　　اس مقامِ ارفع و اعلیٰ پہ ہے تیرا سخن

تھی تری چشمِ بصیرت جلوہ گاہِ حسنِ تام
طور کو بھی تھا ترے ذوقِ نظر کا احترام

حاملِ رعنائیِ کونین ہے تیرا کلام　　ہے تری طرزِ نگارش کو میسر اک دوام
تیرا ہر ہر لفظ ہے بیداریِ دل کا پیام　　تیرے نغموں سے عیاں ہے زندگانی کا خرام

تیرے افسوں نے کیا ہے بے ثباتی کو ثبات
مٹ نہیں سکتا زمانے سے ترا نقشِ حیات

آہ و ب

(از جناب فاروق محشر بدایونی)

جب بنایا ہی تھا مجھ کو ڈوب جانے کیلئے
ایک ساحل بھی بنا دیتے دکھانے کے لئے

رات بھر فطرت کے جلوے مسکرانے کے لئے
اک ہمیں دیوانہ وار آنسو بہانے کے لئے

پھونک ڈالا طور کو ناحق بیک برقِ جمال
لن ترانی کم نہ تھی بجلی گرانے کے لئے

ایک وہ عشوہ طراز بزم ہائے رنگ رنگ
ایک ہم تنہائیوں کے ناز اٹھانے کے لئے

سانولی شب پھر یہ البیلی فضا کا فر گھٹا
توبہ پھر بھی جا رہی ہے ٹوٹ جانے کے لئے

آشیانہ جل چکا پھر چن رہا ہوں شاخ نو
لیکن اب کاشانۂ ہستی جلانے کے لئے

وہ کرم سے یا ستم سے ہاتھ اٹھاتے ہیں تو کیا
یہ کرم بھی ہے وفا کا دل بڑھانے کے لئے

غنچے دیوانے ہیں کھل جاتے ہیں بے تائیدِ دوست
چاک دامانی پہ اپنی مسکرانے کے لئے

آخری سانسوں سے سُن لو قصہ یادِ وفا
کچھ تمہارے واسطے ہے کچھ زمانے کے لئے

یوں وہ اکثر مجھ سے ملتے ہیں کہ جیسے اجنبی
یہ بھی شاید عشق کو محکم بنانے کے لئے

اب تو اے محشرؔ ہمارا گھر جہاں آباد ہے
آتی ہے یادِ وطن اکثر رلانے کے لئے

غزل
از جناب آرزو لکھنوی

غزل

(جناب شاعر لکھنوی)

خرد تو گمراہ ہو چکی ہے جنوں کو اب رہنما کریں گے
جہاں پہ ہے انتہائے منزل وہاں سے ہم ابتدا کریں گے

محبت اک سوز مشترک ہے ہم اس کی تشریح کیا کریں گے
نگاہ و دل کا معاملہ ہے نگاہ و دل فیصلہ کریں گے

چلے تو ہیں بزم ناز میں ہم ہزار ضبط وفا کریں گے
مگر یہ بے اختیار آنکھیں برس پڑیں گی تو کیا کریں گے

ہو لاکھ ترتیب قصۂ دل مگر جب آئے گی اُن کی محفل
زباں پہ مغرور ہونے والے نگاہ سے التجا کریں گے

تعین آستاں سے بچ کر۔ بدل کے آدابِ رسم کہنہ
جہاں خیال آئے گا کسی کا۔ وہیں پہ سجدے ادا کریں گے

ہے دل تو مرکز ترے کرم کا۔ اسے مٹاتا ہے کیوں زمانہ
جو دل نہ ہوگا تو غم نہ ہوگا۔ جو غم نہ ہوگا تو کیا کریں گے

قریب آتا ہے وہ زمانہ۔ ہنسے گا بجلی پہ آشیانہ
جہاں کا ہر ذرہ برق ہوگا وہاں نشیمن بنا کریں گے

ہے اک طرف جام کی تمنا تو ایک جانب خیالِ توبہ
ذرا گھٹاؤں کا رنگ دیکھیں تو پھر کوئی فیصلہ کریں گے

تجلیوں کو بلند کر کے بنائیں گے ہم نگاہ اپنی؛
خرد کے نقش و نگار دے کر جنوں کو آراستہ کریں گے

ہو بہانے کے بعد ہوتی ہے حاصل اک عمرِ جی فسانہ
خزاں کے جھونکوں سے ڈرنے والے چمن کی تعمیر کیا کریں گے

مٹائی جائے ہزار۔ شاعر مگر حقیقت رہے گی روشن
چراغ کاشانۂ محبت بجھیں گے پھر بھی جلا کریں گے

مانگ کی افشاں

(جناب اشعر ملیح آبادی)

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں
امبر پہ جھلک مارتے ہوں جیسے ستارے
یا سینۂ ظلمت سے بھڑکتے ہوں شرارے
یا رات کے دریا میں رواں نور کے دھارے
اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

جیسے رخِ سنبل کو گہر چوم رہے ہوں
یا سبزۂ گلہائے سمن جھوم رہے ہوں
یا جگنوؤں کے جلتے دیے گھوم رہے ہوں
اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

جس طرح گھٹاؤں میں ہو بجلی سی چمکتی
جس طرح کھلے آنکھ سی دوشیزۂ کرن کی
لرزیدہ سرِ عرش بریں کاہکشاں سی
اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

جس طرح کہ پگھلا ہوا بہتا ہوا پارا
یا کفر کے بادل میں ہو ایماں کا ستارا
یا نہرِ لبن کا یہ جھلکتا ہے کنارا
اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

جس طرح چمک جاتی ہوں تاروں کی شعاعیں
جس طرح جھلک جاتی ہوں راتوں کی فضائیں
لو دیتی ہوں جس طرح جوانی کی ادائیں
اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

لہ آسمان   کہ جوئے شیر

شکستِ فتح

(از جناب حامد حمید...)

مجھکو معلوم تھا جب پی کے بہک جاؤں گا
مست نظروں سے مجھے جام پلایا کیوں تھا
چاندنی رات میں اظہارِ محبت کر
دامِ امید میں اس دل کو پھنسایا کیو
ایک دن گر یوں ہی برباد مجھے کرنا تھا
میری اجڑی ہوئی دنیا کو بسایا کیوں تھا
میں نے کچھ اور سمجھ کر تری زلفو
دام ہر رنگ زمیں تو نے بچھایا کیو

~~~~~~~~

مجھ سے کچھ مانگے آئی ہے محبت تیری
مجھ سے کچھ اور بھی جاتی ہو الفت تیری
کیا تجھے یاد ہیں بے باک جفائیں
یعنی وہ جابر و [illegible]
تیری آنکھوں میں دیا جس طرح سے آنسو [illegible]
میں بھی تاروں کو یونہی دیکھ کے روتا تھا کبھی
اور امڈے ہوئے جذبات کی رو میں
اشکِ حسرت سے میں اک ہار پروتا تھا
چشمِ مخمور تری مائلِ حیرانی ہے
کس لیے آتی تجھے آج پریشانی ہے
~~~~~~~~

دیکھ لیا

(از محترمہ آر۔کے۔ درخشاں [illegible])

ہزار بار تجھے آزما کے دیکھ لیا
فسانۂ دلِ مضطر سنا کے دیکھ لیا

نظر نہ آئی کہیں اُن کی جلوہ گاہ مجھے
فضائے وادیٔ ایمن میں جا کے دیکھ لیا

[illegible] تا حدِ منزل کوئی نشاں تیرا
رہ طلب میں قدم بھی بڑھا کے دیکھ لیا

نگاہ شوق کو جسکی تلاش تھی اُسے آج
حریم ناز کے پردے اُٹھا کے دیکھ لیا

سکون دلکو کہاں اور اضطراب بڑھا
تمہاری یاد میں آنسو بہا کے دیکھ لیا

[illegible] اور رنگ فضا ہے یہ دفعتہً کس نے
نقاب عارض تاباں اُٹھا کے دیکھ لیا

جنونِ عشق کا دامن بھی چاک ہو نہ سکا
تجھے نسیم چمن آزما کے دیکھ لیا

[illegible] لطف درخشاں کو سجدہ کرنے میں
جبین شوق کو ہر سو جھکا کے دیکھ لیا

قطعہ

(از جناب آصف علی صاحب بیرسٹرایٹ لا ممبر سنٹرل اسمبلی)

خودی کی خود نمائی کی بھی حد ہے
یہ ہستی ہے؟ خدا کی بیخودی ہے

ہوس ہونے کی اور اس پر نہ ہونا
شہود اور غیب کی کم مائگی ہے

بنانا بھی نہ تم کو راس آیا
جو صورت بھی بنائی میٹ گئی ہے

تمہاری قدرتوں سے مجھکو حاصل؟
نہیں کچھ بھی جو قسمت بن گئی ہے

چمن میں اور سکونِ قلب؟ توبہ
کلی اور پھول کیا، سب بیکلی ہے

نہ مرتے ہیں، نہ جیتے ہیں، نہ خوش ہیں
خدا کا قہر ہے یا زندگی ہے؟

میں اس کا آئینہ ہوں یا وہ میرا
سکون کس کو ہے؟ کسکو بیخودی ہے؟

میں منزل ہوں، مسافر ہوں کہ رہرو ہوں؟
ہے کچھ بس میں مرے یا بےبسی ہے؟

اشارہ بھی ہے، اور پھر کچھ نہیں ہے
ستم ہے، جور ہے، یا دل لگی ہے؟

مانگ کی افشاں

(جناب اشعر ملیح آبادی)

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں
انبر پہ جھلک مارتے ہوں جیسے ستارے
یا سینۂ ظلمت سے بھڑکتے ہوں شرارے
یا رات کے دریا میں رواں نور کے دھارے

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں
جیسے رخِ سنبل کو گہر چوم رہے ہوں
یا سبزۂ گلہائے سمن جھوم رہے ہوں
یا جگنوؤں کے جلتے دیے گھوم رہے ہوں

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں
جس طرح گھٹاؤں میں ہو بجلی سی چمکتی
جس طرح کھلے آنکھ سی دوشیزہ ملکن کی
لرزیدہ و سرجوش بریں کاہ کشاں سی

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں
جس طرح کہ پگھلا ہوا بہتا ہوا پارا
یا کفر کے بادل میں ہو ایماں کا ستارا
یا نہرِ لبن کا یہ جھلکتا ہے کنارا

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں
جس طرح چمک جاتی ہوں تاروں کی شعاعیں
جس طرح جھلک جاتی ہوں راتوں کی فضائیں
تو دیتی ہوں جس طرح [illegible] کی ادائیں

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

شکستِ فتح

(از جناب حامد [illegible])

مجھکو معلوم تھا جب پی کے بہک جاؤں گا
مست نظروں سے مجھے جام پلایا کیوں تھا

چاندنی رات میں اظہارِ محبت کر کے
دامِ امید میں اس دل کو پھنسایا کیوں تھا

ایک دن گر یوں ہی برباد مجھے کرنا تھا
میری اجڑی ہوئی دنیا کو بسایا کیوں تھا

میں نے کچھ اور سمجھ کر تری زلفوں کو چھوا
دامِ ہر رنگ زمیں تو نے بچھایا کیوں تھا

مجھ سے کچھ مانگنے آئی ہے محبت تیری
مجھ سے کچھ اور بھی جاتی ہو الفت تیری

کیا تجھے یاد ہیں بے باک جفائیں اپنی
یعنی وہ جابر و معصوم [illegible] اپنی

تیری آنکھوں میں [illegible] جس طرح سے آنسو [illegible]
میں بھی تاروں کو یونہی دیکھ کے روتا تھا کبھی

اور اڑتے ہوئے جذبات کی رو میں بہکر
اشکِ حسرت سے میں اک ہار پروتا تھا کبھی

چشمِ مخمور تری مائلِ حیرانی ہے
کس لیے آئی تجھے آج پشیمانی ہے

دیکھ لیا

(از محترمہ آر۔ کے۔ درخشاں [illegible])

ہزار بار تجھے آزما کے دیکھ لیا
فسانۂ دلِ مضطر سنا کے دیکھ لیا

نظر نہ آئی کہیں اُن کی جلوہ گاہ مجھے
فضائے وادیٔ [illegible] میں جا کے دیکھ لیا

ملا نہ تا حدِ منزل کوئی نشان تیرا
رہِ طلب میں [illegible] بڑھا کے دیکھ لیا

نگاہِ شوق کو جس کی تلاش تھی اُس نے آج
حریمِ ناز کے پردے اُٹھا کے دیکھ لیا

سکونِ دل کو کہاں اور اضطراب بڑھا
تمہاری یاد میں آنسو بہا کے دیکھ لیا

کچھ اور رنگ خضا ہے یہ دخترِ گلشن نے
نقابِ عارضِ تاباں اُٹھا کے دیکھ لیا

جنونِ عشق کا دامن بھی چاک ہو نہ سکا
تجھے نسیمِ چمن آزما کے دیکھ لیا

ملا نہ لطف درخشاںؔ کو سجدہ کرنے میں
جبینِ شوق کو ہر سو جھکا کے دیکھ لیا

قطعہ

(از جناب آصف علی صاحب بیرسٹرایٹ لا ممبر سنٹرل اسمبلی)

خودی کی خود نمائی کی بھی حد ہے
یہ ہستی ہے ؟ خدا کی بیخودی ہے

ہوس ہونے کی اور اس پر نہ ہونا
شہود اور غیب کی کم مائگی ہے

بنانا بھی نہ تم کو راس آیا
جو صورت بھی بنائی مٹ گئی ہے

تمہاری قدرتوں سے مجھکو حاصل ؟
نہیں مٹتی جو قسمت بن گئی ہے

چمن میں اور سکونِ قلب ؟ توبہ
کلی اور پھول کیا، سب بیکلی ہے

نہ مرتے ہیں، نہ جیتے ہیں، نہ خوش ہیں
خدا کا قہر ہے یا زندگی ہے ؟

میں اس کا آئینہ ہوں یا وہ میرا
سکوں کس کو ہے ؟ کسکو بیخودی ہے ؟

میں منزل ہوں، مسافر ہوں کہ رہ ہوں ؟
ہے کچھ بس میں مرے یا بےبسی ہے ؟

اشارہ بھی ہے، اور پھر کچھ نہیں ہے
ستم ہے، جور ہے، یا دل لگی ہے ؟

شالیمار
دہلی کے آخری ہندو تاجدار کی داستانِ عشق
پرتھوی راج سنجوگتا
شالیمار کا لازوال تاریخی شاہکار
ستار نینا
پرتھوی راج
میجسٹک دہلی میں
۲۶ اپریل سے
شروع

آزمائش شرط ہے
یہ نیا مرہم تمام جلدی امراض اور زخموں کا
تیر بہدف اور عجیب و غریب علاج ہے۔
ہمدرد مرہم ایک صدی پرانے نسخے سے تیار
کیا گیا ہے جسے مغلیہ دور کے اطبا نے ایجاد کیا
تھا۔ ہمدرد جس پھرتی سے درد کو، جلن،
سوزش اور ورم کو کم کرتا ہے اسے دیکھ کر
آپ دنگ رہ جائیں گے۔ کسی بھی جلدی
تکلیف یا زخم پر لگاتے ہی اس کے جراثیم
کش اجزا جراثیم کو فوراً ہلاک کر دیتے
ہیں۔ یہ زخم کو پکنے اور خون کو زہرآلود ہونے
سے بھی بچاتا ہے۔
آپ کو ہمدرد مرہم ضرور آزمانا چاہئے۔
وقت بے وقت کے لئے ایک ڈبیہ اپنے مکان، دفتر
یا کارخانے میں ضرور رکھئے۔ ایک صدی سے زیادہ
عرصے سے جڑی بوٹی سے تیار شدہ یہ مرہم کروڑوں
انسانوں کی تکلیف کو رفع کر چکا ہے۔ اب یہ ہندوستانی حکیموں
کا خفیہ نسخہ آپ کو تکالیف سے نجات دلانے کیلئے مرہم
کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔
ہمدرد کٹنے کے زخم۔ جلنے کے زخم۔ ناسور۔
خارش۔ کھجلی اور درد وغیرہ کے لئے اکسیر ہے۔
ایک ڈبیہ ابھی لیجئے کب آپ کو اس کی ضرورت پڑ جائے۔ جب کوئی چوٹ
لگ جاتی ہے تو اس کا فوراً علاج نہ کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ دو ڈبیاں
خریدیے ایک گھر کے لئے اور دوسری دفتر یا کارخانے کے لئے۔
HAMDARD
ہمدرد مرہم

ایک ماں اور بیوی کا روح کو وجد میں لانیوالا

ڈرامہ

جس کو سوسائٹی نے ماں اور بیوی تسلیم کرنیسے انکار کردیا

ایسٹرن پکچرز کی گھریلو زندگی کے متعلق لاجواب فلم

زینت

ڈائرکٹر

شوکت حسین

ادا کار

نورجہاں۔ شاہنواز۔ ڈکشت۔ یعقوب۔ مجید۔ جلّو۔ ببّو۔ کرن دیوان (جونیر)
شانتارن۔ ہمالیہ والا وغیرہ

ہر جگہ ریکارڈ بزنس کررہا ہے

لاہور:۔ نشاط سینما۔ ۱۳ واں ہفتہ۔ ملتان:۔ راجہ سینما۔ ۱۰ واں ہفتہ۔ جالندھر:۔ ہری رائل سینما۔ ۱۰ واں ہفتہ

جگت سینما دہلی میں ۷ واں ہفتہ

امرتسر
ریالٹو سینما۔ ۹ واں ہفتہ

جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز دہلی۔ لاہور

الہ آباد
پریم سینما۔ چوتھا ہفتہ

اب جنگ ختم ہو چکی ہے!

جنگ کے زمانے میں ہر چیز کے دام چڑھے ہوئے تھے اب رفتہ رفتہ چیزوں کے دام کم ہوں گے۔ اِس وجہ سے جواہرات، زمین، عمارات اور دوسری خام یا صنعتی اشیاء خرید کر اپنا روپیہ خطرے میں نہ ڈالئے۔ کیونکہ لازمی طور پر گھٹیں گی۔ مندرجہ ذیل مدوں میں روپیہ لگانا فائدہ مند بھی ہے اور محفوظ بھی رہے گا۔

★ بیمہ پالیسی

★ امداد باہمی کی انجمنیں

★ بنک کا سیونگ کھاتہ

★ ڈاک خانہ سیونگ کھاتہ

★ سرکاری قرضے

★ نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ

روپیہ بچائیے

اور

ہوشیاری سے خرچ کیجیے

فیلڈ پبلسٹی بیورو نے جاری کیا

سیٹھ جی ۔ ڈی ۔ برلا کا پیغام

جنگ ختم ہو چکی ہو ۔ جنگ کی گرانی کی وجہ سے ہر چیز کے دام چڑھے ہوئے تھے ۔ اب امن کا زمانہ آگیا ہے وہ کارخانے جو جنگ کے دوران میں فوج کی امداد کیلیے سامان تیار کیا کرتے تھے اب عوام کی ضروریات کیلیے سامان تیار کریںگے ۔ لازمی طور پر چڑھی ہوئی چیزیں گریںگی ۔ یہ وقت روپیہ بیکار ضائع کرنیکا نہیں ہو ۔ بلکہ جمع کرنیکا ہو ۔ گھر پیرو روپیہ رکھنے سے چوری کا اندیشہ ہے ۔ سونا چاندی یا جائداد خرید لینے سے قیمتیں گرنے سے آدھی سے کم رقم رہ جائیگی ۔ روپیہ محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ ۔ مندرجہ ذیل مدوں میں روپیہ لگائیے ۔

- ★ بیمہ پالیسی
- ★ امداد باہمی کی انجمنیں
- ★ بنک کا سیونگ کھاتہ
- ★ ڈاکخانہ سیونگ کھاتہ
- ★ سرکاری قرضے ۔
- ★ نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ
- ★ وکٹری بانڈز

روپیہ بچائیے

اور

ہوشیاری سے خرچ کیجیے

فیلڈ پبلسٹی بیورو دہلی نے شائع کیا

ہمارا سنسار
سوشل تصاویر کی دنیا میں
انقلابی پیشکش
ہر گھر کی کہانی
جسے
پرکاش نے ہر گھر کے
لئے تیار کیا ہے
رٹز سینما میں جمعہ ۱۹ اپریل سے غیر معمولی کامیابی
حاصل کر رہا ہے
ستارے:-
رنجنا۔ جیون۔ اوما کانت۔ سوشیل کمار۔ جلو۔ راجکماری شکلا وغیرہ
شوری پکچرز کی لاجواب پیشکش
شالیمار
ڈائرکٹر روپ کشوری
اداکاران:- چندر موہن۔ بیگم پارہ۔ منورما۔
الناصر۔ ہری شیوڈیپانی۔ مجنوں۔ ہریلا۔ وغیرہ
رُت رنگیلی
ڈائرکٹر روپ کشوری
خاص اداکار۔ منورما۔ الناصر
اندرپوری پکچرز کی لاثانی تصویر
خوش نصیب
ڈائرکٹر وٹھل داس پنچوٹیا
اداکار۔ رکمنی دیوی۔ جے شنکر۔ وٹھل داس وغیرہ وغیرہ
جاری کردہ
فلم کارپوریشن

جہیز کی مذموم رسم کے خلاف ایک سنیاسی کا زبردست احتجاج

کاردار پروڈکشنز کا زبردست اصلاحی کارنامہ

جذبات موسیقی۔ اور رومان کی لاجواب داستان

[illegible]

اداکاران

ی جہرہ شمیم۔ غلام محمد۔ مصرا۔ امر۔ شاکر۔ نسیم جونیر وغیرہ

ہدایت کار — موسیقار

اے۔ آر۔ کاردار — نوشاد

عہ ۵ اپریل سے :۔ جوبلی ٹاکیز میں

ہر جگہ کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کر رہا ہے

جاری کردہ :۔ دی گڈول پکچرز لمیٹڈ۔ دہلی۔ لاہور

محبت کا چراغ آندھی و طوفان میں بھی نہیں بجھا کرتا!

ت کے پروانوں کی عظیم قربانی جینت ڈلبھائی پروڈکشنز کا مایۂ ناز شاہکار

سوہنی مہینوال

جادو اثر نغمات

روح پرور رقص

عہد ماضی کی ناقابل فراموش داستان

اداکار

بیگم پارہ۔ الیشور لعل

مبارک۔ وکیشت وغیرہ

عظیم الشان کامیابی حاصل کر رہا ہے

وتی ٹاکیز۔ دہلی میں اور دیگر بڑے بڑے شہروں میں

تقسیم کنندگان :۔ بلیموریا اینڈ چھوٹو بھائی۔ دہلی اور لاہور

فلمی خبریں

منظہر آرٹ پروڈکشنز مسٹر منظہر [illegible] ہندوستان میں مبارک اکبر کا افتتاح کرنے باری گئے ہوئے تھے۔ باری سے بنگلور ہوتے ہوئے وہ بمبئی واپس آ گئے ہیں اور موہن اسٹوڈیوز میں اپنی زیر تکمیل تصویر "[illegible]" کی فلمبندی شروع کر دی ہے۔ سونا میں منظہر خاں۔ منور سلطانہ۔ نور جہاں [illegible]۔ ڈکشٹ۔ ماصوری، مدن پوری [illegible] اور حسن اہم رول ادا کر رہے ہیں۔

شالیمار پکچرز ایک رات اور من کی جیت جیسی تصویریں تیار کرنے والے ڈائرکٹر احمد نے راجپوتانہ کی خوبصورت حسینہ سنجوگتا اور پرتھوی چوہان والئے دلی کے رومان کو فلمبند کیا ہے۔ پرتھوی راج سنجوگتا میں مشہور فلمسٹار پرتھوی راج اور پُراسرار نیناؤوں والی شباب پری ہیں۔ پرتھوی راج سنجوگتا عنقریب شمالی ہندوستان میں نمائش کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔ دلی میں غالباً مجسٹک سینما میں اس کی نمائش ہوگی۔ پرتھوی راج سنجوگتا کی موسیقی۔ ایس۔ کے۔ پال کی ہے۔ اور اداکاروں میں تیواڑی۔ بھارت ویاس۔ بی بی۔ اور کوکو کے علاوہ سینکڑوں نے کام کیا ہے۔ ہدایات مشہور ڈائرکٹر نجم نقوی کی ہیں۔

ہینشوری پکچرز لاہور موجب جے این ہینشوری کی تازہ ترین تصویر "کہاں گئے" اس ماہ کے آخر تک نمائش کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اداکاران میں چاند۔ رونق۔ ایس کپور۔ بیج شر [illegible] زبیدہ رمیش اور بھاگ سنگھ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "کہاں گئے" کی ہدایات کے فرائض مسٹر نرنجن ادا کر رہے ہیں۔

پروگریسو پکچرز لاہور مسٹر ملک نے اپنی آنے والی تصویر "گیتوں بھری [illegible]" کی کاغذی تیاریاں ختم کر دی ہیں۔ اب عنقریب اپر انڈیا [illegible] میں مسٹر رشید ملک فلمبندی شروع کر دیں گے۔ "گیتوں بھری [illegible]" کی کہانی پروفیسر سید عابد علی عابد کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

پنچولی آرٹ پکچرز شہرت روز قریب الاختتام ہے۔ برکت مہرہ

بڑی محنت اور جانفشانی سے اس تصویر کو ایک کامیاب تصویر [illegible] ہیں۔ کہانی امتیاز علی تاج۔ مکالمے حبیب احمد [illegible] اور موسیقی پنڈت امرناتھ کی دماغی کاوشوں [illegible] ہے۔ اداکاران میں مینا۔ الناصر۔ ارشاد۔ اجمل۔ جٹ او [illegible] کے نام شامل ہیں۔

نرگس آرٹ کنسرن بائی جدن بائی کی صاحبزادی۔ تقدیر اور ہمایوں کی مشہور نرگس نے اپنا فلمی ادارہ قائم کیا ہے۔ اس ادارہ کی اولین عشقیہ اور رومانی تصویر رومیو جولیٹ بڑی سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے۔ رومیو جولیٹ کی کہانی کمال امروہی کی لکھی ہوئی ہے۔ رومیو جولیٹ میں نرگس سپرو۔ ماسٹر نثار۔ محشر شیرازی۔ انور۔ مدادا اور سنانسی [illegible] وغیرہ کام کر رہے ہیں۔

چترا پروڈکشنز کی "بہار آئی بہار" سے بدل کر "سدا بہار" کے نام میں منتقل ہو گئی ہے۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں بہار نے تین قلابازیاں کھائی ہیں۔ ابھی دیکھیں تیار ہونے تک اور کتنے نام تبدیل ہوتے ہیں۔ "سدا بہار" شنکر مہتہ کی نگرانی میں تیار ہو رہی ہے۔ "سدا بہار" میں ارشاد۔ آشا۔ ادم۔ رمیش بھاگ سنگھ اور انت نے کام کیا ہے۔ یہ مسٹر گولانی کی پیشکش ہے۔

محبوب پروڈکشنز ہدایت کار اعظم۔ محبوب اپنے جدید سوشل شاہکار "انمول" کو مکمل کر چکے۔ مزدوروں کا نشان اور محبوب کا نام میرے خیال میں ایک تصویر کی کامیابی کے لئے کافی ہے۔ محبوب اس سے پیشتر نجمہ۔ تقدیر اور ہمایوں جیسی تصویریں پیش کر چکے ہیں۔ "انمول" میں نور جہاں۔ سریندر۔ ثریا اور ظہور راجہ نے کام کیا ہے۔ موسیقی شاردا۔ نستے اور رتن کے شہرت یافتہ نوشاد علی کی ہے۔ اُمید اغلب ہے کہ "انمول" سال رواں کی بہترین سوشل تصویر ہوگی۔ عنقریب شمالی ہندوستان میں نمائش شروع ہو جائے گی۔

کاردار پروڈکشنز میاں کاردار کا بھی دُنیا لوہا مانتی ہے۔ کاردار دو عقابوں کے بیچ میں "K" بھی ایک تصویر کی کامیابی کے لئے کافی ہے۔ شاہجہاں قریباً ختم ہو گیا [illegible] اور نسرین اپنا کام ختم کرنے کے بعد کمپنی سے الوداعی دعوت لے چکی ہیں۔ نسرین کے متعلق سُنا گیا ہے کہ مشہور موسیقار رفیق غزنوی

[illegible] کے علاوہ [illegible]
نے بھی نورجہاں [illegible] نام پیدا کیا ہے۔ شاہجہان کی [illegible]
[illegible] مغل دور کے شاہانہ جاہ و جلال کا شاندار
[illegible]

[illegible] کے علاوہ "قیمت" اور "ناٹک" نام کی دو تصویریں زیر تکمیل [illegible] اجمیری اور الیاس یوسفی بالترتیب فلمبند کر رہے ہیں۔

[illegible] پکچرز بمبئی [illegible] لیلےٰ مجنوں کی شاندار کامیابی کے بعد صحرائے عرب کا زبردست رومان "وامق عذرا" ہدایت کار تنویر نے بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ وامق و عذرا میں تنویر سورن لتا اور ایم اسماعیل نے کام کیا ہے۔ وامق عذرا کی کہانی منشی دل لکھنوی اور گانے تنویر نقوی کے ہیں۔

ہدایت کار تنویر ایک اور تصویر "یادگار" تیار کر رہے ہیں۔ "یادگار" کے متعلق سنا ہے کہ واقعی یادگار ہوگی۔

یونائیٹڈ فلمز "بھائی جان" کے خالق ایس خلیل "شاہکار" نامی تصویر تیار کر رہے ہیں۔ جس طرح بھائی جان لاکھوں کے طول و عرض میں مقبول اور کامیاب ہوئی ہے امید ہے "شاہکار" کو بھی ویسی ہی کامیابی نصیب ہوگی۔ شاہکار میں سوبھنا۔ ساحر [illegible] شاہنواز۔ یعقوب۔ نجمہ اور ایک نیا چہرہ افضل پیش ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ اس کمپنی کا ایک اسٹوڈیو لکھنؤ میں بھی تیار ہوگیا ہے۔ اسٹوڈیو کا نام "آئیڈیل اسٹوڈیو" رکھا گیا ہے۔ اسٹوڈیو ہر قسم کی عمدہ اور جدید مشینری سے مزین ہے۔ جس کے سیٹ معقول کرائے پر دستیاب ہو سکتے ہیں۔

دین پکچرز بمبئی "جگ بیتی" قریب الاختتام ہے۔ جگ بیتی میں پری رو شا۔ صادق علی۔ سلوچنا چٹرجی اور ہمالیہ والا کام کر رہے ہیں۔ جگ بیتی کی کہانی و مکالمے مسٹر [illegible] اور آغا جانی کاشمیری نے بالترتیب لکھے ہیں۔ موسیقی ماسٹر غلام حیدر۔ اور ہدایات "رتن" کے شہرت یافتہ ایم صادق کی ہیں۔

منروا مووی ٹون "نورجہاں" قریب الاختتام ہے۔ "نورجہاں" کا کردار مجسم چاند مہتاب نے ادا کیا ہے۔ [illegible] اور تاریخی تصویروں کے بانی سہراب مودی کی ہیں۔ [illegible] علاوہ ایک سوشل تصویر کی کاغذی تیاریاں مکمل

[illegible]

فلم چالیس کروڑ کے [illegible]

[illegible] بمبئی کی خبر ہے کہ [illegible] پروڈکشن کی تصویر "چالیس کروڑ" بمبئی کی نمائش کے موقع پر جب ہندوستان کے نقشے پر کانگریس کا ترنگا جھنڈا لہرایا گیا تو پبلک نے احتجاج کیا کہ یہ ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ہے کیونکہ کانگریس ہندوستان کے چالیس کروڑ انسانوں کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ جوشیلے نوجوانوں نے اعلان سے استدعا کی ترنگے جھنڈے والا منظر فلم میں سے کاٹ دیا جائے مگر مالکان ٹس سے مس نہ ہوئے تو لوگوں نے سینما کے پردہ کو چاک کر دیا۔ اس کے بعد کی اطلاع مظہر ہے کہ بمبئی مسلم لیگ ای وارڈ نے ایک ریزولیوشن پاس کیا ہے کہ فلم چالیس کروڑ میں سے کانگریس کے ترنگے جھنڈے والا منظر کاٹ دیا جائے۔"

جیسا کہ مندرجہ بالا خبر میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر درست ہے تو ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہندوستانی پروڈیوسروں کی ذہنیت کیا ہوگیا ہے۔ ہندوستان ویسے ہی روزمرہ سینکڑوں جھگڑوں میں مبتلا رہتا ہے۔ سینما گھر جو ایک تفریح گاہ ہے وہاں سے بجائے دماغ کو تر و تازگی حاصل ہو۔ خیالات پراگندہ ہو جاتے ہیں۔

ہم اس بات کے مخالف نہیں کہ سینما کے ذریعہ سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے مگر اس بات کے بھی حامی نہیں کہ سیاست کو غلط رنگ میں پیش کر کے آپس میں تنازعہ کرایا جائے۔ ہم سیاسیات پر بحث کرنا نہیں چاہتے مگر چندرا آرٹ پروڈکشن کی اس حرکت سے ناخوش ہیں کہ انہوں نے ایسا منظر پیش کر کے بلاوجہ تنازعہ کی بنیاد رکھدی ہے۔ کیا سنسر بورڈ اس بات پر توجہ [illegible] اس منظر کو تصویر سے خارج کرنے کی کوشش کرے گا؟ سنسر بورڈ کو چاہیئے کہ تصویر کو پاس کرنے سے پیشتر دیکھ لے کہ تصویر میں کوئی منظر تو نہیں جس سے کسی کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ ہمیں امید ہے کہ پبلک کی یہ شکایت سنی جائے گی اور غور سے سنی جائے گی۔

خورشید - فلم "موتی" میں

THE ADEEB DELHI

جناب سلطان حیدر جوش

نجمہ - فلم ''پروانہ'' میں

معذرت

قارئین کرام معاف فرمائیں ہر ممکن سعی
کے باوصف "ادیب" کی اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔
دہلی میں آبادی کی کثرت کے دوش
بہ دوش کاپی نویسوں کی قلت جاری ہے۔
ہمارے کاتب صاحب کی بیماری نے ہمیں
بے دست و پا کر دیا۔ مارچ و اپریل کا مشترکہ نمبر
نکالنا پڑا اور مئی کی اشاعت میں بھی تاخیر ہو گئی۔
جن حضرات کا چندہ اپریل میں ختم
ہو رہا تھا ہم اُنھیں وی، پی نہیں بھیج رہے
ہیں، اُن کی میعاد میں جون تک توسیع کر دی
ہے کہ تلافیٔ حالات ہو جائے۔
ہم حالات پر قابو پانے کی ہر ممکن سعی
کر رہے ہیں، انشاء اللہ آئندہ "ادیب"
وقت پر طلوع ہو گا۔

منیجر

"ادیب" کی ادبی ضرورت

ضرورت ہے

ایک تعلیم یافتہ خاتون، کی
جو ادب سے دلبستگی رکھتی
ہوں اور ادارت و اشاعت
میں ہماری معاون بن سکیں
مشاہرہ سو روپے تک پیش
کیا جا سکتا ہے

منیجر ادیب معرفت
ہارڈنگ لائبریری دہلی

سالانہ چندہ دس روپیہ علاوہ محصول

قیمت فی کاپی ایک روپیہ علاوہ محصول

ادیب دہلی

اڈیٹرز

سید محمد مرتضیٰ واحدی | فصیح الدین احمد ایم اے | شہاب ملیح آبادی

جلد ۱ | مئی سنہ ۱۹۴۶ء | نمبر ۷

فہرست مضامین

نئی کتابیں

(شہاب ملیح آبادی)

لاجونتی " از ڈاکٹر سرشانتی سروپ بھٹناگر۔ ملنے کا پتہ:- آنند سروپ بھٹناگر نمبر ۲۵۰ تغلق روڈ، نئی دہلی

جہرہٗ نقش میں بعض خیالات تسلسل کے ساتھ اتنے دزدانہ انداز سے آتے ہیں کہ اُن کے قدموں کی آہٹ تک نہیں محسوس ہوتی ' لاجونتی ' کا مطالعہ، مجھے نہ جانے کہاں کہاں لے گیا، پڑھ کے لیٹا ہی تھا کہ دورِ مغلیہ کی تصویریں صحنِ تخیل میں رقص کرنے لگیں، والہانہ دوہے گنگنانے لگے اور شبِ مہتاب کی زردپہلی چاندنی، چلچلاتی دھوپ میں جھلکتی نظر آنے لگی۔

اس سلسلے میں، مجھے ایک انگریزی مثل یاد آئی۔

تھوڑی دیر کے لیے یہ حقیقت، اپنی برعکس صورت میں ڈھلتی ہوئی محسوس ہوئی کیا یہ صحیح نہیں ہے،

یہ خیال کیوں پیدا ہوا ؟ ' لاجونتی ' کے مطالعے نے مجھے یوں غور کرنے پر آمادہ کیا کہ قدرت، نفسِ انسانی کی نباض قدرت نے ڈاکٹر بھٹناگر کو شاعر پیدا کیا تھا انھوں نے اپنے کو کیمیاگر، بنا ڈالا، قدرت کی فیاضیاں اعلان کر رہی ہیں کہ لو، ہم تمہیں شاعرانہ دل و دماغ عطا کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب بہ ضد ہیں، نہیں، کچھ ہو، ہم بنیں گے تو کیمیاگر بنیں گے اور آرٹ کی بجائے سائنس کے زانو پر سر رکھیں گے، مگر اس بانکپن سے ہونا کیا ہے ؟ میں نے ابھی کہا تھا، یہ حقیقت " تھوڑی دیر کے لیے " اپنی برعکس صورت میں ڈھلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر " سے مراد کیا ہے ؟ " تھوڑی دیر " سے مراد یہ ہے کہ قدرت سے سرکشی، کبھی پائندہ سرخروئی حاصل نہیں کر سکتی کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں جو قدرت کے مصالح کے خلاف صف آرائی کر سکے ؟ ڈاکٹر بھٹناگر کی کیمیاگری، وہ اعصاب پیدا نہ کر سکی کہ اُن کی شاعرانہ اُپج کو دبا دیتی۔ اُنھیں قدرت کا لوہا ماننا پڑا اور وہ سائنس کے سوتیلے بھائی آرٹ کو منضبط، اسٹاف اور حسبِ آلات کے باوصف اپنی لیبارٹری میں در آنے سے باز نہ رکھ سکے۔ ڈاکٹر بھٹناگر نے، اپنی اس شکست کا اعتراف غیرشعوری طور پر دیباچے میں کیا ہے۔ " میری تمام زندگی علم کیمیا کی تلاش میں گزری ہے۔ یہ امر اتفاقیہ ہے کہ اپنی زبان میں شعر سننے اور کہنے کا چسکا ہے، کیا کروں بچپن سے ہی یہ فطری شوق دامنگیر ہے۔" قدرت اپنی فیاضیوں میں سبقت کرتی ہے' جب انسان ان فیاضیوں کے خلاف جادہ پیما ہوتا ہے تو وہ ' چسکا ' بن کر اُس کا تعاقب کرتی ہیں۔ جوانی، بچپن کے بعد آتی ہے، کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ پہلے شاعر تھے، بعد میں کیمیاگر بن بیٹھے ؟ ڈاکٹر بھٹناگر تلاشِ علم کیمیاگری میں اُس سے دامن چھڑاتے رہے، لیکن وہ بچپن سے ابتک، اُسے جھٹک نہ سکے۔ یہی بےچارگی، اعتراف شکست ہے!

دوسرے شاعری وہبی ہے، کیمیاگری کسبی۔ شاعری کا سرچشمہ محکم قدرت رواں ہوا ہے، کیمیاگری کا پودا، خود ڈاکٹر صاحب نے نصب کیا ہے اسے خزاں ہے، اُسے نہیں، اُدھر ہر موسم، موسم بہار ہے، اِدھر نہیں!

آرٹ اور سائنس، ایک عمر سے، مختلف سمتوں پر گامزن ہیں' ایک ہی خاندان کے دو فرزند، رفتار و گفتار میں، شاید ہی کبھی اتنا بُعد المشرقین رکھتے ہوں، حد ہو گئی، اگر آپ سائنس کے پرستاروں میں ہیں تو آرٹ کے عشوۂ و ناز کا مزہ کبھی نہ چکھ سکیں گے، اگر آپ آرٹ کے زُلف گزیدہ ہیں تو سائنس کی تمام عنایات آپ پر موقوف! سائنس نے قسم کھالی ہے، آرٹ کے کسی طالب سے اُس کا علاقہ نہیں ہوگا، آرٹ حلف اُٹھا چکا ہے ' دشمن سے ملوں گا، لیکن سائنس کی طرف مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں،

اب صورت یہ ہے کہ سائنس کے حوارین، تجربے اور مشاہدے کے پس پردہ اپنی دھن میں مصروف ہیں اور آرٹ کے پرستار تخیل و جذبات کی بانسری بجا رہے ہیں، نہ یہ اُن کی سنیں، نہ وہ اِن کی۔ اُدھر یہ زعم کہ ہم، عالم شکار ہیں، دُنیا کو تسخیر کر کے رہیں گے، اِدھر یہ پندار کہ ہم آدم و یزداں شکار، ہر فاتح کے فاتح ہیں۔

میں ڈاکٹر صاحب کے کیمیاوی کمالات سے واقف نہیں ہوں، سنتا ہوں اور زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھ کر ایمان رکھتے ہوئے میں بھی تسلیم کروں گا کہ وہ سائنس کے اُفق پر ایک درخشاں ستارہ ہیں، لیکن افسوس اُس تابانی سے حظ اُٹھانے کے لیے میں بالکل نابینا ہوں،

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، مجھے لاجونتی کے مطالعے سے اس کا ضرور احساس ہوا کہ وہ دونوں محفلوں میں باریاب ہو چکے ہیں۔ بالعموم، سائنس سے دلچسپی رکھنے والے حضرات، ادبیات کو بکواس سمجھ کر، اس سے کنارہ کش رہتے ہیں اور ادبیات کے حلقہ بگوش سائنس سے کوئی رسم و راہ نہیں رکھتے۔

ڈاکٹر بھٹناگر، ان خوش بخت لوگوں میں ہیں، جن کی نگاہیں دونوں کے جمال سے بہرہ اندوز ہیں۔

قدرت نے انھیں شاعر پیدا کیا، انھوں نے اپنے کو کیمیاگر بنایا، چلیے، میرے دونوں ہیں۔

ڈاکٹر بھٹناگر کی ہر نظم کے سینے سے شاعری کی آواز آتی ہے، ان کی نظم "مفلسی" میں جن جذبات کا اظہار ہوا ہے، وہ شاعرانہ حس ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

نظم وصال، جس میں گنگا کا سمندر سے تخاطب ہے، شاعرانہ انداز بیان، ندرت خیال اور جدت فکر کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

یہ مصرع: "زندگی میری کبھی سنگیں تھی، اب آبی ہوئی" قابل توجہ ہے۔ ایک اور بند ملاحظہ کیجیے۔

میں کبھی لذت کش گہوارۂ کہسار تھی
رونق صحن چمن، زینت دہ گلزار تھی
دیدۂ بینا میں شمع جلوہ گاہ یار تھی
ہمالہ کے گلے میں موتیوں کا ہار تھی

برف کے شفاف گالوں میں کبھی رکھا مجھے
تانہ دے آزار، موج باد بے پروا مجھے

یہ اور اس نوع کے دوسرے بند، کیمیاگری کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ کر بھی تخیل کی گرفت میں نہیں آ سکتے، یہ کام صرف شاعر کر سکتا ہے تو کیا پھر میں غلط کہتا ہوں کہ ڈاکٹر بھٹناگر پہلے شاعر ہیں اور بعد میں کیمیاگر؟

اس مجموعے میں، کچھ بلکہ بیشتر نظمیں ایسی بھی ہیں جو بطور یادگار، اہلیہ مرحومہ کی جدائی کے غم میں سپرد قلم ہوئی ہیں، بہ قول شبلی، ہمارے سب سے شیریں گیت وہ ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ غم و درد کی داستان سناتے ہیں۔ "بیوی اور کتاب" اور اسی سلسلے کی دوسری نظمیں جو مرحومہ بیوی کی یاد میں خون رلا رلا کر، شعریت کے قالب میں ڈھل گئی ہیں، سینے میں اتر جاتی ہیں۔ میں خواجہ حسن نظامی صاحب سے متفق ہوں کہ یہ اشعار، بھٹناگر صاحب کے مجموعۂ کلام میں ماسٹر پیس (شاہکار) ہیں۔

"آجاؤ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جذبات کی فراوانی، بندش کی چستی اور الفاظ کی سادگی کے باوجود رنگینی ذیل کے اشعار میں ملاحظہ کیجیے۔

سپرد خاک اگر ہو گئیں تو کیا پروا | بہ شکل لالہ و گل ہی زمیں سے آجاؤ
میں کوششوں میں ہوں، دنیا بہشت کو کر لوں | بکار خیر ہی خلد بریں سے آجاؤ
شراب نیستی کے گرداب سے نکلے کر | دہن پہ میرے لب ساتگیں سے آجاؤ
قدم جو اٹھ نہ سکیں آؤ تم بپائے نگاہ | تخیلات میں میرے جبیں سے آجاؤ
پسند ہو نہ اگر شاہ راہ عام تمھیں | تصورات میں راہ یقیں سے آجاؤ
ترس رہے ہیں ملنے سے دیدۂ مشتاق | اٹھا کے پردۂ رخ شرمگیں سے آجاؤ

فنی نگاہ کی میزان سے کوئی ذیل کے اشعار تولیے۔ "بیوی اور کتاب" میں جذبات کی مصوری کس خوبی سے کی ہے۔

مجھ سے بیوی نے کہا اک دن جو میں ہوتی کتاب
تیری دید شوق سے ہر وقت رہتی فیضیاب
ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں توڑ کر شرم و حجاب
رہتی میں پیش نظر تیرے بر افگندہ نقاب
ہم کبھی مجنوں نظر ہوتے رخ لیلی کبھی | زرکش و امن کبھی ہم صورت عذرا کبھی

بیوی کی اس تمنا کا قلب شاعر پر کیا اثر پڑا، اس کے دل کا احاطہ کن جذبات نے کیا، اسی کی زبان سے سنیے:۔

سن کے یہ، رک سی گئی اوراق گردانی مری
بن کے اشک منفعل ٹپکی پشیمانی مری
تو سراپا انسیت ہے، تو وہ کاغذ کتاب
تیری آنکھوں سے چھلکتی ہے مروت کی شراب
تو نہ خود بنتی اگر مفہوم باب زندگی
کون سمجھاتا کہ مہمل تھی کتاب زندگی

جذبات کی حسین و مکمل مصوری تو یہی ہے کہ سامعین کہہ اٹھیں۔

دیکھیے تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

میں ابھی ذکر کر رہا تھا کہ سائنس اور آرٹ، مختلف جادوں پر گامزن ہیں، لیکن اگر کوئی بالغ نظر، میانہ روی کے انداز میں قدم اٹھائے

زاویات میں سائنس کا زاویہ، دُنیا بدل دیتا ہے۔ ادبیات میں تصوری جذبات اور حقیقت نگاری ایک دلچسپ موضوع ہے، اِس وقت، داخلی جذبات نگاری سے ہٹ کر خارجی دُنیا، جاذبِ نظر بنی ہُوئی ہے۔ عہدِ حاضر ہر ادیب سے حقیقت پرستی و حقیقت نگاری کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر کے کلام میں، سائنس کے طفیل، حقیقت نگاری کے تیور پیدا ہو گئے ہیں، اُن کا کلام، عصرِ نَو کے کام و دہن ہیں، حسبِ مُراد، واقعات و حقائق کا عرق ٹپکا رہا ہے۔ سب سے زیادہ مجھے جس بات پر حیرت ہے، وہ یہ کہ صاحب زر ہوتے ہوئے، ڈاکٹر صاحب: زر کے خلاف ہیں، زر سے اِس فطری انحراف کے باعث، جو خالص فیضانِ شعر ہے، بھٹناگر صاحب کے کلام کی حدود اکثر اشتراکیت سے مل جاتی ہیں۔ مثلاً "جنگ" کا یہ شعر ؎

ڈویٹی بٹا کے برابر ہوں آدمی سارے
نئی طرح سے ہو تقسیم، زر، زمینداری

"نئی طرح" کی تقسیم کے تو اکثر لوگ قائل ہو چکے ہیں، جرمنی، اٹلی، جاپان بھی یہی چاہتے تھے، لیکن پہلا مصرع اَنوکھا ہے اور معنی خیز! نظم "وکیل" کا یہ بند ملاحظہ فرمایئے:۔

کُھلا ہُوا ہے یہ بازار جو عدالت کا
کہ جس بحث فیصلہ کرتی ہے سب کی قسمت کا
شہادتوں میں سمٹے جا رہے ہیں صدق و صفا
کہ منصفی بھی ہے اک کھیل مال و دولت کا
فروخت ہوتے ہیں تحصیل میں وکیل و گواہ
خریدے جاتے ہیں انصاف اور امن و پناہ

یہ حقائق ڈاکٹر صاحب کے ذہن پر ہرگز طلوع ہوتے، اگر وہ شاعر نہ ہوتے، ہوتے بھی تو اس جُرأتِ رندانہ سے نہ کہتے اور کہتے بھی تو ایسے الفاظ میں نہ کہتے۔

پہلے مصرعہ "کُھلا ہوا ہے یہ بازار جو عدالت کا" میں لفظ "یہ" معنی خیز ہے۔ اس حرفِ اشارہ کا ہدف کون ہے؟ کس کی جانب یہ تیر سَر کیا گیا ہے، آپ فیصلہ کریں، مَیں تو اِتنا ہی کہوں گا۔

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ڈاکٹر بھٹناگر نے کچھ مزاحیہ نظمیں بھی لکھی ہیں، جن میں سے اکثر بہت شوخ اور ... ہیں۔ ہر شاعر زندہ دل پیدا ہوتا ہے، سائنس کی سنجیدگی کے لمحات میں تبسّم کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی، آرٹ حوادث میں بھی شانِ خندہ ہائے زیرلبی، نہیں کھوتا، لیکن مزاحیہ شاعری مُشکل چیز ہے۔ صرف سُننے کی بات، سے مزاحیہ رنگ کامیاب نہیں ہو جاتا، اکبر کم ہی پیدا ہوتے ہیں، ڈاکٹر اقبال نے بھی مزاحیہ نظمیں لکھیں، لیکن انھیں غیب سے ہدایت ملی اور وہ سنجیدہ موضوع میں شوخیاں دکھاتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے ماتھے پر، مجھے اقبال کا پَرتو نظر آتا ہے، اُن کی نظم "وصال۔ گنگا" پر یہ شعاعیں صاف ہیں۔

بھٹناگر صاحب نے کچھ ہندی نظمیں بھی لکھ کر جولانیٔ طبع دکھائی ہے، جن میں موجودہ عہد کی "سنسکرت بازی" سے کُھلا ہُوا گریز ہے۔ کبھل نہ ہو، "نیم مسلم نیم مُسلم" کی طرح، روایات سے اسی مُعاصب کی حد تک، باغی نہیں ہوتا، اُن کا شعر ہے۔

ہم "لاجونتی" کا خیر مقدم کرتے ہیں، ڈاکٹر بھٹناگر آئیں، یہ ہے مرزا غالب کی محفل، یہیں مرزا تفتہ جلوہ افروز ہیں، دیدہ و دل فرشِ راہ، اُن کے نواسے بھی، بہ تشریف ادب، آئیں، مرزا کی محفل اُن کا خیر مقدم کرتی ہے۔

ہتھوڑے

مرتّبہ جناب شفیق قادری صاحب
ملنے کا پتہ: شمسی پریس بک ڈپو، گیا۔ قیمت عہ

کتاب کا شوخ عنوان، جدید رُجحاناتِ شعر و ادب کی خود غمازی کر رہا ہے۔ اِس مجموعے میں، مختلف شعرا کے کلام کی آتش فشانیاں، بند ہیں، جو ورق کُھلتے ہی ہتھوڑے کا کام دینے لگتی ہیں۔ عصرِ نو کا "فرہاد" اپنا تیشہ کوہ بیستون پر نہیں چلاتا بلکہ اُس کا رُخ عہدِ حاضر کے "پرویز" کی جانب ہوتا ہے۔ اس کتاب کے اوراق میں بھی جدید نوع کے تیشے ملیں گے۔

اس مجموعے کی صف میں تیرہ شعرا، تیشہ بردوش، نظر آتے ہیں، منتخب نظموں میں اقدار کی میزان سکتے میں آ جاتی ہے، کس کو کس کانٹے پر تولا جائے، اپنی اپنی جگہ، ہر شاعر ایک انفرادیت رکھتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے، مجموعہ دلچسپ ہے، مگر بیشتر نظمیں رَوانی کے

باوجود اپنا رُخ، اپنی سمت اور اپنی منزل کی جانب صحیح اشارہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی ہیں۔ طفیل احمد سلطان پوری کی نظم "خاتونِ مشرق" اچھی نظم ہے، لیکن اس کے مطالعے سے کوئی خاتونِ مشرق اپنے ماحول پر فتح کا اشارہ نہیں پا سکتی، ماضی کے آنسو، مستقبل کا تبسم کیونکر بن سکتے ہیں، پتہ نہیں۔ جمیل مظہری کی نظم "وقت کا دھارا پھیرنے والے" جس میں گیت کی تو آتی ہے، بہت عمدہ نظموں میں ہے۔ بند ملاحظہ کیجئے۔

جب تک بے تخصیص کی لعنت کیا ہوگی تعمیم
جمہوریت دستوریت میں دونوں نیم حکیم
اس کو بالو اُس کو شکر، یہ کیسی تقسیم
اس کو روٹی، اُس کو ٹھوکر، یہ کیسا اندھیر
وقت کا دھارا پھیرنے والے، وقت کا دھارا پھیر

رہنے دیں سب اپنی منطق عقل کے ٹھیکے دار
ڈھل سکتا ہے ہر سانچے میں انسانی کردار
فطرت یہ ہے، فطرت یہ ہے، اکتنک یہ تکرار
فطرت کیا ہے، فطرت کیا ہے، فطرت کو کر زیر
وقت کا دھارا پھیرنے والے، وقت کا دھارا پھیر

اس نظم میں اپنے ماحول کے اعتبار سے، کچھ فارسی الفاظ گراں گزرتے ہیں مثلاً پہلے مصرعے میں، ورنہ یہ نظم بہ ہر صورت قابلِ ستائش ہے۔

اس مجموعے میں، ہمارے دوست نہال سیوہاروی بھی جلوہ افروز ہیں جن کی نظم "غلاموں کی دنیا" ان کے مخصوص اندازِ فکر و بیاں کی حامل ہے آخری شعر میں جو فرا بیت ہے، اس کے ہم قائل نہیں، بال وپر، وس لیے خدا دشمن کو بھی نہ دے۔

اس مجموعے میں دوسرے شعرائے کرام کا کلام بھی قابلِ مطالعہ ہے۔

ڈگر (مجموعۂ نظم) از جناب الطاف مشہدی، ملنے کا پتہ:۔ الطاف مشہدی، چک ۱۱۳ جنوبی ضلع سرگودھا، (پنجاب) قیمت کتاب عہ

ادبی حلقوں میں، الطاف مشہدی کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے ان کی گرجتی گونجتی شاعری، بے شمار دلوں میں شگاف اور لاتعداد داغوں میں تلاطم پیدا کر چکی ہے۔

"ڈگر" بھی اسی شان کا مجموعہ ہے، اس مجموعے میں اچھی اچھی نظمیں اور گیت مطالعے کی آنکھوں سے مس ہوتے ہیں، مصرعوں کے تمام تڑپتے تلملاتے تقاضے اس مجموعے کے سقف و بام پر گونج رہے ہیں۔

"دو موڑ میں" حسن اور ماحول کا اچھا مقابلہ ہے۔ شعر سنیئے:۔

ایک مدہوش ترنم تری آواز میں ہے
اپنا انجام ابھی منزلِ آغاز میں ہے
کتنے لمبے تری پلکوں کے گھنے سائے ہیں
ہم کہاں ظلم کی وادی میں اُتر آئے ہیں
تو اُدھر نرم حسیں گیت بنی جاتی ہے
اپنی حالت پر اِدھر مجھکو ہنسی آتی ہے

"ہندو پانی، مسلم پانی" میں اتحادِ فرقہ وارانہ کی اُمنگ ہے، شاعر نے اس مجموعے میں رومانٹک نظمیں بھی پیش کی ہیں، مگر ان کے ماتھے پر بھی "بھوک" "بغاوت" اور "انقلاب" کی مہریں لگی ہوئی ہیں "طوائف" میں پرولتاری پرچم، مزدوروں سے چھین کر طوائف کے ہات میں دے دیا گیا ہے۔ بند ملاحظہ ہوں۔

تیری مظلومی بدل دے گی یہ فرسودہ نظام
خودسری تسبیح کے دانوں پہ لے گی تیرا نام
ظلم کی دُنیا پہ چھا جائے گی جب تاریک شام
وہ بھی دن نزدیک ہیں اے زندگانی کے شباب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب
تُو نے مذہب کو جھکایا دہریت کے پاؤں پر
دخترِ رز مسکرائی داڑھیوں کی چھاؤں پر
تجکو سجدہ ہے روا، اے نئے اشتراکی آفتاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب

اگر مشہدی صاحب "طوائف" کو "اشتراکی آفتاب" نہ بتاتے تو کوئی شکایت نہ تھی، ہم اب تک تو یہ سنتے آئے ہیں کہ اگر "فرسودہ نظام" بدل گیا تو "طوائفیت" کا خاتمہ ہو جائے گا، کیا صفِ انقلاب میں آکر "طوائف" سرمایہ داری کی طرح اپنی قبر اپنے ہات سے کھود رہی ہے؟ اگر نصیبِ دشمناں، فرسودہ نظام، تبدیل ہو گیا تو پھر بھی آوارگی

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

اس وقت بیشتر ترقی پسند ادیب اور شعراء کے دوش پر اشتراکیت کا بوجھ ہے لیکن وہ اکثر غلط جانب سر کیا جاتا ہے۔ مشہدی صاحب کی بیشتر نظموں کی کمند، اسی وفور جذبات میں، قصر شاہی کی بجائے بے خطا، بام خدائی پر ڈالی گئی ہے، ان کی نظم "نیا خدا" کا تبرزیں ہی سرہوا ہے: ع میں جب کروں یقین خدا کے وجود کا، ہمیں جو شرائط خوش عقیدگی پیش کیے گئے ہیں، میرے خیال میں خدا انھیں قبول نہیں فرمائے گا۔"

اس اشارے سے الطاف مشہدی کی شاعرانہ عظمت کی تخفیف مقصود نہیں ہے۔ الطاف کی شاعری ایک جگہ پیدا کر چکی ہے اور وہ اس کی مستحق ہے، البتہ کچھ نظموں کے منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے، ہمارا اشارہ اس سے زیادہ نہیں۔

کتاب کی طباعت قابل اصلاح ہے، اکثر مصرعے ناموزوں رہ گئے جس سے پتہ چلتا ہے، پروف ریڈنگ کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

مجموعی اعتبار سے، کتاب مدح سے مستغنی ہے

طرزِ زندگی (ناول) از جناب نسیم انہونوی صاحب
ملنے کا پتہ: نسیم بکڈپو لکھنؤ۔

یہ ناول انہونوی صاحب کی افسانوی حیات کا نقش اول ہے" جیسا کہ مصنف نے خود اپنے دیباچے میں اعتراف کیا ہے، طرز زندگی کے شریانوں میں علامہ راشد الخیری مرحوم کا خون موجزن ہے، وہی لب و لہجہ طرز تحریر ہے، وہی قدیمی معاشرتی اقدار سے والہانہ خوش عقیدگی "طرز زندگی" پہلی بار ۱۹۲۸ء میں منظر عام پر آئی تھی، اٹھارہ سال کے بعد "زرد دیوار پہ سبزہ" لیے، دوسری بار، بہ تغیرات چند، بہ تقاضائے سن" پھر جلوہ افروز ہو رہی ہے۔

مصنف نے اختر جہاں کے کردار میں بڑی جانفشانی کے ساتھ اپنی جبیں کو عرق آلود کیا ہے۔ اختر جہاں کے ایسے کردار، جو زمان و مکاں کے قیود توڑ کر رکھ دیں، جو اپنے نصب العین کے لیے ہر جا تے کو بیتک کہیں، عملی زندگی میں ہزار گردش فلک کے بعد، زمین پر طلوع ہوتے ہیں، ہر چند افسانے کی سرزمین پر وہ ہر ماہ بعد جنم لے سکتے ہیں۔ عملی زندگی میں، ممکن ہے، اختر جہاں شکستہ دلی کی حد پر پہونچ کر خودکشی کر لیتی، لیکن "طرز زندگی" میں وہ نہایت آب و تاب کے ساتھ، سرخروئی کی شان لیے ہوئے، کام بخت و کامگار ہے۔ مصنف نے، دوسرے کرداروں کی مصوری بھی احتیاط و جانفشانی کے ساتھ کی ہے۔ نازو اور اس کی ماں کے کردار چلتی پھرتی تصویریں ہیں، جو آج بھی سانسیں لے رہی ہیں۔

انہونوی صاحب کے ناول کا پلاٹ، جس طبقے کے محور پر گھوم رہا ہے، وہ سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے مر چکا ہے، لیکن آرٹ مردوں کو بھی زندہ کر دیتا ہے۔" طرز زندگی اس طبقے کے کان میں صدائے "قم باذنی" ہے۔" یہ کتاب ان گھرانوں کے لیے، جہاں تغیر قدم رکھتے ہچکچاتا ہے، دلچسپ اور قابل عبرت ثابت ہوگی۔"

خدا سے

(شہاب ملیح آبادی)

آیام کی رونق کو بڑھانے والے
انسان کو خوش وضع بنانیوالے
کیوں دین سے غفلت کا گلہ ہو تجھکو
تہذیب کو سینوں میں جگانیوالے!

طاقت سے کبھی ضعف کو خودسر کر دے
مظلوم کو ظالم کے برابر کر دے
مشکل ہے کبوتر کو جو کرنا شاہیں
شاہیں کو کسی طرح کبوتر کر دے

جہانگیر

(مترجمہ شہاب ملیح آبادی)

۲۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو شہنشاہِ اکبر خلد آشیاں ہو گئے رحلت سے قبل تمام امراء خوابگاہِ عالی میں طلب کئے گئے اور انھیں وصیت کی گئی کہ تاج شاہی شہزادۂ سلیم کے فرق کی زینت بنایا جائے اور شہنشاہ ہمایوں کی شمشیر آبدار شہزادے کے حوالے کر دی جائے۔ اکبر کو شہزادۂ سلیم سے [illegible] تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ شہزادہ سلیم، شیخ سلیم چشتی کی دعاؤں کی دین ہے۔ شہزادۂ سلیم راجپوت سردار، راجہ بہاری مل والیٔ امبر کی ہمشیرہ کے بطن سے تھے۔ جن سے اکبر نے رشتۂ ازدواج چند سیاسی مصالح کی بناء پر قائم کیا تھا۔

اکبر کی رحلت کے وقت سلیم کی عمر چھتیس سال کی تھی شہزادے کی تعلیم دستورِ شاہی اور رسوم مروجہ کے تحت آزادانہ ہوئی تھی۔ جس میں کچھ ہاتھ یسوعی پادریوں [illegible] بھی تھا اور اسی بناء پر قیاس آرائیاں ہوتی تھیں کہ شہزادہ سلیم اختیار ہو کر عیسائی مذہب قبول کر لیں گے۔

شہزادہ سلیم فطرتاً لاابالی مزاج کا شخص تھا۔ اسی بناء پر آس نے دکن کی گورنری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

۱۶۰۰ء میں شہزادۂ دانیال کی رقابت میں سلیم کو اکبر سے کچھ کبیدگی پیدا ہو گئی، جس نے بعد میں بنگال کی جانب سے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ اکبر کے دل پر اس سرکشی کا گہرا صدمہ ہوا، دو سال بعد جب سلیم نے ابوالفضل کو قتل کرا دیا اکبر کا دل پاش پاش ہو گیا۔ لیکن الفتِ پدری [illegible] ۱۶۰۳ء میں دونوں بغل گیر ہو گئے۔

تخت پر جلوہ گر ہوتے ہی سلیم نے لقب "جہاں گیر" اختیار کیا۔ اعلانِ شاہی نافذ کیا گیا کہ رعایا کی فلاح و بہبود سلطنت کا فرضِ اولیں ہے۔ اسلامی شریعت کی حفاظت کی جائے گی اور دوسری اہم اصلاحات کا باب کھولا جائے گا مثلاً قیدیوں کو جیل سے رہائی عطا ہو گی۔ منشیات کی خرید اور فروخت ممنوع قرار دے دی جائے گی، لوٹ مار کا سدِباب اور سنگین سزاؤں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ امراء کی جاگیریں بحال رہیں گی اور مذہبی اوقاف کا تحفظ کیا جائے گا۔

اس کے باوجود شہزادۂ خسرو کی تمنائیں بغاوتیں ہوئیں۔ خسرو عوام میں بے حد ہر دلعزیز تھا۔ اس کی روشن خیالی، خوش وضعی اور تابدار شخصیت نے ہر دل کو موہ لیا تھا۔ آگرہ کے قید و بند سے نکل کر شہزادۂ خسرو پنجاب کی طرف چل کھڑا ہوا۔ وہاں علمِ بغاوت [illegible] کر دیا۔ سکھوں کے گرو ارجن کی حمایت اور کچھ کاشتکاروں کے کس بل پر خسرو نے سرکشی کا پرچم لہرا دیا۔ گرو ارجن نے دعاؤں کے دوش بہ دوش شہزادے کی مالی مدد بھی کی۔

نتیجہ کیا ہوا؟ بغاوت آسانی کے ساتھ فرو ہو گئی، لیکن انتقامِ جہانگیری کی بجلی باغیوں کے سر پر ہولناک انداز میں کڑکی۔ دو سردارانِ بغاوت، حسین بیگ اور عبدالعزیز گرفتار ہوئے، ایک گائے اور دوسرا گدھے کی کھال میں چن دیا گیا۔ گائے کی کھال زیادہ تر خشک ہوتی ہے حسین بیگ چار گھنٹے سے زیادہ نہ جی سکا، عبدالعزیز ۲۴ گھنٹے جھیل لے گیا، اس کے بعد رہا کر دیا گیا، بعد میں ان باغیوں کو پبلک میں مشتہر کیا گیا، باغ سے شہر تک کھونٹے نصب کئے گئے اور ان باغیوں کو ان پر سے کر کرا کے کھینچا گیا۔

پبلک مظاہرہ بڑا عبرتناک تھا۔ شہنشاہ تمام لوازماتِ شاہی سے مزین ہو کر شاہانہ وقار و دبدبے سے سجے ہوئے ہاتھی پر متمکن تھا۔ پیچھے لرزاں و گریاں شہزادہ خسرو تھا۔ معتوب باغیوں میں سردار ارجن سنگھ کی ایک ممتاز شخصیت تھی۔ وہ سکھوں کے پانچویں گرو اور آدی گرنتھ (جو سکھوں کی انجیل کا مرتبہ رکھتی ہے) کے مدون تھے۔

یورپین مصنفین نے اس عتابِ شاہی پر رنگ چڑھا کر مسلمان سکھ مسئلہ بھی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے ہندوستان کی سیاسی فضا نے اس کے خاطر خواہ قبول نہیں کیا۔ خسرو کی آنکھ داغ دی گئی جس سے بینائی سلب ہو گئی، اور

قید تا عمر کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ ۱۶۲۲ء تک خسرو کی ہر سانس سلطنت میں خلش بن کر چبھتی رہی، وہ مختلف ہنگامہ آرا جماعتوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

یہ ایک بڑی ٹریجڈی تھی کہ خسرو تختِ شاہی پر متمکن نہ ہو سکا اگر عنانِ حکومت اُس کے ہاتھ آ جاتی، تاریخ کا باب ہی مختلف ہو جاتا۔ سر طامس رو کی رائے تھی، اگر سلطان خسرو کو غلبہ حاصل ہو جاتا سلطنتِ مغلیہ عیسائیوں کی جائے پناہ اور عبادت گاہ بن جاتی اُسے عیسائیوں سے گہری عقیدت اور فطری مناسبت ہے، علم دوستی شجاعت اور امورِ جنگی کی مہارت میں اس کا کوئی حریف نہیں تھا، خوشامد اور اکثر رسوم مروّجہ سے اسے فطری گریز تھا، عوام کی نظروں میں اُسے مجاہد اور شہید کا رتبہ حاصل ہے۔ اس کے جنازے میں بے شمار افراد شریک تھے، الٰہ آباد تک جہاں جہاں جنازے کو توقف کرایا گیا، ایک یادگار قائم کر دی گئی، یہ اُس کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ہے۔ دُوسرے اشخاص کی طرح شہزادہ خسرو کثرت ازدواج کا قائل نہ تھا۔ اس کا اُس نے عملی ثبوت بھی دیا خسرو ایسے روشن دل و زندہ خیال شخص کے لئے اس عہد کی سطح ہموار نہیں تھی۔

حکمرانی کے دورِ آغاز میں، جہانگیر نے برعکس وعدوں کے باوصف، یسوعی پادریوں کی تلقین کی طرف میلان ظاہر کیا، انھیں اکثر مراعات بخشی گئیں۔ جس حجرۂ شاہی میں تختِ جہانگیری رونق افروز تھا، اُس میں اکثر تصاویر کے چہرے آیاتِ انجیل سے نمایاں تھے اور پاپائے اعظم اور شہنشاہ ہسپانیہ کے فوٹو بھی امتیازی جگہ پائے ہوئے تھے۔ عیسائیوں کے اکثر مذہبی جلوس آگرہ اور لاہور کی سڑکوں پر، نہایت طمطراق سے نکلتے تھے۔ شہنشاہ اکثر سرکاری کاغذات پر وہ مہرِ شاہی ثبت کیا کرتا تھا جس پر حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی شبیہ کندہ تھی۔

۱۶۰۸ء میں کپتان ولیم ہاکنس کی آمد نے یسوعی فرقے کی سرگرم بازاری پر اولے گرا دیئے۔ ہاکنس نئی قائم شدہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا روح رواں تھا۔ شہنشاہ انگلستان جیمس اوّل کی جانب سے وہ دربارِ جہانگیری میں ایک خط بھی لایا تھا کہ دوسروں کے مانند اہلِ انگلستان کو بھی تجارتی مراعات بخشے جائیں۔ جہانگیر کے اوقاتِ شاہی میں ہاکنس کو جو آتنی مداخلت حاصل ہوئی، وہ ترکی زبان تھی۔ دونوں بغیر کسی مترجم کے، آپس میں گفتگو کر سکتے تھے۔

ہاکنس مرنجان مرنج طبیعت کا آدمی تھا، عہد الزبتھ کی تمام رنگینیاں اس میں سمٹ آئی تھیں، ادھر جہانگیر بھی پیر مغاں کی شریعت کے شیدا اور دختِ رز کی زلفوں کے شکار تھے، پھر کیا تھا دونوں میں خوب گاڑھی چھنی، ہاکنس کے اعزاز و مراتب کا پارہ چڑھنے لگا اور اُس نے دربارِ جہانگیری میں ایک بلند مسند حاصل کر لی۔ تیس ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ اور منصب چہار ہزاری کا تمغہ عطا کیا گیا۔ یسوعی پادریوں کو ہاکنس کا یہ اعزاز ایک آنکھ نہ بھایا، انھوں نے "بورانے کتے" کی طرح اُسے زخمی کرنے اور یہاں تک کہ زہر بھی دینے کی کوشش کی۔

۱۶۱۱ء میں ہاکنس نے وطن کی طرف مراجعت کی۔ دوسرے سال اہلِ پرتگال نے انگریزوں کی بیخ کنی کیلئے ذرائع اختیار کئے لیکن اُن کی مساعی مشکور نہیں ہوئیں۔

ہاکنس نے جہانگیر کی روز مرّہ معمولات پر روشنی ڈالی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں، لکھتا ہے :-

علی الصباح، شہنشاہ تسبیح لیکر رُخ بہ جانب قبلہ وظیفے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ عبادت کے لئے ایک خاموش نفیس کمرہ مخصوص ہے۔ شہنشاہ اسی میں محوِ عبادت ہوتے ہیں، ایک بالائی گوشہ پر حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی تصویر آویزاں ہے۔ شہنشاہ کے ہات میں آٹھ تسبیحیں ہوتی ہیں جن میں سے ہر تسبیح میں ۴۰۰ دانے ہوتے ہیں ایک وظیفے میں ۳۲۰۰ کلمے نطقِ شاہی سے ادا ہوتے ہیں۔ فارغ ہونے کے بعد درشن دینے کے لئے شہنشاہ جھروکے میں تشریف لاتے ہیں۔ ہر روز ہزاروں آدمی درشن کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر دو گھنٹے کے لئے خواب گاہ تشریف لے جاتے ہیں، دو گھنٹے سونے کے بعد دسترخوان شاہی چنا جاتا ہے اور شہنشاہ ناشتہ تناول فرماتے ہیں، اور دوپہر تک وقت عزیز حرم میں صرف کرتے ہیں۔ دوپہر کو پھر جلوت میں جلوہ گر ہوتے ہیں، تین بجے تک تفریح طبع، جانوروں کی کشتیاں اور مختلف کھیل کود کی تماشہ آرائیوں سے محظوظ ہوتے ہیں،

تین بجے کے قریب دربارِ شاہی منعقد ہوتا ہے، زعمائے حکومت اور امرائے سلطنت مجتمع ہوتے ہیں، شہنشاہ مسندِ شاہی پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور تمام اعیانِ سلطنت حسبِ مراتب صف آرا ہوتے ہیں، بہت مخصوص و ممتاز امراء ایک سرخ حد بندی کے اندر باقی باہر جگہ پاتے ہیں، یہ حد بندی دوسرے امراء کے مقابل تین قدم بلند تر ہوتی ہے، مجھے بھی اسی صف میں شرکت کا شرف بخشا گیا ہے۔ وسط میں ٹھیک شہنشاہ کے روبرو شاہی وکیل ایستادہ ہوتا ہے جس کے ساتھ افسرِ جلاد بھی ہوتا ہے، اس کے عقب میں چالیس جلاد مخصوص وضع کی ٹوپیاں پہنے ہوئے کھڑے رہتے ہیں، ان کے کاندھوں پر تبر اور ہاتھوں میں کوڑے ہوتے ہیں، حکمِ شاہی کے انتظار میں چاق و چوبند، مسلح کھڑے رہتے ہیں شہنشاہ تمام مقدمات غور سے سنتے ہیں اور دو گھنٹے روزانہ اس پر صرف کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ اپنے حجرۂ عبادت میں تشریف لے جاتے ہیں، عبادت سے فارغ ہونے کے بعد جام رقص میں آتا ہے، پانچ چھ قسم کا بھنا ہوا گوشت حاضر کیا جاتا ہے جس میں سے وہ ایک ٹکڑا چکھ لیتے ہیں، اور ایک بڑا دور بادۂ گلفام کا نوش فرماتے ہیں۔ اس کے بعد ایک پرائیویٹ کمرے میں قدم رنجہ ہوتے ہیں، جہاں حکمِ شاہی کے بغیر کوئی قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، اس کمرے میں وہ تین جام اور نوش کرتے ہیں، اس کے بعد افیون کی باری آتی ہے اور جب نشہ حدِ عروج پر پہونچ جاتا ہے محوِ خواب ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لوگ اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔"

ہاکنس کی داستان کے علاوہ سر طامس رو کی تحریر بھی، جہانگیر کے معمولات پر روشنی ڈالتی ہے۔ سر طامس رو ۱۶۱۵ سے ۱۶۱۹ عیسوی تک ہندوستان میں رہا، اس کی ڈائری اس عہد کی قیمتی تفسیر ہے۔ لکھتا ہے :-

"میں چار بجے شام کو دربارِ شاہی میں پہنچا جہاں ہر روز شہنشاہِ ہندوستان جلوہ افروز ہوتے ہیں، امورِ سلطنت کے مراحل طے پاتے ہیں، درخواستیں پیش ہوتی ہیں، محلِ شاہی کے حجروں میں کوئی مرد خدمت گزاری پر فائز نہیں ہوتا، خواجہ سراؤں کو خدمت پر مامور کیا جاتا ہے۔ کنیزانِ حرم، اندرونِ خانہ، چمن آرائی کے فرائض انجام دیتی ہیں اور [illegible] ہیں۔ ہر دن شہنشاہ جھروکے میں تشریف لاتے ہیں جہاں سے رعایا ان کا درشن کرتی ہے۔ دوپہر کو ہاتھیوں کی لڑائی اور دوسرے سامانِ تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں، سہ پہر کو دربار میں جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ شام کو آٹھ بجے کھانے کے بعد خوابگاہ تشریف لے جاتے ہیں۔

پرائیویٹ کمرے میں چیدہ اور نہایت ممتاز امراء ہی بار پا سکتے ہیں۔ شہنشاہ ان امراء سے تمام امورِ متعلقہ کے باب میں نہایت بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے گفتگو کرتے ہیں، اسوقت حکومت، صلح و جنگ اور دوسرے سیاسی امور پر کوئی بحث نہیں ہوتی یہ امور دربار میں طے کئے جاتے ہیں۔

شہنشاہ کے یہ روزمرہ معمولات ہیں، جنہیں بجز علالت کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، عوام کی محکومی نے شہنشاہ کو بھی ایک نوع سے پابند کر دیا ہے۔ رعایا اگر ایک دن بھی ان کے درشن سے محروم ہو جائے اور اس کی کوئی معقول وجہ نہ پیش کی جا سکے تو اغلب ہے غدر کی صورت پیدا ہو جائے۔ بروز سہ شنبہ وہ جھروکے میں عدل گستری کے لئے تشریف فرما ہوتے ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ اشخاص کی شکایات بھی بغور سنتے ہیں، میں دربار میں حاضر ہوا، دو امراء میری رہبری کر رہے تھے، میں نے پہلے ہی سے قبل اپنے ملک کے آداب ملحوظِ خاطر رکھنے کی اجازت مانگ لی تھی جو شہنشاہ نے بخوشی منظور کر لی۔ میں تین بار کورنش کیلئے خم ہوا۔ دربار نہایت عالی شان ہے، ہر قسم کے افراد وہاں نظر آتے ہیں، حسبِ مراتب چند حد بندیاں ہیں لیکن سب بلحاظ تعمیر ایسی ہیں کہ نزدیک و دور کا ہر شخص شہنشاہ کے دیدار سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔"

۱۶۱۱ء میں نور جہاں جن سے وہ ایک مدت سے والہانہ محبت رکھتے تھے، ان کے حلقۂ ازدواج میں داخل ہو گئی یہ عجیب و غریب ممتاز و مقتدر ملکہ ایک ایرانی مہاجر کی دختر نیک اختر تھی۔ عہد شہزادگی ہی میں جہانگیر کو ان سے تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا اکبر کو یہ رشتہ پسند نہ تھا اس لئے انہوں نے ایک امیر سلطنت علی قلی خاں موسوم بہ شیر افگن متعینہ نظامت بنگال کے ساتھ

رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔ تخت پر متمکن ہوتے ہی جہانگیر
کی حسرتِ دیرینہ بر آئی، شیر افگن مقتول ہوا، چار سال بعد وہ
حرم شاہی میں داخل ہوگئی۔ نور جہاں کی عمر بوقت عقدِ ثانی
چھتیس سال کی تھی اور مشرق میں اس عمر میں عورت کا حسن
زائل ہو جاتا ہے، لیکن نور جہاں مستثنیات میں تھی، چنانچہ وہ
حرم میں آتے ہی شہنشاہ کے دل و دماغ پر حاوی ہوگئی۔ اس
رشتے کے طفیل اعتماد الدولہ جن کی وہ دختر تھیں دربار میں نمایاں
حیثیت پر پہنچ گئے، ان کے بھائی آصف خاں نے بھی دربار میں
رسوخ حاصل کر لیا۔ پہلے شوہر کی بچی کا عقد شہنشاہ کے فرزند
شہزادۂ شہریار سے کر دیا گیا اور ملکہ کی بھتیجی جنہوں نے بعد میں
ممتاز جہاں کا لقب پایا شہزادہ خرم کے عقد میں آگئیں۔ ان
رشتوں سے ملکہ کی حیثیت ایک آہنی قلعہ بن گئی۔

ملکہ نور جہاں کی حکمرانی کا سکہ جہانگیر کے دل و دماغ پر
بیٹھا ہوا تھا، اس لئے ہندوستان پر صحیح معنوں میں ملکہ ہی حکمراں
تھی۔ انتظام سلطنت کی کشتی نور جہاں نے اس تفکر و تدبر سے
رواں کی کہ تاریخ کا تند سے تند دھارا بھی ملکہ کی شہرت و
عظمت کو زائل نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ زیر نقاب
جھروکے میں تشریف فرما ہوتی تھیں، عوام کی تکالیف کو ہمدردانہ
سنتیں اور ان کے مصائب کو دور کرنے کی ہر ممکن سعی کرتی تھیں۔
اپنی جیب سے کثیر رقم یتیم لڑکیوں کے جہیز پر صرف کرتی تھیں،
سکۂ رائج الوقت پر ان کا نام بھی ثبت تھا۔ ایک اعلیٰ شہسوار
ہونے کے علاوہ ملکہ کو شکار سے بھی بڑا شغف تھا۔ اس عہد کی
تصاویر میں وہ پولو بھی کھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں، ایک موقعہ پر
روایت ہے، بہ یک وقت چار شیر انھوں نے ہلاک کئے۔

ملکۂ نور جہاں کے اس اعزاز و اقتدار نے اکثر امراء
کے سینوں میں حسد کی آگ بھڑکا دی تھی، ان سب کا سرغنہ
مہابت خاں تھا، اس تصور ہی سے آگ بگولہ ہو جاتا تھا کہ
سلطنت کی باگ ڈور عورت کے ہات میں ہو۔ مہابت خاں نے
جہلم کے ساحل پر جب شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں خیمہ نشین
تھے دونوں کو قید کرنے کی بھی کوشش کی، لیکن ملکہ نے مردانہ وار
مقابلہ کیا، تیروں کی بارش بھی اس کے پائے استقلال میں
لغزش نہ پیدا کر سکی۔ اس کے بعد ملکہ نے وہ سخت اقدام اختیار کئے
کہ مہابت خاں کو راجپوتانہ میں پناہ لینا پڑی۔

عہد جہانگیری میں کوئی جنگی کارنامے قابلِ ذکر نہیں ہیں۔
جہانگیر ایک علم دوست مبصر تھا، علم و فن اس کے میدان تھے۔
میدانِ کارزار سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا، جنگی فتوحات کی اسے
مطلق اشتہا نہ تھی۔ شہزادۂ خرم نے میواڑ کے رانا کے خلاف جنگ
کا باب بند کر دیا، اکثر امراء اور سردار گرفتار ہوئے لیکن رانا کی
خواتین حرم میں نہیں داخل کی گئیں۔ کشمیر کی سرحد پر قلعہ کانگڑا فتح
ہو گیا لیکن جب شاہ ایران شاہ عباس نے قلعۂ قندھار کو فتح کیا
تو کوئی مداخلت نہیں کی گئی۔

جہانگیر دوسرے شہنشاہانِ مغلیہ کے مانند، اولاد کے معاملہ
میں خوش بخت نہیں تھا۔ شہزادۂ خسرو کے سوا سب کے سب
عیاش اور جنگجو تھے، امورِ سلطنت میں باپ کی حمایت کیا کرتے
خود آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں اور نور جہاں کے
خلاف سازش میں مصروف رہتے تھے۔

، نومبر ۱۶۲۷ء منحوس تاریخ تھی۔ اس دن شہنشاہ جہانگیر
نے آنکھیں بند کر لیں، نعش لاہور پہنچائی گئی اور ایک باغ میں
دفن کر دیا گیا۔ ملکہ نور جہاں نے ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا جہاں
وہ خود بھی آج محوِ خواب ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کیرکٹر کے اعتبار سے ایک پیچیدہ شخصیت
کے مالک تھے۔ ان کے مزاج میں انتہا پسندی کے عناصر نمایاں
تھے، ہر جذباتی آدمی ایسا ہی ہوتا ہے، بچوں اور حیوانوں سے
انھیں خاص انس تھا۔ ایک پوتے کی بیماری پر شکار سے توبہ کرلی
تھی۔ اگر اکبر حروف نا آشنا تھے تو پسر پدر اگر نتواند پسر تمام کند
کے مصداق جہانگیر علم و فضل کی ہر منزل عبور کئے ہوئے تھے۔
مرقع فارسی میں تزک جہانگیری منہ بولتی شہادت ہے۔ بابر کے
بعد اس میدان میں ان کا کوئی حریف شاہانِ مغلیہ میں نہیں ہے۔

جہانگیر کو مختلف انواع کے پھول جمع کرنے کا بھی بے حد
شوق تھا، کشمیر میں انھوں نے ایک مفصل فہرس ان کے متعلق
تیار کی تھی۔ چڑیوں کی نسل و تولید کے باب میں بھی متعدد
تجربے کئے تھے، علم کے شغف کا یہ حال تھا کہ اکثر عمل جراحی

...نوں کے شکار ہو چکے تھے، غضب یہ تھا کہ اطبا نے انھیں اسپرٹ اور دیسی شراب پر بھی آمادہ کر دیا تھا جو سخت مہلک دَور ہوتا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا، یہاں تک کہ پیالہ ان کی گرفت میں لینے سے بھی قاصر ہو گئے تھے، ملکہ نورجہاں کی توجہ سے اس میں کمی ضرور ہو گئی" لیکن شراب کے مہلک اثرات زائل نہیں ہوئے۔

اگرچہ وہ اپنے خاندان میں سب سے بڑا بادشاہ نہیں تھا، تاہم شہنشاہ جہانگیر کا نام ایک نہایت دلچسپ و پُرکشش شخصیت کا تصور ذہن میں قائم کرتا ہے۔

ہر نوع سے جہانگیر ایک ناقابل فراموش شہنشاہ ہے۔

سلامِ حُرّیت

(از سیدہ اختر صاحبہ)

بڑے بڑوں کا کبھی نشہ کر دیا تھا ہرن
کہاں گیا مرے ساقی وہ جوشِ عہدِ کہن

ہر ایک ذرّہ نہ کیوں تجھ پہ اب ہو خندہ زن
کبھی جو مہر تھا سب کہہ رہے ہیں اُسکو کرن

سُناؤں کس کو کہ تجھ میں وہ ذوق شوق نہیں
سکوت میں مرے پوشیدہ ہیں ہزار سخن

بتا! یہ مردِ مسلماں کی زندگی کیا ہے؟
نہ دل میں یادِ خدا ہے نہ لب پہ شورِ یزن

خزاں کا شکوہ نہ کر اپنی غفلتوں سے پوچھ
کہ خونِ دل سے بنایا تھا تو نے اپنا چمن

وطن پرست نہیں، آہ کوئی مست نہیں
برائے نام فقط رہ گئے ہیں اہلِ وطن

وہ قوم اپنی روایات جو بھلا بیٹھی!
اُٹھا لے اُسکو زمانے سے اے خدائے زمن

خدا کو بھول گئے۔ مصطفٰے کو بھول گئے
ہیں محوِ قبر پرستی مجاہدانِ وطن

اسی کا نام ہے اختر جو حُرّیت تو سلام
نہ آنکھ میں وہ تجلّی نہ چہرہ پہ وہ شکن

عہد شاہجہانی میں موسیقی اور دربار کے مغنی

(مصنفہ۔ صاحب زادہ محب الرحمٰن خاں)

عہد شاہجہانی (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء) میں دوسرے فنون لطیفہ کی طرح موسیقی کو بھی ترقی دی گئی۔ ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کے ملاپ سے ایک نئی موسیقی پیدا ہوئی۔ اس ایجاد کا آغاز اکبر اعظم کے عہد میں ہوا تھا اور شاہجہاں کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا جس کے نتیجہ میں ہندی اور ایرانی موسیقی کی انفرادیت ختم ہو گئی یہ بات قابل غور ہے کہ اکبر اعظم کے دربار میں تقریباً ایک درجن وہ غیر ملکی موسیقی داں تھے جو ہرات، مشہد اور خراسان کے دوسرے شہروں سے آئے تھے اور اپنے ملک کی طرز پر گاتے بجاتے تھے لیکن شاہجہاں کے دربار میں صرف دو ایرانی موسیقی داں تھے۔

شاہجہاں کے عہد میں فن موسیقی کے عروج کی وجہ ملک میں امن وامان اور بادشاہ وقت کا ذاتی ذوق تھا۔ شاہجہاں مذہب کا سختی سے پابند ہوتے ہوئے بھی دوسرے مسلمان حکمرانوں کی طرح موسیقی سے بہت دلچسپی رکھتا تھا اور درباری مورخ کے مطابق بادشاہ خود بھی اچھا مغنی تھا۔

بادشاہ امور مملکت سے فرصت پاکر عصر و مغرب کے درمیان موسیقی سے لطف اندوز ہوتا تھا اور رات کو آرام کرنے سے قبل گویّوں سے گانا سنتا تھا۔ روزآنہ کے پروگرام کے علاوہ درباری خوشیوں و تہواروں، تخت نشینی کی سالانہ تقریب پر، شادی و ولادت کی تقریبات پر، شہزادوں یا شہزادیوں کے صحتیاب ہونے پر اور عیدین پر رقص و سرود کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ ان تقریبات پر استادوں اور دوسرے اچھا گانیوالوں و بجانے والوں کو انعامات و خطابات سے سرفراز کیا جاتا تھا سنہ ۱۶۴۴ء میں شہزادی جہاں آرا کے صحتیاب ہونے کی خوشی میں شاہجہاں نے لال خاں گنسمندر کو دو ہزار روپیہ، رنگ خان کو ایک ہزار روپیہ اور دوسرے درباری مغنیوں کو بارہ ہزار روپیہ انعام میں تقسیم کئے تھے۔

اس زمانہ کی موسیقی اور موسیقی دانوں کے تفصیلی حالات فقیر اللہ کی "راگ داپرن" اور "منکوتہول" میں ملتے ہیں۔ فقیر اللہ کے مطابق اس زمانہ میں موسیقی کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا "اتم" (پہلا درجہ) "مدھم" (دوسرا درجہ) اور "نکشت" (تیسرا درجہ) "اتم" میں چار بڑے مغنی، آٹھ کم درجہ کے مغنی، بارہ خوبصورت عورتیں، چار بانسری بجانے والے اور چار امریتانگ (ایک ساز کا نام) بجانے والے ہوتے تھے۔ "مدھم" میں دو بڑے مغنی ہوتے تھے اور اس کے علاوہ باقی وہی لوگ ہوتے تھے جو "اتم" میں ہوتے تھے۔ "نکشت" میں ایک بڑا مغنی چار کم درجہ کے مغنی، چار خوبصورت عورتیں اور دو بانسری بجانے والے ہوتے تھے حرم میں "اتم" دو استاد عورتوں و دو دوسرے درجہ کی گانیوالی عورتوں، دو بانسری بجانے والیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ "مدھم" میں ایک استاد عورت اور چار بانسری بجانے والیاں اور "نکشت" میں ایک استاد عورت اور دو بانسری بجانے والی عورتیں شامل تھیں۔

"راگ داپرن" کا مصنف اکبر اعظم اور شاہجہاں کے درباری مغنیوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ دربار اکبری کے مغنی (مع تان سین کے) ان لوگوں کے سامنے عطائی دوا فروش تھے۔ ان کی علمیت "راگ ساگر" تک محدود تھی برخلاف اس کے شاہجہاں کے درباری مغنی کئی نئی طرزوں اور کئی نئے نغموں کے موجد تھے۔ اس زمانہ میں اکثر استاد نئی نئی طرزوں اور نئے نئے نغموں کے معلوم کرنے میں مصروف رہتے تھے اور اسی لئے سازوں و راگوں میں دلکشی اور سادگی بڑھ گئی تھی۔ جب شاہجہاں تخت نشین ہوا تو فن کار

دوسرے آکر دربار میں جمع ہو گئے۔ ان میں کے زیادہ تر لوگ گوالیار سے تعلق رکھتے تھے۔ دربار شاہجہانی کے تین گویوں اور سازندوں میں کسی فن کار عورت کا نام نہیں ملتا۔

صوفی مغنی :۔ دربار کے مغنیوں میں سب سے پہلا قابل ذکر نام شیخ بہاؤالدین کا ہے جن کا انتقال بہ عمر ایک سو سترہ برس شاہجہاں کی تخت نشینی کے دوسرے سال میں ہوا۔ وہ بارنوا، (دوآبہ کے ایک پرگنہ جھنجھنا کا ایک گاؤں) کے رہنے والے تھے اور ان کا تعلق وہاں کے صوفی خاندان سے تھا۔ شکار میں ایک حادثہ کے ظہور پذیر ہو جانے کی وجہ سے انھوں نے دنیا کو ترک کر دیا اور پچیس برس کی عمر میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنے وقت کے مشہور صوفیوں و سادھوؤں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فن موسیقی کا شوق انھیں دکن لے گیا اور انھوں نے دکن کے مشہور باکمالوں سے اس فن کی تعلیم حاصل کی اور وہاں پچاس برس کی عمر تک موسیقی کی تعلیم حاصل کرتے رہے، جب گھر کی یاد نے زیادہ ستایا تو جھنجھنا واپس آ گئے۔ وہ ہرے رنگ کا لباس پہنتے تھے اور تمام عمر مجرد رہے۔ "راگ درپن" میں لکھا ہے "فن موسیقی میں دکن بھی ان کا جواب نہیں رکھتا تھا، اور انھوں نے کئی عمدہ گیت دھرپد اور ترانے بنائے۔" وہ "امرت بین" بجانے میں ماہر تھے، اور ایک نیا ساز "خیال" کے نام سے ایجاد کیا تھا۔ ان کے دو شاگرد رشید اور اسد ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ جب وہ گاتے تو رشید بین بجاتے تھے۔

شیر محمد اس عہد کے دوسرے صوفی موسیقی داں تھے یہ شیخ بہاؤالدین کے شاگرد تھے۔ جب ان کے والد فوت ہو گئے تو وہ اپنے ایک رشتہ دار شیخ نصیرالدین کے پاس رہنے لگے لیکن شیخ موصوف کے انتقال کے بعد انھوں نے مجبوراً مسافرت کی زندگی اختیار کی۔ انھوں نے ایرانی موسیقی شیخ نصیرالدین سے سیکھی تھی۔ وہ سلطان حسن شاہ شرقی کی طرح بہت اچھے نہ نغمہ نواز تھے اور نہ ہی ان کے نغمے سنگیت کے قانون پر پورے اترتے تھے لیکن وہ گاتے وقت بہت اچھے نغمے پیدا کیا کرتے تھے جو لوگوں کو بہت پسند تھے۔ "ان نغموں کی صحیح تشریح کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔"

ایک صوفی موسیقی داں میاں دالو تھے جو شیر محمد کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ میاں دالو نے بالکل ترک دنیا نہیں کیا تھا۔ وہ "دھرپد" کے گانے اور ساز بجانے میں اپنے وقت کے استاد تھے۔ "راگ درپن" کا مصنف لکھتا ہے "دھرپد کے گانے اور ساز بجانے میں میں نے ان سے بہتر کسی دوسرے کا نام نہیں سنا۔" مصنف مذکور نے لکھا ہے کہ اس نے انھیں آگرہ میں دیکھا اور سنا ہے۔

دھرپد کے گویّے

دربار کا قابل ترین مغنی لال خاں کلونت تھا، جسے ۱۹ نومبر ۱۶۳۷ء کو شاہجہاں نے "گنسمودر" کا خطاب دیا تھا (ایرانی تاریخ میں گنسمند بحر علوم کے معنی میں آیا ہے) وہ تان سین کے بیٹے بلاس خاں کا داماد تھا۔ اس نے موسیقی کی تعلیم تان سین سے حاصل کی تھی۔ شاگردی کے ہی زمانہ میں تان سین اس کی قابلیت سے مرعوب ہو گیا تھا اور اسی اثر کی وجہ سے تان سین نے اپنی پوتی کی شادی اس کے ساتھ کر دی تھی۔ دھرپد کے گویوں میں اس کا کوئی ہمسر نہیں تھا "بادشاہ نامہ" میں اکثر جگہ لال خاں کا ذکر آیا ہے اور اسے دربار کا استاد اعظم بتایا ہے۔ شاہجہاں نے اپنے درباری مغنیوں میں سب سے زیادہ انعامات اسی کو دیئے تھے۔ تخت نشینی کی دوسری سالگرہ پر اس کو ایک ہاتھی انعام میں ملا تھا۔ سنہ ۱۰۵۳ھ (مطابق ۱۶۴۵ء و ۱۶۴۶ء) کے نئے سال پر وہ ان درباریوں میں تھا جنھیں سب سے زیادہ انعامات ملے تھے۔ تخت نشینی کی دسویں سالگرہ (۱۶۳۸ء) پر اسے چار ہزار روپیہ انعام میں ملے۔ اس کے علاوہ دوسرے موقعوں پر بھی کثیر رقمیں پائیں۔ اس نے کئی گیت بادشاہ کی مدح میں بنائے۔ وہ اسّی یا نوّے برس کی عمر میں فوت ہوا۔

دربار کا سب سے قابل گیت بنانے والا جگناتھ مہاکبی رائے تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تان سین کے بعد اس سے زیادہ قابل گیت بنانے والا گویا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ وہ چند دھرپد بنا کر تان سین کے پاس لایا۔ اس نے انھیں دیکھ کر کہا "اگر یہ زندہ رہا تو اس فن میں میرے بعد اسی کا درجہ ہو گا۔" اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دکن میں گذارا۔ گن سین کا نام بھی دھرپد کے

گانے والوں میں قابل ذکر ہے۔ اس کو "تانک افضل" کا خطاب ملا تھا۔ وہ تانک بہار و کا شاگرد تھا۔ اپنے ہمعصروں میں فن موسیقی میں بلند درجہ رکھتا تھا۔

رانگ خان کلونت بھی "دھرپد" کا استاد تھا۔ دربار میں لال خاں کلونت کے بعد مغنیوں میں سب سے زیادہ انعامات اسی کو ملے تھے۔ وہ ان فن کاروں میں تھا جو جہانگیر کا دربار دیکھے ہوئے تھے اور اس سے فیض پائے ہوئے تھے۔ دربار کے استادوں میں خوشحال خاں بھی تھا جو لال خاں کا بیٹا تھا۔ سنہ ۱۶۵۵ء میں باپ کے مرنے کے بعد بادشاہ نے اس کو گنسمودر کا خطاب دیا تھا۔ ان کے علاوہ "راگ درپن" کے مصنف نے دوسرے مغنیوں کے نام بھی لکھے ہیں۔

دھرداس کلونت جو آواز کے خراب ہو جانے کی وجہ سے آگرہ چلا گیا تھا، اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔ ہرسین اور اس کا بیٹا سوبل سین جس کے دانت چالیس برس کی عمر میں ٹوٹ گئے اور اس وجہ سے اس نے گانا چھوڑ دیا تھا، شہزادہ شجاع بادشاہ سے اجازت لیکر دو مغنیوں کو اپنے ساتھ بنگال لے گیا تھا۔ مسری خاں جو بلاس خاں کا شاگرد تھا اس کی وفات بہار میں ہوئی۔ دوسرا گنتا جس نے بنگال میں وفات پائی۔

قوال دربار شاہجہانی کے قوال روضہ خاں اور کبیر خاں تھے آخرالذکر شیر محمد کا شاگرد تھا۔ دربار میں صرف دو ایرانی مغنی تھے۔ محمد باقی مغل جو آخر عمر میں افیون کی زیادتی کی وجہ سے گانے کے قابل نہیں رہا تھا اور میر محمد جو خود بھی الیاں بنایا کرتا تھا۔ وہ ہرات کے سید خاندان سے تھا اور اس کا باپ ہرات سے ہندوستان آیا تھا۔

خیال کے گویئے اس وقت تک "خیال" موسیقی کے ایک راگ کے طور پر مقبول نہیں ہوا تھا اور اس میں بہت کم ترقی ہوئی تھی۔ وہ دھرپد کے مقابلہ میں کم درجہ کا سمجھا جاتا تھا۔ اس کی عام مقبولیت محمد شاہ کے عہد میں ہوئی دربار شاہجہانی میں خیال کے گانے والوں کے صرف دو نام ملتے ہیں۔ راجہ ایرسنگھ اور راجہ رام شاہ۔ آخرالذکر امیر خسرو اور سلطان حسن شاہ شرقی کی طرز کا ماہر تھا۔ رام شاہ نے کئی

جاتے ہیں۔ "خیال اور ترانے بنائے تھے۔ (اپنی کتاب کے آخر میں) فقیر اللہ لکھتا ہے "اگر دربار کے سب مغنیوں کا فرداً فرداً ذکر کیا جائے تو طوالت بہت ہو جائے گی"۔

اس زمانہ کی تاریخ موسیقی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ :۔

(۱) سب سے زیادہ مقبولیت دھرپد کے راگ کو تھی اور اسے فن موسیقی میں سب سے بلند درجہ ملا ہوا تھا۔

(۲) خیال کی ترقی اور مقبولیت بہت محدود تھی۔ حالاں کہ موسیقی کے ایک راگ کے طور پر اس کا ذکر امیر خسرو اور سلطان حسن شاہ شرقی کے زمانے کی کتابوں میں ملتا ہے۔

(۳) صوفی صرف گانا سن کر ہی محظوظ نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں سے اکثر خود بھی بہت اچھے مغنی ہوتے تھے۔

(۴) موسیقی اور اچھے مغنیوں کے لئے دکن کی وہی شہرت تھی جو اسے امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۵ء) کے زمانہ میں حاصل تھی۔

(۵) شمالی ہند کی موسیقی کا مرکز گوالیار تھا۔ اس نے جیسے ماہر مغنی اکبر اعظم کو دیئے تھے ایسے ہی استاد شاہجہاں کو بھی دیئے۔

(۶) موسیقی میں نئی نئی طرزیں اور نئے نئے نغمے ایجاد کئے گئے تھے اور کئی نئے ساز بھی وجود میں آئے تھے۔

(۷) ایرانی موسیقی کے صرف دو موسیقی والوں کا دربار میں ہونا بتاتا ہے کہ ہندوستانی و ایرانی فنون کی جدوجہد فیصلہ کن سطح پر پہنچ گئی تھی۔

وہ دن بھول گئے

(جناب (آنسہ) خاتون جہاں بیگم صاحبہ)

نوری اور مجید نے جب ہوش سنبھالا اپنے آپ کو اسی طرح آم کے درختوں کے نیچے کھیلتے ہوئے پایا۔ مجید کے باپ حمید نے خاں صاحب کے باغ کی نگرانی کرتے ہوئے اپنی پوری جوانی ختم کر ڈالی تھی۔ اور اسی نے بڑھاپے میں مجید نے باپ کی جگہ سنبھالی نوری حمید کی چہیتی اور مرحوم بہن کی لڑکی تھی۔ بیوی کے مرنے کے بعد حمید کی زندگی مجید نوری اور خاں صاحب کے باغ تک محدود ہو گئی تھی۔

مجید دن بھر باغ کی دیکھ بھال کرتا۔ کیاریاں بناتا۔ پودوں میں پانی دیتا نوری گھر کی دیکھ بھال کرتی۔ صبح اٹھتے ہی اپنے چھوٹے سے مکان میں جھاڑو دیتی صفائی کرتی کھانا پکاتی۔ بارہ بجے حمید کو کھانا کھلا کر مجید کے لئے کھانا لے جاتی۔ مجید کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھکر کھانا کھاتا کچھ دیر تک نوری سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ اور کچھ دیر آرام کرکے پھر کام میں مشغول ہو جاتا۔ اور نوری گھر لوٹ کر رات کے لئے کھانا پکاتی اور رات کا کھانا تینوں ساتھ ملکر ہی کھاتے اور اسی طرح ان لوگوں کے دن اطمینان اور سکون میں بسر ہو رہے تھے۔ انکی زندگی میں دُکھ اور درد کا شائبہ کم تھا۔

نوری اور مجید آپس میں بیحد محبت کرتے تھے۔ ایک لمحہ کی جدائی بھی انھیں ناگوار تھی۔ مگر وہ کام کے لمحات کو خاموشی اور صبر سے گذارتے تھے اور رات کو جب حمید خواب راحت کے مزے لیتا تو دونوں چپکے سے اٹھکر گھر سے باہر آ جاتے۔ چاندنی راتوں میں وہ لوگ خاں صاحب کے باغ میں چلے جاتے کبھی کبھی وہ خاموشی سے روشوں پر ٹہلتے رہتے کبھی فوارے کے پاس بیٹھ جاتے اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔ باغ کا کونا کونا انکی محبت کا گواہ تھا۔ تاروں کی چھاؤں میں چاندنی راتوں میں وہ دونوں ایکدوسرے سے اپنے دل کا حال کہتے نگاہوں کا خاموش پیغام سناتے وہ لوگ بڑی بیچینی سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب خاں صاحب مجید کی تنخواہ میں اضافہ کریں گے اور انکا باپ ہمیشہ کے لئے انھیں بیاہ کی زنجیر میں باندھ دے گا۔

مجید کا قد لمبا اور جسم سڈول تھا۔ ہاتھ پاؤں مضبوط اور تندرست تھے کالے کالے بال جو اکثر کام میں منہمک ہونے کی وجہ سے اُلجھے پڑے رہتے تھے گیہوں سے سبزی آنکھیں گندمی رنگ۔ چہرے پر دلکشی اور شرافت کے ایسے آثار پائے جاتے کہ دیکھنے والا حیران ہوتا کہ وہ صرف ایک غریب مالی کا لڑکا ہے۔ اس کی فطرت میں صفائی بہت تھی اس لئے عام طور پر کپڑے بھی صاف ہی پہنتا تھا مزاج میں بہت سنجیدگی اور ذہانت تھی۔ بچپن میں تھوڑا بہت پڑھ بھی لیا تھا۔ مجید میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اسکو قدرت نے گلا بہت اچھا دیا تھا اس کی رسیلی آواز سنکر فضا سرشار ہو جاتی گیت کے بادل برسنے لگتے۔ چاندنی راتوں میں جب وہ کوئی رسیلی تان چھیڑ دیتا نوری بیخود ہو کر اس کے کشادہ سینے پر اپنا سر رکھدیتی تو ان دونوں کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی بہت میٹھا سپنا دیکھ رہے ہوں یا جیسے جنت میں پہونچ گئے ہوں۔

نوری کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں جھیل میں پڑے ہوئے دو کنول کی طرح جن میں معصومیت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہو نشیلی آنکھیں نرم سنہرے لمبے لمبے بال نور میں ڈوبا ہوا رنگ اسکا چہرا اتنا دلکش اور بھولا تھا کہ دیکھنے والا ایک لمحے کے لئے ضرور مبہوت ہو جاتا۔ یہ دونوں بچے کیچڑ میں پڑے ہوئے دو چمکدار ہیروں کی طرح تھے دنیا سے الگ۔ حمید کو ان دونوں کے ساتھ بے اندازہ محبت تھی۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت رہی اس نے ان دونوں کو کبھی کام نہ کرنے دیا اسکا ارادہ تھا کہ مجید کو مقامی اسکول میں داخل کرا دے۔ اس کا خیال تھا کہ مڈل پاس کرنے کے بعد مجید کو کوئی بہتر ملازمت ملجائے گی لیکن حمید کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ بڑھاپے اور بیماری نے مل جل کر حمید کو اتنا بے بس اور مجبور کر دیا کہ مجید کو اسکا کام سنبھالنا پڑا۔

خاں صاحب کی یہ کوٹھی شہر سے تھوڑی دور ایک نہر کے کنارے بنی ہوئی تھی یہاں اکثر وہ اپنے بچوں کے ساتھ تفریح کے لئے آتے تھے۔ خاں صاحب کے دو بچے تھے بڑا لڑکا اسلم ایم اے میں پڑھتا تھا اور اس سے دو برس چھوٹی لڑکی ریحانہ بی اے میں۔ دونوں بہن بھائی جوان تھے خوبصورت تھے بلند اخلاق تھے اسی لئے سوسائٹی کی آنکھ کا تارا تھے اسلم۔ ریحانہ اور انکے دوستوں نے ملکر ایک ڈرامیٹک سوسائٹی بنائی تھی۔ اسلم کے لکھے ہوئے ڈرامہ کھیلے جاتے ریحانہ ہیروئن کا پارٹ ادا کرتی۔ لیکن ہیرو کا انتخاب کرتے وقت انھیں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

کیونکہ جو لڑکے انکی پارٹی میں شامل تھے ان میں سے کوئی ہیرو بننے کے لیے موزوں نہ تھا کسی کو گانا نہیں آتا تھا کسی کی شکل خراب تھی تو کوئی اداکاری کے جوہر سے ناآشنا تھا یہ پارٹی سیر و تفریح کی بہت ہی شوقین تھی۔ امتحان دینے کے بعد شہر سے قریب ایک ہفتہ کے لئے جانے کا پروگرام بنا۔ کسی نے کہا "جگہ ایسی ہونی چاہیئے جہاں خوبصورت مناظر ہوں۔ ٹھہرنے کا معقول انتظام ہو" اور طے پایا کہ خاں صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرا جائے۔ جو نہر سے قریب تھی۔ ایک طرف تھوڑی سی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں ایک طرف پھلوں اور پھولوں کے جھکتے ہوئے تختے اور کوٹھی کا باغ اسقدر خوشنما تھا کہ جو دیکھتا محوِ حیرت رہ جاتا۔ جب سے باغ کی دیکھ بھال کا انتظام مجید نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا باغ کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے تھے۔

نوکر کو ایکدن پہلے بھیجکر اطلاع کردی گئی۔ مجید اور نوری نے ملکر دن بھر مکان کو خوب صاف کیا۔ مجید نے باغ کی نئے سرے سے صفائی کی۔ روشیں خوبصورتی سے ٹھیک کیں رنگ برنگ پھولوں کے پودوں میں پانی ڈالا۔ غرضکہ مجید اور نوری نے ملکر کوٹھی اور اس کے باغ کو آراستہ کرکے جنت کا نمونہ بنا دیا۔

دوسرے دن صبح مجید اور نوری جلدی سے اُٹھے ایکدفعہ پھر سب چیزوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ ہر چیز کی دیکھ بھال کرکے دونوں باغ میں آ گئے۔ نوری پھول توڑ توڑ کر گلدستے اور ہار بنانے لگی اور مجید کیاریوں کی طرف مشغول ہو گیا۔

صبح کا وقت تھا گرمیوں کے دن تھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی پھولوں کی عطر بیز خوشبو نے فضا کو مست کر دیا تھا موسم خوشگوار اور دلکش تھا۔ مجید آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔ نوری نے مسکرا کر کہا "ذرا زور سے گاؤ نا" اور مجید نے ایک سُریلا اور دلکش گیت گانا شروع کر دیا اور گاتے گاتے اتنا مدہوش ہو گیا کہ اسے پتہ تک نہ چلا کہ نوری کب گجرے تیار کرکے وہاں سے چلی گئی۔

مجید اسی طرح گانے میں محو تھا کہ کسی کے ہلکے ہلکے قہقہوں کی آواز سے چونک پڑا۔ اس نے دیکھا قریب ہی رنگ برنگی چمکدار ساڑیوں میں ملبوس کچھ لڑکیاں اور بہترین قسم کے کپڑوں سے آراستہ چند لڑکے کھڑے ہوئے شوق سے اسکا گانا سن رہے تھے۔ وہ گھبرا کر خاموش ہو گیا۔ ندامت کی وجہ سے اسکا سر جھک گیا اور وہ پاؤں کے ناخن سے زمین کریدنے لگا۔ اسلم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "بہت اچھا گاتے ہو تم! شاید اس سے پہلے کبھی ٹھیک یاد نہیں"

مجید:- جی سرکار! میں مالی ہوں یہاں کا۔"

اسلم:- کوئی نیا مالی رکھا گیا ہے! وہ بڈھا مالی جیب کہاں ہے؟ تمہارا کیا نام ہے؟

مجید:- حضور مجید اور وہ میرا باپ ہے بیماری کی وجہ سے اس نے کام چھوڑ دیا میں ہی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ سرکار بہت دنوں سے تشریف نہیں لائے اس لئے مجھے نہیں جانتے۔

اسلم: ہاں شاید یہ ہی بات ہو۔

ریحانہ:- تم گاتے تو بڑا اچھا ہو کس سے سیکھا تم نے؟

مجید:- (شرماکر) سرکار کسی سے نہیں یونہی تھوڑا سا . . .

مجید رعب کی وجہ سے جملہ ختم نہ کر سکا۔ اسلم نے مجید سے موٹر سے سامان اُتارنے کو کہا اور سب لوگ اندر چلے گئے۔

مجید اور دوسرے نوکروں نے جلدی جلدی سامان قاعدہ سے رکھوایا اور پھر ناشتے کا انتظام کرنے لگے۔ مجید باغ میں جاکر کام میں مشغول ہو گیا۔

ناشتہ پر سب لوگوں میں یہ ہی تذکرہ تھا کہ مجید کتنا اچھا گاتا ہے اور شکل بھی اس کی کتنی اچھی ہے۔ ریحانہ کے دماغ میں ایک دم خیال نے کروٹ لی "اگر مجید ہمارے ساتھ شہر چلے اور ہمارے ڈراموں میں پارٹ کرے تو کتنا اچھا ہو" کچھ لوگوں نے اس خیال کی تائید کی اور کچھ نے مخالفت کرتے ہوئے کہا "وہ جاہل مالی بھلا ایکٹنگ کیا کر سکتا ہے" ریحانہ نے کہا "سکھانے سے کیا نہیں آ جاتا گانا تو آتا ہی ہے شکل بھی اچھی ہے ایکٹنگ سکھائیں گے" اس مسئلہ پر سب نے غور کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر سیر گاہ میں مشغول ہو گئے۔

دن بھر اس پارٹی کے لوگ سیر و تفریح میں مشغول رہے کچھ لوگ پیڑوں میں جھولا ڈالکر جھولنے لگے کچھ نے نہر میں کشتی کی سیر کو ترجیح دی۔ لیکن ریحانہ ان سب باتوں سے بے پرواہ کچھ کھوئی کھوئی سی کمرے میں ایک کتاب لیے بیٹھی رہی اس کی نگاہیں کتاب پر تھیں ہونٹ حرکت کر رہے تھے مگر نہ سمجھ رہی تھی اور نہ ہی اسکا دل لگ رہا تھا اس کے دل و دماغ میں یہ ہی گونج رہا تھا "مجید کتنا اچھا ہے کتنا اچھا گاتا ہے" "کاش وہ ہمارے ساتھ رہ کر ہم لوگوں میں ملنا پسند کرے" اور اسی لئے اس نے اور لوگوں کے سنجیدگی سے اس بارے میں غور کرنے سے پہلے مجید سے پوچھنا مناسب

کما اسکا خیال تھا کہ سب لوگ تیار ہو ہی جائیں گے اور اگر نہ ہوئے تو ہم ان کو اپنی سوسائٹی میں شامل نہیں کریں گے لیکن اگر مجید تیار نہ ہوا تو وہ اپنے بڈھے اور بیمار باپ کو کس پر چھوڑ جائے گا۔ ریحانہ کے نزدیک مجید کو راضی کرنا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔

تین چار دن گذر گئے ہر شخص تفریح میں مشغول تھا صرف ریحانہ ہی کھوئی کھوئی رہتی تھی اور ایک دن اپنی وحشت کے زیر اثر رات کو جبکہ سب لوگ نہر میں چاندنی رات کا لطف اٹھانے کشتی کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔ ریحانہ مجید کے پاس پہنچ گئی۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے حمید سو چکا تھا۔ مجید اور نوری اپنے گھر کے سامنے چبوترے پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ ریحانہ کی شان کے خلاف تھا کہ وہ نوکروں کے گھروں کی طرف جائے لیکن اس کے شوق نے اسکو یہ سوچنے کا موقعہ نہ دیا اور جب ریحانہ وہاں پہونچی تو اس نے دیکھا۔ مجید بیٹھا تھا اور اس کی گود میں سر رکھے نوری لیٹی ہوئی تھی وہ دونوں کسی گہرے خیال میں محو تھے ان کو ریحانہ کے آنے کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی اور ریحانہ یہ منظر دیکھ کر چپکے سے اُلٹے پاؤں واپس ہو گئی۔ وہ ایک بیجان لاش کی طرح چلتی ہوئی گھر آئی اور پلنگ پر گر پڑی نہ معلوم کیوں اسکو یہ سب دیکھکر بہت دُکھ ہوا۔ اسکو ایسا محسوس ہوا جیسے اس سے کوئی چیز چھین لی گئی ہو۔ تمام رات وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کی روح کی گہرائیوں میں ایک ٹیس سی تحلیل ہو گئی تھی۔ بار بار وہی منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا اور وہ دھک سے ہو کر رہ جاتی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ نیند کی آغوش میں پہونچ گئی۔

صبح جب ریحانہ بیدار ہوئی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ سورج کی کرنیں درختوں کی چوٹیوں سے اُتر چکی تھیں۔ اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا اور آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں اس نے دیکھا سب کے بستر خالی پڑے ہوئے تھے وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی نوکر کو آواز دیکر غسل کے لئے پانی تیار کرنے کو کہا اور خود کمرے میں چلی گئی۔

مجید میز کے پاس کھڑا ہوا گلدان میں پھول لگا رہا تھا اس کی شکل دیکھکر ریحانہ سب کچھ بھول کر اسی کو دیکھتی رہی۔ اور جب یہ پھول لگا کر واپس جانے لگا تو ریحانہ نے اسکو بلایا۔ ریحانہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی "کہو تم اس زندگی سے خوش ہو؟" مجید اسکا مطلب نہ سمجھا اور حیرانی سے اسکا منہ تکنے لگا۔ ریحانہ نے پھر کہا "مطلب یہ کہ تمکو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

مجید:۔ (آہستہ سے) جی نہیں! آپ لوگوں کی مہربانی سے سب ٹھیک ہے۔

ریحانہ:۔ تم کو شہر جانے کا شوق نہیں ہے؟

مجید:۔ (شرما کر) جی ہے کیوں نہیں۔

ریحانہ:۔ تو کبھی جاتے نہیں؟

مجید:۔ نہیں سرکار فرصت ہی نہیں ملتی۔

ریحانہ:۔ اچھا اگر میں لے چلوں تو چلوگے؟

مجید:۔ (شکریہ کے انداز میں) مہربانی ہے سرکار کی۔

ریحانہ:۔ اچھا جب میں واپس جاؤنگی تو تم کو اپنے ساتھ لیجاؤنگی تم اپنا سامان تیار کر لو۔

مجید:۔ سرکار کی مہربانی۔ ہم غریبوں کا سامان ہی کیا ہے۔

ریحانہ:۔ اچھا یہ بتاؤ تمکو پڑھنے لکھنے سے شوق ہے؟

مجید:۔ جی سرکار بہت ہے۔ مگر مقدر میں نہیں تھا اسلئے چھوڑنا پڑا۔

ریحانہ کو یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی اور اس نے کہا "میں شہر میں تم کو پڑھوا بھی دونگی۔"

مجید:۔ لیکن سرکار پھر یہاں کا کام کون کرے گا؟

ریحانہ:۔ اس کی تم فکر نہ کرو یہاں دوسرا آدمی آجائے گا۔

مجید:۔ لیکن سرکار میں اپنے بیمار اور بوڑھے باپ کو....

ریحانہ:۔ (بات کاٹ کر) تمھارے گھر میں ایک لڑکی بھی تو ہے۔ کون ہے وہ؟

مجید:۔ نوری۔

ریحانہ:۔ بس وہی تمھارے باپ کی دیکھ بھال کریا کرے گی۔ وہ تمھاری کون ہے؟

مجید:۔ (شرما کر) منگیتر۔

ریحانہ ایکدم چونک پڑی اور مجید کے جانے کے بعد اس کو یہی آواز سنائی دے رہی تھی منگیتر! منگیتر!! منگیتر!!!

مگر ریحانہ نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور ایک دن جبکہ سب لوگ اکٹھا تھے اس نے پھر اس مسئلہ کو چھیڑ دیا۔ بہت کچھ بحث و تکرار کے بعد وہ سب لوگوں کو راضی کرنے پر کامیاب ہو گئی۔ یہ طے ہوا کہ اسکو پڑھنے کے لئے ایک بورڈر رکھا جائے گا۔ اسلم اسکو ہر قسم کی تہذیب [illegible]

باتیں سکھانے گا اور وہ خود اسکو مختلف قسم کے ڈانس ... سکھایا کرے گی۔ اس طرح ریحانہ نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی خوشی پوری کرنے کے لئے دوسروں کی خوشی کو قربان کرکے ایک دیہاتی کو مہذب انسان بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ سب باتیں طے کرکے جب ریحانہ نے مجید سے ملنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور وجہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ "میں نوری کو رنجیدہ کرکے نہیں جا سکتا۔"

ریحانہ۔ لیکن کیا تمہاری خود خواہش جانے کی نہیں ہے؟

مجید۔ مگر میں نوری کی خوشی پر اپنی ہر خوشی قربان کر سکتا ہوں۔

اور جب ریحانہ کسی طرح بھی اسکو تیار نہ کر سکی تو اس نے نوری کو بلا کر اس سے کہا "نوری! کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہاری وجہ سے مجید ہمیشہ غریب آدمی رہے؟ دیکھو اگر مجید ہمارے ساتھ شہر چلا جائے تو میں اسکو پڑھواؤں گی پھر وہ پڑھ لکھکر امیر آدمی ہو جائے گا۔ عیش و عشرت میں زندگی گذارے گا کیا تم اسکو خوش و خرم دیکھنا نہیں چاہتیں۔

نوری:۔ لیکن شہر جا کر وہ مجھے بھول جائے گا۔

ریحانہ:۔ نہیں وہ تم کو کبھی نہیں بھول سکتا تم اس سے کہدو کہ وہ شہر چلا جائے۔

اور جب نوری کی خواہش پر مجید شہر جانے لگا تو نوری سسک سسک کر رو رہی تھی مجید نے قسم کھا کر وعدہ کیا کہ وہ اسکو کبھی نہیں بھولے گا اور شہر سے اکثر اس سے ملنے آتا رہے گا اور پھر جب وہ نوکر ہو جائے گا تو نوری اور باپ کو ساتھ لیجائے گا۔ پھر نوری سے شادی کرے گا۔ اور عیش و عشرت میں زندگی گذار دے گا۔

شہر جا کر ریحانہ ہمہ تن مجید کو انسان بنانے میں مشغول ہو گئی۔ ایک ماسٹر کا انتظام کیا گیا۔ اس کے لئے نئے نئے ڈیزائین کے کپڑے سلوائے گئے اور ریحانہ خود اسکو ہر بات سکھانے میں ہمہ تن مصروف رہتی۔ اگرچہ خان صاحب کو یہ بات کچھ پسند نہ آئی۔ مگر بیٹی کی خواہش پوری کرنے کے لئے وہ خاموش ہو گئے۔

ریحانہ نے مجید کو کچھ اس طرح اُلجھائے رکھا کہ وہ ایکدفعہ بھی نوری سے ملنے نہ جا سکا اس کا تمام دن بہت مصروفیت میں گذرتا لیکن رات کو جب وہ بستر پر لیٹتا تو اسے نوری بے طرح یاد آتی۔ لیکن پھر نئے ہنگاموں میں رفتہ رفتہ نوری کا خیال کم ہونے لگا اور وہ ہمہ تن پڑھائی میں مصروف

ہو گیا۔ اور ایک ہی سال میں اس نے اس قدر ترقی کر لی ... کی کہ سب لوگ حیران ہو گئے۔ مختلف قسم کے ساز اسے بڑی خوبی سے آ گئے۔ اور وہ ذرا سی ... سوسائٹی میں ... کر لیا گیا۔ اس شہری مجید اور دیہاتی مجید میں کتنا فرق تھا۔ دیکھنے والے کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ مجید ہے۔ اور خود مجید اپنی اس کامیابی پر پھولا نہ سماتا تھا وہ ریحانہ اور اپنے ان سب دوستوں کا جنھوں نے اس کی مدد کی تھی ... تھا۔ اور ریحانہ کے اشاروں پر تو وہ کٹھ پتلی کی طرح ناچتا تھا۔ ریحانہ کامیابی پر دل ہی دل میں پھولی نہ سماتی تھی جیسے اس کو کائنات کی دولت مل گئی ہو۔ سب سے زیادہ خوشی اس کو اس بات کی تھی کہ ... کے دل سے نوری کی یاد بالکل محو کرا چکی تھی۔

اور نوری: اس کے دن رات کس کرب و بے چینی میں گذرتے تھے ... ہی جانتا تھا وہ تمام دن اور رات اس کی یاد میں روتی رہتی۔ ہر آہٹ ... مجید کے آنے کا مژدہ دیتی مگر مضمحل۔ مایوسیوں ناکامیوں نے ... شکستہ دل اور چور چور کر دیا تھا۔ ہر وقت روتے رہنے سے ... آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے ان کی چمک دھیمی ہو گئی ... رنگ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ جیسے وہ مدقوق ہو اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی مجید نے بھی بیٹے کے غم ... گھل گھل کر جان دیدی اور اب نوری اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔ چاروں طرف مایوسیوں اور ناکامیوں کے بادل گھرے ہوئے تھے ... اور پریشانیاں اژدہے کی طرح منہ پھاڑے اسکو کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔

جدائی کی اور زیادہ تاب نہ لا کر وہ لوگوں سے پتہ پوچھتی پوچھتی خان ... صاحب کے مکان پر پہنچ گئی۔

وہ ایک خوشگوار دن تھا۔ خان بہادر صاحب کا مکان دلہن کی طرح آراستہ تھا۔ مہمان آ جا رہے تھے۔ کیونکہ ان کی چہیتی بیٹی کی ... کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ خان بہادر صاحب اگرچہ بالکل اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ انکے ہی ٹکڑوں پر پلے ہوئے انسان سے انکی ... شادی ہو مگر انھوں نے ریحانہ کو جس محبت اور ناز و نعم سے پالا ... اسکو دیکھتے ہوئے انھیں بیٹی کی خواہش قربان کر دینی پڑی۔ اور پھر ... میں کیا برائی تھی۔ خوبصورت۔ شریف۔ ذہین اور لائق نوجوان تھا ... جس وقت نوری خان بہادر صاحب کے گھر پہونچی تو یہ شا...

حرکت دیکھکر دنگ رہ گئی۔ ایک نوکر سے پوچھنے پر جب اسکو معلوم ہوا کہ ریحانہ کی منگنی مجید سے ہو رہی ہے تو وہ چکرا کر گر پڑی۔ نوکر نے از راہ ہمدردی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے اور جب اس کو ہوش آگیا تو بھوکا سمجھکر اس کو روٹی اور تھوڑی سی مٹھائی کھانے کو لادی۔ نوری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور جب نوکر نے وجہ پوچھی تو اس نے صرف اتنا کہا "تمھاری بڑی مہربانی ہوگی اگر تم ریحانہ بہن سے کہو کہ نوری آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" نوکر پہلے تو راضی نہ ہوا مگر نوری کی بے انتہا خوشامد پر اس نے ریحانہ کو خبر کردی۔ ریحانہ چونک پڑی مگر اس نے اپنی چالاکی سے مجید کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی اور چپکے سے اپنے کمرے میں آئی اور نوری کو بلوایا۔

نوری کو دیکھکر ریحانہ نے پوچھا "کیا چاہتی ہو؟" نوری نے اپنی پرنم آنکھیں اٹھاتے ہوئے کہا "اپنا شوہر جس پر تم قبضہ کر بیٹھی ہو!" اور ریحانہ نے نوری کے رخسار پر ایک چانٹا رسید کیا۔

نوری حیران اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسکو دیکھتی رہ گئی۔ ریحانہ کو جلدی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے نوری سے معافی مانگتے ہوئے کہا "میں غصہ میں تمھیں مار بیٹھی ہوں۔ ۔ ۔ ۔" نوری بات کاٹتے ہوئے بولی "تمہارا حق ہے بہن اب میں تم سے کچھ نہ کہوں گی۔ تم بڑی آدمی ہو۔ میں غریب بے یار و مددگار تمھارا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہوں میں کسی سے گلا بھی نہیں کرتی۔ میرے مجید کی آنکھیں روپیہ کی چمک میں چندھیا گئیں اب وہ راجہ ہو گئے ہیں مجھ دکھیاری کو کیوں پوچھنے لگے۔ وہ بڑے آدمی ہیں۔ میں دیہاتی ہوں غریب ہوں ان کو خود میری ضرورت نہیں ہے۔ میں مجید کی راہ میں کانٹا نہیں بننا چاہتی میں خود انکی راہ سے ہٹ جاؤنگی۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں ہمیشہ سکھی رہو۔ خدا تم لوگوں کو خوب پروان چڑھائے۔

ریحانہ مبہوت ہو کر سنتی رہ گئی اور نوری مضمحل شکستہ خاطر ایک طرف کو چلی گئی۔ معلوم نہیں کہاں۔ کہیں دور سے ریکارڈ بج رہا تھا۔

"اب راجہ بھئے مورے بالم وہ دن بھول گئے"

ذوقِ طلب

(اشعر ملیح آبادی)

مذاقِ جستجوئے دوست کامل ہوتا جاتا ہے
کہ اب دل ہی چراغِ راہ منزل ہوتا جاتا ہے

یہ کیسا انقلابِ رنگ محفل ہوتا جاتا ہے
چراغِ صبح جیسے خود مرا دل ہوتا جاتا ہے

امیدیں ٹوٹتی جاتی ہیں ارماں مٹتے جاتے ہیں
مرتب خود بخود افسانۂ دل ہوتا جاتا ہے

ذرا اے ناخدا طوفاں سے بھی کھیل لینے دے
سفینہ کیوں مرا نزدیکِ ساحل ہوتا جاتا ہے

زہے افسردگیٔ غم خوشا اندازِ مایوسی
یہ عالم ہے کہ اب احساس مشکل ہوتا جاتا ہے

طرب واماندگیٔ راہ کا شکوہ نہیں مجھکو
مرا ذوقِ طلب خود خضرِ منزل ہوتا جاتا ہے

افسانہ

ہمیں کہانی سناؤ

(جناب محمد امین صاحب شرقپوری)

یہ ایک عجیب ملک کی کہانی ہے ــــ !

آبادی کے لحاظ سے شاید ہی کوئی دوسرا ملک اس کا مقابلہ کر سکے گا کیونکہ لوگ محلات میں بھی رہتے ہیں اور بلند پختہ مکانوں میں بھی آباد ہیں کچے مکانات کی بھی کمی نہیں بڑا حصہ جھونپڑیوں میں بھی پناہ گزیں ہے، اور اس سے زیادہ تعداد میں ایسے مکانات اور جھونپڑے آباد ہیں جو چھت اور فرش کی زحمت سے بے نیاز ہیں، دروازوں اور کھڑکیوں کا بھی جھگڑا نہیں، ایسے مکانوں میں رہنے کے لئے صرف پھٹے پرانے چیتھڑوں کی ضرورت پڑتی ہے جو بچھونے کا کام دیتے ہیں اور اوڑھنے کا بھی، قدرت ان کے لئے ہوا اور گرمی کا خود بندوبست کرتی ہے، ایسے وسیع مگر مختصر مکانات میں کروٹوں سے اوٹ اور دیواروں کا کام لیا جاتا ہے، کیونکہ پورا کنبہ قطار کی صورت میں سوتا ہے، اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی کپڑا سردی کے بچاؤ کے لیے سب کو کافی ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے گرم سانسوں سے بھی انھیں راحت ملتی ہے۔ ٹانگیں سکیڑ کر جب چھاتی سے لگا لیتے ہیں تو انھیں کافی اور بیڑی کی گرمی محسوس ہوتی ہے جن سے ان کے تھکے ماندے جسموں میں حرارت دوڑ جاتی ہے، اور جب ان کی آنکھ کھلتی ہے تو بالکل تازہ دم ہوتے ہیں، ان کا اثاثہ چند پھٹے کپڑے، ایلومینیم کے ٹیڑھے میڑھے برتن، پانی کے مٹکے، پیلے ایک انبار کی صورت میں ان کے سرہانے پڑے رہتے ہیں۔ رات بھر کی دھول مٹی میں اٹے ہوئے اثاثے مختلف رنگوں میں ملتے ہیں۔ بعض اوقات انھیں خود بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ پانی پینے کا برتن ہے یا کھانا کھانے کا، ایسے قیمتی سامان کے چوری جانے کا انھیں ہر وقت خطرہ ہوتا ہے اس لئے سوتی جوتی اس کی نگہبانی پر مامور ہیں جو دم ہلا کر، کان کھڑے کئے اپنا فرض بجا لاتے ہیں، خورد و نوش کے عالم میں بہت محتاط واقع ہوئے ہیں، جو ٹکڑا بچتا ہے اسے برتن میں رکھے جاتے ہیں یہ ٹکڑے شدت کی بھوک کے وقت فرسٹ ایڈ کا کام دیتے ہیں اس طرح وہ بھوکوں مرنے سے بچ جاتے ہیں، طبعی موت کو ٹالتے رہتے ہیں!

حالانکہ ان کے جسم انھیں بیماریوں کا شکار ہونے کی پہلی ہی نظر میں انھیں موت کا پہلا شکار قرار دے دیگا، مگر ان کے باوجود وہ زندہ رہتے ہیں، یہاں تک کہ کئی بچوں کے باپ بن جاتے ہیں ان کے چیتھڑوں کی طرح جن میں بچے دن رات آبادی بڑھانے میں مشغول رہتے ہیں، کھانسی اور بخار تو ان کے لئے معمولی بیماریاں ہیں، آٹھوں پہر پیٹ رہنا بھی کچھ خطرناک نہیں سمجھا جاتا، دراصل ان کے جسم کی ساخت میں فولاد کو گہرا دخل ہے ورنہ ایک معمولی انسان کا طویل مدت تک زندہ رہنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے جو حیاتین کے معاملہ میں کورا ہو اور کبھی بھول کر بھی اس کے ذہن میں نہ آیا ہو کہ زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں کیا کھانا چاہئے اور کیسا لباس پہننا چاہئے، کسب معاش کے لئے انہیں کچھ زیادہ پریشانیوں کا سامان نہیں کرنا پڑتا مکانات میں رہنے والے ان سب کے کفیل ہیں، چلتے پھرتے مکانوں کے یہ باسی گدھے اور خچر بھی پالتے ہیں اکثر ان کو بڑا کاندھوں پہ لئے پھرتے ہیں، یہ مستقل مزاج لوگ جب اینٹ پتھر کے مکانوں کے رہنے والوں کی غیر مستقل مزاجی کا شکار ہوتے ہیں تو اس وقت ان کی مشاورتی کمیٹی انھیں ہجرت کے حکم دیتی ہے، جس کا مطلب ہے وہ دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں اس طرح اوقات کے اندر آگے آپ جانتے ہیں زمین گول ہے ــــ !

ان سے ذرا اونچا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں رہتا ہے یہ آفات کے عموماً شکار ہوتے رہتے ہیں کیونکہ طوفانی ہوا اور مسلسل دھار بارش سے چھتیں اور دیواریں خطرے کی گھنٹیاں بجاتی رہتی ہیں، آگ بھی اکثر اوقات ایٹم بم کا کام دیتی ہے، اور اگر بدقسمتی سے قرب و جوار میں کہیں ندی یا دریا بہتا ہے تو آٹھوں پہر ان کا خون خشک رہتا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں جو آنے والے خطرے سے انھیں قبل از وقت ہوشیار کر دے، اس کے باوجود وہ اپنے پاس کافی اثاثہ رکھتے ہیں، کھانے پینے کے برتن باسن، سونے کے لئے کھٹولے، ٹین اور لکڑی کے صندوق جن میں خوشی کے موقعہ پر پہننے کے لئے کپڑے، چاندی کے چند زیور، وہ جس طرح خطرے کو بھانپ لینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں اسی طرح شادی بیاہ یا تیوہار کا انتظار بھی انھیں بے چینی سے ہوتا ہے، بچے، جوان، بڑھے، لڑکیاں، عورتیں یکساں حصہ لیتی ہیں، کیونکہ اس روز انھیں مٹھائی کھانے کا موقعہ ملتا ہے، وہ کپڑے پہننے کا اتفاق ہوتا ہے جو ایک تیوہار جانے کے بعد آئندہ خوشی کے دن کے

انتظار میں صندوق میں بند کر دئے جاتے ہیں، ان میں سے اکثر کھیتی باڑی کرتے ہیں، یا اسی قسم کی اور مشقت جس سے پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بہتا رہتا ہے، انھیں جانوروں سے بہت محبت ہوتی ہے کیونکہ ان کی گذر اوقات کا بوجھ انھی پر ہوتا ہے، جانوروں میں رہنے سہنے سے ان کی عادات میں بدتمیزی پائی جاتی ہے جو جہالت کا دوسرا نام ہے، مگر وہ انسانی ہمدردی سے بھرپور ہیں، دکھ سکھ پر سب سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں، بالکل حیوانوں کی طرح جو دن بھر چرنے کے بعد شام کو ٹوٹے پھوٹے دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے ملتے ہیں یا اکثر گرمیوں کی دوپہر کو کسی پیڑ کے نیچے جگالی کرتے ہوئے سستاتے ہیں، پڑھنے لکھنے کا نام ان کے لیے نیا ہے، صدیاں گذر گئی ہیں مگر انھیں یہ پتہ نہیں ہو سکا کہ آخر یہ کس چڑیا کا نام ہے، گنا چنا لباس پہنتے ہیں جس کی صفائی پر کبھی کبھار توجہ دی جاتی ہے کیونکہ لباس سے ان کا منشا تن ڈھکنا ہے نمائش یا اُجلے پن کا مظاہرہ نہیں، اور کبھی کوئی بھولے بھٹکے اجلے کپڑوں والا وہاں پہنچ جاتا ہے تو وہ اس کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں، آنے والا اندرونی طور پر ان سے گھن محسوس کرتا ہے مگر ظاہراً خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے، وہ معمولی پڑھا لکھا بھی ہوتا ہے۔ لوگ اس کے قلم اور دوات سے بہت گھبراتے ہیں، اس کی اُلٹی سیدھی لکیروں سے انھیں زندگی خطرے میں محسوس ہوتی ہے، اس لئے ان سب کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ راحت پہنچائی جائے تاکہ یہ اُجلی آفت مبنی خوشی ٹل جائے، آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ تن اُجلا اور من میلا بگلا بھگت انسان وہاں سے مالامال ہو کر لوٹتا ہے اور اس کی اپنی بستی میں پکے پکے باقاعدہ مکان بھی نظر پڑتے ہیں، جہاں چند بچوں کی تعلیم کے ابتدائی سامان بھی ملتے ہیں، جو بچے ماں باپ کا شرارتوں سے ناطقہ بند کر دیتے ہیں اور کھیت یا دکان پر کام کرنے سے جی چراتے ہیں وہ ان درسگاہوں میں ڈھکیل دئے جاتے ہیں، ماسٹر موٹا سا ڈنڈا لیے دن بھر سر پر کھڑا رہتا ہے، کیونکہ ان میں سے ایک آدھ اگر بھاگ کر گھر چلا گیا تو پاداش میں وہ ایک وقت کے کھانے سے محروم رہے گا، اور یہ سزا اس کے لئے بہت بڑی ہے کیونکہ اس کی خوراک اور رہائش کا انتظام گاؤں والوں کے ذمہ ہوتا ہے، ان حالات میں اس کے فرائض کیا کیا ہو سکتے ہیں آپ سمجھ سکتے ہیں، ان لوگوں کی زندگی بھی جھونپڑوں میں رہنے والوں کی سی ہے۔ چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں میں تاریکی چھائی رہتی ہے جسے رات کو مٹی کا ٹمٹماتا ہوا دیا توڑنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔

انھیں بارش اور دریا کا اسقدر خوف نہیں ہوتا کیونکہ ان کے مکان قدرے مضبوط ہوتے ہیں جہاں ان آفات کے اثرات آسانی سے داخل نہیں ہو سکتے، مگر ارضی آفات کیڑے مکوڑوں کی طرح انھیں گھیرے رہتی ہیں، باقاعدہ مکان بنا کر رہنے کی صورت میں ان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، غلہ گھر پہنچنے سے پہلے ہی پہلے غائب ہو جاتا ہے، اور یہ خون پسینہ بہا کر غلہ پیدا کرنے والے گھٹیا اناج پر شکم پروری کرتے ہیں، ان کے پاس غلہ ڈھونے کے لئے لکڑی کی بنی ہوئی گاڑیاں ہیں جنھیں بیل کھینچتے ہیں، بنیا جس سے وہ ہر قسم کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں شان سے گاڑی میں بیٹھ کر راتوں رات انھیں کوچ کا حکم دیتا ہے، یہ تھکے ہارے بھری ہوئی گاڑیاں لئے بیل ہانکتے، ہنستے گاتے، سورج نکلنے سے پہلے پہلے شہر پہنچ جاتے ہیں، ان کی گاڑھی کمائی آنکھوں کے سامنے مول تول کے مراحل سے گذرتی ہوئی بوریوں میں بند ہو جاتی ہے، بنیا رقم جیب میں ڈال کر واپسی کا اعلان کرتا ہے، کچے پکے راستوں میں چرچراتی ہوئی گاڑیاں ٹھکانوں پر پہنچ جاتی ہیں، عورتیں جن کا کمائی میں برابر کا ساجھا ہوتا ہے خلاف توقع مردوں کے ہاتھوں میں چند ٹکے پا کر انکے منہ تکتی ہیں، کیونکہ پیسے کی اہمیت کا انھیں کسی نہ کسی طرح علم ہو چکا ہے، وہ جانتی ہیں کہ اس کے بغیر ان کی لڑکیاں کنواری بیٹھی رہیں گی۔ لڑکے الغوزے بجا کر جوانی کا راگ الاپتے رہیں گے۔ تیج تیوہار کی خوشیاں یوں ہی بیت جائیں گی، مردوں کو گنگ پا کر ان کی آنکھیں بھر جاتی ہیں، بدن میں رعشہ سا اُتر آتا ہے، ان جفاکش عورتوں کی ہمت قابل تعریف ہوتی ہے، روکھی سوکھی اور موٹا جھوٹا کھانے اور پہننے والی یہ عورتیں بہت تندرست ہوتی ہیں، کھالنی بنجار وہاں جاتے ہوئے گھبراتا ہے، انھیں مغموم پا کر مردوں کا دل شکستہ نہیں ہوتا انھیں اگلی فصل کا لالچ دیتے ہیں سبز باغ دکھاتے ہیں وہ ان پڑھ جاہل، خوبصورت تندرست عورتیں ان کی باتوں میں آجاتی ہیں، خدا پر انھیں بھروسہ ہے، اس لیے وہ مایوسی کے دریا میں ڈوبتی ہیں اور پھر ابھرتی ہیں اسی طرح سال گذر رہے ہیں، صدیاں ہو چکی ہیں نہ مردوں کی آس ٹوٹتی ہے نہ عورتیں فراش ہوتی ہیں بالکل ان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی مانند جو بارش کی امید پر جھومتے رہتے ہیں، گھٹا اٹھتی ہے اُٹھ کر برس جاتی ہے۔ ہر سال ہر فصل پر ان کی نظریں نیلی چھتری کو تکتی رہتی ہیں ان کے خیال کے مطابق ان کا خدا انھیں مایوس نہیں کرتا کبھی شروع فصل میں اور کبھی عین ایسے موقعہ پر جب ان کی امید کے ٹمٹے

فرشتے سمجھتے ہیں جو سب سے گھٹا کر ان کی پیاس بجھا دیتی ہے، ان کا خیال ہے کہ انسان کی روزی خدا کے ہاتھ ہے اس لئے انتہائی مصیبت میں بھی وہ اُس سے آس لگاتے رہتے ہیں، آس اور یاس اُن کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں، کیسے ہوں، کسی حال میں ہوں، وہ اپنے عقیدے پر قایم ہیں، سیلاب آتے ہیں، قحط پڑتے ہیں، وہ مقابلہ کرتے ہیں، ہر حال میں قانع ہیں، ایک کی کمائی سے سینکڑوں کے پیٹ پل رہے ہیں، انھیں اپنا غم نہیں، کنوارا کسی کنواری کے پیچھے نہیں بھاگتا، وہاں اغوا کی وارداتیں نہیں ہوتیں، بیوہ شوہر کی یاد میں جوانی بتادیتی ہے، شادی بیاہ کے معاملات اُن کے بزرگوں کے ہاتھ میں ہیں، وہاں طلاقوں کے لئے عدالتوں کے دروازے نہیں کھٹکھٹائے جاتے۔ ایسے نجی معاملات خود طے کر لیتے ہیں، دراصل ان کی سادگی نے انھیں کبھی موقع ہی نہیں دیا کہ وہ فرصت کے لمحات میں کبھی یہ سوچ بھی سکیں کہ زندگی جفاکشی سے ہٹ کر بھی کسی چیز کا نام ہو سکتا ہے۔

اور یہ بلند و بالا عمارتوں کی آبادیاں جہاں علم و ہنر کے چرچے ہیں لوگ شب و روز کمانے کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں جب کبھی اس قسم کے واقعات کی بھنک اُن کے کان میں پڑتی ہے وہ تعجب کا اظہار کرتے ہیں اَن ہونی باتوں پر، اگرچہ اُن کی کمائی کا بڑا حصہ ان پختہ مکانوں میں کھپتا ہے، جن کے مکیں موٹروں میں گھومتے ہیں، طرح طرح کے لباس پہنتے ہیں، روپیہ جہاں مشینوں میں ڈھلتا ہے اور شہروں ہی میں بٹ کر رہ جاتا ہے، بھوک کی چیخ و پکار بھی ان ہی بلندیوں سے سُنی جاتی ہے، روز بڑی تعداد میں لوگ مرتے ہیں اور پیدا ہوتے ہیں، تعمیر کے مرکز بھی یہاں ملتے ہیں، اور تہذیب کے کھنڈر بھی، خلقت کا بہتا ہوا دریا ہے جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہہ رہا ہے ... ن اور خطرے کے پیغام دن رات کانوں کے پردے پھاڑتے رہتے ہیں، مندروں میں گھنٹیاں بجتی ہیں، مسجدوں کے میناروں سے اللہ اکبر کی صدا گونجتی ہے، کلیسا کے گھنٹے عبادت کی دعوت دیتے ہیں، انصاف کے لئے عدالتیں کھلی ہیں، جا بجا درسگاہیں ہیں، انسان کو نئے نئے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے، روحانی اور جسمانی کوفت کو دور کرنے کے سامان مہیا ہیں، یہاں زندگی بالکل نئی شکل و صورت میں ملتی ہے، خوشحالی اور آسودہ زندگی گذارنے کے لئے نئے نئے ڈھنگ نکالتے ہیں ترقی یافتہ ممالک کی نقالی کرتے ہیں بیشتر پڑھے لکھے مغربی رہن سہن کے گرویدہ ہیں، صاف ستھرے مکانوں میں رہتے ہیں دو قدم بھی موٹر میں چل کر جاتے ہیں، مگر یہاں بھی بڑی آبادی کا اکثر حصہ مفلس ہے، دولت مندوں کا رعب ہے ان پر رات دن ان کی خدمت اور خوشامد میں لگے رہتے ہیں کیونکہ یہ امیر لوگ اگر خفا ہو جاتے ہیں تو انھیں جان کے لالے پڑ جاتے ہیں ان کے عالیشان مکانوں کی پاسداری کرتے ہیں ان کے جان و مال کی حفاظت پر مامور ہیں، بردہ فروشی کا دور مدتوں ہوئیں گذر چکا ہے مگر معمولی تنخواہ کے عوض ان لوگوں کی حالت اب بھی بردہ فروشی کی سی ہے جو ہر وقت مالک کے حکم پر چلنے کے لئے کمربستہ ہیں، مالک آدھی رات کو گھر لوٹے گا تو یہ دروازے پر چوکسی کرتے ہوئے ملیں گے۔

مغرب کی عنایت سے ایسی آبادیوں میں لوہے کی مشینیں موجود ہیں۔ جن سے زندگی کی ضروریات سائینٹفک اصول پر تیار کی جاتی ہیں، ان پر کام کرنے والے وہی فاقہ مست لوگ ہیں جو دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھتے، اصلی اور حقیقی خوراک سے محروم ہیں اس لئے بیماریوں کا شکار رہتے ہیں، ان کے علاج کے لئے جا بجا اسپتال کھلے ہوئے ہیں جہاں یہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیتے ہیں، کچھ عرصہ سے وہاں ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جو سرمایہ داروں کے ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں مگر وہ جوں ہی سر اٹھاتے ہیں انھیں کچل کر رکھ دیا جاتا ہے، کیونکہ مظلوموں کی بغاوت انھیں پسند نہیں۔ انھیں مالی نقصان پہنچتا ہے علاوہ ازیں وہ اس بدعت کو تقویت نہیں دینا چاہتے، ان کی امارت کے لئے یہ لوگ مستقل خطرہ ہیں، دانہ و دام سے انھیں بس میں لانے کی کوشش میں رہتے ہیں، ان سب کا غل مچا کر مقررہ مزدوری سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے سعی کرنا دوسرے لفظوں میں امیر بننے کی خاموش کوششیں ہیں، سائبانوں اور چبوتروں پر سونے کے بجائے یہ مکانات چاہتے ہیں، اچھی خوراک اور پوشاک چاہتے ہیں، ہم جنسوں کی دیکھا دیکھی موٹروں میں گھومنے پھرنے کی آرزو رکھتے ہیں، ان کے دماغ سٹھیا گئے ہیں یہ دیوانوں ہی کی سی باتیں ہیں، غریب پیدا ہونا اور بیماریوں کا شکار بن کر قبل از وقت دنیا سے رخصت ہو جانا ان کے پچھلے کرموں کا پھل ہے جسے وہ بھوگ رہے ہیں انھوں نے ہر جیون میں برے کرم کئے ہیں اس لئے انسان کا روپ دھارنے کے بعد انھیں سکھ اور آسائش کی زندگی گذارنے کا کیا حق ہے، محنت مشقت سے پیٹ پالتے ہیں، بوجھ ڈھوتے ہیں، باربرداری میں انھیں عار نہیں کیونکہ روزی کمانے کے لئے ذرائع درکار ہیں، سرمایہ داران کی بے بسی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں انھیں بے حس کرنے کے لئے نت نئے کچوکے دیتے رہتے ہیں یہ سخت جان

تکالیف سہتے ہیں، نیم شکم زندہ رہنے پر مجبور ہیں، پیٹ بھرنے کی فکر میں مبتلا ہیں، ٹھیلے کھینچتے ہیں، رکشا میں لوگوں کو بٹھاتے ہیں، شاید بیل گھوڑے کا کام ہے اس لیے یہ حیوان نما انسان گردن پر جُوا رکھے ہوئے بازاروں میں اکثر آپ کو ملیں گے۔ ان کے چہروں پر مردنی چھائی رہتی ہے گرمی ہو یا سردی پسینے میں شرابور رہتے ہیں۔ انسانی تہذیب ان کی صورت سے بیزار ہے۔ جب انھوں نے خود یہ جامہ اتار دیا تو تہذیب کو ساتھ دینے کی کیا ضرورت ہے؟

انہی لوگوں کی ایک دوسری جماعت ہے جو بظاہر اجلی نظر آتی ہے تعلیم یافتہ بھی ہے دفاتر میں آپ ان کے نمونے دیکھ سکتے ہیں۔ میزوں پر جھکے رہتے ہیں ڈاکٹر چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ صحت کے اصولوں کی پابندی کی جائے مگر یہ کولھو کے بیل پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں، بینائی کو بحال رکھنے کے لیے انھیں چشمے دئے گئے ہیں زندہ رہنے کے لیے کئی ایک مراعات حاصل ہیں مگر نہ جانے ان کے چہروں پر زردی کیوں چھائی رہتی ہے۔ افسروں کے پاس چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ پنکھوں اور روشنی کے نیچے بٹھائے جاتے ہیں، پھٹی ہوئی دیواروں پر پلاسٹر کیے جاتے ہیں یہ دیکھنے میں کافی مضبوط ہوتی ہیں ان کڑیوں کو سنبھالے ہوئے ہیں جن پر کئی ٹن بوجھ رکھا ہوا ہے، جن کے سہارے کئی منزلیں کھڑی ہیں مگر آندھی طوفان اور زلزلوں کو روکنا ان کے بس کا نہیں، اُن کی تعمیر میں کوئی ایسا عنصر نہیں ملے گا جسے طوفان پر صرف کہہ سکیں یہ سفید پوش مزدوران ننگے دھڑنگے بھائیوں سے کسی صورت کم نہیں جو آقاؤں کے زرخرید ہیں، جن کی انسانی حسوں کو کچلنے کے لیے نت نئی چالیں چلی جاتی ہیں، اور کمی گھاتیں تلاش کی جاتی ہیں مگر یہ لوگ نہ جانے کیوں خود کو انسان سمجھنے پر مجبور ہیں، روز بروز انسان بننے کی سعی میں مبتلا ہیں، شکم چین کے طلبگار ہیں، ان کا مرض ناقابلِ علاج حد تک پہنچ گیا ہے اور یہ محلات میں پائل پیار کر آنند کے تار بجانے والوں کی زندگی سے تو آپ واقف ہی ہوں گے، میں ان سازوں کو چھیڑ کر وہ راگنیاں پیدا نہیں کرنا چاہتا جس سے آپ پر وجدانی کیفیت طاری ہو جائے، اگرچہ آپ کا گرد و پیش ان راحتوں سے آراستہ پیراستہ ہے جو محلات میں رہنے والوں کو میسر ہیں، معلوم ہوتا ہے آپ سنتے سنتے تھک گئے ہیں اور غالباً یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گئے ہیں کہ تمدن کے اس دور میں ایسا کونسا ملک ہو سکتا ہے میں آپ کی بے چینی ختم کیے دیتا ہوں یہ وہی ملک ہے جہاں آج کل آپ مقیم ہیں ——! اور یہ کہانی بھی تو ردی ہو چکی ہے بے ربط سی نہ اس میں کوئی چاشنی ہے اور نہ رنگینی!!

محسوساتِ ماہر

از جناب ماہر القادری

(آل انڈیا مشاعرہ بمبئی (۱۹ اپریل ۱۹۴۶ء) کی طرحی غزل)

محبت ہی کو ہم کونین کا حاصل سمجھتے ہیں
نہ ہم ہیں حال سے واقف نہ مستقبل سمجھتے ہیں

نظر کی چوٹ جو احساسِ غم بن کر ابھر آئے
اسے ہم درد کہتے ہیں اسی کو دل سمجھتے ہیں

جہاں اُن کے تصور کے سوا کوئی نہیں ہوتا
ہم اُس عالم کو بھی ہنگامۂ محفل سمجھتے ہیں

مری جانب کبھی بھولے سے بھی نظریں نہیں اُٹھتیں
وہ مجھ کو التفاتِ خاص کے قابل سمجھتے ہیں

کبھی لطف و کرم کرنا کبھی بیگانہ بن جانا
ترے بدلے ہوئے تیور مزاجِ دل سمجھتے ہیں

محبت میں خیال و فکر بھی اپنے نہیں رہتے
وہ قاتل ہیں مگر ہم اُن کو جان و دل سمجھتے ہیں

وہی پہلی نظر جس کو غلط انداز ہونا تھا
اسی کو آج تک ہم یادگارِ دل سمجھتے ہیں

یہی احساس تو آوارگی کی جان ہے ماہر
کہ ہم اک اک قدم کو جانبِ منزل سمجھتے ہیں

نئے ادب کا کیرکٹر

(شہاب ملیح آبادی)
جوائنٹ اڈیٹر ادیب

نئے ہندوستانی ادیب و شعراء کے متعلق علامہ اقبال مرحوم کی رائے تھی کہ ان بیچاروں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ کچھ ادیبوں کو یہ بات پسند آئی۔ انہوں نے اس سے انکار کیا کہ ہمارے ادب پر عورت اتنی حاوی ہے، کچھ لوگوں نے اسے تسلیم کیا اور اس کی اپنے حسب منشاء تاویلیں بھی کیں۔

جدید ادب میں اور بالخصوص ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے طفیل دلچسپ مباحث چھڑ گئے ہیں۔ قدیم ادب کے پجاری اپنا راگ الاپ رہے ہیں اور جدید ادب کے پرستار اپنی دھن میں ہیں۔ حامیانِ ادبِ قدیم کی نظر میں جدید ادب محض فحش نگاری اور عریانی کی داستان ہے۔ بندگانِ ادبِ جدید کی نگاہ میں ادبِ قدیم محض لاشوں کا افسانہ! اوّل اوّل بحث کا غبار ایک علمی جہت سے اٹھا ————

ادب کی معنوی حیثیت و قیمت کیا ہے؟ آیا وہ حلقۂ تنگ ہے جہاں ادب کا مقصدِ اوّل و آخر صرف ادب ہی ہے یا وہ ایک کھلا میدان ہے جہاں ادب زندگی کا آئینہ دار ہے؟ ایک صف کے علمبردار 'ادب برائے ادب' کا پرچم لہرا رہے ہیں تو دوسری صف کے مجاہدین 'ادب برائے زندگی' کا جھنڈا اونچا کر رہے ہیں۔

ادب کا مقصدِ اوّل بعض ادیبوں کی نظر میں صرف تفریحِ طبع ہے۔ انسان دن بھر کا تھکا ہارا ادب سے صرف یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ عملی زندگی کی ناکامیوں اور نامرادیوں پر ایک دبیز نقاب ڈالکر اسے خیالی جنت کی سیر کرائے۔ "ہائے ہائے" کرنیوالی زندگی کچھ دیر کے لئے ماحول سے بلند ہوکر کانوں کے ذریعہ فردوس کا شہد پی سکے۔ اس خیال کے مخالف ادیب، اسے ذہنی فرار کہتے ہیں اور اس کے حامیوں کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے کوئی "آقا" کام چور خادموں کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ تاریخ سے ثابت کرتے ہیں کہ ہر زمانے کا ادب اس زمانہ کی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور جب ادب عکس ہوتا ہے زندگی کا تو کیوں ادب کو زندگی کی جدوجہد کا مردِ میدان نہ بنایا جائے۔ زندگی کے تلخ حقائق کا مردانہ وار مقابلے کی قوت پیدا کی جائے اور جب قوتِ ارادہ زندگی کا رہنما ہوگا، وہ حقیقت پرست ادیب ہی پیدا کرے گا۔ ایسے نزاعی امور پر غور کرنے میں ہم ایسے پنچیوں کی پوزیشن بڑی ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ ہمارا ایک ہاتھ قدامت پرستوں کی ریشِ سفید میں پڑا ہوتا ہے اور سعادت مندی سے انھیں نئے زاویۂ نگاہ کے روشن پہلو دکھاکر رام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارا ہاتھ منچلے جوانوں کی ٹھوڑی میں ہوتا ہے کہ میاں ابھی جوان ہو، خون میں گرمی زیادہ ہے۔ جذبات کی رو میں نہ بہو۔ بڑے بوڑھوں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے ہیں۔ اس میانہ روی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ترقی پسندر وں میں ہمیں "ری ایکشنری" سمجھنے لگتے ہیں اور بڑے بوڑھوں کی نظر میں ہم "فتنہ" کا لقب پا لیتے ہیں۔

اسے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ادب کے چشم و ابرو اور خط و خال ضرور ایسے ہوں جو تفریحِ طبع کی لذت کو پورا کرسکیں بلکہ ہم یہاں تک کہیں گے کہ اچھا ادب ایسے خط و خال کا ہوتا ہی ہے کہ منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ ایسی محفلوں میں مجھے شرکت کا موقع ملا ہے جہاں غیور حساس شعراء نے قحطِ بنگال ایسے دردناک موضوع پر اپنے اشعار سنائے۔ اچھے اشعار اور اچھے شعرائے کلام کا خیر مقدم ہمیشہ لفظ 'واہ' سے کیا گیا۔ لفظِ 'واہ' جس نفسانی محرک کا اظہار کرتا ہے، ظاہر ہے۔ انسانی فطرت کو کیا کیا جائے اسے اکثر آنسوؤں میں بھی لذت ملتی ہے۔

میرے اس اشارے سے مقصود یہ ہے کہ نئے ادب کے کیرکٹر میں خندہ پیشانی بھی ہونا چاہیئے کہ دیکھنے والوں کے دل باغ باغ ہوجائیں۔ تندرستی ہزار نعمت ہے، خندہ پیشانی تندرست و صحت مند دل و دماغ کی علامت ہے۔ نحیف و بیمار چڑچڑے ہوتے ہیں، صرف ادیب ہی کو نہیں ادب کو بھی خندہ جبیں اور تندرست آثار ہونا چاہیئے۔ یہ غلط خیال ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق ادب میں چڑچڑاپن پیدا کردیتے ہیں۔ اچھا ادیب، سچا ادیب، آتشِ نمرود میں گلزارِ خلیلی کی شان پیدا کردیتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ادب کو بند پانی کی طرح رکا ہوا نہ ہونا چاہیئے

فنون و ادب کا تعلق ہے انسان کے جذبات سے جس طرح سائنس کا سرچشمہ اسکی عقلِ صالح ہے۔ احساسات میں تنوع اور وسعت ہے انسان کی زندگی کا بیشتر حصہ جذبات میں صرف ہوتا ہو، زندگی کے گوناگوں اوقات و حوادث جذبات کو حرکت میں لاتے رہتے ہیں اور جب یہ حقیقت ہے تو ادیب کیونکر اپنے گرد و پیش سے بے نیاز رہ سکتا ہے، نہیں رہ سکتا ہے اور رہنا بھی نہ چاہیے۔ اگر خوشی کی تمنا اگر تفریح کی آرزو وزن رکھتی ہے تو غم بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ غم کی بھی ایک دنیا ہے، ادب اتنی بڑی چیز سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔

نئے ادب نے زندگی کی اہمیت کو محسوس کیا اور اپنے چلو میں زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

ہمارا موضوع ہے نئے ادب کا کیرکٹر، اس لئے ادب کے اسی پہلو سے ہم گفتگو کریں گے۔

ہماری معاشرت میں کیرکٹر کا تصور ہمیشہ جنسیات سے وابستہ رہا ہے، کبھی کبھی عزتِ نفس کی خاطر خودداری کے لئے بھی کیرکٹر استعمال کیا جاتا ہے ورنہ بالعموم اُس کا تصور جنسی معاملات ہی سے رہتا ہے۔ بد معاش اور خراب کیرکٹر کا آدمی کون کہا جاتا ہے؟ وہ جو جنسی معاملات میں آدابِ مقررہ و مروجہ کے خلاف قدم اُٹھاتا ہے، چوری، قمار بازی، جھوٹ، غیبت، اسراف سب کے مرتکب اِس خطاب سے محروم کرائے جاتے ہیں۔ زانی اور اسی قبیل کے افراد اس لقب سے سرفراز کئے جاتے ہیں۔ اور جو افراد جنسی معاملات میں محتاط و معتدل ہیں، جوانِ صالح کہلاتے ہیں۔

میں یہ اشارہ اِس وجہ سے کر رہا ہوں کہ نئے ادب پر فحش کلامی اور عریاں نگاری کا الزام اسی گوشے سے عائد کیا جا رہا ہے۔

اگر حق کی نظر سے دیکھا جائے تو تاریخ اِس امر کی شاہد ہے کہ انسان کی جنسیات سے دلبستگی آج سے نہیں ابتدا ہی سے ہے۔

اگر قدیم ادب کا جائزہ لیا جائے تو میر و درد ایسے چند شعراء کو مستثنیٰ کرتے ہوئے اردو ادب کا پورا سرمایہ جنسیات ہی ہے۔ غزل کے معنی ہی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا۔ اور غزل ہی ہمارے ادب کا بڑا سرمایہ ہے۔ غزل لکھتے اور سناتے وقت ہمارے شعراء جھوم جھوم جاتے تھے اور بسا اوقات معاملہ بندی کی لہریں ایسے اشعار کہہ جاتے تھے کہ سُن کر شعورِ لطافت کو ٹھیس پہونچتی ہے۔

پھر یہ آج کیا بات ہو گئی جو نئے ادب پر اتنا عتاب ہے؟ اِسمیں بہت سی نفسیاتی پیچیدگیاں ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے قدیم ادیبوں کے "معشوق" اکثر و بیشتر روایتی ہوتے تھے۔ روایتی سے مراد یہ ہے کہ شعر کہنے کی خاطر محض فرضی معشوقوں پر طبع آزمائی کی جاتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا، یہی ہوتا بھی تھا کہ دلی دکھنی کا معشوق، داغ دہلوی کا محبوب بھی ہو۔ اور جب معشوق فرضی ٹھہرا تو کس بات پر مُنہ بنایا جاتا؟ لیکن اخلاقی رُو سے بات ہی سب کچھ ہے، آپ مجھے گالی دیں وہ بھی گالی ہے، پھر یا فرضی پردہ دیکر گالی دیں وہ بھی گالی ہے۔

• دوسری وجہ رُستگاری یہ بھی تھی کہ اگر شاعر کا معشوق فرضی نہیں حقیقی بھی ہوتا تو اُس کا خاندانی شجرہ ایسا ہوتا تھا کہ اُس پر کوئی اُنگلی نہ اٹھاتا تھا کیونکہ وہ سب ہی کی نظر میں خاک تھا۔ "کوٹھے والیاں" شرافت و نجابت سے یکسر محروم تھیں اِس لئے اُن سے معاملہ بندی میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اور بالخصوص ایسی صورت میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جب ایک حمام میں سب ایک سے تھے۔ آداب مانع تھے اپنے گھر والیوں سے آج بھی رومانٹک جذبات کا اظہار پبلک میں نہیں کیا جا سکتا تو سوچئے کیسے ممکن تھا کہ زبان چٹخارے کے لئے کچھ غذا چاہتی ہے اور وہ غذا "کوٹھے والیاں" ہی بہم پہونچا سکتی تھیں۔

مرچیں اُس وقت لگتی ہیں جب کسی شاعر یا ادیب کی "اشتہائے سخن" کا رُخ ہماری "بہو بیٹیوں" کی جانب ہو اور نئے ادب سے جو ایک غیر شعوری گریز ہے وہ اسی بنا پر کہ اس نے شریف گھرانوں کی "بہو بیٹیوں" کا نفسیاتی تجزیہ اور اخلاقی نقشہ کھینچا ہے۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ عورت کی معاشرتی حیات میں بھی بڑا زبردست انقلاب آیا ہے۔ جن چہروں کے دیدار کو آفتاب و ماہتاب اتنی دوری پر بھی ترستے تھے، آج اُن چہروں کو سڑکوں کا گرد و غبار اتنی قربت سے دیکھتا ہے کہ دل کی دھڑکن تک سُن لیتا ہے اور جب صورت یہ ہے تو کیونکر یہ پابندی عائد کی جائے کہ "کوٹھے والیوں" کے حسن سے متاثر ہوا جا رہا ہے اور شریف والیوں کے شباب کو شباب نہ سمجھا جائے۔ خلافِ فطرت بات ہے، ناممکن بات ہے!

نئے ادب پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ جنسی اُمور کے تجزیے میں اُس کا محرکِ اوّل "جذبۂ لذت" ہے۔ یہ ایک طرح سے

ہٹ دھرمی کی بات ہے۔ قدیم ادب میں بھی جنسی لذت ہی کار فرما تھا، وہ کیا اور زیادہ قابلِ گرفت تھا کیونکہ وہ عملی اعتبار سے بھی آسودہ لذت تھا۔ معاشرتی پابندیوں کے دباؤ سے آج کا ادیب جیگانہ لذت ہے اور اِس لئے وارفتۂ لذت ہو جاتا کچھ عجیب تر بات نہیں ہے۔ اِس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں نئے ادب کی ہر اخلاقی بے اعتدالیوں کے لیے جواز ڈھونڈھ رہا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کی ترقی نے بہت سی ممنوعات کے رُخ سے نقاب اُٹھا دی ہے اور خصوصاً موجودہ تحقیقاتِ علم النفس نے ایک دیدہ دلیری پیدا کر دی ہے۔ بھوکے کو جب بھوک کی معصومیت کا یقین ہو جائے تو پھر سمجھ لیجئے وہ اظہار سے کب اور کہاں رُکے گا؟

ہندوستان کی سیاسی حالت نے جو بے اطمینانی و بے روزگاری پیدا کی ہے (جنگ کی زحمتوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں) اُس سے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک ذہنی انتشار رونما ہوا۔ حاؔلی کے وقت کے دردِ ملت آشنا آج روٹی کی آواز لگا رہے ہیں اور اسی روٹی کی طلب میں صدائے انقلاب بلند ہو رہی ہے۔ یہی فقر و افلاس جنسی معاملات میں بھی ہے۔

عصرِ حاضر کی نسل پر ڈاکٹر فرائڈ اور کارل مارکس کے گہرے اثرات ہیں۔ ایک جنسی حوادث کا نباض ہے تو دوسرا معاشی آفات کا حکیم۔

ڈاکٹر فرائڈ پر آئندہ کسی نشست میں لکھوں گا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ قدیم و جدید دونوں رجحانات کے ادیب' فرائڈ کے متعلق بیشتر غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ صالح افراد' فرائڈ کو الزام دیتے ہیں کہ اُس نے جوانوں کو گمراہ کر دیا اور نوجوان اپنے افعال کے لئے دلیل و براہین کا سرچشمہ فرائڈ ہی کو سمجھتے ہیں۔ فرائڈ نہ یہ ہے نہ وہ۔ اتنا ضرور ہے کہ جنسی معاملات میں جو وسعت و بصیرت پیدا ہوئی ہے وہ بڑی حد تک فرائڈ ہی کی رہینِ منت ہے۔ میرے نئے ادب کے دوست میرے اِن اشاروں سے بہت خوش ہو کر داد دیں گے کہ میں بڑی دُور کی کوڑی لا رہا ہوں' لیکن میں نئے ادب کی ہر بے اعتدالی کا موید نہیں ہوں۔

ہر چند ہماری معاشرت میں مغربی تہذیب کے اثرات جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک ہماری مٹی کی خاصیت مشرقی رنگ کی ہے۔ ہر قوم کے کچھ مخصوص جذبات اور مخصوص آداب ہوتے ہیں ہمارے بھی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ جذبات اور آداب اٹل نہیں ہوتے' تغیر کی لچک رکھتے ہیں اور تبدیلیٔ وقت سے بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ افتادِ طبع چشم زدن میں تبدیل نہیں ہو جاتی۔

چونکہ جنسی اعتبار سے بھی ہمارا ملک بھوکا ہے۔ اِس لئے جنسی آگاہی کی کنکھیاں ہمیشہ تول میں مصروف رہتی ہیں۔ نئے ادیبوں کی دلیل کہ چونکہ جنسی اُمنگ فطری ہے' اِس لیے کیوں نہ بیباکی سے اُس کا اظہار کیا جائے۔ بچکانہ خیال اور طفلانہ ہٹ ہے۔ عورت کے عضو عضو کی تشریح اور اُس کا ردِ عمل جب ڈنکے کی چوٹ پر محفل کے سامنے لایا جائے گا تو کانوں کو ضرور گراں گزرے گا۔ نئے ادیبوں میں کچھ اور بھی لوگ ہیں جو عجیب عجیب دلائل پیش کرتے ہیں۔ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آپ خلوت میں عریاں نگاری کے مزے لیتے ہیں تو جلوت میں ماتھے پر شکن کیوں پڑ جاتی ہے؟ اِس لئے کہ عریانی خلوت ہی کے لئے ہے' آپ شاپنگ کرتے وقت کبھی اپنی بیگم کے ساتھ اُس اخلاق سے پیش نہیں آئیں گے جس اخلاق سے گھر کی چہار دیواری میں پیش آتے ہیں۔ پھر غیر عورت کا معاملہ تو اور بھی نازک ہو جاتا ہے وہاں تو خلوت بھی شرم آلود ہو جاتی ہے۔

ایک اور دلچسپ دلیل دی جاتی ہے۔ نئے ادیب کہتے ہیں" ہم تو سماج کا آئینہ ہیں جو دیکھتے ہیں وہ دکھا دیتے ہیں"۔ اول تو ادبی حیثیت سے یہ نظریہ ہی ضعیف ہو چکا ہے۔ وہ ادب ہی کیا جو تخلیقی نہ ہو۔ محض عکس ریز ہو۔ عکس ریزی افضل ہے کہ نگارہ تخلیق؟

دوسرے سماجی خرابیوں کی اِصلاح سب سے پہلے ادیب کے فرائض میں آتی ہے' اگر ادیب نے محض عکس ریزی کی تو ادب برائے زندگی کا مقصد فوت ہو گیا' تیسرے یہ کہ سماج کی خرابیوں کو محض پبلک میں لے آنے سے افراد پر کوئی اثر نہیں پڑتا" پوشیدہ کاروبار" بدستور جاری رہتا ہے' لاکھ افسانے پڑھنے کے بعد بھی" لحاف" کی سرگرمیاں اور" بغل کی بو" زائل نہیں ہو سکتی۔ سوائے اسکے کہ لوگ اُنگلیاں اُٹھائیں کہ وہ دیکھو جا رہا ہے۔ بڑا بے باک لکھنے والا ہے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

یہ ٹھیک ہے' طنز کی باریک دھار بڑی تیز ہوتی ہے' جہاں پند و نصائح کی کمر ٹوٹ جاتی ہو وہاں طنز کمر توڑ دیتا ہے' لیکن طنز اور باریک خیالی کو اسکی ہر احتیاط رکھنا واجب ہے کہ اُس کی چوٹ دل پر لگے' کانوں پر نہیں + آپ عورت سے متاثر ہیں' ہوں' خدا مبارک کرے لیکن اُس اثر کو ایسے مراق سے بچایئے

داعی عمل دو طریقے اختیار کرتا معلوم ہوتا ہے۔ اوّل نفسیاتی یا فطری، دوم معیاری یا معقولی۔ نفسیاتی یا فطری طریقۂ عمل کے تحت ہمارے خیالات اَٹ پٹ شتر بے مہار کی طرح، جدھر منہ اُٹھا دوڑے دوڑے پھرتے ہیں، اُن کا رخ کسی خاص سمت نہیں ہوتا یہ نہیں کہ ان میں کسی قسم کا تسلسل اور ربط ہی نہ ہو البتہ یک سوئی نہیں ہوتی۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہو، مگر ربط و تسلسل سے تو پراگندہ و منتشر خیالات بھی خالی نہیں ہوتے: بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دیوانگی مجنون تک میں ایک مخصوص ربط یا طریقۂ کار مضمر ہوتا ہے۔ معیاری یا معقولی طریقۂ عمل تب ہے جب ہم کوئی سوال حل کریں یا کسی مسئلے پر غور کریں۔ اس وقت ہمارا نفس شتر بے مہار نہیں ہوتا بلکہ ہمارے قابو میں، ایک خاص منزل کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ ایسے ارادی عمل و فکر کے وقت نفس کی باگ ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ (ہمارے ہاتھ سے کیا مطلب؟ کیا نفس کے اوپر کوئی اور قوت حکمران ہوتی ہے؟ جب روح و نفس ایک ہی شے ہے تو پھر یہ باگ کس کے ہاتھ میں؟) — یوں سمجھئے نفس کے طریقۂ عمل کی باگ نفس بالتعبیرِ شعور میں ہوتی ہے: اس معیاری یا معقولی طریقے کو غایتی یا منطقی بھی کہتے ہیں منطقی طریقہ محض استدلالی ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ جمالیاتی و اخلاقی بھی ہوتا ہے۔ کچھ بھی ہو، وہ کسی نہ کسی مقصد یا غایت سے ترشح ہوتا ہے، جدید فلسفہ، نفس بشری کی حدود میں، چار بنیادی غایات کا قائل ہے۔ وہ حق، حسن، نیکی و مسرت ہیں ان کو اصطلاح جدید VALUES یا قدر سے تعبیر کرتی ہے۔

اس تشریح کا لُبِّ لباب یہ ہوا کہ نفس کے غایتی طریقۂ عمل کا حاصل ایک نہ ایک قدر ہوتی ہے اور فطری طریقے کا حاصل محض ایک نہ ایک واقعہ ہوتا ہے۔ لیکن حصول قدر بھی آخرکار ایک نہ ایک واقعے پر ہی ختم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عمل کا طریقۂ کار فطری ہو یا غایتی، ہمیشہ واقعاتی ہوتا ہے۔ غلط بحث سے گریز کرنے کی ایک اور صورت لیجئے۔ یعنی، حصولِ قدر والا عمل مخصوص قواعد و ضوابط کا پابند ہوتا ہے اور فطری عمل ایسی پابندی سے بری ہوتا ہے کسی مخصوص قدر کی منزل پیمائی اسی وقت ممکن ہے کہ اس منزل کا راستہ، طریقۂ سفر اور لوازمات سفر اچھی طرح معلوم ہوں۔ اسی معلومات کی خاطر تعلیم و تربیت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور تعلیم کے فیض سے غایتی حاد پیمائی کے قواعد و ضوابط وجود میں آتے ہیں۔ تعلیم یافتہ نفس معقولی و غایتی طریقِ عمل اختیار کرتا ہے اور جاہل نفس فطری و نفسیاتی طریقۂ کار کا شکار بنا رہتا ہے۔

لکھنے کو لکھ گیا اور یہ سمجھ کر لکھ گیا کہ میں نے گڑھ فتح کر لیا یعنی۔ عمل کا طریقۂ کار ہمیشہ واقعاتی ہونے سے جو مُعَمّا ان بزرگ نے حل کر لیا لیکن اب سمجھتا ہوں کہ خاک حل کیا!

حقیقتاً نفس کا ہر عمل نفسیاتی ہے۔ وہ نفسیاتی بنیاد کے خلاف عمل پیرا ہی نہیں ہو سکتا۔ ماننا پڑتا ہے کہ نفس کا معقولی و غایتی عمل بھی نفسیاتی بنیاد سے پاک نہیں ہوتا — اور — فطری و نفسیاتی عمل میں بھی معقولی جزو شامل ہوتا ہے! — مثلاً — ایک گمراہ مسلم کرسیٔ وزارت یا حصولِ زر کی خاطر اسلامی نفس کے خلاف دشمنانِ اسلام کا ساتھ دے، اور قوم مسلم کی بربادی پر محض نفسیاتی رنگ میں عمل پیرا ہو جب بھی وہ کوئی فعل خلافِ عقل نہیں کرے گا یعنی اپنی نفسانی و حیوانی صورت میں بھی، منہ کا نوالہ ناک میں نہیں رکھنا چاہے گا۔

اب نفسیاتی و غایاتی طریقہ ہائے عمل کا مابہ الامتیاز کیا رہا؟ — صرف ایک طریقۂ کار کا غلبہ دوسرے طریقۂ کار پر۔ یعنی — جس عمل کا جزوِ غالب تحریکِ فطری ہو وہ نفسیاتی سمجھا جائے گا اور جس طریقۂ کار میں غایاتی حصہ حیوانی تحریک کو روکے تھامے وہ غایاتی قرار پائے گا۔ کیا کہہ دوں کہ نفسیاتی و نفسانی میں وہی فرقِ لطیف ہے جو غالب نے ایمان و دین میں دکھانا چاہا ہے؟

ایک اور بازی گری ملاحظہ ہو:

ہمارے اقوال و افعال جو معقولی و منطقی شق میں آتے ہیں ایک ہی شان کے نہیں ہوتے۔ بعض بیّن و واضح ہوتے ہیں، بعض ابہام آمیز و محتاجِ افہام و تفہیم ہوتے ہیں، اور بعض بادی النظر میں پراگندہ و مہمل سے نظر آتے ہیں — یعنی۔ ہماری معقولیت کے بھی مختلف مدارج و مراتب ہیں۔ اس کے علاوہ، جہاں تک بیان کا تعلق ہے، لغزشِ زبان بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً کسی کی زبان سے نکلے کہ ”نام نہاد مدعیانِ اتحاد بے نتھے بیلوں کی کانگریس ہیں“ حالانکہ وہ دراصل کہنا چاہتا ہو کہ ”نام نہاد مدعیانِ اتحاد بے نتھے بیلوں کی کانگریس ہیں“ حالانکہ وہ دراصل کہنا یہ چاہتا کہ ”نام نہاد مدعیانِ اتحاد کانگریس کے بے نتھے بیل ہیں“

پھر ابہام و تفہیم کے میدان میں، اظہارِ مفہوم کی دقت کا تو کہنا ہی کیا؟ — اکثر ایک بیان کو محض لفظی اعتبار سے کچھ کا کچھ سمجھ لیا جاتا ہے اور بیان کرنے والا کبھی تو یہ کہتا ہے کہ اس کا مفہوم غلط سمجھا گیا، کبھی یہ مانتا ہے کہ وہ اپنا مفہوم

پوری طرح بیان نہیں کر سکا۔ اور بعض دفعہ تو سے نظر آتا ہے کہ اس کا تخیل ترجیح مقابلتاً اس کی تعبیر صحیح نہیں ہو سکی۔ یا دیکھئے تو یہ صورتیں اکثر و بیشتر پیش آتی ہیں اور روزانہ کی زندگی سے سیاسی، سماجی، مذہبی وغیرہ ہر میدان میں پیش آتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات مفہوم کا اظہار ناقص ہوتا ہے، بعض اوقات خیال کی تعبیر ناقص سے مفہوم ہی غلط ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات حقیقت کا مشاہدہ یا احساس ہی ناقص ہوتا ہے مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے خیال کو ایک حقیقت یا قدر سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

خواہ مخواہ یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہمارا نفس ہمیشہ کسی نہ کسی معیار یا قدر کے تحت عمل کرتا ہے، البتہ یہ عمل بعض اوقات وقوف و شعور کے ساتھ ہوتا ہے اور بعض اوقات غیر شعورانہ طور پہ گویا۔ جس وقت کسی غایت کے تسلط میں، عملِ نفس آگاہی و وقوف سے باہر ہو تو وہ منتشر و بے قابو معلوم ہوتا ہے لیکن در اصل عمل کی باگ اس وقت بھی نفسِ غیر شعوری میں ہوتی ہے۔

تعلیم و تربیت کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ وہ نفس بشری کی تحقیقات سے اس کا طریقۂ عمل معلوم کرے۔ اس کی تہ میں پوشیدہ ہونے والے ڈھیرے کو کھود کر نکالے اور سطح پر لانے کی جد و جہد کرے تاکہ ہم آئندہ وہ عمل بھی جو اب تک بے خبری میں کرتے ہوں وقوف و شعور کے ساتھ کریں اور کم سے کم تصحیح اوقات و غلط روی کا امکان ہو۔

بے شک معرفتِ نفس معرفتِ حق ہے۔ لیکن معرفتِ نفس علم نفسیات کے دفترِ بے پایاں کے بعد بھی ایسی ہی تو مطلب ہے جیسی اس علم سے پہلے تھی۔ کیوں؟ — یوں کہ سمجھنے والا، سمجھانے والا، سمجھ کے قاعدے بنانے والا، اور جس کو سمجھایا جاے، وہ سب ایک ہی ہیں۔ یعنی — نفس۔

ارے واہ رے بازی گر!

ماورا پر ایک تنقیدی نظر

(جناب اشعر ملیح آبادی)

گذشتہ پندرہ بیس سال سے ہماری زندگی جس تیزی سے بدلتی جارہی ہے وہ ہم پر خوب روشن ہے۔ جدید تصورات و خیالات نے ہمارے ذہنوں میں انقلاب کی رَو دوڑا دی ہے۔ ہمارے دلوں میں ایک نئی حرکت اور نئی بیداری رواں دواں ہے۔ گذشتہ ادب ہمارے اس نئے ادب سے قریب قریب مختلف ہے۔ عروض کی کٹھن منزلوں، قافیے ردیف کی پابندیوں اور الفاظ کے مقررہ استعمال سے آزادی حاصل کی جارہی ہے۔

ان ترقی پسند شاعروں میں راشد سب سے پیش پیش ہے۔ ادب اور زندگی کو ہم آہنگ کرنے میں راشد نے انتھک کوششیں کی ہیں۔ مگر وہ اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں۔ اُنہوں نے ایک آدھ جگہ ماحول اور سماج کی ترجمانی کرنے کے علاوہ ہر جگہ اپنے ہی احساسات اور جنسی جذبات کا پرتو پیش کیا ہے۔ اور ان جذبات کی ترجمانی بہت خوب کی ہے۔ اب اگر احساسات اور جذبات ہی عریاں ہوں تو ادب پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ یہ فرض شاعر کا ہے۔ کہ وہ گفتنی و ناگفتنی باتوں میں امتیاز پیدا کرے۔

راشد کے کلام میں ایک نفسیاتی تخلیل اور گھلاوٹ ملتی ہے۔ نظموں میں ایک کیف اور نغمگی ہے۔ ہر نظم کا ایک مقصد ہے اور اس مقصد تک پہنچنے کے لئے ارتقار کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ دیگر شے ہے کہ یہ مقصدیت ہم کو لذتیت کی طرف لے جائے۔ بہرحال دیکھنا یہ ہے اس نے جس مقصد کو بھی لیا اسے کس طرح نبھایا۔

بعض مواقع پر راشد نے نظم کے حسن و ارتقا کے بڑھانے کے لئے نادر تشبیہات سے کام لیا ہے جو ہر چند کہ مغربی ادب کی گونج معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بھی مشرق میں وہ بالکل نئی اور حسین کہلانے کی مستحق ہیں۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر راشد کی شاعری کانوں کو بے تکی اور مہمل معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے زیادہ تر خاکے مغربی زندگی سے لیے گئے ہیں۔ مگر کون کہہ سکتا ہے زندگی کی ہر آن بدلتی دنیا میں ہماری زندگی بھی بدل جائے اور ساتھ ہی ساتھ ہمارا ادب بھی تبدیل ہو جائے اور پھر یہی نامانوس طریقِ شعری مانوس ہو کر رائج ہو جائے۔ ہم کو اس شاعری میں کیف و اثر محسوس ہونے لگے اور اس کی آواز ہمارے کانوں کے لئے سہاناگ بن جائے۔

یہ صحیح ہے کہ راشد کی شاعری ایک نئے تجرباتی اور ہنگامی دور کی تمہید ہے اور اس کا مقابلہ دورِ آخر کی شاعری سے نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی فن کی اہمیت تو کسی زمانے میں ختم نہ ہوگی۔ فن تو ہر عہد اور حال میں قائم رہے گا ــــ راشد نے فن کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ کہیں کہیں اس آزادی نے حُسن پیدا کر دیا ہے اور کہیں کہیں ختم۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ "ماورا" میں جو پابند ادب سے گریز کیا گیا ہے تو راشد کی سعی کہاں تک کامیاب ہوئی ہے۔ اور پھر جب ایک کام بغیر بغاوت کے نکل سکتا تھا تو بغاوت کر کے بیکار انتشار پھیلایا گیا۔

اردو ادب کا دامن بہت وسیع ہے۔ وہ ہر مضمون اور ہر خیال کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ مروجہ پابندیوں میں رہ کر خیال و بیان کو وسعت دی جاتی۔ الفاظ میں وسعت اور شگفتگی پیدا کی جاتی۔ اور مشرق کی روح کو فنا نہ کیا جاتا۔

راشد کی یہ بغاوت کہ اُنہوں نے موروثی زبان کے الفاظ، ان کے معانی، اسالیبِ بیان، بندشوں اور ترکیبوں کو توڑ کر پگھلا کر نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ زیادہ درخورِ اعتنا نہیں۔ جدت کے زور اور ترقی پسندی کے زعم میں زمین کو آسمان کہہ دینا ہرگز درست نہیں۔ معانی سے احتراز کرنا خود زبانِ اُردو سے احتراز کرنا ہے۔

فکر کی تازگی اور خیال کی رعنائی کے اعتبار سے راشد کی شاعری ضرور قابلِ قدر ہے مگر فنی لحاظ اور افادیت کے اعتبار سے ان کی نظموں کی وقعت بہت کم ہے۔ ابتدائی چند نظموں میں فن کا لحاظ تھوڑا بہت نظر آتا ہے مگر آگے چل کر فن کی بندشوں کو توڑ دیا گیا ہے۔ افادیت۔ مقصدیت جس کے لئے یہ ترقی پسند شعرا چیخنے چلاتے رہتے ہیں راشد کے یہاں کسی کسی نظم میں نظر آجاتی ہے۔ وہ حسن کی محفل میں آرزوئے وصل لئے ہر وقت نظر آتے ہیں۔ اور جب اس خوابِ سرمستی سے بیدار ہوتے ہیں تو ایک آدھ بات کام کی کہہ جاتے ہیں۔ اور راشد کے مقلدین اس ایک نکتہ کو اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ شاید راشد کو بھی اس کے معنی سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہوگا۔

"طلوع" کے تعارف میں اکرام حیدر لکھتے ہیں کہ "راشد کے خیال میں یہ ارض
مشرق کی روح اگر مر نہیں چکی تو قریب مرگ ضرور ہے۔ مشرقی نظامِ زندگی
فسردہ ہو چکا ہے اس کا مذہب اس کا تمدن اب اپنی آخری ہچکیاں لے
رہا ہے۔ راشد کی شاعری میں اس اعصابی تکان، ذہنی جمود، شکستہ
ایمان اور حد سے بڑھے ہوئے احساس کمتری کا پتہ ملتا ہے جو صدیوں
سے ارض مشرق پر طاری ہے۔ راشد سمجھتا ہے کہ اب بیمار کے اچھا
ہونے کی کوئی اُمید نہیں۔ اسے اب مر جانا چاہئے"

ارض مشرق کے متعلق یہ رائے بالکل نئی اور عجیب ہے۔ ناامیدی
بزدلی کی نشانی ہے۔ اگر مریض کو بجائے اس کے کہ تریاق دیا جائے
یا اس کو جاں فزا نغمے سنائے جائیں اگر اس کے سامنے اس کی موت کا
ذکر کیا جائے تو اگر وہ کل مرنیوالا ہوگا تو آج ہی مر جائے گا۔ اور
اس صورت میں واقعی اس کی موت ناگزیر ہو جائے گی۔ لیکن ہمارے
بس میں تریاق ہے تو ہم مریض کو اچھا کرنے کی کوشش کیوں نہ کریں۔
شکست خوردگی اور کمتری کا یہ احساس ہم کو ایک مذموم پستی کی طرف
لے جاتا ہے ہمارے احساسات اور خیالات پر ایک تکان، جمود
اور گرانی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اور ہم کوئی کارِ عظیم کرنے کے قابل
نہیں رہتے۔ اقبال، جوش، مجاز اور روش وغیرہ بھی مشرق کے بیمار ہیں
میں ہیں۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کا کھویا ہوا اقتدار پھر مل جائے لیکن
وہ راشد کی طرح موت کا انتظار تو نہیں کرتے ہیں۔ وہ ایسا خواب
تو نہیں دیکھتے جو شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہو۔ راشد کی یہ حرماں نصیبی اور یاس
پرستی ممکن ہے آگے چل کر ہمارے احساسات کو مردہ اور ہمارے
جذبات کو فنا کر دے۔

زندگی کی موجودہ الجھنوں کی طرف راشد اشارہ کرتا ہے مگر اس میں
شدت نہیں ہوتی ہے۔ اس کو حسن کے علاوہ شاعری کے اور موضوعات
سے جو کہ اس سے زیادہ اہم ہیں۔ بہت کم مطلب رہتا ہے۔ اسکے یہاں
مزدور، سرمایہ دار اور فاقہ کشوں کا زور شور نہیں ہے جتنا کہ لذتیت کا۔
اس کے یہاں جگہ جگہ اپنی جنسی آسودگی کی خواہش اور معصیت آلودگی کی
آرزو بیدار ہے۔ وہ گناہ و معصیت کے بھنور میں اس طرح پھنسا ہوا
ہے کہ اس کو زندگی کے کسی اور پہلو پر نظر کرنے کی مہلت ہی نہیں۔
چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت

[illegible] دیکھ
تو اگر چاہے تو یہ بھی جاوداں ہو جائیگا
پھیل کر خود بے کراں ہو جائے گا

(طلسمِ جاوداں)

تیرے ان ہونٹوں کے اک لمس جنوں انگیز سے
چھا گیا ہے چار سُو
چاندنی راتوں کا نورِ بے کراں
کیف و مستی کا وفورِ جاوداں

(ہونٹوں کا لمس)

التفات کر دیکھ
اس زمستاں کی حسیں رات کو دیکھ
توڑ دے وہم کے جال
چھوڑ دے اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال

(التفات)

روح کا اظہار تھے بوسے مرے
جیسے میری شاعری میرا عمل
روح کا اظہار کیسے بھول جاؤں

تو کہ تھی اس وقت گمنامی کے غاروں میں نہاں
میرے ہونٹوں ہی نے دی تجھ کو نجات
اپنی راہوں پر اٹھا لایا تجھے
زندۂ جاوید کر ڈالا تجھے

(اظہار)

آج پھر روح پہ وہ چھا ہی گیا
دی مرے گھر پہ شکست آ کے مجھے
ہوش آیا تو میں دہلیز پہ افتادہ تھا
پارہ پارہ تھے مری روح کے تار
آج وہ آ ہی گیا۔

(گناہ)

اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم

میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جن سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

(انتقام)

اِس قسم کی بیسیوں اور مثالیں ہیں جو رفتہ رفتہ سامنے آئیں گی۔
یہ لذتیت "ماورا" کا مرکزی نقطہ ہے۔ یہی غالباً راشد کا اصلی مقصد ہے۔ اور یہی افادی ادب ہے۔ "گناہ اور محبت"، "خودکشی"، "اجنبی عورت"، "زوال سپاہی"، "حزن انسان"، "دریچے کے قریب" وغیرہ چند نظموں کے علاوہ ہر نظم سے جنسی بھوک نمایاں ہے۔ اور ان نظموں میں اگر لذتیت نہیں ہے تو ابہام کثرت سے ہے۔ تسلسل کا رشتہ ہر جگہ ٹوٹا ہوا ہے۔ اور نظمیں اچھا خاصا معمہ بن گئیں ہیں۔

راشد کا یہ اعلان کہ اخلاق نویسی اور حقیقت نگاری کو شاعری سے نکال کر ہی اس کو فنی طور پر جامد ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ اگر اخلاقی قدریں فنا ہو جائیں، حقیقت نگاری مٹ جائے تو عریانی۔ ابتذال اور فحاشی کو روکنے والا کوئی نہ رہے گا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں ادب کوک شاستر کا نمونہ بن جائے گا۔

بہر حال کچھ ہو راشد کے قلم میں کوئی ایسی طاقت چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ حسن و محبت کے اِس بھنور سے نکل آئیں تو ادب میں کوئی انقلاب برپا کرینگے۔

ان کا مجموعہ کلام "ماورا" ان کے دائمی مقام کا ضامن ہے۔ ان کی شاعری کا تجزیہ کرنے کے لئے مجھے "ماورا" پر ایک نظر ڈالنی پڑیگی۔

"میں اسے واقفِ الفت نہ کروں" اچھی نظم ہے مگر پہلا بند بہت معمولی اور مبتذیانہ ہے۔ دوسرے بند میں البتہ ندرت کے ساتھ ساتھ احساس کی شدت جھلکتی ہے ؎

سوچتا ہوں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقفِ درد نہیں خوگرِ آلام نہیں
سحرِ عیش میں اسکی اثرِ شام نہیں
زندگی اس کے لئے زہر بھرا جام نہیں
میں اسے واقفِ الفت نہ کروں

مگر پھر یہ کہ ع سوچتا ہوں کہ محبت ہے جوانی کی خزاں۔

عجیب نظریہ ہے۔ غالباً ان کا خیال سجاد انصاری کے اس مقولہ سے پیدا ہوا ہے کہ "وفا اضمحلالِ حسن ہے"۔ حالانکہ وفا ہی حُسن کی معراج ہے۔ اور محبت ہی حُسن کی بہار ہے۔

"رخصت" راشد کی بلند نظموں میں سے ایک اچھی نظم ہے۔ جذبات کی شدت اور صحیح و سچا تاثر اس نظم سے پوری طور سے نمایاں ہے۔ جدید تراکیب اور اچھوتے استعارے اس کی زینت ہیں۔

ان کی سانیٹ "انسان" میرے خیال سے اپنے اندر کوئی شدت نہیں رکھتی۔ انداز بیان بہت پھس پھسا ہے۔ طرزِ ادا میں کوئی عمق نہیں ہے۔ البتہ آخری شعر میں ایک خاص تڑپ اور محرومی کا اظہار ہے ؎

کسی سے دُور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا
خدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا

مگر یہ محرومی اور بے چارگی بھی ہمارے جذبات کو پستی اور تنزلی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور اس طرح راشد کی افادیت کا خون ہو جاتا ہے۔

"خواب کی بستی" فرار کی تخیلی صورت ہے۔ رعنائی فکر کے لحاظ سے نظم ضرور اچھی ہے مگر طرزِ اظہار بہت کمزور اور مُتھد باندہ ہے مثلاً کہتے ہیں۔

گوارا کر خدارا اِس قدر ایثار جانے دے
نہ کر اب ساتھ جانے کے لئے اصرار جانے دے
میں تنہا جاؤں گا، تنہا ہی تکلیفیں اُٹھاؤں گا
مگر اس پار جاؤنگا تو شاید چین پاؤں گا
نہیں مجھ میں زیادہ ہمتِ تکرار جانے دے

اب خود اندازہ لگائیے کہ اس کو پڑھنے میں زبان کتنی ٹھوکریں کھاتی ہے۔ ایک مصرعہ ہے ع مجھے اِس خواب کی بستی سے کیا آواز آتی ہے۔ یہ پنجابی لب و لہجہ ہے جو اُردو زبان کی روانی اور شگفتگی کو قعرِ ذلت کی طرف لیے جا رہا ہے۔ آگے چل کر کہتے ہیں ع مجھے اس پار لینے کے لئے وہ کون آیا ہے۔ اِس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس پار سے لینے کے لئے کون آیا ہے۔ مگر ان کا مصرع اِس مفہوم سے ہم کو بیگانہ رکھتا ہے۔ پھر ایک جگہ کہتے ہیں ع

مجھے جانے دے اب رہنے سے میری جان جاتی ہے

اب خود اندازہ لگائیے کتنا پھس پھسا اور کمزور مصرع ہے۔ اور آگے ایک جگہ "ارض بے آباد" نظم کیا ہے۔ حالانکہ "بے آباد" کی بجائے "غیر آباد" زیادہ موزوں، مستعمل اور فصیح ہے۔ اور مصرع کی موزونیت

سا بھی کوئی سقم نہیں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن قدیم تراکیب سے بغاوت جو ٹھہری۔

"گناہ اور محبت" پابند نظم ہے۔ زبان و بیان، انداز و لب و لہجہ بھی بہت ہی حسین اور دلکش ہے۔ فکر کی یہ بلندی راشد کے لئے قابلِ مبارکباد ہے۔ آخری شعر سنئے جو فکر کے ارتقا کا اعلیٰ نمونہ ہے ؎

مجھے محبت نے معصیت کے جہنموں سے بچا لیا ہے
مجھے جوانی کی تیرہ و تار بستیوں سے اٹھا لیا ہے

ایک دن لارنس باغ میں راشد نے منظر کشی کی کوشش کی ہے مگر یہ خاکہ اور یہ منظر مبہم ہے۔ پھر بھی تنہائی، خاموشی اور گلزار کی رعنائیوں کے باوجود یہ کہنا ع افکار کا ہجوم ہے میرے دماغ سے۔ بہت خوب ہے مگر یہ کہ ع اشجار بار بار ڈراتے ہیں بن کے بھوت۔ کچھ محلِ غور ضرور ہے۔ دن کے وقت باغ میں اشجار پر بھوتوں کا گمان ہونا بالکل نئی چیز ہے۔ اور حقیقت سے اس کو دور کا لگاؤ نہیں۔ پھر اس سے عجیب بات سنئے ؎

سینے میں جو ئے اشک ہے میرے رکی ہوئی
جا کر اسے بہاؤں گا کنجِ گلاب میں

اول تو جوئے اشک آنکھوں میں رکی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اگر فرض کر لیجئے کہ راشد صاحب کو وہ سینے میں رکی ہوئی محسوس ہوئی تو بھی اس کو "کنجِ گلاب" میں بہانا نہایت مہمل بات ہے۔ معلوم نہیں راشد صاحب نے اس سے کیا مطلب لیا ہے۔

"ستارے" راشد کی بہت حسین سانیٹ ہے۔ ستاروں کے مقصد پر بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ نظم کا مرکزی خیال بہت بلند اور رعنا ہے ؎

چمکتے ہیں کہ انساں فکرِ ہستی کو بھلا ڈالے
لئے ہے یہ تمنا ہر کرن ان نور پاروں کی
کبھی یہ خاکداں گہوارۂ حسنِ لطافت ہو
کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پالے

"مری محبت جواں رہے گی" میں فکر کی کوئی رعنائی نہیں ہے۔ البتہ فنی لحاظ سے نظم اچھی خاصی ہے۔ تخیل کی ندرت اور عمق مفقود ہے۔

"بادل" کی قسم سے اردو ادب میں بہت نظمیں ملتی ہیں۔ حالی، اسمٰعیل، افسر وغیرہ نے اس قسم کی کوششیں کیں مگر اس رنگ کو عروج نہ حاصل ہوا۔ اس سے صرف بچوں کا طبقہ محظوظ ہوا۔ اس لحاظ سے راشد کی یہ سعی ضرور مستحقِ ستائش ہے۔ اس کے علاوہ راشد کی نظم بچوں کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کے لئے بھی سامانِ حظ مہیا کرتی ہے۔

"فطرت اور عہدِ نو کا انسان" میں فطرت اپنے شاہکار انسان سے مخاطب ہوتی ہے ؎

دل ترا اک تک نہ ہوگا کھیل سے بیزار آہ
جب کھلونے بھی تری نیند میں کھو جانے کو ہیں

اور پھر انسان کا جواب ؎

جانتا ہوں مادرِ فطرت کہ میں آوارہ ہوں
طفلِ آوارہ ہوں لیکن سرکش و ناداں نہیں
میری اس آوارگی میں وحشتِ عصیاں نہیں
شوخ ہوں لیکن ابھی معصوم اور بے چارہ ہوں

آوارگی، آشفتگی اور حسین کھلونوں سے کھیلنے کے بعد یہ کہنا کہ ع میری اس آوارگی ...... بہت بے جوڑ بات ہے۔ پھر شوخی کے ساتھ ساتھ معصومیت اور بے چارگی کا وجود عجیب امر ہے۔ اور پھر اس سے بڑھ کر الحاد کی تلقین کرتے ہیں ؎

شکر کر زندانی آہرمن و یزداں نہیں
ان سے بڑھ کر کچھ بھی وجہِ کاہشِ انساں نہیں

خدا کی ذاتِ پاک کو وجہ کاہشِ انساں کہنا کفر ہے۔ کیونکہ وہ تو وجہ تسکینِ انسان ہے۔ "مکافات" اخلاق کے مسلمہ اور سب کے مانے ہوئے اصولوں پر ایک ضربِ کاری ہے۔ تہذیب و آداب کے ڈھالے ہوئے سانچوں سے گریز ہے۔ مذہب کے خلاف ایک آواز ہے۔ غور کیجئے جس نظم کی ابتدا ہی اس شعر سے ہو ؎

رہی ہے حضرتِ یزداں سے دوستی میری
رہا ہے زہد سے یارانہ استوار مرا

اس کے الحاد کا کیا ٹھکانا۔ لیکن اگر واقعی حضرتِ یزداں سے دوستی رہی ہوتی تو شوق آرزوؤں کا سیلاب، اضطراب، وحشت، معصیت اور گناہ کے جذبے ہی فنا ہو جاتے اور روح ایک شفاف جھلکتے ہوئے آئینے کی طرح پاک ہو جاتی۔ اخلاق کے اصولوں پر زندگی گذاری ہوتی تو "شباب زہر سے کبھی لبریز نہ ہوتا۔ اور خوابوں کے سلسلے مہیب نہ ہوتے۔ اور نہ ہی یہ اجتناب "پیامِ مرگِ جوانی" ثابت ہوتا۔ مگر

جس کی سرشت ہی معصیت آلود ہو وہ خدا کو بدنام نہ کرے گا تو کیا تعریف کرے گا۔ راشد کے نزدیک زندگی صرف "غرقِ شراب و عصیاں" اور تلقینِ کفر و الحاد کا نام ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ پکارتا ہے ؎

اسے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک نہ کیوں کیا میں نے

"شاعر کا ماضی" میں راشد نے جو حقیقت بیان کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے شاعروں کا ماضی در اصل ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے شاعروں کے لئے یہ نظم ایک آئینہ ہے۔ جس میں وہ اپنے خد و خال دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اسی نظم میں ایک جگہ ہو ع

یہ اک گذری کہانی آنسوؤں کی اور آہوں کی

بندش بہت سست ہے۔

"خوابِ آوارہ" کا مرکزی خیال بہت بلند ہے۔ مگر الفاظ کے جا بے جا استعمال غلط تراکیب اور ابہام نے نظم کو اس کے مفہوم سے بہت دُور کر دیا ہے۔

"زندگی جوانی حسن و عشق" میں ابہام بڑھ گیا ہے۔ کچھ عجیب خیال پیش کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ زمین کی باتیں ہیں کہ آسمان کی ؎

مرے ندیم کھلی ہے مری نگاہ کہاں
ہے کس طرف کو مری زیست کا سفینہ رواں
وطن کے بحر سے دور اس کے ساحلوں سے دور

"زیست کے سفینہ کا وطن" تو غالباً عالمِ بالا سے مراد ہے۔ کیونکہ ہمارے تصورات کے مطابق ہماری روح کا منبع وہی ہے۔ مگر پھر آگے چل کر "وطن" کی جگہ تبدیل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے ؎

وہ سامنے کی زمیں ہے مگر جزیرۂ عشق
جو دور سے نظر آتی ہے جگمگاتی ہوئی
کہ سرزمینِ عجم کے کہیں قریب ہیں ہم
ترے وطن کے نواحی میں اے حبیب ہیں ہم

"جزیرۂ عشق" سے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ شاعر زندگی کی کشاکش سے قرار حاصل کر کے "جزیرۂ عشق" میں داخل ہو جانا چاہتا ہے۔ مگر پھر یہ "سرزمینِ عجم" کہاں سے آ گئی۔ جو خوش قسمتی سے ان کے حبیب کا وطن ہے۔ نظم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "سرزمینِ عجم" کے قریب ہی کہیں "جزیرۂ عشق" واقع ہے مگر وہ کہاں ہے؟ یہ عقدہ نہیں کھلتا۔ پھر شاعر کہتا ہے کہ اگر جانِ عجم یہاں سے بہت دور ہے تو "جزیرۂ عشق" ہی کی جانب چل اور اس کا جواب ملتا ہے ع

اسی کی سمت رواں ہیں، سفینہ راں ہیں ہم

مصرع کی بندش نہایت کمزور اور بھدی ہے۔ اگر یہ ہوتا کہ ع

اسی دیار کی جانب سفینہ راں ہیں ہم

تو مصرع کا سقم دور ہو جاتا۔ سرزمینِ عشق میں راشد اپنی نجات کا ذریعہ دیکھتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے ؎

نہ خیر و شر ہے نہ یزداں و اہرمن ہے یہاں
کہ جا چکے ہیں وہ اس سرزمینِ رنگیں سے

عجیب انکشاف ہے۔ یعنی کبھی تو وہ اس "سرزمینِ رنگیں" میں رہتے تھے۔ اور اب یہاں سے چلے گئے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ مذہب کے عقیدہ کے مطابق خدا ہر جگہ موجود ہے۔ اس سے انکار کرنا خدا کی قدرت سے انکار کرنا ہے۔ اور پھر یہ راشد کا عمل ہے جو ان کے نئے نظام کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یعنی اس نے سفینۂ زیست کے لنگر "جزیرۂ عشق" پر پہونچ کر کھول دئے ہیں۔ کیونکہ ؎

یہاں عدم ہے نہ فکرِ وجود ہے گویا
یہاں حیات مجسم سرود ہے گویا

"رفعت" میں بھی ابہام کا رونا ہے۔ کچھ مفہوم ذہن میں آتا ہے تو دوسرے مصرعے ذہن میں آئے ہوئے مفہوم کو بھی غلط قرار دیتے ہیں۔

"نغمہ و نور کا گہوارہ" بہت لطیف جامع اور جدید ترکیب ہے۔ مگر پھر "آنکھ کا پلکارا" سمجھ میں نہیں آتا۔ غالباً پلک جھپکنے کی حرکتوں کو انہوں نے پلکارا نظم کیا ہے۔ محض قافیئے کی خاطر۔ نظم کا ارتقائی نقطہ بہت دلکش اور رعنا ہے ؎

عالمِ قدس سے آوازیں مری آئیں گی
پھر خمیازہ کشِ وقت کی امواجِ حسیں
اک سفینہ مرے نغموں سے بھر لائیں گی

"دلسوزی" میں راشد کی شدتِ احساس بہت تیز ہے۔ اس کی فکر بلندی پر ہے۔ مگر فن کی عینک لگا کر دیکھئے تو پہلا ہی شعر نظر میں کھٹکتا ہے ؎

یہ عشق پیچاں کے پھول پتے جو فرش پر یوں بکھر رہے ہیں
یہ مجھ کو تکلیف دے رہے ہیں، یہ مجھ کو غمگین کر رہے ہیں

پہلے مصرع میں "یوں" کی وضاحت کہیں نہیں ہے۔ یہ لفظ محض برائے بیت ہے۔ دوسرا بند البتہ اس کی بلندیٔ فکر کی دلیل ہے ؎

خزاں زدہ اک شجر ہے اس پر ضیائے مہتاب کھیلتی ہے
اور اس کی بے رنگ ٹہنیوں کو وہ اپنے طوفاں میں ریلتی ہے
کوئی بھی ایسی کرن نہیں جو پھر اس میں روحِ بہار بھر دے
تو کیوں نہ مہتاب کو بھی یارب تو یونہی بے برگ و بار کر دے

ایک شعر ہے ؎

ندیم آہستہ زمزموں کے سرودِ پیہم کو چھوڑ بھی دے
اُٹھا کے ان نازک آبگینوں کو پھینک دے اور توڑ بھی دے

ظاہر ہے کہ نازک آبگینے جب پھینکے جائیں گے تو وہ خود شکستہ ہو جائیں گے ان کے لئے یہ کہنا "توڑ بھی دے" بے کار محض ہے۔ یہ ٹکڑا محض قافیہ کی کمی کو پورا کرتا ہے۔

"جرأت پرواز" کے شروع ہی میں راشد نے ایک عجیب بات کا انکشاف کیا ہے یعنی ع

آج تک کی ہے کئی بار محبت میں نے

میرے خیال سے محبت ایک اور صرف ایک بار ہوتی ہے۔ اس کے بعد احساس الفت میں وہ شدت وہ گہرائی اور دہشت ختم ہو جاتی ہے۔ اُس کو رغبت، رومان اور بوالہوسی کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ "تمناؤں کے پروانے" بہت عمدہ استعارہ ہے۔ دوسرے بند کا ماحصل سنئے ؎

اک بار اور محبت کر لوں
مجھ کو ہے جرأتِ تدبیر ابھی
برسرِ جنگ ہے تقدیر ابھی
اور تقدیر پہ پھیلانے کو اک دام بھی

یہ تقدیر کے لکھے ہوئے حتمی فیصلے کے خلاف بغاوت ہے۔ پھر بھی اگر [illegible] ہے وہ کہتا

مجھ کو اک بار محبت کر لینے دو
اور [illegible] کا [illegible] برآمدن بھی

یہاں ان کی محبت کا نظریہ بدلا ہوا ہے۔ وہ یعنی نسل انسانی سے محبت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جس انداز سے وہ کہتے ہیں اس کا مفہوم غیر واضح رہتا ہے ؎

ایک بار اور محبت کر لوں
ایک انسان سے اُلفت کر لوں

اِس ایک انسان سے نسل انسانی کا تصور ادا نہیں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص اِنسان سے محبت کرنا چاہتے ہیں۔ علاوہ اس کے نظم کا اختتامی خیال ہم کو ایک پستی اور کمتری کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی جرأت کا انجام "کام برآوردن" پر ختم کر دیتے ہیں۔ راشد مشرق کے تنزل کی آخری حد دیکھنا چاہتا ہے۔ یعنی ایسی پستی جہاں سے وہ کبھی اُٹھ نہ سکے۔

"وادیٔ پنہاں" میں راشد کا ابہام اہمال کی حدوں کو چھوتا ہے اگر اس سے ہم "تخیل کی وادی" مراد لیں تو یہ چند خوش قسمت اِنسان کون تھے جو اس وادی میں چلے گئے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔

میرے خیال سے اِن تمام نعمتوں کا ایک جگہ مہیا ہو جانا جنکا ذکر راشد نے "وادیٔ پنہاں" میں کیا ہے جنت سے کم نہیں اور غالباً جنت کی راشد کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں۔ کیونکہ وہ خدا کے وجود ہی سے منکر ہیں۔ "طلسمِ جاوداں" راشد کی کامیاب نظم ہے ؎

اپنی آنکھوں کے طلسمِ جاوداں میں بہنے دے
تیری آنکھوں میں ہے وہ سحرِ عظیم
جو کئی صدیوں سے پیہم زندہ ہے
انتہائے وقت تک پائندہ ہے

مگر پھر وہی لذتیت بھرا اظہار، وصال کی آرزو ؎

چند لمحوں کے لئے آزاد ہوں
تیرے دل سے اخذ نور و نغمہ کرنے کے لئے
زندگی کی لذتوں سے سینہ بھرنے کے لئے

مگر اس لذتیت کے باوجود راشد کو اپنے فرض کا احساس ہے وہ کہتا ہے کہ

آج میں ہوں چند لمحوں کے لئے تیرے قریب
سارے انسانوں سے بڑھ کر خوش نصیب

لیکن اس کے باوجود احساس فرحت میں شدت نہیں۔ بلکہ وہ آنکھوں کے طلسمِ جاوداں میں بہہ جانا چاہتا ہے۔

"ہونٹوں کا لمس" راشد کی قوتِ بیان کی شاہد ہے۔

تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
اور پھر لمسِ طویل
جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد
میں نے جواب تک بسر کی ہی نہیں
اور اک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ

گو "ہونٹوں کے لمس" میں راشد کو اتنا کیف اور مزہ آنے لگتا ہے کہ وہ بار بار اس کا ذکر کرتا ہے۔ جو عریانی کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ جدتِ خیال اور فکر کی رعنائی ملاحظہ ہو۔ ؎

چاندنی ہے اور میں اک تاک کے سائے تلے
استادہ ہوں
جان دینے کے لئے آمادہ ہوں
میری ہستی ہے نحیف و بے ثبات
تاک کی ہر شاخ ہے آفاق گیر
حملۂ مرگ و خزاں سے بے نیاز

شراب کا یہ تصور اُردو میں بالکل اچھوتا ہے۔ اس کے آگے انسان کے تمام حواس اور اختیارات باطل ہو جاتے ہیں۔

"اتفاقات" میں اندازِ بیان ضرور دلکش ہے مگر وہی جنسی جذبے کی تسکین کی آرزو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راشد صاحب کو اتفاقیہ طور پر وہ لڑکی ہاتھ لگ گئی تھی۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

اس زمستاں کی حسیں رات کو دیکھ
آج اس ساعتِ دزدیدہ و نایاب میں بھی
تشنگی روح کی آسودہ نہ ہو
جب ترا جسم جوانی میں ہے نیسانِ بہار
رنگ و نکہت کا فشار

لڑکی گھر جانا چاہتی ہے مگر شاعر اسے ایسا کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہے وہ انہیں خدا کے خوف سے ڈراتی ہے۔ مگر راشد شاید گناہ پر تلے ہی ہوئے تھے۔ کہتے ہیں۔ ع تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں۔

اور پھر وہی اصرار ؎

خوفِ موہوم تری روح پہ کیا طاری ہو
اتنا بے صرفہ نہیں میرا جمال
اس زمستاں کی جنوں خیز حسیں رات کو دیکھ

اسی نظم میں ایک حسین استعارہ ملاحظہ کیجئے۔ کتنی رعنائی ہے۔ ؎

تیرے مژگاں کے تلے گہرے خیال
بے بسی کی نیند میں اُلجھے ہوتے

ایک جگہ کہتے ہیں۔ ع

چھوڑ دے اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال

یہاں راشد نے "شبستانوں" بجائے شبستاں استعمال کیا ہے۔ جو کانوں کو ناگوار گذرتا ہے۔ ایک جگہ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کا ذکر کرتے ہیں کہ "یہ پھول ہیں، یہ گھاس ہے اور یہ اشجار ہیں" مگر غالباً یہ سب روایاتی چیزیں تھیں۔ اس لئے اُنہوں نے "اسپین" "یہ دیواریں ہیں" کا اضافہ کر دیا۔ حالانکہ اس اضافہ سے منظر میں بھدا پن پیدا ہو گیا ہے۔

آگے ایک مصرع ہے۔ ع کہکشاں اپنی تمناؤں کا ہے راہگذار۔

"راہگذار" مونث ہے مگر نہ جانے کس خیال کے تحت راشد نے اس کو مذکر نظم کیا ہے۔ ایک نہایت حسین اور نفیس تشبیہ ملاحظہ ہو۔ اُردو ادب میں ایسی تشبیہات شاذ ہی نظر آتی ہیں۔ ؎

دیکھ پتوں پہ لرزتی ہوئی کرنوں کا نفوذ
سرسراتی ہوئی بڑھتی ہے رگوں میں جیسے
اولیں بادہ گساری میں مئے تازہ و ناب

شدتِ جذبات سے شاعر اتنا مغلوب ہے کہ پہلے وہ کہکشاؤں کو اپنی تمناؤں کا راہگذر بناتا ہے۔ مگر جب اسے وہاں تک رسائی ناممکن نظر آتی ہے تو وہ زمین ہی کو جلوہ گہ راز بنانا چاہتا ہے۔ اور گو اس کو یقین نہیں کہ ان دونوں کی روحیں مل سکتیں ہیں۔ پھر بھی وہ لب ملانے کی گذارش کرتا ہے ؎

روحیں مل سکتی نہیں ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں
آ اسی لذتِ جاوید کا آغاز کریں
صبح جب باغ میں رس لینے کو زنبور آتے
اس کے بوسوں سے ہوں مدہوش سمن اور گلاب
شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں

اور خدا سے تو لپٹیاں ہو جاتے

"خدا" بیشانی کی سوا اظہار کے بغیر نظم مکمل ہو سکتی ہے۔ مگر الحاد کی تلقین ہی مقصود تھی۔

"حزنِ انسان" بڑی حد تک مبہم ضرور ہے۔ مگر افلاطونی عشق پر بہت لطیف طنز کیا ہے۔ افلاطونی خالص روحانیاتی عشق کا خوب مذاق اُڑایا ہے۔ ؎

آہ انسان کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی
حُسن بے چارے کو دھوکا سا دئے جاتا ہے
ذوقِ تقدیس پہ مجبور کئے جاتا ہے

مگر اس طنز میں خدا کو بیچ میں بیکار لایا گیا ہے ؎

مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب
ہے یہی حضرتِ انساں کے تمسخر کا جواب

"ایک رات" بہ اعتبار تخیل بہت اچھی نظم ہے۔ بہ حقیقت ہے ؎

غم کا بحرِ بے کراں ہے یہ جہاں

مگر راشد کی نمایاں خصوصیت یعنی لذتیت یہاں بھی آشکار ہے۔

اور پھر یہ اندازِ بیان ع

میری محبوبہ کا جسم ایک ناؤ ہے

بہت ہی پوچ ہے۔ کیفِ اتصال کا یہ نادر نمونہ ملاحظہ ہو ؎

دفعتاً پھر جیسے یاد آ جائے اک گم گشتہ بات
تیرے سینے کے سمن زاروں میں اٹھیں لرزشیں
میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کے لئے

"سپاہی" راشد کی بہت کامیاب نظم ہے۔ اظہارِ خیال میں بڑی جدت اور ندرت ہے۔ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ شروع سے آخر تک تسلسل قائم رہتا ہے۔ اور مصلحِ قوم پر کتنا لطیف طنز ہے ؎

مصلحِ قوم نہیں کہ میں آہستہ چلوں
اور ڈروں قوم کہیں جاگ نہ جائے
میں تو اک عام سپاہی ہوں مجھے
حکم ہے دوڑ کے منزل کے قدم لینے کا

اور ایک اچھوتی تشبیہ ملاحظہ ہو ؎

اور دشمن کے گرانڈیل جواں
جیسے کہسار پہ دیودار کے پیڑ

[illegible]

ہیں۔ مگر زوال کا بھی مرکزی خیال لذتیت پر مبنی ہے۔ وہ محبوب سے کہتا ہے کہ کسی روز تیرے جذبات کا دریا سے رواں تھم جائے گا۔ اور تیرے سینے کا درخشندہ جال بیگانۂ لرزش کر دیا جائے گا۔ کیونکہ وقت کو پائندگی نہیں تو حسن کیونکر برقرار رہ سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک روز تیرا شباب ختم ہو جائے گا اور تجھے افسوس ہو گا کہ تو نے جوانی کے حسین لمحات کو بے لطفی سے کیوں گنوا دیا۔ لہٰذا بجائے اس کے کچھ عرصہ بعد تو اپنی جوانی پر پچھتائے اسی وقت اپنے شباب کو غارت گرِ ہوش بنا۔

"اظہار" میں بھی یہی جنسی بھوک نمایاں ہے۔ ایک روحانی حادثہ کا بیان ہے۔ جس کا اظہار بوسوں سے کیا گیا تھا۔

"آنکھوں کے جال" ذاریت کی اعلیٰ مثال ہے وہ آنکھوں کے دلفریب جال میں گرفتار ہے ؎

قہوہ خانے کے شبستانوں کی خلوت گاہ میں
آج کی شب تیرا وزدانہ ورود
عشق کا ہیجان، آدھی رات، اور تیرا شباب

ایک حسین اور نادر تشبیہ ملاحظہ ہو ؎

اپنے سر پر قمقموں کے نور کا سیلاب دیکھ
جس سے تیرے چہرے کا سایہ تیرے سینے پہ ہو
اِس طرح اندوہ میری زندگی پر سایہ ریز
تیری آنکھوں کی درخشانی سے ہے

"گناہ" ایسی نظمیں اگر "ماورا" میں شامل نہ ہوتیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔ جدتِ خیال اور ندرتِ تخیل کا پتہ ہی نہیں۔ مرکزی خیال نہایت پست ہے۔ آخر میں بے وجہ ہی خداوند کی بے بسی کا اظہار کر دیا ہے ؎

اس سے ملنے کا بھی ارمان نہ تھا
پھر بھی وہ آ ہی گیا
کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میرے خداوند کی تھی

"عہدِ وفا" یوں تو لذتیت کا شاہکار ہے۔ مگر ندرتِ فکر اور جدتِ تراکیب نے نظم کو بہت بلند کر دیا ہے۔ ؎

شمع جلتی ہے تو سائے کو بھی حاصل ہے دوام

[illegible] ہے میں سایہ تیرا
[illegible] جب تک ہوں کہ سینے میں ترے روشنی ہو

پھر بھی وہ "عہدِ وفا ابدی" کیسے ہو سکتا ہے جو صرف جوانی تک ہی قائم رہے۔ آخر میں وہ مست نہنگوں سے خود کو تشبیہ دیتے ہیں جن کو "موج کا خمار" پانی سے ریت پر لے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "میرا عہدِ وفا تو ضرور ابدی ہے۔ مگر میں اپنے "جذبات کی شوریدہ سری" سے مجبور ہو کر "نئی عشرت" کی تلاش میں رہتا ہوں۔ اور پھر تاکید کہ ؎

میرے جذبات کو تو پھر بھی حقارت سے نہ دیکھ
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی

"شاعرِ درماندہ" میں موجودہ دور کے کرب و ہیجان کا عکس پوری طور سے ملتا ہے۔ الفاظ کا حُسنِ انتخاب قابلِ ستائش ہے۔ جن سے پس منظر پوری طرح سے نمایاں ہے ؎

زندگی تیرے لئے بستر سنجاب سمور
اور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری
عافیت کوشیٔ آبا کے طفیل
میں ہوں درماندہ و بے چارہ ادیب
خستۂ فکرِ معاش

ان الفاظ کے پس منظر سے "زمانۂ ماضی سامنے آجاتا ہے" موجودہ معاشی حالت ملاحظہ ہو ؎

پارۂ نانِ جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
میں مرے دوست مرے سینکڑوں اربابِ وطن
یعنی افرنگ کے گلزاروں کے پھول

اور اس کی تابناک وجہ سنئے ؎

تجھ کو معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سراپردۂ نسیاں میں ہے

اور پھر وہی از [illegible] وصل ؎

مجھے آغوش میں لے
دو "انا" مل کے جہاں سوز ہیں
اور جس عہد کی ہے تجھ کو دعاؤں میں تلاش
آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے۔

"دریچے کے قریب" راشد کی بہترین فنکارانہ نظم ہے۔ الفاظ سے پس منظر کو سامنے لانے میں راشد کا کمال اوج پر ہے۔ ؎

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اِس فرشِ طربناک سے جاگ
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چُور سہی
آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب

مگر ہاتھوں سے آنکھیں کھولنے کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر ایک نہایت حسین خیال ملاحظہ ہو ؎

دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے

"مینار" سے ہٹ کر اس کی نظر بازار کے ہجوم پر پڑتی ہے، وہ انکو حسرت سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ ؎

ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے

راشد مشرق کی زبوں حالی سے اس قدر ناامید ہے کہ اسکے نزدیک امکان سے بعید ہے کہ یہاں کبھی کوئی انقلاب ہو سکے گا۔

"رقص" میں راشد کا گریز پوری طور سے اجاگر ہے۔ مگر یہ فراریت زندگی کی تلخیوں سے نجات حاصل کرنے کا صحیح جواز نہیں۔ زندگی کے مصائب کو زیر کرنا ہمارا فرض ہے نہ کہ اس سے بھاگ کر رقص گہہ میں پناہ لینا۔ یہ فراریت ہمارے احساسات کو مردہ کر دیتی ہے اور ہم زیست کے آلام سے گھبرا کر "غرقِ جامِ شراب" ہونا چاہتے ہیں۔ اِس طرح جہنم کی آگ پھولوں میں تبدیل ہونے کی بجائے اور بھڑک جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی۔ ع ایک خونی بھیڑیئے سے کم نہیں، لیکن اس سے بچنے کے لئے یہ کہنا ؎

رقص گہہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے

جواز صحیح نہیں۔ اور پھر دیکھئے یہ کتنا سچا اور صحیح تاثر ہے ؎

جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری ان آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک

راشد کی قدرت یہیں آکر ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی ؎

جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں

"بے کراں رات کے سناٹے میں" حسین اور دلکش نظم ہے الفاظ کا انتخاب ان کی نغمگی اور حسین پس منظر ذہن پر عجیب کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ لذت و کیف کا بڑا حسین ماحول نظر کے سامنے آتا ہے۔ اور پھر جب ع

ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی

تو اس کے قریب ہی کہیں ؎

نیند آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لیے
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے
بے کراں رات کے سناٹے میں

کتنا سچا تاثر ہے۔ ایک اور نادر تشبیہ ملاحظہ ہو ؎

آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں

تشبیہ کی یہ قدرت اردو شاعری کے لئے بالکل نئی چیز ہے۔

"شرابی" مفہوم کے اعتبار سے بہت بلند نظم ہے۔ وہ "دما فرنگ کا ادنیٰ غلام" ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے اور شکر بھیجتا ہے کہ وہ ع صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گر اعظم نہیں۔ ورنہ اگر آج وہ صاحبِ اقتدار ہوتا۔ اسکے قبضہ میں نظام ہوتا تو وہ بھی شراب کی بجائے غریبوں اور فاقہ کشوں کا لہو پی آتا۔ مگر وہ اپنی "ادنیٰ غلامی" پر ناز کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ع اور بہتر عیش کے قابل نہیں۔ لیکن آخر یہ غلامی بھی کیوں؟ اور اسپر فخر و شکر کیوں؟ اس غلامی کی لعنت سے پیچھا کیوں نہ چھڑایا جائے۔

"انتقام" راشد کے باغیانہ جذبات کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے مگر ان کے انتقام کی نوعیت عجیب ہے۔ بجائے اسکے کہ مغربی آقاؤں کی غلامی سے انحراف کیا جائے وہ مغربی عورت سے ہم آغوش ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لیا ہے اور اسکی [illegible] ترجمانی کی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس تسکینِ نفس کو انتقام کیسے کہا جا سکتا ہے اور پھر اس انتقام میں اخلاق کا تصور مفقود ہے۔ ہر شخص راشد تو نہیں ہو سکتا۔ لہذا انتقام کا یہ جذبہ [illegible] کے پہنچا دے گا۔

"اجنبی عورت" کو شاعر نے ایک بالکل نئے زاویۂ نگاہ سے پیش کیا ہے مغربی عورتیں جو ہندوستان میں دلچسپیوں کی خاطر آتی ہیں اسکی [illegible] حالات پر بہت کم نظر کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ آقا ہیں ہم غلام۔ انہیں یہ سوچنا ہی نہ چاہیئے کہ ہم اپنی زندگی کیونکر بسر کرتے ہیں۔ لیکن یہ "اجنبی عورت" ہندوستان کے مسائل پر نظر ڈالتی ہے ؎

یہ سیہ پیکر برہنہ راہ رو
یہ گھروں میں عورتوں کا زہر خند
یہ گزرگاہوں پہ دیو آسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل بے باک مزدوروں کا سیلابِ عظیم

یہ ہندوستان کی صحیح تصویر ہے۔ جسے راشد نے بڑی چابکدستی سے اُتارا ہے۔

"خودکشی" ماورا کی آخری نظم ہے۔ اور یہاں راشد کا ابہام اوج پر ہے راشد تلخیٔ زیست سے امان پانے کے لئے رقص و سرود میں کھو جانا چاہتا ہے اور جب وہاں اس کو ناکامیابی ہوتی ہے تو وہ عزمِ خودکشی کرتا ہے اور روزانہ خودکشی کا ارادہ کرتا ہے اور ناکامیاب ہوتا ہے جس کے لئے کس خوبی سے کہا ہے۔ ؎

شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

مرکزی خیال ضرور عمدہ ہے۔ مگر ابہام کی کثرت کی بنا پر نظم کا تسلسل سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ اگر زندگی کو ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ فرض کر لیا جائے تو پھر ؎

وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں

کا کیا مطلب ہوا۔ زندگی کا یہ استعارہ بہت مبہم ہے۔ اور پھر یہ دیکھیے ؎

جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بے پایاں جست
اس دریچے میں سے جو

بھاگتا ہے ساتویں منزل سے کوئے و بام کو
خیال کتنا مضحکہ خیز ہے۔ اور جس کو کمزور تراکیب نے اور
بھی مسخرآمیز بنا دیا ہے۔

بہرحال راشد نئے دور کا شاعر ہے۔ زندگی کی نئی قدروں سے متاثر ہے۔ اس کے کلام میں ایک ہلکا سا گریز پیدا ہو چلا ہے اگر وہ لذتیت کے جال سے نکل آئے تو بہت جلد کسی مقام پر پہنچ سکتا ہے۔

وہ ابھی حسن و معصیت کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ رجعا یاقی ادب کے برعکس اس کی کوششیں ضرور قابل تحسین ہیں لیکن اگر وہ خیال کی روح کو نیا قالب دے تو اس کی انفرادیت اور افادیت دونوں ادب میں انقلاب برپا کر سکتی ہیں۔ ابھی اسکی فراریت زندگی سے ہے۔ جب یہ فراریت اور گریز حسن و معصیت سے ہوگا اور زندگی کا مقابلہ کیا جائے گا تو راشد اپنے دور کا بہترین شاعر ہوگا۔

الفاظ کے انتخاب میں راشد کا سلیقہ بہت حسین اور دلکش ہے۔ لیکن محض الفاظ کے گورکھ دھندے سے کبھی کوئی کام نہیں ہوا۔ جب تک ان کے پیچھے کوئی بڑا خیال کارفرما نہ ہو۔ مجموعی طور پر ترقی پسند شعراء میں راشد ہی سب سے نمایاں خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کا کلام ذہن و فکر کے لئے نئے دریچے وا کر دیتا ہے اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے شاید سب صحیح ہے۔

قحط

(جناب ملک سعید احمد صاحب)

(۱)

صبحدم پھوٹتی کرنوں کا غرور
جلوہ گر ہوتا ہے مانند شباب
شام کو پھر اُفق کی گہرائی میں
ان ہی ڈوبتی کرنوں کا شعور
عہد ماضی کو کچل دیتا ہے
اور مغرور صبح کی کرنیں
اپنا دم توڑ کے رہ جاتی ہیں

(۲)

جس طرح موج کی وسعت میں
اس کی بے تاب تمنا کو
ہو کبھی ترک تمنا کا گماں
اور ہو ساتھ ہی پیمان وفا کا بھی خیال
وہ ابھرتی ہے مگر مٹ جاتی ہے
اپنا دم توڑ کے رہ جاتی ہے

(۳)

مضمحل برق تبسم کا وجود
اور بے نور شرر بار نگاہوں کا سکوت
جسمِ رقصاں ہو عقیدت کا فریب
بوالہوس تہذیب کے گہوارے پر
چند سکڑی ہوئی لاشوں کے وجود
اپنا دم توڑ کے رہ جاتے ہیں

موجودہ ہندوستانی پریس پر تبصرہ

(شہاب ملیح آبادی)

اُنیسویں صدی کا انجام اور بیسویں صدی کا آغاز ہندوستانی پریس کیلئے عجیب تلاطم کا دور تھا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ گرد و غبار اُڑا کر خاموش ہو چکا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ، ہندوستانی نظم و نسق پر، حکومتِ برطانیہ کا پرچم لہرانے لگا تھا، سامنتی دور نے آخری ہچکیاں لے کر، اپنا تمام اثاثہ صنعتی و حرفتی عہد کے حوالے کر دیا تھا۔

صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ، سیاست کے بطن سے ایک تعلیم یافتہ متوسط طبقہ پیدا ہوا، راجہ رام موہن رائے اور اُن کے بعد سر سید نے نئی تہذیب کا خیر مقدم کیا، لیکن اندر ہی اندر آزادی و بیداری کے جذبات پرورش پانے لگے۔ نئی توانائیوں نے نئے راستے کھول دیئے انڈین نیشنل کانگرس کی ولادت کے بعد ہی، ہندوستان کی سرزمین پر، قومی بیداری و آزادی کا پودا پروان چڑھنے لگا۔

جب ماحول متلاطم ہوتا ہے، افراد کے سینوں پر بھی اس تلاطم کا عکس پڑتا ہے، جذبات و خیالات حرکت میں آجاتے ہیں، ان خیالات و جذبات کا روشن ترین آئینہ پریس ہوتا ہے، چنانچہ پریس کی ترقی کے لیے یہ دور بڑی گہما گہمی کا تھا۔ با اثر شخصیتیں، پریس کے کس بل پر صفت آرائی کرنے لگیں، ہندوستانی پریس کا ارتقا انھیں غازیوں کی مساعی کا آئینہ دار ہے، آج ہندوستان میں جو بیداری کے آثار نظر آ رہے ہیں، آج ہندوستانی پریس کی بنیادیں جو غیر متزلزل ہو چکی ہیں، آج جو کچھ آزادی کی لہر دوڑی ہوئی ہے وہ سب اِنہی مجاہدین کے جہاد کا صدقہ ہے۔ حکومت کے بعد، سب سے بڑی طاقت پریس ہے، دراصل، حکومت کی قوت کا مدار بھی یہی ہے۔ ع

زلفِ اگر نتواند، پریس تمام کند!

پریس زندگی خیز حربہ ہے، پچھلی نصف صدی کے اخبارات اس حقیقت سے واقف تھے، چنانچہ انھوں نے جنگ آزادی میں وہ پرچم حریت بلند کیا جو آج ہر شہر پر لہرا رہا ہے، لیکن! لیکن کیا؟

لیکن یہ کہ صنعت و حرفت کے فروغ، سائنس کی محیر العقول تحقیقات اور جذبۂ آزادی کے نشو و نما نے، اخبارات کا ضمیر بدل دیا ہے، نہیں، تجارت کی کچھ ایسی ہوا چلی کہ بعض اخبارات کے سینے میں دل، رہا ہی نہیں، ضمیر ایک بچکانہ وسوسہ گیا ہے اور بس!

اس حقیقت کو اخبار بیں طبقہ بہت دھندلی روشنی میں دیکھتا ہوگا کہ اب، اخبار اور پریس، شعبۂ تجارت کا ایک جزو اور کامرس کی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ جذبات پرست افراد جو شعلے ایڈیٹوریل نوٹ پڑھ کر جھوم جھوم جاتے ہیں، وہ بیچارے یہ نہیں جانتے کہ یہ خوش پوش و خوش وضع دیوی، الفاظ کی دبیز نقاب اوڑھے ہوئے ہے۔ یہ خوش نما ایڈیٹوریل نوٹ، یہ حریت و آزادی کی تبلیغ، یہ ہنگامہ پرور بیانات نقاب ہیں اور نقاب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ اخبارات، جو برطانوی سامراج کے خلاف سب سے زیادہ کہرام مچاتے ہیں، اُس سے بغلگیری کی سب سے زیادہ گہری تمنا رکھتے ہیں، یہ اول فول، حسرت ہم آغوشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ہندوستانی اخبارات میں، اس وقت، بڑے بڑے لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اُن کے قبضۂ قدرت میں، عہد حاضر کے تازہ ترین وسائل ہیں وہ اقتصادی اعتبار سے ایک محفوظ قلعے میں خلوت نشیں ہیں، فارغ البالی کی ہر سمت سے نسیم خوشگوار چل رہی ہے، ان صاحبان کے تن و توش میں توانائی کا اُبھار پیدا ہو چکا ہے، لیکن اخبار کے سینے میں وہ صحافتی ولولے مر چکے ہیں۔

مالکانِ اخبارات، جو کسی وقت فنونِ سپہ گری سے مسلح ہو کر، مجاہدانہ شان سے کئی معرکے سر کر چکے تھے، آج دوسری ہی قسم کی جانبازی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اُن کے سیاسی و اخلاقی ضمیر میں، ابن الوقتی کا طوفان موجزن ہے، رائے عامہ کو مرکب بنا کر، فن شہسواری دکھا رہے ہیں اور مقصد اول اگر کچھ ہے تو صرف ایک ——— تجارتی فروغ!

اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ اخبارات کی نبضیں، اشتہارات کے خون سے چلتی ہیں۔ اچھے سے اچھے اخبارات، اشتہارات نہ ملنے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں جن کا نہ ماتم ہوتا ہے نہ درود۔ مشتہرین، اخبارات کے پہلے آقا ہوتے ہیں، جن کے در پر جبیں سائی کیے بغیر، وہ پنپ نہیں سکتے، مجھے اس وقت، آرچیبالڈ سالوج کی مثال یاد آئی۔ وہ ٹوری پارٹی کے ایک معتقد "سیٹھ" تھے۔ انھوں نے لارڈ بیور بروک، "ایکسپرس اخبار" کے روحِ رواں کو ڈانٹ بتائی کہ مائیں، ایکسپرس، میں بیئر کی گراں قیمت کے خلاف یہ طومار کیسا؟ بیور بروک نے کہا "اب کچھ نہ کہو، میں اس باب کو آج ہی سے ختم کر دوں گا، دوستوں کی پشت پر ضرب لگانا میرا مسلک نہیں ہے؟"

دیکھا آپ نے؟ ہندوستان میں کتنے اخبارات ہیں جن کی نبضوں کی دھمک سے یہی آواز نہیں آتی۔ ہوں گے تو شاذ!

اخبارات کو رشوت کے شکنجے میں جکڑنے کی دوسری صورتیں بھی ہیں، بڑے بڑے بینک، اوقاف، صنعتی ادارے اور دوسرے صاحبِ سرمایہ مفاد، نہایت خوبصورتی سے اخبارات کے مسلک پر اثر انداز ہوتے ہیں، روزانہ اخبارات کو زیرِ نگیں رکھنے کے لیے اُس میں حصے دار بن جاتے ہیں، اس دورِ جمہوری میں، رائے عامہ پر مؤثر دباؤ ڈالنے کے لیے، اخبارات کی پالیسی کا رُخ حسبِ خاطر موڑ دیتے ہیں۔

امریکہ میں مارگن خاندان نہایت ثروت و اثر کا مالک ہے۔ امریکہ کے متعدد اخبارات اُس کی مٹھی میں ہیں۔ مسولینی کو اُس نے کئی کروڑ ڈالر قرض دے رکھے تھے، جب اٹلی کی فاشسٹ حکومت نے جارحانہ اقدام اُٹھا کر سفاکی و بربریت کے مظاہرے کیے، امریکہ کے کسی اخبار نے ان وحشیانہ کارروائیوں پر انگشت نمائی نہیں کی، جب قرض منسوخ قرار دے دیا گیا امریکن اخبار پہلی بار "اٹیلین فاشزم کے خطرے" کی طرف سے چونکے۔ اسی طرح سے، ہٹلر کی حکومت سے، جب تک ان اخبارات کے مُنہ میں رَس ٹپکتا رہا، یہ اخبارات ہٹلر ایسے جنگجو کو صلح پسند و امن جو فرما نروا بتاتے۔

ہندوستانی اخبارات کے چند پروپرائیٹر بھی اس فن میں مہارت حاصل کرنے لگے ہیں۔ اُنھوں نے اپنا قومی ضمیر بدل کر، جب تجارتی نصب العین اختیار کیا تو عوام کی جہالت میں، دفینے دفن پائے۔ اگر اخبارات کی اشاعت کو فروغ دینا ہے تو ایسے کھلونے تیار کیے جائیں جو ان "ذہنی نابالغوں" کے طفلانہ جذبات کو آسودہ کر سکیں۔ اُن کے میلانات کو بہلایا اور اُن کی عصبیت کے ساتھ کھیلا جائے،

قومی آواز و ذاتی منفعت کی خاموش خلش کو ہم آہنگ کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے، اس میں بھی تدبّر کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں یہ تدبّر کارفرما ہے وہاں قومی آزادی کے پردے میں، اخبارات کے اُفق پر شفق پھوٹی ہوئی ہے، لیکن کچھ اخبارات، تدبّر کی بے مائگی کے باعث ظلمت کا شکار رہ جاتے ہیں۔

اکثر اخبارات میں جوش و ولولے سے بھرپور ایڈیٹوریل نوٹ دیکھنے میں آتے ہیں اور دوسرے صفحات پر سردممالک کے پالے ہوئے نیشنل وار فرنٹ اشتہارات زیبِ قرطاس ہوتے ہیں۔ یہ تضاد کیا ہے؟ یہ تضاد نہیں ہے، آئینِ زندگی اور اُصولِ تجارت ہے! ریاستوں کی مطلق العنانی پر سخت ایڈیٹوریل نوٹ نظر سے گزرتے ہیں، عوام کی بیداری کو سراہا جاتا ہے، دوسرے صفحات پر "خبروں" کے بھیس میں وہ نشتر رکھ دیے جاتے ہیں جو عوام کی ہڈی میں اُتر جائیں، اِن نشتروں کی آب دیکھ کر والیانِ ریاست کی باچھیں کھلی جاتی ہیں، پروپرائٹر اخبار کے سینے پر خزانے کا مُنہ کھُل جاتا ہے۔ یہ تضاد کیا ہے؟ یہ تضاد نہیں ہے، آئینِ زندگی ہے، اُصولِ تجارت ہے!

نفع خوروں کی نفع خوری پر، آگ میں جھُلسی ہوئی، بادلوں کی طرح گرجتی اور بجلی کی طرح کڑکتی تحریریں ہماری سماعت سے مس ہوتی ہیں، لیکن اُن کے خلاف جب احتیاطی تدابیر اور عملی کارروائیوں کا درکھلتا ہے تو اُس منظرِ عام پر، وہ آتش فشاں اہلِ قلم ناپید ہو جاتے ہیں، یہ تضاد کیا ہے؟ یہ تضاد نہیں ہے، آئینِ زندگی اور اُصولِ تجارت ہے!

حقیقت یہ ہے کہ پریس، تجارت کے سانچے میں ڈھل چکا ہے

ایڈیٹر، اسسٹنٹ ایڈیٹر، کاتب، پروف ریڈر غرض کہ پورا عملہ سرمایہ دار کے چشم و ابرو پر رقص کرتا ہے اور اُن ہی کی اُنگلی کے اشارے پر اپنا کھیل دکھاتا ہے۔

اَن پڑھ اور جاہل لکھ پتی پریس پرائٹر، فہیم و بصیر ایڈیٹر کی رہنمائی کرتا ہے، ہونہار اور زندہ دماغ افراد کو چاندی کی زنجیر پہنا کر، جو بولی چاہتا ہے، کہلوا لیتا ہے۔ اُن کے ضمیر کی آواز، چاندی کی کھنک میں گم ہو جاتی ہے، اُن کی ہر سطر سے آواز آتی ہے: "ہم غیر کی امانت ہیں۔"

ہندوستان میں شاید ہی اب کوئی مدیر ایسا ہو جو انجام سوچے بغیر، بے خوف و خطر اپنی آواز حلق سے باہر نکل جانے دے۔ بیشتر تو ایسے ہیں جو دو متضاد پالیسی کے اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں، صبح ان کے قلم سے ترقی پسندی کی آواز آتی ہے تو شام کو قدامت پرستی کی صدا سناتے ہیں۔

صرف ایڈیٹوریل نوٹ ہی میں ملمع سازی کا جوہر نہیں ہوتا، خبروں کے چہرے بھی اس طور سے تبدیل کر دیے جاتے ہیں کہ اُن سے بھی ایک پیغام کی صدا آتی ہے۔ یہ بھیس میں نکلے ہوئے افکار زیادہ مہلک اور سم آلود ہوتے ہیں۔

اُنیسویں صدی میں، جب صحافتی زندگی ناقابلِ رشک زندگی تھی اور اہلِ قلم کا مشاہرہ نہایت ادنیٰ ہوتا تھا، اُس وقت غیّور ایڈیٹر "ملکِ خدا تنگ نیست اور پائے مرا لنگ نیست" کہہ کر آزاد ہو سکتا تھا لیکن آج ہزاروں روپے اینٹھنے والے مدیر اتنے خود دار نہیں ہو سکتے، یہی معاشی بے اطمینانی اُن کے دل و دماغ میں خوف کا کرنٹ دوڑاتی رہتی ہے۔ ایک اُمّی خبر رساں سے لے کر اعلیٰ مدیرِ خاص تک بس اِسی دماغی و روحانی خوف کا شکار ہیں۔

ہندوستان کے دیسی اخبارات کی طرح، اینگلو انڈین اخبارات بھی "آدھا تیتر آدھا بٹیر" کے مصداق، ناہموار جادے پر گامزن ہیں، اوّل اوّل اُن کے رجحانات ترقی پسندی کی جانب مائل تھے، لیکن سامراجی دباؤ کے خلاف، ہندوستان میں قومی تحریک جواں ہوئی، تو اُن کے مطمحِ نظر میں بھی آثارِ تغیّر پیدا ہوئے، سیاسی بیداری عوام میں اتنی پھیل چکی ہے

کہ کوئی سامراج پسند اخبار سامراج کی کھلے الفاظ میں حمایت نہیں کر سکتا، تاہم دوسرے وسائل اس نوع کے اختیار کیے جا سکتے ہیں کہ عوام کی دلچسپی کے دھارے کا رُخ بدل جائے یا شعور بیداری میں کم سے کم مضرت رساں دھارا نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کے لیے متعدد تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ مثلاً ایڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ ساتھ اور رنگ آلود خبروں کے دوش بدوش ایسی غذا بہم پہونچائی جائے کہ نگاہ سیاسی اُمور پر جمنے نہ پائے مثلاً جرائم کی رُوداد، فلمی شوخیاں، طلاق کے قصّے، ریس کے پروگرام وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستانی اخبارات بھی اُن کی ریس میں یہی کرتے ہیں، لیکن اُن کے پیشِ نظر اپنے جرنل کی اشاعت ہے اور اینگلو انڈین اخبارات کے روبرو ایک سیاسی مقصد، ایک سامراجی نصب العین ہے۔

یہ بدیشی اخبارات، نہایت نکتہ رس ہیں۔ وہ قومی تحریک کی مخالفت نہیں کرتے، لیکن قومی کارکنوں میں اکثر لیڈروں کو خاطر خواہ پاکر، سیاسی بصیرت کی روشنی میں اُن کی حمایت شروع کر دیتے ہیں۔

ہندوستانی اخبارات کے موجودہ ناؤ کھویا، تند و تیز طوفانِ حیات سے لڑنے کے قابل نہیں، اُنھیں دُھن ہے، لبِ ساحل عالیشان ایوان تعمیر کرانے کی، وہ دَور لَد گیا جب ہندوستانی پریس کا نصب العین، ایک برق تپاں بن کر گرجتا تھا، اب دور ہے، کسبِ زر اور حصولِ منفعت کا، ہر پریس پرائٹر خواب میں حور و قصور کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہا ہے۔ اکبر کے شعر میں اتنی تحریف کیجیے اور پڑھیے:

راہِ آزادی" میں بوڑھے "لُٹ گئے
واں نہ پہونچے اور ہم سے چھٹ گئے

وہ علم بڑا خونخوار ہے جس نے کبھی اعترافِ جہل کے گھاٹ کا پانی نہیں پیا۔

کچھ ترقی پسند ادب کے بارے میں

ترقی پسند ادب یا نئے ادب کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس کے موافق بھی اور مخالف بھی۔ عام طور پر جو کچھ مخالفت میں لکھا گیا ہے اُسے سمجھ کر نہیں لکھا گیا، موافقت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس میں سے بھی بہت کچھ ایسا ہے جس میں اُلجھن ہے، وضاحت اور صراحت کی کمی ہے۔ لیکن بہت کچھ ایسا بھی لکھا گیا ہے، جسے اگر ذہنی ایمانداری کے ساتھ پڑھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو سکتی ہیں، بہت کچھ جو اندھیرے میں ہے اُجالے میں آسکتا ہے اور اس طرح راستے کے بہت سے کانٹے خود بخود ہٹ سکتے ہیں جن معاندوں نے اس ادبی تحریک کے مفہوم اور مقصد کو سمجھا ہے وہ برابر یہ بتاتے رہے ہیں کہ ترقی پسندی کیا ہے، اور ترقی پسندی کیا نہیں ہے۔ انھوں نے بار بار یہ بتایا ہے کہ ترقی پسندی کوئی ایسی چیز نہیں جو ہر قدیم چیز کو ہڑپ کر لینا چاہتی ہے، ترقی پسندی کسی ایک خاص زمانہ کی چیز بھی نہیں۔ اس کا مبہم احساس مصنفوں اور شاعروں میں ہر زمانہ میں رہا ہے۔ ہر زمیں ایک دو نام ایسے ہیں جو ستاروں کے جھرمٹ میں چاند سورج کی طرح چمکتے دکھائی دیتے ہیں، سعدی اور ان کی ہجویں، میر کی غزلیں، پھر غالب کے افکار اور مومن کا انداز بیان ان سب چیزوں میں تبدیلی کی ایک خواہش کا پتہ چلتا ہے، ترقی کے ایک نمایاں احساس کی جلوہ گری ملتی ہے، اور کسی نہ کسی حد تک قدامت کی پابندیوں کو توڑ کر ایک نئی شاہراہ پر چلنے کی ہمت اور جسارت۔ ہر زمانہ میں تبدیلی کی یہ خواہش، ترقی کا یہ احساس اور کسی نئے جہان کی تلاش کا جذبہ موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ احساس انفرادی ہے اجتماعی نہیں، داخلی ہے خارجی نہیں، وجدانی ہے شعوری نہیں۔ اس میں جو کچھ ہے وہ ایک نمایاں شخصیت کے زور بازو اور اضطراب کی تصویر ہے۔ اور اس ایک شخصیت کے بعد باقی ہر طرف خاموشی ہے۔ اس آواز کی طرف سے کان بند کر لینے کے بعد بزم سونی اور ویران نظر آتی ہے، ہر چیز ایک مقررہ نہج اور فرسودہ ڈگر پر چل رہی ہے۔ اور چلنا بھی کیسا ایک جگہ ٹکی ہوئی ہے اور زمانہ کو اسی یکسانی، اسی ٹھہراؤ میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ دلوں میں اس کے بدلنے کی خواہش بھی نہیں پیدا ہوتی، وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ چیزوں کو بدلا جا سکتا ہے، انھیں تبدیلی

کی ضرورت ہی نہیں۔ جب عام احساس میں موجودہ حالت کی طرف سے اتنا اطمینان، اتنی بے فکری ہو اور کوئی ایک آواز ایک نیا نغمہ سنائے تو عام احساس اس میں بھی لذت محسوس کرتا ہے۔ جب یہ نغمہ بند ہو جاتا ہے تو اس کا بند ہونا محسوس بھی نہیں کیا جاتا، اس کی کمی بھی مشکل ہی سے محسوس کی جاتی ہے — صرف زمانہ کا نباض ان ناموں کو تاریخ کے صفحوں میں جگہ دے دیتا ہے اور آنے والی نسلیں انھیں اوراق کی رنگینی میں گزرے ہوئے نغموں کے مدھم سُر سُنا کرتی ہیں — لیکن یہ حالت ہمیشہ نہیں رہتی۔ زمانہ ایک ایسا انقلاب لاتا ہے، جس کے سینہ میں ہر چیز کو زیر و زبر کر دینے کا زبردست جوش، اور ولولہ ہوتا ہے، اور نظام کہن کو بدل کر ایک جہان نو کی تعمیر کا جذبہ۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد حالات نے زندگی میں ایک انقلاب کی خواہش پیدا کی، اور ہمیشہ کی طرح ادب کو بھی اس کا معتبر ترجمان بننا پڑا — حالی اپنا دیوان اور اس کا مقدمہ لے کر شاعری اور تنقید میں ایک انقلاب کے پیامی بن کر نکلے۔ سرسید نے نثر کو ایک نئے انقلاب سے آشنا کیا۔ نذیر احمد کے ناولوں نے انقلاب کے اس جذبہ کی ترجمانی کی۔ اور ان سب نے مل کر اپنے اپنے مخصوص حلقوں میں انقلاب کے احساس کو جگایا — اسی احساس نے مہدی افادی، سجاد انصاری، عظمت اللہ جیسے ادیب و شاعر پیدا کئے۔ اب احساس رفتہ رفتہ داخلی وجدان کا ہم نوا بننے کے بجائے خارجی حقائق کا پیامی بن رہا تھا۔ انفرادیت، اجتماعیت میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ سیاسی اور معاشی حالات اجتماعی احساس کی دبی ہوئی چنگاری کو لو دے رہے تھے۔ چنگاری شعلہ بن رہی تھی۔ اور اسی شعلہ کی لپک چکبست، اقبال اور اکبر کی شاعری میں بھی موجود ہے، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور پریم چند کے افسانوں میں اور مرزا رسوا اور پریم چند کے ناولوں میں بھی اسی کی تابانی اور ضو فشانی ہے۔

یورپ کی پہلی جنگ آئی اور ختم ہو گئی اور اپنے پیچھے کچھ حالات چھوڑ گئی جنھوں نے ساری دُنیا کو ایک زبردست معاشی بحران کے خونیں پنجے میں جکڑ دیا۔ اسی ہیجان نے دنیا کے سیاسی حالات میں خون کی سُرخی بھر دی۔ جرمنی میں نازی پارٹی برسر اقتدار آئی۔ فاشیت نے سارے یورپ کو اپنے پیروں تلے روندنے کے منصوبے بنائے۔ کمیونسٹ لیڈروں پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے۔ امریکا، انگلستان اور فرانس میں ان مظالم کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ اور ان مظاہروں کے شعلوں نے ادیبوں

اور شاعروں کو جلا لیا۔ جرمنی نے فن مصنفوں، سائنس دانوں اور آرٹسٹوں کو جلا وطن کر دیا جو اپنے فن کو اس کے وحشیانہ مقاصد پر قربان کرنے کے تیار نہ ہوئے۔ جرمنی کے اس ظلم کے خلاف مصنفوں کے دل میں بھی آگ بھڑکی، اور ۱۹۳۵ء میں "ترقی پسندی" کی تحریک شروع ہوئی۔ انگلستان، فرانس اور اسپین میں اس نے باقاعدگی سے عمل شروع کر دیا۔ مصنفوں نے ہر اس چیز کو مٹانے کا بیڑا اٹھایا جو ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔ سامراج، فاشیت، کٹر مذہبیت، قدامت پسندی۔ لیکن اس نئی تحریک کو کسی سیاسی سہارے کی تلاش تھی، وہ سہارا اسے خود بخود اشتراکیت نے دیا۔ اشتراکیت بھی معاشی زندگی کی کشمکش کو دور کرنے کی ایک سیاسی تحریک کا دوسرا نام تھا۔ "ترقی پسند" ادیبوں کے اور اشتراکیت کے مقاصد ایک تھے۔ اور اسی لئے "ترقی پسند" ادب کی تحریک میں اشتراکی عناصر کا شامل ہو جانا یقینی تھا۔

یورپ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ ہندوستان بھی دنیا میں پھیلے ہوئے معاشی بحران کی جکڑبندے سے آزاد نہ تھا۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے اس کی حالت اور بھی نازک تھی۔ اور ہر ہندوستانی کے سینے میں آزادی کی زبردست خواہش کروٹیں لے رہی تھی، ہر طرح کی بے بسی کے باوجود ہندوستانی بازو رجعت پسند قوتوں، سامراجی سیاست اور سامنتی اقتدار کو پاش پاش کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ امیری اور غریبی کی، زمیندار اور کسان کی، ساہوکار اور مزدور کی جو ٹکر کبھی نہ ہوئی تھی وہ اب ہونے لگی، اور ادب ان سب حالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اقبال اور جوش کی شاعری، پریم چند کے ناول اور افسانے اور ان کے علاوہ اور بہت سے ان گنت مصنفوں کی ادبی تخلیقیں زندگی کی ترجمانی کر رہی تھیں — ان سب میں ترقی اور تبدیلی کا انقلابی ولولہ جوش مار رہا تھا کہ عین اسی وقت یورپ سے کچھ نوجوان ہندوستان آئے۔ انھوں نے یورپ کے سیاسی اور معاشی حالات کے بھیانک مرقعے دیکھے تھے۔ جب زندگی مٹ رہی تھی، اس کی اعلیٰ قدریں سسک سسک کر جان دے رہی تھیں تو یورپ کے ادیبوں نے "انسانیت" کو زندہ و برقرار رکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان نوجوانوں نے ترقی پسندی کی تحریک کی ہلکی لہروں کو سمندر کی ٹھاٹھیں مارتے دیکھا تھا اور اس لئے انھوں نے بھی اپنے دیس کو ان لہروں کی آغوش میں دینے کا تہیہ کر لیا۔ ان کے دلوں میں زندگی کے جمود کو رواں دواں بنانے کی خواہش تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی۔ [illegible] تحریک کے مقاصد بتائے گئے اور زندگی کے طرق و مسائل کو ترقی دینے کی راہیں سوچی گئیں۔ شاید یہی جذبہ سب سے پہلے "انگارے" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ "انگارے" اُن چند مصنفین کے افسانوں کا مجموعہ تھا جنھوں نے ہندوستان میں ترقی پسندی کی تحریک شروع کی تھی لیکن قدامت اور رجعت پسندی، کٹر مذہبیت، فرسودہ روایات اور ذہنی عصبیت کو نیست نابود کر دینے کے بے پایاں جوش نے ان کے قلم میں ایسی بے باکی پیدا کر دی جس نے اکثر جگہ ابتذال اور سوقیانہ پن کی گندگی اور برہنگی اختیار کر لی۔ پھر بھی یہ مجموعہ انقلاب کی زبردست خواہش کا پہلا مظہر تھا۔ اس نے نئے لکھنے والوں کے ذہنوں اور اُن کے انداز فکر پر چاہے برے اثرات ڈالے ہوں ہیئت کے اعتبار سے ہندوستانی ادب کو ایک نئی راہ بھی دکھائی۔ اور اس کے بعد سے ہر نئی چیز کو پڑھنے والے ترقی پسند ادب سمجھنے لگے۔ یہیں سے غلط فہمیوں کی ابتدا ہوئی۔ لوگوں نے ہر رطب و یابس کو ترقی پسند ادب سمجھ کر اس کے نام پر ناک بھوں چڑھانی شروع کی۔ اسے گالیاں دیں اور ایسی ایسی نازیبا حرکتیں کیں جو ادب و معاشرت دونوں کے نام پر بدنما ہیں۔ یہ حال اُن لوگوں کا تھا جنھوں نے چیزوں کو بے سوچے سمجھے پڑھا تھا اور اچھے اور بُرے کے فرق کو سمجھے اور محسوس کئے بغیر پڑھا تھا۔ لیکن اکثر لوگ ایسے تھے جنھوں نے سنی سنائی باتوں سے اپنے خیالات کی محفل سجائی تھی۔ اور محض تماش بینی یا ہنگامہ آرائی کے لطف کے لئے گالی دینے والوں کے ساتھ تال سُر ملانے لگے تھے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ دونوں گروہ غلطی پر تھے۔ لیکن انصاف شرط ہے، ان کا قصور بھی اتنا بڑا نہیں جتنا شاید آپ نے سمجھا ہو۔ سب سے بڑا قصور اور سب سے بڑا جرم اُن مصنفوں نے کیا ہے جنھوں نے "ترقی پسندی" کا مفہوم سمجھے بغیر ہر قسم کی گندگی، عریانی اور فحاشی کو ادب کے بازار میں "ترقی پسندی" کے نام سے بیچ کر اور اس طرح ان کھوٹے سکوں نے کھرے سکوں کی ساکھ بھی کھو دی اور نظر کو اچھائی میں بھی برائی، حسن میں بھی عیب اور حقیقت کی مصوری میں پروپیگنڈے کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ جو لوگ فرائڈ کی جنسیات کا نام سن کر، جیمس جوائس اور ڈی۔ ایچ لارنس کے دو ایک ناول پڑھ کر، ادب کو نئی شاہراہوں پر لگانے کے دعویدار بن بیٹھے، وہ حقیقت میں "ترقی پسندی" کے نام کا پرچم ہاتھوں میں لئے ہوئے ادب کو ایک اندھے کنوئیں میں دھکیل رہے تھے۔

پھر اگر لوگوں نے ترقی پسند ادب کو ایک لعنت سمجھا تو اس میں ان کا کیا قصور، قصور اُن کا ہے جو ترقی پسند نہیں ہیں اور ترقی پسندی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ نادان جو کرداتا بنتے ہیں گمراہ ہوکر رہبری کے دعویدار ہیں۔ اور اسی لئے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ہر چیز کو ترقی پسند ادب مت سمجھئے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ترقی پسند ادب کیا ہے اور کیا نہیں ہے اور پھر اس معیار کو اپنا رہنما بناکر اپنی رائیں قائم کیجئے مجھے یقین ہے کہ اس طرح آپ کا دل بھی مطمئن ہو سکے گا، روح کو مسرت ملے گی اور نظر میں وسعت پیدا ہوگی، جس چیز کو آپ نے بہت ہی برا سمجھ رکھا ہے اس میں بھی حسن نظر آنے لگیں گے۔ بشرطیکہ آپ کے دل میں یہ جاننے کی لگن ہو کہ ترقی پسند ادب کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

ترقی پسند ادب وہ ہے جو کمزوروں اور مظلوموں کا حامی ہے اور ظالمانہ قوت و اقتدار کی سرکوبی کا پیامی بن کر سامنے آئے۔ ترقی پسند ادب زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں کا ترجمان اور مفسر اور اعلیٰ اور بہتر قدروں کا محافظ ہے۔ ترقی پسند ادب زندگی کے حسن کا تصور اور اس کے اعلیٰ مقاصد کا محافظ ہے۔ ترقی پسند زندگی کی اس چیز کا ہم نوا ہے جو زندگی کو آگے کی طرف لے جائے، اُسے پہلے سے زیادہ بلند ہونے میں مدد دے۔ ترقی پسند ادب تاریخ کا تقاضہ ہے، سماج کا فریضہ ہے اور کلچر کے تسلسل مرتفع۔ وہ فطرت کا ہم صفیر و ہم سفر ہے اور ہیئت و بیان میں اعلیٰ معیار مرتفع اور اس کی تاثیر کا پیامبر ہے۔ مختصر یہ کہ ترقی پسند ادب اُس ادب کا نام ہے جو زندگی کو ترقی کی طرف لے جائے اُسے پہلے سے زیادہ بلند، با مقصد اور با معنی بنائے۔ جو کچھ اس ترقی اور بلندی کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ ترقی پسند ادب اُس کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ زندگی میں جو کچھ ہے وہ ترقی پسند ادب کا موضوع ہے اور جو کچھ نہیں ہے اس کے دائرے سے خارج۔

اور اسی لئے جو کچھ غیر فطری ہے، سفلیانہ ہے، مخرب اخلاق ہے وہ ترقی پسند ادب نہیں۔ جو عریانی و ہم جنسی میں لذت محسوس کرے وہ ترقی پسند ادب نہیں۔ جو زبان و بیان میں اور ہیئت میں تجربہ کرتے وقت اپنی ادبی روایتوں کے سرمایہ کو ٹھکراتا ہوا چلے وہ ترقی پسند ادب نہیں۔ جو ادب یہ بھول جائے کہ فکر و ہیئت میں ایک تاریخی اور کلچرل تسلسل اور ہم آہنگی کا ہونا ضروری اور لازمی ہے، ترقی پسند ادب وہ

بھی نہیں — جنسی زندگی کے وہ افسانے، ناول اور نظمیں، جو جنس اور اُس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو اپنا فرض منصبی سمجھے وہ ترقی پسند ادب نہیں کچھ اور ہے۔ جو آزاد شاعری شاعرانہ ترنم اور رنگینی سے ہم آہنگ نہ ہو وہ ترقی پسند نہیں۔ اور جو ادب زبان میں جدتیں پیدا کرنے کی کوشش میں اُس کی صورت کو اور بھی مسخ کر دے وہ بھی ترقی پسند نہیں۔

اس لئے ہر اُس ادب کو جو ترقی پسندی کا جھوٹا سہارا لے کر لکھا جاتا ہے، اُسے ترقی پسند ادب مت سمجھئے۔ جو کچھ آپ پڑھیں اُسے زندگی، اخلاق اور حسن کے اعلیٰ معیاروں اور قدروں کی کسوٹی پر پرکھیئے، اگر وہ اس پر پورا اُترے تو اسے ترقی پسند ادب سمجھئے۔ جو اس معیار پر پورا نہیں اُترتا وہ بنا ہو کر بھی ترقی پسند نہیں۔ نئے ادب میں بہت کچھ بُرا ہے اور جو کچھ بُرا ہے اُسے ترقی پسندی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ایک ڈرامے کا عکس!

(شہاب ملیح آبادی)

کردار (۱) فلسفی جسے سب ڈاکٹر سمجھتے ہیں۔
(۲) سالار، فلسفی کا رہنما دوست
(۳) زہرہ جمال، محبوبۂ فلسفی۔
(۴) روحِ انبیا، روحِ ملایک وغیرہ۔

(فلسفی کی بڑ)

آج یہ کیسا سماں ہے، دل بجھا جاتا ہے کیوں؟
دل میں یہ الجھن ہے کیا، رہ رہ کے گھبراتا ہے کیوں؟

کیوں مسلسل بے دلی ہے روح پر چھائی ہوئی
ہر تمنا موت کی صورت میں بر آئی ہوئی

کیا یہی مقصودِ ہستی ہے یہی تکمیلِ ذات
ایک لمحے کی خوشی کے واسطے ترسے حیات؟

حبس، تاریکی، دھواں، کچھ بھی نظر آتا نہیں
میں کہاں ہوں میں کہاں، پاگل نہ ہو جاؤں کہیں

یہ رموزِ علم ہیں یا جہل کے اسرار ہیں؟
وہم ہوتا ہے مجھے یہ موت کے آثار ہیں،

(فلسفی چکرا کر گرتا ہے، بے ہوش ہو جاتا ہے —— ہوش میں آنے کے بعد —— پھر بڑبڑاتا ہے)

حق تعالیٰ نے مجھے بخشا ہے کچھ ایسا خیال
ہو نہیں سکتا جو آشوبِ تغیر سے نڈھال

صبحِ نو کا زمزمہ، افسانۂ ماہِ تمام
کون شیرینی ہے وہ جس سے نہیں میں شادکام

چاندنی، دریا، ہوا، صحرا، شگوفے، لالہ زار
سرد میداں، روح پرور وادیاں، ابرِ بہار

علم، دولت، نام، شہرت، آسماں، میداں، زمیں
ایک عورت کے سوا، قسمت میں میری کیا نہیں

آہ پھر بھی میں حقیقی عیش سے محروم ہوں
اتنے اسبابِ مسرت ہیں مگر مغموم ہوں

ہو جو گردش میں ستارا، چرخِ حکمت کیا کروں
اے مزاجِ حق پسندی، یہ بصیرت کیا کروں؟

مجھ دکھے دل کو ہوا سے نغمہ خوانی چاہیے
شادمانی، شادمانی، شادمانی چاہیے

(غیب سے ایک آواز آتی ہے، فلسفی چونک پڑتا ہے)

کون؟ یہ آہٹ ہے کیا؟ کوئی شریکِ راز ہے؟
کان میرے بج رہے ہیں یا کوئی آواز ہے؟

کانپتا ہے عکس یہ کس کا در و دیوار پر!
گھورتا ہے کون غیبت کے دریچے سے ادھر؟

یہ حقیقت، یہ بصیرت، یہ عقائد، یہ علوم
میری تنہا ذات اور اتنی بلاؤں کا ہجوم!

(غائبانہ آواز)

خوف کا دامن جھٹک، دامن جھٹک، مردِ ملول   اے اسیرِ دامِ تنہائی، ہدایت کر قبول،
میرے ہر نقشِ قدم کو چوم، بے تابانہ چوم   مجھ سے پیدا ہے حقیقت، مجھ میں پنہاں ہیں علوم
تجھ سا انسان اور وہمی، رحم آتا ہے مجھے   مسلکِ بشر کی قسم، جینا نہیں آتا مجھے
کیوں ملول و سرنگوں ہے، رونقِ عالم کو دیکھ   نغمۂ رخسار و رقصِ کاکلِ برہم کو دیکھ
اے فدائے چرخِ بالا، خاک کی قدرت بھی دیکھ   اے گرفتارِ طلسمِ آدم! کبھی عورت بھی دیکھ

(دوستی کا عہدنامہ، تلاشِ رومان)

رات، سناٹا، ہوائیں خامشی کی راگنی،   چرخ پر مہتاب، چہروں پہ سنہری چاندنی،
دیدنی تھے تو برگسترِ وقت کے نقش و نگار   مسکراتی وادیوں میں گنگناتے آبشار
تھا ہوا کے نرم جھونکوں میں لگاوٹ کا اثر   خال و خط میں شہر کے جادو تھا، جادو کارگر،
ذرّے ذرّے پر جوانی کا دھواں چھایا ہوا   چپّے چپّے پر قیامت کا سماں چھایا ہوا،
پُرسکوں فطرت کی آنکھوں میں فراغت کا خمار   ہر قدم اک خلد تھا بہرِ شبابِ سوگوار
دن کا غوغا، شب کے سنّاٹے میں عزلت کوش تھا   شب کا سنّاٹا نہیں تھا، اک کھلا آغوش تھا

(ایک حسینہ پر فلسفی کی نگاہ)

آج پہلی بار دیکھا بے نقاب   اک فسوں انگیز، ہیجانی شباب
بھیس میں عورت کے ماہِ زرنگار   کفر پیدا دلبری، ایماں نثار
یہ قدِ عالم شکن، زلفِ دراز   جلد میں سرخی، بدن نکھرا، گداز
رہ میں اندازِ جوانی آ گئے   کھنچ کے اسرارِ معانی آ گئے
انکھڑیوں میں ہوشی کے زمزمے   اُف یہ فتنہ کھا کے چھوڑے گا مجھے
حسنِ نو کا پھول کانٹا ہو گیا   اے خدائے علم یہ کیا ہو گیا؟

(رومانی ولولوں کا اظہار)

یہ کیا تو نے جادو کیا اے حسینہ   مجھے تو کوئی شکل بھاتی نہیں تھی
وہ شے جس کو کہتے ہیں پُرفن جوانی   مرے دل میں جادو جگاتی نہیں تھی
مرے دل کو افکارِ پیچاں کی رو سے   کوئی زلفِ پیچاں بچاتی نہیں تھی
میں اسرارِ پنہاں کا مارا ہوا تھا   یہ پیدا حقیقت لبھاتی نہیں تھی
کسی شاہدِ گل کفن کی طرف سے   صبا کوئی پیغام لاتی نہیں تھی
تخیل کے اُجڑے ہوئے بوستاں میں   نسیمِ طرب گل کھلاتی نہیں تھی

حقائق کی افسردہ تابانیوں میں — جبینِ نظر مشتاق نہیں تھی
فسونِ جنونِ حکمت مرے وسوسوں میں — فسانے کی مشعل جلاتی نہیں تھی
رُلاتی تھی مجھکو، مرے دل میں ٹیکی — یہ دُنیا کبھی مسکراتی نہیں تھی
جوانی کی دُھومیں مچاتی ہے ہر سُو — مرے دل میں دُھومیں مچاتی نہیں تھی

(فلسفی لائبریری میں بہ حالتِ کشمکش)

کس طرف جاؤں جوانی شادمانی اِک طرف؟ — علم و حکمت کے لبوں کی گلفشانی اِک طرف؟
کون ہے پاکیزہ تر، یہ جذبۂ تکمیلِ ذات؟ — یا حسینوں کی جوانی، یا دُہ بروکشیِ صفات؟
راز کی کاوش میں تڑپوں یا فراقِ یار میں؟ — ہے مزا کس میں زیادہ حُسن یا اسرار میں؟
کون ان میں کور دل ہے، کون ان میں دُوربیں؟ — عشق یا سازِ گماں یا علم یا سوزِ یقیں، ؟
قُرب میں کس کے خوشی ہے، بعد میں کس کے نجات — کس میں کتنا ظرف ہے، کس کی ہے کیسی کائنات؟

(رُوحِ ملائک و رُوحِ انبیا کی تشریف آوری)

فلسفی :- کون؟ کس کا عکس ہے؟ سالار؟ کیا؟ زہرہ جمال؟ — خواب میں بھی کیا مجھ سے ہی نظر آتے ہیں کیا؟
رُوحِ ملائک و انبیا :- جی نہیں، رُوحِ ملائک اور رُوحِ انبیا؟
فلسفی :- آئیے، کچھ میرے لائق کام؟ کہیئے، کیا ہوا؟
رُوحِ ملائک :- آپ اور سالار کے ہم ساز، یہ کیسا خیال؟
رُوحِ انبیا :- چشمِ مومن اور اسیرِ کاکلِ زہرہ جمال؟
فلسفی :- میرا پیچھا کر رہا تھا، کیا کروں، حسنی ملال؟
رُوحِ انبیا :- اِک خوشی کے واسطے یہ لعنتیں کرلیں حلال؟
رُوحِ ملائک :- ہے حریفِ دانش و حکمت، حسینوں کا جمال؟
فلسفی :- اور باتیں کیجئے، جانے بھی دیجئے یہ سوال؟

(رُوحِ ملائک و انبیا گرانی میں واپس، سالار کی آمد)

سالار :- تم نے دیکھا، ڈاکٹر، کیسا ہے رومانی سماں، — یہ شبِ مہتاب، یہ رنگین زمیں، یہ آسماں،
فلسفی :- ہے چراغِ کیف روشن روح کی محراب میں — پھر درِ آغوش کھل جائے شبِ مہتاب میں
سالار :- بزمِ آب و گِل میں لذّت کے سوا کچھ بھی نہیں — آدمی کے پاس عورت کے سوا کچھ بھی نہیں
دولتِ فردوس قرباں، سُرخیِ رُخسار پر — حلقۂ جنّت نچھاور، کاکلِ خمدار پر
آؤ، ہو جائے طوافِ کوچۂ حُسن و جمال
فلسفی :- کچھ پتہ ہے، مانگے یا گھر یہ ہے زہرہ جمال؟

سالار:- میں نے کل پکچر میں دیکھا تھا اُسے لیکن نڈھال

(ایک حسینہ کا گذر)

سالار:- اے ڈاکٹر وہ دیکھ، کوئی آ رہا ہے پاس — آنکھوں میں کیا خمار ہے، چہرے پہ کیا مٹھاس

فلسفی:- واللہ، تم سے اہلِ نظر اب نہیں رہے — جب تک فلک میں دم ہے، تمہاری زمیں رہے

سالار:- تم تو مرا مذاق اڑاتے ہو، ڈاکٹر

فلسفی:- واللہ یہ مذاق نہیں جانتا ہوں میں — سالار تم کو اہلِ نظر مانتا ہوں میں

سالار:- تم ایک مسخرے ہو، تمہیں جانتا ہوں میں

فلسفی:- مانو نہ مانو اس کو، تمہیں مانتا ہوں میں

(شراب خانہ، فلسفی، سالار اور زہرہ جمال، ہم پیالہ و ہم نوالہ)

(زہرہ گاتی ہے)

ہوائے چمن تھی، قدح خواریاں تھیں — نسیمِ گلستاں میں سرشاریاں تھیں

چھلکتی فضا میں مچلتے تھے نغمے — قمر سازیاں تھیں، فلک پاریاں تھیں

دو عالم کو تسخیر کرنے کی خاطر — جواں بختِ انساں کی طیاریاں تھیں

صفِ مے پہ شاہ و گدا ہم قدم تھے — نہ سرمایہ داری نہ ناداریاں تھیں

نہ سلطاں کے ماتھے پہ زر کی شکن تھی — گدا کی نہ آنکھوں میں لاچاریاں تھیں

ہر اک لب پہ زندہ تبسم کا افسوں — جواں بختیاں تھیں، جواں کاریاں تھیں

تر و تازہ چہروں پہ کیا چاندنی تھی — شرابی ہواؤں میں میخواریاں تھیں

شگفتہ خیالات کی تازگی میں — جہاں بانیاں تھیں، جہاں داریاں تھیں

شریعت کی عفت ہو قرباں جس پر — وہ روشن دلی کی سیہ کاریاں تھیں

کھلا تھا نگاہوں میں بازارِ عشرت

متاعِ نظر کی خریداریاں تھیں

(فلسفی خراٹے لینے لگتے ہیں، سالار بھدی آواز میں جھوم جھوم کر گانے لگتا ہے، اُس کے بعد محفل برخاست)

دل بے بہارِ لالہ رخاں سوگوار بود — یا از شگفتِ غنچہ دہاں اشکبار بود

مردے کہ شد ہلاک غمِ عشق، ترہ وار — او ہم شکارِ کشمکشِ روزگار بود

... ژ ... ژ ... ژ ... ژ ... ژ ... ژ ...

(گذشتہ سے پیوستہ)

ہندوستانی پریس

(مترجمہ شہاب ملیح آبادی)

بیرونی ممالک کے سیاح بھی اس امر کے شاہد ہیں کہ شاہانِ مغلیہ علم سے گہرا شغف رکھتے تھے، اُن کی علم دوستی و علم نوازی زبان زدِ خلائق تھی، سرطامس رو نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے "علمائے عمرانی فلسفے اور علم ہندسہ میں اچھی بصیرت رکھتے اور ارسطو، اقلیدس، بوعلی سینا اور دوسرے مفکرین و محققین پر بحث و گفتگو کر سکتے ہیں۔"

اسلام نے تحصیلِ علم و کسبِ فن کے حقوق کسی صاحبِ اثر اقلیت کے ہاتھ میں نہیں دیئے بلکہ اُس نے اِس دولت کو ملکیتِ عام ٹھہراتے ہوئے، کسبِ علم کو ہر فرد کا حقِ پیدائشی بتایا ہے، برہمنوں کی طرح، کسبِ علم کا حق، اپنے ہی تک نہیں محفوظ کر لیا ہو، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں ہر جماعت سے صاحبانِ علم و فن پیدا ہوتے رہے۔ عہدِ مغلیہ میں بھی تعلیم کا گاؤں گاؤں چرچا تھا۔ ہر گاؤں میں ایک مولوی اپنی نگرانی میں دیہاتی بچوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ابتدا، قرآن کریم کی آیات سے ہوتی تھی۔ جب مسلمان ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ دو ایسی چیزیں لائے جس نے گہرے اثرات چھوڑے، پہلی چیز تو وہ عقیدہ ہے جو ہندوستان کے لئے نیا تھا ــــ خداوند تعالیٰ کے نزدیک سب انسان برابر ہیں، سب کا درجہ مساوی ہے اور دوسری چیز فارسی زبان ہے، جس نے ملکی ادب پر دیرپا اثر ڈالا ہے۔

ہندو اور مسلم دونوں تعلیم اور اس کے فوائد سے آگاہ تھے یہ تو جب مغلیہ سلطنت کے انحطاط پر برطانوی اقتدار حاوی ہونے لگا تعلیم میں بھی انحطاط پیدا ہوا، یہ مجبوری دور تعلیم کے اعتبار سے غفلت و نامرادی کا دور ہے، ورنہ دیسی حکومتیں، جیسا کہ گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز نے خود ۱۸۱۵ میں لکھا تھا "تعلیم سے دلچسپی رکھتی تھیں۔"

[illegible] کی مثالیں [illegible] فروغ دیا جاتا تھا۔ جب اہلِ فرنگ کے قدم سرزمینِ ہند پر جمے اور اُن کے ادارے مضبوط ہوتے چلے گئے، ایک تعلیمی انحطاط بھی شروع ہوا، رفتہ رفتہ دیسی ادارے فضا میں گم ہونے لگے اور اوقاف کچھ خاص [illegible] میں ڈھل گئے جو ذاتی اغراض پر صرف ہونے لگے۔

اِن دیسی تعلیم گاہوں کے عوض، جو رفتہ رفتہ [illegible] کیا تدابیر اختیار کی گئیں؟ عیسائی مشنری ایک [illegible] پرچار کر رہے تھے لیکن اُن کا مقصد تعلیمی دینِ عیسوی کی اشاعت تھا۔

عہدِ مغلیہ میں کتابوں اور اخباروں کی اشاعت بھی عام تھی۔ خفی خاں نے منتخب اللباب میں اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں فوجی سپاہیوں کو برابر اخبارات بہم کئے جاتے تھے۔ اورنگ زیب اخبارات کی آزادی کے باب میں نہایت وسیع القلب واقع ہوا تھا۔ مثلاً خفی خاں نے ایک بنگالی اخبار کا حوالہ دیا ہے جس نے اورنگ زیب اور اس کے پوتے مرزا اعظم خاں کے باہمی تعلق پر نہایت سخت نکتہ چینی کی لیکن اخبار [illegible] کوئی قانونی کارروائی نہیں کی گئی۔

ملک کی مذہبی زبانیں عربی اور سنسکرت، مگر فارسی جو عدالت کی زبان تھی، فروغ پر تھیں، خود ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکن انھیں سیکھنا ضروریاتِ وقت کے مطابق تصور کرتے تھے۔ وارن ہسٹنگز، اولین گورنر جنرل، مشرقی علوم میں بے حد دلچسپی رکھتا تھا، اس غرض سے کہ عدالتوں میں مسلمانوں کی ذہین خدمات حاصل کی جائیں۔ اُس نے ۱۷۸۱ میں کلکتہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ نصاب میں مختلف نوع کے مضامین شامل تھے فلسفہ، دینیات، قانون، نجوم، اقلیدس، علم ہندسہ، منطق، قواعد، نحو وغیرہ جو اسلامی ادب و علم سے ہم آہنگ تھے۔ مدرسے میں پانچ درجے تھے، جو ہر ایک مدرس کے سپرد تھا، طلبا کو ۲ روپے سے لے کر پندرہ روپیہ تک، درجے کے مطابق وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔ [illegible] میں پہلے انڈیا بل، ایکٹ میں تبدیل ہوا جس کی رو سے مزید اصلاحات منظرِ عام پر آئیں، بہ قول کرزن "ایک تنگ دامن و محدود [illegible]

...ے کی بجائے جن کے پیشِ نظر ہمیشہ تجارتی مفاد رہتے تھے، ... ایک حکومت کی صورت میں ڈھلنے لگی، "تاجر کرو تبر نے معزول ... تسمۂ تجارت، ادارۂ نظم سلطنت میں منتقل ہو گیا۔"

اس جدید ایکٹ کی رو سے ایک بورڈ آف کنٹرول وجود ... آیا۔ اس بورڈ نے حکومت کی شکل اختیار کی، ایک صدر اور ... پریوی ممبران کونسل جن میں ایک سکریٹری آف اسٹیٹ بھی تھا ... ادارانہ اختیارات کی مسند پر جلوہ افروز ہو گئے۔ اس بورڈ کو ... سول، فوجی اور مالی اختیارات سونپ دیئے گئے۔ ایسٹ انڈیا ... کے ڈائرکٹروں کے فرمان میں ترمیم و تنسیخ کا بھی یہ بورڈ مجاز ... کمپنی کو تجارتی امور پر اب بھی قدرت حاصل تھی، لیکن انتظامی ... کاروبار، حکومتِ برطانیہ کی پارلیمان کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔

نظم و نسق کی اس صورت نے "بورڈ آف کنٹرول اور ... کمپنی کے مابین تنازع کی صورت پیدا کر دی، عوام ... کی حکومت سے تنگ دل ہو کر اس کی معزولی کی تمنائیں ظاہر ... رہے تھے۔

اس دستوری نظام کے اثرات کیا تھے؟ سر طامس رُو کے ... الفاظ میں سنیئے۔ "برطانوی حکومت کی طاقت کا یہ فیض ہے کہ وہ ... رعایا کو اندرونی بغاوتیں فرو کر کے اور خارجی حملوں کی راہ ... سنگِ گراں بن کر، زیادہ سے زیادہ اس امن سے ... روشناس کر سکتی ہے جو کسی دیسی طاقت کے زیرِ سایہ رعایا کو ... حاصل نہیں ہے۔"

"برطانوی رعایا" داخلی جبر و تشدد سے بھی محفوظ ہے۔ یہ ... طمینان کسی دیسی فرمانروا کی رعایا کو حاصل نہیں ہے، لیکن یہ فوائد ... بہت گراں قیمت پر خریدے گئے ہیں۔ قومی جذبۂ آزادی، قومی ... کردار، وقار اور خودداری کا ایثار قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے، ... حکومتِ برطانیہ کے زیرِ اقتدار رعیت، بے خوف و خطر اپنی نجی ... معاملات تجارتی کاروبار اور داخلی فرائض انجام دے سکتے ہیں لیکن ... ان صوبوں کی رعایا، حکومت کے سول یا ملٹری انتظام میں شرکت کا ... خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی۔

قومی ... اور عزتِ نفس کا احساس پیدا ہوتا ہے، حکومتِ ... خود اختیاری سے جہاں افراد اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں، ملک کے

کسی طبقے میں ہمت و توانائی پیدا نہیں ہو سکتی، اُن لوگوں سے بلند کرداری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے جو فوجی خدمات میں صوبے دار سے بڑھ کر اور کوئی حیثیت نہیں حاصل کر سکتے اور سول نظم و نسق میں قلیل آمدنی پر عدالت یا ریونیو شعبے میں اونچی جگہ نہیں پا سکتے"

کچھ حکام ایسے بھی تھے جو حکومت کی ہندوستانی کلچر سے بے نیازی کی شدید مذمت کرتے تھے۔ اُن کی اس روش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۷۹۲ء میں لارڈ کارنوالس اور ریذیڈنٹ ڈنکن کی مشترک مساعی سے بنارس میں ایک سنسکرت کالج قائم ہو گیا۔

مغربی طرزِ تعلیم رائج کرنے میں، کمپنی کی طرف سے کسی میلان کا ظہور نہیں ہوا۔ ولبر فورس جو کسی وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے اور بعد میں ممبر پارلیمنٹ ہو گئے تھے، اس باب میں جد و جہد کرتے رہے لیکن کمپنی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ انگلینڈ کی رائے عامہ کا دباؤ ناقابلِ شکست ہوتا جاتا تھا۔ کمپنی با ایں ہمہ بے نیاز رہی، ۱۸۱۱ء کی ایک سرکاری یادداشت میں لارڈ منٹو کا ارشاد ہے :-

"یہ ایک عام شکایت ہے کہ اب ہند میں سائنس اور ادب تیزی کے ساتھ انحطاط و زوال کی طرف بڑھ رہے ہیں، مجرد تعلیم اور فنونِ لطیفہ کا دامن ہر بات سے چھوٹ رہا ہے۔ اس افسردگیٔ ذوق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اکثر کتابیں طاقِ نسیاں میں پڑی کرم خوردہ ہو گئی ہیں، اگر گورنمنٹ نے فوری توجہ نہ کی تو اندیشہ ہے کہ علم حرفِ غلط کی طرح محو ہو جائے گا۔ نہ علم رہے گا نہ علماء۔

رائے عامہ کے وزنی دباؤ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجدیدِ چارٹر کے وقت ۱۸۱۳ء میں گورنر جنرل کو اختیار دیا کہ "کم سے کم ایک لاکھ روپیہ سالانہ علم و ادب کے فروغ کی مد پر صرف کیا جائے۔"

۱۸۱۶ء میں راجہ رام موہن رائے کی مساعی کے طفیل، تعلیمِ مغربی عام کرنے کے لئے عملی قدم اٹھائے گئے اور ایک ہندو کالج معرضِ وجود میں آ گیا، مشنری اداروں نے بھی تعلیم کو رائج کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا، اس طرح تعلیم کا سکہ رائج ہو گیا۔

۱۸۳۳ء میں نئے ایکٹ کے تحت یہ امر واضح کر دیا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ذمہ دار عہدے پر فائز ہونے میں کسی

[illegible] ذاتی یا نسل کی بنا پر قدم [illegible] جاتا تھا۔ اس اعلان سے نئے باب کھل گئے۔

ہرچند مشاہرہ کی سطح بہت پست تھی، تاہم مخبری اور انشاپردازی کی ہوا چل نکلی تھی۔ قلم میں وہ مقناطیسی قوت تھی کہ بیشتر نوجوانوں کے دل اس کی طرف کھنچے ہی چلے جاتے تھے۔ قلم کی کشش کے ساتھ "منفعتِ ذاتی" کا چہرہ بھی آبدار نظر آتا تھا۔ کمپنی اپنے ملازمین کو نجی تجارت کا حق دیئے ہوئے تھی، ان کے ذاتی اور نجی معاملات کی طرف سے بالکل بے چشم و بے گوش تھی۔ چونکہ کمپنی نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں اسلئے ملازمین کمپنی نے وہ دولت جمع کر لی کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کمپنی کے عہدے داروں کی لوٹ کھسوٹ ضرب المثل بن چکی ہے۔

لیکن چند وجوہ کی بنا پر چھاپے خانے ہونے کے باوجود انگریزی اخبارات عنقا تھے۔ انگلینڈ سے بھیجے ہوئے اخبارات اتنے سست گام ہوتے تھے کہ اکثر ایک سال کے بعد ہندوستان پہونچتے تھے۔

۱۶۷۴ء میں ڈائرکٹران کمپنی نے ہنری ہلس کو پریس ٹائپ اور کاغذ کی کثیر مقدار کے ساتھ بمبئی بھیجا۔ سو سال تک کوئی کارِ نمایاں انجام نہ پایا۔ ۱۷۷۲ء میں ایک پرنٹنگ پریس مدراس میں کام کر رہا تھا۔ کلکتہ میں بھی چھ سال بعد ایک سرکاری چھاپہ خانہ معرضِ وجود میں لایا گیا۔ شمالی ہند میں بھی پریس موجود تھا۔ کیونکہ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے قلعۂ آگرہ کو فتح کیا ہے، ضبط شدہ مال میں ایک پریس بھی تھا۔

سب سے پہلا انگریزی اخبار ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء میں "بنگال گزٹ" کے نام سے جیمس آگسٹس ہکی کی سرکردگی میں، منظر عام پر آیا جس کی وجہ ہکی نے یہ بتائی "اخبار کی اشاعت میرا محبوب مشغلہ نہیں ہے، نہ اس طرف میرا فطری میلان ہے، میں سخت محنت کے شدائد کا عادی نہیں، تاہم میں جسمانی محنت کا طوق گلے میں ڈالنا چاہتا ہوں کہ اسی طوق سے دل و دماغ کی آزادی و سکون کی متاع ہاتھ آسکتی ہے۔"

ہکی کا طرزِ انشا وقت سے ہم آہنگی نہ پیدا کر سکا۔ اس کی شستہ [illegible] پبلک میں ہر دلعزیزی حاصل نہ کر سکیں۔ اسی

[illegible] ہکی کو اور زیادہ تیغ کرنے پر آمادہ کر دیا، [illegible] جنرل وارن ہیسٹنگز اور لیڈی ہیسٹنگز کی ہجو [illegible] نہیں کیا عام خیال یہ تھا کہ سر فلپ فرانسس جن کی وارن ہیسٹنگز سے ہمیشہ ان بن رہی، ہکی کا پشت پناہ ہے۔

وارن ہیسٹنگز چیف جسٹس اور دوسرے ممتاز صاحب اثر حضرات سے ٹکر لے کر ہکی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن تمام عیب کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہکی ہی ہندوستانی پریس کا پیشوا ہے۔

دوسرا ہندوستانی اخبار موسوم بہ "انڈیا گزٹ" نومبر ۱۷۸۰ء میں نکلا۔ ۱۷۸۱ء میں حکومت کی سرپرستی میں کلکتہ گزٹ منظر عام پر آیا۔ ہکی کے صحافتی دنیا میں قدم رکھنے کے پانچ برس کے اندر ہی اندر پانچ اخبارات ظہور پذیر ہو گئے۔ فروری ۱۷۸۴ء "بنگال جرنل" اپریل ۱۷۸۵ء میں "اورینٹل میگزین" اور جنوری ۱۷۸۶ء میں "کلکتہ کرانیکل" پبلک سے روشناس ہوئے۔

اکتوبر ۱۷۸۵ء میں رچارڈ جانسٹن کے تحت "مدراس کوریر" نکلا جو ہر ہفتے شائع ہوتا، تمام صوبے میں بذریعہ ڈاک بے محصول تقسیم ہوتا کیونکہ حکومت کا ہات اس کے سر پر رکھا ہوا تھا۔

جنوری ۱۷۹۵ء میں "ویکلی مدراس گزٹ" شائع ہوا۔ "مدراس کوریر" کے پروپرائیٹروں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بھی کیا لیکن وہ بے سود ثابت ہوا۔ اپریل ۱۷۹۵ء میں مسٹر ہمفرے نے مدراس سے ایک اخبار "انڈیا ہیرلڈ" حکومت کی اجازت کے بغیر بلا کمپنی لائسنس جاری کر دیا، اس اخبار کی ایک اشاعت میں "پرنس آف ویلز اور حکومت کے خلاف "ہتک آمیز روش" اختیار کی گئی تھی جس کی پاداش میں مسٹر ہمفرے کی گرفتاری عمل میں آئی، اگرچہ وہ جہاز سے مفرور ہو گئے۔

رفتہ رفتہ احتسابی کاروائیاں بھی قدم اٹھانے لگیں اور سنسر کا رسوخ بڑھنے لگا۔ ۱۲ دسمبر ۱۷۹۵ء کو ایڈیٹر "مدراس گزٹ" کو متنبہ کیا گیا کہ وہ حکومت کے جنرل آرڈرز کی نقلیں اس وقت تک شائع نہ کریں جب تک فوجی سیکرٹری اس پر نظر ثانی نہ کریں۔ چار سال کے بعد ۲۹ جون ۱۷۹۹ء میں سرکاری اعلان تا قدیم کر حکومت کی

نظرثانی [illegible] کے بغیر کوئی اخبار شائع نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ بنگال، اور مدراس کی بہ نسبت بمبئی انگریزی اقتدار میں بہت پہلے آیا۔ لیکن [illegible] تک بمبئی سے کوئی انگریزی اخبار شائع نہیں ہوا۔ "بمبئی ہیرلڈ" پہلا ہفتہ وار اخبار تھا، جس نے بمبئی سے سر اٹھایا اور وہ بھی ۱۷۹۰ء میں۔ دوسرے سال "بمبئے کوریر" (جس کی آج نمائندگی کا فریضہ ٹائمز آف انڈیا انجام دے رہا ہے) لوک ایشن برنر کی سرکردگی میں نکلا۔ سنہ ۱۷۹۱ء میں "بمبئی گزٹ" شائع ہوا۔ بعد میں وہ "گورنمنٹ پیپر" کی صف میں آگیا۔ دوسرے سال "بمبئی گزٹ" اور "بمبئی ہیرلڈ" ایک دوسرے میں ضم کر دیئے گئے۔

"بمبئی گزٹ" کے پروپرائٹروں نے حکومت کے حضور ایک عریضہ پیش کیا کہ ان کا اخبار "حکومت کے مصالح کی تائید میں" بہت مالی نقصانات اٹھا چکا ہے، اس لئے اگر گورنمنٹ نے پوری سرپرستی سے کام نہ لیا تو اخبار کے دیوالیہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس عریضہ کی تمنائیں پوری ہوئیں اور حکومت نے بورڈ کے نوٹس، احکام اور تجاویز کی اشاعت کا حق مرحمت فرما دیا۔ اخبارات حکومت کے لئے ایک رحمتِ الٰہی ثابت ہو رہے تھے اور اس کو بھی ان کی افادیت کا شدید احساس ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بہ لحاظِ مضامین اخبارات کے اوراق تنوع کی لذت سے محروم نہیں تھے۔ پارلیمنٹری رپورٹوں کے علاوہ مقامی باشندوں کے مطالعہ کے لئے دلچسپ ایڈیٹوریل نوٹ بھی ہوتے تھے۔ انگلینڈ کے واقعات، فوجی معاملات پر معلومات، حکام کی مختلف اسکیمیں ...... سب ہی صفحۂ قرطاس پر جگہ پانے لگیں۔ اسکے علاوہ پیرس، اسٹاک ہوم، ویانا، میڈرڈ اور جینوا وغیرہ سے وہ خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں جو خطوط کی شکل میں پہنچتی تھیں۔

موجودہ دور میں اخبار جن چیزوں سے توجہ کا مرکز بن جاتا ہے ان میں سے اکثر و بیشتر اٹھارویں صدی کے اخبارات میں بھی نظر آتی ہیں۔ گورنمنٹ کے نوٹسوں کے علاوہ، ایڈیٹروں کے نام خطوط، سماجی خبریں، آداب معاشرت کے متعلق اطلاعات، شعر و ادب کے مخصوص کالم، اشتہارات اور فیشن کی خبریں عام ہیں۔ اگر نشست کی کوئی رپورٹ یا تقریریں زیادہ طویل ہوتیں تو اکثر ضمیمے بھی شائع کئے جاتے۔

موجودہ عہد کا اخبار بین معترض ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے اخبارات کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین میں نہیں۔ لندن کی مٹی میں تھیں، کیونکہ ہندوستانی مسائل اُن اخبارات میں مفقود تھے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا، یہ واقعہ تھا۔ لیکن یہ واقعہ ایسا کیوں تھا؟ اصل میں اخبار اُن لوگوں کی طرف سے "نطق و گویائی" کا فرض انجام دے رہا تھا جو کمپنی کے ذمہ دار عہدوں کے حلقے سے باہر تھے۔ اگرچہ حکومت بیرونی افراد کی تنقید و نکتہ چینی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی، پھر بھی وہ اُن برائیوں کی طرف سے چشم پوشی نہیں کرتی تھی جن کی اطلاع اخبارات کے وسیلہ سے حکومت کے کانوں تک پہنچتی تھیں۔

ابھی تک اخبارات کا مرکز زیادہ تر فوجی اور ملٹری معاملات سے وابستہ تھا۔ لیکن حکومت کی نظر میں یہی معاملات زیادہ باعثِ تشویش تھے۔ کمپنی اقتدارِ مسلّم کے لئے تن من کی بازی لگائے ہوئے تھی، اس لئے فوجی امور پر نکتہ چینیاں درگزر نہیں کی جاسکتی تھیں، ۱۷۹۱ اور ۱۷۹۸ء کے درمیان کئی ایڈیٹروں پر عتاب نازل ہوا، کیونکہ حکومت اُن امور پر کھلم کھلا نکتہ چینی نہیں برداشت کر سکتی تھی، جو اُس کی بقا سے متعلق تھے۔

۱۷۹۶ء میں "ٹیلیگراف" نے ایک خط مشتہر کے نام سے شائع کیا جس نے سنسنی پیدا کر دی، معلوم ہوا کہ وہ بنگال کے کپتان ولیم سن کا خط ہے۔ ولیم سن کو اس الزام میں کہ انہوں نے ہندوستانی فوج میں انتشار پھیلانے کی نیت کی تھی، ملازمت سے سبکدوش کر دیئے گئے۔ بعد میں جب ولیم سن نے بیماری کا عذر کر کے دماغی ناہمواری کا گلا کیا تو اُن کی بہ لحاظِ گریڈ، نصف تنخواہ کی منظوری ہو گئی۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اخبارات نے اپنا اثر پیدا کرنا شروع کر دیا تھا اور حکومت وقت ان اثرات کی طرف سے بے خبر نہیں رہتی تھی۔

بیشتر دوستی انفرادی احتیاج کا شکار ہو جاتی ہے۔

قرار اطلاعات و معلومات

خدمتِ خلق کا ایک عالمگیر ادارہ

سفید زمین پر سرخ صلیب سوئٹزر لینڈ کا بھی ملکی نشان ہے مگر ریڈ کراس (صلیب احمر) کا لفظ سنتے یا اِس نشان پر نظر پڑتے ہی دُنیا کے ہر شخص کا ذہن سوئٹزر لینڈ کی طرف نہیں بلکہ ریڈ کراس کے ادارہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لندن سے چنکنگ اور ٹوکیو سے نیو یارک تک اِس ادارہ کی ہر دلعزیزی کی صرف یہ وجہ ہے کہ یہ بغیر تخصیص مذہب و ملت امن اور جنگ کے زمانہ میں بیماروں اور زخمیوں کی تیمارداری اور بچوں اور زچاؤں کی بے غرض خدمت کرتا ہے۔

ریڈ کراس کے لفظ سے بعض لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ اس کا تعلق عیسائیت سے ہے مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ اس ادارہ کی بنیاد سوئٹزر لینڈ میں پڑی اور اس کا بانی سوئٹزر لینڈ کا باشندہ تھا اِس لئے سوئٹزر لینڈ کے ملکی نشان کو اِس ادارہ کا نشان بنایا گیا۔ مگر سب سے عجیب اتفاق یہ ہے کہ سفید زمین پر سرخ صلیب کا نشان ہندوستان میں قدیم الایام سے رائج تھا اور بہت ممکن ہے کہ ہندوستان ہی سے سوئٹزر لینڈ گیا ہو۔ موہنجو دارو میں بھی اسکے نمونے ملے ہیں۔ اور ٹیکسلا (پنجاب) کی کھدائی میں آدھے انچ کا ایک چوکور نگینہ برآمد ہوا ہے جس میں سفید زمین پر سرخ عقیق سے صلیب کا نشان بنا ہوا ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہ تیسری صدی قبل مسیح میں تیار کیا ہوگا۔ یہ نگینہ میجر جنرل سر گورڈن جولی نے انڈین ریڈ کراس سوسائٹی کی نذر کر دیا ہے۔

انڈین ریڈ کراس سوسائٹی کا زمانہ جنگ میں کام

انڈین ریڈ کراس سوسائٹی نے جنگ کے دوران میں مشرق وسطیٰ میں برطانوی فوجوں کی بھی اِس طرح خدمت کی جس طرح کہ ہندوستانی فوجوں کی۔ اور چودھویں فوج کو تو شروع سے آخر تک اس نے ہر طرح سے مدد پہنچائی۔ گم شدہ فوجیوں کی تلاش۔ بیماروں اور زخمیوں کی تیمارداری۔ محاذ جنگ پر لڑتے ہوئے سپاہیوں کو آسائشی چیزوں کے تحفے پہنچانا۔ غرضکہ مدد کے تمام طریقوں کو اس نے اختیار کیا۔ گرم موزے۔ جیکٹ اور مفلر وغیرہ یا کھانے کی چیزوں اور کتابوں اور رسالوں کے پارسل سپاہیوں کے لئے روحانی مسرت اور مادی راحت کا سامان ہوتے ہیں اور مرہم پٹی کا سامان ہزاروں زخمیوں کی جان بچا لیتا ہے۔ جنگی ادارہ کا شعبہ رسد جس سال قائم ہوا تھا اس سال ۱۹۴۳ء ... کا سامان زخمیوں اور سپاہیوں کو دیا گیا تھا مگر پانچویں سال یہ رقم ۴۰ گنا بڑھ گئی۔ بیس لاکھ چیزیں زخمیوں اور سپاہیوں کے لئے بن کر اور سی کر تیار کی گئیں۔ ولندیزی جزائر شرق الہند۔ برما اور انڈمان میں مشترکہ جنگی ادارہ نے ہندوستانی جنگی قیدیوں پر تقریباً ڈھائی کروڑ روپیہ صرف کیا۔

سینٹ جان ایمبولینس ایسوسی ایشن (انڈیا کونسل) کی ۶۹۲ ڈویژنیں ہیں جن میں ۱۹۰۰۰ مرد۔ عورتیں اور لڑکے لڑکیاں کام کر رہی ہیں۔ بمبئی کلکتہ اور دیگر مقاموں کے فوجی اسپتالوں کی نرسنگ ڈویژنوں نے فوجی طبی حکام کو بہت مدد پہنچائی ...سلسلے میں اور دارجلنگ کے درمیان ہفتہ میں تین بار جو اسپتالی ٹرین آتی تھی اس پر ۴۵ گھنٹہ کی مسلسل ڈیوٹی انجام دی۔ بمبئی پونا اور دیولالی میں عورتوں کی ڈویژنوں نے ایک سال میں تقریباً ایک لاکھ مریضوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کیا اور اس میں انہوں نے تقریباً دو لاکھ میل کی مسافت طے کی۔

ورکشاپوں اور فیکٹریوں میں ابتدائی طبی امداد

جنگ کے زمانہ میں ورکشاپوں اور فیکٹریوں میں کام کی کثرت کی وجہ سے حادثات بھی کثرت کے ساتھ پیش آتے۔ سینٹ جان ایمبولینس نے ورکشاپوں وغیرہ میں کام کرنے والوں کو ابتدائی طبی امداد دینے کی جو تحریک شروع کی تھی اس کے مفید ہونے کا اندازہ کچھ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں بی۔ بی۔ اینڈ سی آئی ریلوے کے تربیت یافتہ ملازموں نے تین ہزار آدمیوں اور جی۔ آئی۔ پی ریلوے کے ملازموں نے دس ہزار

آدمیوں کو ... امداد دی۔ اگر ہر ورکشاپ، ہر کارخانے اور ہر فیکٹری میں یہ تحریک عام ہو جائے تو بہت ہی مفید کام انجام پا جائے گا۔

قحط کے زمانہ میں ریڈکراس کی طرف سے امداد

بنگال کوچین ملابار اور ٹراونکور کے قحط کے ہیبت ناک افسانے ابھی دنیا کے حافظے سے محو نہیں ہوئے ہیں۔ اِن علاقوں کے قحط زدہ باشندوں کو ریڈکراس نے بہت دل کھول کر مدد دی۔ ستمبر ۱۹۴۳ء میں دودھ کی تقسیم کا کام شروع کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت بچوں، زچاؤں اور حاملہ عورتوں کو مفت دودھ تقسیم کیا جاتا ہے۔ ریڈکراس نے ۶۰۳۵ ٹن دودھ تقسیم کیا۔ اس کام کا یہ اثر ہوا کہ کوچین اور ٹراونکور میں ریڈکراس کی شاخیں کھل گئی ہیں۔ اور ان جگہوں پر ریڈکراس کا نام گھر گھر مشہور ہو گیا ہے۔ کمزوروں اور فاقہ زدہ لوگوں کو ملٹی وٹیامن ٹیبلٹز (کثیر الحیاتین قرص) کی بھی بہت بڑی تعداد تقسیم کی گئی۔

زچاؤں اور بچوں کی بہبودی

ماؤں اور بچوں کی امداد کے سلسلہ میں ریڈکراس نے بہت اہم کام انجام دیا ہے۔ صوبائی حکومتوں کو بھی اس کام کی طرف متوجہ کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ زچہ اور بچہ کی بہبودی کے مرکز ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں قائم ہیں۔ جن سے زچاؤں اور بچوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ مگر ایسی اسکیموں کو وسیع پیمانے پر چلانے کے لئے تربیت یافتہ عملہ کی ضرورت ہے۔ لیڈی چیمسفورڈ فنڈ کی چوتھائی آمدنی اس تربیت کے لئے وقف کر دی گئی ہے۔ اور پانچ پانچ سو روپیہ کے چار وظیفے ان عورتوں کو دئے گئے ہیں جنہوں نے طب میں گریجویٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہائجین اینڈ پبلک ہیلتھ کلکتہ میں زچہ و بچہ کی بہبودی کا خاص نصاب پڑھنا منظور کیا ہو۔ ہندوستان میں دایہ گیری کا کالج قائم کرنے کی تجویز کی گئی ہے جس کو بہت جلد عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ ریڈکراس سوسائٹی کی انتظامی مجلس نے ۱۸۴۰۰۰ روپیہ کی رقم اس کالج میں پڑھنے والی نیز سمندر پار جاکر تربیت حاصل کرنے والی طالبات کے لئے مخصوص کر دی ہے۔ ان اداروں نے ملک کی صحت کا معیار بلند کرنے میں بھی بہت کافی حصہ لیا ہے۔ چنانچہ آنکھ کی بیماریوں کا علاج کرنے کے لئے ریڈکراس کے کیمپ اور تپ دق اور بینائی کے انسداد کے طریقے تعلیم کرنے کی مہمیں اس کا کھلا ثبوت ہیں جونیر ریڈکراس کی تحریک سے بچوں میں خدمتِ خلق کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے اور یہ جذبہ اچھے شہری بننے کی بنیاد ہے۔

اِس وقت ملک قحط کے خطرہ سے دوچار ہے اور بہبودئ عوام کے یہ ادارے اپنے گزشتہ تجربوں اور اپنے منظم اور تربیت یافتہ عملے سے کام لے کر اس سلسلہ میں بہت کچھ کر سکتے ہیں اور یقیناً کریں گے۔

فلمی خبریں

پنچولی آرٹ پکچرز میڈیو پنچولی نے چوتھا اسٹوڈیو قائم کر لیا ہے۔ ۲۲ اپریل کو اس کی رسم افتتاح ہوئی۔ فی الحال "شہر سے دور" کو اس اسٹوڈیو میں مکمل کیا جائیگا "شہر سے دور" میں مینا۔ الناصر۔ اجمل۔ رضا میر وغیرہ نے کام کیا ہے۔ "شہر سے دور" کی ہدایات برکت میرہ کی ہیں۔ نغمات شہنشاہ اور نغمات مدھوک اور موسیقی پنڈت امرناتھ کی ہے۔

دوسری تصویر بر اہان پکچرز کے لیبل سے "پگڈنڈی" رامنارائن دوبے سرعت کے ساتھ ختم کر دیتے ہیں۔ "پگڈنڈی" کی کہانی امتیاز علی تاج اور گانے مدھوک نے لکھے ہیں۔ موسیقی خورشید انور کی ہے اداکاران میں اختری گیانی۔ پدما۔ ادم۔ درگا۔ کلاوتی اور درشن کے نام شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور سوشل فلم کی کاغذی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ مزید اطلاعات کا انتظار ہے۔

محبوب پروڈکشنز "انمول گھڑی" ثابت انمول گھڑی ہوگی فلموں کے مقابل پر جب آ کے کڑی ہوگی

محبوب پروڈکشنز کے "قائد" اور "ہمایوں" جیسے شہرہ آفاق فلم کے ہدایت کار محبوب اپنی اعلےٰ ہدایت کاری اور تجربہ کاری کا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی چوتھی سوشل تصویر "انمول گھڑی" مکمل کر لی ہے۔ "انمول گھڑی" ایک روح پرور اور نغمہ کار شاہکار ثابت ہوگا۔ کیونکہ اسمیں ملکہ نغمات نور جہاں۔ خوش گلو سریندر پری روشن آرا۔ اور فطرتی اداکار ظہور راجہ مراد۔ لیلا مصرا۔ اور شہنشاہ ظرافت بدھوا ایڈوانی جیسے اداکار جلوہ گر ہوتے ہیں۔ موسیقی نوشاد علی نے جنکے نام پر کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کی ہے۔ "انمول گھڑی" نمائش کے لئے بالکل تیار ہے۔ عنقریب نمائش کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔

کاردار پروڈکشنز - میاں کاردار کا "شاہجہاں" تیار ہو چکا ہے عنقریب نمائش کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔ شاہجہاں میں [illegible] راگنی۔ گلوو وغیرہ نے کام کیا ہے۔ شاہجہاں کی موسیقی نوشاد علی کی ہے۔ "قیمت" اور ایک دوسری سوشل تصویر پر اہم مہا جیری اداکاریں بروسینی کے زیر ہدایت تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ستارہ نے ۲۴۰۰ ماہوار پر کاردار کے ساتھ مستقل طور پر معاہدہ کر لیا ہے۔ اب ستارہ کاردار کی آنے والی تصویروں "ناٹک" اور "قیمت" میں اہم پارٹ ادا کرے گی۔

مدھوک کی "کالی گھٹا" مشہور فلمی شاعر اور کہانی و مکالمہ نویس مسٹر ڈی۔ این مدھوک نے اپنی آنے والی تصویر کا اعلان کیا ہے۔ آیندہ تصویر کا نام "کالی گھٹا" رکھا گیا ہے۔ نام تو ایسا ہے کہ سنتے ہی جی للچا جائے مسٹر مدھوک کا بیان ہے کہ کالی گھٹا ان کی بہترین تصویر ہوگی۔ مزید اطلاعات کا انتظار ہے۔

چترا پروڈکشنز "آئی بہار" تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ صرف چند بیرونی مناظر کی فلمبندی باقی ہے۔ چند روز ہوئے تیار شدہ حصوں کا آزمائشی شو ہوا تھا جسکے اختتام پر مسٹر مدھوک بہت خوش نظر آ رہے تھے مسٹر مدھوک کو فخر ہے کہ "آئی بہار" جیسی تصویر ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے "آئی بہار" شنکر مہتہ کے زیر ہدایت مکمل ہوئی ہے۔ رکمی۔ ارشاد ادم۔ آشا اور اجمل نے کام کیا ہے۔

انٹرنیشنل سائن آرٹ پروڈکشنز مسٹر بالی نے "گردش" کی فلمبندی شروع کر دی ہے۔ "گردش" کی کہانی سردار مہندر سنگھ ثالث نے اور مکالمے مسٹر حبیب احمد ملک نے لکھے ہیں۔ گردش میں آشا پوزے۔ پرکاش۔ دلنواز۔ شیر نواب وغیرہ کام کر رہے ہیں۔

غلام حیدر پھر پنچولی میں مشہور میوزک ڈائرکٹر ماسٹر غلام حیدر نے پنچولی آرٹ پکچرز سے پانچ برس تک علیحدہ رہنے کے بعد پھر شمولیت کر لی ہے۔ ماسٹر غلام حیدر اس سے قبل "خزانچی" اور "خاندان" میں اپنی موسیقی کے نمونے پیش کر چکے ہیں ماسٹر غلام حیدر کی دوبارہ خدمات حاصل کر لینے پر سیٹھ دلسکھ پنچولی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے یکم جون سے ماسٹر غلام حیدر پنچولی میں

کر اپنا کام شروع کر دیئے۔

ہند پکچرز بمبئی 'وامق عذرا' تقریباً تیار ہو چکا ہے۔ وامق عذرا میں نذیر۔ سورنلتا۔ ایم اسماعیل وغیرہ کام کر رہے ہیں۔ کمپنی کی دوسری تصویر 'یادگار' بھی قریب الاختتام ہے۔

حقیقی براڈرز لمیٹڈ سید حسنینؔ 'دل' کے بیرونی مناظر قلمبند کرنے کے بعد آسام سے واپس آگئے ہیں۔ اب صرف چند اندرونی مناظر کی فلمبندی باقی ہے۔ 'دل' میں ملکۂ ترنم نورجہاں نئے رنگ روپ اور شان وشوکت کے ساتھ جلوہ گر ہو رہی ہے۔ 'دل' کے بعد دو اور تصویروں کا اعلان ہو چکا ہے۔ 'ہندی' اور 'خاتون' ان میں سے ایک تصویر سبطین فضلی اور دوسری حسنین خود تیار کریں گے۔ اُمید ہے 'دل' سال رواں کی بہترین سوشل تصویر ثابت ہو گی۔

فلم جرنلزم کو زبردست صدمہ یہ خبر اخباری حلقوں میں عام طور پر اور فلمی اخباری حلقوں میں خاص طور پر بڑے رنج وغم اور افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ پنجاب کے مشہور اور فلمی اخبار 'چترا' کے ایڈیٹر و مالک مسٹر دین دیال بھاٹیہ تین ماہ تک علیل رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ مرحوم نے ایک بیوہ اور چار بچے اور سینکڑوں دوست اور مداح چھوڑے ہیں۔ مرحوم بڑے خوش اخلاق اور بہترین اخبار نویس تھے۔ ہمیں مرحوم کے لواحقین سے دلی ہمدردی ہے۔ مسٹر بھاٹیہ کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہفتہ وار 'چترا' آج اُردو کے فلمی اخباروں میں چوٹی کا اخبار ہے۔ مسٹر بھاٹیہ کی موت سے جو اخباری دنیا کو صدمہ پہنچا ہے اُس کی کمی پوری ہونی مشکل ہے۔

پیپلز تھیٹر لمیٹڈ خواجہ احمد عباس کا [illegible] E [illegible] ([illegible]) کا ایک خاص شو شملہ میں ہوا۔ جسے آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگریس کے نمائندوں نے جو ان دنوں شملہ کانفرنس میں حصہ لے رہے تھے۔ اور ہندوستانی وممالک خارجہ کے تقریباً ایک سو اخباری نمائندوں نے دیکھا۔ "چلڈرن آف دی ارتھ" میں صرف پیپلز تھیٹر کے ایکٹروں نے کام کیا ہے۔ اس میں بنگال کے قحط اور بھوک کے دردناک مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصویر بیرون ہند بھی نمائش کے لئے بھیجی جائے گی۔ تصویر کی ڈائرکشن خواجہ احمد عباس مناظر صفی کی ہے۔

کلام سحر

جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحر

شکوۂ دورِ جام ہے ساقی زندگی تشنہ کام ہے ساقی

روک دے گردشِ زمانہ کو تیرے ہاتھوں میں جام ہے ساقی

فرصتِ صبر و اجر کس کو ہو زندگی تیز گام ہے ساقی

مے کا پینا حرام ہو کہ نہ ہو نہ پلانا حرام ہے ساقی

طالبِ انتقام کیونکر ہوں زندگی انتقام ہے ساقی

درحقیقت حیات و موت ابھی

قصّہ ناتمام ہے ساقی

غزل

(جناب ایس محمد علی فیروز بی ۔ اے)

سُنانی ہو تو پہلے یادِ غم کی داستاں کرلوں
کسی صورت سے یہ رودادیں نوکِ زباں کرلوں

روا ہے عشق میں سجدہ جدھر کرلوں جہاں کرلوں
اِدھر کرلوں اُدھر کرلوں یہاں کرلوں وہاں کرلوں

کہا صیّاد سے بلبل نے ہنگامِ گرفتاری
اگر تھوڑی سی مہلت دو تو سیرِ گلستاں کرلوں

مری تقدیر مجھ کو لے چلی ہے کوئے قاتل میں
کوئی ٹونا کوئی جادو برائے حفظِ جاں کرلوں

یہ کیا جلدی ہے پھر اِسکو جلا دینا مٹا دینا
مکمل آشیانے کو تو لے برقِ تپاں کرلوں

محبت میں بھی تدبیر آخر راس آئے گی
رہیں نامہرباں یہ بُت خدا کو مہرباں کرلوں

بتانِ سنگدل پھر بھی کوئی میری نہ مانیں گے
اگر قبضے میں اپنے میں زمین و آسماں کرلوں

قفس کی قید سے میں بھی ہوں خوش میرا خدا بھی خوش
اجازت ہو تو اے صیاد طوفِ آشیاں کرلوں

ابھی اہلِ چمن واقف نہیں میری طبیعت سے
اگر چاہوں تو میں کانٹوں سے پیدا گلستاں کرلوں

خدا کی شان نے نوشی سے تائب ہوگیا فیروز
ذرا جام و سُبو لانا میں اِسکا امتحاں کرلوں

غزل

(جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی)

چلا آتا ہے اک مستِ شباب آہستہ آہستہ
دعائیں ہو رہی ہیں مستجاب آہستہ آہستہ

حیا کشتہ ہوں میں اُٹھے نقاب آہستہ آہستہ
سکوں سے ہم بغل ہو اضطراب آہستہ آہستہ

کہاں تک دھڑکنیں ہی دھڑکنیں ہستی کے پردوں میں
مغنی چھیڑ اب تارِ رباب آہستہ آہستہ

خود اپنے حسن کا پردہ ہے نورِ سرمدی تیرا
بنے جس طرح مہر اپنی نقاب آہستہ آہستہ

تسلی کی یہ باتیں ہیں کہ تڑپانے کی باتیں ہیں
خموشی، پھر تبسم، پھر خطاب آہستہ آہستہ

مجھے کیا نیند آئے گی کہ ہمدم میں نے دیکھی ہیں
وہ آنکھیں بند ہوتے وقتِ خواب آہستہ آہستہ

شبابِ حسن کی گرمی میں ہے رنگِ حیا شامل
گلِ عارض سے کھنچتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

نہ سمجھا حسن خود بیں ورنہ اتنا دور کیوں کھنچتا
محبت ہو گئی خود اپنا جواب آہستہ آہستہ

کھلی جو آنکھ اُفق پر اک ستارہ جھلملاتا تھا
میں سمجھا تھا کہ جائیگا شباب آہستہ آہستہ

خبر کیا تھی کہ یہ بھی گھات ہے ان حسن والوں کی
متاعِ ہوش لوٹے گا حجاب آہستہ آہستہ

محبت راہ کرتی ہے یونہیں محبوب کے دل میں
کہ جیسے نشہ کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

اثرؔ اس طرح میں مصرعِ ولی کا تو سنا ہوگا
"خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ"

بدل کر قافیہ اس بحر میں غواصِ معنی ہو
رُلیں کچھ اور دُرہائے خوش آب آہستہ آہستہ

فنا ہوگی ہم آغوشِ دوام آہستہ آہستہ
شبستانِ سحر بنتی ہے شام آہستہ آہستہ

ابھی تو رکھی ہے بنیادِ قصرِ خود شناسی کی
عیاں ہوں گے در و دیوار و بام آہستہ آہستہ

مآلِ جبر و استبداد ظاہر ہو کے رہتا ہے
لیا کرتی ہے فطرت انتقام آہستہ آہستہ

کوئی دیکھا کرے آخر کہاں تک خوابِ آزادی
ہوئی جاتی ہے ذہنیت غلام آہستہ آہستہ

اگر محرومِ جادہ ہے تری منزل تو کیا پروا
بنے گا ماہِ نو ماہِ تمام آہستہ آہستہ

حجاباتِ تعین رفتہ رفتہ چاک ہوتے ہیں
کہ دل پر ثبت ہو نقشِ دوام آہستہ آہستہ

چلا اس پر بھی کیا جادو نگاہِ مست ساقی کا
ابھرتا خود بخود ہے خطِ جام آہستہ آہستہ

مجھے محسوس ہوتا ہے یہ تنہائی میں راتوں کی
کوئی لیتا ہے جیسے میرا نام آہستہ آہستہ

فریبِ شوق بے رسوا کئے شاید نہ چھوڑے گا
ابھی تھا کوئی مجھ سے ہمکلام آہستہ آہستہ

جہاں دیکھوں جدھر دیکھوں تو ہی تو ہی تو ہی تو ہے
اٹھا دی شوق نے قیدِ مقام آہستہ آہستہ

دلِ بیتاب کو قابو میں رکھنا ہو گیا مشکل
ذرا اے قاصد سنا اُن کا پیام آہستہ آہستہ

ہوائیں اب سکوں پرور ہیں گلزارِ محبت کی
اثرؔ پختہ ہوا سودائے خام آہستہ آہستہ

ادھورا خواب

(جناب اشعر ملیح آبادی)

آرزوؤں کے محل کتنے بنائے میں نے　　کتنے غم عرصۂ گیتی میں اُٹھائے میں نے
چھٹ چلا تھا مرے ماتھے سے شکستوں کا غبار　　آچلا تھا مری بے چین طبیعت کو قرار
اور جب تجھ سے کسی طرح ملاقات ہوئی　　ایک خوابیدہ تڑپ روح میں پھر چونک اُٹھی
آہ لیکن یہ مرا خواب ادھورا ہی رہا

اوّل اوّل وہ ملاقات میں پردے کا خیال　　خود نمائی کو تڑپنے لگا پھر خود ہی جمال
دل میں شعلہ سا اُٹھا سوزِ دروں سے آخر　　نغمہ بیدار ہوا سازِ جنوں سے آخر
میں نے سوچا تھا جوانی کا اندھیرا گلشن　　مشعلِ سوزِ محبت سے کریں گے روشن
آہ لیکن یہ مرا خواب ادھورا ہی رہا

ربط بڑھتا گیا جذبات اُمڈتے ہی گئے　　شعلۂ حسرت و ارمان بھڑکتے ہی گئے
رس میں ڈوبے ہوئے انداز تری باتوں کے　　مسکراتے ہوئے اقرار تری آنکھوں کے
میں نے سوچا تھا کہ مل جائیں گے دو ٹوٹے دل　　اور ہو جائے گی کلفت سے رہائی حاصل
آہ لیکن یہ مرا خواب ادھورا ہی رہا

رقص کے وقت حسیں جسم ترا بل کھاتا　　مسکرا ہوا جیسے کہ مہکتا شعلہ
وہ لچکتے ہوئے ہاتھوں کے اشارات عجیب　　میں نے سمجھا تھا جگا دیں گے مرا خفتہ نصیب
میں نے سمجھا تھا جوانی کی تڑپتی ہوئی لَو　　ڈال دے گی دلِ تاریک میں اپنا پرتَو
آہ لیکن یہ مرا خواب ادھورا ہی رہا

مطلعِ حسن سے اُٹھتا ہوا خورشیدِ شباب　　سُرخ رخساروں میں کھلتے ہوئے معصوم گلاب
نرم باہوں کا حسیں جال گھنیری پلکیں　　گھنگھروؤں کی وہ صدا جیسے ساغر چھلکیں
میں نے چاہا اسی ماحول میں ہم کھو جائیں　　تیری زلفیں مری آغوش میں وا ہو جائیں
آہ لیکن یہ مرا خواب ادھورا ہی رہا

رسم و اوہام کے گنبد سے میں ٹکرا نہ سکا　　سازِ عشرت یہ حسیں گیت کوئی گا نہ سکا
آنسوؤں سے ہیں بھرے پھر مری آنکھوں کے ایاغ　　پھر بجھے جاتے ہیں بے چین تمنا کے چراغ
پھر وہی صبر، وہی ضبط، وہی اضمحلال　　وہی افسردگی و بے بسی و درد کے جال
زندگی کا یہ حسیں خواب ادھورا ہی رہا

ہنوز یہ غلام ہیں

از اظہار ملیح آبادی (پونہ)

مرے تخیلات کے ہنوز یہ غلام ہیں

گلوں کے سُرخ جام ہیں — نشاط کے پیام ہیں
حسین قصر و بام ہیں — لطیف صبح و شام ہیں
یہ "مہوشوں" خرام ہیں — یہ "آتشیں" کلام ہیں
یہ "دلنواز" نام ہیں — یہ "جاں شکار" دام ہیں
رُخانِ لالہ فام ہیں — لبِ نشاط کام ہیں

یہ سب مرے غلام ہیں

مرے لئے یہ مہر و ماہتاب و صبح شام ہیں
مرے تخیلات کے ہنوز یہ غلام ہیں

ہنوز یہ غلام ہیں

(۲)

یہ مہر و ماہ و کہکشاں — یہ گلستاں یہ بوستاں
قریبِ نہر جھاڑیاں — کنارِ بحر کشتیاں
یہ کہسارِ دلستاں — یہ آبشارِ رازداں
یہ شب انیسِ جاوداں — سیاہیوں کے کارواں
یہ چاندنی رواں دواں — اِدھر اُدھر یہاں وہاں

مری تخیلِ حکمراں

یہ ابر و باد و بحر و بر مرے سبو و جام ہیں
مرے تخیلات کے ہنوز یہ غلام ہیں

ہنوز یہ غلام ہیں

(۳)

یہ پیروانِ بندگی — یہ نکتہ دانِ بیخودی
یہ شورشیں یہ بے حسی — ہنر اجنرا غمی خوشی
یہ دشمنی یہ دوستی — یہ اختیار بے کسی
یہ کُشتگانِ دلبری — یہ نغمہ خوانِ مے کشی
ہمیبری یہ داوری — یہ جنستی یہ دوزخی

اذاں کبھی فغاں کبھی

مرے لئے یہ خود مری نظر کے انتقام ہیں
مرے تخیلات کے ہنوز یہ غلام ہیں

ہنوز یہ غلام ہیں

(۴)

یہ ابر و باد و بحر و بر — یہ ماہ و انجم و قمر
شرابِ سُرخ و جامِ زر — لبِ نشاط و چشمِ تر
شفق کے لعل و نگار در — گلوں کے مے فشاں گہر
لبِ جنونِ فتنہ گر — "خدا" بھی اک مری نظر
یقیں نہ آئے گا مگر — کھلا ہے زندگی کا در

مرے "خدا" سے پیشتر

شراب ہے نئی مگر ابھی وہ کہنہ جام ہیں
مرے تخیلات کے ہنوز یہ غلام ہیں

ہنوز یہ غلام ہیں

ایک گیت

(حضرت نور بجنوری)

وہ ایک گیت جسے آج تک میں گا نہ سکا

دل و دماغ کو میرے جلائے دیتا ہے
نگاہ و نطق میں شعلے بسائے دیتا ہے
حواس و ہوش کے ٹکڑے اُڑائے دیتا ہے

یہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے سائے کی مانند

کبھی شفق کی دہکتی ہوئی ہنسی بن کر
کبھی ستاروں کی مغموم روشنی بن کر
کبھی عروسِ چمن کی فسردگی بن کر

میں دیکھتا ہوں شب و روز جھلکیاں اسکی

حسین آنکھوں کی خاموش التجاؤں میں
ضمیرِ روح پہ چھائی ہوئی گھٹاؤں میں
سمادھیوں میں مزاروں میں اور چتاؤں میں

ابھی یہ گیت فضا میں رہے گا آوارہ

ابھی جنونِ محبت کو اتنی تاب کہاں
ابھی خرابِ غمِ زندگی خراب کہاں
ابھی نصیب مرے دوست وہ رباب کہاں

مگر وہ لمحۂ مسعود آئے گا اک دن

کہ ذرہ ذرہ یہی گیت گائے گا اک دن

حیاتِ تلخ

(حضرت ضیاء الاسلام)

آج کیوں سرد ہوتی جاتی ہے محفل دل کی
آج کیوں بربطِ شوریدہ میں آواز نہیں
آج کیوں شمعِ فروزاں سے دھواں اُٹھتا ہے
آج اک بھی میرا ہمدم مرا دمساز نہیں

ہاں مگر محفلِ عالم کا یہی رنگ ہے آج
نابلد ہو گئے رسم و رہِ الفت سے عوام
ورنہ قرآن کے سیپاروں کو یکجا کر کے
یکجہت ہو کے بناتے نئی وحدت کا نظام
اک نئے عہد کا بس ہوتا اسی سے آغاز

آج پیراہنِ صد تار فروزاں ہے ندیم
آج ملت کا مگر حال زبوں ہوتا ہے
دل ہر اک صاحبِ ادراک کا خوں ہوتا ہے
اور مرا خواب پریشان ہوا جاتا ہے
میرے گہوارۂ ملت کا خوش آئنہ سا خواب

زندگی کیا یونہی تلخابی میں گذرے گی ندیم؟
کیا یونہی میرے نشیمن میں رہیں گے اغیار؟
کیا کبھی میری خودی رنگ نہ لائے گی ندیم؟
کیا یہ خاکسترِ انساں نہ سلگے گی کبھی ؟
کیا مرے باغِ تمنا میں نہ پھوٹے گی کلی؟

جاری کردہ :- جنرل ٹاکیز لمیٹڈ، چاندنی چوک دہلی

آنکھیں ہوں تو ادھر آئیے

پربت پہ اپنا ڈیرا

ڈائرکٹر دی، شانتارام کا فلمی معجزہ

راجکمل کلامندر کی پیشکش

اداکاران :- ونمالا، الہاس، شانتارن اور دیگر جگمگاتے ہوئے ستارے

نوولٹی سینما دہلی میں ۱۷ مئی سے مقبولیت کی حد پر پہنچ گیا ہے

Regd. L No. 4796 May 194[illegible]

THE ADEEB

DELHI

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only; single copy Rupee one
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th, please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communicatins should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at 'Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi
Edited by Fasi-ud-din Ahmed M. A. and M. L. Wahidi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal Delhi.

نہلا - فلم '' پرتھوی راج سنجوگتا '' میں

دعوتِ نو

(شہاب ملیح آبادی)

آؤ نظامِ دہر کو زیر و زبر کریں
ساغر اٹھائیں، خدمتِ نوعِ بشر کریں

تہذیبِ عصرِ نو کو دکھائیں رہِ جدید
پیدا زمیں سے چرخ مزاجِ دگر کریں

اس خاکدانِ دہر میں دل ہی عجیب شے
قرباں اس پہ دولتِ ایوانِ زر کریں

مُدت سے ہے سفینۂ دل خشکیوں میں غرق
دل کو شرابِ ناب کی موجوں سے تر کریں

ہم تیرہ دل ازل سے ہیں ظلمت کے میزباں
اب گل کھلائیں، دعوتِ شمس و قمر کریں

صہبا کی بوند بوند ہے شمشیرِ آبدار
اب عزمِ فتحِ ارض و سما بے خطر کریں

کافی نہیں ہے دہر میں آغوشِ بوئے گل
خاروں کی سمت بھی کبھی مُڑ کر نظر کریں

رُک رُک کے منزلِ غمِ ہستی نہ ہوگی طے
اب بڑھ کے کائنات کو زیرِ نگیں کریں

اِس لمحۂ عزیز کو سمجھیں عزیز تر
کم اعتبارِ عمرِ مسیح و خضر کریں

آگے اٹھا چکا ہے قدم کاروانِ عقل
تعمیرِ بام ہو چکی اب شرحِ در کریں

اب ہند میں کہاں ہیں شہاب ایسے بادہ نوش
کم ہیں جو موجِ بادہ سے کسبِ ہنر کریں

THE ADEEB DELHI

جون جولائی [illegible]

مسٹر امین شرقپوری

اڈیٹرز: حافظ فصیح الدین احمد ایم اے، محمد سید مرتضیٰ واحدی

ضروری اطلاع

مئی کے پرچے کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی ہے متعدد اسباب
نے مل کر ہماری مساعی کے خلاف کچھ ایسی سازش کی کہ وہ
مشکور نہ ہوسکیں۔ اس غرض سے کہ آئندہ پرچہ وقت پر نکلجائے
ہم جون اور جولائی کا مشترکہ نمبر نکال رہے ہیں۔ ہم قارئین کرام کو
اس سے کوئی نقصان نہ پہونچنے دینگے۔ جن حضرات کو وی پی
مئی میں بھیجا جاتا وہ اب ہم اگست میں روانہ کرینگے۔
انشاء اللہ اگست سے ہر پرچہ وقت پر ضرور نکلے گا۔
ہم ہر نوع سے مسلح ہو کر حالات پر قابو پانے کے لیے
اپنے کو تیار کر چکے ہیں۔

مینیجر

سالانہ چندہ دس روپے علاوہ محصول

قیمت فی پرچہ ایک ... محصول

ادیب

DELHI

اڈیٹرز

سید محمد ارتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم اے — شہاب ملیح آبادی

جلد	جون، جولائی ۱۹۴۶ء	نمبر ۹، ۱۰

فہرست مضامین

نئی کتابیں

(شہاب ملیح آبادی)

ن ۔م۔ راشد پر۔ از جناب حیات اللہ انصاری صاحب۔ ملنے کا پتہ۔ افسانہ سیں ۱۹۱ کوچہ پنڈت دہلی۔ قیمت کتاب عکر

اس کتاب کا مصنف چھپا رستم نکلا۔ ابھی تک تو یاران رہگذر ان حضرت کو صرف افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے حیات اللہ انصاری کسی ہم عصر افسانہ نگار سے پیچھے نہیں ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ افسانہ نگار نقاد کی حیثیت سے بھی جودتِ طبع دکھا کر بہتے کی باتیں کہہ سکتا ہے۔

ن۔م۔ راشد کی شاعری میں جو "نیا پن" ہے اس سے کچھ "چھچھا پن" بھی پیدا ہوگیا ہے۔ اور اسی چھچھے پن کو دیکھ کر اکثر لوگوں کی رال ٹپک جاتی ہے۔ راشد کی ایک نفسیاتی الجھن کا ستایا ہوا شاعر ہے جو زیادہ تر لذتیت کی تمناؤں کا شکار ہو جاتا ہے۔

حیات اللہ نے راشد کی شاعری پر "کھل" کر نظر ڈالی ہے اور اس نقاد نے راشد کی شاعری کے جو پہلو علم النفس کی روشنی میں اُجاگر کیے ہیں وہ قابلِ داد و ستائش ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ راشد کا بیشتر حصۂ کلام نفسانی جذبات کا آئینہ دار ہے اور یہ جذبات بھی ہموار سطح نہیں رکھتے بلکہ انہیں نفسیاتی الجھنوں کے بے شمار پیچ و خم اور محرومی و آسودگی کی تعداد ناہمواریاں ہیں۔ ان نفسیاتی الجھنوں میں جیسا حیات اللہ نے ثابت کر دکھایا ہے "توجہ کی کمی، ایذا دہی، ایذا طلبی، ضمیر کی کسک، جذباتی کشمکش، اور جذبۂ تخلیق کی کمی کی نمایاں آمیزشیں ہیں"۔

راشد کا کلام عورت کے محور پر رقص کرتا ہے اور شاعر عورت ہی کی فطرت، اُس کی فطرت کے مقتضیات اور اُس کے حلقۂ فرائض کی اہمیت و نوعیت سے ناواقف ہے۔ حیات اللہ نے اِس پہلو پر بھی اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔

مصنف نے راشد کی شاعری کے ساتھ ساتھ آخری اوراق میں کرشن چندر کے تعارف پر بھی نکتہ آرائیاں کی ہیں۔ اوّل تو کرشن چندر کی ذات عرفانِ شعر کے لیے تاریک اطمینان نہیں۔ دوسرے اُن کا مقدمہ ایک کھُلی ہوئی سفارش ہے تنقیدِ شعر نہیں ہے۔ حیات اللہ نے کرشن چندر کے الفاظ کو اچھی طرح کسوٹی پر پرکھا ہے۔

کتاب مطالعہ کے قابل ہے۔ وہ لوگ جو راشد کی شاعری پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو راشد کے ذہنی و نفسیاتی تلاطم کو نہ سمجھ کر اُس سے بیزار ہیں، دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ ہر چند کتاب اپنے تن و توش کے اعتبار سے نحیف الجثہ ہے، مگر ادب کے تمام وثامن اس کی صحت پر صرف کیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استدلال کے ہونٹوں پر شگفتگی اور تنقید کے عارضوں میں سُرخی و تازگی موجود ہے۔

"بدلیاں" از سحاب آغا شاعر قزلباش۔ ملنے کا پتہ نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی۔ شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دہلی۔ قیمت کتاب عہ

یہ سحاب کے سترہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ میں نے یوں ہی ورق الٹا تو ایک افسانے کی سُرخی سامنے آئی "کس قدر رنگین ہے راہِ محبت کا فریب"۔ اِس سے پہلے میں نے سحاب کے افسانے نہیں پڑھے تھے یہ افسانہ جس کا عنوان ایک مصرعہ ہے، میں نے پڑھا۔ اس کے بعد دو تین افسانے اور دیکھے۔ اپنی رائے کو تولنے کے لیے میں نے ابتدائی اوراق میں کسی مشہور شخصیت کا "تعارف نامہ تلاش کیا" موجود تھا۔ جی خوش ہوا۔ جی اس بات پر خوش ہوا کہ سحاب نے عام روش سے ہٹ کر کسی "سفارش نامے" کی ضرورت نہیں سمجھی یہ خود اعتمادی کی نشانی ہے!

سحاب کا لکھا ہوا مقدمہ پڑھا کہ دیکھوں یہ لڑکی خود اپنے متعلق کیا رائے رکھتی ہے؟ منہ سے بیساختہ یہ لفظ نکل گیا "لعنت"! جی اس بات پر خوش ہوا تھا کہ اس لڑکی میں خود اعتمادی ہے، مقدمے نے اسی خوشی پر پانی پھیر دیا ——— اپنے متعلق اتنی گھٹیا رائے اور رائے عامہ کی "تھڑی تھڑی" کا اتنا خوف!

سحاب کے دو تین افسانے پڑھ کر جی خوش ہوا۔ افسانے کے تیور اُمید افزا مستقبل کی طرف اشارہ ہیں۔

پریم چند کے بعد ہمارا افسانوی ادب بہت آگے بڑھ گیا ہے اور برابر آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ ترقی پسندی کی لہر اُس کی کشتی کو برابر

آگے رینگ رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود فطری اعتبار سے ہمارا افسانوی ادب ایک ٹھٹکا ہوا قدم ہے۔ پریم چند جو کچھ کہتے تھے اُسے سمجھتے بھی خوب تھے اور جو کچھ سمجھتے تھے اُسے اچھی طرح کہنا بھی جانتے تھے۔

سحاب تو سحاب چوٹی کے افسانہ نگار بھی پیچیدہ نگاہی کے شکار ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ حیاتِ خارجی اور کیفیاتِ داخلی کو ہم آہنگ نہیں کر سکے ہیں۔ حقیقت نگاری رومان کے دلدل میں ہے تو رومان حقیقت نگاری کی زبردست گرفت میں۔ دونوں میں شرکتِ مقتضیاتِ حیات نہیں ہے۔

سحاب کے افسانے کی خامیاں جذبات کی شدت اور مطالعے کی کمی ہیں ورنہ مجموعی اعتبار سے تمام افسانے ایک اُمید افزا مستقبل کا آئینہ دکھا رہے ہیں۔

سحاب کی زبان میں شگفتگی ہے، ہماری دعا ہے کہ وہ آسمانِ ادب پر سحاب بن کر محیط ہو جائیں۔

1919

موت سے پہلے " از پروفیسر احمد علی صاحب ایم اے۔ ملنے کا پتہ نفشا پریس کوچہ پنڈت دہلی، قیمت کتاب ۶/۔

اردو دنیا میں پروفیسر احمد علی نو وارد نہیں۔ ایک جوان سال و پختہ خیال، شہرت پرور شش ادیب ہیں۔ "قید خانہ" "ہماری گلی" "شعلے" "انگارے" وغیرہ کا مصنف لائقِ صد احترام ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر موصوف انگریزی ادب کی دنیا میں بھی معروف ہیں۔ اُن کی انگریزی تصانیف گنگناتی اُمنگوں کے ساتھ قطع راہ میں سرگرم ہیں۔ میں نے پہلے پہل اُن کا نام "انگارے" کے سلسلے میں سنا تھا۔ اس کتاب کے نام سے آج بھی خیالات کے بدن پر جھرجھری سی محسوس ہوتی ہے۔ اُس کتاب سے پروفیسر ایک ڈراؤنی صورت میں تخیل کے سامنے آتے تھے۔ میں نے جب احمد علی کو مادی آنکھوں سے دیکھا تو روحانی سکون نصیب ہوا۔

کتابِ زیرِ تنقید میں احمد علی نے اپنے مخصوص انداز میں مرگِ حیات اور مرگ و حیات کی تمناؤں کے باہمی تضاد کو پیش کیا ہے۔ ہیرو کا کردار بڑی تخیلی گہرائی کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ روحِ انسانی کی لرزشیں ہر حرف کے تار میں جھنا جھن بج رہی ہیں۔ کہیں کہیں اندازِ بیان کے باعث الجھاؤ ضرور ہے جس سے مطلب عام فہم سے بالا ہو جاتا ہے، معلوم نہیں کہ یہ اُلجھاؤ کی بلندی ہے کہ فہمِ عامہ کی پستی۔

افسانے کے اختتام پر آرٹ، سیاست، اور زندگی کے متعلق پر دلچسپ و نکتہ رس خیالات کی گونج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند مصنفین میں بیشتر ادیبوں نے آرٹ کو پراپیگنڈے اور فوٹو گرافی تک محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ آرٹ جیسا احمد علی نے دکھایا ہے بلند تر شے ہے۔ ترقی پسند مصنفین اس باب کو ضرور پڑھیں۔ کیونکہ وفورِ جذبات اور عقیدہ پرستی کے نشت و شو سے اکثر مصنفین کے خطِ رخ پر "ریشِ دراز" کا سبزہ اُگتا دکھائی دے رہا ہے۔ احمد علی کا "سیفٹی ریزر" بال صفا کا کام دے گا جس سے خط و خال کی تازگی و رعنائی کی خاطر استفادہ ضروری ہے۔

ایک کاروباری از اختر اُرینوی صاحب۔ ملنے کا پتہ نگارستان ایجنسی اُردو بازار دہلی، شائع کردہ ہندستانی پبلشرز دہلی، قیمت کتاب ۱۲/۔

اختر صاحب کی کاوشِ تخلیق کئی کتب کو جنم دے چکی ہے۔ افسانے کے جرم میں اُن کے خط و خال مانوس و مقبولِ عام ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے کاروباری ہیرو کا کردار بڑی خوش اسلوبی اور نکتہ رسی سے پیش کیا ہے۔ خانگی کشمکش اور ہیرو کی ذہنی پیچیدگیوں اور متلاطم ہنگامہ آرائیوں پر بصیرتِ نفس کی ایسی روشنی ڈالی ہے کہ پڑھ کر مزا آ جاتا ہے۔ عورت بیوی کی حیثیت سے کیا سوچتی ہے، کیا کرتی ہے، یہ کوئی "ایک کاروباری" مصنف ہی سے پوچھے۔ مختصر طور پر کرداروں میں ایک انوکھا پن پیدا کرنے میں شریکِ بصیرت ہیں۔ کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔

چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی، مگر بن کہے بھی چارہ نہیں، اکثر محاورات اور الفاظ ڈنک مار دیتے ہیں۔ جس لفظ نے میرے سینے پر نیشِ عقرب کا کام کیا وہ لفظ "وجوہات" ہے۔

ایک جگہ اختر صاحب لکھتے ہیں: "پاپ اُس کے منہ سے مستقل طور پر وصل ہو گیا تھا" کہاں کا لفظ کہاں پہونچا، نشیب و فراز میں تبدیل ہو گیا۔

مجموعی حیثیت سے کتاب بہت دلچسپ اور مبنی بر حقیقت ہے۔

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

سماج کا راج

(از واحدی)

آپ نے دیکھا ہوگا۔ شہروں میں بڑے بڑے میدان صاف کرکے گھاس لگادی جایا کرتی ہے۔ تاکہ لوگ تھوڑی بہت کھلی ہوا کھا سکیں۔ گھاس بیٹھنے کے لیے ہوتی ہے۔ گھاس کو راستہ بنانے سے روکا جاتا ہے۔ راستے گھاس کے پاس بھری پڑے ہوتے موجود ہوتے ہیں۔ مگر لوگ روکنے کی پرواہ نہیں کرتے۔ چوکیدار نے دیکھ لیا اور گھاس روندنے والا اکیلا دکیلا ہوا تو ہٹ گیا ورنہ بالکل نئی لیکھ بنتی رہتی ہے۔ آخر منتظمین سمجھ جاتے ہیں کہ جو راستہ ہم نے تجویز کیا تھا وہ ٹھیک نہ تھا۔ خلقت اِدھر سے چلنا چاہتی ہے اور پھر اس زبردستی کی بنی ہوئی لیکھ کو خوبصورت روش میں تبدیل کردیا جاتا ہے۔

یہی حال دنیا کی ہر بات کا ہے۔ سماج جس معاملہ میں جو روش اختیار کرلیتی ہے وہی مقبول ہو جاتی ہے۔

میں نے آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ لیکن آنکھوں دیکھے برابر ہے۔ میرے مکان کے بالکل سامنے مسجد ہے۔ مسجد اور مکان کے درمیان کی سڑک پر سے سر سید احمد خاں بانیٔ علی گڈھ کالج پالکی گاڑی میں گذرے۔ علی گڑھ سے اپنے گھر آئے تھے۔ گھر قریب ہی ہے۔ مغرب کا وقت تھا۔ نمازی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔ سر سید پر نظر پڑنی تھی کہ نمازیوں نے چلانا شروع کیا: "یہی ہے وہ کافر جو انگریزوں سے مل گیا ہے۔ مسلمان بچوں کو انگریزی سکھا کر بے دین بنا رہا ہے" وغیرہ وغیرہ۔

نوجوانوں نے دو چار کنکر پتھر بھی پھینک دئے۔

انگریزی تعلیم انگریزی لباس۔ انگریزی رہن سہن۔ غرض انگریزی کی تمام چیزوں سے میرے بچپن تک اسّی فی صدی مسلمانوں کو نفرت تھی۔ اور میرے بچپن سے پہلے شاید نوے فیصدی بلکہ سو فی صدی کو نفرت ہوگی۔ آہستہ آہستہ یہ نفرت رغبت سے بدلی اور اب اسی محلہ میں لڑکے کیا لڑکیاں انگریزی خواں اور انگریزی داں جتنی چاہے لے لیجئے۔ گریجوایٹ لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد مسلمانوں میں برابر بڑھ رہی ہے۔ علماء اور مشائخ اپنی اولاد کے سروں پر شریعت اور طریقت کی دستاریں بندھوانے کی بجائے ایم۔اے اور بی۔اے کی ہُڈ (ٹوپیاں) رکھواتے ہیں۔ دین کا عالم کہلانا تو ابھی تک عالم ہے۔ مگر حکومت مسلمانوں کے دل اور دماغ پر انگریزی علوم کے عالم کی ہے۔ ایم۔اے، بی۔اے اور بیرسٹر کی۔ یہ ایم۔اے، بی۔اے اور بیرسٹر ہی کسی عالمِ دین کو ابھار دیں تو خیر ورنہ دین کی قوتِ پرواز آجکل معطل ہے۔ مسلمان سماج نے آسمان سے اُتار کر عالمِ دین کو زمین پر لا بٹھایا ہے۔ اور ایم۔اے، بی۔اے، بیرسٹر کو آسمان پر چڑھا دیا ہے۔

سر سید لڑکوں کو انگریزی پڑھوانی چاہتے تھے۔ لیکن لڑکیوں کے مدرسے اور کالج کھولنے کے سخت خلاف تھے چنانچہ علی گڈھ کے زنانہ کالج کی خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب نے بنیاد ڈالی تو سر سید ناخوش ہوتے تھے۔

سر سید کے ساتھی شمس العلماء مولوی نذیر احمد کا ایک فقرہ یاد آگیا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے ان سے پوچھا "آپ کی پردہ کے متعلق کیا رائے ہے؟" ہنس کر بولے "لڑکوں کے پردہ کو پوچھتے ہو یا لڑکیوں کے پردہ کو۔ بھئی زمانہ وہ آگیا ہے کہ میں تو کہتا ہوں لڑکے بھی پردہ میں بٹھا دیے جائیں۔"

نواحِ علی گڈھ کے کسی رئیس کا سچا واقعہ ہے۔ یہ فرمول اور متوازن دماغ کے رئیس تھے۔ مکان کی چھت پہ چار دیواری کے پاس اُن کی بیوی کھڑی تھیں۔ انگڑائی جو آئی۔ ہاتھ اوپر اٹھ گئے اور دیوار کی منڈیر پر جا ٹکے۔ وہیں رئیس موصوف تشریف فرما تھے۔ اِدھر ہاتھ ٹکے اُدھر لکڑی پڑی اور انگلی ٹوٹ گئی۔

۱۹۰۱ء میں کوئی مسلمان ڈپٹی کلکٹر دیہات کا دورہ کر رہے تھے۔ اہل و عیال بھی ساتھ تھے۔ جنگل میں خیمہ لگا ہوا تھا اور ڈپٹی صاحب کہیں کام پر جاچکے تھے۔ خیمہ میں آگ لگ گئی۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے بچوں کو تو باہر نکال دیا اور خود خیمہ میں جلکر جان دیدی۔ اِس واسطے کہ اُس وقت سماج اسی درجہ کے پردہ کی قدر کرتی تھی۔

[illegible] بارہ سال سے زیادہ کی بات نہیں۔ میرے عزیزوں کا [illegible] معمر خاتون ریاست الور سے آکر اپنی بھتیجی کے ہاں [illegible] جا کر ٹھہریں۔ بھتیجے کا گھر بھر سیر کا شوقین تھا۔ [illegible] مہینے میں کئی پھیرے قطب صاحب کے ہو گئے۔ بزرگ خاتون نے اسے محسوس کیا اور کہا "لڑکیو! ابھی تو پچاس برس ہوئے کہ ایک دفعہ سڑک پر سے بتایا تھا کہ وہ ہے قطب صاحب کی لاٹھ۔ الور کی ریل نہیں نکلی تھی۔ بیل گاڑی میں دلی سے الور جاتے تھے۔ سو بیل گاڑی میں سے جھانک کر قطب صاحب کی لاٹھ کی زیارت کرنے کی تو میں گنہگار ضرور ہوں۔ باقی تمہاری طرح پھیرے پھیرے قطب صاحب، پھیرے پھیرے قطب صاحب کوئی اتنا سیلانی [illegible] ہو"

۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے میرے مکان سے صرف اسّی گز کے فاصلہ پر مکان لیا۔ دونوں اوّل تو ویسے ہی بھاری بھرکم تھے۔ پھر عظیم الشان مکان کے کرایہ دار، ساز و سامان اور کرّ و فر۔ شہرت عام کی ابتدا تھی۔ تاہم محلّے والوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ غیر معمولی شخصیتیں ہیں۔ اس کے باوجود جب پہلی بار یہ دونوں بھائی بیویوں کا برقعے اڑھا کر اور تانگوں میں بٹھا کر۔ تانگوں کے گرد چادر لپیٹے بغیر سڑک پر آئے تو کھڑکی کھڑکی بج گئی۔

قاعدہ یہ تھا کہ خواتین جب تانگہ میں نہیں پالکی گاڑی میں سوار ہونے لگتیں تو ناکہ بندی کر دی جاتی تھی اور کسی مرد کی مجال نہ ہوتی تھی کہ مقررہ حد سے آگے گاڑی کی طرف قدم بڑھا سکے۔ اس اہتمام کے بعد گاڑی کے آگے اور پیچھے چاندنیاں اور چاجمیں تانی جاتیں۔ تب بیگم صاحبہ آکر گاڑی میں بند ہوتیں۔ آج اس طرح گاڑیوں میں بیویوں کو سوار کرایا جائے تو سماج شاید مذاق اڑائے۔ پردہ کے دور اور عورتوں کے انگریزی پڑھنے سے قبل کے دور کی کل نسوانی خصوصیات پردہ کی کمی اور انگریزی تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ مفقود ہو رہی ہے اور سماج اس پر شاداں و فرحاں ہے۔ معیارِ شرافت بدل گیا ہے۔

مجھے [illegible] ایک عورت کی کئی کئی شوہر [illegible]

جس طرح مسلمانوں کے ہاں جائز ہے کہ ایک مرد چار بیویاں کرے بشرطیکہ چاروں سے یکساں برتاؤ کر سکے۔ مسلمانوں کا چار بیویاں کرنا یا کر سکنا دوسری قوموں کے لیے عجیب ہے۔ اور ہم مسلمان غیر مسلم "مقدس عورتوں" کے کئی کئی شوہر سن کر حیران ہوتے ہیں۔ یا چار بیویاں نہ کر کے زیادہ عورتوں کے ساتھ بے ضابطہ تعلق رکھنا ہماری عقل میں نہیں آتا۔ یہ سب سماج کے کھیل ہیں۔ ہماری سماج نے ہماری ایک ذہنیت بنا دی ہے۔ دوسروں کی سماجوں نے دوسروں کی ذہنیت بنا دی ہے۔

پردہ دار سواریوں کا تو اب پرانی دِلّی میں بھی نام و نشان نہیں رہا۔ لیکن ابھی پرانی دلّی میں عورتیں برقعے اوڑھ کر تانگوں اور رکشاؤں میں یا پیدل پھرتی ہیں۔ اور کوئی انگلی نہیں اٹھاتا۔ مگر نئی دِلّی جا کر برقعہ اوڑھنا تماشہ بنتا ہے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو غدر ۱۸۵۷ء کے سہمے ہوئے بزرگوں سے میرا سابقہ پڑا۔ یہ بزرگ انگریزوں سے نفرت بھی کرتے اور اُن سے ڈرتے بھی تھے۔ ایک گورا دکھائی دے جاتا تو انھیں ۵۷ء یاد آ جاتا۔

ہندوؤں نے بے شک انڈین نیشنل کانگریس قائم کر لی تھی۔ اور جنوبی ہند کا ایک آدھ مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک تھا۔ مگر اس وقت کی انڈین نیشنل کانگریس میں اور پچھلی جنگ عظیم کی امن سبھاؤں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ لوکمانیہ تلک کا کانگریس پر قبضہ ہوا تو کانگریس نے آزادی کا نام لینا شروع کیا۔ شمالی ہند کے بھی دو مسلمان تلک کے ہم نوا تھے۔ ایک مولانا حسرت موہانی۔ جو اب مسلم لیگی کہلاتے ہیں۔ اور ایک سید حیدر رضا دہلوی جن کا سیاسیات سے زیادہ عرصہ تعلق نہیں رہا۔ ریاست حیدرآباد میں کہیں وکالت کرتے ہیں۔ حیدر رضا صاحب زبردست مقرر تھے۔ ان کی تقریریں سننے کو میرا جی چاہتا تھا۔ مگر ۵۷ء دیکھے حضرات کی صحبت نے ایسا پست ہمت کر دیا تھا کہ جلسوں میں شرکت کرتے ہوئے جی خوف کھاتا تھا۔

آخر گاندھی جی۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا دَور آیا۔ انہوں نے تھوڑے عرصہ کے واسطے سارے ملک کو متحد کر دیا۔ کانگریس صرف ہندوؤں کی نہ رہی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی ہو گئی۔ یہ اتحاد جاری رہتا تو شاید آج سے بہت پہلے ہندوستان آزادی حاصل کر لیتا۔ تاہم مئی ۱۸۵۷ء سے بیس اور تیس برس کے اندر اندر پیدا ہونے والوں کو مئی ۱۹۴۷ء میں اللہ نے اتنا دکھا دیا کہ آقا خود غلاموں کے پاس تشریف لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھئی ہم تمہیں تمہارا ملک واپس کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں بتاؤ واپسی کی شکل کیا ہو۔ ہندو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کی شرط بھی ختم۔ ہماری رخصتی کا انتظام کرو۔
ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں مری مان جائیے
اللہ تیری شان کے قربان جائیے

یا وہ ڈر تھا کہ تنہائی میں انگریز کی مخالفت نہ کی جا سکتی تھی اور "دیوار ہم گوش دارد" کی نصیحت فراموش نہ ہوتی تھی یا گاندھی جی نے اہنسا اور ستیہ گرہ کے عجیب اور انوکھے ہتھیاروں سے انگریزوں کا خوف بھی کھو دیا اور انگریزوں سے ملک بھی واپس دینے کا فیصلہ کرا لیا۔ صرف ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔ یعنی ہندو مسلم اتحاد کی آنچ کی کسر ہے۔

سماج جو چاہے وہ نہ ہو یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں سماج کو کیا چاہنا چاہیئے یہ سماج کے دل میں غیر معمولی اشخاص ڈال سکتے ہیں اور ڈالتے ہیں۔ لیکن عموماً رہنمائیوں کی بجائے بے راہ رویوں کا اثر سماج پر زیادہ ہوتا ہے اور رحمان کی نسبت شیطان کا سماج پر زیادہ غلبہ رہتا ہے۔ ضرب المثل نہیں سنی "دین سے دنیا رکھنی ضروری ہے"۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماج میں آخری پچاس سال میں جتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں اتنی تبدیلیاں کم ہوا کرتی ہیں۔ اور ابھی دیکھئے ان آنکھوں کو کیا کیا دیکھنا ہے۔

عرشِ غیبی سے سو صحیفوں کا   لمحے لمحے نزول ہوتا ہے
تو ہے گر نائلِ جہان بینی   ذرہ ذرہ رسول ہوتا ہے

اپنا دن ہے نہ رات، اے ساقی   اک جنوں ہے حیات، اے ساقی
نبضِ عالم کی ہے دھمک اِس میں   رکھ مرے دل پہ ہات، اے ساقی

سرمستِ جہانِ گزراں ہے ساقی   کونین ہے یا صحنِ جہاں ہے ساقی
آ جا کہ رگِ ارض و سما میں امشب   خونِ غضبِ عہدِ جواں ہے ساقی

بیگانۂ اسباب بنانا تجھ کو   وہ دولتِ نایاب بنانا تجھ کو
ظلمت سے اگر تو نہ کنارا کرتا   میں مہرِ جہاں تاب بنانا تجھ کو

یہ گردشِ ایام ہے میرے دل میں   یا زہر کا اک جام ہے میرے دل میں
رہتا ہوں خوشی میں بھی ملول و غمگیں   کس قہر کا کہرام ہے میرے دل میں

خدا شاہد ہے بندے کی گواہی   بہ جبرِ خیر ہے اک رسم واہی
لبوں پر ہے خدا، دل میں نہیں ہے   معاذ اللہ! ذوقِ حق پناہی

لباسِ خیر و شر کو چاک کر دے   بشر کو صاحبِ ادراک کر دے
اگر رہنا ہے تجھکو اس زمیں پر   زمیں کو وادیِ افلاک کر دے

جو خیر سے طباع ہے دل کا بد ہے   نیکی سے ذہانت [illegible] کی ہے کد ہے
دنیا میں بخیر ایسے بشر ہیں نایاب   اس دور میں اس عقل پہ ہیں حد ہے

سلسلہ ... علی گڑھ

قندِ پارسی

(جنابہ رُشدہ بنت نکہت شروانی)

زندہ دل اور ترقی پسند اقوام اپنی صاحبِ فہم و ذکا ہستیوں کی خداداد قابلیت سے ہر ممکن طریقہ سے مستفید ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ اہلِ ہنر حضرات کی وہ حوصلہ افزائی ہوتی ہے کہ ان کا نام شہرت کے ساتویں آسمان پر روشن ستارہ کی طرح چمکنے لگتا ہے زندگی میں جو قدر و منزلت ان کی ہوتی ہے اس کا تو پوچھنا ہی کیا۔ مگر بعدِ مرگ بھی ان کا نام ان کے کمالات کے باعث حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے۔ بعد کے لوگ جب ان کے نتیجۂ فکر پر غور کرتے ہیں تو متحیر ہو جاتے ہیں کہ کیا کیا عنقا دماغ تھے اور کتنا بلند تخیل۔

ایشیا کے بعض ممالک میں ترقی اور روشن دماغی کا آغاز اس زمانہ سے ہوتا ہے جب کہ یورپ (جو کہ موجودہ زمانہ میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا ہے) بربریت اور جہالت کی تاریکیوں میں گم تھا۔ ایشیائی اقوام راہِ ترقی پر گامزن تھیں۔ لہٰذا شروع ہی سے انہوں نے اپنے اہلِ ہنر حضرات کی قدردانی کی۔ کس قوم نے کس فن میں کیا کیا کمالات حاصل کئے؟ یہ تو خارج از بحث ہے۔ مگر یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جو عروج فارسی شاعری کو کسی زمانہ میں حاصل ہوا وہ آج تک ہزاروں زبانوں کے لیے قابلِ رشک بنا ہوا ہے۔ خلوت و جلوت۔ لڑائی جھگڑا۔ صلح صفائی۔ طعن و تشنیع۔ مدح و قدح غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں شعر و شاعری کو دخل نہ ہو۔

کسی زمانہ میں بدیہہ گوئی اپنے پورے عروج پر تھی۔ بدیہہ گو شعرا بادشاہانِ وقت کے خاص لطف و عنایت کا مرکز بنے رہتے۔ ان کے دم سے محفلیں چمک اُٹھتیں۔ طبیعتیں پھڑک جاتیں اور مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ بعض پیچیدہ عقدے شاعری کے وسیلہ سے حل کئے جاتے۔ اس وقت میں آپ کے سامنے فارسی زبان کی چاشنی کے چند نمونے پیش کرتی ہوں جس کے ذائقہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کبھی فارسی زبان کیا تھی۔

(۱) ایران سے ــــــــ سفیر نے اپنا ایک سفیر شہنشاہ اکبر کے دربار میں بھیجا۔ اس زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی سفیر کسی بادشاہ کے دربار میں جاتا تو پیغام رسانی سے قبل اپنے بادشاہ کی شان میں مدحیہ اشعار پڑھتا۔ چنانچہ سفیرِ ایران نے بھی دربارِ اکبری میں یہ رباعی پڑھی۔

زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد   رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پر از زر نازد   عباس بہ ذوالفقارِ حیدر نازد

شہنشاہ اکبر نے دربارِ مغلیہ پر ایک معنی خیز نظر ڈالی ابوالفضل فیضی فوراً شہنشاہ کا مطلب تاڑ گیا۔ کھڑے ہو کر فی البدیہہ یہ رباعی عرض کی۔

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد   دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقارِ حیدر نازد   کونین بہ ذاتِ پاکِ اکبر نازد

(یہاں "ذاتِ پاکِ اکبر" سے مراد شہنشاہ کے علاوہ "اللہ پاک کی ذات" بھی لی جا سکتی ہے) اکبر نے یہ رباعی بہت پسند کی اور ہفت ہزاری کا منصب فیضی کو عطا کیا۔

---

(۲) جہاں تک فارسی بدیہہ گوئی کا تعلق ہے فارسی داں عورت بھی کسی مرد سے کبھی پیچھے نہ رہی۔ جب کبھی اس کو اپنے ذہنِ رسا کی نمود کا موقع دیا گیا تو اس "ناقص العقل" نے بھی وہ جوہر دکھائے کہ خود ساختہ "کامل العقل" حضرات کو بھی اس کی خداداد قابلیت کا لوہا ماننا پڑا۔

اس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ عالمگیر نے سیاسی اسباب کی بنا پر شاہجہاں اور ممتاز محل کو آگرہ کے شاہی قلعہ میں نظربند کر دیا تھا۔ ایک دن شاہجہاں اپنی چہیتی ملکہ کے ساتھ محل کے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دریائے جمنا کا پانی لہریں لیتا ہوا آتا اور محل کے پتھروں سے سر ٹکراتا۔ شاہجہاں اور ممتاز محل میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ آخر پانی کے اتنی مسافت طے کر کے آنے اور پتھروں سے سر ٹکرانے کی وجہ کیا ہے۔ شاہجہاں نے یہ مصرع موزوں کیا ع آبِ از ہوائے روئے تو می آید از غم سنگہا (یعنی اے محبوب، پانی تیرے رخ کے دیدار کی خواہش لیکر میلوں سے چلا آتا ہے) ممتاز محل نے فی البدیہہ دوسرا مصرع موزوں کر دیا ع ذہیبت شاہجہاں سر می‌زند بر

جب وہ شاہ جہاں (شاہجہاں) کو دیکھتا ہے تو ہیبت زدہ ہو کر سر قدموں سے پٹکنے لگتا ہے۔

---

(۳) چاندنی رات تھی جہانگیر اور نورجہاں صحن چمن میں داد عشرت دے رہے تھے۔ پاس ہی شمعدانوں میں کافوری شمعیں روشن تھیں جنکی روشنی پر ننھے پروانے اپنی جانیں نچھاور کر رہے تھے۔ یہ حسین سماں اور اسپر قربت محبوب۔ جہانگیر کا دماغ شعر و شاعری کے لیے بیحد موزوں ہوگیا۔ اس نے حسب ذیل شعر پڑھا۔

بلبل نیم کہ نالہ کشم درد سر دہم پروانہ ام کہ سوزم و دم بر نیاورم

(میں بلبل نہیں ہوں کہ آہ و فغاں کروں درد سر کا دوں۔ میں تو پروانہ کی مثال ہوں جو کہ جل جاتا ہے مگر آہ نہیں کرتا۔)

جہانگیر نے داد طلب نگاہ نورجہاں پر ڈالی۔ بھلا وہ کب چوکنے والی تھی فی البدیہہ بولی۔

پروانہ من نیم کہ بیک شعلہ جاں دہم شمعم تمام سوزم و دم بر نیاورم

(میں پروانہ نہیں ہوں کہ ایک شعلہ کی تاب نہ لاکر جان کھو بیٹھتا ہے۔ میری مثال تو شمع جیسی ہے یعنی سر سے پاؤں تک جلتی ہوں مگر اُف نہیں کرتی۔)

اہل نظر خود موازنہ کر سکتے ہیں کہ خوب تر شعر کونسا ہے۔

---

(۴) زیب النساء کا نام عالم نسواں میں ہمیشہ فخر کے ساتھ لیا جائیگا ایک مرتبہ اس شہزادی نے کسی تاجر سے ایک نادر آئینہ خریدا جو کہ قیمت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ شہزادی زیب النساء اس آئینہ کو بیحد عزیز رکھتی ایک دن اتفاقاً یہ آئینہ ایک کنیز کے ہاتھ سے چھوٹ کر چور چور ہوگیا۔ اُسی وقت شہزادی کمرہ میں داخل ہوئی اور باندی کی گھبراہٹ کا سبب پوچھا۔ باندی تھی روشن دماغ اور زیب النساء کی صحبت نے اسکی قدرتی ذہانت پر صیقل کا کام کیا تھا۔ فوراً یہ موزوں مصرع پڑھا ع از قضا آئینۂ چینی شکست (اتفاقاً چینی کا بنا ہوا آئینہ ٹوٹ گیا) شہزادی کنیز کی اس موزونی کو دیکھکر بہت خوش ہوئی اور بطور معافی یہ مصرع کنیز کے سامنے پڑھا ع خوب شد سامان خود بینی شکست (آئینہ خود بینی سکھاتا ہے اچھا ہوا ٹوٹ گیا)

---

(۵) شہنشاہ شاہجہاں کے زمانہ حکومت میں ایک شاعر تھا جو کہ برہمن تخلص کرتا تھا۔ اُس نے اپنے تخلص کی تخصیص سے حسب ذیل شعر کہا

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

(میرے دل میں کفر کی محبت اتنی جاگزیں ہوگئی ہے کہ میں کئی مرتبہ اسکو کعبہ میں لے گیا۔ مگر جب واپس لایا تو پھر وہ برہمن کا برہمن ہی رہا یعنی میرے کفر آشنا دل پر کعبہ کی حرمت بھی اثر انداز نہیں ہوسکتی)

مخالفین شاعر میں سے کسی نے دربار شاہی میں عرض کی کہ سلطنت اسلامیہ میں رہتے ہوئے کعبۂ معظم کی توہین کی یہ جسارت ہر طرح قابل سرزنش ہے۔ سعد اللہ خاں (وزیر اعظم) نے شہنشاہ کے غصہ کو بھانپ لیا دست بستہ عرض کی کہ اے بادشاہ اس شوخ چشم کو تادیب کی کیا ضرورت ہے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ پہلے ہی کہہ گئے ہیں کہ

خر عیسےٰ اگر بہ مکہ رود چوں بیاید ہنوز خر باشد "شعر العجم"

---

(۶) ایک مرتبہ شاہی سبزواری جو کہ اپنے ہم عصر شعراء میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ کسی بادشاہ کے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص جو کہ دربار شاہی کے آداب سے بے بہرہ تھا ایسی جگہ بیٹھ گیا جو کہ شاہی سبزواری کی نشست سے بلند تھی۔ شاہی اٹھ کھڑا ہوا اور حسب ذیل اشعار فی الوقت پڑھے۔

شاہا مدار چرخ فلک تا ہزار سال چوں من یگانۂ ننماید بصد ہنر

گر زیر دست ہر کس و ناکس نشانیم اینجا لطیفہ ایست بدانم من اینقدر

بحر است مجلس تو و در بحر بے خلاف لؤلؤ بزیر باشد و خاشاک بر زبر

(اے بادشاہ آسمان کی گردش ہزاروں سال میں بھی ایک مجھ ایسا یگانہ اور صاحب ہنر پیدا نہیں کرسکتی۔ اگر آپ نے ہر کس و ناکس سے فروتر مجھ کو بٹھایا بھی تو اس میں یہ لطیفہ ہے کہ آپ کی مجلس مثل ایک سمندر کے ہے۔ اور سمندر میں موتی ہمیشہ نیچے رہتے ہیں اور کوڑا کرکٹ اوپر ہوتا ہے) (نوادر مؤلفہ مرزا عسکری)

---

(۷) مجد الدین ہمگر یزد (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ان کی بیوی عمر میں بہت بڑی تھیں۔ اور بوڑھی ہوگئی تھیں۔ جس کے باعث انکو اپنی بیوی سے کوئی لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔

ایکمرتبہ بیوی سے پیچھا چھڑانے کی خاطر یزد سے اصفہان چلے گئے۔ انکی بیوی بھی انکی تلاش میں اصفہان جا پہنچیں۔ نوکر نے مجد الدین سے جاکر کہا کہ "مژدہ کہ خاتون بخانہ فرود آمد" یعنی جناب کو یہ خوش خبری مبارک ہو کہ گھر کی بیوی گھر میں آگئیں۔ ہمگر اس بلائے ناگہانی کی خبر سنکر سخت گھبرایا۔ اور بولا "مژدہ آں بودے کہ خانہ بخاتون فرود آمدے" یعنی میرے لیے خوشخبری تو وہ ہوتی کہ تو آکر کہتا کہ گھر بیوی پر آن پڑا۔

(تذکرہ آتشکدہ)

کالی داس

(ڈاکٹر [illegible])

پروفیسر میکس مولر نے کسی وقت یہ رائے ظاہر کی تھی "تاریخ کا لفظ جو عام مفہوم میں مستعمل ہوتا ہے، ہندوستانی ادب کی دنیا میں مفقود ہے" اس رائے کی مسلّمیت صرف اُن ادبا و شعراء کے کلام پر منطبق ہوتی ہے، جو سنسکرت ادب کے ہیرو ہیں۔ اور جن کے افکار گہربار آج بھی سنسکرت ادب کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

اس بے نیازی کا سبب کچھ تو ساز و سامان تھا جو تحفظ ادب کی بجائے کے لئے بہت عام تھا۔ دوسرے ہندو عقیدے کے اثرات بھی تھے فردِ واحد کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو وہ ہیچ عالم کے حضور خس و خاشاک اور جس کی عظمت وہم خام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مشاہیرِ ادب کے حالات سے ہم بے بہرہ اور اُن کی عملی زندگی کے نشیب و فراز سے لاعلم ہیں۔ تاہم ایسی ادب میں آج بھی چند مشاہیر کے نغمے گونج رہے ہیں، خوشی الحانی و شہرہ نوائی میں کالی داس کے حریف شاذ ہیں۔

اگر کسی شخص نے اپنی ادبی کاوشوں کے طفیل لافانی زندگی پائی ہے تو وہ کالی داس ہے۔ نظموں اور ڈراموں کے سوا کالی داس کی زندگی ایک نقطۂ موہوم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کوئی مقبرہ، کوئی کتبہ کالی داس کی عملی شہادت دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ کوئی مقام کوئی شہر ایسا نہیں، فخر سے سر اُٹھا کر یہ کہہ سکے "کالی داس کو ہم نے جنم دیا، کالی داس ہمارا فرزند ارجمند ہے۔" اس شاعر اعظم کے متعلق ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس صدی میں اور کہاں شعریت کا پرچم لہرا رہا تھا۔

ولسن ایسے چند محقق مصنفین کی رائے ہے کہ کالی داس شہنشاہ وکرماجیت کے نو رتن کا ایک ستارہ تھا غالباً ۵۶ قبل مسیح میں۔ مشکل یہ ہے کہ خود اس شہنشاہ کے متعلق ہی معلوماتِ عامہ کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ وسط ہند میں اُجین کا یہ حکمران ایک دلیر جنگجو فرمانروا تھا اس نے ایک قبیلے کو شکست دے کر سمت سنہ کا موجد ہوا۔ یہ شہنشاہ عہدِ و[illegible] [illegible] کرماجیت کے متعلق تاریخ و کتنا ہی [illegible] نہیں ہے، جب سمدرگپت ایسے عظیم فرمانروا جس نے ہند کا تقریباً کل بَرّ اعظم مغلوب کر لیا تھا [illegible]۔ جو مسخر کر لیا تھا، غیاب ماضی میں اس طرح گم ہو گیا تھا کہ اس کا نام تک ذہنوں سے محو ہو گیا تھا، تحقیقات کے آئینے نے بہت دیر بعد اس نام کے چہرے کو چمکایا ورنہ کون جانتا، سمدرگپت کس کا نام ہے۔ بھاؤ داجی اور دوسرے اصحاب اس بات کو رد کرتے ہیں کہ شیکسپیئر ہند وکرماجیت کے عہد کا شاعرِ اعظم تھا۔ اُن کی رائے میں کالی داس کا عہد چندرگپت ثانی یا ہرش وردھن کا عہد تھا۔ یہ دونوں شہنشاہ بھی "وکرماجیت" کا لقب اختیار کئے ہوئے تھے، اس سنہ کے لحاظ سے یہ تو صدیوں کا عرصہ ایک جنبشِ قلم نے چھ سو سال کی خلیج پیدا کر دی۔

کچھ ہو اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ عہد کالی داس کسی "وکرماجیت" فرمانروا کا عہد ضرور تھا۔ کالی داس کے ایک ڈرامے کے افتتاحی الفاظ جو اسٹیج منیجر سترادھر کی زبان سے، اپنی بیوی کو مخاطب کر کے ظاہر کئے ہوئے ہیں "ناظرین محترم سمجھا ہے اُس شہنشاہِ اعظم وکرماجیت کی جو ناظرین کا خود ایک مبصر ہے"۔

کالی داس کو کس عہد کی صف میں اور کس شہر کی مسند پر بٹھایا جائے یہ مسئلہ آج تک طے نہیں ہو سکا۔ اس شاعرِ اعظم کے خط و خال کسی ممتاز عہد و نمایاں اسکول کو مترشح نہیں کرتے۔

روایت ہے۔ انجام کار کالی داس نے لنکا کی طرف ہجرت کی اور وہیں شیکسپیئر کے انگریزی ناٹک نویس کی طرح، ایک درباری کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی، کمار داس بادشاہ نے جو کالی داس کے پرستاروں میں تھا، شاعر کے پہلو میں اپنے کو بھی چتا کی نذر کر کے، اسی طرح کشیدگی اختیار کر لی۔ لیکن ایسے ہزاروں افسانے ہیں۔

بعض مورخین نے جدتِ طبع کی حد کر دی۔ کہتے ہیں کالی داس کسی ایک شاعر کا نام نہیں ہے۔ شاہی درباروں میں متعدد شعراء تھے جو بہ نقطۂ عروج پہنچ کر یہی لقب اختیار کر لیتے تھے۔ یہ نظریہ سب سے زیادہ پُھس پُھسا ہے۔ کالی داس کے نام سے جو تصنیفات محفوظ ہیں اُن میں انفرادیت کی شان ہے۔ ایک واضح اور نمایاں رجحان ہر لفظ سے ٹپکتا ہے۔ ہر حرف سے خصوصیت

کی آواز آتی ہے۔ آغوشِ فطرت میں کالی داس نے جس حسن و خوبی، جس کمال صنعت سے منظر نگاری کی ہے، مناظرِ قدرت کی جو تصویر کشی کی ہے، اور ہر مصرع میں جو عظیم الشان روح کارفرما نظر آتی ہے، سب ایک ہی دل و دماغ کی گواہ ہیں۔ اتنی نمایاں انفرادیت، کثرت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ ملک الشعراء شکنتلا میں یوں رطب اللسان ہوتا ہے "اگر تیری یہ آرزو ہے کہ آغاز موسم کے نوخیز و شیریں میوے ختم سال کے پختہ و عرق ریز پھل، اگر تیری تمنا ہے کہ ہر وہ شے جس سے روح غذا پاکر آسودہ و مسرت در کنار ہوتی ہے، اگر تیری خواہش ہے کہ ارض و سماء مل کر باہم دگر جذب ہو کر ایک حسین نام کے سانچے میں ڈھل جائیں تو اسے شکنتلا وہ نام شکنتلا ہے"۔

گوئٹے نے یوں تشریح کی ہے "شکنتلا، سالِ نو کی بہار اور شبابِ پختہ کے رس بھرے میووں کو ہم آغوش کرنے کی تمنا ہے۔ یہاں زمین و آسمان بغلگیر ہو جاتے ہیں"۔

"جسم و روح کی تمنائے یک جہتی و ہم آغوشی کا خون، کالی داس کے کلام کی رگ رگ میں دوڑتا ہوا ہے۔ یہ اُس عہد کی خاص ترجمانی ہے۔ حور پیکر خواب آور شباب، اُس عہد میں بالعموم زہد و اتقا کے صحن ہی میں محو گلگشت ہو کر اٹھکیلیاں کرتا تھا۔ دیوتا اور دیویاں ہر قدم پر جلوہ افروز تھیں۔ دیوتا کبھی کبھی تفریح طبع کے لئے یا بہر آزمائش پریوں کو آسمان سے زمین پر بھیج دیتے تھے کہ وہ فقراء و حکماء سے جا کر اٹھکھیلیاں کریں۔ کالی داس کی نظر میں تمام کائنات، انسان کی حسن پرست و طرب جو تمناؤں کا مرکز ہے۔ کون و مکان کی جنبش آدمی کی شادمانی کے لیے معرضِ وجود میں آتی ہے، مناظرِ قدرت کی تمام رعنائیاں انسان کی خوشی کے لیے ہیں"۔

بعض مورخین کی رائے میں کالی داس کا تعلق چندر گپت ثانی کے دربار شاہی سے تھا۔ یہ فرمانروا علم پروری و ادب نوازی کے لیے مشہور ہے، روایت ہے کہ اُس نے ایک شاعر کو کشمیر کی حکومت سونپ دی تھی۔ کالی داس کے کلام میں کشمیر سے مانوسیت کا کوئی اشارہ نہیں ہے، ہاں حکومتِ اُجین کے متعلق بیشتر اشعار اظہارِ عقیدت میں صرف ہوئے ہیں۔ ایک ڈرامے میں ایک کردار یوں گویا ہوتا ہے "وہ گدھ میں فرمانروائی کرتا ہے۔ رعایا شادمان و فرحان ہے۔ اُس کا جلال بڑے سے بڑے غنیم کو بھسم کر سکتا ہے۔ یوں تو ہر حکمراں لقب کا لیبل ماتھے پر چپکاتے ہے لیکن صحیح معنوں میں وہ ہی تنہا خداوندِ زمین ہے۔

شہنشاہی اور شاعری کا فرق دیکھیے، وکرماجیت عظمت و طمطراق بہ دوش تاج و کمر کی آب و تاب سے بہرہ یاب، نسیان کی نذر ہو چکے، لیکن وہ شخص جس کی وہ سرپرستی کرتے تھے، آج بھی اُفقِ ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر جگمگا رہا ہے۔ شاہی فانی ہے، شاعری لافانی! وکرماجیت کی شوکت و عظمت ہندوستان ہی میں گم ہو چکی ہے، کالی داس کی چمک دمک سے آج مشرق و مغرب تابناک ہیں۔ وہ کون زبان ہے جس نے ترجمے کی بدولت کالی داس کا دیدار حاصل نہیں کیا ہے؟

عہدِ قدیم کے کہربائی ماحول سے کالی داس کی شخصیت کے دھندلے دھندلے آثار نظر آتے ہیں۔ میری بی ہیرس اپنی تصنیف "کالی داس شاعرِ فطرت" میں لکھتی ہیں "ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کالی داس فنونِ لطیفہ کا ماہر تھا، اُس کے اشعار میں مصوری و موسیقی کے آثار موجود ہیں"۔ وہ فطری طور پر فطرت پرست شاعر تھا، بلکہ "موسم کا شاعر" دنیا کا سب سے بہتر منظر نگار شاعر تھا۔ اس طویل نظم میں چھ موسم کی تصویر کھینچی گئی ہے ہر موسم ڈیڑھ سو صفحات میں بند ہے۔ ہندوستانی موسم کے مختلف مناظر و مطالب شاذ ہی کوئی اس صفت و مہارت سے بیان کر سکے۔ اشعار تشبیہ و تمثیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ماہتاب، موسمِ گرما، خوبانِ زرنگار کو بے نقاب دیکھ کر آتشِ رشک و رقابت سے بھڑک اٹھتا ہے۔ لبِ جو کرم زدہ بالی بارش کے اکسانے پر ایستادہ بہ ساحل درختوں سے ہم آغوش ہو جاتا ہے ابرِ بہار بغلگیری کی تمنا لیے ہوئے پہاڑ کی چوٹیوں پر دوڑ پڑتا ہے، بیل سمٹتا ہوا بار و ہے۔ سرخ ..... گل، لب گلنار اور یاسمین دندان گہربار!

یہ رومانیت "کمار سمبھاو" میں عروج کی چوٹی پر پہنچ گئی ہے۔ آٹھ ابواب میں کالی داس پاروتی اور شیو کے رومانی حالات کی مصوری کرتا ہے، صبر و شدائد کے مراحل گزرنے پر دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں، تارک الدنیا تپاگی پر حسین اندام پاروتی قدرت پالیتی ہے۔ ان ابواب میں کالی داس نے جس شاعرانہ کمال کی

ہو نہ لگا دی گئی ہے، وہ مغربی شعراء کے احاطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا"
یکن کالی داس کے کلامِ کل کا یہ محض ایک جزو ہے۔

اس نظم میں بعض جدید شعراء نے بے جوڑ پیوند لگا دیے ہیں۔
سی اضافے کی بنا پر کچھ لوگ یہ قیاس آرائی کرنے لگے ہیں کہ کالی داس
یک نہیں متعدد شعراء کا مخلوط نام ہے۔ اصل و نقل میں تمیز کرنا مشکل
نہیں ہے۔ نقالوں کا بھانڈا ایک مصرع ہی میں پھوٹ جاتا ہے۔
ظم میگھ دوت میں ہندوستانی مناظر کے بہترین نمونے ہیں۔ دولت
کے دیوتا کا خادم یکشا، اندرا کے ہاتھی سے آقا کے باغ کو پامال کرا
بیٹھنے پر معتوب ہوتا ہے اور وہ دور رام گری پہاڑ کی جانب جلاوطن
کر دیا جاتا ہے۔ یہاں سے وہ افسردہ و مضمحل ہو کر اپنی بیوی کے نام
پیغام بھیجتا ہے۔ اس سے کالی داس کے ہاتھ میں راستے کی منظر نگاری
ہو فقرہ آ جاتا ہے۔ بارش کے آثار رقصِ طاؤس کی بہار دکھانے
لگتے ہیں۔ نظم کا بیشتر حصہ مناظر کی تصویر کشی کی زینت بنا ہے۔ یکشا کی
بی اذیت کا علم دیوتا کو ہوتا ہے۔ اور سزا سے جلاوطنی درگزر کر دی
تی ہے۔

کالی داس کے تین ڈراموں "مالوِکاگنی مترا" "وکرم ادوشی" اور
"شکنتلا" کے لطف اندوز ہونے اور اُن کی حقیقی عظمت کو سمجھنے کے
یے اُن روایات پر نظر رکھنا ضروری ہے جنھوں نے اُن میں جنم
یا ہے۔ روایتاً مشہور ہے کہ ہندوستان کا پہلا ناٹک "پاون" نامی
ک شاعر نے تیار کیا تھا۔ اس ناٹک کا پہلا ایڈیشن راماین سے اخذ کیا گیا
تھا۔ ایک چکنے پڑے پتھر پر یہ ناٹک کندہ کرایا گیا تھا۔" لیکن پاون نے
ی تصنیف سے غیر مطمئن ہونے کی وجہ سے ناٹک کو غرقِ دریا کر دیا،
بعد میں ایک شہزادے نے غوّاص طلب کیے اور ناٹک برآمد کیا گیا۔
اس طرح پہلا ناٹک منظرِ عام پر آیا۔ زیادہ قرین قیاس یہ بات ہے
کہ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ناٹک کا ظہور عبادت
ہوں سے ہوا تھا۔ ان کا مقصد محض عوام کی تربیتِ نفس تھا۔
ہندوستانی ناٹکوں کا ابتدائی موضوع مذہبیات کا ایک باب
تھا۔ انسان کو نفسِ امّارہ پر قابو پانے کے لیے جو اکثر راکشس کے
روپ سے پیش کیا جاتا تھا ضروری ہے کہ انسان کو ادب کے گوشے سے
لا متحرک کیا جائے۔

"شکنتلا" کے پس پشت راماین اور مہابھارت کی زبردست

رزمیہ کتابیں اپنا احسان کے جلوے، راجن کے "شکنتلا"
"برھمن اور رنگ روپ۔" راجا کون قوم ہے کس کے واسطے
انتظام کیا، یہ جو مضمون کہاں سے آئی، وہ دیوتا بعید میں وجود سے
بہرہ یاب ہوتے ہیں کہ خبر اس عظیم الشان کو مین کا سبب کیا ہے۔
ترجمہ میکس مُلر ـــــ کون کہہ سکتا ہے، شاعر کی پرواز نظر و تخیل
کہاں سے آئی ہے۔ شکنتلا میں سلسلۂ واقعات کا باپ بادشاہ
دُشیانت سے جو قمری نسب سے ہے اور دیوتا پورو کا جانشین ہے
کھلتا ہے۔ وہ رتھ میں بیٹھا ایک ہرن کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ نزدیک
پہونچ کر ہرن کو قتل کرنے کے لیے تیر سر کرنے ہی والا ہے کہ ایک یوگی کی
آواز مداخلت کرتی ہے اور بادشاہ اس خونی ارادے سے باز آ جاتا ہے
بادشاہ کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ جنگل درویشوں اور رشیوں کا
مسکن ہے، پرندے بے خوف و خطر دانہ چگتے رہتے ہیں، مقدس آگ
کی مہک درختوں میں آویزاں ہے، اسی اثنا میں کچھ نسوانی آوازیں
آتی ہیں، انھیں صحرائی دوشیزاؤں میں ایک خلد نژاد پری زاد شکنتلا
بھی ہے۔ جسے اندرا نے وشوامتر رشی کو ترغیب و تحریص کے دام
میں لانے کی غرض سے بھیجا ہے۔ جو کنو یوگی کے ساتھ رہتی ہے
یہ دوشیزائیں صحنِ گل و لالہ میں مصروفِ گلگشت ہیں کہ ایک شہد کی
مکھی شکنتلا پر حملہ آور ہوتی ہے۔ وہ مسکرا کر سہیلیوں کو مدد کے لیے
بلاتی ہے، دُشیانت جھپٹ کر امداد کے لیے پہونچ جاتے ہیں۔
شکنتلا کے رضاعی باپ کنو یوگی گجرات کی طرف تیرتھ کے
لیے گئے ہوئے ہیں۔ شکنتلا دُشیانت کی مردانگی اور سہیلیوں
کی ترغیب سے متاثر ہو کر بادشاہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے
دُشیانت کو جب شکنتلا کے حسب نسب سے آگاہی ہوتی ہے،
تکلفات کی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور دونوں رشتۂ ازدواج میں
منسلک ہو جاتے ہیں۔ لیکن دُشیانت کو اپنے دربار کی طرف
واپس جانا پڑتا ہے۔ ایک یوگی دروَاس شکنتلا سے برہم ہو کر
بددعا کرتے ہیں کہ جب تک اُس کے انگوٹھے میں دُشیانت کی
انگوٹھی رہے گی وہ اُس کا چہرہ یاد رکھے گا۔ جب وہ دربارِ شاہی
میں پہونچتی ہے شرم سے زمین میں گڑ جاتی ہے۔ کیونکہ بادشاہ کے
چہرے پر اجنبیت کے آثار حاوی دیکھتی ہے۔ اُسے معاً خیال آتا ہے
کہ انگوٹھی راستے میں کسی چشمے کو عبور کرتے وقت غائب ہو گئی تھی

شکنتلا اپنے جنگل کو پلٹ آتی ہے، یہیں ایک بچے کی ولادت ہوتی ہے، شیردل بچے کا نام بھارت رکھا جاتا ہے۔ اسی اثنار میں دو مچھیرے ایک مچھلی کے پیٹ میں سے گمشدہ انگوٹھی نکال کر دربار شاہی میں پیش کرتے ہیں۔ معاً بادشاہ کو گندھروا رسم عقد یاد آجاتی ہے اور وہ تائب ہوکر شکنتلا کی تلاش میں چل کھڑا ہوتا ہے۔ ہزار مصائب و شدائد کے مراحل طے کرنے کے بعد رشیا نت اس پیڑ کے قریب پہونچتا ہے جہاں بھارت بیٹھا کھیل رہا ہے۔ اسی اثنا میں شکنتلا کا ورود ہوتا ہے، دونوں ایک دوسرے کو پہچان کر بغلگیر ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ شکنتلا کو اپنے دربار لے جاتا ہے۔ اس طرح سے ناٹک ختم ہو جاتا ہے۔

پلاٹ بہت لطیف ہے۔ لیکن اس ڈرامے کی عظمت اس پلاٹ میں نہیں ہے۔ کالی داس کے ہر ناٹک کی طرح شکنتلا کی عظمت و شوکت بھی اُس نازک خیالی، باریک نگاہی، ناقابلِ تقلید منظر نگاری اور حیرت انگیز رومانی خیال آفرینی میں مضمر ہے۔ جو کالی داس کا خاص حصہ ہے فریزر نے ٹھیک کہا ہے "سنسکرت اور صرف سنسکرت ہی میں وہ لاتین مل سکتی ہے جس پر کالی داس نے بے نظیر شکنتلا کی تصویر کشی کی ہے اور وہ لفظ کے جادو سے ہیولیٰ تیار کیا ہے جو سراپا موسیقی تھا جس کا ہر حرف موسیقی کے رس میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ موسیقی جو اُس کی لطیف فضا سے بہر نوع ہم آہنگ تھی"

کالی داس ایک لاثانی شاعر ہے!

قطعہ

اُس کمر کی نزاکتیں مت پوچھ
اُس دہن کی لطافتیں مت پوچھ
شوق نے گل کھلائے تھے کیا کیا
رنگ و بو کی وہ صحبتیں مت پوچھ

(جناب ضیاءالاسلام صاحب بی۔ سی۔ ایس)

ہنگامے

(فاروق محشر بدایونی)

اب اُن کے قولِ وفا کا مجھے یقیں بھی نہیں
کہ ایک "ہاں" تو بڑی چیز ہے "نہیں" بھی نہیں

بہار آئی ہے پھیلائے اپنے دامن کو
برائے نذر یہاں تارِ آستیں بھی نہیں

خیالِ زلف ہے اُلٹا کہ چھاؤں پا دل کی
ابھی بحدِّ نظر ہے ابھی کہیں بھی نہیں

حیات سلسلۂ وصل و ہجر کا ہے نام
کبھی حسیں ہے یہ دُنیا کبھی حسیں بھی نہیں

یہ کیا کہ آج وفا و جفا کی روداد یں
مری زباں سے سُنیں بھی نہیں کہیں بھی نہیں

مجھے تو کرنا ہے اس زندگی کو غرقِ شراب
ابھی تو خیر سے آلودہ آستیں بھی نہیں

یہ وہم چھوڑ کہ تابع ہیں میرے ہفت افلاک
کہ آسماں تو رہا آسماں زمیں بھی نہیں

ہزار راہبر و صد ہزار راہ نما
جس اہلِ دل کی ضرورت ہو وہ کہیں بھی نہیں

کسی سے کیا گلہ بے رُخی کریں محشر
جب اپنے بس میں خود اپنا دلِ حزیں بھی نہیں

ڈاکٹر سر محمد اقبال

(مسز محمود سعید)

بیسویں صدی کی پو پھٹتے ہی، اردو ادب کے افق پر ایک درخشاں ستارہ طلوع ہوا، جو ابھی حال میں غروب ہوا ہے، جس کی درخشانی و تابناکی ایک مخصوص شعلہ گی کے تیور لیے ہوئے تھی۔ انسانی پیکر میں آکر، اس انجم، بندہ گہر نے اقبال نام پایا؛ جو خود ہی ایک نقطۂ عروج ہے۔

۹ اپریل ۱۹۳۸ء منحوس تاریخ تھی، اسی دن، اقبال نے عالم انسانی سے رشتہ منقطع کر لیا۔ ہر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی پیدائش، بمقام سیالکوٹ کہ سرحد پنجاب پر ایک معروف شہر ہے، ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو ہوئی نسلی اعتبار سے اُن کا تعلق، ایک کشمیری برہمن خاندان سے تھا، جس نے کچھ پیڑھیاں پہلے اسلام کو قبول کر لیا تھا۔ اس طرح برہمن نسل اور اسلامی مذہب کے محاسن اُن کی ذات میں مرکوز ہو گئے تھے۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی، اُن کے پدر بزرگوار، ہر چند خود متبحر عالم نہ تھے، لیکن ادب و علم سے والہانہ شغف رکھتے تھے، اُن کے حلقۂ احباب میں علم و ادب کی مشہور روزگار ہستیاں تھیں جن میں مولوی سید میر حسن صاحب کا اسم گرامی نمایاں ہے، مولوی موصوف کا علمی تبحر حکومت وقت کے سے خراج عقیدت وصول کر چکا تھا، شمس العلماء کا خطاب اس کا گواہ ہے۔

اقبال کو عربی اور فارسی سے جو تعلق خاطر تھا، وہ مولوی میر حسن ہی کی ذات گرامی کا فیض عام تھا۔

۱۸۹۵ء میں اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے ۱۸۹۹ء میں بی اے اور ایم اے کی اسناد حاصل کیں، اسی کالج میں، اُن پر پروفیسر سر تھامس آرنلڈ کا سایہ پڑا، اقبال کا میلان، شروع ہی سے، فلسفے کی طرف تھا اور اسی سے دونوں کے تعلقات میں وہ شگفتگی پیدا ہوئی، جو تا عمر پژمردگی سے آشنا نہ ہوئی۔

ایم اے کی ڈگری کے بعد ہی، اقبال اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے، چند سال بعد گورنمنٹ کالج لاہور نے اپنے شعبۂ فلسفہ میں انھیں کھینچ لیا، جہاں اُن کو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی، علم کی تشنگی، ہندوستان کی سرزمین میں نہ بجھ سکی تو اقبال نے ۱۹۰۵ء میں، انگلستان جانے کا عزم کیا، تاکہ کیمبرج میں رہ کر فلسفے کا عمیق تر مطالعہ کر سکیں اور مفکرین سے بے حجابانہ رسم و راہ پیدا کر سکیں۔ اس وقت پروفیسر آرنلڈ انگلینڈ میں تھے، اُن کی ہدایت کے مطابق، ایرانی تصوف کے میدان میں تلاش علم کا راہوار چل نکلا۔ ایرانی تصوف پر، اقبال نے وہ معرکۃ الآرا مقالہ لکھا کہ میونخ یونیورسٹی نے بھی اُن کے گلے میں پی، ایچ، ڈی کا ہار ڈال دیا۔

۱۹۰۸ء میں سندِ وکالت حاصل کر کے، لاہور میں پریکٹس شروع کر دی، دوستوں کے اس مشورے پر، کہ اُن کی جولانی طبع کے لیے "قانون" ہی سازگار ہو گا، گورنمنٹ کالج لاہور کی دعوت کو رد کر دیا، لیکن، فلسفے اور ادب نے آسانی سے شکست نہ مانی، وہ اُن کا تعاقب کرتا رہا، اِدھر قانون کی دیوی اُن کے وہ ناز نہ اٹھا سکی جو اُن کی صلاحیتوں کے تیوروں سے پیدا ہوتا رہتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال نے علم و ادب کی ہم نشینی پر قانون کو ٹھکرا دیا۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے، اقبال اوائل عمر سے ہی اس کی ذُلفوں کے شکار تھے۔ لاہور آنے سے قبل، غزل کے میدان میں طبع آزمائی کرتے رہتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے وہ بغرضِ اصلاح مرزا داغ کی خدمت میں بھیج دیتے تھے، مرزا داغ کا اس وقت طوطی بول رہا تھا، نظام حیدر آباد دکن کی مسند سے، اُن کے نغمے چہار اطراف میں گونج رہے تھے۔ داغ نے یہ نوٹ لکھ کر غزلیں واپس کر دیں "انھیں، اِصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔" اقبال کی شاعرانہ صلاحیتوں کی یہ پہلی آواز تھی۔

لاہور میں، اکثر مشاعروں میں وہ شریک ہوتے، انجمن لٹریری سوسائٹی میں جب انھوں نے اپنی نظم "ہمالیہ" پڑھی، تحسین کے نعروں سے سقف و بام گونج اٹھے، شہرت کے پر لگ گئے، اقبال کا نام اَدبی حلقوں میں امتیازی شان نمود سے روشن ہو گیا۔

انجمن حمایتِ اسلام نے اقبال کو اپنے سالانہ جلسوں میں دعوت دی، اسی منبر سے انھوں نے اپنی مشہور نظمیں، مثلاً تصویرِ درد، شکوہ، جوابِ شکوہ، قوم کے سامنے پیش کیں، ان نظموں کے بعد اقبال کی شاعرانہ عظمت نے ایک حصار تیار کر لیا، جس میں تغیرِ روزگار ابھی تک کوئی شگاف نہیں پیدا کر سکا ہے۔

اقبال کی شاعری کو، تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) انگلینڈ جانے سے قبل کی نظمیں — ۱۹۰۵ء تک

(۲) وہ نظمیں جو یورپ میں لکھی گئیں — ۱۹۰۸ء تک۔

(۳) ۱۹۰۸ء کے بعد کی نظمیں، جو فارسی شاعری شروع کرنے سے پہلے لکھی گئیں۔

یہ تمام نظمیں، اقبال نے "بانگِ درا" کے نام سے ۱۹۲۴ء میں شائع کیں۔ کتاب کا عنوان خود ایک کھلتا ہوا باب ہے۔ بانگِ درا، کاروانِ ارتقا کے جادے پر ایک حدی خوانی ہے، خوابیدہ ملت کے سر پر ایک ضرب ہے، زندگی کا گرجتا ہوا پیغام ہے۔ انگلینڈ میں اتفاقی طور پر، ہمارے شاعر کے ذہن پر اس امر کا بھی انکشاف ہوا کہ وہ اردو کی طرح، فارسی میں بھی اپنے خیالات کو روانی کے ساتھ نظم کر سکتے ہیں۔

فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے، فارسی زبان زیادہ ہموار و زرخیز ہے، اقبال کی پہلی فارسی نظم ۱۹۱۵ء میں بہ عنوان "اسرارِ خودی" منظرِ عام پر آئی، اس کتاب کی طباعت سے، اقبال کی شاعرانہ عظمت کی شہرت ہندوستان کی حدیں توڑ کر، ایران، افغانستان اور ترکی میں پھیل گئی، پروفیسر نکلسن نے جب ۱۹۲۰ء میں اس کا ترجمہ شائع کیا تو ہمارے شاعر سے انگلستان کی سرزمین بھی روشناس ہو گئی، نظم کے بعض حصے جرمن اور اٹلین زبان میں بھی، بصورتِ ترجمہ، شائع ہوئے بین الاقوامی شہرت و اعترافِ عظمت کا یہ کھلا ہوا اشارہ تھا۔

"اسرارِ خودی" کے جلو میں دوسری فارسی مثنوی "رموزِ بے خودی" جلوہ گستر ہوئی۔ اسرارِ خودی کے سلسلے کی یہ ایک کڑی تھی۔ اسرارِ خودی کا موضوع انسانی شخصیت و انفرادیت ہے، جس میں طاقت و جرأت مرکزی مقام پر ہیں کیونکہ یہی شانِ دولت، انسان کو اپنی تعمیرِ تقدیر سے بہرہ ور کر سکتی ہے۔ "رموزِ بے خودی" انسان کی عظمت کی رہنما ہے، حصولِ طاقت کے بعد، شخصیت ایک "قانون" کے روبرو خم ہو جائے کہ خدمتِ نوعِ انسانی انسان کے تمام حوصلوں کی منتہا ہے، بلاشبہ۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے اقبال کا "قانون" وہ قانونِ الٰہی ہے جو اسلام کی روحِ رواں ہے، اقبال کے نزدیک، اسلام، تمام عالمِ انسانی کے امراض کا واحد علاج ہے۔

اس مثنوی کے بعد، "پیامِ مشرق" طبع ہوئی، یہ بھی فارسی نظموں کا مجموعہ ہے جو گوئٹے کے "دیوانِ مغرب" کی وضع پر مرتب ہوا ہے، دراصل گوئٹے کا دیوان ہی اس کا محرکِ اول ہے۔ پیامِ مشرق کے بعد زبورِ عجم، شائع ہوئی اور اس کے ساتھ "جاوید نامہ" پبلک کے سامنے آیا۔ جاوید نامہ، روحِ شاعر کی عالمِ بالا کی جانب پرواز کا ذکر ہے۔ اس سفر میں شاعر کا راہنما، دنیائے تصوف کا شاعرِ اعظم جلال الدین رومی ہے۔ اقبال نے اپنی ہر فارسی نظم میں، مثنوی معنوی کا تتبع کیا ہے کہ انھیں کو وہ عالمِ روحانیت میں اپنا راہنما تصور کرتے ہیں۔

اقبال کی فارسی شاعری کے اس انہماک و شغف سے اردو شاعری کے پرستاروں میں آثارِ بے چینی پیدا ہونے لگے، ہر گوشے سے آواز آنے لگی "شاعرِ مشرق! کچھ ادھر بھی" اس آواز پر لبیک کہا گیا۔ بالِ جبریل ۱۹۳۵ء میں ضربِ کلیم ۱۹۳۶ء میں ابرِ رحمت بن کر برسیں ان کتابوں کی روح وہی ہے جو "اسرارِ خودی" کے پیکر میں تھی یعنی دعوتِ عمل ہے۔ شاعرانہ حسن و نزاکت، جو بانگِ درا کا زیور تھا، دعوتِ عمل کے سانچے میں ڈھل کر، حرکت کا ساز و سامان بن گیا۔

اقبال نے اپنی آخری نظم بھی، فارسی ہی میں شائع کی، "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق!" مغربی اقوام کے وہ جارحانہ اقدام، جو اقوامِ مشرق پر حملہ آور ہیں، یہ مثنوی اُن اقدامات کے خلاف بہ صورتِ شعر ایک حربہ ہے۔

اقبال کی رحلت کے بعد ایک اور کتاب شائع ہوئی، "ارمغانِ حجاز" یہ قطعات اور متفرق نظموں کا مجموعہ ہے۔

اقبال کو عرب سے عشق تھا، "ارمغانِ حجاز" میں اس تڑپ کو بخوبی ظاہر کیا گیا ہے۔ خرابیٔ صحت کے باعث، وہ اس سرزمینِ پاک کی زیارت سے محروم رہے، اقبال کی تمام شاعرانہ بصیرت سرزمینِ عرب کا وہ تحفہ ہے جو عالمِ انسانی کو پیش کیا گیا ہے، رسالتمآب کی ہدایت کا سرچشمہ جو نوعِ انسانی کے لیے، سرزمینِ عرب سے پھوٹا، اقبال کی شاعری اُسی چشمے کی مترنم آواز ہے، جس نے نغمے کی روانی پیدا کر لی ہے۔

اقبال کی عظمت کا سنگِ بنیاد اُن کا جوہرِ شاعری ہے، لیکن اُنھوں
نے نثر میں بھی ایک معرکۃ الآرا کتاب "تجدیدِ اسلامی کا احیاء" لکھی
ہے جو فلسفۂ مذہب میں ایک معتد بہ اضافہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب چھ
لیکچروں پر مشتمل ہے جو علامہ نے مدراس میں دیے تھے۔ یہ لیکچر علومِ مغربی
کی سرشت اور فلسفۂ اسلامی کے مزاج سے کما حقہ آگاہی پر دلالت کرتے
ہیں۔ انھیں لیکچروں کی بنا پر علامہ کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینے
کے لیے دعوت نامہ پیش کیا گیا تھا۔

اپنی زندگی ہی میں، اپنی عظمت و شہرت کی کھیتی کو لہلہاتا ہوا
دیکھنا، شاید اقبال کے سوا کسی اور اُردو شاعر کو نصیب ہوا ہو۔ اس
خوش بختی میں، بنگالی شاعر ٹیگور کے سوا کوئی اور شریک نہیں۔ عہدِ حاضر
کے یہ دونوں شاعر اپنے نظریات میں بیشتر حیثیتوں سے ایک دوسرے سے
مماثل ہیں۔

دونوں شعرا، بادۂ حُبِّ وطن سے سرشار، مشرق کے پرستار
اور تمام عالمِ انسانی کے مونس، غم خوار ہیں، دونوں صاحبِ کشف،
بہتر و روشن تر مستقبل کے آئینہ دار ہیں، دونوں کی منزل ایک ہے،
جادے مختلف، ٹیگور کا مسلک صلح و شانتی ہے اور اقبال کی رفتار
میں ہنگامۂ جد و جہد اور شورشِ حرکت و عمل ہے۔ اقبال کی شاعری
عمل کا پیغام ہے۔

ٹیگور اور اقبال دونوں کی آنکھوں میں صوفیانہ مشاہدۂ نفس
کی چمک ہے لیکن ٹیگور کی نگاہ میں وصل اپنی منزل ہے اور اقبال
کی نظر میں وہ راہِ حرکت و عمل کے لیے ایک تازیانہ ہے، اُن کا
عقیدہ ہے کہ انسان مظاہرِ قدرت پر غلبہ پانے کی سعی نہ کرکے
خداداد صلاحیتوں کی ناشکری کی، اقبال کے اس پہلو پر مسٹر یوسف نے
اچھی بات کہی ہے "ایک صوفی نہ انتہائی تعریف کے خلاف"

اقبال کے "فلسفۂ خودی" پر دلچسپ بحث چھڑ گئے ہیں۔ اکثر
لوگوں کا خیال ہے کہ یہ فلسفۂ خودی، جرمنی فلاسفر نیٹشے کے
خیالات کا چربہ ہے۔ بلاشبہ اقبال کی "خودی" اور نیٹشے کے
"مافوق البشر" کے تصورات میں کچھ مشابہت ہے۔ اسی مشابہت
سے بعض لوگوں کو دونوں کی ہم نسلی کا شبہ ہو جاتا ہے، ہر چند نیٹشے
کے اثرات اقبال پر رائیگاں نہیں گئے، تاہم اُنھوں نے جو کچھ بھی پیش
کیا ہے وہ سرتاپا روحِ اسلامی کی ترجمانی ہے جب کہ نیٹشے مذہب کا منکر

تھا۔ اقبال کے [illegible] سب کچھ ہے اور مذہب کچھ
کچھ بھی نہیں۔ دونوں کی نظر میں [illegible] ہے۔

تلاشِ خدا سے پہلے تلاشِ بشر دونوں کا مشترک و ہم آہنگ مقصد
ہے اسلامی تصوف کے لیے یہ زاویۂ نگاہ غیر مانوس نہیں ہے۔ عبدالکریم
جبالی کی مشہور تصنیف "مکمل بشر" مابعد الطبیعاتی رنگ میں اسی فلسفہ
کو پیش کرتی ہے۔ مولانا روم کی مشہور و مقبول کتاب مثنوی میں بھی یہی روح
کارفرما ہے، بلکہ اس خیال کا سرچشمہ خود قرآنِ حکیم ہے، جس میں
متعدد مواقع پر انسان کو تسخیرِ کائنات کی ترغیب دلائی ہے۔ وقت
کی رفتار نے اس رجحان کو ذہنوں سے محو کر دیا، اقبال نے اسی چیز پر
شاعری کے جلوہ ہائے بوقلموں دکھائے تو مسلمانوں کے دل و دماغ
اسے نیا نظریۂ حیات سمجھ کر مسخر ہو گئے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے اقبال کی
روح پر نیٹشے کے خیالات اثر انداز ہوئے تو اس میں بھی کوئی شک نہیں
کہ وہ اثرات، مطالعۂ اسلام سے، بڑی حد تک، تغیر پذیر ہوئے۔

اقبال کے مداحین میں، ایک اور موضوع پر بھی اختلافِ آرا کا
بحث ہے۔ وہ لوگ جو اُن کی اس ابتدائی دور کی شاعری سے متاثر
ہیں جس میں ہر حرف سے قومیت اور نیشنلزم کی بو آتی ہے، متاسف
ہیں کہ اقبال نے نیشنلزم کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر، ایک بحر سے
کنارہ کشی اختیار کی اور فرقہ وارانہ خیالات کی جوئے تنک آب میں
گم ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی نظموں میں سے بیشتر ایسی
ہیں جو بادۂ حُبِّ وطن سے سرشار ہو کر لکھی گئی ہیں۔ نیا شوالہ، اور سارے
جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، اس کی بین مثالیں ہیں جن کے
ہر مصرع میں نیشنلزم کا خون حرکت کر رہا ہے، لیکن یہ خیال غلط فہمی
پر مبنی ہے کہ وسعتِ نظر سے اقبال کے سینے میں ہندوستان کی محبت
کمزور پڑ گئی تھی، ایسا نہیں ہے، ہند تو ہند، اقبال کی روح نہ صرف
مشرق کے تمام ممالک کے لیے درد سے بے چین تھی بلکہ تمام بنی نوعِ انسان
کی محبت سے چور تھی۔ وسعتِ خیال کا دائرہ کیسے ہی وسیع ہوتا
ہی رہتا ہے، مشرق و مغرب کی کشمکش اور مشرقی ممالک کی آزادی کی
تڑپ کے باب میں، ہر ہندوستانی مشرق سے ہمدردی رکھے گا،
ایسی ہی ہمدردی اقبال کو بھی تھی، اقبال کو کچھ لوگ محض شاعرِ
اسلام سمجھ کر مطمئن یا غیر مطمئن ہو جاتے ہیں، میں کہتا ہوں اقبال

اور بھی کچھ تھا، وہ شاعرِ ہندوستان، شاعرِ ایشیا، شاعرِ مشرق اور شاعرِ عالمِ انسانیت تھے۔ اُن کے کلام میں اسلامی اصطلاحیں بیشتر موضوع کی روانی و آسانی کی خاطر تھیں اور جہاں چند اسلامی اصول پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے، وہ نتیجہ ہیں اُس عقیدے کا جو انھیں اسلام سے تھا، جن کے متعلق وہ صدقِ دل سے محسوس کرتے تھے کہ تمام دردِ انسانی کا واحد علاج ہے۔

اقبال کی شاعری نے عہدِ حاضر کی رہ پر نمایاں نقش ثبت کر دیے ہیں جو جلد محو نہ ہو سکیں گے۔ اوّل اوّل، بعض علمی و ادبی حلقوں میں اقبال کو بہ حیثیت شاعر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا تھا، یو، پی میں بیشتر افراد اُن کی "فارسیت زدہ" اُردو اور مخصوص "پنجابیت" کے شاکی تھے لیکن رفتہ رفتہ عصبیت کا گرد و غبار چھٹ گیا، کیونکہ فارسیت کا جہاں تک تعلق تھا، غالب کی نظیر موجود تھی اور جہاں تک زبان میں "پنجابیت" کے شمول کو دخل ہے، وہ درخورِ اعتنا نہیں۔

جب اقبال کی شاعرانہ عظمت مسلّم ہو گئی تو بعض ہم عصر شعرا خصوصاً نوجوان طبقہ، اُن کے طرزِ بیان اور اسٹائل کی تقلید میں غزل سخن کرنے لگے، چنانچہ آج جو "خودی" اور "سرمایہ و محنت" کی باہمی آویزش پر ادبی مواد جمع ہو رہا ہے، وہ اقبال کی شاعری ہی کا عکسِ اوّل ہے۔ اقبال نے کارل مارکس کا خود گہرا مطالعہ کیا تھا اور بڑی حد تک وہ اس پیغمبرِ اشتراکیت سے متاثر بھی ہوئے تھے، اقبال کا پورا کلام، سرمائے کے خلاف اور صدائے محنت سے ہم آہنگ ہے۔

اقبال کی برق صرف سرمایہ داری ہی پر نہیں گرتی، وہ سامراج کے ایوانوں پر بھی کڑکتی اور جمہوریت کے عشرت کدوں پر بھی گرجتی ہے۔ اپنی ایک نظم میں جمہوریت، پر یوں گہر افشانی کرتے ہیں۔

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانی نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے، ایک موقعے پر، اقبال بھی [illegible]

ہوئے تو اُن کے حریف نے یہی اشعار، ایک پوسٹر پر جلی حروف میں لکھوا کر شہر میں گشت کرا دیے کہ وہ اُس جمہوری ادارے میں جس کے متعلق اُن کے خیالات یہ ہیں، بار پانے کی تمنا کیوں رکھتے ہیں، یہ محض لفظوں سے کھیلنا ہے، لیگ آف نیشنز کے سلسلے میں اقبال نے اُس ادارے کے اراکین کو "کفن دُزدے چند" کا خطاب دیا، ہندوستانی پبلک میں یہ اتنا مقبول ہوا کہ عرصے تک انجمنِ اقوام کو اسی خطاب سے یاد کیا گیا۔ اقبال نے، ادبی مشاغل کے باوجود، اپنا کچھ وقت سیاسی اُمور کو بھی دیا، لیکن اُن کی اُفتادِ مزاج کو سیاست سے کوئی لگاؤ نہ تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر احباب و معتقدین مصر نہ ہوتے تو شاید وہ کبھی اس جانب رُخ نہ کرتے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں شاعر کو مسلم لیگ کی صدارت کا بار بھی اُٹھانا پڑا اور سنہ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے مجبور ہوئے۔ مسلم لیگ کا وہ سیشن جو اقبال کی صدارت میں ہوا بہت اہم ہے کیونکہ تقسیمِ ہند کا مسئلہ پہلی بار یہیں پیدا ہوا، اقبال کی نظر میں، ہندو و مسلم کے دو علیحدہ، لیکن معنوی حیثیت سے ہم آہنگ خطے ضروری تھے، اُس وقت یہ تجویز درخورِ اعتنا نہ سمجھی گئی لیکن آج تحریکِ پاکستان کے نام سے مقبولِ عام ہے۔

دُوسرا شعبۂ حیات، جس میں اقبال کی بصیرت نے کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ شعبۂ تعلیم ہے۔ ہر چند، انگلینڈ کی روانگی کے بعد، تعلیمی اداروں سے اُن کا عملی تعلق منقطع ہو چکا تھا، لیکن اُنھیں اُس سے فطری لگاؤ رہا۔ تعلیم کی تنظیمی اصلاح کے لیے جب نادر خاں شاہِ افغانستان نے تین اہلِ بصیرت کو دعوت دی ہے، تو اُس میں سر سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے ہمراہ ڈاکٹر اقبال بھی تھے۔

تعلیمی حیثیت سے، اقبال کی اہمیت، اُن اُمور پر مبنی نہیں ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً، سرکاری یا غیر سرکاری حیثیت سے تکمیل کو پہونچائے، بلکہ اُن کی عظمت اُن معیاری و مثالی اقدار میں مضمر ہے جو انھوں نے نئے زاویۂ نگاہ سے، مبصرانہ انداز سے پیش کیے ہیں۔ اقبال کے اِس پہلو پر، خواجہ غلام السیدین نے ایک بے نظیر کتاب "اقبال کا فلسفۂ تعلیم" لکھی ہے۔

اقبال کے متعلق ایک یہ غلط فہمی بھی عام ہے کہ وہ سرکاری عہدوں کے متمنی تھے، "سر" کا خطاب اس غلط فہمی کو اور ہوا دیتا ہے۔

ہوگوں کو اس خطاب کا راز معلوم نہیں ہے ورنہ ایسی افواہوں کی حقیقت کھل جاتی۔ ایک مقتدر چینی سیاح لاہور میں گورنر کا مہمان تھا اُس نے گورنر سے یہ تمنا ظاہر کی کہ وہ اقبال سے ملنا چاہتا ہے۔ گورنر نے دریافت کیا، شاعر کے متعلق اُن کی معلومات کا وسیلہ کیا ہے، اُس نے بتایا کہ ایران اور رُوس کے چند اضلاع میں اُس نے اقبال کے کلام کو مقبول عام پایا ہے اور اس پر استعجاب بھی ظاہر کیا کہ حکومت ہند نے اب تک شاعر کی قدر کا صحیح اندازہ کیوں نہیں کیا۔ گورنر اقبال کے نام سے ضرور واقف تھا۔ لیکن اُن کی وسعت علم، یا اُن کی بین الاقوامی شہرت کا اندازہ نہیں رکھتا تھا چنانچہ ملاقات کے بعد وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خود ہی خطاب کی تجویز پیش کی۔

عام خیال تھا کہ سر کا خطاب پا کر، اقبال نے آزادیٔ ضمیر کو فروخت کر دیا لیکن یہ خیال اُس وقت باطل ثابت ہوا جب اقبال کے قلم کے تیور ویسے ہی مجاہدانہ رہے۔ اقبال کے پیش نظر جو آئیڈیل بھی تھا، وہ اُس پر تادمِ مرگ قایم رہے، اُن کی بصیرت نے کہیں سرِ خم نہیں کیا، اُن کے جذبات و افکار، ویسے ہی سرافراز و سرفروش رہے جیسے خطاب سے پہلے تھے۔

اقبال کی آخری عمر، غم و اندوہ کا افسانہ ہے، خرابیٔ صحت، سِن و سال کے تقاضے اور سب سے بڑھ کر شریکِ حیات کی رحلت — ان سب نے بل کر شاعر کی پشت کو خم کر دیا، ہر چند اُن کے علمی و ادبی مشاغل کے بیل رہنا رہی ہے۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں شاعر نے آنکھیں بند کر لیں۔ اقبال کا جنازہ جس شان و شوکت سے اُٹھا، وہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں، ہندوستان کے گوشے گوشے سے آہ و بکا کا دھواں اُٹھا، سارا بزمِ اعظم، شاعرِ اعظم، کی رحلت پر ماتم کدہ بن گیا، آج وہ شاہی مسجد لاہور کے قریب محوِ خواب ہے،

ہندوستان میں اقبال اکیڈیمی اور دوسرے ادارے، بطور یادگار قایم کیے جا رہے ہیں، اگرچہ اقبال ہم میں نہیں رہا لیکن اُن کے خیالات ہمیشہ مشعلِ راہ بن کر ہماری راہنمائی کرتے رہیں گے مرنے سے پہلے جو رباعی، شاعرِ مشرق نے لکھی ہے، وہ تا حشر زندہ رہے گی۔

حیات رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

مشعلِ راہ میری نظر میں

(جوش ملیح آبادی)

مخشب جارچوی ایک خوش طبع اور خوش فکر نوجوان ہیں ان کی شاعری بھی ان کی طرح جوان ہے۔ انکے بیان میں تازگی اور لہجے میں شیرینی کا عنصر بہت خوبی کیساتھ سمویا ہوا ہے ان کی عشقیہ شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر غزل گویوں کی طرح اُن کا عشق روایتی اور اُن کا محبوب موروثی نہیں بلکہ بیاس وادی سے گذرے اور اسکے طوفان سے خود کھیلے ہیں یہی حال ان کی مناظر پرستی کا ہے۔ اُنہوں نے گھر کی چار دیواری میں بیٹھکر باغوں جنگلوں اور کہساروں پر خامہ فرسائی نہیں کی ہے بلکہ کھلی ہوا میں سیر کر کے حسنِ قدرت کا مطالعہ کیا ہے۔ جسکے اُبھرے ہوئے نقوش نظروں کو ٹھیرا کر دماغ کو منور کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے ذہنی ارتقاء اور بلوغ کی گواہی دے رہی ہیں۔ اور اسی پاکیزہ اور صالح علامت پر میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔

جوش ملیح آبادی شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے

انقلاب اور انقلابی شاعری مبہم الفاظ ہیں۔ ادب برائے ادب کی طرح انقلاب برائے انقلاب بھی گمراہ کن عقیدہ ہے، اس لئے کہ انقلاب کا نتیجہ خیر بھی ہو سکتا ہے اور شر بھی۔ یہ انقلاب کی نوعیت اور مقاصد پر منحصر ہے۔

روس میں زاریت کا خاتمہ انقلاب کی ایک صورت تھی اور جرمنی میں جمہوریت کی تباہی دوسری۔ اس خیر و شر میں تمیز کرنے اور صحیح انقلابی تعلیم کی ترویج کے لئے جذبہ و جنون کافی نہیں۔ فہم و تدبر اور صحت نظر بھی لازمی ہے۔ چنانچہ ہر ادبی تحریر کے فنی اور افادی پہلو تو ہوتے ہی ہیں لیکن انقلابی ادب کا ایک تیسرا پہلو بھی ہوتا ہے۔ یعنی نظریاتی پہلو۔ گو یہ سچ ہے کہ انقلابی ادب کامیاب اور ناکامیاب، مفید اور مضر ہونے کے علاوہ صحیح یا غلط بھی ہو سکتا ہے۔ جوش چونکہ شاعرِ انقلاب تسلیم کیے جاتے ہیں اس لیے ان کے دوسرے محاسن یا معائب پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ انقلابی نقطہ نظر کس حد تک صحیح ہے؟

یہاں سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح انقلابی نقطہ نظر ہے کون سا؟ یہ اپنے اپنے سیاسی عقائد کی بات ہے۔ اگر شاعر ایک نظریے کو صحیح سمجھتا ہے تو اس کے کلام کی صحت یا نادرستی اسی نظریے سے متعین کی جا سکتی ہے۔ نقاد کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ شاعر سے یہ گلہ کرے کہ اسکا نظریہ نقاد کا نظریہ کیوں نہیں ہے؟ آجکل عام طور سے اصطلاحی معنوں میں انقلابی نظریے سے اشتراکی نظریہ، مراد لیا جاتا ہے۔ غالباً جوش بھی اسی نظریے کے قائل ہیں اور اس سے مطابقت کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کا انقلابی کلام اشتراکی نظریے سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے؟ اگر یہ صحیح نہیں ہے تو جب تک وہ اپنے نظریے کی وضاحت نہ کر دیں تنقید بے سود ہے۔ اس مضمون میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پہلی بات صحیح ہے اور صحیح انقلابی شاعری وہی ہے جو اشتراکی عقاید کے مطابق ہے۔

جوش کے کلام سے جو سب سے پہلا تاثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جوش ایک شخصیت نہیں بلکہ دو شخصیتیں ہیں۔ ان دو شخصیتوں کے لئے جوش صاحب نے خود سیف اور سبو کے نشانات وضع کئے ہیں اور وہ اس تضاد کا اعتراف کرتے ہیں ؎

لایا ہوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے　　یہ طبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لئے

انقلابی شاعر پر حسن و عشق یا مے و جام حرام نہیں اور اس پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ انقلابی مضامین کے علاوہ اپنے دوسرے تجربات اور دوسری واردات کا ذکر ہی نہ کرے لیکن چونکہ یہ سارے تجربات اور وارداتیں ایک ہی شخصیت پر گذرتی ہیں۔ اس لیے ہم یہ تقاضہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اس کے کلام کے ان متنوع اوراق میں کوئی داخلی یا خارجی ربط اور کوئی ذہنی یا جذباتی وحدت قایم رہے۔ اشتراکی نظریۂ حیات ہمہ گیر ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تمام انسانی تعلقات اور تجربات، ہماری تمام محبتیں، اور لغزشیں، راحتیں اور کدورتیں غیر مربوط اور الگ تھلگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی بنیادی، سماجی حقیقت کی پیداوار اور آئینہ دار ہوتی ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صحیح انقلابی شاعر اپنا انقلابی نظریہ محض انقلابی مضامین تک محدود نہیں رکھتا۔ اس کے لئے حسن و عشق، مناظرِ فطرت، شراب و ساغر، سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خالص عاشقانہ کیفیت کا ذکر کرتا ہے تو اس میں بھی انقلابی شعور کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پائی جاتی ہے۔ وہ بزم شراب کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس بزم کی ہاؤ ہو میں انقلاب کا شور و شغب بھی شامل ہوتا ہے اور جب وہ خالص انقلابی مضامین باندھتا ہے تو وہ بھی بزم مے کے سرور اور فراق و وصال کے سوز و ساز سے یکسر خالی نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شاعر اپنی ذات کو انقلابی نظریۂ حیات سے منطبق کر چکا ہے تو اس کے لئے یہ آسانی سے ممکن نہیں کہ وہ ایک لمحے میں خالص سو فیصدی انقلابی ہو اور دوسرے لمحے میں مکمل رند اور فراری۔ یہ جوش صاحب کا کمال کہہ لیجئے یا کمزوری سمجھیے کہ ان کی انقلابی اور رندانہ

شخصیتوں میں کوئی ربط یا علاقہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو اتنا کہ محسوس ہو کہ اگر انکا کلام دو حصوں میں بانٹ دیا جائے تو سوائے اسلوب بیان کے ان دو حصوں میں کوئی ذہنی یا جذباتی کیفیت مشترک نہیں۔ اگر یہ تضاد موجود ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں شخصیتوں میں سے یا یوں کہہ لیجئے کہ انکی شاعری کے ان دو حصوں میں سے زیادہ کامیاب کون سا ہے؟ چونکہ شاعرانہ خلوص کا واحد امتحان شعر کی کامیابی ہے اس لئے ہمارے پہلے نتیجے سے یہ بھی نتیجہ ہوگا کہ ان دونوں شخصیتوں میں سے زیادہ پُرخلوص کونسی ہے؟ ایک حد تک ان دونوں سوالات کے جواب ذاتی تعصبات اور ذاتی مذاق پر منحصر ہیں۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ کامیاب نظموں کی گنتی کس حصے میں زیادہ ہے تو ممکن ہے فیصلہ کچھ آسان ہوجائے لیکن شعر اور ریاضی میں بڑا فرق ہے۔ پھر کامیاب اور ناکام نظمیں متعین کرنا بھی کچھ ایسی سیدھی بات نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ کونسی نظم شاعر کی ذہنی کیفیت کی مکمل ترجمان ہے اور کس نظم میں یہ ترجمانی ناقص یا غیر مکمل ہے، کس نظم میں الفاظ و معانی پوری طرح مدغم ہیں۔ اور کس نظم میں الفاظ و معانی کا رشتہ ڈھیلا اور بے جوڑ ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی طے کرنا پڑے گا کہ ان دو مختلف انواع کی کیفیتوں میں بنیادی انسانی اقدار کا امتزاج صحیح اور غلط کہاں کہاں ہے؟

میری ذاتی رائے میں اگر محض تعداد سے اندازہ لگایا جائے تو جوش کی رندانہ اور عاشقانہ نظمیں اس عتبار سے ان کی انقلابی نظموں سے زیادہ ہیں بہر حال اس وقت ان کے انقلابی اور رندانہ کلام کا موازنہ مقصود نہیں محض ان کے انقلابی کلام کی انقلابیت کو اشتراکی نقطۂ نظر سے پرکھنا مقصود ہے۔

اشتراکیت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ انقلاب کسی فرد یا کسی ایک شخص کی ذاتی کوششوں یا تدبر کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ سماجی اور اقتصادی قوتوں کی باہمی پیکار اور کشمکش سے نمودار ہوتا ہے۔ اس انقلاب میں فرد کی اہمیت طبقوں یا جماعتوں کی اہمیت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جوش کی شاعرانہ طبیعت اور مزاج اس نظریئے کے خلاف ہے۔ وہ طبعاً انانیت پسند اور انفرادیت کے مداح واقع ہوئے ہیں جب وہ انقلابی تگ و دو کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور سے اس تگ و دو کا ہیرو کوئی طبقہ نہیں بلکہ کوئی فرد ہوتا ہے اور ان کے ابتدائی انقلابی کلام میں یہ ہیرو جوش صاحب خود ہی ہیں ؎

بُت کے آگے بھی جھکے گا اون کا سر نہیں — عقل و آفت کی حیب کہن جہاں ہم
قسم اس آتش کی جو مرے سینے میں جلے گا — کر لے پیدا تو اس جیسی ہی تو مجھ کو بتا
مری تیغ رواں باطل کے سر کو کاٹے گی — تجھے ہر شوق کی جنبش ختم ہونے بھی نہ پائے
اور بالخصوص جب ہے حکومت کا نشہ — رعب شکوہ، جاہ و جلالت کا سماں
شاہانِ کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا — قرنا و طبل و نادک و رایت کا سامنا

لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

یہ تصور کہ کوئی ایک فرد یا کوئی ایک شخص انقلاب کو اپنی ذات میں سمیٹ سکتا ہے اور یہ سماجی علل و اسباب اس کشمکش میں غیر اہم ہیں قطعی غیر مارکسی اور اشتراکیوں کے بقول رجعت پسندانہ ہے۔ وہ ذاتی انکسار اور جماعتی تفخر جو صحیح انقلابی شاعر میں ہونا چاہیئے جوش صاحب کی شخصیت کی عین ضد ہے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک دوسری بات یہ ہے کہ اشتراکی نظریئے کے مطابق سماجی نظام میں سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ طاقتور مند، محنت کش کا طبقہ ہے، کامیاب انقلابی درس دینے کے لیے اس طبقے سے ذہنی جذباتی اور نظریاتی مطابقت پیدا کرنا ضروری ہے۔ جوش کے ہاں یہ بات نہیں۔ وہ کسان اور مزدور کا اکثر ذکر کرتے ہیں لیکن بہت اوچھے اور مشفقانہ انداز میں۔ انھوں نے اس طبقے کی نظر سے مسائل کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی، نہ اس طبقے کے مسائل میں انھیں زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً کسان کے متعلق انکی مشہور نظم کے چند اشعار ہیں ؎

یہ سماں اور ایک قوی انسان یعنی کاشتکار — ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار
طفل باراں تاجدار خاک امیر بوستاں — ماہر آئین قدرت ناظم بزم جہاں
ناظر گل پاسبان رنگ و بو گلشن پناہ — ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

ان سارے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسان کے متعلق چند روانی تصورات کے علاوہ اور کوئی تصویر شاعر کے ذہن میں نہیں ہے۔ اسی طرح آگے چل کر اس کسان کے ہل کے متعلق وہ یوں قصیدہ خوانی کرتے ہیں ؎

کون ہل؟ ظلمت شکن قندیل بزم آب و گل — قصر گلشن کا دیا شیشہ گیتی کا دل
خوشنما شہروں کا بانی راز فطرت کا سراغ — خاندان تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام — شام زیر ارض کو صبح درخشاں کا پیام

یہ الفاظ بھی نوابی درباروں کے قصیدہ گو شعرا کی ذہنیت کا عکس ہوں تو ہوں اشتراکی شعور کے ترجمان نہیں۔ کسان اور ہل کی رنگین تصاویر کے

بعد یہ تصویر آتی ہے ؂

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا   بے ردا بیوی کا سر بچے کا منہ اترا ہوا
سیم و زر نان و نمک آب غذا کچھ بھی نہیں   گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری ہائے ہائے   یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے

مزدور اور کسان کے متعلق یہ ترحم اور رقت کا جذبہ قطعاً غیر اشتراکی ہے اس لیے کہ اشتراکی نظریہ مزدور اور کسان کی بے بسی لاچاری اور نقاہت کے بجائے اس طبقے کی تنومندی اور اس کی قوت و عظمت کا قائل ہے۔

انقلاب کا تصور ان طبقاتی تصورات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ جوش نے اپنے طبقاتی نظریے کی تنظیم نہیں کی اس لیے ان کا نظریۂ انقلاب بھی ایک حد تک نادرست ہے۔ وہ انقلاب کا تصور ہمیشہ کسان یا مزدور کی نظر سے نہیں بلکہ ایک خوش حال کی نظر سے کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ انکے شعر میں انقلاب ایک پرہول، مہیب اور دہشتناک سلسلے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہی صورت جو راتوں کو ہر حاکم شہر اور ہر صاحب زر کی نیند خراب کرتی ہے ؂

اللہ اللہ بزمِ ہستی میں مری گلباریاں   ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو ریزہ ریزہ استخواں
الاماں الحذر میری کڑک میرا جلال   خوں سفاکی گرج طوفان بربادی قتال
برچھیاں بھالے کمانیں تیر تلواریں کٹار   بیرقیں پرچم علم گھوڑے پیادے شہسوار
آندھیوں سے میری اٹھتا ہے دنیا کا نظام   جرم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام
موت ہے خوراک میری موت پر جیتی ہوں میں   سیر ہو کر گوشت کھاتی ہوں لہو پیتی ہوں میں

انقلاب کا یہ نظریہ اک مزدور یا کسان کا نظریہ نہیں جس کے لئے انقلاب خوش آیند دنوں اور بے غم راتوں کا پیش خیمہ ہے، موت اور گوشت خون کا نمائندہ نہیں۔

یہی نہیں کہ جوش نے مزدور اور کسان کے تجربات اور مسائل کی ترجمانی نہیں کی۔ شکوہ یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے طبقے کی الجھنوں اور مسائل کو بھی بیشتر موضوعِ شعر نہیں بنایا۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ وہ انفرادیت پسند ہیں اس لئے وہ جماعتی طور سے سوچتے ہی نہیں، انفرادی طور سے سوچتے ہیں اور جب کبھی وہ سیاسی یا جماعتی مسائل کا ذکر کرتے ہیں تو اپنی جماعت کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ اپنے ذاتی نقطۂ نظر سے۔ اس سے ان کے کلام میں ایک اور نظریاتی قباحت پیدا ہو گئی ہے اور وہ ہے ابنائے وطن کیلئے، ان کی نفرت اور حقارت ؂

اے سیہ رو بے حیا وحشی کمینے بدگماں   اے جبینِ ارض کے داغ اے ذلیلِ ہندوستاں

یعنی اہانتوں کا کچھ احساس کر سکیں   اتنا دلوں میں جذبۂ غیرت کہاں ہے جوش
تیری شرابِ تند کو برداشت کر سکے   اس ملک میں یہ ظرف و قوت کہاں ہے جوش
ہم شاعروں کی وضعِ جنوں کے اٹھائیں ناز   اہلِ وطن میں اتنی شرافت کہاں ہے جوش
اپنی تباہیوں پہ کبھی غور کر سکے   اتنی ذلیل ملک کو فرصت کہاں ہے جوش

اپنے ملک اور اپنی قوم کو ذلیل اور اپنی ذات کو افضل اور برتر قرار دینا کسی اشتراکی شریعت میں حلال نہیں۔ اس لیے کہ ایک اشتراکی اپنی ذلت یا برتری، اپنی یاس و ناامیدی کو اپنے ملک، اپنی جماعت یا اپنے طبقے سے الگ بھی نہیں کرتا۔

اس ساری بحث سے یہ مراد نہیں کہ جوش کا انقلابی یا ترقی پسند کلام نظریاتی اعتبار سے بالکل ناقابلِ اعتنا ہے۔ نہ اس سے یہ مراد ہے کہ انکے نظریات میں جو کمزوریاں دکھائی دیتی ہیں وہ مستقل اور ناقابلِ اصلاح ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے دس پندرہ برس میں انکی شاعری میں تعلّی اور تبرا دونوں بہت کم ہو گئے ہیں۔ ایک حد تک وہ محض اپنی ذات کی ترجمانی کرنے کے بجائے کبھی کبھی جملہ نوعِ انسان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں مثلاً اب اگر وہ یہ کہیں ؂

تری شان سے بحر و بر کانپتا ہے
شجر کانپتا ہے حجر کانپتا ہے

تو "میں" سے ان کی مراد شبیر حسن جوش نہیں ہے بلکہ ہر آدم زاد انسان ہے۔ اسی طرح بغاوت اور انقلاب کے متعلق بھی ان کے تصورات زیادہ خوشگوار اور کم ہولناک ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی جماعتی زندگی کی کوئی نہ کوئی صحیح اور واضح تصویر بھی دکھائی دے جاتی ہے۔

حوصلے سرنگوں امیدیں شل   آرزو داغ یاس سے بوجھل
نشہ بجھتا ہوا سا ایک شرار   کیف گرتی ہوئی سی ایک دیوار
ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن   ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن

اس کے علاوہ ان کی کامیاب ترقی پسند (بدقسمتی سے ہمارے ہاں انقلابی ادب اور ترقی پسند ادب میں فرق نہیں کیا جاتا۔ تمام کامیاب انقلابی ادب ترقی پسند ضرور ہو گا۔ لیکن ہر ترقی پسند تحریر کا انقلابی ہونا لازمی نہیں) نظموں کا ذکر بھی میں نے نہیں کیا، اس سے یہ مراد نہیں تھی کہ ایسی نظمیں ان کے کلام میں مفقود ہیں۔ یہ نظمیں عام طور سے دو تین مضامین کے متعلق ہیں۔ ایک وہ نظمیں جن میں کبھی جوش اپنی زبان سے اور کبھی انسان کی زبان سے ان داستانوں اور اذیتوں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں ان گنت صدیوں کا جبر اور ظلم و ستم برباد نہیں کر سکتے ؂

عمرِ رفتہ کی ہی پیرِ مغاں کیا کہنا   وہی دختر ہے وہی مہرِ نشاں کیا کہنا
کب سے ہے عشق نظر گیر شریعت سے حرام   وہی نظریں ہیں وہی حسنِ جواں کیا کہنا
شورشِ عصر و بحر اکبے ہے کب سے   پھر بھی سرشار ہیں یہ دانِ جہاں کیا کہنا
نیم کیسے ہاکت میں ابھی ہیں گرمِ خرام   زلفِ بردوش مسیحا نفساں کیا کہنا

دوسرے اسی سے ملتی جلتی وہ نظمیں ہیں جن میں رسمی عقائد اخلاق کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی گئی ہے۔ تیسرے وہ وطنی یا قومی نظمیں ہیں جن میں غم و غصہ یا نفرت و حقارت کی بجائے وطن یا اہل وطن سے شاعر نے اپنی محبت یا ہمدردی کا اظہار کیا ہے ؎

گھٹا اٹھی ہو جیسے کہ دامن میں سر جھکاتا ہوا   فضائے شرق میں دھیمی سی ایک آواز پاتا ہوا
یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے   صبا جس طرح زیرِ شاخِ سنبل گنگناتی ہے
فضا میں جس طرح روح الامیں کی بال فشانی   برستا ہو کہیں کچھ دور جیسے خوابِ پیشانی
یہ شرق محو ہے صبحِ تجلی زاد ہونے میں   یہ ایشیا مصروف ہے بیدار ہونے میں

ابھی تک ہم نے صرف جوش کے کلام کے نظریاتی پہلو کا ذکر کیا ہے ان کے کلام سے افادی اثرات کا جائزہ نہیں لیا۔ افادی اعتبار سے جوش کے کلام کی قدر و قیمت میں کلام نہیں۔ کسی نظام کے خلاف آواز اٹھانا ہمیشہ جرأت اور دلیری چاہتا ہے۔ ہمارے موجودہ ماحول میں اس چیلنج کی وقعت مختلف وجوہ کے سبب اور بھی زیادہ ہے۔ اس لئے اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ جوش کی مثال نے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اور انھیں فکر و نظر کے نئے راستوں اور منازل کی جانب گام زن ہونے کی ترغیب دی۔ اگر ان میں سے بہت سے ناکام اور بے رنگ نقالی کی حد سے آگے نہیں گذر سکے تو اس کی ذمہ داری ان کے اپنے کندھوں پر ہے۔ جو گنتی کے چند ایک لکھنے والے ہمارے نئے ادب میں تھوڑا بہت اضافہ کرنے میں کامیاب ہوئے انھیں جوش کی رفاقت اور گرمیٔ گفتار سے یقیناً اعانت اور امداد ملی ہے۔   (ماخوذ از آجکل دہلی)

[فاضل مضمون نگار نے اپنے فاضلانہ مضمون کی فضیلت کو ایسے پیچ و خم کھاتے ہوئے راستے پر ڈال دیا ہے کہ با دلِ ناخواستہ ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مضمون نگار ایک شخصیت ہوتے ہوئے بھی، بیچ سے چاک ہو گیا ہے، نصف حصہ "نقاد" نے اڑا لیا ہے اور آدھا دھڑ "ذوقِ ہم آہنگی" کے حوالے ہے، میں واقف ہوں

فاضل مضمون نگار کو اشتراکیت میں عصبیت حاصل ہے ... کی آنچ سے متحرک ہو کر انھوں نے جوش کو اس بات کی طرف رگیدا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے، جوش نے کبھی اشتراکی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، ہاں کچھ "اشتراکیوں" نے ان کی "ملی بھگت" ضرور کی ہے لیکن انکی یہ ہم آہنگی ان اشتراکی ادیبوں سے، بربنائے اشتراکیت نہیں بربنائے ترقی پسندی ہے اور بہ قول فاضل مضمون نگار ہر ترقی پسند کا انقلابی ہونا ضروری نہیں۔ جوش کی کچھ نظموں کے چہرے پر جو اشتراکیت کے تیور نظر آتے ہیں، وہ بالکل ایسے ہی ہیں جیسے کوئی کسی کو ہر وقت چور کہے اور وہ سچ مچ چوری کرنے لگے۔ چند اشتراکی ادیبوں کی تحریص سے جوش کی ترقی پسند شاعری نے قصرِ انقلاب میں "نقب زنی" کی ضرور کوشش کی ہے، لیکن اس کا عذاب جوش کی گردن پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ جوش کی فطرت نقب زنی کے خلاف ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے اشتراکی دوستوں کو مارکس کے فوٹو کے سوا جو نظم "مارکس" میں منعکس ہے، کوئی قیمتی اثاثہ لا کر نہیں دیا۔ اپنے ایوانِ شاعری سے خود انھوں نے ترقی پسند ادب کی جھولیاں بھر دی ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے جوش کی شاعرانہ افتادِ مزاج کے لیے "انانیت" کا لفظ، اپنی دانشتاکی کے باوجود، برمحل نہیں استعمال کیا، اور اس انانیت کی تفسیر میں جو اشعار پیش کیے گئے ہیں وہ اس لفظ پر منطبق نہیں ہوتے۔ جوش میں انانیت نہیں ہے، اس کا اطلاق نہ ان کی زندگی پر ہو سکتا ہے نہ ان کی شاعری پر، اگر انانیت کے عام مفہوم کے علاوہ کوئی مفہوم مضمون نگار کے ذہن میں ہے تو بدقسمتی سے وہ ہماری سرحدِ ادراک سے پرے ہے۔

اگر فاضل مضمون نگار نے، جوش کو اپنے بائیں باغ میں کھینچ کر، ان کا تعاقب نہ کیا ہوتا اور شاعر کو صرف نیشنلسٹ کی حیثیت سے پرکھا ہوتا تو دونوں اس تنگ دو سے بچ جاتے، نہ یہ ہانپتے نہ وہ۔

جوش کمیونزم کا نہیں نیشنلزم کا شاعر ہے اور ہر نیشنلسٹ کی طرح جوش کا انقلاب بھی ایک جذباتی تلاطم کا آئینہ دار ہے، ہمارا یہ شاعرِ انقلاب، اس میں شک نہیں، بعض اوقات، اشتراکیت کی طرف جھکتا ضرور ہے، لیکن وہ صرف اس بنا پر کہ اسے اپنی آیۂ اپنی کھلائی نیشنلزم کی اولادِ نرینہ یعنی طبقۂ سرمایہ داری سے طبعی گریز

نظری انحرافات اور بھی بعض ہے۔ ابھی جوشؔ کی تازہ نظم "اور ہند کا خطاب" شائع ہوئی ہے۔ کمیونسٹ ادیبوں نے اس نظم پر خوب بغلیں بجائیں لیکن نظم کا ہر شعر نیشنلزم کا آئینہ دار ہے۔ اس حقیقت کو جو دراصل ایک مجبوری ہے، کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ جوشؔ کا رُواں رُواں نیشنلزم کے ہر بن مو سے جکڑا ہوا ہے۔ جوشؔ کی چند نظمیں مثلاً کسان، اہلِ زر کے خلاف اُن کا گرجتا گونجتا نعرہ احتجاجِ خدا کے باب میں تفکّرِ صالح کا ولولہ اور اب چند اشتراکیوں کی ہم نشینی ــــ ان سب کے مخلوط اثرات کے تحت بعض حضرات یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ جوشؔ اشتراکیت کا شاعر ہے۔ یہ غلط ہے!

اگر آپ نیشنلزم اور صرف نیشنلزم کی عینک سے شاعرِ انقلاب کی شاعری کو دیکھیں تو دو شخصیتوں کا سایہ بالکل جدا ہو جائیگا اور آپ دیکھیں گے کہ جوشؔ کا کلام اُن کی فطرت، اُن کی سرشت، اُن کے نسلی اور موروثی مزاج، اُن کے تجربات اور اُن کی بڑی حد تک زندگی کے عین مطابق ہے۔ اور اِسی کا یہ فیض ہے کہ آج بھی اُردو ادب کے اُفق پر جوشؔ کی شاعری کے شمس و قمر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں۔

آئندہ نشست میں جوشؔ کی انقلابی شاعری پر تفصیل سے لکھوں گا۔

[شہاب]

بازارِ سینما میں ایک چکر

(شہاب ملیح آبادی)

ہندوستانی فلم انڈسٹری نے پچھلے تیس سال میں ترقی کے جادے پر نہایت تیز گامی سے قدم رکھا ہے۔ اس تیزگامی میں کوئی دیسی صنعت اُس کی حریف نہیں ہے۔ سینما کی مقبولیت کا ڈنکا گھر گھر میں بج رہا ہے، سماج کا ہر طبقہ اُس کی پذیرائی کے لیے موجود ہے۔

جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کا دُنیا بھر میں واویلا مچا ہوا ہے۔ جرمنی اور جاپان ایسے دیو ہیکل ممالک ماتم کدہ بن گئے۔ لیکن یہی جنگ فلم انڈسٹری کے لیے ابرِ رحمت بن کر برسی، سیکڑوں ایام زدہ پروڈیوسروں کی کھیتیاں ایک ہی چھینٹے میں لہلہا اُٹھیں، حکومت کی عائد کی ہوئی پابندیاں فلم کے بازار کو سرد نہ کر سکیں۔ جنگ کے بعد تعمیری ہنگاموں میں صنعتِ فلم کی آواز بھی شریک ہے، خبر ہے کہ ایک لامحدود ترقی کا در کھلنے والا ہے۔ پوری صنعت گرمجوشی کے ساتھ مصروفِ جدوجہد ہے۔ یہ بھی افواہ ہے کہ بمبئی میں ٹریننگ کے مقصد کے لیے ایک انڈین فلم ادارہ چودہ لاکھ روپے کے سرمایے سے جاری کیا جائے گا، جو خود گورنمنٹ کے مساعی پر مبنی ہوگا، صنعت کا یہ تابناک رُخ حوصلہ افزا ہے۔ اِس ہنگامہ آرائی میں بہت کچھ اُس خوف کو بھی دخل ہے جو بیرونی ممالک کا سرمایہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کی گھات میں بیٹھا ہوا پیدا کر رہا ہے۔ لیکن خوف، ہر خوف تخلیقی کاموں کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتا ہے۔ منفی روش، تخریبی کام تو بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے، لیکن تعمیری خدمت اُس کے بس کی چیز نہیں ہے۔ آپ کہیں گے موجودہ فلمی صنعت میں تخلیقی جوہر ہیں ہی کہاں؟ اِس میں کوئی شک نہیں، صنعت کی مالیاتی اعتبار سے ترقی کی تابانی کے دوش بدوش پروڈیوسروں کی ذہنی ظلمت بھی قدم اُٹھا رہی ہے۔

ہمارے پروڈیوسروں میں روشن دماغوں کی کمی نہیں ہے لیکن ہم ہر چند کہ در کانِ نمک رفت نمک شد کے مصداق اُن کی

تصویریں [illegible] بھیڑوں کی ذہنیت عام ہے۔ "خزانہ" کی تصویر [illegible] کی غیر معمولی مقبولیت دیکھ کر ہر پروڈیوسر تاریخی آثار کے میوزیم کی طرف بے تحاشا دوڑ پڑا۔ "شہنشاہ اکبر" "سکندر" "بابر" "تاج محل" اور ایسی ہزاروں تصویریں اسکرین پر بکھیر دی گئیں لیکن ان میں سے ایک بھی کان پر جوں بن کر نہ رینگ سکی۔ "پربھات" کی تصویر [illegible] چلتی ہے۔ "تو تلسی داس" "سور داس" مالی ایسی تصویریں [illegible] لگتی ہیں۔ "لیلیٰ مجنوں" کی تنا میں "وامق عذرا" "سوہنی مہیوال" "رومیو جولیٹ" "ہیر رانجھا" قبروں سے سر پیٹ کر گریباں چاک، دامن دریدہ، صحرا بدوش نکل پڑتے ہیں۔ "رام راجیہ" اور "شکنتلا" کے بطن سے اِس نوع کی تصویریں پیدا ہونے لگیں اور سلسلۂ پیدائش ہنوز جاری ہے، "پرتھوی راج سنجوگتا" "سری کرشن بھگوان" "لاکھا رانی" "رتن ولی" "میگھ دوت" "سبھادرا" "کرشن لیلا" وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

کلکتے سے "قیدی" برآمد ہوا تو متعدد مسلم سوشل قصا بیڑیاں توڑ کر مارکٹ کے سقف و بام پر جھپٹ پڑیں، "نجمہ" "عصمت" "بھول" "پہلی نظر" "غزل" "زینت" "نغمۂ صحرا" "نیک پروین" وغیرہ وغیرہ۔

اِس اُچھل کود سے کیا پتہ چلتا ہے؟ اِس اُچھل کود سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ یا تو پروڈیوسروں کے سر میں مغز نہیں ہے بھوسا بھرا ہوا ہے یا اگر ہے تو اب تک ٹانگ پھیلائے خرّاٹے لے لے کر میٹھی نیند سو رہا ہے، جب تک "باکس آفس ہٹ" کی تمنا اور "مارکٹ کی نباضی" کا فریب وہ اپنے کو دیتے رہیں گے کوئی مفید تخلیقی کام انجام نہ دے سکیں گے۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری، اِس بھرپور ترقی و شادابی کے باوصف ابھی عہدِ طفولیت میں ہے، جو لڑکھڑا کر گھٹنوں گھٹنوں چلنے کی سعی میں مصروف ہے۔ اور یہ عہدِ طفولیت وہ ہوتا ہے "نقالی" کا۔ بڑوں کی نقالی کر کے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ہمارے اِن چھوٹے بھیاؤں کے "بڑے" کون ہیں؟

پروفیسر ایڈلر کی اگر جدید علم النفس کو پیش نظر رکھ کر غور کیا جائے تو اِس امر کا پتہ چلتا ہے کہ احساسِ کمتری کا سبب

خلاف ہے اپنے لیے ایک صورت خالی پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو کیا یہ سچ نہیں کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری ہالی وڈ امریکہ کی چمک دمک دیکھ کر اُسے "بت" بنا کر اُس کی اندھی نقالی میں مصروف ہے؟

تو یہ معجزہ جب بے بصری کی حد میں آجاتی ہو تو دوسرے کے معائب کو بھی محاسن سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے سر میں نیازمندانہ خم پیدا کر لیتی ہے۔

ہندوستان اِس وقت مرکز ہے ہجوم مسائل کا، لیکن ہر تصویر ان مسائل کے تلاطم سے کترا کے کنارے کنارے نکل جاتی ہے، کیوں؟ اِس وجہ سے کہ ہالی وڈ کی تصاویر خود سماجی موضوع سے کوری ہوتی ہیں، امریکی پروڈیوسروں کی نگاہ رجعت پسندی کی شیدا ہے، تصاویر کے کردار محض افسانوی ہوتے ہیں جنہیں حقیقت و اصلیت کا خون ہوتا ہی نہیں ہے۔ زیادہ تر انفرادی معاملات، طلاق وغیرہ تصویر پر حاوی رہتے ہیں، کسی تصویر کے چہرے پر قومی و اجتماعی حوصلوں کا عکس نہیں پڑتا۔ اُسکی وجہ کیا ہے؟ ہالی وڈ، زندگی سے کنارہ کش ہو کر سینما کو محض تفریحِ طبع کا آلہ سمجھتا ہے، اُس کے تصور میں بھی نہیں آتا کہ اِس آلے میں زندگی کی دھار پیدا کی جا سکتی ہے۔

۱۹۴۳ء سے جب نازی جرمنی نے ان تصاویر کے موضوع سے اپنے حسبِ حال پروپیگنڈا شروع کیا تو آثارِ تبدیلی پیدا ہوئے اور کچھ ایسی تصاویر معرضِ وجود میں آئیں جو ایک سنجیدہ فکر اور میلانات حقیقت کا پہلو لئے ہوئے تھیں۔ "ہٹلر کے بچے" "یہ سرزمین ہماری ہے" اِسی قبیل کی تصاویر ہیں، لیکن ہندوستانی فلم کا باوا آدم ہی نرالا ہے!

یہاں کا ایک وفد ہالی وڈ گیا تھا، اس سلسلے میں امریکہ کا ایک فلمی پرچہ ۲۹ راگست ۴۵ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"دوسرے ممالک کے پروڈیوسرز، ڈائرکٹرز اور دیگر ماہرِ فنیات یہ تصور کرتے ہیں کہ ہالی وڈ کی ایک زیارت سے اُن کی جہالت دُھل جائے گی اور تنگیٔ علم کا دامن پہنائے عالم کو وسعت میں گھیر لے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ واپسی پر اُن کے ہاتھ میں ایک عصائے معجزہ آ جائے گا، اِدھر چھو منتر کیا، اُدھر ہالی وڈ کے معیار کی تصویر

تمام ہو گئی!" ـــ

حُسن تو ہی جہاں میں تیرا افسانہ کیا
کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا

ادبی حلقوں میں "ادب برائے ادب" کی باڑھ کند ہو چکی ہے، "ادب برائے زندگی" کا نظریہ پالا مار چکا ہے، لیکن فلمی دنیا میں ابھی "آرٹ برائے آرٹ" ہی کی پیدائش نہیں ہوئی ہے، "آرٹ برائے زندگی" تو دوسری نسل کا تذکرہ ہے۔ "ادب برائے زر" وہ نظریہ ہے جو آج تک کہیں سُننے میں نہیں آیا تھا، لیکن ہندوستانی فلمی صنعت کے لئے یہ نظریہ آیاتِ ربانی کا حکم رکھتا ہے۔ میرے خیال میں ڈبگو زیڈ احمد پہلے پروڈیوسر ہیں جن کے اسٹوڈیو کے ماتھے پر "آرٹ برائے عوام" کا لیبل لگا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اِس حوصلہ مندی پر وہ اِس بات کے مستحق ہیں کہ "ترقی پسند پروڈیوسرین" میں شمار کئے جائیں۔

بالعموم ہمارے پروڈیوسر جب کوئی تصویر پیش کرتے ہیں تو اسکرین پر مجھے ایک دُعا پھڑپھڑاتی ہوئی نظر آتی ہے ـــ اے مالکِ ارض و سما، اے غریبوں کے پروردگار! ہماری اِس تصویر کو "باکس آفس ہٹ" بنا دے" ـــ دعائیں کم ہی قبول ہوتی ہیں لیکن نیت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے!

"باکس آفس ہٹ" کی تمنا میں پروڈیوسر سب سے زیادہ اِس اَمر کے کوشاں ہوتے ہیں کہ اُن کی تصویر "چونی والوں" میں مقبول ہو جائے۔ اور چونی والوں کی نظر میں کون تصویر مقبول ہوتی ہے؟ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ لیکن حالات غمازی کرتے ہیں کہ اُن میں وہی تصویر مقبول ہو سکتی ہے جو اُن کے جاہلانہ شعور بگڑے ہوئے مذاق، رکیک میلانات اور بے ہودہ و خرافات خیالات کو غذا پہونچاتی ہو۔ اِسی تمنا سے "آرٹ برائے زر" کا نظریہ ایک عملی فلسفہ بن جاتا ہے۔ اور اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک طرف کہنہ فرسودہ ناقابلِ کہانیاں بار بار سامنے آتی ہیں۔ اور دوسری طرف اخلاق سے گری ایسی تصاویر بنائی جاتی ہیں کہ اخلاق کی چولیں ہل جاتی ہیں۔ اِسی بنا پر اکثر افراد سینما کو عہدِ حاضر کی سب سے بڑی لعنت اور اخلاقی اعتبار سے اُم الخبائث سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن ہوس زر نے اِسے ایسا بنا دیا ہے!

[illegible] ایک [illegible] کاٹنے کے جرم میں گرفتار [illegible]

اُس نے اپنے بیان میں کہا "قسمت" میں اشوک کمار کا کام دیکھ کر مجھے بھی اس فن کی ترغیب ہوئی۔ ایسا ہی ایک قصہ بنارس میں پیش آیا تھا۔ وہ مجرم بھی "قسمت" دیکھ کر جیب تراشی پر تُل گیا۔

بچوں کی ابتدائی تعلیم میں تصاویر کو بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ ابتدائی درجوں کی کتابوں میں حروف سے شناسائی بذریعہ تصاویر ہی کی جاتی ہے۔ سینما اس پہلو سے نہایت موثر حربہ ہے چنانچہ روس میں اشتراکیت کی تبلیغ بہت حد تک سینما ہی کی مرہونِ منت ہے۔ ہندوستانی فلم اس تعلیمی و تبلیغی عناصر سے بالکل کوری ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ کہ پروڈیوسروں میں "باکس آفس ہٹ" کے میدان میں گھوڑ دوڑ ہو رہی ہے۔ کسبِ زر میں ہر ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ یہاں نہ آرٹ آرٹ کے لیے ہے نہ آرٹ زندگی کے لئے۔

"قسمت" نے شاندار کامیابی حاصل کی، لیکن نوخیز دماغوں کے لیے ایسی کہانیاں "مجرمانہ دلولوں" سے بھرپور کہاں تک مفید ثابت ہو سکتی ہیں؟ "چھمیا" کا ایک اشتہار ملاحظہ کیجیے۔

کل ایک بجے
ہولی کے مبارک دن
ایک بچے کی پیدائش ہوگی
بے عیب و بے داغ چولی کا بچہ
تخلیق پیدو تماداس گپتا
چھمیا

میں نے اشتہار کے ترجمے میں دیدہ و دانستہ اُن الفاظ کی ہیئت بدل دی ہے جن سے عیاشیت کی دل شکنی کے پہلو نکلتے ہیں۔ دوسرے اشتہار کے چہرے پر وہ شوخ عریانی رقص کر رہی ہے

[illegible]

آج ایک سال [illegible] ہندوستانی [illegible] شکل سے کوئی تصویر یا کبھی ہوگی جو تقاضائے [illegible] زندگی کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرتی ہو آپ غیر ملکوں سے ترجیح رکھتے ہیں کہ آپ کے اُجڑے ہوئے گھر کی تعمیر [illegible] کی داد دی وہ لیں۔ ہندوستان صرف پیٹ کا مارا ہوا نہیں جنسی بھوک میں بھی مبتلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری معاشرت میں اختلاطِ "مرد و زن" ایک خطرناک صورت بن جاتا ہے شرم و حیا کے محاسن کا احساس بہت حد تک اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ تصویر دیکھتے وقت (اور ہندوستانی تصویر جنسی بھوک کی شکار ہے) دل کا چور تو خوش ہو جاتا ہے، لیکن جب شعوری یا غیر شعوری طور پر "بہو بیٹیوں" کے چہرے سامنے آتے ہیں تو دل کا چور ضمیر کا قالب بدل کر خود اپنے پر لعنت ملامت کرتے ہوئے اُس سے بھی انتقام لینا چاہتا ہے جس نے اس [illegible] کی کشمکش کو پیدا کیا ہے۔ اس باب میں میں جوش کا ایک شعر پیش کرتا ہوں اور بس ؎

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

اخلاقی سرد بازاری کے ساتھ ساتھ فلم اسٹوڈیوز کے علمی ماحول کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ فلمی دنیا کے لیے عام طور پر علمی و ادبی بصیرت کو ایک رکاوٹ ([illegible]) سمجھا جاتا ہے، ہونہار ادبی ذوق والے انسان کے لیے اسٹوڈیوز کی چار دیواری میں پرواز کا موقع نہیں۔ ہم اعلیٰ چیز پیش کر سکتے ہیں، ہماری مشکل یہ نہیں کہ ہم بلند و برتر مواد پیش نہیں کر سکتے بلکہ یہ ہے کہ ادنیٰ و مبتذل چیز ہمارے قلم سے نکل نہیں پاتی۔ فلم اس حلقے میں حرف شناسی تک کامیابی کا ضامن ہے۔ اچھا شاعر اچھا ادیب فلم لائن کے لیے بلیک شیپ ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پروڈیوسر عوام کو بلند کر کے ادیب تک لانا نہیں چاہتے۔ ادیب کو پست کر کے عوام کی سطح تک لے آنا چاہتے ہیں۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جوش سا شاعر "میرے جُبنا کا دیکھو اُبھار" لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ جوش نے

جب بھی آگیا پیر عدم تھا اور وہ اپنے فطری چھوٹے پن کے باعث یہ سمجھ رہے تھے کہ اس پلیٹ فارم سے وہ ملک و عوام کی بہتر خدمت کرسکیں گے۔ لیکن انہوں نے دیکھ لیا کہ شاعر انقلاب جوش تھے اور کشیا سماج کے گیت لکھنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔ کچھ کر ہی کیا سکتا تھا؟ —— فلم لائن میں یہ زوال نہیں کمال ہے!

یہی حال کہانی لکھنے والوں کا ہے۔ اس لائن میں کرشن چندر، اور احمد عباس ایسے لوگ خال خال ہیں، بلکہ کرشن چندر ایسے ادیب تو اس صنعت کے لیے مبتدی ہیں یہی وجہ ہے کہ بیشتر کہانیاں فرسودگی آلود زندگی کی امنگوں سے عاری اور آرٹ کے مقتضیات سے بیگانہ ہوتی ہیں۔

"نئے چہروں" کی تلاش کا غل مچا ہوا ہے لیکن ہر پروڈیوسر تصویر کی کامیابی کے لیے پرانے ناموں اور معروف ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے بغیر قدم نہیں اٹھاتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر تصویر میں وہی تھکا دینے والے چہرے بصارت کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ بازار کا رنگ دیکھ کر ہر پروڈیوسر اس عقیدے کو دل میں چھپائے ہوئے ہے کہ غیر معروف اسپ تازی سے معروف "خچر" بہتر ہے۔

کسی آئندہ نشست میں اسٹوڈیو کی عملی زندگی پر اپنے تجربات و مشاہدات قلم بند کروں گا، سر دست یہ سرسری اور اجمالی خاکہ کافی ہے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ہندوستانی پریس

(گذشتہ سے پیوستہ)

قسط ۴

(مترجمہ شہاب ملیح آبادی)

ہندوستانی پریس کی ولادت کو ابھی بیس برس ہی ہوئے تھے کہ مارکوئز ولزلی گورنر جنرل کی حیثیت سے نیا مزاج اور نئے تیور لیکر ہندوستان آئے۔

ہندوستانی پریس اپنی اوائل عمری میں آزادی رائے کے باوجود ایک بے ربط و غیر منضبط پالیسی کا شکار تھا۔ آزادی رائے کا رخ غلط سمت رہتا تھا۔ بالعموم، پبلک کی چیدہ شخصیتوں کے نجی معاملات پر نکتہ چینی کے سوا اور کوئی حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اکثر سرکاری ضابطوں پر شدید نکتہ چینی کرنے کے ساتھ ساتھ معلومات کے گہرے وسائل پردسترس رکھتا تھا اور یہی معلومات حکومت کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی تھیں۔ گورنمنٹ کے ذہنی انتشار کی ایک وجہ نپولین کی ابھرتی ہوئی شخصیت بھی تھی جس سے برطانیہ کے ہندی مقبوضات بھی خطرے کی زد پر تھے، اس وجہ سے حکومت کی کارروائیوں پر پریس کی جانب سے علانیہ نکتہ چینی ہنس کر نہیں ٹالی جا سکتی تھی، ولزلی کہ نپولین ہی کی طرح ایک شاہانہ مزاج رکھتا تھا۔ ذرا سی اختلاف رائے پر برہم ہوجاتا تھا۔ ایک موقع پر تو اس نے شاہانہ طمطراق کے ساتھ فرمایا "میری سرشت اور میرے مزاج سے لوگ کما حقہ طور پر آگاہ ہوچکے ہیں۔ جب تک میں اس کرسی پر ہوں کوئی شخص شرارت کی جرأت نہیں کرسکتا۔ تاوقتیکہ وہ حکومت کی پوری طاقت سے برسرپیکار ہونے کے لیے آمادہ دکھائی نہ ہو"۔ ان دلیرانہ الفاظ کے پس پشت ایک قوت ارادہ تھی۔

اس وقت ولزلی مدراس میں ٹیپو سلطان سے دست وگریباں تھا۔ اس شہنشاہ کرناٹک کے خلاف ٹیپو یا فرانسیسی حمایت میں ایک لفظ کی بھی وہ تاب نہیں لاسکتا تھا۔ چنانچہ جب "ایشیاٹک مائی رر" کے ایڈیٹر ہمفریس نے یورپین اور دیسی اقوام کی طاقتوں پر قیاس آرائیاں کیں اور انھیں اپنے جریدہ میں شائع کیا تو ولزلی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ ہر چند اس ایک ورق کے مضامین مدیر تھا اس نے جو کچھ کیا رائے عامہ کی تحریک کے تحت لکھا، لیکن ولزلی جو ہند میں برطانیہ کی نازک پوزیشن پر نظر رکھتا تھا، ایسے مضامین کو محض شرارت تصور کرکے ان کا قلع قمع کردینا ہی انسب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اپریل میں اس نے کمانڈر انچیف کو لکھا "میں پہلی فرصت ہی میں اخبارات کی طرف توجہ مبذول کرکے ایڈیٹروں کے پورے قبیلے کے لیے قانون وضع کردوں گا، اس اثنا میں اگر آپ مفسد اخبارات کے ایڈیٹروں کو نرمی سے نہ رام کرسکیں تو ان اخبارات کو جبر وطاقت کے بل پر دبا دیں اور ان کے ایڈیٹروں کو یورپ پارسل کردیں۔

مئی ۱۷۹۹ء ہی میں یہ رائے عملی صورت میں قوانین بن کر فولاد ویلم کی دیوار پھاند کر سامنے آگئی:-

(۱) ہر اخبار کا مشتہر اخبار کے نیچے اپنا نام درج کرے گا

(۲) ہر ایڈیٹر اور پروپرائٹر اخبار اپنے نام اور جائے قیام سے حکومت کے سکریٹری کو آگاہ کرے گا۔

(۳) اتوار کے دن کوئی اخبار شائع نہیں ہوگا۔

(۴) تاوقتیکہ سکریٹری خود کسی اخبار کا معائنہ نہ کر لیں کوئی اخبار شائع نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) ان میں سے کسی کی خلاف ورزی پر تادیبی کارروائیاں عمل میں لائی جائیں گی ایک ... مالک کو بوریہ بستر سنبھال کر یورپ کی ہوا کھانی پڑے گی

اسی طرح سے کچھ اصول سکریٹری کی ہدایت کے لیے بھی وضع کیے گئے، جو بہ حیثیت سنسر مقرر قرار دیا گیا تھا۔

(۱) کمپنی کی مالیات، آمدنی وغیرہ سے متعلق خبروں کو شائع ہونے سے باز رکھا جائے۔

(۲) فوج کے نقل وحمل یا کوئی بحری یا بری فوجی طیاریاں صیغہ راز میں رہیں، ان کے متعلق مشاہدات خبریں بنکر شائع ہونے سے روکی جائیں۔

(۳) اشخاص کی نجی زندگی پر گندگی نہ اچھالی جائے۔

(۴) کمپنی اور دیسی طاقتوں کے مابین صلح وجنگ کے امکان پر کسی اخبار کو لب کشائی نہ کرنے دی جائے۔

یہ یورپین اخبارات کے وہ اقتباسات جو برطانوی ہند کی طاقت پر کسی نوع سے اثر انداز ہو سکتے ہوں شائع کرنے سے باز رکھے جاتیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ قوانین بہت سخت تھے۔ مدراس اور بمبئی میں سنسرشپ پہلے ہی سے کارفرما تھی اب کلکتہ بھی اس کی زد میں آگیا۔ یہ قوانین باضابطہ سرکاری اخبارات کے مالکوں اور ایڈیٹروں کو بھیج دیے گئے۔ تقریباً ہر مدیر نے بذریعہ خط، حکومت کی ہدایات کے آگے سرِ صحافت خم کر دیا۔ مختلف ایڈیٹروں کے خطوط اِس بات کی تردید کرتے ہیں کہ ابتدائی اخبارات کے کارکن غیر ذمہ دار اور باغیانہ مزاج کے آدمی تھے۔ ان خطوط میں اُمید و بیم کی لہر تو ہے، لیکن رُوگردانی کا ایک شائبہ بھی نہیں۔

یہ قوانین لندن بھیج کر ڈائرکٹران بورڈ کی حمایت بھی حاصل کرلی گئی، لیکن پریسیڈنٹ بورڈ اس باب میں ولزلی کے چند اقدامات کو تحسین کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ سر جان میکلم ایسے لوگ اِن قوانین کے پُرجوش حامیوں میں تھے، اُن کی رائے میں سنسر کے ذریعے پریس کو پابند کرنا بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ بعد میں "ارتکابِ جرم" پر تادیبی کارروائیاں اختیار کی جائیں۔ جب حکومت کی قوت و طاقت کو رُسوا کیا جائے گا، حکومت بات پر ہاتھ دھر کے خاموش نہیں بیٹھ سکتی، وہ اپنے وقار کا لوہا پوری طاقت سے منوائے گی۔" سنسر قائم ہونے کے بعد پریس کے "جرائم" مفقود ہو گئے۔ جو کچھ بدعنوانیاں ظہور میں آئیں وہ غیر اہم تھیں اور ان کا سبب نیت کی خرابی نہیں، بے پرواہی تھا"

مئی ۱۸۰۱ء میں دوسری مشکلات سامنے آئیں۔ گورنر جنرل نے حکم نافذ کیا کہ خرچ ڈاک کی ممکن الوقوع کمی کو پورا کرنے کے لیے مالکان اخبارات پہلی قسط میں ضمانت داخل کر دیں، اس کی خلاف ورزی پر اخبارات اُس وقت تک نہیں قبول کیے جائیں گے جب تک ڈاک کے تمام اخراجات پہلے ہی ادا نہیں کر دیے جائیں گے۔

ولزلی (۱۸۰۱) میں اِس نتیجے پر پہونچ گئے تھے کہ ایک سرکاری گزٹ کا اجرا غیر سرکاری پریس کی "مفسدانہ صحافت" کے مقابل ضروری ہے۔ غیر سرکاری پریس کے متعلق اُن کی رائے بہت پست تھی اُسے وہ اوّل نمبر کا فتنہ پرور تصور کرتے تھے، پریس چند یورپینوں کی روٹی کا سہارا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

ولزلی کا خیال تھا کہ ایک سرکاری گزٹ اور اخبار جاری کیا جائے جس میں عمیق و سنجیدہ خیالات ہوں اور سرکاری نوٹیفکیشن کے علاوہ پرائیوٹ اشتہارات بھی شائع ہوتے رہیں۔ ایک کمیٹی غور و خوض کے لیے مرتب کی گئی، تخمینہ لگایا گیا، معلوم ہوا۔ ۔ ہزار سکہ روپیہ لاگت پر بیٹھے گا جس میں اِسٹاف کا خرچ شامل نہیں ہے لیکن کمیٹی کی رپورٹ نے جو خاکہ تیار کیا تھا وہ اخراجات کے عذر پر عملی جامہ نہ پہن سکا۔ ولزلی اپنے وقت سے پہلے کا خواب دیکھ رہے تھے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اخبارات میں اکثر فوجی خبریں بھی شائع ہو جاتی تھیں۔ حکام کی نظر میں وہ تشویش کا کانٹا بن کر کھٹکتی تھیں۔ چنانچہ ۴۔ اگست ۱۸۰۱ء میں فوجی شعبے کی طرف سے "کلکتہ گزٹ" کے ایڈیٹر کو تنبیہہ کی گئی کہ وہ آئندہ سے کسی نوع کے فوجی احکام شائع نہ کرے تاوقتیکہ وہ کسی سکریٹری حکومت کی جانب سے خود بغرضِ اشاعت اِرسال نہ کیے جائیں۔ صِرف یہی نہیں بلکہ فوج کے متعلق دوسرے امور کو بھی شائع ہونے سے روک دیا گیا۔ ان کی اشاعت کے لیے شرطِ اولین حکومت کی اجازت تھی۔ اِسی قسم کی ہدایات دوسرے اخبارات کے نام بھی اِرسال کی گئیں، مثلاً "ایشیاٹک مائی رر" "پوسٹ" "اسٹار" "ٹیلی گراف"۔ ان تمام اخبارات نے اعلان کیا کہ وہ قوانین حکومت کی خلاف ورزی کے لئے کبھی کوئی قدم نہیں اُٹھائیں گے۔

۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۳ء کے درمیان جب دوسری مرہٹہ لڑائی سے فضا بوجھل ہو رہی تھی، گورنر جنرل نے متعدد تاکیدی پیغامات بھیجے کہ جہازوں کی آمد و رفت اور دیگر امورِ متعلقہ کی بابت کوئی ایسی خبر پردۂ اشاعت پر نہ آئے جو حکومت کے مفاد پر ضرب لگا سکتی ہو، ہر خبر کی اشاعت، حکومت کی چشم و ابرو کی محتاج رہی، اس کے خلاف جو قدم اُٹھائے گا بھگتے گا۔

خبریں تو خبریں، کمپنی پبلک جلسوں تک کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتی تھی، چنانچہ جولائی ۱۸۰۲ء میں پبلک ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اِس سلسلے میں بھی نوٹس جاری کیا گیا کہ گورنمنٹ کی اجازت بغیر پبلک جلسے منعقد نہ کئے جائیں۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمپنی آزادیِ رائے کو کوئی وقعت نہیں دیتی تھی اور تمام [illegible]

نئے قانون سے آسودہ خاطر تھا۔

جب نئے ضوابط کا علم ڈائرکٹران بورڈ کو ہوا تو انہوں نے انھیں سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا، بلکہ گورنر جنرل (لارڈ ہیسٹنگز) کو ایک مراسلے کے ذریعہ تنبیہہ بھی کی کہ جس برس سے جس طریقہ عمل پر عمل درآمد ہو رہا تھا اُسی طرف پھر مراجعت کی جائے۔ تاوقتیکہ نئے قوانین ہمارے روبرو پیش نہ ہوں اور ہم انھیں منظور نہ کر دیں"۔ رائے عامہ ان جدید ضوابط پر خوشی سے بغلیں بجا رہی تھی۔

اسی زمانے میں (۱۸۲۱ء) میں بھوانی چرن۔ بنیرجی نے ایک ہفتے وار اخبار "سمیندھ کومودی" جاری کیا، جو راجہ رام موہن رائے کی سرپرستی میں جلد ہی آگیا۔ یہ اخبار ہندو مذہب اور سیاست کے منہ کی زبان تھا۔ اِس پرچے میں بیشتر مذہبی بحث ہوتے تھے۔ اور وہ بھی ایک مناظرے کی صورت میں۔ سیرام پور کے پادریوں کا اخبار "سماچار درپن" ہندو اور عیسائی مذاہب کے باب میں جو خیالات پیش کرتا تھا اُسکی تردید اِدھر سے ہوتی تھی۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں کچھ اخبارات فارسی زبان میں بھی شائع ہوتے تھے۔ لیکن انھیں سے کوئی اخبار نشو ونما نہ پاسکا۔ اب اُن کا کوئی نسخہ بھی دستیاب نہیں ہے۔ فارسی میں سب سے پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" تھا جو ہفتے وار شائع ہوتا تھا۔

انگریزی اخبارات کے اقتباسات اور نامہ نگاروں کے خطوط کی اشاعت سے یہ پرچہ تربیتِ رائے عامہ کے حوصلے رکھتا تھا۔ اور وہ دوسری ریاستہائے طبقۂ حکومت پر شدید نکتہ چینی کرتا تھا۔ جس سے اکثر حکومت کے ماتھے پر بل پڑ جاتا تھا۔ "جامِ جہاں نما" کی کچھ کاپیاں حکومتِ ہند کے شعبۂ آثارِ شاہی میں ابھی تک محفوظ ہیں۔

راجہ رام موہن رائے بھی ایک اخبار فارسی میں نکالا کرتے تھے۔ اُن کا یہ اخبار "مرآت الاکبر" مذہبی تبلیغ اور اصلاحی جدوجہد کا آئینہ دار تھا۔ لیکن گورنمنٹ کی نظر میں یہ بھی ایک تشویشناک اقدام تھا۔

۱۸۲۲ء میں فریدوں جی مرزبان نے بمبئی میں پہلا گجراتی پریس۔ سماچار پریس۔ قائم کیا۔ اوّل اوّل پارسی مذہبی کتب کے ترجمے شائع ہوتے رہے۔ لیکن بعد میں "بمبئی سماچار" اخبار شائع کر دیا گیا۔ یہ پرچہ اب بھی بقیدِ حیات ہے۔ اور جانشینانِ فریدوں جی بمبئی کے گجراتی پریس کے فروغ میں ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، لارڈ ہیسٹنگز کی جاری کردہ ہدایات کو ڈائرکٹران بورڈ نے سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل کے جاری کردہ ضوابط قانون کی صورت نہیں اختیار کر سکے۔ قانون کی حیثیت سے بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں جو رائے عامہ کو اپیل نہ کر سکیں۔ ان قوانین کی ایک ہلکی جھلک کافی ہے۔ (باقی آئندہ)

غالب

(خدا بخش)

ادب، قومی حیات کا آئینہ ہے اور قومی حیات مجموعہ ہے متعدد اثرات کا جن میں کچھ انسان کے قبضۂ قدرت میں اور کچھ اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہ گوناگوں اثرات آب و ہوا، طبعی حالات، سیاسی اقتدار یا سیاسی محکومیت، سب برعکس رہتے ہیں۔ کچھ اثرات اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ احاطۂ نظر سے بچ کر نکل ہی نہیں سکتے، مثلاً مشرق میں، شاعری کی کچھ صورتیں کبھی ظہور پذیر نہیں ہوئیں۔

ہیَن، سوئن برن یا تھیوڈور واٹس ڈنٹن کی شاعری میں بحری زندگی کے جو مناظر، جو نقشے اور جو کمالات نظر آتے ہیں، مشرق اُن سے بیگانۂ محض ہے۔ ملٹن، کولنس، شیلی اور دکشر ہیگو کے کلام میں آزادی کے منبر پر جو لطیف و پاکیزہ اشعار چڑھائے گئے ہیں مشرق میں اُن کی جھلک ناپید ہے۔ حُسن دلبری کی پرستش کا وہ والہانہ جذبہ جو کیٹس کی شاعری کا روح رواں تھا، یہاں مفقود ہے۔ براؤننگ اور ٹینی سن کی شاعری میں جو جواں اندیشی، زندگی خیز اور آلام گسل، حیات پروری وغیرہ ولولۂ خیالی کے آثار پائے جاتے ہیں، مشرق کا ادب ان سے تہی دامن ہے۔ ورڈزورتھ ایسے فطرت پرست شعرا ہماری زمین پیدا نہ کر سکی۔

مشرق میں رگِ موسیقی و نغمۂ فطرت کے مناظر و مظاہر، سیاسی حریت و آزادی اور حُسن کی پرستش و عقیدت کی رگ پٹھے جنبش میں نہیں آتی۔ ہمارے شاعر کی کائنات کا محور، انسان اور اس کی تقدیر کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی ہر صلاحیت، اُس کا پورا فن اسی ایک مرکز پر مرکوز ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے ادب میں مغربی ادب کا سا تنوع، وسعت، گہرائی اور ولولہ نہیں ملتا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جدتِ فکر و خیال ناپید ہے۔ یہ سچ ہے، ہمارے شعراء اپنے میدانِ خاص میں بہر نوع بے نظیر و بے بدل ہیں۔

مشرق کی افتادِ مزاج، توہم پرستی، افسردہ نگاہی اور بے عملی کی آئینہ دار ہے۔ صوفیانہ پرداز خیال نے اُس سے قوتِ عمل سلب

[illegible] نے اسے راضی بہ قضا بنا دیا ہے بلکہ اُس کا شاعر و فلسفی تو اُس پر مہریں لگا چکا ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور تاریخ اس کی تائید میں اس کو بتلاتی ہے کہ اس زندگی میں کسی شے کو قیام و قرار، کسی چیز کو ثبات و استقلال حاصل نہیں ہے۔ آفاتِ ارضی و سماوی کا ایک ہجوم ہے جو اُسے گھیرے ہوئے ہے اور حوادث کی ایک ضرب میں برسوں کے کئے دھرے پر پانی پھر جاتا ہے، ایک وبا چشم زدن میں لاکھوں انسانوں کو اپنے ساتھ بہائے جاتی ہے، فرمانرواؤں کے وقتی عتاب سے گھر کے گھر، گھن کی طرح پس کر رہ جاتے ہیں۔ مشرقی فلسفہ کو ہر قدم پر اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوتا ہے۔ بشری تمنائیں اور انسانی مساعی مضحکہ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ زندگی "اتفاقات ہیں زمانے" کے مصداق، اتفاقات کا کھیل نظر آنے لگتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مشرقی ادب میں یاس، قسمت پرستی، افسردہ طبعی اور خاموشی نظری سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ زندگی کی تھکن اسے تصوف اور مذہب کی جانب مائل کر دیتی اور یہ اپنی کوشش کے باوجود مائل کر دیتی ہے۔ اس کا یہ اثر ہے کہ مشرقی ادب میں انسانی زندگی کی بے ثباتی، قوتِ ارادہ کی مکمل مجبوری، خدا کے سامنے گڑگڑاتی ہوئی تمنائیں، اتنی مرکزی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مشرقی شاعری کا بڑا اثاثہ صبر ایوبی کا صدقہ ہے۔

بالخصوص، سرزمینِ ہند میں اس مشرقی رجحان نے اور زیادہ گہری جڑیں پکڑیں۔ اس کا ایک اور بھی سبب تھا۔ انیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی، اسلامی عظمت کا آفتاب غروب ہونے لگا تھا تمام شاہی عظمت و وقار، تمام کر و فر آخری ہچکیاں لینے لگا تھا، اس لئے اس دور کے ادیب و شعراء کے دل و دماغ پر انسانی زندگی کی بے مائگی اور قدرت کے آگے بے چارگی کے اثرات نقش ہو کر رہ گئے۔ قسمت سے لڑنا واہی خیال ہے، جب قدرت ہی کا منشا یہ ہے کہ ہم خاک وطن میں تڑپیں اور حوادث کے بہاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں تو پھر ہماری جد و جہد فضول! حزن و یاس کے اس متلاطم دور کے پائے ہوئے دل و دماغ سمٹ کر رہ گئے زندگی ایک جنسِ کاسد و متاعِ فضول نظر آنے لگی۔ سودا نے یہ اشعار محض دل بہلانے کے لئے نہیں لکھے تھے:-

میں ہوں طائرِ آتشبار کیسی ہی بہار آئے،
نہ باصحرا سرے دارم نہ با گلزار سودائے
بہر سو می روم از خویش می جوشد تماشائے

میر تقی میر کے نام سے کون واقف نہیں، ان کے یہ درج ذیل اشعار محض خیالی تکواس نہ تھے بلکہ ان کے دل کی گہرائی کی آواز تھے:-

ہر صبح، غموں میں شام کی ہے ہم نے
خوں نابہ کشی، مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ہمارے شعراء کی نفسیاتی زندگی، بھیانک اور ہمت شکن حوادث کا ایک ہولناک جلوس تھا۔ ان کی شاعری اندرونی کشمکش کا ایک ایسا آئینہ تھا جس میں ڈراونے چہروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ حتےٰ کہ میر حسن کی مثنوی بھی، جو بظاہر ایک ہنستی کھلکھلاتی زندگی کا نقشہ، ایک چہکتی گنگناتی دنیا کا خاکہ پیش کرتی نظر آتی ہے۔ تہہ میں ایک یاس لئے ہوئے ہے۔ حزن و یاس کا پرتو انیس و دبیر کے کلام پر بھی اثر انداز تھا۔ ماحول، جو غم و اندوہ کے سینے میں ڈوبا ہوا تھا، ایسے ہی ہانپتے ہوئے شعراء پیش کرسکتا تھا۔

ہمارے شعراء کی ذہنی کیفیت عجیب تھی روتے روتے کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور ہنستے ہنستے دھاریں مار کر رونے لگتے تھے۔ غم کی دلدل سے نکل کر ایک پل میں خوشی کے عرش پر جا بیٹھے اور دوسرے ہی پل میں پھر وہاں سے گرے تو پہلے سے بھی دس ہیں ہاتھ زیادہ گہرے اس دلدل میں جا پھنسے۔

لیکن ہمارے شعراء کا یہ یاس و حزن مکروہ صورت کا جھرجھرا نہ تھا۔ بلکہ لطافت کی آب لئے ہوئے، راضی بہ رضائے الٰہی کا ایک ہنستا ہوا مکھڑا تھا جو جد و جہد سے کنارہ کش ہوکر سر تسلیم خم کرچکا ہو۔ ان کی افسردہ نگاہ ہی شو پنہار کے مماثل نہ تھی، ہیں کے مطابق تھی۔

شاعر کا فرض و منصب کیا ہے؟ کیا ہمارے شعراء اس فرض و منصب کے کانٹے پر پورے اترتے ہیں؟ وہ کونسی خصوصیت ہے جو شاعر کو لافانی بنا دیتی ہے؟ اس بدلتی ہوئی متلاطم دنیا میں جہاں ہر سانس ایک تغیر ہے، شعراء کی آواز کو کیوں بقا حاصل ہو جاتی ہے! وہ کیا بات ہے جو شاعر کے کلام میں وہ جادو بھر دیتا ہے کہ اس کے رنگ روپ میں بر ہزار گردشِ فلک بھی، کشش باقی رہتی ہے؟

اِسٹاپ فورڈ بروک نے اس باب میں قیمتی رائے کا اظہار کیا ہے۔ "شاعر، عیش کی روداد سنا کر اور غم کی تصویر کھینچ کر، ان تمام افراد سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، جو ان کیفیات کا عینی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اپنے ہم جنسوں سے وہ ایک رشتۂ قرب محسوس کرکے اور ان کی کیفیات کا از روئے ہمدردی مطالعہ کرکے، براہِ راست متاثر ہوتا ہے، اور اس تاثر سے جذبات میں روانی آجاتی ہے۔ جو ڈھل کر اشعار کی صورت میں ٹپک پڑتی ہے۔ افرادِ ملت، اپنی تکالیف کا ایک ترجمان، اپنے مصائب کا ایک درد آشنا اور اپنی بے کیف زندگی کا ایک ہم نوا پاکر، شاعر کے عقیدت مند ہو جاتے ہیں۔ اور شاعر، افراد کی اس عقیدت مندی کے طفیل خود اپنے کو بلند و برتر مقام پر مسند نشین دیکھنے لگتا ہے۔ اس طرح سے، دردِ انسانی پر پرورش پاکر اس کی شاعرانہ صلاحیتیں جوان ہو جاتی ہیں۔ جذبات میں اور زیادہ پختگی آجاتی ہے، خیالات کی حدیں وسیع تر ہو جاتی ہیں۔ قوت متخیلہ کی ہم آہنگی سے عمیق تر حقائق میں نظر اترنے لگتی ہے اور اس کی شاعری سے وہ درس حق ہیں اور میرا اسرار زندگی بے نقاب ہونے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ انسانی مسرت اور انسانی آلام [illegible] سے ہمدردانہ نگاہ پیدا کرکے اور ان کیفیات کا اظہار کرنے کی قدرت پاکر جو محسوس سب کرتے ہیں، کہہ نہیں سکتے، شاعر ایک انفرادی شان کا مالک بن جاتا ہے اور عوام کی نظروں میں وہ بلند منصب حاصل کرلیتا ہے۔ شاعری صرف خارجی زندگی کا نقشہ نہیں کھینچتی بلکہ عالمِ جذبات انسانی کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ شاعری میں قدرتی جادو اور اخلاقی عمق دونوں جاگزیں ہوتے ہیں۔ بہر صورت، شاعری انسان اور عالم انسانیت کی ترجمان ہے۔ حقیقت کا ایک دلفریب و دلنشین احساس پیدا ہو جاتا ہے، شاعری کی بدولت۔ انسان خود اپنے نفس اور کائنات سے ہم آہنگی پیدا کرلینے پر قدرت پاتا ہے۔

شاعر کا میدانِ عمل وہ جذبات ہیں۔ جو ازل سے ابد تک انسانی سیرت کا بیش خیمہ ہیں، جذباتِ زمان و مکان کی قید سے بالا، تغیرات وقت سے شکست کھا کر انہیں ٹھکراتے رہتے ہیں، وہ جذبات جو نسل و مذہب کی خود ساختہ حدیں توڑ کر تمام انسانیت کو ایک رشتے میں منسلک کر

[illegible] بگڑتی رہتی ہے، مذہبیت سے ہیجان پیدا ہوتا رہتا ہے [illegible] سب ہیں، عہد بہ عہد، خیالات مختلف ہوتے رہتے ہیں، لیکن اس ہجوم تغیر و تبدل میں، اس سماجی رسم و رواج کے متغیر تلاطم میں عالم انسانیت کے علم و عمل کی ترتیب و تشکیل میں ایک چیز اٹل ہے وہ ہے فطرت نوع انسانی!

غم و اندوہ کے نوحے، زندگی و مرگ کی روداد ... وہ رنج و غم جو مایوسی عشق یا مرگ توقعات سے پیدا ہوتا ہے، فقر و افلاس کے چبھتے ہوئے نشتر جن سے انسان ادھ مرا پڑا ہوا ہے، بخت و اتفاق کے خلاف شکست خوردگی کے ہلاکت خیز احساسات یہ ہیں وہ موضوع جو عہد بہ عہد اور نسل بہ نسل عوام کے جذبات کو حرکت میں لا کر شاعری کی طرف کھینچتے رہیں گے۔ ان ہی کے طفیل شعر کی سحر کاریاں دلوں کو موہتی رہیں گی اور افکار انسانی کو بلند سے بلند تر کرتی رہیں گی۔ شاعری خواہ اس کا موضوع مسرت ہو یا غم دلوں میں رقت و پسندیدگی کی لہر پیدا کرتی رہے گی۔ شاعری عیش میں ہم ساز اور غم میں رفیق چارہ ساز ہے!

اگرچہ ہماری اردو شاعری کا رنگ محل فارسی شاعری کی وضع پر انہی سنگ و خشت سے تعمیر ہوا ہے لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اردو شاعری فارسی شاعری کی نقالی اور بے جان ترجمانی ہے، ہو، اگر خیالات میں یک رنگی و مماثلت ہے، لیکن ان خیالات کے طرز بیان میں جدت فکر، ندرت خیال، باریک نظری اور فنی کشش ہے۔

کون ایسا ہے جو میر، مومن، ذوق، آتش، ناسخ اور غالب کا مطالعہ کرے اور ان کی شاعرانہ عظمت، ان کی رنگین نوائی اور فنی دسترس سے متاثر نہ ہو جائے۔

ان کی شیرینی گفتار، ان کی سنجیدگی افکار، ان کی بلند پرواز شاعرانہ رفتار، تبسم و اشک سے شیر و شکر افکار گہر بار اور لطافت کی لڑی میں گوندھے ہوئے حرف و صوت کے ہار، ہر دل سے خراج تحسین وصول کر لیتے ہیں، یہ شعرائے کرام آسمان ادب کے وہ آفتاب و ماہتاب ہیں جو کبھی گہنا نہیں سکتے فانی زندگی کے لافانی شعرائے گردوں مقام!

بالخصوص غالب کی شہرت و عظمت اور زیادہ وسیع حلقے کی مستحق ہے۔ اہل مغرب واقف نہیں کہ وہ شاعر جو ابھی ۱۸۶۹ء میں ہماری نظروں سے اوجھل ہوا ہے جس کے قصیدے انوری اور خاقانی کے قصیدوں کے ہم وزن و ہم گوہر تھے، جس کی غزلیں عرفی اور طالب کی غزلوں سے [illegible] رباعیات [illegible] خیام کی ہم دوش و ہم عنان تھیں اور جس کی نثر اپنی تابناکی میں ابوالفضل اور ظہوری کو شرما دیتی ہے۔ ایک لاثانی شاعر ہے۔

غالب کی نثر و نظم خود ایک سوانح حیات ہے جس سے شاعر کی زندگی آشکارا ہو جاتی ہے غالب کی زندگی آلام و حوادث کی کہانی ہے، ہم عصروں کی ناقدری کا شکوہ ہے اور دوستوں کی چھپی ہوئی دوستداری کی داستان ہے۔

غالب کی شاعرانہ کائنات مشاہدۂ نفس و مطالعۂ باطن اور اُس کی شاعری زندگی اور زندگی کے گوناگوں مسائل کا ترانہ ہے اس کا دل ہر مصرعے میں دھڑکتا ہے، اپنی نامراد زندگی کا نقشہ بے جھجک کھینچتا ہے اس کی شاعری گہے ایک بخت تابندہ ہے اور گہے ایک بھیانک ظلمت اسیر دل!

اگرچہ غالب کی عظمت محض شاعری پر قائم ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ عہد حاضر کا سب سے بڑا نثر نگار بھی تھا، شگفتگی، سنجیدگی، سنجیدہ مزاح، پرکشش تناسب الفاظ و معانی، برجستگی روانی اور بے ساختگی کی عبارت میں اُس کا کوئی حریف نہیں۔ یہ محض قصیدہ خوانی اور مدح سرائی نہیں حقیقت ہے اور غالب کی حیثیت کا سچا تلا پیمانہ۔

غالب کے اردو اور فارسی دیوان خزینۂ زر و گوہر میں ہر دیوان لعل، بلور، یاقوت اور نیلم سے جڑا ہوا ہے۔

مذہبی حیثیت سے غالب کا مسلک وحدت الوجود تھا، جو مذہب کے ظاہری آثار سے بیزار تھا، اس کے عقیدے کے ماتھے پر کسی فرقے کی کوئی تحریر نہ تھی۔ وہ صرف اسلام کا پیرو تھا۔ اسلام، صاف و صفا، قید و بند سے بیگانہ، رسوم کے گرد و غبار سے پاک، تنگ خیالی سے دور اور حقائق عالم سے ہم کنار!

غالب کا ایک فارسی شعر ہے ؎

با من میاویز اے پدر، فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

یہ شعر جرأت و بے باکی اور آزاد خیالی کا خود ایک شاہد ہے!

یہی وجہ ہے کہ غالب کا ذہن تعصب سے پاک اور مسلک رواداری کا سالک تھا ؎

حرفم در مذاق قلقلہ جا خواہد گرفت
دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

غالب کا دور ہر چند علم و ادب کے اعتبار سے ایک ڈوبتا ہوا دور تھا اسلامی علم و فضل کا عہد زرّیں کب کا پیوند خاک ہو چکا تھا، پھر بھی موت کی دستبرد سے کچھ اہلِ کمال محفوظ رہ گئے تھے جو غالب کی شاعرانہ عظمت و کمال کے دل سے معترف تھے۔
ان میں فضلِ حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین خاں عبداللہ خاں امام بخش صہبائی، مومن خاں، نواب مصطفےٰ خاں، نواب ضیاء الدین، سیّد غلام علی خاں، وحشت اور اُن کے سوانح نگار مولانا حالی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
اِن کے علاوہ بہادر شاہ اور نواب رامپور بھی اُن کے معتقدین میں تھے جو مالی مدد بھی کرتے تھے۔ اگرچہ وہ برائے نام تھی۔
پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کے عہد نے غالب کی قدر کا صحیح اندازہ نہیں کیا، علم و ادب کی اقلیم کے فرمانروا ہمیشہ قسمت کے ہاتوں آلام و بدبختی کے شکار رہے ہیں، غالب بھی مستثنےٰ نہیں تھے۔
قطیین و رسا دماغوں نے وہ کون ایسی بات محسوس کی ہے جس کے نقوش غالب کے دل پر نہیں ہیں؟ صائب کا ایک شعر ہے ؎

بے اجل یاد کسے خلق بہ نیکی نہ کند
مرگِ ایں طائفہ را ہر سر انصاف آرد

یہ تصنع اور مبالغے کی آواز نہ تھی بلکہ اپنی شہرت و عظمت کا یقین پختہ تھا جو اِن شعراء کی زبان پاکر شعر کی صورت میں ڈھل جاتا تھا۔ غالب بھی اپنی عظمت کا اعتقادِ راسخ رکھتا تھا۔ ملاحظہ ہوں اشعار ؎

تا زِ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریدار کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

ان اشعار میں الہامی شان اور پیش گوئی کے تیور ہیں، جو بعد میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئے۔
مولانا حالی نے غالب کی سوانح بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظم کی ہے، غالب کے دوسرے سوانح نگار کو شاعر کی زندگی کے بعض واقعات کی تحریری تصویر کھینچنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی ادبی گہرائی میں اُتر کر یہ بھی واضح کرنے کی سعی کرنا چاہیے کہ غالب کس حد تک اپنے عہد سے متاثر، کہاں تک اپنے دور کا ہم نوا اور کس حد تک وہ دوسرے دور کا نقیب و پیمبر تھا۔ یہی کافی نہیں ہے کہ شعراء اُردو میں اُس کی حیثیت کو متشخص کرنے اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں نقادوں کی صلاحیتیں صرف ہو جائیں بلکہ تمام عالم کے شعراء میں تقابل و تناسب سے غالب کی صحیح پوزیشن معلوم کی جائے۔
اس گوشے سے جب مطالعہ کیا جائے گا تو غالب کی شاعرانہ عظمت دہ چند ہو جائے گی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کا دیوان جس کی جوت سے بین الاقوامی ادب کے در و دیوار جاگ اٹھیں گے، ہندوستان کے لیے ایک متاعِ بے بہا بن جائے گا۔

ہٹلر اور عورت

(صبوحی)

ایک بار آئن سٹائن سے ایک شخص نے دریافت کیا۔ "حضرت! یہ تو کہئے آپ کے نظریۂ اضافیت کی بابت یہ کیونکر طے کیا جائے کہ وہ نظریہ صحیح نظریہ ہے؟"

آئن سٹائن نے جواب دیا "آپ کو اس تحقیق کے لئے اپنی عمر میں کچھ اضافہ کرنا پڑے گا، ۱۹۹۰ء سے قبل اس کا فیصلہ ممکن نہیں ہے"

"یہ کیسے؟" اس شخص نے بحیرت دریافت کیا۔ آئن سٹائن نے کہا "اگر نظریۂ اضافیت صحیح ہے اور آپ اس وقت تک بقید حیات ہیں۔ تو آپ معلوم کر لیں گے، اہل جرمن کہیں گے۔ آئن سٹائن مرحوم جرمن نسل سے تھے، فرانسیسی دعوے کریں گے، آئن سٹائن خالصتاً فرانسیسی تھے اور اگر نظریۂ اضافیت غلط ہے تو اہل جرمن اس کی تردید کریں گے۔ کہ آئن سٹائن جرمن تھا۔ اور فرانسیسی بہ بانگ دہل کہیں گے، آئن سٹائن ہرگز فرانسیسی نہیں تھا، اہل جرمن بکتے ہیں، وہ سو فیصدی جرمن تھا۔"

اس دلچسپ گفتگو سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ دو پڑوسی اقوام ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے اور یہ بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ جرمنی اور فرانسیسی معاشرہ اقوام ہمیشہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ نہ صرف سیاسی اختلاف ہے بلکہ دونوں کی سرشت دونوں کا مزاج ہے، دونوں کے نصب العین اور دونوں کے کردار و گفتار میں بعد المشرقین ہے۔

انقلاب فرانس تاریخ عالم کا سب سے بڑا واقعہ تھا، اس انقلاب کی بدولت آج دنیا میں آزادی، مساوات اور اخوت کا چرچا ہے۔ جرمنی نے اس انقلاب کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا، بلکہ اس کے اثرات کو زائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

جرمن اقتدار پسند ملک ہے۔ جمہوری مزاج جرمنی کبھی نہ پروان نہیں کر سکا۔ ہٹلر کی ایسی "منظم" تحریک جس کا نظریاتی رو سے نہ سر تھا نہ پیر، صرف مظاہرہ طاقت کے کس بل پر تمام قوم میں مقبول ہوئی۔

ہٹلر کے عورت سے متعلق ... کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جو ... یہاں تک کہ ... ان پر جو ظلم کئے گئے، ایسے مظالم تاریخ کم ہی پیش کر سکتی ہے۔ سوشلسٹوں کے خلاف ہٹلر نے جوائے کی چوٹی کا زور لگایا، وہ بھی ... لیکن ان سب سے زیادہ جسے ہٹلر نے پامال کرنے کی کوشش کی، وہ عورت تھی۔

ہٹلر کے متعلق عام طور سے مشہور ہے کہ وہ عورت ذات سے سخت متنفر تھا۔ حالانکہ بعض افواہ اس کی تردید کرتی ہیں، ہمیں تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے، اس شبہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہٹلر نے ازدواجی زندگی سے ہمیشہ گریز کیا۔

یہاں ہمیں ہٹلر کی ذاتیات سے بحث نہیں، ازدواجی زندگی کے باوجود ہٹلر کی پشت پر ایک جماعت تھی جو عورت کے متعلق دقیانوسی خیالات کا شکار تھی۔

مرد نے عورت کو ہمیشہ پابہ گِل رکھنے کی کوشش کی ہے، یہ میں عورت ہونے کی بنا پر عصبیت سے نہیں کہتی، تاریخ اور علم النفس گواہ ہیں کہ مرد نے عورت کو اپنی ملکیت تصور کرتے ہوئے، اُسے ہمیشہ عملی زندگی سے محروم رکھا ہے۔ آج دنیا کے علم و ادب پر مرد ہی کی حکمرانی ہے۔

بیسویں صدی اور خصوصاً انقلاب روس نے عورت کے کان میں صورِ بیداری پھونکا، یوں تو سرمایہ داری نے جب سماجی نظام کو درہم برہم کیا ہے، عورت کے پاؤں کی بھی اکثر بیڑیاں کٹ گئیں لیکن مساوات حاصل نہ ہو سکی۔ ہٹلر اور نازی جرمنی نے دن دہاڑے عورت کی آزادی و حرکت پر چھاپہ مارنے کی کوشش کی۔

میں نازی تحریک کے نفسیاتی اسباب پر اس وقت کچھ نہیں لکھنا چاہتی، صرف اجمالی خاکے پر اکتفا کرتی ہوں۔

نازی رہنماؤں نے اپنے عقائد پر، جہاں تک عورت کا تعلق ہے، پردہ اخفا نہیں ڈالا۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر اس بات کا اعلان کرتے تھے کہ عورت کے فرائض صرف 'خانگی' ہیں، اس کو گھریلو زندگی سے باہر قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔

ان کی شریعت میں عورت کی معراج تین معروف حروف کے ہیں Kinder ، Kirche Kuche یعنی علی الترتیب بچے، بندگی، باورچی خانہ، اُردو کے یہ تین حروف 'ب' عورت کے لئے کمال و مثال ہیں۔

بچوں کی دیکھ بھال، بندگی و عبادت کے فرائض اور خورد و نوش کا
انتظام۔ یہ ہے عورت کی فطری دُنیا جو خود قدرت کی وضع کردہ
ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہٹلر نے متعدد بار اس عقیدے کی تائید میں گوہر فشانیاں کی ہیں،
ڈاکٹر گریلیس کا فتویٰ تھا "آیندہ نسل کی پیدائش و نگرانی عورت کا
سب سے بڑا فریضہ اور اس کی زندگی کا تنہا محور ہے"

فرک، جو امورِ صحت کے نگراں تھے (اس شعبے کا نگراں بھی
مرد!) خانگی زندگی کے محاسن پر ہمیشہ زبان کو جنبش رکھتے تھے۔
Kuche Kirche Kinder! القدس باقی ہوس!

ایک تقریر میں ہٹلر نے کہا "مجھ سے پوچھتے ہو میں نے جرمن
عورت کے لئے کیا کیا، تو سنو، میرا جواب یہ ہے۔ میں نے اپنی
نئی فوج میں، جرمنی کے بچوں کے لئے بہترین باپ مہیا کر دیئے ہیں
جرمن عورت کے لئے میں نے یہ کیا ہے، وہ اس سے زیادہ کیا چاہتی
ہے! سیاست عورت کے لئے ہے نہ عورت سیاست کے۔ یہ سیاست
تو مردوں کے لئے بھی لوہے کے چنے ہیں۔ اس سے عورت کا ملوث
ہونا بیہودہ ہے۔ مجھ سے قبل سیاست مسٹرے انگوروں کی ٹپاری تھی،
میرے تحت بھی، وہ قابلِ شمار نہیں"

تقریر کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے دست و پا
عورت کا آقا نہ صرف مرد کے دست و پا تھے۔

"جرمنی کے لئے اور زیادہ تندرست و توانا بچے جو فوج میں اپنے
باپ کی ٹکر کے ہوں پیدا کرو، پیدا کرو" یہ تھی ہٹلر کی پدرانہ پند!

حیرت کی بات یہ ہے کہ عورت کی جوان تحریک جو نازی جرمنی میں
بھی جاری تھی، اس پدرانہ شفقت کو بہ سر و چشم قبول کر رہی تھی، انہیں
اپنے مستقبل کی اس قطع و برید میں تنگیٔ داماں کی جگہ وسعتِ دامن
نظر آ رہی تھی، میں سمجھتی ہوں۔ اگر وہ اس وقت ان سے یہ کہتا کہ خانوادے
سے رشتۂ ازدواج قائم کر لو۔ تو اسے بھی وہ ہنسی خوشی تسلیم کر لیتیں۔

نازی جرمنی میں مردوں کے لئے ایک جبریہ لیبر آرمی (فوج) تھی
اسی وضع پر ہٹلر نے عورت لیبر سروس قائم کر کے تجربہ کیا ان عورتوں کے
سوا جو یونیورسٹی میں داخل ہو رہی تھیں یا "سیاسی رہنماؤں" سے
منسلک ہو رہی تھیں یہ رضاکارانہ اصول پر قائم تھی، چھ ماہ خدمت انجام
دینا پڑتی تھی، پہلا خیمہ ۱۹۳۵ء میں شہر میاخ مقام پر کھولا گیا۔
فوجی بارکوں کی بجائے لڑکیاں گھروں میں رہتیں جہاں
وہ کاشتکاروں کی عورتوں سے دودھ دوہنا اور گھی بنانے کی تعلیم
حاصل کرتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔

معمول میں فوجی درشتی تھی۔ ساڑھے پانچ بجے علی الصباح
بیدار ہونا پڑتا، سات بجے تک ورزش اور گانے بجانے کا پروگرام
رہتا اور ناشتے کے بعد ساڑھے سات بجے سے تین بجے تک بستی
یا قریب کسی فارم میں کام کرنا پڑتا تھا، کھانے کے لئے بیچ میں نصف
گھنٹے کی مہلت ملتی تھی۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ "جبریہ آرام" کے
لئے ملتا۔ اور پھر ساڑھے چھ بجے تک کلاس ہوتے تھے۔ شامیں موسیقی
اور لکچروں میں صرف ہوتیں، ساڑھے نو بجے خواب گاہ جانا پڑتا تھا۔

پورے جرمنی میں ایک آواز بھی پبلک زندگی کے لئے عورت
کی شرکت کی ہم نوا نہ تھی، ناروے کے ایک شخص نے گھبرا کر ایک موقع
پر کہا۔ "میں کہتا ہوں" وہ ملک جو اپنی نصف آبادی (عورتیں)
کی تمام صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دے، وہ ملک جو اپنی نصف
آبادی کا کوئی سماجی مصرف پیدا نہ کر سکے وہ ملک سڑی ہے سڑی،
پاگل ہے پاگل"

چونکہ عورت وہ شدائد جھیلنے کی اہل نہ سمجھی گئی جو فوجی مردوں
کی قسمت میں آتے ہیں، اس لئے وہ تنظیم خانہ کی طرف واپس
کر دی گئی"

رڈولف ہس نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا: "عورت
کے معاملے میں، جب دوسری اقوام کے عقائد پر جرمنی معترض نہیں
ہوتا تو دوسری قومیں کون ہوتی ہیں۔ جو ہمارے عقائد و مصالح پر
انگشت نمائی کریں، جرمنی کی تمنا ہے، عورت ماں بننا سیکھے ہماری
جماعت جرمن عورت کو 'مردانہ کارٹون' بنانا یا دیکھنا پسند نہیں
کرتی۔ مثالی عورت وہ ہے جس کے قرب میں ہم عاشقانہ ولولوں کو
سرخرو کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اور جو ہماری اس سرخروئی
کے طفیل نسل میں خاطر خواہ اضافہ کر سکے۔ ایسی عورت صحیح معنوں
میں عورت ہے!

جرمن فلم انڈسٹری میں، فلم اسٹار یعنی ریفنس تھال کو خاص
حقوق و مراعات کے تحت دس لاکھ مارک سالانہ آمدنی پیدا کر لینے
کے لئے اس اصولِ عام کی زد سے پرے رکھا گیا ہے، ہٹلر کی طرح

وہ ہم [illegible] کر رہی ہے۔ باقی عورتوں کے لئے [illegible] کی قسمت غلطی ہے!

جنگی مصالح کے تحت، ہٹلر جرمن نسل و آبادی میں اضافہ کرنا چاہتا تھا، اس کی یہ تمنا اس کے اصلی پروگرام میں نمبر ۲۱ سے روشن ہے لیکن افزائش نسل میں، اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا گیا کہ اولاد تندرست و توانا ہو، اس کے لئے تندرست و توانا ماں باپ ضروری ہیں۔ "نسل میں آمیزش و آلودگی" پیدا نہ ہونے پائے۔ یہ ہٹلر کا خاص فرمان تھا۔ ۱۹۳۳ء کے اواخر سے قانونِ انسدادِ جراثیم (Sterilization [illegible]) جاری کر دیا گیا تھا جس کے تحت "موروثی عدالتِ صحت" اور ایک سپریم عدالت کارفرما تھیں۔ وہ افراد جو موروثی امراض کا شکار تھے، عدالت کے فیصلے پر قوتِ مردمی سے محروم کیے جاتے تھے ذکور مینیا، الکوحل اور سنٹ وائٹس ڈانس، ان بیماریوں کے زمرے میں کیوں شامل نہیں پتہ نہیں۔ اکثر یہ عدالتیں غیر ملکی افراد کو بھی اپنی حدود میں کھینچ لیتی تھیں حسبِ مراد، والدین کی قانون ہمت افزائی کرتا اور ہر طرح سے پشت پناہی کرتا تھا۔ نئے تعزیرات میں ایک دفعہ اس بات کے لئے رکھی گئی تھی کہ کوئی شوہر بہ روئے وصیت، اپنی جائداد بیوی بچوں کے سوا کسی دوسرے کے نام منتقل نہیں کر سکتا تھا، اس قانون کے مجرم سزا کے مستحق تھے۔ بقائے نسل کے لئے ہر ممکن وسیلہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔ وہ عورتیں جو امید کے آخری دنوں میں ہوتیں، خاص مراعات کی مستحق سمجھی جاتی تھیں، اُن سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ دیدہ و دانستہ اسقاط حمل کرانا قانون کی نظر میں سنگین جرم تھا۔ اسی طرح برتھ کنٹرول کی تبلیغ ممنوع تھی۔ تقدیس مآب امومیت کے خلاف زبانی یا تحریری تمسخر سنگین سزاؤں کا مستحق تھا۔ اس طرح ایک سیاسی کیبنٹ جن کے ممبروں میں بیشتر اولاد سے محروم تھے، افزائش نسل کا بیڑا اٹھائے ہوئے خانگی زندگی کی کشتی کھینے میں مصروف تھی!

شادی بیاہ کی ضروریات کے لئے ایک انوکھے قسم کا قرض قائم تھا۔ جب ایک جوڑا پاس کر دیا جاتا تو وہ ایک ہزار مارک قرض لے سکتا تھا۔ نقد کی صورت میں نہیں، ایک سرٹیفکیٹ کی شکل میں یا اس سرٹیفکیٹ سے، خاطر خواہ فرنیچر خریدا جا سکتا تھا۔ یہ سرٹیفکیٹ چھوٹے دستکاروں میں بٹ جاتا۔ بڑے اسٹوروں میں [illegible] آسکتے تھیں۔ [illegible] ہر اولاد کی پیدائش اس بات کی ضمانت کرتی تھی کہ قرض کی چوتھائی رقم معاف، اگر کسی شخص کو قدرت نے چار بچے دے دیئے تو مقروض قرض کے بارے مطلق سبکدوش، جڑواں بچے دو ہی گنے جاتے تھے۔ ایک وزیر سے کسی نے پوچھا اگر کسی مقروض کے اولاد پیدا ہی نہ ہو تو کیا صورت اختیار کی جائے گی؟ جواب معقول تھا اور صاف، سادہ "جب زن و شوہر ہمارے طبی معائنے میں پاس ہو جائیں گے تو اولاد ہو کر رہے گی"

۱۹۳۶ء میں تقریباً سات لاکھ افراد اس انوکھے قرض سے مستفید ہو رہے تھے اور تقریباً ۲۴ کروڑ مارکس قرض میں چلے ہوئے تھے۔ سول سروس میں بھی ہر بچے کی پیدائش پر الاؤنس ملتا تھا اور انکم ٹیکس بہ قدر ۱۵ فیصدی ہر لڑکے کی پیدائش پر کم کر دیا جاتا تھا۔

ہٹلر نے ایک قومی صحت ادارہ بھی قائم کیا تھا جس کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ حکومت ملک کے صحت مند و توانا افراد کی پشت پناہی کرے گی، کمزوروں اور بیماروں کی نہیں، اس ادارے کے ذمے فرائض کا ہجوم تھا۔ تمام صحت سروس کے اختیارات اس کے ہاتھ میں مرکوز تھے۔ بچوں اور کارکنوں کی صحت کی نگرانی ڈاکٹر، نرسیں، دندان ساز، دوا فروش ان سب کی ٹریننگ کی دیکھ بھال، افزائش نسل کے بارے میں غور و خوض وغیرہ

صحت کے دفاتر کا سب سے اہم اور ضروری فریضہ تھا "نسلی اور موروثی ثقافت اور تربیت" ملک کے طول و عرض میں متعدد دفاتر اس غرض سے قائم کئے گئے کہ آبادی کو ازدواجی مسائل ضروریات پر مشورے دے سکیں۔ بغیر ان دفاتر سے سرٹیفکیٹ حاصل کئے کوئی شخص بیاہ رچانے کا حقدار نہیں تھا۔ اس تمام کاوش سے پتہ چلتا ہے کہ نازی جرمنی کو سب سے زیادہ اس بات کی دھن تھی کہ گہواروں کے ظروف بچوں کی کثرت سے لبالب ہو جائیں۔

اگر اعداد پر غور کیا جائے تو ہٹلر کی مساعی زیادہ مشکوک ہیں ہٹلر کی تمنا تھی کہ ۱۹۳۳ء کی سطح سے افزائش نسل دوچند زیادہ ہو جائے لیکن وہ [illegible] فی صدی سے زیادہ بلند نہ ہو سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جسمانی [illegible] سے بہت کچھ ترقی ہو گئی تھی لیکن افراد میں مشکل سے دو تہائی تندرست ثابت [illegible]

اور جب اس پر غور کیا جائے کہ تو نسل بیشتر جنگ اور جنگ کی محرومیوں
کی رعایت ہے تو کچھ الاؤنس بھی دینا پڑتا ہے۔

نازی جرمنی نے یونانیوں کی طرح اس بات کو گرہ میں باندھ لیا تھا
کہ مضبوط دماغ کے لئے مضبوط جسم ناگزیر ہے، اس لئے ورزش تفریح
اور کھیل کود کے لئے وافر سامان مہیا کر دیا تھا۔ یہاں تک یونیورسٹیوں
میں سند لینے سے بیشتر جسمانی طور پر فٹ ہونا ضروری تھا۔

جرمنی کے تمام طول و عرض میں ہزاروں اشتہارات کے بھرے پڑے
ہوا رہے تھے۔ جن کے ماتھے پر یہ عبارت لکھی ہوتی تھی: "سب کچھ نسل کے لئے
ان تمام خوبیوں کے ساتھ"۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ نازی جرمنی
نے عورت کی قدر و قیمت کم یا لگ کم کر دی تھی۔

نازی جرمنی سے اس کے سوا توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی۔ یہ بات
اب روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ فاشزم خواہ وہ اٹلی کی ہو یا جاپان
کی، اسپین کی ہو یا جرمنی کی، ایک رجعت پسند حکمت عملی ہے۔ ع

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اس تحریک کی دلی تمنا ہے۔ اس وقت دنیا میں اقوام عالم کی بیداری
کے ساتھ ساتھ، عورت بھی اپنے حقوق سے بیدار ہو چکی ہے اور ایسی صورت
میں وہ دقیانوسی طریقۂ عملی خواہ وقتی طور پر مؤثر ہو جائے، تا دیر اثر پذیر نہیں
رہ سکتی۔ خیر، یہ دوسری بحث ہے، سر دست میں اس میں پڑنا نہیں چاہتی
آخر میں اتنا کہہ کر مضمون کو ختم کرتی ہوں، "وہ ملک جو اپنی نصف آبادی کی
صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے زنگ آلود کر دے۔ وہ ملک سٹری ہے سٹری
پاگل ہے پاگل۔"

وزارتی وفد۔ ہز ایکسیلنسی وائسرائے اور کانگریس و مسلم لیگ

کے درمیان

کانفرنس کے بارے میں خط و کتابت اور دیگر دستاویزات

نمبر ۱

خط مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء منجانب لارڈ پیتھک لارنس بنام مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر جناح

وزارتی وفد اور ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے جن مختلف نمائندوں سے ملاقات کی ہے۔ ان کی پیش کردہ آرا پر انہوں نے احتیاط سے غور کیا ہے۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ کرنے کے لئے انہیں ایک اور کوشش کرنی چاہئے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ان کے سامنے گفت و شنید کے لئے کوئی ایسی بنیاد پیدا نہیں کی جاتی جو اس قسم کے سمجھوتے تک پہنچا سکے۔ اس وقت تک دونوں پارٹیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کی دعوت دینا بیکار ہوگا۔

چنانچہ مجھے کہا گیا ہے کہ میں مسلم لیگ کو اس امر کی دعوت دوں کہ وہ بات چیت کے لئے چار آدمی بھیجے۔ جو وزارتی وفد و وائسرائے نیز کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اسی قدر آدمیوں سے ملیں گے تاکہ کسی ایسی اسکیم کے متعلق تصفیے کے امکانات پر بات چیت کی جائے۔ جو مندرجۂ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہوگا۔

برطانوی ہندوستان کا آئندہ نظم یہ ہوگا۔

ایک یونین گورنمنٹ جس کا تعلق مندرجۂ ذیل امور سے ہوگا امور خارجہ۔ دفاع اور مواصلات۔ صوبوں کے دو گروپ ہوں گے۔ ایک گروپ ان صوبوں کا ہوگا۔ جن میں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے۔ اور دوسرا گروپ ان صوبوں کا ہوگا جن میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ ان گروپوں کا تعلق ان دیگر تمام امور سے ہوگا جنہیں متعلقہ گروپ میں شامل صوبے مشترکہ طور پر اپنے پاس رکھنا پسند کریں گے۔ صوبجاتی حکومتوں کا تعلق دیگر تمام امور سے ہوگا۔ اور انہیں اقتدار اعلیٰ کے باقی ماندہ تمام حقوق حاصل ہوں گے۔"

تجویز ہے کہ ہندوستانی ریاستیں ان شرائط پر جو ان کے ساتھ طے کی جاویں گی۔ اس نظام میں مناسب حصہ لیں گی۔

میں یہ ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ہم ان اصولوں کی مزید تشریح ضروری یا مناسب خیال نہیں کرتے۔ کیونکہ دوسرے تمام معاملات کو گفت و شنید کے دوران میں اٹھایا جا سکے گا۔

اگر مسلم لیگ اور کانگریس اس بنا پر بات چیت کرنے کے لئے تیار رہوں۔ تو براہ کرم مجھے ایسے چار اشخاص کے ناموں سے مطلع کیجئے جنہیں ان جماعتوں کی جانب سے گفت و شنید کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔ ناموں کی اطلاع پانے پر میں آپ کو اطلاع دوں گا کہ گفت و شنید کا مقام کونسا ہوگا۔ گفت و شنید اغلباً شملہ میں ہوگی۔ جہاں موسم زیادہ معتدل ہوگا۔

نمبر ۲

خط مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء منجانب صدر کانگریس بنام لارڈ پیتھک لارنس

آپ کے خط مورخہ ۲۷ اپریل کا شکریہ۔ آپ نے

تجویز پیش کی ہے۔ اس کے متعلق میں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رفقائے کار سے مشورہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں آپ کو اس امر سے مطلع کروں کہ وہ ہر اس معاملہ کے بارے میں جس کا تعلق ہندوستان کے مستقبل سے ہو مسلم لیگ یا کسی دوسری جماعت کے نمائندوں کے ساتھ پوری طرح تبادلہ خیالات کرنے کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے ہیں۔ تاہم میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ نے جن بنیادی اصولوں " کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی مزید تشریح اور وضاحت کی ضرورت ہے۔ تاکہ کوئی غلط فہمی نہ رہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ ہمارے مدنظر ایک ایسی فیڈرل یونین ہے۔ جو خود مختار یونٹوں پر مشتمل ہو۔ ضروری ہے کہ اس قسم کی فیڈرل یونین کا تعلق بعض ایسے اہم امور سے ہو جن میں دفاع اور اس کے متعلق معاملات اہم ترین ہیں۔ یہ فیڈرل یونین منظم اور مربوط ہونی چاہیئے۔ اور اس کے پاس انتظامی اور قانون ساز ادارے ہونے چاہئیں۔ نیز ان امور کے لئے اس کے پاس روپیہ ہونا چاہئے اور ایسے ان اغراض کے لئے محاصل وصول کرنے کا اختیار بطور حق ہونا چاہئے۔ ان امور اور ان اختیارات کے بغیر فیڈرل یونین کمزور اور غیر مربوط رہے گی۔ اور دفاع اور عام ترقی کو نقصان پہنچے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مشترکہ امور میں امور خارجہ۔ دفاع اور مواصلات کے علاوہ۔ کرنسی۔ کسٹم (درآمدی اور برآمدی محصولات) اور دیگر ایسے امور شامل ہونے چاہئیں جن کے متعلق زیادہ غور و فکر کے بعد یہ معلوم ہو کہ ان کا ان سے گہرا تعلق ہے۔

آپ نے ہندوؤں کی غالب اکثریت اور مسلمانوں کی غالب اکثریت کے صوبوں کے دو گروپوں کا جو ذکر کیا ہے۔ وہ واضح نہیں ہے۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت والے صوبے صرف شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ سندھ اور بلوچستان ہیں۔ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کو معمولی سی اکثریت حاصل ہے۔ فیڈرل یونین کے تحت صوبوں کے گروپ بنانا ہمارے نزدیک غلط ہے۔ اور مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر ایسا کرنا بھی غلط ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس صوبے کے کس گروپ میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا اختیار آپ نے صوبوں پر نہیں چھوڑا۔ یہ بات ہرگز یقینی نہیں کہ کون صوبہ اپنی اس ہیئت ترکیبی کے ساتھ کس خاص گروپ میں شامل ہونا پسند کرے گا۔ بہر صورت کسی صوبے کو اس کی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرنا قطعاً غلط ہے۔ جہاں ہم اس بات سے متفق ہیں کہ صوبوں کے پاس تمام بقیہ امور کے بارے میں کامل اختیارات نیز باقی ماندہ اختیارات ہونے چاہئیں وہاں ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ صوبوں کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ اگر وہ چاہیں تو مزید امور کو فیڈرل یونین کے ساتھ مشترک رکھ سکیں۔ فیڈرل یونین کے اندر کسی ذیلی فیڈریشن کا قیام وفاقی مرکز کو کمزور کر دے گا۔ اور اس کے علاوہ غلط بھی ہوگا۔ اس لئے ہم کسی ایسی صورت کے حق میں نہیں ہیں۔

ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک مذکورہ بالا مشترکہ امور کا تعلق ہے ہمارے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ریاستیں فیڈرل یونین کا حصہ ہوں۔ یونین میں ریاستوں کی شمولیت کا طریقہ کیا ہوگا۔ اس پر پورا غور بعد میں کیا جا سکتا ہے۔

آپ نے بعض " بنیادی اصولوں " کا ذکر کیا ہے۔ لیکن جو بنیادی مسئلہ ہمارے سامنے ہے یعنی ہندوستان کی آزادی اور اس کے بعد برطانوی فوج کا ہندوستان سے ہٹایا جانا۔ اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ ہندوستان کے مستقبل یا کسی عارضی حکومت کے بارے میں ہماری گفت و شنید صرف اس بنا پر ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں جہاں ہم ہر پارٹی سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وہاں ہم اپنے اس پختہ یقین کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ جب تک ایک مقتدر غیر ملکی حکومت ہندوستان میں موجود ہے۔ اس وقت تک کسی گفت و شنید میں حقیقت کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔

آپ کی تجویز کے مطابق جو گفت و شنید ہوگی اس میں حصہ لینے کے لئے میں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اپنے تین ساتھیوں یعنی پنڈت جواہر لال نہرو۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور خان عبدالغفار خاں سے کہا ہے کہ وہ میرے ہمراہ ہوں۔

نمبر ۳

خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۴۶ء منجانب پریذیڈنٹ مسلم لیگ بنام لارڈ پیتھک لارنس

آپ کے خط مورخہ ۲۷ اپریل کا شکریہ۔ کل صبح میں نے

اسے اپنی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا تھا سمجھوتے کے لئے بات چیت کرنے کی غرض سے دو جماعتوں کے نمائندوں کے درمیان ایک اجلاس کی تجویز کے ذریعہ وزارتی وفد اور ہز ایکسلنسی وائسرائے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان تصفیہ کرانے کے سلسلہ میں جو مزید کوشش کر رہے ہیں۔ میں اور میرے رفقاء اسے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تاہم انہوں نے مجھے آپ کی توجہ مسلم لیگ کی اس پوزیشن کی طرف مبذول کرانے کے لئے کہا ہے۔ جو اس نے ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور منظور کرنے کے بعد سے اختیار کر رکھی ہے۔ اور جس کی تصدیق بعد میں مسلم لیگ کے کل ہند اجلاسوں میں متواتر ہوتی۔ اور جس کی تصدیق ابھی حال میں یعنی ۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو مجالس آئین ساز کے مسلم لیگی ممبروں کی کنونشن نے بھی کی کنونشن کی منظور کردہ قرارداد کی نقل منسلک ہے۔

ورکنگ کمیٹی یہ ظاہر کر دینا چاہتی ہے کہ آپ کے مختصر سے خط میں بہت سے اہم اصولی اور فروعی معاملات ایسے ہیں جن کی تشریح اور وضاحت کی ضرورت ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے خیال میں یہ مقصد اس میٹنگ میں حاصل ہو سکے گا جس کی آپ نے تجویز کی ہے۔

لہٰذا ہندوستان کے آئینی مسئلے کا متفقہ حل تلاش کرنے میں مدد دینے کی شدید خواہش کے پیش نظر ورکنگ کمیٹی نے معاملات پر اثر انداز ہوئے بغیر یا ذمہ داری کو قبول کئے بغیر مجھے مسلم لیگ کی جانب سے گفت و شنید میں حصہ لینے کے لئے تین نمائندے نامزد کرنے کا اختیار دیا ہے۔

چار نام یہ ہیں:-

۱۔ محمد علی جناح۔

۲۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں۔

۳۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں۔

۴۔ سردار عبدالرب نشتر۔

نمبر ۴

لارڈ پیتھک لارنس کے نام مسٹر جناح کے خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۴۶ء کے ساتھ منسلکہ تحریر

سبجکٹس کمیٹی کی منظور کردہ قرارداد جو ۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ لیجسلیٹو کنونشن کے سامنے پیش کی جائے گی

ہرگاہ کہ ہندوستان کے اس وسیع برّاعظم میں بسنے والے دس کروڑ مسلمان ایک ایسے مذہب کے پیرو ہیں۔ جو زندگی کے شعبہ پر خواہ وہ تعلیمی ہو یا مجلس اقتصادی ہو یا سیاسی حاوی ہے۔ اور اس کا ضابطہ صرف روحانی احکام اور عقائد یا رسم و رواج تک محدود نہیں۔ اور وہ مخصوص نوعیت رکھنے والے ہندو دھرم اور فلسفہ سے بالکل مختلف ہے۔ جس نے ہزاروں سالوں سے ذات پات کی گہری تمیز کو نشوونما دی اور اسے قائم رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ چھ کروڑ انسان پستی کا شکار ہو کر اچھوت بن گئے ہیں اور انسانوں میں غیر فطری تفریق پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ملک کے باشندوں کے ایک کثیر حصے پر سماجی اور اقتصادی امتیازات ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ اور اندیشہ ہے کہ وہ مسلمانوں۔ عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کو سماجی اور اقتصادی اعتبار سے ہمیشہ کے لئے غلام بنا دے گا۔

ہرگاہ کہ ہندوؤں میں ذات پات کا رواج قومیت مساوات جمہوریت اور ان تمام اعلیٰ مقاصد کے صریح خلاف ہے۔ جن کا کہ اسلام علمبردار ہے

ہرگاہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف تاریخی پس منظر روایات۔ تمدنوں اور مجلس اور اقتصادی نظاموں کی وجہ سے ہندوستان میں ایسی واحد قوم کا ارتقاء ناممکن ہو گیا ہے جس کی خواہشات اور جس کے مقاصد ایک ہوں اور ہرگاہ کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اب تک دو جداگانہ بڑی قومیں ہیں۔

ہرگاہ کہ برطانیہ کی طرف سے اس پالیسی کے نفاذ کے معاً بعد ہندوستان میں مغربی جمہوریت کی طرز کے سیاسی ادارے قائم کئے جائیں اکثریت کی حکومت کے اصول پر مبنی ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم یا سوسائٹی کی اکثریت دوسری قوم یا سوسائٹی کی اکثریت پر اس کی مخالفت کے باوجود اپنی رائے ٹھونس سکتی ہے۔ اور یہ بات ہندو اکثریت والے صوبوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ۔ ۱۹۳۵ء کے تحت کانگریسی حکومت کے ڈھائی سالہ عہد میں اچھی طرح واضح ہو گئی ہے۔ اس عہد میں مسلمانوں کو ناقابل بیان مصائب اور مظالم کا نشانہ بنایا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئین میں اور گورنروں کے دستاویز ہدایات میں جو نام نہاد تحفظات رکھے گئے تھے ان کے متعلق انہیں یقین ہو گیا کہ وہ بیکار اور بے اثر ہیں۔ اور وہ اس اٹل نتیجے پر پہنچے کہ اگر ایک متحدہ ہندوستانی وفاق قائم ہوا۔ تو اس کے تحت مسلم اکثریت والے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی حالت کچھ اچھی نہ ہوگی اور مرکز میں ان کو

کی [illegible] ہندوستان کے حقوق اور ان کے مفاد کو کہیں بھی کماحقہ محفوظ نہیں کیا جا سکے گا۔

ہرگاہ کہ مسلمانوں کو اس امر کا یقین ہے کہ اسلامی ہند کو ہندو غلبے کے تسلط سے بچانے کے لئے اور انہیں اپنی مرضی و منشا کے مطابق ترقی دینے کا پورا پورا موقع دینے کے لئے ضروری ہے کہ ایک آزاد اور کامل طور پر خود مختار ریاست قائم کی جائے۔ جو شمال مشرقی منطقے میں بنگال اور آسام پر مشتمل ہو اور شمال مشرقی منطقے میں پنجاب صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہو۔

ہندوستان کی مرکزی اور صوبجاتی مجالس قانون ساز کے مسلم لیگی ارکان کا یہ اجتماع گہرے غور و خوض کے بعد یہ اعلان کرتا ہے کہ مسلمان قوم کسی ایسے آئین کو قبول نہیں کرے گی۔ جو متحدہ ہندوستان کے اصول پر بنایا جائے گا۔ اور کسی ایسے واحد دستور ساز ادارے میں شریک نہ ہوگی۔ جو اس غرض کے لئے قائم کیا جائے گا۔ اور برطانیہ سے ہندوستان کے باشندوں کے ہاتھوں میں اختیارات منتقل کرنے کا کوئی ایسا فارمولا جسے حکومت برطانیہ وضع کرے گی اور جو مندرجہ ذیل معقول اور منصفانہ اصولوں کے مطابق نہ ہوگا۔ جن کی غرض ہندوستان میں اندرونی امن و امان قائم کرنا ہے۔ وہ ہندوستانی مسئلے کے حل میں مدد نہیں دے گا۔

۱۔ وہ منطقے جو ہندوستان کے شمال مشرق میں بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب۔ صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہیں۔ یعنی پاکستانی منطقے۔ جہاں مسلمانوں کی موثر اکثریت ہے۔ انہیں ایک آزاد اور کامل طور پر خود مختار ریاست بنا دیا جائے۔ اور واضح الفاظ میں اس امر کا یقین دلایا جائے، کہ پاکستان کا قیام بلا تاخیر عمل میں لایا جائے گا۔

۲۔ اپنے اپنے جداگانہ دستور بنانے کے لئے ہندوستان اور پاکستان کے باشندوں کی دو جداگانہ مجالس آئین ساز قائم کی جائیں

۳۔ پاکستان اور ہندوستان کی اقلیتوں کو آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرارداد کے مطابق تحفظات دیئے جائیں۔ جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو بمقام لاہور منظور کی گئی تھی۔

۴۔ مرکز کی عارضی حکومت کی تشکیل سے مسلم لیگ کے تعاون اور اس میں مسلم لیگ کی شمولیت کی لازمی شرط یہ ہے کہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو منظور کیا جائے اور اس کو بلا تاخیر عملی جامہ پہنایا جائے۔

یہ اجتماع پورے زور کے ساتھ یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ اگر متحدہ ہندوستان کی بنا پر کوئی آئین ٹھونسنے یا مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف مرکز میں کوئی عارضی انتظام کو جبراً قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ اپنی بقا اور اپنی قومی حیات کے تحفظ کے لئے اس کا ہر ممکن طریق سے مقابلہ کریں۔

نمبر ۵

خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۴۶ء منجانب لارڈ پیتھک لارنس
بنام صدر کانگریس

آپ کے خط مورخہ ۲۸ اپریل کا شکریہ۔ وزارتی وفد کو یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ کانگریس نے ہماری اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی مشترکہ گفت و شنید میں حصہ لینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی جانب سے آپ نے جو آراء ظاہر کی ہیں ہم نے ان پر غور کیا ہے معلوم ہوتا ہے۔ ان کا تعلق ایسے معاملات سے ہے جن پر کانفرنس میں بحث کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ہم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ نے ہماری دعوت کو قبول کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے ان شرطوں کو جو میرے خط میں درج ہیں ابتدائی شرط کے طور پر کلیتہً مان لیا ہے۔ ہم نے ان شرطوں کو بنائے گفت و شنید کی حیثیت سے تجویز کیا ہے۔ اور کانگریس ورکنگ کمیٹی سے ہم نے صرف یہ خواہش کی ہے کہ ان کے متعلق ہمارے اور مسلم لیگ کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے اپنے نمائندے بھیج دے۔

آج سہ پہر کو ہمیں مسلم لیگ کا جواب موصول ہونے کی امید ہے اور اس خیال سے کہ مسلم لیگ نے ہماری دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ یہ گفت و شنید شملہ میں ہو۔ چنانچہ ہمارا ارادہ ہے کہ اگلے بدھ کو شملہ روانہ ہو جائیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اس بات کا انتظام کر سکیں گے کہ کانگریس کے نمائندے بھی بروقت شملہ پہنچ جائیں تاکہ جمعرات ۲ مئی کی صبح کو بات چیت شروع کر دی جائے۔

نمبر ۶

خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۴۶ء منجانب لارڈ پیتھک لارنس
بنام پریذیڈنٹ مسلم لیگ

آپ کے خط مورخہ ۲۹ اپریل کا شکریہ! وزارتی وفد کو یہ معلوم

کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ مسلم لیگ ہمارے اور کانگریس کے نمائندوں
کے ساتھ مشترکہ گفت و شنید میں حصہ لینے کے لئے رضامند ہے میں
خوشی سے اس امر کی اطلاع دیتا ہوں کہ کانگریس کے پریذیڈنٹ کی
طرف سے مجھے ایک خط ملا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ
کانگریس بھی مجوزہ گفت و شنید میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہے اور
مولانا آزاد۔ پنڈت نہرو۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ اور خان عبدالغفار
خاں کو بطور نمائندہ نامزد کر دیا گیا ہے۔

ہم نے مسلم لیگ کی اس قرار داد پر غور کیا ہے جس کی طرف
آپ نے ہمیں دھیان دلایا ہے۔ ہم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا۔ کہ
کانگریس اور مسلم لیگ کی طرف سے ہماری دعوت کو قبول کر لینے کا
مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے ان شرطوں کو بنائے گفت و شنید کی
حیثیت سے تجویز کیا ہے اور مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی سے ہم نے صرف
یہ خواہش کی ہے کہ ان کے متعلق ہمارے اور کانگریس کے نمائندوں
کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے اپنے نمائندے بھیج دے۔

ہماری تجویز ہے کہ یہ گفت و شنید شملہ میں ہو۔ چنانچہ ہمارا
ارادہ ہے کہ اگلے بدھ کو شملہ روانہ ہو جائیں۔ امید ہے کہ آپ اس
بات کا انتظام کر سکیں گے کہ مسلم لیگ کے نمائندے بروقت شملہ
پہنچ جائیں۔ تاکہ جمعرات ۲ مئی کی صبح کو بات چیت شروع کی
جا سکے۔

نمبر ۷

ایجنڈا

۱۔ صوبوں کے گروپ۔
(ا) ہیئت ترکیبی۔
(ب) گروپ سے متعلق امور کے فیصلہ کا طریقہ۔
(ج) گروپ کی آرگنائزیشن کی نوعیت۔

۲۔ یونین۔
(ا) یونین سے متعلق امور۔
(ب) یونین کے آئین کی نوعیت۔
(ج) مالیات۔

۳۔ دستور ساز ادارہ۔
(ا) ہیئت ترکیبی۔
(ب) افراد
(۱) یونین کے بارے میں۔
(۲) گروپ کے بارے میں۔
(۳) صدر کے بارے میں۔

نمبر ۸

خط مورخہ ۶ مئی ۱۹۴۶ء منجانب صدر کانگریس
بنام لارڈ پیتھک لارنس

میں نے اور میرے رفقاء نے کل کانفرنس کی کارروائی کو بڑے
غور سے دیکھا۔ اور ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ ہماری گفت و شنید
کا رخ کیا ہے۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ گفت و شنید کی غیر واضح اور
مبہم نوعیت اور ان بعض مفروضات نے جن پر امن کی بنیاد رکھی گئی ہے
مجھے کسی قدر الجھن اور پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ جہاں ہماری یہ خواہش ہے
کہ سمجھوتہ کی غرض سے کسی بنیاد کے حصول کے لئے ذرائع اور وسائل
تلاش کرنے کی ہر کوشش کا ساتھ دیا جائے۔ وہاں ہمیں وزارتی وفد یا
مسلم لیگ کے نمائندوں کو اس دھوکے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ
کانفرنس میں اس وقت تک جو کارروائی ہوئی ہے۔ وہ کسی کامیابی
کی امید دلاتی ہے۔ پیش آمدہ مسائل کے بارہ میں ہمارا جو عام نقطہ
نگاہ ہے اس کا ذکر میں نے اختصاراً اپنے خط مورخہ ۲۸ اپریل میں
کر دیا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے نقطۂ نگاہ کو بڑی حد تک نظر انداز
کر دیا گیا ہے۔ اور ایک ایسا طریق عمل اختیار کیا گیا ہے۔ جو اس کے
برعکس ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ابتدائی مرحلوں پر کچھ مفروضات قائم کرنے
کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہوتا ہے
لیکن ایسے مفروضات جن میں بنیادی مسائل کو نظر انداز کر دیا گیا ہو
یا جن میں متضاد روش اختیار کی گئی ہو۔ ان کے متعلق یہ اندیشہ ہوتا
ہے کہ بعد کے مراحل میں غلط فہمیوں کے پیدا کرنے کا موجب نہ
بن جائیں۔

میں نے اپنے خط مورخہ ۲۸ اپریل میں بیان کر دیا تھا۔ کہ
ہمارے سامنے بنیادی مسئلہ ہندوستان کی آزادی اور اس کے بعد
ہندوستان سے برطانوی فوجوں کی واپسی کا ہے۔ کیونکہ جب تک

سرزمین ہند پر غیر ملکی فوج موجود ہے۔ اس وقت تک کوئی آزادی آزادی نہیں کہلا سکتی۔ ہم ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں مستقبل قریب یا بعید میں نہیں بلکہ آج! دوسرے معاملات اس کی ذیل میں آتے ہیں۔ ان کے متعلق مناسب گفتگو اور فیصلہ دستور ساز اسمبلی کر سکتی ہے۔

کانفرنس میں کل میں نے اس کی طرف پھر اشارہ کیا تھا۔ اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ آپ۔ آپ کے رفقاء نیز کانفرنس کے دوسرے ارکان نے ہندوستان کی آزادی کو بنائے گفتگو کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ آزاد ہندوستان اور انگلستان کے باہم تعلق یا دیگر رشتہ کے بارے میں آخری فیصلہ دستور ساز اسمبلی کرے گی۔ یہ بالکل صحیح ہے لیکن اس سے اس پوزیشن پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ ہندوستان کی آزادی کو اس وقت تسلیم کر لیا جائے۔

اگر صورتِ حالات یہی ہے تو یہ لازمی امر ہے کہ اس کے منطقی نتائج ظہور میں آئیں۔ کل ہم نے محسوس کیا کہ ان منطقی نتائج کا کوئی احساس موجود نہیں تھا۔ آزادی کے سوال کا فیصلہ کوئی دستور ساز اسمبلی نہیں کرے گی۔ یہ سوال اس وقت حل ہونا چاہئے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حل ہو چکا ہے یہ اسمبلی آزاد ہندوستانی قوم کے منشا کی نمائندگی کرے گی اور اسے عملی جامہ پہنائے گی۔ یہ اسمبلی پہلے سے بنائے ہوئے کسی نظام کی پابند نہ ہوگی۔ اس اسمبلی کے قیام سے پہلے ایک عارضی حکومت قائم کرنا ہوگی۔ جو ممکنہ حد تک آزاد ہندوستان کی حکومت کی حیثیت سے کام کرے گی۔ اور عبوری دور کے تمام انتظامات کا بیڑہ اٹھائے گی۔

کل کی گفتگو میں مل کر کام کرنے والے صوبوں کے "گروپوں" کا بار بار ذکر کیا گیا تھا۔ اور یہاں تک کہا گیا تھا کہ اس قسم کے گروپ میں انتظامی اور قانون ساز ادارے ہوں گے۔ گروپ بندی کے اس طریقے پر اس وقت تک ہم نے کوئی بحث نہیں کی تاہم معلوم ہوتا تھا کہ ہماری گفتگو میں یہ سب باتیں مفروضہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں اس بات کو اچھی طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس چیز کے سخت خلاف ہیں کہ صوبوں کے کسی گروپ یا فیڈریشن کے یونٹوں کو انتظامی یا قانون ساز ادارے بنانے کا حق دیا جائے۔ کیونکہ اگر زیادہ نہیں تو اس کی حیثیت ایک ذیلی فیڈریشن کی ضرور ہو گی اور ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہمیں یہ منظور نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انتظامی اور قانون ساز مجلسوں کے تین سلسلے قائم ہو جائیں گے۔ اور یہ انتظام بوجھل۔ بے ہنگم اور غیر مربوط ہوگا۔ اور اس سے متواتر کشمکش پیدا ہوگی۔ کسی ملک میں اس قسم کے انتظام کا ہمیں علم نہیں۔

ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ کانفرنس تقسیم ہند کی کسی تجویز پر غور کرنے کی مجاز نہیں۔ اگر ایسا ہونا ہی ہے۔ تو یہ دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ ہونا چاہئے۔ جو موجودہ حکمراں طاقت کے اثرات سے آزاد ہوگی۔

دوسری بات جسے ہم واضح کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ ہمیں انتظامی یا قانون ساز مجلس میں گروپوں کی مساوی نمائندگی کی تجویز منظور نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر گروپ اور جماعت کے دل سے خطرات اور شبہات دور کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جو حقیقت سے عاری ہوں اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہوں۔ جن پر ہم اپنے آئین کی عمارت بنانے کی امید رکھتے ہیں۔

نمبر ۹

خط مورخہ ۸ رمئی ۱۹۴۶ء منجانب لارڈ پیتھک لارنس
بنام صدر مسلم لیگ و صدر کانگریس

میں اور میرے رفقاء کانفرنس کے سامنے وہ بہترین طریقہ پیش کرنے پر غور کرتے رہے ہیں۔ جو ہمارے نزدیک اس وقت تک کی گفت و شنید کی روشنی میں سمجھوتے کی اغلب بنیاد بن سکتا ہے۔

ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس بات کو ضبطِ تحریر میں لا کر اس کی نقلیں کانفرنس کے اگلے اجلاس سے پہلے پارٹیوں کو بصیغہ راز بھیج دی جائیں۔ تو ان کے لئے سہولت کا باعث ہوگا۔

ہمیں امید ہے کہ: یہ نقلیں ہم آج صبح آپ کو بھجوا سکیں گے لیکن آج تین بجے سہ پہر کی مجوزہ کانفرنس سے پہلے اس پر اچھی طرح غور کرنے کے لئے چونکہ آپ کے پاس بہت تھوڑا وقت ہوگا۔ اس لئے آپ یقیناً اس بات سے اتفاق کریں گے کہ کانفرنس کو کل یعنی جمعرات ۹ رمئی کی سہ پہر (تین بجے) پر ملتوی کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ اس تبدیلیٔ وقت سے جس میں ہمارے نزدیک سب پارٹیوں کا فائدہ ہے آپ کو اتفاق ہوگا۔

نمبر ۱۰

خط مورخہ ۸ مئی ۱۹۴۶ء منجانب پرائیویٹ سیکرٹری لارڈ پیتھک لارنس بنام صدر کانگریس و صدر مسلم لیگ

آج صبح وزیر ہند نے جو چٹھی آپ کو بھیجی ہے۔ اس سلسلہ میں وزارتی وفد کی خواہش پر میں منسلکہ دستاویز آپ کو ارسال کرتا ہوں۔ یہ وہ تحریر ہے جس کا ذکر وزیر ہند نے اپنے خط میں کیا تھا۔ وفد کی تجویز ہے کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندے پسند کریں تو اس تحریر پر اگلے اجلاس میں جو جمعرات کی سہ پہر کو تین بجے منعقد ہوگا بحث کی جائے گی۔

نمبر ۱۱

۸ مئی کے خط کی منسلکہ تحریر

کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کے درمیان سمجھوتے کے مجوزہ نکات

۱۔ ایک آل انڈیا یونین گورنمنٹ اور مجلس قانون ساز ہوگی جس کا تعلق امور خارجہ۔ دفاع۔ مواصلات اور بنیادی حقوق سے ہوگا۔ اور ان شعبہ جات کے لئے روپیہ حاصل کرنے کے لئے ضروری اختیارات اسے حاصل ہوں گے۔

۲۔ باقی ماندہ تمام اختیارات۔ صوبوں کے پاس ہوں گے۔

۳۔ صوبوں کے گروپ قائم کئے جاسکیں گے۔ اور گروپ جن صوبجاتی امور کو مشترک رکھنا چاہیں ان کی تعیین کرسکیں گے۔

۵۔ یونین کی مجلس قانون ساز میں۔ ریاستوں کے نمائندوں سمیت مسلم اکثریت والے صوبوں اور ہندو اکثریت والے صوبوں کے تعداد مساوی ہوگی۔ قطع نظر اس کے کہ یہ صوبے یا ان میں سے کوئی صوبہ گروپ میں شامل ہے یا نہیں۔

۶۔ یونین کی گورنمنٹ میں بھی وہی تناسب رکھا جائے گا جو اس کی مجلس قانون ساز میں ہوگا۔

۷۔ یونین اور گروپوں (اگر کوئی ہوں) کے آئین میں ایک دفعہ ایسی رکھی جائے گی جس کے ذریعہ کوئی صوبہ اپنی قانون ساز اسمبلی

کی اکثریت کے ذریعے [illegible] دس سال کے اندر [illegible] پھر ہر دس سال کے [illegible] کے بعد اس آئین کی دفعات پر دوبارہ غور کرنے کا مطالبہ کرسکے گا۔

آئین پر اس طرح دوبارہ غور کرنے کے لئے اصلی دستور ساز اسمبلی کی طرز کی ایک مجلس بنائی جائے گی جس کی رائے دہی کی شرائط بھی وہی ہوں گی۔ اور اسے اختیار ہوگا کہ جو فیصلہ بھی ہو اس کے مطابق آئین میں ترمیم کردے۔

۸۔ مندرجہ بالا بنیادوں پر آئین بنانے کے لئے جو آئین ساز ادارہ قائم کیا جائے گا اس کی ہیئت یہ ہوگی۔

(الف) ہر صوبجاتی اسمبلی سے اس اسمبلی کو مختلف پارٹیوں کی تعداد کے تناسب سے نمائندے منتخب کئے جائیں گے۔ اور اس طرح منتخب کردہ ارکان کی تعداد ان کی تعداد کے ۱/۱۰ کے برابر ہوگی۔

(ب) ریاستوں کے نمائندے ان کی آبادی کی بنا پر لئے جائیں گے۔ اور وہاں نمائندگی کا تناسب وہی ہوگا جو برطانوی ہندوستان میں ہوگا۔

(ج) جو دستور ساز اسمبلی اس طرح بنائی جائے گی اس کا اجلاس جلد سے جلد دہلی میں منعقد ہوگا۔

(د) ابتدائی اجلاس کے بعد جس میں کام کی عام ترتیب طے کی جائے گی اسمبلی تین فریقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ایک فریق ہندو اکثریت والے صوبوں کی نمائندگی کرے گا۔ دوسرا فریق مسلم اکثریت والے صوبوں کی نمائندگی کرے گا اور تیسرا فریق ریاستوں کی نمائندگی کرے گا۔

(ھ) اس کے بعد پہلے دو فریق اپنے اپنے گروپ کے لئے صوبائی آئین یا اگر وہ چاہیں ہر گروپ کے لئے آئین طے کرنے کے لئے اجلاس منعقد کریں گے۔

(و) جب یہ آئین طے ہو جائیں گے تو کسی صوبے کو یہ فیصلہ کرنے کا حق ہوگا کہ اپنے ابتدائی گروپ سے علیحدہ ہو کر دوسرے گروپ میں شامل ہو جائے یا کسی گروپ سے الگ رہے۔

(ز) اس کے بعد تینوں فریقوں کا ایک مشترکہ اجلاس اس غرض سے ہوگا کہ یونین کے لئے اس طرز پر آئین طے کیا جائے جو مذکورہ بالا پیراگراف ۱ ــ ۷ میں قرار دی گئی ہے۔

(ح) یونین کے آئین میں کوئی ایسا نکتہ جو فرقہ وارانہ مسئلہ پر اثر ڈالتا ہو اس وقت تک اسمبلی کا منظور کیا ہوا نہیں سمجھا جائے گا جب تک دو بڑی قوموں کی اکثریت اس کے حق میں رائے نہ دے۔

۹۔ وائسرائے فوراً مذکورہ بالا آئین ساز ادارہ کا اجلاس طلب کریں گے۔ اس ادارہ پر وہ شرائط عاید ہوں گی جو اوپر کے پیراگراف ۸ میں درج کی گئی ہیں۔

نمبر ۱۲

صدر مسلم لیگ کی جانب سے لارڈ پیتھک کے نام

خط مورخہ ۸ مئی ۱۹۴۶ء

مجھے آپ کے پرائیویٹ سکرٹری کا لکھا ہوا خط مورخہ ۸ مئی اب وصول ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ منسلک دستاویز بھی مل چکی ہے جس کا حوالہ آپ نے اپنے ۸ مئی کے پہلے خط میں دیا ہے آپ کی تجویز یہ ہے کہ اگر مسلم لیگی وفد پسند کرے تو اس "تحریر" پر کانفرنس کے آیندہ اجلاس میں جمعرات کے روز تین بجے بعد دوپہر بحث کی جائے۔

آپ نے ۲۷ اپریل کو اپنے خط میں تجویز پیش کی تھی وہ حسب ذیل ہے:۔

"ایک یونین گورنمنٹ ہوگی جس کا تعلق مندرجہ ذیل امور سے ہوگا۔ امور خارجہ۔ دفاع اور مواصلات صوبوں کے دو گروپ ہوں گے۔ ایک گروپ ان صوبوں پر مشتمل ہوگا جن میں ہندو غالب اکثریت میں ہیں اور دوسرا گروپ ان صوبوں پر مشتمل ہوگا جن میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ ان گروپوں کا تعلق ان دیگر تمام امور سے ہوگا جنہیں متعلقہ گروپ میں شامل ہونے والے صوبے مشترکہ طور پر اپنے پاس رکھنا پسند کریں۔ صوبجاتی حکومتوں کا تعلق دیگر تمام امور سے ہوگا۔ انہیں اقتدار اعلیٰ کے باقی ماندہ تمام حقوق حاصل ہوں گے۔"

اس معاملہ پر شملہ میں بحث ہوئی تھی۔ اور ہم نے اتوار ۵ مئی ۱۹۴۶ء

کو کانفرنس میں شرکت پر رضامندی ان شرائط کے مطابق ظاہر کی تھی جو میرے خط مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء میں درج ہیں۔

آپ نے اپنے فارمولا کی وضاحت کر کے عنایت فرمائی اور پھر ۵ اور ۶ مئی کو گھنٹوں تک بحث کے بعد کانگریس نے آخری اور حتمی طور پر تجویزہ یونین کو ٹھکرا دیا جس کے اختیارات صرف تین شعبہ جات تک محدود ہوں گے۔ اور جسے یونین کا کام چلانے کے لئے روپیہ فراہم کرنے کے اختیارات بھی ہوں گے۔

اس کے علاوہ آپ کے فارمولے میں صاف طور پر بتا دیا گیا تھا کہ مسلم اور ہندو صوبوں کی گروہ بندی اور ان گروہ بند صوبوں کی دو فیڈریشنوں کی تشکیل کے متعلق پہلے سے ایک سمجھوتہ ہو جانا چاہئے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ دو آئین ساز ادارے قائم ہونے چاہئیں اس بنیاد پر آپ کے فارمولا میں ایسی یونین کی تجویز پیش کی گئی تھی جس کے پاس صرف تین شعبے ہوں اور ہماری رضامندی اس لئے حاصل کی گئی تھی کہ ہم اس ڈھانچہ پر گوشت پوست چڑھا دیں۔ کانگریس نے اس تجویز کو قطعی طور پر ٹھکرا دیا اور اجلاس کو اس لئے ملتوی کرنا پڑا کہ مشن اس پر مزید غور و خوض کر سکے کہ اس سلسلے میں اور کیا تدبیر اختیار کی جائے۔

اور اب یہ نئی منسلک "دستاویز" ہمارے پاس اس نیت سے بھیجی گئی ہے کہ "اس تحریر پر آیندہ اجلاس میں بحث کی جائے جو جمعرات کو تین بجے بعد دوپہر منعقد ہوگا" اس دستاویز کا عنوان یہ ہے "کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کے درمیان سمجھوتہ کے لئے مجوزہ نکات" یہ نہیں واضح کیا گیا کہ یہ نکات کس کے تجویز کئے ہوئے ہیں۔

ہماری رائے میں سمجھوتہ کے لئے جو نئے نکات تجویز کئے گئے ہیں۔ ان میں اس اصل فارمولا سے بنیادی انحراف موجود ہے جس کا ذکر آپ کے خط مورخہ ۲۷ اپریل میں کیا گیا ہے اور جسے کانگریس نے مسترد کر دیا تھا۔

مثلاً جن چند نکات کو ہمیں ماننے کے لئے کہا جا رہا ہے ان میں یہ بھی ہیں کہ اس تحریر کے پیراگراف ۱ کے بموجب ایک کل ہند یونین گورنمنٹ ہونی چاہئے۔ تحریر میں ایک اور شعبہ کا اضافہ کیا گیا ہے جو یونین گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہے گا یعنی "بنیادی حقوق" اور

یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ آیا یونین گورنمنٹ اور جس قانون ساز کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنے اخراجات کے لئے ٹیکس لگا کر روپیہ فراہم کر سکے۔

"نئی تجاویز" میں صوبوں کی گروہ بندی کا سوال بالکل اس حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے جیسا کہ اب تک کی بحث کے دوران میں کانگریس ترجمان کی خواہش تھی اور یہ آپ کے پہلے فارمولا سے قطعی مختلف ہے۔

ہم اس بات پر کبھی رضا مند نہیں ہو سکتے کہ ایک واحد آئین ساز ادارہ قائم کیا جائے نہ ہی ہم آئین ساز اداروں کی تشکیل کے اس طریقہ سے متفق ہو سکتے ہیں جن کا ذکر اس تحریر میں کیا گیا ہے۔

تجاویز میں اور بھی کئی قابل اعتراض باتیں ہیں جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ اس وقت ہمیں صرف ان بڑے بڑے نکات سے سروکار ہے جو اس تحریر سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان حالات میں ہمارا خیال ہے کہ اس تحریر پر بحث کرنے سے بنا بریں کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلے گا کہ اس میں آپ کے اصل فارمولا سے مکمل انحراف کیا گیا ہے تاوقتیکہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں جو کچھ کہا ہے اس کے باوجود بھی اگر آپ یہ چاہیں کہ ہم کل اس معاملہ پر کانفرنس میں بحث کریں۔

نمبر ۱۳

لارڈ پیتھک لارنس کا خط مورخہ ۹ مئی ۱۹۴۶ء صدر مسلم لیگ کے نام

آپ کا کل کا خط موصول ہوا جسے میں نے اپنے رفیقوں کو دکھا دیا ہے۔ اس میں آپ نے کئی مسائل اٹھائے ہیں جن کا میں ترتیب وار جواب دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ "کانگریس نے آخری اور حتمی طور پر مجوزہ یونین کو ٹھکرا دیا جس کے اختیارات تین شعبوں تک محدود ہوں گے اور جسے یونین کا کام چلانے کے لئے روپیہ فراہم کرنے کے اختیارات بھی ہوں گے"۔ جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے۔ کانفرنس کے کمرے میں جو کچھ ہوا یہ بیان اس کے مطابق نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کانگریس کے نمائندوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ یونین کے اختیارات بہت محدود ہوں گے نیز یہ بھی کہا کہ اس قدر محدود ہیں ... موجودہ میں ان ... علاوہ اور اختیارات بھی آجائیں گے۔ البتہ آپ نے یہ تسلیم کیا تھا کہ اس دلیل میں کچھ وزن ضرور ہے کیونکہ میرے خیال کے مطابق آپ یہ بات مان گئے تھے کہ ضروری روپیہ فراہم کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ اختیارات ضرور دیئے جائیں۔ اس معاملے کے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہیں ہوا تھا (اور نہ حقیقتاً کسی دوسرے معاملہ کے متعلق)

۲۔ اگر میں صحیح سمجھ سکا ہوں تو آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ گروہ بندی کے متعلق ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ اس فارمولے سے مختلف ہے جس کا ذکر ہمارے دعوت نامے میں کیا گیا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اس خیال سے متفق نہیں۔ موجودہ تجویز قدرے واضح شکل میں ہے کیونکہ اس میں وہ طریقہ مقرر کر دیا گیا ہے جس کے مطابق صوبے کسی خاص گروہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس واضح شکل کو مسلم لیگ اور کانگریس کے نظریات میں ایک معقول سمجھوتہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ کیونکہ کانگریس پہلے ہی گروہ بندی کے سراسر خلاف ہونے کی رائے کا اظہار کر چکی تھی۔

۳۔ آپ نے اس ادارہ پر بھی اعتراض کیا ہے جسے ہم آئین بنانے کے لئے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ سے یہ کہوں گا کہ جب آپ یہ بتا رہے تھے کہ دونوں آئین ساز ادارے کس طرح کام کریں گے تو کانفرنس میں گزشتہ منگل کو آپ نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ان اداروں کو آخر میں یونین کا آئین طے کرنے کے لئے یکجا ہونا پڑے گا۔ آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا کہ طریق کار کا فیصلہ کرنے کے لئے یہ ادارے ایک ابتدائی مشترکہ اجلاس منعقد کریں۔ ہم جو کچھ تجویز کر رہے ہیں وہ دوسرے الفاظ میں ٹھیک وہی کچھ ہے۔ لہٰذا میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کا کیا مطلب ہے جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "اس تجویز کو بھی کانگریس نے قطعی طور پر مسترد کر دیا تھا"۔

۴۔ اس سے اگلے پیراگراف میں آپ نے یہ سوال کیا ہے کہ یہ تجاویز کس نے پیش کی ہیں جو اس تحریر میں درج ہیں۔ جو میں نے آپ کو بھیجی ہے۔ جواب یہ ہے کہ وزارتی وفد اور ہز ایکسی لینسی وائسرائے یہ تجاویز پیش کرتے ہیں تاکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے نظریوں کے اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

۵- اس کے بعد آپ نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ ہم نے اپنے دعوت نامے میں مندرج پہلے فارمولا سے انحراف کیا۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میرا سابقہ دعوت نامہ منظور کرتے وقت نہ تو مسلم لیگ اور نہ ہی کانگریس نے یہ ذمہ داری لی تھی کہ وہ اصل فارمولا کو تمام و کمال منظور کرے گی اور اپنے ۱۹- اپریل کے جواب میں میں نے یہ الفاظ لکھے تھے۔

"ہم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اگر مسلم لیگ اور کانگریس ہمارے دعوت نامے کو قبول کرلے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ ان امور کے تمام و کمال قبول کرنے کی ایک ابتدائی شرط ہوگی جن کا ذکر میرے خط میں موجود ہے۔ یہ امور سمجھوتے کے لئے ہماری طرف سے ایک مجوزہ بنیاد ہیں۔ اور ہم نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے یہی کہا ہے کہ اس بنیاد پر بحث کرنے کے لئے وہ ہمارے اور کانگریس کے نمائندوں سے ملاقات کرنے کی غرض سے اپنے نمائندے بھیجے۔"

حقیقتاً یہی ایک معقول رویہ ہے کیونکہ ہمارے تمام مذاکرات کا مقصد یہ ہے کہ سمجھوتہ کے ہر قابل تصور امکان کو تلاش کیا جائے۔

۶- یونین کے شعبوں کی فہرست میں اضافہ کے لئے ہم نے اپنی تجاویز میں "بنیادی حقوق" کو اس لئے شامل کرلیا تھا کیونکہ ہمیں ایسا نظر آیا کہ اس میں بڑی بڑی قوموں اور چھوٹی چھوٹی اقلیتوں دونوں کا فائدہ ہے اگر ان حقوق کو کانفرنس میں رکھا جائے اور بنا بریں ان پر غور و خوض کیا جائے۔ جہاں تک مالیات کا تعلق ہے اس نقطے کے اس ضمن میں شامل کرنے کے صحیح مفہوم پر کانفرنس میں بحث کرنے کی اجازت ہے۔

۷- آپ کے اگلے دونوں پیراگرافوں میں وہی دلائل دہرائے گئے ہیں جو آپ پہلے دے چکے ہیں اور ہم ان پر اوپر تبصرہ کر چکے ہیں۔

آپ کے آخری پیراگراف سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگرچہ ان حالات میں آپ کے خیال کے مطابق آج دوپہر کو کانفرنس میں مسلم لیگی وفد کی شرکت سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا تاہم اس صورت میں آپ آنے پر تیار ہیں۔ اگر ہم آپ سے اس امر کی درخواست کریں۔ میں اور میرے رفیق کار اس دستاویز پر جو ہم پیش کر چکے ہیں۔ دونوں پارٹیوں کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں خوشی ہوگی کہ آپ کانفرنس میں تشریف لائیں۔

نمبر ۱۴

صدر کانگریس کا خط ۹ مئی سنہ ۱۹۴۶ء

لارڈ پیتھک لارنس کے نام

میں نے اور میرے رفیقوں نے اس یادداشت پر جو آپ نے ہمیں کل بھیجی ہے اور جس میں سمجھوتے کے لئے کئی نکات تجویز کئے ہیں کمال احتیاط سے غور کیا۔ میں نے ۲۸- اپریل کو آپ کو ایک خط بھیجا تھا جس میں میں نے مختصر طور پر یہ بتایا تھا کہ ان "بنیادی اصولوں" کے متعلق جن کا ذکر آپ کے خط مورخہ ۲۷ اپریل میں موجود ہے کانگریس کا رویہ کیا ہے۔ کانفرنس کے پہلے دن کے بعد ۷ مئی کو میں نے آپ کو اس غرض سے ایک خط تحریر کیا تھا کہ کانفرنس میں زیر بحث معاملات کے متعلق ہر ممکن غلط فہمی سے بچا جائے۔

اب مجھے آپ کی یادداشت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی بعض تجاویز ہمارے خیالات اور ان خیالات سے جن کا کانگریس بار بار اعلان کر چکی ہے بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس طرح ایک مشکل صورت کا سامنا ہے۔ ہماری یہ خواہش رہی ہے اور ہے کہ سمجھوتہ کے تمام امکانات تلاش کئے جائیں اور ہندوستان میں جو آئینی تبدیلی ہو وہ باہمی صلاح و مشورہ سے عمل میں آئے اور اس مقصد کے لئے ہم آگے بڑھنے کو بھی تیار ہیں لیکن چند نمایاں حدود ہیں جن سے آگے ہم نہیں جا سکتے اور جن کے متعلق اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ ان سے تجاوز کرنا ہندوستان کے باشندوں اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہندوستان کی ترقی کے لئے مضر ہوگا۔

میں نے اپنے پچھلے خطوں میں اس ضرورت پر زور دیا تھا کہ ایک مضبوط اور منظم فیڈرل یونین ہونی چاہئے۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ہم ذیلی فیڈریشن یا مجوزہ طریقہ سے صوبائی صوبہ بندی کے خلاف ہیں اور سراسر غیر مساوی جماعتوں کے درمیان اگزیکٹیو کونسلوں یا مجالس قانون ساز میں مساوات دینے کے خلاف ہیں۔ ہم ان صوبوں یا ان یونٹوں کے راستہ میں جو تعاون کرنا چاہتے ہیں حائل ہونا نہیں چاہتے لیکن یہ کام پورے طور پر صوبوں کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہئے۔

جو تجاویز آپ نے پیش کی ہیں ان کا مقصد ہماری رائے میں یہ ہے کہ آئین ساز اسمبلی کی آزاد صوابدید کو محدود کر دیا جائے۔ ہم نہیں

[illegible] کیوں کر ہو سکتا ہے۔ آج کل ہم ایک [illegible] [illegible] بحث کر رہے ہیں اور اگر اس وقت اس پہلو پر کوئی فیصلہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ فیصلہ ان فیصلوں سے ٹکرا جائے جو ہم یا آئین ساز اسمبلی دوسرے پہلوؤں کے بارے میں کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں صرف یہی طریقہ مناسب و معقول معلوم ہوتا ہے کہ ایک آئین ساز اسمبلی بنائی جائے جسے اپنا آئین وضع کرنے کی پوری آزادی ہو لیکن جسے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے چند خصوصی اختیارات حاصل ہوں۔ اس طرح ہم اس بات پر متفق ہو سکتے ہیں کہ کسی بھی بڑے فرقہ واری مسئلہ کو فریقین کی رضامندی سے اور جہاں یہ رضامندی حاصل نہ ہو ثالث کے ذریعہ طے کیا جائے۔

آپ نے جو تجاویز ہمیں اپنے خط نمبر ۹ پیراگراف (د) (۲) (د) (ذ) میں بھیجی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ علیحدہ گروپوں کے لئے دو یا تین علیحدہ علیحدہ آئین بنائے جائیں گے اور انہیں ایک کمزور سے بالائی ڈھانچہ کے ذریعہ ایک دوسرے سے ملا دیا جائے گا اور یہ ڈھانچہ تینوں ڈھیلے ڈھالے گروپوں کے رحم وکرم پر ہوگا۔

ابتدائی مراحل میں ہر صوبہ کو کسی خاص گروپ میں شامل ہونے کے لئے مجبور کیا گیا ہے خواہ وہ صوبہ ایسا کرنا چاہے یا نہ چاہے۔ سرحدی صوبہ کو جو ظاہر ہے کہ ایک کانگریسی صوبہ ہے کسی ایسے گروپ میں شامل ہونے کے لئے کیوں مجبور کیا جائے جو کانگریس کا مخالف ہے۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ انسانوں کے ساتھ انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے سلوک کرنے میں منطق اور معقولیت کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے لیکن منطق اور معقولیت کو بالکل نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غیر معقولیت اور ناانصافی بعض اوقات خطرناک ثابت ہوتے ہیں خاص کر ایسے موقع پر جب ہم کروڑوں انسانوں کے مستقبل کے لئے تعمیری کام کر رہے ہیں۔

اب میں آپ کی یادداشت کے بعض نکات کو لوں گا اور ان کے متعلق چند تجاویز پیش کروں گا۔

نمبر ا۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ نے یونین کو ایسے اختیارات دیئے ہیں جنہیں وہ ان شعبہ جات کے لئے جو اس سے متعلق ہوں روپیہ فراہم کرنے کے لئے استعمال کر سکے۔ ہمارے خیال میں یہ بات صاف طور پر بتا دینی چاہیئے کہ فیڈرل یونین کو خود بھی یہ حق ہونا چاہیئے کہ اسے آمدنی فراہم کرنے کا اختیار دیا جائے۔ اس کے علاوہ بہرحال کرنسی (زر رائج)، [illegible] اور ساتھ ہی وہ شعبے بھی شامل کرتے جائیں جن کے متعلق گہری چھان بین کے بعد یہ معلوم ہو کہ وہ یونین کے ماتحت شعبوں سے علاقہ رکھتے ہیں۔ ایک اور شعبہ لازمی بلکہ ناگزیر طور پر یونین کے ماتحت ہونا چاہیئے اور وہ ہے منصوبہ بندی کا شعبہ۔ منصوبہ بندی کا کام موثر طریق پر صرف مرکز ہی انجام دے سکتا ہے اگرچہ اپنے اپنے علاقوں میں صوبے اور یونٹ بھی اس کو انجام دیں گے۔

آئین کے ٹوٹ جانے اور عام نازک صورت حالات میں یونین کو تلافی کرنے کا بھی اختیار ہونا چاہیئے۔

نمبر ۵۔ ۶۔ ہم اگزیکٹو کونسل اور مجلس قانون ساز میں سراسر غیر مساوی گروپوں کے درمیان مجوزہ مساوات کے بھی بالکل خلاف ہیں۔ یہ غیر مناسب ہے اور اس سے گڑبڑ پیدا ہو جائے گی۔ خود اس قسم کی باتوں میں تصادم کے بیج اور آزادانہ نشو ونما کی تباہی پوشیدہ ہے۔ اگر اس یا اس قسم کے کسی معاملہ پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ تو ہم اسے ثالث کے سپرد کرنے کو تیار ہیں۔

نمبر ۷۔ ہم اس تجویز کو قبول کرنے کو تیار ہیں کہ دس سال بعد آئین پر دوبارہ غور وخوض کرنے کی گنجائش رکھی جائے یقیناً آئین میں ایسے ادارہ کا انتظام کیا جائے گا جس کے ذریعہ آئین پر کسی وقت بھی نظر ثانی کی جا سکے۔

دوسرے کلاز میں قرار دیا گیا ہے کہ نظر ثانی وہ ادارہ کرے جو آئین ساز اسمبلی کی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہو۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ہندوستان کے لئے جو آئین بنایا جائے گا وہ بالغ رائے دہندگی پر مبنی ہوگا۔ آج سے دس سال بعد ہندوستان اس سے کم کسی چیز پر مطمئن نہ ہوگا کہ تمام اہم اور نازک مسائل پر ہندوستان کے ہر بالغ مرد اور عورت کو رائے دینے کا حق حاصل ہو۔

نمبر ۸۔ (الف) ہم یہ تجویز پیش کریں گے کہ انتخابات کا معقول اور مناسب طریقہ جو تمام پارٹیوں کے لئے منصفانہ ہو سکتا ہے واحد قابل انتقال ووٹ کے ذریعہ متناسب نمائندگی کا ہے۔ یاد رہے کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کی موجودہ بنیاد بہت زیادہ اقلیتوں کے [illegible] ہے۔

[illegible] کا تناسب بہت کم معلوم ہوتا ہے اور اس کے باعث آئین ساز اسمبلی کے ارکان کی تعداد بہت محدود ہو جائے گی۔ غالباً یہ تعداد ۰۰ [illegible] سے زیادہ نہ جائے گی۔ اسمبلی کو جو اہم کام درپیش ہوں گے

کے نچلے ایوانوں کے ارکان کی تعداد بہت زیادہ ہونی چاہئے ہماری تجویز کہ صوبائی اسمبلیوں کے کل ارکان کی تعداد کا کم از کم ۱/۱۰ حصہ آئین ساز اسمبلی کے ارکان منتخب کرے۔

نمبر ۸۔(ب)۔ یہ فقرہ مبہم اور تشریح طلب ہے لیکن سر دست ہم مزید تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتے۔

نمبر ۸۔(د۔ ہ۔ و۔ ز) میں ان کلازوں کی طرف پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان گروپوں کی تشکیل اور مجوزہ طریقہ دونوں ہی غلط اور ناپسند ہیں۔ اگر صوبے چاہیں تو ہم گروہ بندی کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے لیکن اس مسئلہ کو آئین ساز اسمبلی کے فیصلہ پر چھوڑ دینا چاہئے۔ فیڈرل یونین کے قیام کے ساتھ ہی آئین کے مسودہ کی تیاری اور اس کی جزئیات طے کرنے کا کام شروع ہو جانا چاہئے۔ اس میں صوبوں اور دیگر یونٹوں کے لئے مشترکہ اور یکساں قواعد ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد صوبے ان قواعد میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

نمبر ۸(ح) موجودہ حالات میں ہم کوئی ایسا کلاز قبول کرنے پر تیار ہیں۔ اتفاق رائے نہ ہونے کی صورت میں معاملہ کو ثالث کے سپرد کر دینا چاہئے۔

میں نے سطور بالا میں ان چند ظاہری نقائص کو بیان کیا ہے جو ہمارے خیال کے مطابق ان تجاویز میں موجود ہیں۔ جو آپ کی یادداشت میں درج ہیں۔ اگر ان نقائص کو ہمارے مشورہ کے مطابق دور کر دیا گیا تو ہم کانگریس سے یہ کہہ سکیں گے کہ وہ ان تجاویز کو قبول کرے لیکن جس شکل میں یہ تجویزیں اس یادداشت میں درج کی گئی ہیں جو ہمیں بھیجی گئی ہے مجھے افسوس ہے کہ ہم انہیں قبول نہیں کر سکتے۔

اس لئے بحیثیت مجموعی اگر ان تجویزوں کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ہر صورت میں مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑے گا اور ان تجویزوں کا اثر یہ ہوگا کہ ہم پابند ہو جائیں گے تو ہمیں ان میں سے اکثر کو مسترد کرنا ہوگا۔ مناسب یہی ہے کہ ہم تینوں پارٹیاں جس برائی سے بچنے کی کوشش کر رہی ہیں ہمیں اس سے بڑی برائی میں نہ پڑنا چاہئے۔

اگر دونوں پارٹیوں کے درمیان کوئی باعزت سمجھوتہ ہو سکے جو ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان کو ترقی کے لئے سازگار ہو تو ہماری تجویز یہ ہے کہ عارضی حکومت فوراً قائم کر دی جائے جو مرکزی اسمبلی کے منتخب ارکان کو جواب دہ ہو۔ آئین ساز اسمبلی کے متعلق جو معاملات کانگریس اور لیگ کے درمیان متنازعہ فیہ ہیں انہیں ایک آزاد ٹریبونل کے سپرد کر دیا جائے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی اس تجویز کے بعد کہ فریقین کے درمیان اختلافی امور طے کرنے کے لیے ثالث مقرر کیا جائے یہ سمجھتے ہوئے کہ فریقین میں ثالث کے بارے میں سمجھوتہ ہو جانے کا امکان ہے۔ کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔ اور فریقین کے درمیان مندرجہ ذیل خط و کتابت ہوئی۔

۱۵
پنڈت جواہر لال نہرو کا خط ۱۰ مئی ۱۹۴۶ء
صدر مسلم لیگ کے نام

آپ نے کانفرنس میں کل جو فیصلہ کیا تھا اس کے مطابق میرے رفیقوں نے ایک موزوں ثالث کے انتخاب پر بہت زیادہ سوچ بچار کیا ہے۔ ہم نے یہی مناسب محسوس کیا کہ کسی انگریز، ہندو، مسلمان یا سکھ کو ثالث مقرر نہ کیا جائے۔ اس طرح انتخاب کا میدان بہت محدود ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے ایک طویل فہرست تیار کر لی ہے جس میں سے کوئی نام انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے اپنی ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کے بعد ایسے اشخاص کی فہرست مرتب کر لی ہوگی جن میں سے کسی ایک کو ثالث مقرر کیا جا سکتا ہے۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ ہم دونوں اس فہرست پر غور و خوض کریں۔ اگر آپ کو یہ منظور ہے تو ہم اس مقصد کے لئے ملاقات کا وقت مقرر کر سکتے ہیں۔ ہماری ملاقات کے بعد جو سفارش ہم کریں اس پر ہم آٹھوں یعنی کانگریس کے چاروں نمائندے اور لیگ کے چاروں نمائندے غور کر سکتے ہیں اور ثالث کے انتخاب کے متعلق آخری فیصلہ کر سکتے ہیں اس فیصلہ کو ہم کانفرنس کے اجلاس میں پیش کر سکتے ہیں۔

۱۶
صدر مسلم لیگ کا خط مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۴۶ء
پنڈت جواہر لال نہرو کے نام

آپ کا خط مورخہ ۱۰ مئی شام کے چھ بجے موصول ہوا۔

وائسریگل لاج میں میری اور آپ کی جو ملاقات ہوئی تھی اس میں ہم نے ایک ثالث مقرر کرنے کے علاوہ کئی دیگر معاملات پر بھی بحث کی تھی۔ مختصر سی بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ہم اپنے اپنے رفقاء سے مشورہ کے بعد اس تجویز کا ان کے مطالب کے ساتھ مزید جائزہ لیں گے جو آپ نے کل کانفرنس میں پیش کی تھی۔

کل صبح دس بجے کے بعد کسی وقت جو آپ کے لئے موزوں ہو مجھے آپ کے ساتھ اس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی غرض سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔

۱۷

پنڈت جواہر لال نہرو کا خط مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۴۶ء صدر مسلم لیگ کے نام

آپ کا خط مورخہ ۱۰ مئی مجھے کل رات دس بجے ملا۔

وائسریگل لاج میں ہماری گفتگو کے دوران میں آپ نے ثالث کے انتخاب کے علاوہ دوسرے امور کا بھی ذکر کیا تھا اور میں نے ان کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار بھی آپ پر کر دیا تھا لیکن میں اس خیال میں تھا کہ ثالث مقرر کرنے کی تجویز پر سمجھوتہ ہو گیا تھا اور ہمارا آئندہ کام صرف نام تجویز کرنا ہوگا اور کانفرنس میں ایسے ہی سمجھوتہ کے بعد ہم نے بات چیت کی تھی۔ میرے رفیقوں نے اس پر [illegible] کام ہے اور انہوں نے مناسب ناموں کی ایک فہرست مرتب کر لی ہے۔ آج سہ پہر کو کانفرنس ہم سے اس بات کی توقع کرے گی کہ ہم اس ثالث کے نام سے کانفرنس کو مطلع کریں جس پر ہم نے اتفاق کیا ہے یا اگر یہ ممکن نہیں تو بہر حال ہمیں اس سلسلے میں کانفرنس کے سامنے تجویزیں رکھنی ہوں گی۔

ثالث مقرر کرنے کے سلسلے میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ ہم اس کا آخری فیصلہ ماننے کے لئے تیار ہوں۔ ہم اس کے لئے تیار ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ ہم اس نقطہ سے کام شروع کر دیں اور اس کے مطابق کانفرنس کو رپورٹ پیش کر دیں۔

آپ کی تجویز کے مطابق آج صبح تقریباً ساڑھے دس بجے آپ کی جائے قیام پر آؤں گا۔

۱۸

صدر مسلم لیگ کا خط ۱۱ مئی ۱۹۴۶ء پنڈت جواہر لال نہرو کے نام

مجھے آپ کا ۱۱ مئی کا خط مل گیا۔

ہماری جو بات چیت ۱۰-۲۰ منٹ تک وائسریگل لاج میں ہوئی تھی میں نے اس کے دوران میں تجویز کے کئی پہلو اور مطالب واضح کر دیئے تھے اور ہم نے کچھ دیر تک بحث بھی کی تھی لیکن کسی نکتہ پر بھی میرے اور آپ کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا سوائے اس کے کہ آپ کی اس تجویز پر کہ میں اور آپ اپنے اپنے رفیقوں سے مشورہ کر لیں ہماری ملاقات اس معاملہ پر مزید غور و خوض کی غرض سے اگلے دن تک ملتوی ہو گئی تھی۔

میں اس سلسلے میں مزید گفتگو کے لئے آپ سے آج صبح ساڑھے دس بجے مل کر خوش ہوں گا۔

۱۹

صدر مسلم لیگ کی یادداشت جس میں کانفرنس کے فیصلہ مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کے مطابق ایک پیش کش کی شکل میں کم سے کم مطالبات پیش کئے گئے ہیں۔ (اس یادداشت کی نقول وزارتی وفد اور کانگریس کو بھی بھیجی گئیں)

وہ اصول جن پر ہماری پیش کش کے طور پر سمجھوتہ ہونا چاہیے۔

۱۔ چھ مسلم صوبوں (پنجاب۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ بلوچستان۔ سندھ۔ بنگال اور آسام) کو ملا کر ایک گروہ بنا دیا جائے جو امور خارجہ۔ دفاع اور ان مواصلات کے علاوہ جو دفاع کے لئے ضروری ہوں دیگر تمام شعبوں اور امور کو اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ مواصلات سے متعلق امور صوبوں کے دونوں گروہ یعنی مسلم صوبے (جن کو اس یادداشت میں آئندہ پاکستان کہا جائے گا) اور ہندو صوبے اکٹھے بیٹھ کر طے کریں گے۔

۲۔ مندرجۂ بالا چھ مسلم صوبوں کے لئے ایک علیحدہ آئین ساز ادارہ ہوگا۔ جو گروپ اور گروپ میں شامل ہونے والے صوبوں کے

بے آئین وضع کرے گا۔ اور شعبوں کی فہرست مرتب کرے گا۔ جو ر پاکستان
فیڈریشن کے) صوبائی اور مرکزی شعبے ہوں گے۔ اقتدار اعلیٰ کے باقیماندہ
اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے۔

۳۔ آئین ساز ادارے کے نمائندوں کے انتخاب کا طریقہ ایسا
ہو گا جس کے ذریعہ پاکستان گروپ کے ہر صوبہ میں آبادی کے لحاظ سے
مختلف قوموں کو مناسب نمائندگی حاصل ہو جائے۔

۴۔ جب آئین ساز ادارہ پاکستان کی وفاقی حکومت اور صوبوں
کا آئین آخری طور پر تیار کرے تو گروپ کے ہر صوبے کو اختیار ہو گا
کہ اس گروپ سے الگ ہو جائے بشرطیکہ حسب خواہش گروپ میں رہنے
یا گروپ سے نکل جانے کے متعلق رائے عامہ کے ذریعہ اس صوبہ کے
باشندوں کی مرضی کا پتہ لگایا جائے۔

۵۔ مشترکہ آئین ساز ادارہ میں اس امر پر بحث ہو سکے گی کہ آیا یونین
کی اپنی مجلس قانون ساز ہو کہ نہ ہو۔ دونوں آئین ساز اداروں کے مشترکہ
اجلاس کا فیصلہ اس امر پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ یونین اپنے لئے روپیہ کس
طریقہ سے فراہم کرے لیکن کسی صورت میں بھی یہ روپیہ ٹیکسوں کے ذریعہ
فراہم نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ اگر یونین کی کوئی ایگزیکٹو یا مجلس قانون ساز قائم کی جائے
تو ان میں صوبوں کے دونوں گروپوں کو مساوی نمائندگی ملنی چاہیئے۔

۷۔ یونین کے آئین کی کوئی بڑی دفعہ جو فرقہ وارانہ مسئلہ پر
اثر انداز ہوتی ہو اس وقت تک مشترکہ آئین ساز ادارہ میں منظور شدہ نہ
سمجھی جائے گی جب تک ہندو صوبوں کے آئین ساز ادارہ کے ارکان
کی اکثریت اور پاکستان گروپ کے آئین ساز ادارہ کے ارکان کی
اکثریت جو اجلاس میں موجود ہوں اور اپنی رائے استعمال کر رہے
ہوں الگ الگ اس دفعہ کے حق میں نہ ہوں۔

۸۔ یونین متنازعہ فیہ نوعیت کے کسی مسئلہ کے متعلق قانون۔
ایگزیکٹو یا انتظامی فیصلہ اس وقت نہ کرے گی جب تک ارکان کی تین
چوتھائی اکثریت اس کے حق میں نہ ہو۔

۹۔ گروپ اور صوبائی آئین میں مذہب۔ ثقافت اور ان
دیگر معاملات سے متعلق جو مختلف قوموں پر اثر انداز ہوتے ہوں بنیادی
حقوق اور تحفظات کا بندوبست کیا جائے گا۔

۱۰۔ یونین کے آئین میں ایک دفعہ ایسی بھی ہو گی جس کی رو سے
کوئی صوبہ اپنی مجلس قانون ساز کی اکثریت کے فیصلے کے ذریعہ
آئین کی دفعات پر از سر نو غور کرنے کا مطالبہ کر سکتا ہے اور
اسے دس سال کے ابتدائی عرصہ کے بعد یونین سے الگ ہو جانے
کا حق حاصل ہو گا۔

ایک پُرامن اور خوشگوار سمجھوتہ کے لئے ہماری پیش کش کے
یہ اصول ہیں اور یہ پیش کش جوں کی توں برقرار ہے نیز اس پیش کش
میں جن معاملات کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب ایک دوسرے پر منحصر اور
لازم و ملزوم ہیں۔

۲۰

۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کانگریس کی طرف سے مندرجہ ذیل نکات
سمجھوتہ کی بنیاد کے طور پر پیش کئے گئے۔

۱۔ مجلس آئین ساز کی تشکیل اس طرح عمل میں آئے گی۔

(الف) نمائندوں کا انتخاب ہر صوبائی اسمبلی متناسب نمائندگی
کے اصول پر کرے گی (واحد قابل انتقال ووٹ) اس
طرح منتخب ہونے والے ارکان کی تعداد کل اسمبلی کا $\frac{1}{5}$
ہو گی۔ اور ان میں اسمبلی کے ممبر اور غیر ممبر بھی آ سکتے ہیں۔

(ب) ریاستوں کے نمائندے اپنی آبادی کی بنیاد پر منتخب ہوں
گے اور ان کی نمائندگی برطانوی ہند کی نمائندگی کے تناسب
ہو گی۔ اب یہ کہ ان نمائندوں کا انتخاب کس طرح عمل میں
آئے گا بعد میں سوچا جائے گا۔

۲۔ مجلس آئین ساز وفاقی یونین کا آئین مرتب کرے گی۔ یہ یونین
ایک کل ہند وفاقی حکومت اور مجلس قانون ساز پر مشتمل ہو گی جس
کا تعلق امور خارجہ۔ دفاع۔ مواصلات۔ بنیادی حقوق۔ زر
محاصل برآمد اور منصوبہ بندی سے ہو گا اور ان امور کے
ساتھ بھی جو مزید غور و فکر کے بعد معلوم ہو گا کہ ان کا ان امور
کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وفاقی یونین کو یہ اختیار
ہو گا کہ ان امور کے لئے ضروری روپیہ حاصل کر سکے اور
بطور خود ٹیکس عاید کر سکے۔ یونین کو یہ اختیار بھی حاصل ہونا
چاہیئے کہ آئین کے ٹوٹ جانے پر اور شدید ہنگامی صورت
حال میں اصلاحی اقدامات اٹھا سکے۔

۳۔ اس کے علاوہ سب اختیارات صوبوں یا گروپوں کو حاصل ہونگے

۴۔ صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ مل کر گروپ بنالیں اور پھر فیصلہ کریں کہ وہ کون کون سے امور ہوں گے جن پر وہ اشتراک عمل چاہتے ہیں۔

۵۔ جس وقت مجلس آئین ساز پیراگراف ۲ کے مطابق کل ہند وفاقی یونین کے لئے آئین مرتب کرے گی تو صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ مل کر اپنے گروپ کے لئے صوبائی آئین مرتب کریں اور اگر وہ چاہیں تو سارے گروپ کے لئے ایک ہی آئین بنالیں

۶۔ کل ہند وفاقی آئین کے کسی اہم نکتہ کو جو فرقہ وارانہ مسئلہ پر اثرانداز ہو رہا ہو اس وقت تک مجلس آئین ساز میں منظور نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ ایک یا ایک سے زیادہ فرقے جن کا اس معاملہ سے تعلق ہو ان کے حاضر ارکان نے اپنی رائے کا الگ الگ اظہار اس پر نہ کیا ہو اور ان کی اکثریت اس کے حق میں نہ ہو۔ اگر کسی ایسے مسئلہ پر آپس میں سمجھوتہ ممکن نہ ہو تو پھر ثالث کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس صورت میں کہ آیا زیر بحث مسئلہ کافی فرقہ وارانہ اہمیت رکھتا ہے یا نہیں سپیکر فیصلہ کرے گا یا اگر مناسب سمجھا گیا تو اُسے فیڈرل کورٹ میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے

۷۔ آئین کی ترتیب کے دوران میں اگر کسی مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہو جائے تو اس خاص مسئلہ کو ثالث کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

۸۔ آئین میں ایک ایسے ادارہ کا انتظام بھی ہو جو بعد میں آئین پر نظرثانی کر سکے لیکن اس ادارہ پر کچھ مناسب پابندیاں عائد کر دی جائیں اگر یہ پسند کیا گیا تو بالتصریح لکھا جا سکتا ہے کہ دس سال کے بعد اس سارے آئین پر دوبارہ غور کیا جائے گا۔

مسلم لیگ کے مجوزہ اصول جن پر وہ سمجھوتہ چاہتی تھی اور ان پر کانگریس کی یادداشت مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء

ان معاملات میں مسلم لیگ کا نقطہ نگاہ کانگریس سے اس قدر مختلف ہے کہ بقیہ مسائل کو نظرانداز کر کے کسی ایک مسئلہ پر تبصرہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کانگریس نے اپنے سیاسی تصورات کا خاکہ مختصر طور پر ایک الگ یادداشت میں دیا ہے مسلم لیگ کی تجاویز اور اس یادداشت کو دیکھنے کے بعد مشکلات اور ان کا ممکن حل واضح ہو جائے گا۔

[illegible] تجاویز جن میں رائے [illegible] ہوتی ہے

۱۔ ہماری تجویز میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ سارے ملک کے لئے ایک آئین ساز مجلس ہو اور اس کے بعد اگر متعلقہ صوبوں نے چاہا تو وہ مل کر گروپ بنا سکتے ہیں۔ یہ صوبوں پر چھوڑ دینا چاہئے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ آزادی کے ساتھ گروپ کی شکل میں کام کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اپنا آئین بنا سکتے ہیں۔ بہرصورت جس گروپ میں آسام کو جگہ دی گئی ہے اُسے وہاں نہ رکھنا چاہئے اور نہ شمال مغربی سرحدی صوبہ انتخاب کے پیش نظر اس تجویز کے حق میں ہے۔

۲۔ مرکزی امور کے علاوہ ہمیں اس پر بھی اتفاق ہے کہ بقیہ اختیارات کو صوبوں کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ جس طرح بھی چاہیں ان اختیارات کا استعمال کر سکتے ہیں اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے وہ گروپ کی شکل میں کام کر سکتے ہیں۔ ہم اس مرحلہ پر تعیین نہیں کر سکتے کہ ایک ایسے گروپ کی آخری شکل کیا ہوگی۔ بہتر ہے کہ اسے متعلقہ صوبوں کے نمائندوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔

۳۔ ہماری تجویز میں انتخاب کا بہترین طریقہ واحد قابل انتقال ووٹ کا طریقہ ہوگا۔ اس طرح مختلف فرقوں کو اسمبلیوں میں ان کی موجودہ نمائندگی کے تناسب نمائندگی حاصل ہو جائے گی اگر آبادی کے تناسب کو لیا گیا تو اس پر بھی کوئی خاص اعتراض نہ ہوگا لیکن اس طریقہ کے اختیار کرنے پر ان صوبوں میں جہاں بعض فرقوں کی خاطر ویٹیج (زائد نمائندگی) کا اصول کارفرما ہے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ جو اصول بھی مانا گیا اس کا اطلاق لازمی طور پر سب صوبوں پر ہوگا۔

۴۔ کسی صوبے کو اپنے گروپ سے علیحدہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی کیونکہ گروپ میں شامل ہونے سے پہلے صوبوں کی رضامندی ضروری ہوگی۔

۵۔ ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وفاقی یونین کے ساتھ اس کی اپنی اسمبلی بھی ہو اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ یونین کو حصول مالیات کی خاطر خود ٹیکس لگانے کا اختیار حاصل ہو۔

۶-۷۔ ہم اس کے حق میں بالکل نہیں ہیں کہ یونین کی انتظامیہ کونسل یا اس کی اسمبلی میں گروپوں کو مساوی نمائندگی دی جائے ہمارے خیال میں یہ شرط کہ یونین کے آئین میں ایسا کوئی اہم

مسئلہ جسے فرقہ وارانہ حیثیت حاصل ہو مجلس آئین ساز میں منظور نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ علیحدہ طور پر متعلقہ فرقہ یا فرقوں کے حاضر ارکان کی جنہوں نے اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہو اسے اکثریت حاصل نہ ہوگی۔ سب اقلیتوں کے حق میں کافی وشافی تحفظ ہے۔ بہ نسبت اس تجویز کے جس کا مقصد کچھ اور ہی ہے ہم نے زیادہ وسیع تجویز پیش کی ہے جس میں سب فرقے آجاتے ہیں۔ چھوٹے فرقوں کے سلسلے میں کچھ مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے لیکن ان سب مشکلات کا حل اس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ انہیں ثالث کی طرف رجوع کیا جائے۔ ہم اس اصول کی تعمیل کے ذرائع پر سوچ بچار کرنے کے لئے آمادہ ہیں تاکہ اسے زیادہ قابل عمل بنایا جاسکے۔

۸۔ اس تجویز کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ کسی حکومت یا مجلس قانون ساز کے لئے وہاں کام کرنا بھی ممکن نہیں۔ جب ایک دفعہ بڑے بڑے اور اہم فرقہ وارانہ مسائل کے لئے تحفظ پیدا ہوگیا تو پھر دوسرے ایسے مسائل کے لئے جو مابہ النزاع ہوں یا نہ ہوں کسی قسم کے تحفظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ان کا تو مطلب یہ ہوگا کہ ہر قسم کے محفوظ مفاد کا تحفظ کیا جائے اور ترقی کے راستے میں روڑے اٹکائے جائیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کسی قسم کی تحریک بھی ممکن نہ ہو سکے۔ اس لئے ہم اسے بالکل رد کر رہے ہیں۔

۹۔ ہمیں پورا اتفاق ہے کہ آئین میں ابتدائی حقوق اور مذہب اور اس طرح کے دوسرے مسائل سے متعلق تحفظات کو شامل کیا جائے۔ ہماری تجویز ہے کہ اس کا مناسب مقام کل ہند وفاقی یونین کا آئین ہے۔ ابتدائی حقوق کے سلسلے میں سارے ملک میں یکسانیت ہونی چاہئے۔

۱۰۔ یہ لابدی امر ہے کہ یونین کے آئین میں نظر ثانی کی کسی شرط کو ملحوظ رکھا جائے۔ ایک دوسری شرط یہ ہوگی کہ دس سال کے بعد آئین پر از سر نو غور کیا جائے۔ اس وقت آئین کے ہر پہلو پر غور کرنے کا پورا موقع حاصل ہوگا اگرچہ یہ خود مضمر ہے لیکن ہم علحدگی کے امکان کی طرف اشارہ نہیں کریں گے کیوں کہ اس نظریہ کی ہم حوصلہ افزائی کرنا نہیں چاہتے۔

غزل

(از جناب حجاب بنارسی)

جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے

نہ میرے غم کو وہ سمجھے نہ وہ میری خوشی سمجھے

مگر ان کی رضا کو تو ہم اپنی زندگی سمجھے

ہر پرواہ، پروانوں کی پروا نہ دلی سمجھے

جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے

میری تشنہ نگاہیں ان کو رسوائے جہاں کر دیں

مگر ضبطِ محبت کو وہ میری بیرخی سمجھے

بجا ان کا تغافل ہے تجھے اے دل گلہ کیوں ہے!

غرورِ حسن کیونکر عشق کی وارفتگی سمجھے

ہماری مے کشی ہرگز نہیں ہے سرکشی زاہد

وہ ناداں ہے ہماری بیخودی کو خودی سمجھے

زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہیں ہچکیاں پیہم

دمِ آخر کوئی ہمراز رازِ زندگی سمجھے

ہزاروں حسرتوں آشنا ہے ایک ٹوٹا دل

جو شاعر ہو دلِ شاعر کی وہ آشفتگی سمجھے

حجاب اس قلب کی سوز و تپش سے کوئی کیا واقف

کوئی مجنوں ہے پھر معنی جامہ دری سمجھے

ریاستوں سے معاہدے اور تاج کے نئے تیور!

(وزارتی وفد اور ہز ایکسلنسی وائسرائے کے بیان مجریہ ۱۷ رمئی کے پیراگراف کی یہ تشریح و تفصیل ہے)

۱۔ دارالعوام میں وزیر اعظم برطانیہ کے حالیہ بیان سے پہلے والیان ریاست کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ تاج کا کوئی ایسا ارادہ نہیں کہ تاج کے ساتھ والیان ریاست کے تعلقات یا ان کی مرضی کے بغیر ان حقوق میں کوئی رد و بدل کیا جائے گا جن کی ضمانت ان معاہدوں اور وعدوں میں دی گئی ہے جو ان کے ساتھ کئے گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ان مذاکرات کے باعث جو تبدیلیاں پیدا ہوں گی ان کے بارے میں والیان ریاست کی رضامندی معقول طور پر حاصل کی جائے گی۔ اس وقت سے ایوان والیان ریاست نے اس امر کی تصدیق کر دی ہے کہ ہندوستانی ریاستیں ملک کی اس عام خواہش میں پوری طرح شریک ہیں کہ ہندوستان فوراً اپنا پورا درجہ حاصل کر لے۔ حکومت برطانیہ نے اب اعلان کیا ہے کہ برطانوی ہند کی آنے والی حکومت یا حکومتیں اگر آزادی کی خواہش مند ہیں تو ان کے راستہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے گی۔ ان اعلانات کا اثر یہ ہوا ہے کہ ہندوستان کے مستقبل سے تعلق رکھنے والے تمام اشخاص اس بات کے خواہش مند ہیں کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کے اندر یا اس سے باہر رہ کر آزادی کا درجہ حاصل کرے۔ جو مشکلات ہندوستان کی اس خواہش کے پورا ہونے میں درپیش ہیں وفد اس ملک میں ان مشکلوں کو دور کرنے کے لئے آیا ہے۔

۲۔ کسی نئے آئینی نظام کے عمل میں آنے سے پہلے جس عارضی دور کا گزرنا لازمی ہے۔ اور جس کے تحت ہندوستان کو آزادی یا کامل حکومت خود اختیاری حاصل ہو گی۔ اس میں اقتدار اعلیٰ بدستور قائم رہے گا لیکن حکومت برطانیہ اقتدار اعلیٰ کسی حالت میں بھی ہندوستان کی حکومت کو منتقل نہیں کر سکتی اور نہ کرے گی۔

۳۔ اس اثنا میں ہندوستانی ریاستیں اس قابل ہوں گی کہ ہندوستان کے نئے آئین کی ترتیب میں اہم حصہ لیں اور ہندوستانی ریاستوں نے ملک معظم کی حکومت کو اس امر سے مطلع کیا ہے کہ ان کے اپنے نیز ہندوستان کے مجموعی مفاد کے پیش نظر ان کی یہ خواہش ہے کہ آئینی نظام کی تیاری میں امداد دیں اور اس کے مکمل ہونے پر اس میں اپنے لئے مناسب جگہ حاصل کریں۔ اس کام کو آسانی کے ساتھ تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کریں گی کہ ان کا نظم و نسق اعلیٰ معیار کے مطابق ہو اور اس طرح وہ جا بجا اپنی پوزیشن کو مضبوط بنا لیں گی۔ جہاں ریاست کے موجودہ وسائل موزوں و مناسب معیار نہیں حاصل ہو سکتے وہاں وہ بلاشبہ مناسب صورتوں میں اتنی بڑی انتظامی یونٹیں بنانے یا ان میں شامل ہونے کا انتظام کریں گی جو ان کو آئینی نظام میں شامل ہونے کے قابل بنا دے۔ اگر مختلف حکومتیں جنہوں نے اب تک ایسا نہیں کیا ہے اپنی ریاستوں میں نمائندہ اداروں کے ذریعہ رائے عامہ کے ساتھ مسلسل اور قریبی تعلق رکھنے کے عملی اقدامات کو بن گئی تو اس سے اس آئین سازی کے زمانہ میں ریاستوں کی حیثیت بھی مضبوط ہو جائے گی۔

۴۔ عبوری دور میں ریاستوں کے لئے ضروری ہو گا کہ مشترکہ نوعیت کے امور کی آیندہ ترتیب کے سلسلے میں بالخصوص معاشی اور مالی میدان میں برطانوی ہند کے ساتھ گفت و شنید کریں۔ ہندوستان کے جدید آئینی نظام میں ریاستیں شامل ہونے کی خواہش کریں یا نہ کریں یہ گفت و شنید جو از بس کہ لازمی ہو گی کافی وقت لے گی۔ مزید براں چونکہ اس گفت و شنید کے بعض پہلو ہو سکتا ہے کہ نئے آئین کے معرض وجود میں آنے تک نامکمل رہ جائیں اس لئے انتظامی مشکلات کے سدباب کے طور پر یہ ضروری ہو گا کہ ریاستوں اور آیندہ حکومت یا حکومتوں کے ارباب اختیار کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو جائے تاکہ نئی حکومتوں کے تکمیل پانے تک اس درمیانی عرصہ میں مشترکہ امور کے متعلق انتظامات جاری رہ سکیں۔ اس باب میں اگر ایسا چاہا گیا تو حکومت برطانیہ اور نمائندہ تاج حتی المقدور مدد دینے کو تیار رہیں گے۔

۵۔ جب برطانوی ہندوستان میں مکمل حکومت خود اختیاری رکھنے والی یا آزاد حکومت یا حکومتیں قائم ہو جائیں گی اس وقت ان حکومتوں پر ملک معظم کی حکومت کا ایسا اثر نہیں ہو گا جس کی وجہ سے وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کر سکے جو بحیثیت اقتدار اعلیٰ کے اس عہد

ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ نہیں خیال کرتی کہ اس مقصد کے لئے
ہندوستان میں برطانوی فوج رکھی جانی چاہئے۔ اس کے منطقی نتیجہ کے
لحاظ سے اور ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے ملک معظم کی حکومت
سے جو خواہشات ظاہر کی گئی ہیں اُن کے پیش نظر ملک معظم کی حکومت
"اقتدار اعلیٰ" کے اختیارات سے کام لینا ترک کر دے گی۔ اس کا
مطلب یہ ہے کہ ریاستوں کے وہ حقوق نہیں رہیں گے جو تاج
کے ساتھ ان کے تعلقات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ریاستوں
نے جو حقوق "اقتدار اعلیٰ" کو دیئے تھے ریاستوں کو واپس
مل جائیں گے۔ اس طرح وہ سیاسی انتظامات ختم ہو جائیں گے۔
جو ریاستوں اور "برطانوی تاج اور برطانوی ہند" کے درمیان
قائم ہیں۔ اس کی جگہ ریاستوں کو یہ انتظام کرنا پڑے گا کہ وہ برطانوی
ہند کی آنے والی حکومت یا حکومتوں کے ساتھ وفاقی تعلق قائم
کریں یا اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو اس حکومت یا حکومتوں کے ساتھ
مخصوص سیاسی انتظامات کریں۔

حکومت کو ناریل کے ریشہ کی صنعت پر نگرانی کرنی چاہیئے

شرح اجرت میں گڑبڑ

ریج کمیٹی کی رپورٹ

ناریل کے ریشہ کی صنعت میں بہت ہی زیادہ کارخانے بہت ہی زیادہ پلانٹ اور بہت ہی زیادہ مزدور ہیں۔ معمولی نوعیت کی چیزیں تیار کرنے میں کافی محنت اور روپیہ ضائع ہوتا ہے۔ بین الاقوامی مقابلہ بازی اور کارخانہ داروں میں قیمت کم کرنے کے مقابلہ بازی کی وجہ سے صنعت کو اتنا فائدہ نہیں حاصل ہو رہا ہے۔ جتنا اس کو اس لحاظ سے حاصل ہونا چاہیئے کہ اس کو قریب قریب اجارہ داری کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ہیں وہ نتائج جو ریج کمیٹی نے ہندوستان میں ناریل کے ریشہ کی چٹائیوں وغیرہ کی صنعت کے متعلق اپنی رپورٹ میں ظاہر کئے ہیں۔

رپورٹ میں لکھا ہے کہ ناریل کے ریشہ کی چٹائیوں کی صنعت میں اس طرح راشن بندی کرنی ضروری ہے کہ ناریل کے ریشہ کی مصنوعات کی پیداوار اور برآمد کی مرکزی نگرانی کے لئے ایک نظام قائم کیا جائے۔ دیگر ترقیوں مثلاً بہتر مشینوں کا استعمال بھی ضروری ہے۔ مزدوروں کے انتظام کے سلسلہ میں ٹراونکور اور کوچین کے درمیان کسی نہ کسی طرح کے اتحاد کی ضرورت ہے۔

مالابار کی سب سے بڑی صنعت

ناریل کے ریشہ کی صنعت مالابار کے ساحل کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ اس علاقہ میں ناریل کے مزرعے بکثرت ہیں۔ ریاست ٹراونکور میں ۳۰۰۰۰ خاندان ریشہ نکالنے کے کام میں اور تقریباً ۳۰۰۰۰ مزدور چٹائیاں وغیرہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ کوچین کی ریاست میں تقریباً ۴۰۰۰۰ مزدور اس صنعت میں ہیں۔ تقریباً ۳۶۰ کارخانے ٹراونکور میں ہیں جن میں سے ۴۶ ایسے ہیں اور باقی دیہاتوں میں ہیں۔ کوچین میں ۱۵ کارخانے رسی بنانے کے اور ۳ چٹائیوں کے کارخانے ہیں۔ کوچین کو صرف ناریل کے بٹے ہوئے ریشے اور رسیاں بنانے اور برآمد کرنے میں خصوصیت حاصل ہے۔ چٹائیاں وغیرہ بنانے کے لئے اس کو اچنگو (ٹراونکور) سے اعلیٰ قسم کا بٹا ہوا ریشہ منگانا پڑتا ہے۔

ناریل کے ریشوں کی بنی ہوئی جو اشیا یورپ بھیجی جاتی تھیں جنگ چھڑ جانے پر ان کی برآمد فوری طور پر بڑھ گئی۔ لیکن جب محوری طاقتوں نے یورپ کو پامال کر دیا اور جاپان جنگ میں کود تو ناریل کے ریشوں کی صنعت قریب قریب ختم ہو گئی۔ اسی اثنا میں کوچین اور ٹراونکور کی حکومتوں کو حکومت ہند کی طرف سے ناریل کے ریشوں سے تیار ہونے والی بہت سی نئی اشیا مثلاً خیموں کے رسّوں کے آرڈر مل گئے دوسرے ریشوں کی قلت کی وجہ سے ناریل کے ریشوں کی مانگ بڑھ گئی۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں حکومت کو اس کی قیمتوں پر کنٹرول عاید کرنا پڑا۔ اس وقت اس صنعت میں مزدوروں کی شدید کمی ہے۔

ٹراونکور میں جو مزدور اس صنعت میں کام کرتے ہیں ان میں کام کی مقدار کے لحاظ سے کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد وقت کے حساب سے کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ ٹھیکے پر کام کرنے والے مزدور بالخصوص عورتیں اور بچے۔ مزدوروں کی کل تعداد کا فی صدی ہیں۔ مزدوروں میں اسّی فی صدی مرد ہیں۔

باضابطہ اور بے ضابطہ دونوں قسم کی فیکٹریوں میں عورتوں اور بچوں سے ریشوں کو چھانٹ کر الگ الگ کرنے۔ رسّیاں بٹنے والوں کے سروں کو جوڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔ ان میں مستقل ملازمت۔ کام سیکھنے۔ گریڈوں یا ٹائم اسکیل کی بنا پر تنخواہوں کی ترقی کا کوئی انتظام نہیں۔ اور نہ ہی کوئی مستقل قاعدے موجود ہیں۔

کام کرنے کے حالات

کام کرنے کے حالات باضابطہ فیکٹریوں میں بھی نہایت غیر تسلی بخش ہیں۔ فیکٹریاں عموماً ناریل کے ریشوں کی بنی ہوتی ہیں ان میں

ہوا کی آمد و رفت کا کوئی انتظام نہیں اور نہ ہی آتشزدگی سے بچنے کا کوئی بندوبست ہے۔ مزدور تنگ جگہوں میں کام کرتے ہیں اور خطرناک مشینوں کو محفوظ نہیں کیا گیا۔ صفائی کی حالت خراب ہے اور ان شعبوں میں جہاں رنگنے اور اسٹینسل کے ذریعہ نقش و نگار بنانے کا کام کیا جاتا ہے ہاتھ نہ دھونے کا کافی انتظام نہیں۔ تمام فیکٹریوں میں مزدوروں کی صرف ایک باری لگتی ہے۔ بے ضابطہ فیکٹریوں میں اتوار کو بھی کام ہوتا ہے۔ اور ان میں کام کے کوئی باقاعدہ اوقات مقرر نہیں۔

اُجرتیں اور آمدنیاں

چونکہ مختلف قسم کے بہت سے الگ الگ کام ہوتے ہیں۔ اور کئی قسم کے نمونوں اور ڈیزائن کی اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ اس لئے ایک فیکٹری میں اُجرتوں کی شرح دوسری فیکٹری کی اجرتوں کی شرح سے مختلف ہوتی ہے۔ مرد اکثر بارہ آنہ سے چودہ آنہ یومیہ تک اجرت پاتے ہیں۔ عورتیں چھ آنے سے آٹھ آنے تک اور بچے چار آنے یومیہ سے کم اجرتوں کی درجہ بندی کی شدید ضرورت ہے۔ جو مزدور وقت کے حساب اجرت لیتے ہیں ان کی اُجرتیں صنعتی تعلقات کی کمیٹی کی کوششوں سے بڑھ گئی ہیں۔ یہ کمیٹی ۱۹۴۳ء میں اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ حکومت ہند کے محکمہ رسد کی طرف سے خیموں کے مختلف حصوں کے لئے جو آرڈر دیئے گئے تھے ان کے بارے میں مقامی فیکٹریوں کی باہم مقابلہ بازی کو روکا جائے۔ عورتوں کی اُجرتیں سات آنے سے بڑھاکر نو آنے یومیہ کردی گئی ہیں۔ اور مردوں کی اُجرتیں دس آنے سے بڑھاکر ایک روپیہ یومیہ کردی گئی ہیں۔ مہنگائی الاؤنس اب ۱۲ آنہ فی روپیہ یا ۱۹۳۹ء کی بنیادی شرح اجرت کے ۷۵ فیصدی کے حساب سے دیا جاتا ہے۔ لیکن اخراجات زندگی میں جو اضافہ ہوا ہے۔ اس کی نسبت سے یہ مہنگائی الاؤنس کم ہے۔ کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ آمدنی اوسطاً بارہ اور باون روپیہ ماہوار ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۳۹ء کی نسبت علی الترتیب آٹھ روپیہ اور بارہ روپیہ کا اضافہ ہوا ہے۔ زائد وقت لگاکر آمدنی پیدا کرنے کا کوئی رواج نہیں۔ نہ ہی بونس۔ انعام خدمت یا پنشن دی جاتی ہے۔

مزدوروں کی سود و بہبود اور ان کیلئے مکانوں کا انتظام

باضابطہ فیکٹریوں میں طبی امداد صرف فرسٹ ایڈ بکس تک محدود ہے گاہ بگاہ طبی معائنہ کا کوئی انتظام نہیں۔ مزدوروں کی ایک کثیر تعداد ناقص تغذیہ کی شکار ہے۔ اور فائیلریاسس کے مرض میں مبتلا ہے الیپی (ٹراونکور) میں تین بڑے یونٹوں میں کینٹینوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ پانچ فیکٹریوں میں اناج کی دوکانیں ہیں۔ جن میں راشن کی تمام چیزیں بازار کے بھاؤ سے کم نرخ پر یا کنٹرول کے نرخوں پر ملتی ہیں۔ آجروں کی طرف سے مزدوروں کے لئے رہائشی مکانوں کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ مزدور اپنی نجی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ بلدیہ کے رقبہ میں وہ زمین کا کرایہ بصورت نقدی اور دیہات میں کام کاج کی شکل میں ادا کرتے ہیں۔

کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ اگرچہ کوچین میں ۲۵ فی صدی مزدور اور ٹراونکور میں ۶۵ فی صدی مزدور مقروض ہیں۔ لیکن اوسط قرضہ فی کس بہت کم یعنی علی الترتیب ۴۲ اور ۶۹ روپیہ ہے۔ اور قرضے کا بڑا حصہ گھریلو ضروریات کے لئے لیا گیا ہے

منظم ٹریڈ یونین

الیپی (ٹراونکور) میں، ایک بڑی منظم ٹریڈ یونین ہے۔ تقریباً سترہ ہزار مزدور اس کے رکن ہیں ۱۹۳۹ء کی عام ہڑتال کے بہت سے یونین نے ہر فیکٹری میں ایک کمیٹی مقرر کر رکھی ہے۔ جو فیکٹری کے تمام شعبوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ کمیٹی روزمرہ پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں منتظمین سے براہ راست بات چیت کرتی اور ان کے بارے میں تصفیہ کرواتی ہے۔ عام پالیسی سے تعلق رکھنے والے مستقل صنعتی تعلقات کی کمیٹی کے سپرد کردیئے جاتے ہیں۔ اس ادارہ کی وجہ سے ٹھیکہ پر مزدور رکھنے کے طریقہ کی خرابیاں دور ہوگئی ہیں اور اس نے صنعتی امن کو ترقی دینے میں بہت کام کیا ہے۔ اس وقت اس کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ چٹائیوں وغیرہ کی تیاری میں نئی قسموں کے تمام کاموں کے لئے اجرتوں کی شرحیں مقرر کی جائیں۔

الیپی اور قرب و جوار کی ۴۶ فیکٹریوں میں سے صرف دس فیکٹریوں کو ٹراونکور کے کارخانوں کے قانون کے تحت لایا گیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ تمام فیکٹریوں کو کنٹرول میں لایا جائے۔ اور معائنہ کرنے والے عملہ میں اضافہ کیا جائے۔ اجرتوں کی ادائیگی کے قانون اور مزدوروں کے معاوضوں کے قانون پر خاطر خواہ عمل کیا جارہا ہے۔ کوچین میں زچگی کے فائدہ کے قانون کے

افسانہ

تلخ و شیریں

(از محمد امین شرقپوری)

دل سکھ کو نت نئی شادیاں کرنے کا شوق تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انکا یہ شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ پہلی بیوی کی مہندی نہ اترنے پاتی کہ یہ دوسری لے آتے، روپے پیسے کی فراوانی تھی، بھرے خزانے چھوڑے تھے، اس غریب ملک میں، مالدار کو سوسائٹی میں ایک وقعت حاصل ہے، لوگ اس کے افعال کو نہیں دیکھتے بلکہ دولت کی چمک کا نشہ کر مست ہو جاتے ہیں، اُس کے ہمنوا بن جاتے ہیں، دلسکھ کو راجہ کہہ کر پکارا جاتا تھا، دولتمند ہونے کی وجہ سے یا شادیاں رچانے سے بہرحال حواریوں نے اُنہیں راجہ مشہور کر رکھا تھا۔ بڑے کمرے میں مسند لگا کر بیٹھتے، درجن بھر آدمیوں کا جمگھٹا ہوتا، حقہ کے کش لگتے، پان کا دور چلتا، واہ واہ کے نعروں میں اُن کا بھاری بھرکم جثہ عجیب شان پیدا کر دیتا، اس پر اُن کی بے تکی باتیں اُن کے راجہ ہونے کا کافی ثبوت تھیں۔ بات بات پر مونچھوں کو تاؤ دیتے مسکراتے ہوئے محفل کی رونق کو دوبالا کرتے، عقل سے کورے تھے اس لیے آسانی سے حواریوں کا شکار بن جاتے تھے، چندو کا اُنکے پاس ہر وقت کا بیٹھنا اٹھنا تھا، مشہور تھا کہ اُنہوں نے چار شادیاں صرف چندو کے ایما پر کر ڈالیں تھیں اب بھی اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ فلاں جگہ میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے کیا کہوں چہرے پر آنکھ نہیں ٹکتی، مور کی سی چال چلتی ہے، دل سکھ لوٹ پوٹ ہو جاتے، مسکرا کر کہتے "کتنے میں ہاتھ آجائے گی؟"

چندو اُن کی نبض پہچانتا تھا بولا " سرکار یہی کوئی چار پانچ ہزار میں سودا ہو جائے گا،"

دل سکھ تجوری سے چار ہزار نکال لائے بولے "دیر نہیں ہونی چاہیئے، ہاتھ سے نکل گئی تو پھر عمر بھر پچھتاوا رہے گا؟"

اوٹ میں رانی کھڑی سن رہی تھی، اُس کی شادی کو دو برس ہوئے تھے، یہ اُن کی نئی بیوی تھیں، شکل صورت ناک نقشہ کی اچھی تھیں، چندو کی بات پر کڑک کر بولیں "چندو کیا پٹی پڑھا رہا ہے۔ بے ایمان ... باقی ...

چندو جیسے ... شادی ... کر دو ... آپ نے سچ سمجھ لیا؟"

مالا کی کڑیاں بکھیل اٹھی، تین عورت پر آتی تھی بولی "مجھے جل دے رہا ہے چار ہزار اینٹھ لے کہا چار رقم لے کر سیدھے ہاتھ تھیلی رکھ دے ورنہ مجھ سے بُرا نہ ہوگا؟"

چندو اپنے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولا "تم تو فضول بگڑ رہی ہو یہ ایک نے قرض مانگے ہیں راجہ اب شادی کیا کریں گے ایک چھوڑ چار موجود ہیں، پھر اب وہ عمر بھی نہیں رہی ان کی، کچھ تو سوچو رانی جی؟"

دل سکھ جو ایسے موقعے پر عقلمند بن جاتے تھے مسکرا کر بولے تم بھی کن باتوں میں آگئیں، چندو اپنی شادی کے لیے ادھار لیے جا رہا ہے روپیہ، تمہارے ہوتے میں شادی کروں گا بھلا"

دل سکھ کی صاف گوئی جس میں محبت کی آمیزش تھی کام کر گئی، رانی غصہ تھوک کر بولی" میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ میرے راجہ ایسے نہیں ہیں، شادی پر آپ نے وچن دیا تھا کہ تمہارے سوا کسی سے بات نہیں کروں گا، پہلی تینوں داسیاں بن کر رہیں گی گھر میں،"

ہاں ہاں وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر بولے "دیکھو اُن سے بات نہیں کرتا یہ اور بات ہے کہ گھر میں ہونے کی وجہ سے اُنکی دلجوئی کرنی ہی پڑتی ہے، زیور کپڑے جو تمہارے پاس ہیں کسی دوسرے کے پاس کہاں ہیں؟"

رانی نگاہیں نیچی کیے زیرِ لب مسکرا رہی تھی، دلسکھ بولے "آج کیا پان نہ کھلاؤ گی اپنے ہاتھ سے؟"

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی چندا پان کا بیڑا لیے۔ داخل ہوئی، یہ دل سکھ کی تیسری بیوی تھی اس کے ہاتھ کا پان اُنہیں بہت پسند تھا۔ خضاب زدہ مونچھیں مروڑنے لگے، بولے "کیا کہا تمہارے پان کا رانی خوشامد کر رہی تھی کہ پان میرے ہاتھ سے کھا لو" ہم نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہماری چندا روٹھ جائے گی ہم سے، چندا نے شرم سے گردن جھکا لی۔ راجہ نے محبت سے گلوری منہ میں رکھ لی۔ ابھی وہ پیک تھوکنے نہ پائے تھے کہ رانی پان لے کر آ گئی۔ اُنکی نظر

...دا کے تعاقب میں اُٹھ گئیں۔ جو سامنے کے دروازہ سے باہر نکل رہا ... دل سُکھ کے چلتے ہوئے جسم ایک دم ٹھٹک گئے۔

"کیوں جی تم نے اسے دکھانے مجھ بھی"

دل سُکھ پیڑا ایک تکیے سے دوسرے تکیے کی طرف کھسکاتے ... ہنستے بولے،

"کیا ہمارا رانی؟"

"ہاں کو مجھ سے کہا تھا اور کھا لیا جیتی کے ہاتھ سے"

"اوہ، کتنی چھوٹی سی بات پر بگڑ گئیں تم بھی، لاؤ تم بھی دے دو ... ہاتھ سے لیتا ہوں"

پیک تھوکنے کے لیے اگالدان کی طرف جھکے۔

"یوں نہیں مانوں گی، منہ خوب صاف کرنا ہوگا"

"پھر لے آؤ تھوڑا سا پانی" راجہ مسکرا کر بولے۔

چندو نے جمنا کو اشارہ کیا جمنا شربت کا گلاس بھر لائی،

دل سکھ مسکرا کر بولے "تمھیں جمنا میرا خیال ہے اور کسی کو نہیں، کیا مزے دار شربت ہے" جمنا اس عزت افزائی پر مسکراتی ہوئی چلی گئی،

رانی لوٹا اور پانی کا گلاس لیے نمودار ہوئی۔ دل سُکھ کے ہاتھ میں شربت کا گلاس دیکھ کر بولی، بڑے بے صبر ہو جی، میں کیا خالی پانی ہی لے کر آئی، لیموں کے رس کا ایسا مزیدار شربت بنا کر لائی ہوں کہ گھنٹوں پیاس نہیں ستائے گی۔ مگر تمہیں تو خالی جینی کا شربت پسند ہے۔ چاہے اسمیں زہر ہی کیوں نہ ملا ہو۔

دل سُکھ جلدی سے گلاس خالی کرتے ہوئے بولے "تمہارا شربت تو واقعی بڑا لذیذ ہوگا۔ پیاس بہت ستا رہی ہے اچھا ہوا لے آئیں" ہاتھ بڑھا کر گلاس تھام لیا۔

چندو بولا "سرکار چلم ٹھنڈی ہو گئی بھر لاؤں"

"ہاں ہاں" وہ بولے، رانی ہاتھ روک کر بولی "اس نگوڑے کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔ چلم کو آج تو اپنے ہاتھ سے بھر کر پلاؤں گی تمہیں"

دل سکھ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ آج رانی کتنی محبت جتا رہی تھی۔ اُسے چلم لے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے رانی کی مور کی سی چال کو۔ ان کے دماغ میں چندو کی نئی دریافت گھوم گئی۔

جس کے چہرے پر کسی کی نگاہ نہیں رکتی تھی اور چال ——— وہ اُنھوں نے چونک کر دیکھا۔ شانتا طشتری میں خربوزے کی قاشیں لگائے پائل بجاتی آ رہی تھی بولے، میں سوچ ہی رہا تھا کہ آج تم نے خربوزہ نہیں کھلایا۔ بھئی بہت وقت پر آئیں۔

شانتا دبی مسکراہٹ سے بولی۔ قاشیں اپنے ہاتھ سے کاٹ کر لائی ہوں، کھائیں گے تو مزہ ہی آ جائے گا آج بہت میٹھا ہے"

کیوں نہیں مسکرا کر بولے "تمہارے ہاتھ کا میٹھا کیوں نہ ہوگا آخر ہماری بڑی رانی ہو نا"

شانتا مسکراتی ہوئی چلی گئی، پائل بجاتی ہوئی، دل سُکھ مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔ برف میں لگی ہوئی قاشیں۔

رانی چلم لے کر آئی، شربت برن کا تون دھرا تھا۔ راجہ طشتری پر جھکے ہوئے تھے۔ ہاتھ کھینچ کر بولے "لاؤ چلم لاؤ" چندو آج مزہ آئے گا چلم میں" رانی جل کر بولی "خربوزہ کھانے کو جی چاہتا تھا تو مجھ سے کہا ہوتا" میں کیا دشمن ہوں، شربت بھی رکھا ہے ویسے کا دیا، پڑے پڑے گرم نہ ہو گیا ہوگا۔ خاک مزہ دے گا"

"یہ بات نہیں رانی، وہ بولے" ابھی پیے لیتا ہوں۔ ذرا کش لے لوں حقہ کے پھر تمہارے ہاتھ کی چلم، کش کھینچ کر بولے "آہا، کیا بڑھیا تمباکو بھری ہے تم نے، تمہارے ہاتھ تو ———" کہتے ہوئے رُک گئے؛ چندو ہنستا ہوا چلا گیا۔

——— (۳) ———

چندو دروازے کے آگے رُکا، تنگ گلی میں ایک چھوٹا مکان کس مپرسی کے عالم میں مکینوں کی مفلسی کی داستان دُہرا رہا تھا جوان بیٹی بیاہ کے لائق ہو چکی تھی، آمدنی محدود، خرچہ زیادہ، جے کشن خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے چندو جو کئی روز سے پھیرے کر رہا تھا ایسا جادو کیا کہ بیچارے کشن تو ہاں کہتے ہی بنی، دل سکھ کی امارت کی کہانی بھولنے والی چیز نہ تھی۔ رہیں اُن کی پہلی بیویاں چندو نے ان پر چالاکی کا پردہ ڈال دیا۔ کسی کے متعلق کہا کہ وہ بانجھ تھی اس لیے اُسے نکال دیا گیا کسی کو بدچلن بتلایا، اس کی دروغ گوئی نے چاروں کو ٹھکانے لگا دیا، شادی کے سارے خرچ کا ذمہ لیا۔

جے کشن اس سے پیشتر دو جگہ سے مایوس ہو چکے تھے، کیونکہ لوگ جہیز کے علاوہ نقد روپیہ بھی مانگتے تھے، یہ جے کشن کے

افسانہ

یہ شمعیں [illegible] دو

(اختر جہاں صاحبہ)

تم بے خبر ہو گئیں!

آج تمہارا اسیم موت کی گردن میں اپنے بازو حمائل کر رہا ہے۔ آؤ اور زندگی سے ملاپ کرا دو۔ تم نے پہلے بھی کئی بار میرا ہاتھ زندگی کے ہاتھ میں دے کر مسکرانے پر مجبور کیا ہے۔ لیکن اس وقت تم بے بس ہو مجبور ہو۔ میرے قلم کی پکاریں تمہارے کانوں میں اس وقت پہنچیں گی جس وقت زندگی کا آخری سانس بھی مجھ سے جدا ہو چکا ہوگا۔ ۔ ۔ تم بے اختیار چیخ پڑو گے میری زندگی کو جھنجھوڑ ڈالو گے۔ ۔ پھر مجھے کیا! میں خود بھی نہیں چاہتا کہ یہ لڑکھڑا کر گرنے والی زندگی تمہاری ہمدردی کا سہارا لے۔ ۔ آج تو مجھے ایسے ظالم ہاتھوں کی ضرورت ہے جو مجھے بے بس کر کے یہ زہر کی شیشی حلق میں انڈیل دیں۔ جس طرح بچوں کو دوا پلاتے ہیں۔ تم اتنا کرم کر سکتے ہو؟ کبھی نہیں۔ ۔ تم تو گدگدا دو گے مجھے لتاڑ دو گے "پاگل!! زندگی سے اس طرح دُم دبا کر بھاگتے شرم نہیں آتی؟ بُزدل!!" سچ مانو میں بزدل نہیں ہوں کبھی تمہیں کیا پتہ! میں زندگی کے دروازے سے کئی بار دھتکار پھٹکار کھا کر پھر اس کے بازوؤں میں چلا گیا ہوں۔ اس ناسمجھ بچے کی طرح جو ماں کا طمانچہ کھا کر اُسی کی گود میں روتا روتا سو جاتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ میں بچے کی طرح نہیں اس فقیر کی طرح دھتکارا گیا ہوں۔ جس کی غیرت دھتکار کے بعد پھر اس دروازے کا رُخ نہیں کرتی۔ ۔

میں جانتا ہوں تمہیں مجھ سے بے حد محبت ہے۔ تم مجھ پر جان چھڑکتے ہو۔ ایک مرتبہ جب ہم ندی کنارے ٹھنڈی چھاؤں میں پڑھنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ میں تمہاری محبت کا امتحان کرنے کے لئے اچانک روپوش ہو گیا۔ تم پڑھنے کے دھیان میں تھے۔ جب میں بہت دیر تک نہیں آیا تو تم پریشان ہو کر مجھے پکارنے لگے۔ میں ندی میں نہاتے نہاتے ایک ٹاپیان کے پیچھے چھپ گیا اور ندی کی لہروں پر صرف میری قمیص تیر رہی تھی۔ تم سمجھے مجھے کوئی دریائی جانور ہڑپ کر گیا۔ کیونکہ اس ندی میں کبھی کبھی مگرمچھ وغیرہ آیا کرتے تھے۔ ۔ میری قمیص دیکھ کر تمہیں یقین ہو گیا کہ میں کسی مگرمچھ کے ہاتھ پڑ گیا ہوں۔ کئی گھنٹے کی مسلسل تلاش کے بعد تم بھی بد دل ہو کر ندی میں کود پڑے اور خود کو لہروں کے سپرد کر دیا۔ گویا تم میرے بعد زندہ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ پھر میرے برآمد ہونے پر تمہارا اچھلنا اور پھر مہینوں روٹھے رہنا۔ اسی قسم کے بہت سے قصے تمہاری بے [illegible]ت محبت کا ثبوت ہیں۔ ۔ آج سے چار پانچ سال پہلے تم میرے لئے زہر تک مر سکتے تھے۔ لیکن اب تمہارے بچے تم سے وابستہ ہیں۔ تم امیدوں میں گھرے بیٹھے ہو۔ میں تمہیں اس گلشن سے لوٹ آنے کی دعوت نہیں دوں گا میں مطمئن ہوں کہ تمہارے آنسوؤں کے لئے مسکراہٹوں کی آغوش وا ہے۔ میرے لئے روئے تو امیدیں گدگدا دیں گی۔ آرزوؤں کے سینکڑوں رومال تمہارے آنسو خشک کرنے کے لئے بڑھ جائیں گے۔ اور میں؟ میرے لئے تمہاری ہمدردی ناکافی ہے میں تمہاری محبت پر قانع نہیں ہوں۔ مجھے بہت کچھ پانے کی ہوس تھی۔ لیکن نہ پا سکا۔

تم چونک پڑو گے میں نے اپنی واحد ہمدردی کو اپنے ہی ہاتھوں موت کی نیند سلا دیا ہے۔ وہی صبیحہ جس کی آنکھوں نے کئی مرتبہ میرے لئے موتی جھلکائے۔ ۔ "بھیا" اس نامکارس پینے کے لئے ہر وقت میرے کان بے چین رہتے تھے۔ رضیہ کی دائمی جدائی کے بعد جب پہلی بار اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ آنکھیں اور پیشانی تو جیسے کھوئی رضیہ کی مجھے مل گئی۔ میں ان نقوش کے قریب تر پہنچنا چاہتا تھا جیسا کہ رضیہ کے قریب رہتا تھا۔ لیکن جھجک نے ہمیشہ دور دور رہنے پر مجبور کیا۔ ان کا اور ہمارا باغیچہ ایک تھا۔ جہاں میں نے بلی کی "میاؤں" سنی اور کھیل چھوڑ کر باہر آ جاتا۔ صبیحہ کی بغل میں ہر وقت ایک سفید بلی رہا کرتی اور اسی کی "میاؤں" صبیحہ کے باغیچے میں آ جانے کا اعلان کرتی تھی۔ میں نے کئی بار اسے پھولوں جیسی تتلیاں پکڑ کر دیں لیکن وہ تتلی پا کر اس قدر خوش ہوتی کہ میرے اس احسان پر شکر گزار ہونا تو کجا بات بھی نہ کرتی۔ ایک دن تو میں اس قدر جھنجھلایا کہ ابا میاں سے شکایت کر دی "واہ میاں واہ! ابھی بلاتا ہوں صبیحہ کو بھلا کیوں نہیں بولتی تم سے!" اتنے میں اتفاقاً صبیحہ کی بلی ہمارے برآمدے میں آ گئی صبیحہ کو بھی اس کے پیچھے آنا پڑا۔ "اے بی گڑیا ذرا یہاں تو آؤ" صبیحہ بلی کو بغل میں دبائے بلا جھجک چلی آئی۔ سلام کیا اور نیچی نظریں کر لیں۔

"ہم دونوں کھیلا کیوں نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ ؟"

"ہم اب کھیلا کریں گے۔ یہی ضرور کیا کرتے ہیں" صبیحہ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ میں نے چپکے سے ابا میاں کے کان میں کہہ دیا کہ "ان میں رضیہ کی شبیہ تو ہے"

انہوں نے صبیحہ کو نظر بھر کر دیکھا اور ٹھنڈا سانس لے کر اخبار اٹھا لیا۔

میں بعد میں خود پر جھنجلایا بھی کہ میں اب تک صبیحہ سے دور دور کیوں رہا۔ صبیحہ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ ہم دونوں چند گھنٹوں میں گھل مل گئے۔ اور جب میں نے اسے بتایا کہ میری بہن رضیہ ہمیشہ کے لئے سو گئی ہے تو وہ بھی میرے ساتھ آبدیدہ ہو گئی۔ اس کا بھی ایک چھوٹا سا بھائی چھ سات ماہ کا ہو کر اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ صبیحہ کو بہت یاد آتا تھا۔ اس نے سسک سسک کر کہا کہ اگر وہ ہوتا تو اس سے بہت محبت کرتا اور جاوید بھیا تو دھمکایا کرتے ہیں۔ ہم دونوں بہت دیر تک روتے رہے اور پھر اچانک مسکرا دیئے۔ صبیحہ کہہ رہی تھی۔

"تم مجھے رضیہ سمجھا کرو"

"رضیہ!" میرے دل میں ننھے ننھے خنک دھارے پھوٹ نکلے۔ "اور تم مجھے فرید بھیا کہا کرو۔" ہم دونوں بہت دیر تک مسکراتے رہے۔"

صبیحہ کی امی بی مجھ سے بہت محبت کیا کرتی تھیں جب انہوں نے یہ سنا کہ میری امی مجھے دو سال کا چھوڑ کر چل بسی تھیں تو انہوں نے اپنے پاس بلا کر لٹا لیا۔ بڑی دیر تک سمجھاتی رہیں۔ ان کے کپڑوں میں کچھ عجیب سی مہک آ رہی تھی۔ غالباً ایسی خوشبو ہر ایک ماں کے پاس سے آیا کرتی ہے۔ میں اکثر ان کے کپڑے سونگھا کرتا تھا۔

صبیحہ کی بڑی بہن صفیہ بڑی جھلی اور مغرور تھیں۔ وہ کھلے بندوں کہا کرتی تھیں "مجھے بچوں سے نفرت ہے! اور آج کل کے بچے توبہ توبہ!!" دانت پیس پیس کر ہمارے پیچھے دوڑتیں۔ ان کے کام میں ذرا مخل ہوئے اور انہوں نے گھورا۔ ایسی نظروں سے گھورتی تھیں کہ ہمیں اپنی نظریں جھکاتے ہی بن پڑتا۔

"اگر انہیں ہم سے نفرت ہے تو ہم بھی کیوں نہ ان سے نفرت کیا کریں" میں نے صبیحہ سے مشورۃً کہا۔

"لیکن کس طرح کیا کریں؟"

"ہمیں بھی ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ گستاخانہ ۔ ۔ ۔ [illegible] تو ہم بیزار ہو جایا کریں۔ اور کبھی موقع دیکھ کر منہ بھی چڑا دیا جائے۔"

چنانچہ ہمیں یہی رویہ اختیار کرنا پڑا۔ ایک دن ان کی اچھی اچھی کتابیں چپکے سے حوض میں پھینک دیں۔ ان کو پانی پر تیرتے دیکھ کر ہم دونوں تالیاں بجا رہے تھے صفیہ آپا پیچھے سے آگئیں۔ پوچھنا تو ضرور نہیں کہ پھر ہمارا کیا حشر ہوا، صرف حرکت ہی نہیں بلکہ ایک واقعے نے تو میرا دل ان کی طرف سے بالکل کھٹا کر دیا۔ جو غالباً انہوں نے انتقاماً کیا تھا۔

ابا میاں کے کہنے سے ہم دونوں رات کو ان سے تھوڑا بہت پڑھ لیا کرتے تھے ایک دن میں نے ان سے ایک لفظ کا مطلب پوچھا وہ لفظ تھا "گفت و شنید" بڑی سنجیدگی سے بولیں "اس کا مطلب ہے تمہارا سر"

میں مطمئن ہو گیا کہ یہی مطلب ہوگا اس دن ماسٹر صاحب نے ہم سب لڑکوں سے اس لفظ کا مطلب پوچھا۔ میں نے فوراً اٹھ کر کہا "تمہارا سر"

"شاباش شاباش!!" انہوں نے دانت پیس کر کہا غالباً وہ اسے میری شرارت سمجھے لہذا "مرغا" بننے کے علاوہ گھنٹہ بھر مسلسل کھڑا رہنا پڑا۔

مجھے صفیہ آپا پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا صبیحہ بھی جز بز ہو رہی تھی۔ اس کے سمجھانے بجھانے سے طبیعت ٹھنڈی ہوئی لیکن میں نے ان سے کبھی نہ بولنے کا قصد کر لیا تھا۔

جاوید بھیا بھی صفیہ آپا سے نالاں تھے اور ہر وقت انہیں رلانے کے لئے تازہ تازہ تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ اسی دن شام کو انہوں نے مجھے ایک تصویر دے کر ہدایت کی کہ اسے صفیہ آپا کی میز پر سجا دوں تصویر قلمی تھی جس میں ایک حجام کی سجی سجائی دوکان دکھائی گئی تھی۔ حجام استرا ہاتھ میں پکڑے تیار کھڑا تھا اور کرسی پر ایک، ملا ٹائپ صاحب معہ داڑھی مونچھوں کے نہایت اداس بیٹھے حجام سے اس طرح مخاطب تھے

وہ کہتی ہیں مذہب کی باتیں بھلا دیں ؎

حجامت کریں داڑھی مونچھیں منڈا دیں

یہ شعر پڑھ کر میں سب کچھ سمجھ گیا جن صاحب سے صفیہ آپا کی نسبت طے ہو چکی تھی۔ وہ شروع سے مذہبی رنگ میں تو رنگے

کچھ ہنستے تھے۔ اب کچھ دن سے چہرے پر استرے کا "ہل" چلا کر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ حسب امید داڑھی مونچھوں کی کھیتی خوب لہلہا رہی تھی جسے آپا انہیں ناپسند کرتی تھیں۔ دوسرے دن صبح وہ ہمیں باغیچے میں نہایت اداس بیٹھی ملیں۔ ہم چپکے چپکے منہ چھپا چھپا کر مسکرا رہے تھے اور وہ بے طرح گھور رہی تھیں۔

ایک دن صبیحہ قمیص شلوار پہنے اور دوپٹہ اوڑھے نہایت معصومیت سے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ارے!" میں نے اسے اس لباس میں پہلی بار دیکھا تھا۔

"امی کہہ رہی تھیں اب فراکیں مت پہنا کرو۔ تم بڑی ہو گئی ہو۔ میں سچ مچ بڑی ہو گئی ہوں بھیا؟" صبیحہ نے بھولے منہ سے پوچھا۔

"اور کیا" میں نے اسے پہلی بار نظر بھر کر دیکھا "اچھی خاصی اونٹنی ہوتی جا رہی ہو۔"

"اور تم؟!! . . ." وہ کہتے کہتے رک گئی اور منہ پھلا لیا۔

"ہاں ہاں کہہ دو میں بھی اونٹ ہوتا جا رہا ہوں۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔ "بدتمیز" مجھے سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔

"ہم نہیں بولیں گے تم سے! ہم تو بدتمیز ہیں نا!" صبیحہ نے روٹھے لہجے میں کہا۔

"اچھا بابا مت بولنا بخشو!" میں نہ جانے کیوں اس سے بیزار سا ہو رہا تھا۔

صبیحہ چپ چاپ چلی گئی۔ اور میں نے بے پروائی سے اخبار اٹھا لیا۔

اسی شام کو خبر ملی کہ صبیحہ کی بلی بیمار ہے۔ میں عیادت کو جانے ہی والا تھا کہ غریب بلی چل بسی۔ میں یہ روح فرسا خبر سن کر بھاگا بھاگا صبیحہ کے پاس گیا۔ وہ مسہری پر بیٹھی تکیے سے لپٹ کر سسک سسک کر رو رہی تھی۔ غالباً بلی کو سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔

"ارے اتنی سی بلی کے لئے؟ . . ." لاحول ولا قوۃ۔ ارے بھئی اٹھو منہ ہاتھ دھو ڈالو۔ دیکھو نا اس دنیا میں کون رہے گا جو غریب بلی رہ جائے۔ ایک دن ہم بھی بلی کی طرح چل بسیں گے۔" میں نے دنیا کی بے ثباتی پر اچھی خاصی جاندار تقریر کر ڈالی۔ خدا خدا کر کے صبیحہ کے آنسو تھمے۔ اور ایک دن پھر ہم ایک ساتھ کھیل رہے تھے۔

کچھ دن سے میں دیکھ رہا تھا کہ صفو آپا ہماری ہر حرکت پر جاسوس جاسوسی نگاہ رکھتی ہیں۔ غالباً انہیں صبیحہ کا اور میرا میل جول کھٹکنے لگا تھا۔ اس روز جو میں اسے آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے بلانے گیا تو صفیہ آپا چیخ کر پیچھے پڑ گئیں۔ "نہیں آئے گی صبیحہ اسے ابھی اور بھی کام ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے کھیلتے شرم نہیں آتی۔" میں اپنا سا منہ لے کر چلا آیا۔ آج پہلی بار بڑے پن کا خیال کھٹک رہا تھا۔ میری آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ میں نے رضیہ کی تصویر نکالی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یونہی روتے روتے میرا سر میز پر ٹک گیا۔

"بھیا!" نیند کے سنہرے تانے بانے اس آواز کے ٹکراؤ سے چرمر ہو کر رہ گئے۔

"صبیحہ!" میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ صبیحہ کی آنکھوں میں دو آنسو ٹپک جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

"تم رو رہی ہو؟" میں نے مصنوعی تعجب سے پوچھا۔

"ہاں" صبیحہ نے سچ سچ بتا دیا۔

"اور تم؟" رضیہ کی تصویر پر میرے آنسو موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔

"ہاں میں بھی رو رہا تھا" میں نے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔ جھوٹ بولنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ "آج مجھے صفو آپا نے خوب ڈانٹا اور یہاں آنے کے لئے منع کر دیا۔ امی بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں . . . میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب میں یہاں نہ آؤں گا۔ لیکن رہا نہیں گیا۔" مجھے یقین تھا کہ تم افسردہ ہو گے . . .

اور وہی ہوا" صبیحہ رک گئی اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی "میں نے کہا تھا کہ وسیم بھیا مجھے رضیہ کی جگہ سمجھتے ہیں۔ تو طنز سے مسکرا کر بولیں بڑے آئے تمہارے وسیم بھیا وکالت کی ضرورت نہیں! سب بہنیں ہی سمجھا کرتے ہیں۔ کیا وہ سچ کہتی ہیں بھیا؟" صبیحہ کی نظریں مجسم استفسار بن کر میری طرف اٹھ گئیں۔

"نہیں صبیحہ وہ جھوٹ کہتی ہیں۔ تم میری حقیقی بہن کی طرح ہو . . . وہ نہیں سمجھتیں تو نہ سمجھیں" میں نے آہستہ سے کہا۔ میری آواز غم کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ ہماری بے لوث محبت پر صفیہ آپا کی طنزیہ جراحت میرے کچوکے لگا رہی تھی۔ دل بھر آیا۔ صبیحہ نے گہرا سانس لیا۔

"اچھا میں جاؤں؟"

"ہاں ہاں جاؤ" میں نے سنبھل کر کہا۔

رہا تصوّر سے!

(جناب حجاب بنارسی صاحب)

خواب رنگین محبت کا دکھایا کیوں تھا؟
میری خوابیدہ اُمنگوں کو جگایا کیوں تھا؟
رازِ جینے کا مجھے تو نے بتایا کیوں تھا؟
چار دن کے لیے طوفان اُٹھایا کیوں تھا؟

یاد رہ رہ کے مجھے آتے ہیں وہ خوابِ جمیل!
تھے کبھی کعبۂ دل کے لیے تم میرے خلیل!
کیا خبر تھی کہ کرو گے نہ وفا کی تکمیل!
قصّۂ دردِ جگر مجھکو سُنایا کیوں تھا؟

میں تو واقف ہی نہ تھی رسمِ جہاں سے ہمدم!
زندگی صرف تبسّم تھی! — محبت کی قسم!
چھیڑ کر تم نے میرا ربطِ ہستی اس دم!
گیت اک پریم میں ڈوبا ہوا گایا کیوں تھا؟

نغمۂ عشق سے معمور تھی یہ ساری فضا!
غنچۂ دل کو مرے چھیڑتی تھی بادِ صبا!
سوز سے کس لیے تم نے مجھے آگاہ کیا!
دل کو آتش کدۂ شوق بنایا کیوں تھا؟

داغ جب اپنی جدائی کا لگانا تھا تمہیں!
شمع کی طرح مجھے روز جلانا تھا تمہیں!
ہائے تا زیست اگر یوں ہی رولانا تھا تمہیں!
ربط مجھ بخت کی ماری سے بڑھایا کیوں تھا؟

اب بھی تجدیدِ محبت کی خدارا کر لو!
اس طرح دردِ محبت کا مداوا کر دو!

غزل

(جناب [illegible] صاحب [illegible] اکبرآبادی)

چارہ فرمائی یہ کیسی تھی تری کیا ہوگیا — چارہ گر اب اور دل میں درد پیدا ہوگیا

ہر تماشائی بجائے خود تماشا ہوگیا — ذرہ ذرہ میں ترا جلوہ ہویدا ہوگیا

بے سبب تکرار کی اب کوئی گنجائش نہیں — ایک چھوٹا دل تو دے چکا میں تم کو، سودا ہوگیا

نوجوانی لٹ گئی، ساری امنگیں مٹ گئیں — چاندنی دو چار دن کی تھی اندھیرا ہوگیا

کچھ زیادہ ہو گئی ہے اور بھی دل کی جلن — پھوٹ کر کچھ اور میرے دل کا چھالا ہوگیا

اپنی پیشانی کو سمجھا کامیاب بندگی — نقش پائے یار پر حاصل جو سجدا ہوگیا

تم نے ٹھکرا کر اسے اب بخش دی معراج عشق — مرتبہ جاکر تمہارے دل کا بالا ہوگیا

موت نے فوراً سنبھالا آ کے راہِ شوق میں — ناتوانی میں مجھے حاصل سہارا ہوگیا

عشق بے آواز کی آواز سن لی خلق نے — جس قدر ہم نے چھپایا اور چرچا ہوگیا

کیا کرے تعریف کوئی بے خودیٔ شوق کی — ایک جذبہ تھا جو دل میں کارفرما ہوگیا

اور کیا ہے منظرِ ہستی فنا کی کا وجود

[illegible] چار دن کے واسطے آ کر تماشا ہوگیا

بکھرے ہوئے تاثرات کا تصوّر

(جناب سیّد محمد مثنیٰ صاحب رضوی بی۔ اے)

وہ پھر مجھ کو رہ رہ کے یاد آرہے ہیں
نگاہوں میں میری بسے جا رہے ہیں

وہ معصوم چہرہ وہ بھولی ادائیں — وہ برقِ تبسم وہ کالی گھٹائیں
اور ایسے میں میرے تخیل کی حسرت — کوئی لے لے بڑھ کے بس اُن کی بلائیں
وہ پھر مجھکو رہ رہ ....

....

نگاہوں میں پیغامِ اُلفت کسی کا — نہیں بھولتا جامِ عشرت کسی کا
نظر میں ہیں رقصاں محبت کی راتیں — وہ یاد آگیا وقتِ رخصت کسی کا
وہ پھر مجھکو رہ رہ ....

....

وہ دَورِ محبت کی راتیں سُہانی — وہ پیمانِ اُلفت کی رنگیں کہانی
غمِ زیست میرا بڑھاتی ہے آکر — وہ سِمٹی ہوئی میری یادِ جوانی
وہ پھر مجھکو رہ رہ ....

....

وہ دورِ مسرت وہ آہوں پہ آہیں — وہ دورِ محبت کی ہلکی کراہیں
یہ سب جس میں حاصل ہوا ہے جذبۂ دل — زمانہ وہی ڈھونڈتا ہے نگاہیں
وہ پھر مجھکو رہ رہ ....

....

جدائی کی بابت وہ مبہم اشارا — وہ آنسو کے قطرے وہ دامن تمھارا
کرم کر بس اے یادِ رفتہ کر کچھ بھی — نہیں اب رہا ضبط کا مجھکو یارا
وہ پھر مجھکو رہ رہ ....

....

حسنِ برہم

(شہاب ملیح آبادی)

محبوبِ خوش خرامے، خوش فہم و خوش بیانے
روٹھا ہوا چلا ہے، مانا نہ بے وفا نے

وہ حسنِ سادہ لوحی، اُس پر یہ بدگمانی
یک خندۂ نمیدنے بر وضعِ آسمانے

گل رنگ و گل فروشے، گلفام و گل نژادے
قندِ لبِ سلیمیٰ، عکسِ مہِ کنعانے

ابرِ صدف نوازے، موجِ گہر بپاسے
عطرِ شمیمِ رقصاں، مطبوعِ گلستانے

آنکھوں میں موجِ بادہ، بادہ حیات پرور
تاثیرِ صد صبوحے، شادابِ ضوفشانے

رفتار میں ترنم، گفتار میں تبسم
گلبانگِ مرغزارے، طوفانِ بے کرانے

تنویرِ آفتابے، تصویرِ ماہتابے
قندیلِ روزگارے، فانوسِ صد زمانے

تقدیر کا صحیفہ، تدبیر کا ارادہ
پیغامِ دل نوازے، تفسیرِ دو جہانے

گیتی کا ماہ پارا، صنوبرِ ضوفروشے
تعبیرِ خوابِ عالم، کشفِ رموزِ جانے

شیریں کلام جس کا فطرت کو چھیڑتا ہے
افسانۂ حقیقت، افسونِ دل ستانے

گاہے متاعِ زریں سود و زیاں یہ دامن
گہ جنسِ زرنگارے، نے سود نے زیانے

چلتی ہوئی حقیقت، مُڑتا ہوا زمانہ
نورُستۂ، نودمیدہ، نوخیز و نوجوانے

بہتی ہوئی جوانی، رکنے میں بھی روانی
زیر و زبر ہیں جس میں کھولے ہوئے فسانے

کاکل کی برہمی میں، وہ رنگ زہر افگن
پلکوں کے سلسلے ہیں، صد تیرِ بے کمانے

آئی کبھی جماہی، ہاتوں سے لب کو چھونا
بہکا دیا نظر نے، سمجھا دیا حیا نے

جنبش کبھی بدن میں، آنچل کبھی ہوا پر
چھیڑا کبھی ہوا کو، چھیڑا کبھی ہوا نے

صد حیف وہ ستمگر پہلو سے ہے روانہ
کچھ بات ہو تو پوچھیں، قصہ ہے کیا نہ جانے

کھلتا نہیں ہے روئے مقصودِ زندگانی
بے نغمہ زمانے، بے جلوۂ مکانے

ہر لمحہ بے کلی میں، اک خار بن گیا ہے
مرغِ شکستہ پر ہے بے شاخِ آشیانے

نادم نہیں ہے اب بھی، اپنے وہ اس کیے پر
کم بخت دل نہ مانے، مانے کبھی زمانے

آئینِ دلدہی ہیں، دستورِ عاشقی ہیں
چلتے نہیں ہیں حیلے، جچتے نہیں بہانے

من صورتِ حریفاں تیر و کماں نہ دارم
فصلے بس است ایں جا، از یارِ بدگمانے

ہر مسئلہ خودی کا حل ہو چکا ہے لیکن
عقدہ مرے جنوں کا کھولا نہیں خدا نے

کب تک رہیں گے سرکش آدابِ خسروانہ
سلطاں کے روبرو سر خم کر دیا گدا نے

گیت

(جناب نعمان صاحب تاثیر)

کلی کلی مُسکائی
پھولوں کی رت آئی — ڈال ڈال منڈلائے بھونرا
پیوے ہو کر مست مدھورا
پیاسا ہے من بھی مورا
نظر نظر للچائی ——— کلی کلی مُسکائی
پھولوں کی رت آئی

قدم قدم پر ہے ہریالی
جھوم رہی ہے ڈالی ڈالی
کدھر گیا موئے من کا مالی
گھور اداسی چھائی ——— کلی کلی مُسکائی
پھولوں کی رت آئی

بجلی چمکے بادل گرجے
رم جھم رجھم میہا برسے
اُس بن اپنا جیارا ترسے
ہر آشا مرجھائی ——— کلی کلی مُسکائی
پھولوں کی رت آئی

کیوں یہ ہوائیں چنچل آئیں
کیوں یہ پپیہے شور مچائیں
من میں اور اک ہوک اٹھائیں
سانسیں ہیں گھبرائی ——— کلی کلی مُسکائی
پھولوں کی رت آئی

آہا ہردے کے داتا
چھوٹ چلا ہے جیون ناتا
کیوں اس رت میں ہے تڑپاتا
ڈستی ہے تنہائی ——— کلی کلی مسکائی
پھولوں کی رت آئی

فنکار

(از نور بجنوری)

آج پھر اے بے کسی میں نے یہ کھائی ہے قسم

چھین لوں گا اپنی فطرت سے محبت کی کرن
پھونک دونگا اپنے خوابوں کا نشیمن آگیں چمن
قلبِ وحشی کو سکھاؤنگا نئے عریاں چلن

پستیوں کی سمت ہی آخر اٹھاؤں گا قدم
آج پھر اے بیکسی میں نے یہ کھائی ہے قسم

چاندنی راتوں میں چھیڑیگا نہ اب مجھکو جنوں
اب نہ دوڑے گا ستاروں میں مرے نغموں کا خوں
چاہیئے مجھکو سکوں قبروں کا پُرہیبت سکوں

رائگاں کبتک مری شہنائیوں کا زیر و بم
آج پھر اے بیکسی میں نے یہ کھائی ہے قسم

اب پیوں گا میں نہ ہرگز رفعتوں کے نام پر
موت کا عفریت ہے سایہ فگن اس جام پر
خم لنڈھانے ہیں مجھے اب آ کے سطحِ عام پر

چاہے گھٹ ہی جائے میری انفرادیت کا دم
آج پھر اے بیکسی میں نے یہ کھائی ہے قسم

اب محبت کے شوالے کو گرایا جائے گا
ایک ظالم دیوتا کا منہ چڑایا جائے گا

فلمی خبریں

لبرٹی پکچرز ۔ یہ نیا فلم ساز ادارہ وجود میں آیا ہے
بمبئی کی فلمی کمپنی ... کے معروف ڈائرکٹر مسٹر ایس آئی
حسن ہیں جو پہلی تصویر "انوکھا راز" پیش کریں گے۔ مسٹر حسن
... شوٹنگ میں منہمک ہیں۔ "انوکھا راز" کی کہانی اور مکالمے
مسٹر حسن ہی کے زور فکر کے ممنون ہیں۔ گانے آسد گورکھپوری
نے لکھے ہیں۔ ستاروں میں ممتاز علی کے کیلاش، مراد، مایا دیوی
... اور ایک نیا انجم موسوم بہ شہناز اس تصویر میں جلوہ گر ہیں۔

... آرٹ پروڈکشنز بیادگار علامہ اقبال مرحوم۔ یہ نیا فلمی ادارہ لاہور سے طلوع
ہوا ہے۔ سنا ہے اس کی پہلی پیش کش "آنے والا دور"
ہندوستان کے سیاسی عقدے کا ایسا حل ہوگا جو چالیس کروڑ
افراد کے دلوں کو موہ لے گا۔ آمین
اِس فلم کی آمدنی کا کچھ حصہ اقبال میموریل فنڈ اور کچھ ...
... فلاح کے لیے وقف ہوگا۔ اِس ادارے کے بانی ایم عبداللہ
سندھی کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہماری دُعا ہے اُن کے
... بہ ہمہ وجوہ مشکور ہوں اور اُن کا ادارہ کانِ نمک کی
... سے محفوظ رہے۔

بنگالی فلمی اخبار والوں کا اندازہ بنگال کے فلمی اخبار والوں
... ایسوسی ایشن کی رائے میں ۱۹۴۳ء کی بہترین فلم بہ لحاظِ
... اسکرین پلے، فوٹوگرافی، صدا بندی وغیرہ
... شانتارام کی تصویر "شکنتلا" ہے۔ جو دہلی میں
... بھی چل رہی ہے۔ اِس ایسوسی ایشن کا پہلا انعام دی
شانتارام کو ملا ہے جس کے لیے ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں۔
... سال میں بہترین موسیقی کا انعام امیر علی دالی "ہپتا" کو
... گیا ہے اور ایکٹرسوں میں اسی کمپنی (نیو ٹاکیز چترا بھٹ) کی

ہیروئن گیتا ... (بیوہ) سے ... مہاراج (دیوداسی) کا پریم ... تصور کیا گیا ہے۔

آزاد پکچرس آزاد پکچرس کی پہلی پیش کش ... عنوان انوکھی تصویر ہے۔ یہ ایک ایسے
شخص کی کہانی ہے جو اکلِ حلال پر جینا چاہتا ہے، لیکن ناساز
گار حالات اُسے شراب اور قمار بازی کی طرف لے جاتے ہیں۔
کہانی مسٹر بلونت بی، ڈیو کے زورِ فکر کا نتیجہ ہے۔
مِس دلاری (چہرۂ نو) کو ہیروئن کا پارٹ دیا گیا ہے،
اِس کے علاوہ دنیائے فلم کے مشہور ستارے بھیم، دلاور،
نیلم، حبیب اور حیدر راشیکھر وغیرہ اِس میں کھیل کے جوہر دکھا
رہے ہیں۔
مکالمے پرکاش کے شہرت یافتہ پنڈت لوج نے
اپنے مخصوص انداز میں لکھے ہیں۔ ہدایت کاری جب
مسٹر بلونت، بی ڈیو ایسے ہدایت کار کے سپرد ہوگی تو اُس تصویر کی
کامیابی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اِس تصویر کے مشتہر میسرز
دار پبلیشرز لاہور ہیں۔

فضلی فلمز فضلی فلمز کی تازہ ترین تصویر "مہندی" تکمیل کے
مراحل طے کر چکی ہے۔ "مہندی" کے ڈائرکٹر
مسٹر سبطین فضلی ہیں۔ جن لوگوں کو شوٹنگ دیکھنے کا موقع ملا ہے
وہ اُمید افزا بیان دے رہے ہیں کہ "مہندی" بہت کامیاب
تصویر ثابت ہوگی۔

تاج محل پکچرز نئی تصویر "ملاقات" تکمیل کی جانب تیز
قدم اُٹھا رہی ہے۔ اِس تصویر کی کہانی
کا سہرا منشی دل لکھنوی کے سر ہے۔ تان سین کے شہرت
یافتہ میوزک ڈائرکٹر "ملاقات" کی بھی میوزک ڈائرکشن کر رہے
ہیں۔ ستاروں میں نسیم بانو، پریم ادیب، شاہ نواز،
راما شکل اور ممتاز علی وغیرہ نمایاں شخصیتیں ہیں۔

پنچولی آرٹ پکچرز لاہور ۔ پنچولی آرٹ پکچرز کی آئندہ
فلم کا نام "پت جھڑ" رکھا گیا ہے۔ اس کی ہدایت کاری کے
فرائض ر. د. نیدر و دے سر انجام دینگے۔ اس کا افسانہ مکالمے

...وں ایں، مدھوک کے زیرِ ہدایت ... شوٹنگ جلد ہی شروع ہو جائے گی۔

ہندوستان کا پہلا مکمل موسیقی ریز شاہکار

ولسکہ۔ ایم۔ پنچولی ہندوستان کی سب سے پہلی مکمل موسیقی ریز فلم کا افسانہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس کی موسیقی "خزانچی" اور "خاندان" کے شہرت یافتہ ماسٹر غلام حیدر کے سپرد ہوگی۔

پنچولی آرٹ پکچرز لاہور

مینا پر قاتلانہ حملہ۔

چند دن ہوئے پنچولی کے اداکار ارشاد نے مینا پر قاتلانہ حملہ کر دیا جس سے سارے مسلم ٹاؤن میں سنسنی پھیل گئی۔

اس حادثہ کے واقعات یوں بیان کئے جاتے ہیں

جوں ہی مینا ارشاد کے کمرہ میں داخل ہوئی ارشاد نے اس پر ... گلاسوں اور کمرہ میں پڑی ہوئی دیگر چیزوں کی بوچھار شروع کر دی۔ اور اس پر بھی اس کی تسلی نہ ہوئی تو وہ ایک دم مینا کے حلق پر جھپٹا۔ مینا کی چیخ پکار سارے اسٹوڈیو اور اردگرد کے رہائشی علاقہ میں بخوبی سنائی دیتی تھی۔ اتنے میں میک اپ لگے ہوئے اجمل فوراً مینا کی مدد کے لیے پہنچا۔ موقع پر ایک زبردست ہجوم جمع ہو گیا۔ اس شور وغل کے درمیان ہدایت کار برکت مہرہ کی آواز "کٹ" سنائی دی جس سے لوگوں کو پتہ چلا کہ معاملہ تشویشناک نہیں ہے بلکہ یہ صرف ولسکہ پنچولی کی فلم "شہر سے دور" کے ایک منظر کی شوٹنگ تھی۔

فلمی چہل پہل

(ہمارے نامہ نگار بمبئی کے قلم سے)

رنجیت کا جشنِ صد سالہ، اِدھر دو ماہ کا سب سے اہم فلمی واقعہ ہے۔ رنجیت وہ تنہا فلم ساز ادارہ ہے جس نے سو سال میں سو بہترین تصاویر پیش کی ہیں۔ رنجیت کا اس باب میں کوئی حریف نہیں دیگر ادارے مل کر بھی اتنی تصاویر اور سب اپنی جگہ چست ... نہیں کر سکتے۔ چندو لال شاہ اور گوہر کی مساعی کے سر سہرا ہے۔ اس موقعہ پر تحائف ایڈریس اور مبارکبادیاں چاروں طرف

سے دونوں کے سروں پر برس رہی تھیں۔

اس ماہ کی سب سے زیادہ قابلِ افسوس خبر یہ ہے کہ فلمی کارسازیوں میں جمود پیدا ہو گیا ہے اور تصاویر کی تیاریاں معرضِ التوا میں پڑ گئی ہیں، کیونکہ کچے مال میں شدید کمی پیدا ہو گئی ہے۔ خصوصاً منفی تصاویر کا (Negative) کوڈک کمپنی جو اس مال کی رسد کی خاص کارکن ہے، پرانے اور نئے پروڈیوسروں کی ضروریات پورا کرنے سے قاصر ہے۔ ڈوپونٹ اور انیسکو کے ایجنٹوں کے پاس مطلق مال نہیں ہے۔ اور بلیک مارکیٹ میں نیگیٹو (Negative) کی قیمت بارہ سو تا اٹھارہ سو فی ریل بڑھ گئی ہے۔ اور اس قیمت پر بھی ایک دو ریل سے زیادہ دستیاب نہیں ہوتیں۔ رسد کی تنظیم کے لیے ہندوستانی موشن پکچرز پروڈیوسرز ایسوسی ایشن (IMPPA) نے ایک سب کمیٹی بنائی ہے اور پروڈیوسروں سے آئندہ چھ ماہ کی ضروریات کے باب میں استفسار کیا ہے۔ کوڈک کمپنی اس اقدام سے متفق ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ ایسوسی ایشن ان مشکلات پر عبور حاصل کر لے گی۔ تاہم جولائی سے قبل قلتِ مال کا سدِ باب ہوتا نظر نہیں آتا۔ اور یہی صورت جاری رہے گی۔

فلمی کاروبار جو چند سیاسی اور فرقہ وارانہ اسباب کے تحت گر رہا تھا، پھر سنبھل گیا ہے۔ "شمع" اور "ماں باپ کی لاج" دونوں تصاویر پبلک میں مقبولیت کی نظر سے دیکھی گئیں۔ اپریل اور مئی میں جتنی تصاویر منظرِ عام پر آئی ہیں، ان دو سے زیادہ کسی کا گرمجوشی سے استقبال نہیں کیا گیا۔

والٹ ڈزنے کا نمائندہ اس وقت بمبئی میں ہے۔ اُسے والٹ ڈزنے کے کارٹون، بابتی کے اثرات و ردِ عمل کی بابت پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کی مخالفانہ روش کو وہ سمجھنے سے قاصر رہا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف کارندہ ہاری مصالح ہی اس امر کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تصاویر ہندوستانی میں پیش کی جائیں یا نہیں۔

تصویر "چالیس کروڑ" جو فرقہ وارانہ اتحاد کے ولولے سے معمور تھی۔ بمبئی میں فرقہ وارانہ کشیدگی کا ہدف بن گئی، مسلمانوں کی ایک جماعت، جو اس تصویر میں اپنے عقیدۂ تقسیمِ ہند پر ایک چوٹ سمجھی غیض و غضب میں آ گئی۔ پردے چاک کر دئے بنچیں توڑ پھوڑ کر

[illegible] مرتب کردی۔ یہی داستان [illegible]
[illegible] کی پیش کش [illegible] ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سینما کے
[illegible] کے دماغ عصبیت کا شکار ہوتے جا رہے ہیں اور وہ
[illegible] گیا ہے کہ پروڈیوسر اپنی تصویر پیش کرنے سے پہلے ہر وقتی
[illegible] سے سرٹیفکیٹ حاصل کیا کریں۔

حکومت کی تبدیلی سے نسبتاً بلیک مارکٹ کی گرم بازاری میں خشکی آچلی ہے اور بلیک مارکٹ ٹکٹ کی خرید و فروخت زائل ہو چکی ہے۔ اب سینما بین مقررہ قیمت پر ٹکٹ حاصل کر سکتا ہے۔ (اندازہ کیجیے' ڈاکٹر کوٹنس کی تصویر کے ٹکٹ پہلے شو پر سوا روپے کی جگہ بیس روپے تک فروخت ہو چکے تھے۔

"ایک کروڑ" سرمایے کا کاروبار فلمیشن میں داخل ہو رہا ہے۔ سینٹرل پکچرس۔ ڈسٹری بیوشن کا پہلا کاروبار اس رقم سے جاری کیا ہے جس کی شاخیں تمام دنیا میں قائم کی جائیں گی "چھایا" لوگ دوسرا ایک کروڑ کا ارادہ ہے' راے بہادر چنی لال کپور جن کے اشتراک سے' ڈیڑھ کروڑ کے سرمایے سے ایک کاروبار جاری کرنے والے ہیں' فلمستان اس کاروبار کی انتظامیہ مینجری کے فرائض انجام دے گا۔

نیو سوانی پکچرس' گریٹر بمبئی پکچرس' سیون آرٹس' سوارنا پکچرس اور شہزادہ پروڈکشنس جو دینا اور اُن کے برادر کا جاری کردہ ہے' نئے فلم ساز ادارے ہیں۔

پردے پر

آجکل تصاویر کی روانی میں وقت ایک جمود پیدا کر رہا ہے ایک متوسط تصویر چھ ہفتوں سے زیادہ نہیں چل پاتی۔ ادھر ماہ میں بمبئی کی پندرہ تصویریں نکل کر منظرِ عام پر آئی ہیں۔ "تکرار' بندیا' بن پھول' نئی ماں' پرتھوی راج سنجوگتا' چالیس کروڑ' بچپن' سنتان' مزدور' کرکشیتر' بچوں کا کھیل' پرندے' رکمانی سویمور' ماں باپ کی لاج اور کلیان"

اِن میں سے پرتھوی راج سنجوگتا' سنتان اور کلیان حال ہی میں دہلی سے نکلی ہیں۔ "چالیس کروڑ" نے ایک سنسنی پیدا کر دی' تاریخی خصوصیات کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اُس نے پاکستانی مسلمانوں کے جذباتِ غیظ و غضب کو بھڑکا دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا

[illegible]
"شمع" اور "ماں باپ کی لاج" [illegible]
کرتی ہیں۔ اِن دونوں تصاویر کا مرکزی موضوع [illegible]
"بیوی کی لاج" سرقہ ہے جو شوہر کے لیے [illegible]
فرق لباس کا ہے ورنہ "شمع" ہندو زندگی کی [illegible]
ہے جیسی "ماں باپ کی لاج" مسلم گھرانوں کی [illegible]
ایک ہیں۔ جہاں تک ایکٹنگ کا تعلق ہے "شمع" میں جناب [illegible] "ماں باپ کی لاج" میں سورن لتا نے تصویر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ گلاب نے ساس کے پارٹ میں درگا کھوٹے اور راج کماری شکلا [illegible] دیا ہے۔ اِن دونوں تصاویر کے پس منظر اور خرچ وافر کے باعث "شمع" "ماں باپ کی لاج" کو جو اصل آئینے کا عکس ہے' ماند کر دے گی۔

"بچپن" اور "بچوں کا کھیل" طفلانہ انداز ستاروں کی مدد سے ایک بچکانہ سعی ہے کہانی کو پیش کرنے کی۔ بہ لحاظِ تاثیر کہانیاں حقیقت سے دور سچ مچ طفلانہ ہیں۔ غیر ملکی تصاویر میں جن سے شرلے ٹیمپل اور مارگیرٹ اوبرائن کی شہرت عام میں پر لگ گئے' جو انسانی کشش کا عنصر ہوتا ہے وہ ان تصاویر میں مفقود ہے۔

"تکرار" اور "بن پھول" کھلتے کی دو تصاویر ہیں جو بہر صورت ادنٰی ہیں۔ جمنا' مینا اور نواب کے چہرے بھی "تکرار" کو خوشگوار نہ بنا سکے۔ "بن پھول" میں کانن کی کوشش الہامی تصویر کو جاذبِ خاطر بنا سکی۔ "بندیا" اور "پرندے" تین ہفتوں سے زیادہ نہ ٹک سکے "کرکشیتر" ایسی گھلک تصویر ہے کہ عام آدمی اُس سے محظوظ ہونے سے قاصر ہے۔ کوئی محظوظ کیا ہوگا جب کچھ سمجھ کی گرفت ہی میں نہ آسکے۔

صرف "مزدور" ایک نفیس سماجی تصویر ہے جس کا زاویہ نگاہ بھی ترقی پسندانہ ہے۔ سرمایے اور محنت کی کشمکش میں اول الذکر کی باریک اور شاطرانہ مصالح کا پردہ خوبصورتی سے چاک کیا گیا ہے لیکن افسوس اس میں ڈراما کی تاثیر نہیں ہے۔ تصویر کا موضوع علمی اور عملی ہیئت سے پیش کیا گیا ہے۔ جس سے دلچسپی کم ہو گئی ہے بلکہ کہیں کہیں بارِ خاطر ہونے لگتا ہے۔ سینیریو ڈھیلا ڈھالا ہے اور بعض جگہ "پریسیڈنٹ" کی مضحکہ انگیز نقالی کی گئی ہے تاہم شہزادہ نو گنگولی اور کے' این سنگھ اور الیس نذیر کے کام نے

[illegible] تصاویر جن میں "نئی ماں" کا موضوع [illegible] جس سے اُس کی فنی خوبیوں پر [illegible] ہوگا۔

[illegible]

[illegible] اسٹوڈیوز "گوکل" سمرت اشوک اور [illegible] زیر تکمیل ہیں۔ [illegible] لال نے اسٹوڈیو کا چارج لے لیا ہے۔ [illegible] ایک سماجی تصویر پیش کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

"[illegible]" ۲۸ جون کو پیش ہوئی۔

پربھات سے علیحدگی کے بعد بابوراؤ پائی کا اسٹوڈیو بمبئی [illegible] پکچرس کے نام سے ظہور میں آیا ہے۔ کیشپ نے "نرگس" مکمل کر لی ہے۔ ہدایت کار اے بنرجی دوسرے مہینے "من موہن" کی شوٹنگ مکمل کر لیں گے، چکرا بارتی نے "میرا سہاگ" کی شوٹنگ شروع کر دی ہے، جس میں سلوچنا، چیٹرجی، لیلا چٹنس اور اُرون پیش پیش ہیں۔

شالیمار پکچرس اگرچہ "دو کنارے" "رنگیلا راجستھان" وغیرہ تصاویر کا بھی اعلان کیا گیا ہے لیکن سردست اسٹوڈیو میں "میرا بابی" کی ہی شوٹنگ ہو رہی ہے جس کی ہدایت کاری کے فرائض ڈبلو زیڈ احمد خود انجام دے رہے ہیں۔ "پرتھوی راج سنجوگتا" منظرِ عام پر آچکی ہے۔

نو رنگ چتراپٹ لمیٹڈ تصویر "کمرہ ۹" وسط جون میں نکل جائے گی۔ "پارو" "شکایت" اور "موتی" زیرِ تکمیل ہیں۔

بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ نتن بوس کی ہدایت میں "ملن" کی رفتار اُمید افزا ہے۔ نجم نقوی "پیر ملن" کے بعد سے بی اے ڈی کے زیر سایہ پہلی تصویر کے کاغذی مراحل طے کر رہے ہیں۔

آصف کا "مغلِ اعظم" شاہانِ مغلیہ کی طرح خراماں خراماں قدم اُٹھا رہا ہے۔ وجاہت مرزا نے "رین بسیرا" کی شوٹنگ شروع کر دی ہے۔

فلمستان لمیٹڈ "سفر" مکمل ہو چکا ہے۔ اشوک کمار کی تصویر "آٹھ دن" اور سنتوشی کی "شہنائی" کی رفتار خوش آئند ہے۔ کشور ساہو جو حال ہی میں فلمستان سے منسلک ہوئے ہیں "سیندور" شروع کر دیں گے۔ گیان مکرجی خود پروڈیوسر بن کر فلمستان کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔

"سنتان" تو نکل چکی ہے اور جنک پکچرس

جنک پکچرس نے دو تصاویر "جلتا" اور "گھر گھر کی رانی" کی تیاری شروع کر دی ہے۔ جن کے علی الترتیب رام پرکاش اور ومبا ہدایت کاری کے فرائض انجام دیں گے۔

کاردار پروڈکشنز "شہجہان" تیار ہے اور دو تصاویر "قیمت" اور "ناٹک" اسٹوڈیو میں زیرِ تیاری ہیں۔ اسی اسٹوڈیو میں مظہر خاں کا "سونا" اور "تاج محل" کی ملاقات بھی آچکی ہیں۔

جینت ڈیسائی پروڈکشنز جینت ڈیسائی کی غیبت میں "مہارانہ" اور "پرتاپ" کی تیاری ملتوی کر دی گئی تھی، اس اثنا میں رمیش سہگل نے اسی کمپنی کے لیے ایک تصویر تیار کر لی ہے۔ اسی اسٹوڈیو میں نئی کمپنی آشا پکچرس کی ایک تصویر جو پنڈت سدرشن کی کہانی پر مبنی ہے تیار ہو رہی ہے۔

سنٹرل اسٹوڈیوز جینت ڈیسائی کی نگرانی میں ریوندرا جیکر ایک سماجی تصویر کی تیاری کر رہے ہیں جس میں خورشید پیش پیش ہیں۔

تصویر "ساتھی" شمالی ہندوستان میں نکل چکی ہے اور رستم موودی "گل بکاؤلی" کی شوٹنگ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

منروا اسٹوڈیو "شمع" کی نمائش کے بعد دو تصویریں سٹ پر اور آگئی ہیں۔ یعنی "منجدھار" زیرِ ہدایت سہراب مودی جس میں مہتاب ہیروئن ہیں۔ اور "دیوانی" زیرِ ہدایت وادی، ڈی سرپٹ دار جس میں ممتاز شانتی، واسطی اور محسن بانو خاص اداکار ہیں۔

راج کمل کلامندر انگریزی کا "ڈاکٹر کوٹنس" مکمل ہو چکا ہے۔ "جیون یاترا" نمائش کیلئے تیار ہے۔ "اندھوں کی دنیا" جس میں لیلا چٹنس منور سلطانہ من موہن وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تیزی سے مراحل

تکمیل کے قریب ہے اور جلد تمام جگہ "رتن مالا" کی چابیاں تقسیم کر دی جائیں گی۔ پُنا مالا کی "شبانہ" مکمل ہو چکی ہے۔ جو عنقریب نمائش کے لیے آ جائے گی۔ تانک کی دوسری تصویر "سونا مندر" مکمل ہو چکی ہے جس میں پریم ادیب اور شانتا آپٹے، خاص اداکار ہوں گے۔ علاوہ ازیں ایک حوصلے دار تصویر "امر راج" کی طیاری شروع کی ہے جس میں نسیم اور ترلوک کپور خاص اداکار ہوں گے۔

آنند برادرس

انہوں نے ایسٹرن پکچرس کے لیے "رنگ محل" مکمل کر لیا ہے۔ اور اپنی نئی تصویر "چاند" کا کام جاری کر دیا ہے۔

مراری پکچرس

"عمر خیام" تیار ہے۔ "شکلا" کیمرہ کے سامنے آ چکا ہے۔

رنگ محل پکچرس

قائم کردہ ڈاکٹر صفدر آہ، پہلی تصویر اس کمپنی کی "بھوک" ہے، جس میں شیخ مختار کا رول خاص ہے۔

شری ساؤنڈ اسٹوڈیوز

"دریا پار کی" "پریکٹیا" واسوانی کی "شبھ پتو" "آخری منزل" میں ہیں۔ آچاریہ کی "پری ورتن" اور "شہرت" تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہیں۔ اور تصاویر کرشن چندر کی "سپاتے کی بہار" جس کی خاص اداکارہ بینا ہوں گی۔ اور شوکت حسین کا "جگنو" نور جہاں اور دلیپ کمار کی مخصوص اداکاری میں نیشنل اسٹوڈیوز کی طرف سے تیاری میں آنے والی ہیں۔

رنجیت اسٹوڈیوز

"مہا جیوتانی" نمائش میں آ چکی ہے۔ "دھرتی" "مدرتی" اور "پھلواری" مکمل ہو چکی ہیں۔ اور جلد نمائش کے لیے آ جائیں گی۔ "لیکھ" "شری گیتی" اور "موریا کا لعل" کا کام جلد شروع ہو جائے گا۔

محبوب پروڈکشنز

"انمول گھڑی" مکمل ہو چکی ہے اور اب محبوب دوسری کہانی کی تلاش میں ہیں۔

امر اسٹوڈیوز

بابوراؤ کی "گوالن" تیار ہو چکی ہے۔ بہرس چٹو پادھیائے "آزادی" کی نصف سے زیادہ شوٹنگ ختم کر لی ہے۔

جمنا پروڈکشنز

... ہدایت کاری ... کے سپرد کر دی گئی ہے۔

ہند پکچرس

"ماں باپ کی لاج" منظر عام پر آ چکی ہے۔ "یادگار" اور "عاشق و معشوق" تیار ہیں اور شفیق دل نے "شکوہ" بنانا شروع کر دیا ہے۔ ان تمام تصاویر میں نذیر یا سورن لتا پیش پیش ہیں۔

سنرائز پکچرس

بمبئی میں ۱۳ جون کو گجراتی میں "رانگ دیوی" پیش کی جا چکی ہے پارو اور چھ راج کی اداکاری میں وی۔ ایم۔ ویاس نے دوسری سماجی تصویر "دھنواں" کی قریب قریب تیاری مکمل کر لی ہے۔

شخصیتوں کا جلوس

اِدھر دو ماہ کی سب سے زیادہ سنسنی خیز خبر سہراب مودی اور مہتاب کی شادی ہے۔ ہر چند اس کی افواہ بہت پہلے سے اڑ گئی تھی، لیکن یہ افواہ اپریل کے آخری ہفتے میں حقیقت میں ملبوس ہوئی جب کہ مہتاب کے بنگلے پر سول میرج ایکٹ کے تحت دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ دونوں ماہِ عسل (Honey-Moon) منانے کے لیے کشمیر تشریف لے گئے ہیں۔

"اسٹیشن ماسٹر" "وکرماجیت" اور "رتن ولی" کی ہیروئن اپنے شوہر راجہ پنڈت سے کچھ کبیدہ ہو کر علیحدہ ہو گئی ہیں۔ دونوں تنہا رہتے ہیں اور کہتے ہیں یہی حادثہ پنڈت انند کمار اور لتا پاور شوبھا اور سنگھ کے درمیان پیش آیا ہے۔

آصف اور ستارہ میں غالباً مصالحت ہو گئی ہے اب پھر دونوں اکثر ساتھ نظر آتے ہیں۔

شانتا رام نے جے شری کو اپنے ہمراہ امریکہ لے جانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ سُنا گیا ہے جے شری دو سو سے اوپر ساریاں لے جائیں گی اور انہیں کے طفیل اپنی تابانیوں سے ہالی ووڈ والوں کی نظریں خیرہ کر دیں گی۔

نجم نقوی شالیمار سے علیحدہ ہو کر بمبئی ٹاکیز اور جمنا پروڈکشنز سے متعلق ہو گئے ہیں۔

اسٹینڈرڈ پکچرز کارپوریشن کا ولولہ خیز اور روح پرور تاریخی شاہکار
بیرم خاں
چمنِ ہند میں اتحادِ ہند و مسلم کی نسیم خوشگوار اٹھلاتی جھومتی اسکرین پر نظر آتی ہو۔ بیرم خاں کی چلتی پھرتی، جاگیر دار کے بھیس میں جلوہ آرا ہے
آنجو چشم مہتاب، ڈیوڈ، صادق علی، غلام محمد، رامیش، اکبر شاہ نواز ایسے درخشاں ستارے تصویر کے اُفق پر تاباں ہیں
لاہور کی غیر معمولی کامیابی کے بعد کمار ٹاکیز میں ۲۰ جون سے دھوم مچا رہا ہے
جاری کردہ:- ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز دہلی
PRODUCTIONS'
جگمگاتے، روشنی برساتے، اسکرین کے دو بڑے تابدار و ضیا پاش ستارے
شانتا آپٹے اور موتی لال
سنجیون آرٹ پروڈکشن کے بے نظیر شاہکار
ساون
میں
اسی اُفق پر چندر پربھا، سوشیلا، شاہو، لیلا پانڈے ایسے بھی انجم گہر بار دمک رہے ہیں۔
شانتا آپٹے کے مسحور کر دینے والے نغمے
ہدایت کار دوار کا کھوس
رٹز دہلی میں ۲۱ جون سے غیر معمولی کامیابی حاصل کر رہا ہے
جاری کردہ:- لکشمی فلم سروس دہلی

[...]ستان لمیٹڈ کا بےنظیر و بےعدیل

شاہکار

شنکار ری

نظروں کو خیرہ کرنے والے جلوے
دلوں میں جادو جگانے والے نغمے!
شہنشاہِ اقلیم فلم، اشوک کمار شمشیر بکف
سردار کے عظیم الشان روپ میں۔ اس
چمک دمک میں ویرا اور روپا دو نئے
حسین چہروں کی جلوہ سازیاں دیدنی ہیں
ڈیبائی کا مزاح تصویر کی مقبولیت کا
روح پرور باب ہے
بمبئی کلکتے میں غیر معمولی کامیابی کے بعد موتی سینما
دہلی میں بےمثال مقبولیت کے کاندھوں پر اڑ رہا ہے

جاری کردہ
جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز دہلی

[illegible]

بھگتی کا مرقع

دیوکینا

عرف

شُو ریکھا ری

ہندو دھرم کے عقیدت مندوں کے لیے پرانوں کی جیتی جا[...]
بےحد دلچسپ نصیحت آمیز اور بےمثال جھلکیا[ں]
اداکار:- پردہ سیمیں کی ماہ پارہ لیلا دیسا[ئی]
لیلا چٹنس، الہاس اور واسطی

میجسٹک سینما دہلی میں

۵ جولائی سے کہرام برپا کیے ہوئے ہے

جاری کردہ- سپریم فلمز چاندنی چوک [...]

THE ADEEB

DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month.
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only; single copy Rupee one
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th, please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

[illegible] Printing Press, [illegible] Delhi
[illegible] published from the office of
[illegible] Delhi.